نہج البلاغہ

ترجمہ و شرح

فخر الحکما مولانا سید علی اظہرؒ
(علامہ سید علی حیدرؒ)

مرکز افکار اسلامی



کتاب سے عام استفادہ کی اجازت ہے

نام کتاب: نہج البلاغہ

ترجمہ وحواشی: فخر الحکما مولانا سید علی اظہرؒ (مولانا سید علی حیدرؒ)

اشاعت اول: جمادی الاوّل ۱۴۴۸ھ (اکتوبر 2026ء)

ناشر: مرکز افکار اسلامی

کتاب حاصل کرنے کے لیے رابطہ کریں

+92 335 1625579

www.afkareislami.com

afkareislami@yahoo.com



فہرست

نمبر شمار	موضوع	صفحہ نمبر
۱	پیش گفتار	۱۳
۲	مقدمہ نہج البلاغہ از فخر الحکما مولانا سید علی اظہرؒ	۲۱
۳	دیباچہ مؤلف نہج البلاغہ علامہ شریف رضی علیہ الرحمہ	۹۹
خطبہ نمبر	خطبہ	صفحہ نمبر
۱	معرفت خدا کے درجات، آفرینش زمین و آسمان اور پیدائشِ آدم علیہ السلام	۱۱۵
۲	بعثت سے قبل کے حالات	۱۳۷
۳	خطبہ شقشقیہ، خلفائے ثلاثہ کی حکومت کے بارے میں آپؑ کا نظریہ	۱۴۳
۴	آپؑ کی دوررس بصیرت، یقین کامل اور موسیٰؑ کا خوفزدہ ہونا	۱۸۰
۵	ابوسفیان نے آپؑ کی بیعت کرنا چاہی	۱۸۲
۶	طلحہ و زبیر کے تعاقب سے روکا گیا تو فرمایا	۱۸۴
۷	منافقین کی حالت	۱۸۵
۸	زبیر نے کہا دل سے بیعت نہ کی تھی	۱۸۶
۹	اصحاب جمل کا بودا پن	۱۸۷
۱۰	طلحہ و زبیر کے بارے میں	۱۸۷
۱۱	محمد بن حنفیہ کو آداب حرب کی تعلیم	۱۸۸
۱۲	عمل کا دار اور مدار نیت پر ہے	۱۸۹
۱۳	اہل بصرہ کی مذمت میں	۱۹۱
۱۴	اہل بصرہ کی مذمت میں	۱۹۳
۱۵	عثمانؓ کی دی ہوئی جاگیریں پلٹا لیں	۱۹۴
۱۶	جب مدینہ میں آپؑ کی بیعت ہوئی	۱۹۵

۱۷	آخرت کے لحاظ سے لوگوں کی تقسیم	۱۹۹
۱۸	مسند قضا پر بیٹھنے والے نااہلوں کی مذمت میں	۲۰۱
۱۹	علماء کے مختلف الآراء ہونے کی مذمت میں	۲۰۵
۲۰	اشعث بن قیس کی غداری ونفاق کا تذکرہ	۲۰۸
۲۱	موت کی ہولناکی اوراس سے عبرت اندوزی	۲۱۱
۲۲	دنیامیں سبکبار رہنے کی تعلیم	۲۱۲
۲۳	قتل عثمان کا الزام	۲۱۴
۲۴	حسد سے باز رہنے اور حسن سلوک	۲۱۷
۲۵	جنگ پر آمادہ کرنا	۲۲۳
۲۶	بسر کے حملے کے بعد جنگ سے جی چرانے والے	۲۲۴
۲۷	عرب قبل از بعثت اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد دنیا کی بے رخی	۲۲۹
۲۸	جہاد پر برانگیختہ کرنا	۲۳۲
۲۹	دنیا کی بے ثباتی اور زاد آخرت	۲۳۸
۳۰	جنگ کے موقع پر حیلے بہانے کرنے والے	۲۴۵
۳۱	قتل عثمان کے سلسلے میں آپؑ کی روش	۲۴۸
۳۲	جنگ جمل سے پہلے ابن عباس کو زبیر کے پاس جب بھیجا	۲۵۰
۳۳	دنیا کی مذمت اور اہل دنیا کی قسمیں	۲۵۱
۳۴	جب جنگ جمل کے لیے روانہ ہوئے تو فرمایا	۲۵۸
۳۵	لوگوں کو اہلِ شام سے آمادۂ جنگ کرنے کے لیے فرمایا	۲۶۲
۳۶	تحکیم کے بعد فرمایا	۲۶۶
۳۷	اہل نہروان کو ان کے انجام سے ڈراتے ہوئے فرمایا	۲۷۰
۳۸	اپنی استقامت دینی وسبقت ایمانی کے بارے میں فرمایا	۲۷۱
۳۹	شبہ کی وجہ تسمیہ اور دوستان خدا و دشمنان خدا کی مذمت	۲۷۵
۴۰	جنگ سے جی چرانے والوں کی مذمت	۲۷۵

۴۱	جب خوارج کا قول لاحکم الا اللہ سنا تو فرمایا	۲۷۷
۴۲	غداری کی مذمت میں	۲۷۹
۴۳	نفسانی خواہشوں اور لمبی امیدوں کے بارے میں فرمایا	۲۸۰
۴۴	جب ساتھیوں نے جنگ کی تیاری کے لیے کہا تو آپ نے فرمایا	۲۸۲
۴۵	جن مصقلہ ابن ہبیرہ معاویہ کے پاس بھاگ گیا تو آپ نے فرمایا	۲۸۵
۴۶	اللہ کی عظمت اور جلالت اور دنیا کی سبکی و بے وقاری کے متعلق	۲۸۶
۴۷	جب شام کی طرف روانہ ہونے کا قصد کیا	۲۸۸
۴۸	کوفہ پر وارد ہونے والے مصائب کے متعلق فرمایا	۲۸۹
۴۹	جب شام کی طرف روانہ ہوئے تو فرمایا	۲۹۰
۵۰	اللہ کی عظمت و بزرگی کے بارے میں فرمایا	۲۹۴
۵۱	حق و باطل کی آمیزش کے نتائج	۲۹۶
۵۲	جب شامیوں نے آپ کے ساتھیوں پر پانی بند کر دیا	۲۹۷
۵۳	دنیا کے زوال و فنا کے بارے میں، گوسفند کی قربانی کے متعلق	۲۹۸
۵۴	آپؑ کے ہاتھ پر بیعت کرنے والوں کا ہجوم	۳۰۲
۵۵	میدان صفین میں جہاد میں تاخیر پر اعتراض ہوا تو فرمایا	۳۰۳
۵۶	میدان جنگ میں آپؑ کی صبر و ثبات کی حالت	۳۰۴
۵۷	معاویہ کے بارے میں فرمایا	۳۰۷
۵۸	خوارج کے بارے میں آپؑ کی پیشینگوئی	۳۰۹
۵۹	خوارج کی ہزیمت کے متعلق آپؑ کی پیشینگوئی	۳۱۱
۶۰	جب اچانک قتل کر دیے جانے سے ڈرایا گیا تو آپؑ نے فرمایا	۳۱۴
۶۱	دنیا کی بے ثباتی کا تذکرہ	۳۱۵
۶۲	دنیا کے زوال و فنا کے سلسلہ میں فرمایا	۳۱۶
۶۳	صفات باری کا تذکرہ	۳۲۰
۶۴	جنگ صفین میں تعلیم حرب کے سلسلے میں فرمایا	۳۲۵

۶۵	سقیفہ بنی ساعدہ کی کاروائی سننے کے بعد فرمایا	۳۲۷
۶۶	محمد بن ابی بکر کی خبر شہادت سن کر فرمایا	۳۳۰
۶۷	اپنے اصحاب کی کجروی اور بے رخی کے بارے میں فرمایا	۳۳۱
۶۸	شب ضربت سحر کے وقت فرمایا	۳۳۲
۶۹	اہل عراق کی مذمت میں فرمایا	۳۳۳
۷۰	پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود بھیجنے کا طریقہ	۳۳۶
۷۱	حسنینؑ کی طرف سے مروان کی سفارش کی گئی تو آپؑ نے فرمایا	۳۴۰
۷۲	جب لوگوں نے عثمان کی بیعت کا ارادہ کیا تو آپؑ نے فرمایا	۳۴۲
۷۳	قتل عثمان میں شرکت کا الزام آپؑ پر لگایا گیا تو فرمایا	۳۴۲
۷۴	پند و نصیحت کے سلسلے میں فرمایا	۳۴۴
۷۵	بنی امیہ کے متعلق فرمایا	۳۴۴
۷۶	دعائیہ کلمات	۳۴۵
۷۷	منجمین کی پیشینگوئی کی رد	۳۴۷
۷۸	عورتوں کے فطری نقائص	۳۵۰
۷۹	پند و نصیحت کے سلسلے میں فرمایا	۳۵۳
۸۰	اہل دنیا کے ساتھ دنیا کی روش	۳۵۴
۸۱	(خطبہ عزاء) موت اور اس کے بعد کی حالت، انسانی خلقت کے درجات اور نصائح	۳۵۶
۸۲	عمرو بن عاص کے بارے میں	۳۸۲
۸۳	تنزیہ بازی اور پند و نصائح کے سلسلے میں فرمایا	۳۸۵
۸۴	آخرت کی تیاری اور احکام شریعت کی نگہداشت کے سلسلے میں فرمایا	۳۸۷
۸۵	دوستان خدا کی حالت اور علما سوء کی مذمت میں فرمایا	۳۹۴
۸۶	امت کے مختلف گروہوں میں بٹ جانے کے متعلق فرمایا	۴۰۲
۸۷	بعثت سے قبل دنیا کی حالت، پراگندگی اور موجودہ دور کے لوگ	۴۰۵
۸۸	صفات باری اور پند و موعظت کے سلسلے میں فرمایا	۴۰۸

۸۹	(خطبہ اشباح) آسمان وزمین کی خلقت	۴۱۲
۹۰	جب آپؑ کے ہاتھ پر بیعت ہوئی تو فرمایا	۴۵۱
۹۱	خوارج کی بیخ کنی اور اپنے علم کی ہمہ گیری وفتنہ بنی امیہ	۴۵۳
۹۲	خداوند عالم کی حمد وثنا اور انبیا کی توصیف میں فرمایا	۴۵۸
۹۳	بعثت کے وقت لوگوں کی حالت اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مساعی	۴۶۲
۹۴	نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدح وتوصیف میں فرمایا	۴۶۳
۹۵	اپنے اصحاب کو تنبیہہ اور سرزنش کرتے ہوئے فرمایا	۴۶۵
۹۶	بنی امیہ اور ان کے مظالم کے متعلق فرمایا	۴۷۱
۹۷	ترکِ دنیا اور نیرنگیٔ عالم کے سلسلہ میں فرمایا	۴۷۳
۹۸	اپنی سیرت وکردار اور اہل بیتؑ کی عظمت کے سلسلہ میں فرمایا	۴۷۶
۹۹	عبدالملک بن مروان کی تاراجیوں کے متعلق فرمایا	۴۸۰
۱۰۰	بعد میں پیدا ہونے والے فتنوں کے متعلق فرمایا	۲۸۳
۱۰۱	زہد وتقویٰ اور اہل دنیا کی حالت کے متعلق فرمایا	۴۸۵
۱۰۲	بعثت سے قبل لوگوں کی حالت اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تبلیغ وہدایت	۴۹۰
۱۰۳	پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدح وتوصیف اور فرائضِ امام کے سلسلہ میں	۴۹۳
۱۰۴	شریعت اسلام کی گرانقدری اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت کے متعلق فرمایا	۴۹۸
۱۰۵	صفین میں جب لشکر کے قدم اکھڑنے کے بعد جم گئے تو فرمایا	۵۰۳
۱۰۶	پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توصیف اور لوگوں کے گوناگون حالات کے بارے میں	۵۰۴
۱۰۷	خداوند عالم کی عظمت، ملائکہ کی رفعت، نزع کی کیفیت اور آخرت	۱۰۷

ماہنامہ "الکلام" سے لی گئی اصل تصویر



دینے والے بکثرت اس سے نہج البلاغہ کی کتابت معطل ہوا چاہتی ہی چنانچہ اسطرف مین نے کئی حضرات کے ذریعہ سے اسکی کتابت کیلئے بار بار جناب ممدوح سے اصرار کیا تو ۱۲ مئی ۲۶ء کو حسب ذیل جواب آیا "تسلیم بصد تعظیم کے بعد واضح رائے عالی ہو کہ مین نہایت شرمندہ ہون کہ آپکی کاپیان نہج البلاغہ کو بہت تاخیر ہوگئی مرزا سلطان احمد صاحب نے بھی متعدد تقاضے کئے اور آج خالو منور علی صاحب بھی آپکا کارڈ لیکر آئے۔ مجبوری یہ ہے کہ جنکا کام مین کر رہا ہون وہ ہمیشہ کلام مجید لکھواتے ہین انکے مقابل مین فی زمانہ اور لوگون نے بھی کلام مجید شروع کئے اب انکو چٹپٹ لگی کہ جسطرح ہو میرا کلام مجید پہلے نکلے انھون نے میرے اوپر زیادہ زور دیا کہ جسطرح ممکن ہو سوائے میرے اور کوئی کام نہ کرو اور انسے پہلے میرا کلام مجید ختم کرو چنانچہ ایک کلام مجید دو مرتبہ تو بارہ بارہ ہزار طبع ہوکر نکل چکا اب تیسری بار پھر وہی شروع ہی الخ۔ اب آپ حضرات فرمائین کہ جو لوگ بارہ بارہ ہزار کلام مجید چھپواتے ہون انکا مقابلہ مین کیونکر کرون جس کے نہج البلاغہ کے خریدار اسوقت دو سو بھی نہین ہین؟ وہ لوگ بڑی رقمین پیشگی اجرت کی جمع کر دیتے ہین لیکن الکلام کیا کرے اسکی حیثیت تو کام لینے کے بعد بھی اجرت دینے کی نہین ہی پیشگی کا کیا ذکر ہی لہذا مین نے یہین ایک کاتب سے ایک صفحہ لکھوایا ہی جسکا نمونہ اسی صفحہ پر ہی

أَمْوَاجٍ مُسْتَفْحِلَةٍ وَلُجَجِ بِحَارٍ زَاخِرَةٍ تَلْتَطِمُ

صہ جناب سید ظفریاب علی صاحب جوہر سابق منیجر مقبول پریس دہلی نے اس

أَوَاذِيُّ أَمْوَاجِهَا وَتَصْطَفِقُ مُتَقَاذِفَاتُ

کتابت کا انتظام کر دیا تھا۔ اب ممدوح کے پدر بزرگوار جناب محترم

أَثْبَاجِهَا وَتَرْغُو زَبَدًا كَالْفُحُولِ عِنْدَ هِيَاجِهَا

میر منور علی صاحب زاد مجدہم الکلام پر بڑی عنایت فرماتے اور زحمت

فَخَضَعَ جِمَاحُ الْمَاءِ الْمُتَلَاطِمِ لِثِقَلِ حَمْلِهَا وَسَكَنَ

شاقہ گوارا کرکے اس کتاب مستطاب کی کتابت کرانے

هَيْجُ ارْتِمَائِهِ إِذْ وَطِئَتْهُ بِكَلْكَلِهَا وَذَلَّ

مین بلیغ کوشش فرماتے ہین۔ مین جناب موصوف کا بھی

مُسْتَخْذِيًا إِذْ تَمَعَّكَتْ عَلَيْهِ بِكَوَاهِلِهَا فَأَصْبَحَ

شکریہ کسی طرح ادا نہین کر سکتا۔ منیجر

بَعْدَ اصْطِخَابِ أَمْوَاجِهِ سَاجِيًا

مَقْهُورًا وَفِي حَكَمَةِ الذُّلِّ مُنْقَادًا أَسِيرًا

اگر آپ حضرات اسکو پسند کرین اور آئندہ اسی خط سے کتاب مستطاب کے لکھوانے کی رائے دین تو مجھے عذر نہین حکم کی تعمیل کرونگا لیکن اگر سابق خط ہی سے آپ اسکو آراستہ دیکھنا چاہتے ہین تو صرف ۹۹ حضرات محض ایک سال کیلئے "انصار نہج البلاغہ" ہونا منظور فرمالین یعنی اپنا چندہ الکلام صرف اس جلد ۶ کا بجائے للعہ کے عہ بذریعہ منی آرڈر مرحمت فرمائین تاکہ اسی ذی الحجہ مین مین بھی سو روپیہ دہلی اسکی کتابت کیلئے پیشگی روانہ کردون۔ ص

ماہنامہ "الکلام" سے لی گئی اصل تصویر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) یا امام حسین کو۔ (پارہ ۶ صفحہ ۹۲) سدفۃ معنے تاریکی۔ اندھیری۔ انوار اللغۃ میں ہے "سدف تاریکی روشنی صبح اوسکی آمد۔ رات اوسکی تاریکی۔ قد وجہت سدافتہ بی بی ام سلمہ رضہ نے حضرت عائشہ سے کہا تم نے تو پردہ آپکا ہٹا دیا۔ پردے کی طرف رخ کیا اوسکو اپنی جگہ سے سرکا دیا یعنی تمکو گھر بیٹھنے کا حکم تھا تم بصرے گئیں اور جنگ میں شریک ہوئیں" (پارہ ۱۲ صفحہ ۵۶) ۱۲ حاشیہ صفحہ ۲۹۹ سلہ نسمۃ معنے جان نفس۔ روح۔ جاندار انوار اللغۃ میں ہے "والذی خلق الحبۃ وبرأ النسمۃ قسم اوس پروردگار کی جس نے دانہ چیرا اوسکو اوگایا اور جاندار کو پیدا کیا حضرت علی اکثر اسی طرح قسم کہاتے تھے" (پارہ ۲۵ صفحہ ۵۶) مثقال کل ذرۃ یعنی ہر ذرہ کے وزن کے برابر مثقال ہر چیز کے وزن کو کہتے ہیں چنانچہ قرآن مجید میں ہے ان اللہ لا یظلم مثقال ذرۃ یعنی خدا تو ہرگز ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا (سورہ نسا آیت ۴۰) ھماھم جمع ہے ھمہ کی اور یہ اصل میں گائے کی آواز کو کہتے ہیں پھر طلقا آہستہ آہستہ گنگنانے عورت کے بچہ کو باریک آواز سے سلانے کو ہمہ کہنے لگے۔ قرارۃ النطفۃ معنے وہ جگہ جہاں پانی ٹھہرتا ہے کیونکہ نطفہ معنے پانی بھی

خَطْوَةٍ وَحِسِّ كُلِّ حَرَكَةٍ وَرَجْعِ كُلِّ كَلِمَةٍ وَ

اور ہر حرکت کی حس اور ہر کلمہ کی آواز اور

تَحْرِيكِ كُلِّ شَفَةٍ وَمُسْتَقَرِّ كُلِّ نَسَمَةٍ وَمِثْقَالِ

ہر لب کی جنبش اور ہر جاندار کے رہنے کی جگہ اور ہر ذرہ کے وزن

كُلِّ ذَرَّةٍ وَهَمَاهِمِ كُلِّ نَفْسٍ هَامَّةٍ وَمَا عَلَيْهَا

اور ہر فکر کرنے والے نفس کی فکروں اور جو کچھ اس (زمین) پر ہے

مِنْ ثَمَرِ شَجَرَةٍ أَوْ سَاقِطِ وَرَقَةٍ أَوْ قَرَارَةِ نُطْفَةٍ

خواہ وہ کسی درخت کا پھل ہو یا گرا ہوا پتہ یا نطفہ ٹھہرنے کی جگہ یا خون

أَوْ نُقَاعَةِ دَمٍ وَمُضْغَةٍ أَوْ نَاشِئَةِ خَلْقٍ وَسُلَالَةٍ

اور لوتھڑے کے رہنے کا سوراخ یا ظاہر ہونے والی مخلوق اور (مخلوقات کے) نتیجے

لَمْ يَلْحَقْهُ فِي ذَلِكَ كُلْفَةٌ وَلَا اعْتَرَضَتْهُ فِي

(ان سب کو وہ اچھی طرح جانتا ہے) ان باتوں (کے جاننے) میں اسے کوئی زحمت نہیں ہوتی اور

حِفْظِ مَا ابْتَدَعَ مِنْ خَلْقِهِ عَارِضَةٌ وَلَا اعْتَوَرَتْهُ

جس مخلوق کو اسنے ایجاد کیا ہے اسکی حفاظت میں اسے کوئی دقت پیش نہیں آتی نہ اپنے امور کے جاری کرنے اور

فِي تَنْفِيذِ الْأُمُورِ وَتَدَابِيرِ الْمَخْلُوقِينَ مَلَالَةٌ

مخلوقوں کی تدبیروں میں اسے کوئی دل تنگی یا سستی طاری ہوتی ہے

آیا ہے چنانچہ اسی نہج البلاغہ میں اسکے پہلے یہ لفظ نطفہ اسی پانی کے معنے میں گزر گیا ہے اور ہو سکتا ہے کہ یہاں نطفہ سے مراد منی اور قرارۃ نطفہ سے مراد نطفہ کے ٹھہرنے کی جگہ ہو۔ نقاعۃ معنے وہ سوراخ جہاں خون جمع ہوتا ہے۔ سلالہ مشتق ہے سل سے جسکا معنے سونت لینا۔ نرمی سے نکال لینا ہے۔ تو سلالہ معنے سونتا نرمی سے نکالا ہوا چونکہ لڑکا بھی ماں باپ سے نکالا جاتا ہے لہذا انکا سلالہ کہا جاتا ہے۔ اعتورت معنے لاحق ہوا پیش آیا۔

ماہنامہ "الکلام" سے لی گئی اصل تصویر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اختیار کی جائینگی اور حلال چھوڑ دی جائیں گی۔ باطل باتوں کو لوگ خوشی سے قبول کریں گے اور امور حق کی طرف توجہ بھی نہیں کرینگے غرض اس زمانہ میں احکام اسلام سب کے سب الٹ جائیں گے ۱۲
حواشی صفحہ ۵۷ ۱۲ سلہ علامہ ابن ابی الحدید معتزلی لکھتے ہیں کہ حضرت کے اسی جملہ کے مطابق علماء نے صانع عالم کے وجود و ثبوت پر استدلال کیا ہے اور یہ اسوجہ سے کہ انسان کا نفس سختیوں پریشانیوں اور مصیبتوں میں خواہ مخواہ اپنے خالق اور پروردگار کی طرف لو لگاتا اور اسی سے اسکی دعا رس بند ہوتی ہے۔ کیا تم کشتی کے سوار کو نہیں دیکھتے کہ جب طوفان آتا ہے اور موجیں کشتی کو گھیر لیتی ہیں تو اس وقت اسکے سواروں کو جو کچھ اپنے بچنے کی امید ہوتی ہے صرف خدا سے ہوتی ہے اور یہ اس سے آس لگاتا ہے انسان کا کچھ اختیاری فعل نہیں ہے بلکہ نفس اسکے سے مجبور ہو جاتا ہے جو گویا فطری امر ہے اس سے معلوم ہوا کہ خدا کا علم انسانی نفوس میں راسخ ہے اسی کو خدا پارہ ۱۱ سورہ بنی اسرائیل آیت ۶۷ میں فرماتا ہے واذا مسکم الضر فی البحر ضل من تدعون الا ایاہ کہ جب سمندر میں تم پر آفت آتی ہے تو سب مددگار غائب ہو جاتے ہیں مگر وہی تمھیں یاد رہتا ہے پارہ ۱۱ سورہ یونس آیت ۲۲ میں فرمایا ہے ھو الذی یسیرکم فی البر والبحر حتی اذا کنتم فی الفلک وجرین بھم بریح طیبۃ وفرحوا بھا جاءتھا ریح عاصف وجاءھم الموج من کل مکان وظنوا انھم احیط بھم دعوا اللہ مخلصین لہ الدین لئن انجیتنا من ھذہ لنکونن من الشاکرین خدا وہی ہے جو تم لوگوں کو خشکی اور تری میں لئے پھرتا ہے یہانتک کہ بعض اوقات تم کشتیوں

وَاِنَّھُمْ عَلٰی مَکَانِھِمْ مِنْکَ وَمَنْزِلَتِھِمْ عِنْدَکَ وَ
اور وہ سب (فرشتے) باوجود اس تقرب کے جو تیرے یہاں اور اس مرتبہ کے جو تیرے
اسْتِجْمَاعِ اَھْوَائِھِمْ فِیْکَ وَکَثْرَۃِ طَاعَتِھِمْ لَکَ
نزدیک انھیں حاصل ہے اور باوجود یکہ انھوں نے اپنی خواہشیں تیری مرضی میں اکٹھی کر لی ہیں
وَقِلَّۃِ غَفْلَتِھِمْ عَنْ اَمْرِکَ لَوْ عَایَنُوْا کُنْہَ
اور وہ کثرت تیری اطاعت کرنے اور بہت کم تیرے حکم سے غافل ہوتے ہیں (پھر بھی) اگر تیری اس
مَا خَفِیَ عَلَیْھِمْ مِنْکَ لَحَقَّرُوْا اَعْمَالَھُمْ وَلَزَرَوْا
کنہ کو ملاحظہ کریں جو اُن سے مخفی ہے تو یقیناً وہ اپنے اعمال کو حقیر اور اپنے
عَلٰی اَنْفُسِھِمْ وَلَعَرَفُوْا اَنَّھُمْ لَمْ یَعْبُدُوْکَ
نفسوں کو معیوب سمجھنے لگیں اور جان لیں کہ تیری عبادت کا جو حق ہے ویسی عبادت
حَقَّ عِبَادَتِکَ وَلَمْ یُطِیْعُوْکَ حَقَّ طَاعَتِکَ
نہیں کر سکے اور تیری اطاعت جیسی چاہئے ویسی اطاعت بھی اُن سے نہیں ہو سکی
سُبْحَانَکَ خَالِقًا وَمَعْبُوْدًا بِحُسْنِ بَلَآئِکَ
تو کس قدر قابل تسبیح خالق اور معبود ہے۔ تو نے اپنی خلق کا بہترین امتحان
عِنْدَ خَلْقِکَ خَلَقْتَ دَارًا وَجَعَلْتَ فِیْھَا
لیکر ایک گھر (بہشت) پیدا کیا اور اس میں (مختلف قسم کی نعمتیں مثلاً)

ماہنامہ "الکلام" سے لی گئی اصل تصویر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کو ظاہر نہیں کر سکتے تھے ایک مرتبہ آپنے عاجز آکر قاضیوں کے نام لکھدیا کہ اچھا جیسا اچھا راجی چاہے اسی طرح لوگوں میں فیصلہ وحکومت کرے۔ تو آپکا یہ جملہ آپکی قوت وغلبہ اور حکومت واقتدار بتاتا ہے یا ضعف اور مجبوری کی طرف اشارہ کرتا ہے؟ پس ایسے وقت میں مصلحت زمانہ اور حکمت و دور اندیشی کا مقتضیٰ اسکے سوا کیا تھا کہ آپ سکوت کریں اور فتنہ وفساد نہ قایم ہونے دیں۔ ایک دفعہ حضرت نماز صبح پڑھتے تھے تو جماعت میں ایک شخص نے نماز ہی میں پڑھدیا ان

وَاتَّبَعُوا أَثَرَهُمْ فَلَنْ يَخْرُجُوكُمْ مِنْ هُدًى وَلَنْ

اور انکے آثار (اقوال وافعال) کی پیروی کرتے رہوگے تو تمھیں کبھی راہ ہدایت سے باہر نہیں کرسکینگے

يَعُودُوكُمْ فِي رَدًّى فَإِنْ لَبَدُوا فَالْبَدُوا وَإِنْ

اور کبھی ہلاکت میں دوبارہ نہیں لاسکینگے غرض اگر وہ توقف کریں تو تم بھی توقف کرو اور اگر وہ

نَهَضُوا فَانْهَضُوا وَلَا تَسْبِقُوهُمْ فَتَضِلُّوا وَلَا

(کسی کام پر) آمادہ ہوں تو تم بھی آمادہ ہوجاؤ۔ اگر (اسے) آگے نہ بڑھنا کہ پھر گمراہ ہوجاؤ گے اور نہ

تَتَأَخَّرُوا عَنْهُمْ فَتَهْلِكُوا۔ لَقَدْ رَأَيْتُ أَصْحَابَ

ان سے پیچھے ہونا ورنہ ہلاک ہوجاؤ گے (بس ساتھ ہی رہو) یعنے حضرت رسول خدا صلعم کے صحابہ کرام

مُحَمَّدٍ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ فَمَا أَرَى أَحَدًا يُشْبِهُهُمْ

کو دیکھا ہے تم میں سے کسی کو بھی ان سے ملتا ہوا نہیں پاتا۔ وہ لوگ پراگندہ مو

مِنْكُمْ لَقَدْ كَانُوا يُصْبِحُونَ شُعْثًا غُبْرًا وَقَدْ بَاتُوا

غبار آلود چہروں سے صبح کو اٹھتے۔ اور سجدہ کرتے نمازیں پڑھتے رات بسر کرتے تھے

سُجَّدًا وَقِيَامًا يَتْلُونَ كِتَابَ اللهِ يُرَاوِحُونَ بَيْنَ جِبَاهِهِمْ وَخُدُودِهِمْ

یکے بعد دیگر کبھی اپنی پیشانیاں (سجدہ گاہوں پر) رکھتے اور کبھی اپنے رخسارے۔

وَيَقِفُونَ عَلَى مِثْلِ الْجَمْرِ مِنْ ذِكْرِ مَعَادِهِمْ كَأَنَّ

اور (یاد) قیامت کی (کہ) گویا انکے درمیان سے ایسے ڈرتے رہتے تھے کہ گویا (چنگاریوں ایسی (چیزیں) پر کھڑے ہیں

ہوا اور جو لوگ یقین نہیں پر رہتے وہ بچے بہکا نہ دیں۔ تو حضرت کا یہ برتاؤ آپکا صبر عظیم اور عجیب بردباری اور صحیح توفیق تھا اسی سے ہمارے (یعنی اہلسنت کے علمائے متکلمین نے قایم کی ہے کہ حضرت امیر المومنین کی سیاست پہلے درجہ کی اور آپکی تدبیر بالکل صحیح اور بے خطا تھی حضرت کی ایسی

حسن سیاست اور صحت تدبیر پر دوسروں کو مطلع کرنے کی ضرورت نہ تھی کیونکہ جس بزرگ کو ایسی ناشنوا اور پراگندہ خیالات اور مختلف طبیعت سے سابقہ ہوا ہے اسے ایسا ناتجربہ کار خود رائے۔ سرکش لشکر ملے باوجود ان مخالف اسباب کے وہ اپنے بہترین انتظام اور اعلےٰ تدبر سے سب مخالفوں پر غالب آئے۔ مخالفوں کو زیر کر دے اور انکے سرداروں کو قتل کرے اسکی حسن سیاست اور صحت تدبیر کو اور کون شخص پہونچ سکتا ہے اور کون شخص ان حالات میں پڑکر اسطرح اپنی

ماہنامہ "الکلام" سے لی گئی اصل تصویر

شرائط خریداری کتاب مستطاب نہج البلاغہ

کتاب مستطاب نہج البلاغہ کہ کتاب ہی ہندوستان میں نہیں چھپی ہے۔ مگر ایران و مصر میں بکر چھپی ہے اور وہ جن نے چھپوا ہوسکے بیچے جاتے ہیں کیونکہ عام طور پر کتب فروش اہل سنت ہیں جو اس کتاب کی اشاعت سے خوش نہیں ہوتے لہذا اس کتاب کا ملنا عام طور پر آسان نہیں ہے۔

کتاب جہان کیاب ہو وہاں ضخیم بھی ہو خفی قلم سے لکھنے پر ۵۰ جزوہ سے کم اسکا زیادہ ہی اسی وجہ سے مصری نسخوں کی قیمت مدت سے شروع میں اسکی جس قدر متداول ہیں انکی قیمت بھی نقد ۵ غد ۵ ۔ بلکہ ۵ سے کم نہیں۔

چونکہ کتاب ایسی الاجواب ہو کہ اسلام میں کوئی کتاب اسکی ہمسر نہیں جس سے خود علمائے اہلسنت نے اسکی تعریف کی تحت کلام الخالق فوق کلام المخلوق اسلئے مجموع خیال قومی ہمدردی ہمنے یہ قصد کیا کہ قوم کو اس دولت لازوال سے محروم نہ رکھنا چاہیے اور جہانتک بلد ہوسکے اسکے فوائد سے اپنی قوم کو مالا مال کرنا چاہئے جس سے ہمکو تخلق باخلاق الٰہی کا سلیقہ حاصل ہو۔ اور سیاست و سلطنت کے ندان معلوم ہوں۔ اور اوپر عمل کرنے سے حالت سابقہ ہماری عود کر آئے۔ اسی بنیاد پر ۱۳۲۱ھ میں اسکی اشاعت باجزوہ شروع ہو جلدہ کے ساتھ شروع کر دیگئی۔ مگر ترجمہ و شرح کی دقت نے اور اصلاع کی چھوٹی تقطیع نے مجبور کیا کہ اس ارادہ کو فی الحال ترک کریں جسپر لشر حضرات نے الزام بھی دیا کہ اس عنوان سے اس کتاب کی عظمت میں فرق آتا ہے جو بہت کچھ درست تھا۔ اور جو جناب مستطاب فخر العلما دام ظلہ نے بھی ناپسندیدگی اپنی ظاہر کی۔ اور فرمایا اس طریقہ سے نہ شرح ممکن ہے نہ ترجمہ درست ہو سکتا ہے لہذا چار نمبروں کے بعد موقوف کیا گیا اسے بعد جناب ممدوح نے ایک مقدمہ بھی اسپر تحریر فرمایا جو نہایت مبسوط ہے اور ترجمہ و شرح بھی لکھتے رہے۔

۱۳۲۱ سے اسکی اشاعت کی ہیئت بدل دیگئی اور یہ قرار پایا کہ اسکی اشاعت مستقل طور پر ہو اور قوم نے تقاضا و شدید شروع کیا کہ کسی طرح یہ کتاب ملے کیونکہ جو چند صفحے شائع ہوئے تھے اوسکے ذائقہ نے انکو بیچین کر دیا تھا لہذا یہ تجویز مناسب سمجھی گئی کہ عمدہ کاغذ پر اسکی تقطیع ۲۹×۲۲ سے کم نہ ہو۔ یہ کتاب اس شان سے چھپے کہ اسکی جلالت ظاہری بھی باقی رہے۔ اور اصل مقصد نہ فوت ہو۔

اس وقت یہ حقیقت تھی کہ اگر ایک دفعہ پوری کتاب شائع ہو تو چار ہزار روپیہ سے کم صرف ہوگا اور اسکی مدت دراز لگیگی جسکا انتظار قوم کو از حد شاق ہو یہ وجہ ہے کہ شروع موجودہ کا اقتباس بھی ہوا اور بہت سی جدید تحقیقات جس سے کہ حجم اسکا ۵۰ جزوہ سے زیادہ ہوگا لہذا یہ تجو پائی کہ سالانہ چندہ اسکا مقرر کیا جائے اور سال بھر میں ۱۲ جزو دیا جائے جس سے ہمکو بھی سہولت ہوگی اور ناظرین شائقین کو بھی آسان ہو اسی بنیاد پر بدیعہ اصلاح اسکا اشتہار بھی دیا گیا اور بعض حضرات نے چندہ بھی عنایت کیا حالانکہ صرف درخواست مطلوب تھی۔ اسی اصول پر ابتدائے ۱۳۲۲ میں مقدمہ کے چھپوانے کا انتظام شروع ہوا کہ پہلی قسط میں مقدمہ دیا جائے اور دوسری قسط میں اصل کتاب اجزا مگر چونکہ بیمہ کاپی حضرت والد ماجد فخر علما و الاسلام قدس سرہ ظاہر سفر عتبات عالیات پیش آیا اسلئے انتظام اسکا معطل کر دیا گیا بعد مراجعت بالخیر پھر اسکی اشاعت شروع کیجائیگی مگر کچھ ایسے اسباب فراہم ہوئے کہ ۱۳۲۲ بھی تمام ہوا اور مقدمہ نہ شائع ہو سکا اس قدر خطوط شکایت و طلب آئے کہ میں جواب دیتے دیتے عاجز آ گیا۔

الحمد للہ کہ اوائل ماہ صفر ۱۳۲۳ میں یہ فخر مجھے حاصل ہوا کہ اسکی پہلی قسط یعنی مقدمہ کو شائع کروں اور اوسکی توفیق دامداد امید واثق ہو کہ اب سلسلہ اسکا برابر جاری رہے وھو الموفق والمعین

آئندہ خریداری (۱) سالانہ چندہ اسکا جسمیں کاغذ قسم اول کا ہوگا ۵ (۲) رسمی کاغذ کا سالانہ چندہ ۵ (۳) اینما قسم دوم ۵

مشکل قیمت قسم اول ۵ (۴) اینما قسم دوم ۵

کہ ضروری ہے کہ جتنی دقتیں ہیں اصلی وجہ انکی کمی سرمایہ ہے جس سے ہزاروں دقتیں پیش آتی ہیں اور ضد

پیش گفتار

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ جَعَلَ الۡحَمۡدَ مِفۡتَاحًا لِذِکۡرِہٖ، وَسَبَبًا لِّلۡمَزِیۡدِ مِنۡ فَضۡلِہٖ، وَدَلِیۡلًا عَلَی الۡاٰئِہٖ وَعَظَمَتِہٖ، وَالصَّلَاۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مُحَمَّدٍ عَبۡدِہٖ وَرَسُوۡلِہٖ وَسَیِّدِ عِبَادِہٖ، وَعَلٰی اٰلِہِ الَّذِیۡنَ ھُمۡ خُزَّانُ کِتَابِہٖ وَجِبَالُ دِیۡنِہٖ، اَمَّا بَعۡدُ

قرآن کریم علم الٰہی کا وہ منبع ہے جس کے بارے میں امیر المومنینؑ فرماتے ہیں: "وَ یَنَابِیۡعُ الۡعِلۡمِ وَ بُحُوۡرُہٗ "[1] "اس سے علم کے چشمے پھوٹتے اور دریا بہتے ہیں"۔ جس قلبِ مبارک پر یہ قرآن اُترا ہے اُس کی نعت گوئی میں علی علیہ السلام فرماتے ہیں: "خَازِنُ عِلۡمِکَ الۡمَخۡزُوۡنِ"[2] "وہ تیرے علم مخفی کے خزینہ دار تھے" اس منبع و ماخذ سے علم حاصل کر کے امیر المومنین علیہ السلام اُس لامتناہی خزانے کے وارث قرار پائے کہ اپنے دست مبارک سے اپنے سینہ اقدس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "ھَا اِنَّ ھَاھُنَا لَعِلۡمًا جَمًّا"[3]۔ "دیکھو! یہاں علم کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے"۔

علم کے اِس ختم نہ ہونے والے ذخیرے سے قلم یا کلام کے ذریعہ جو علمی چشمہ رواں ہوا اُس سے کچھ موتی و جواہر سمیٹ کر سید رضیؒ نے یکجا کیے اور اُس انتخاب کا نام "نہج البلاغہ" رکھا اور ان دو خوبصورت جملوں میں تعارف کرایا:

عَلَیۡہِ مَسۡحَۃٌ مِّنَ الۡعِلۡمِ الۡاِلٰھِی وَفِیۡہِ عَبۡقَۃٌ مِّنَ الۡکَلَامِ النَّبَوِیِّ[4]

اس میں علمِ الٰہی کی چمک اور کلام نبوی کی خوشبو ہے۔

اس صاحبِ علم و کمال نے ہمیشہ دعوت دی ہے کہ "سَلُوۡنِیۡ قَبۡلَ اَنۡ تَفۡقِدُوۡنِیۡ"[5] "مجھے کھو دینے سے پہلے مجھ سے

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۹۶

[2] نہج البلاغہ خطبہ ۷۰

[3] نہج البلاغہ خطبہ ۷۰

[4] دیباچہ نہج البلاغہ، ص ۸۱

[5] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۸۷

پوچھ لو"۔ جب پوچھنے اور سیکھنے والا کوئی نہ ملا تو حسرت سے فرمایا: "لَوْ اَصَبْتُ لَهٗ حَمَلَةً[1]" کاش! اس کے لینے اور اٹھانے والا کوئی مل جاتا۔

اس علمی سرمائے کو سمیٹنے کے لیے اور امیر المومنینؑ کی حسرت کو پورا کرنے کے لیے حارث ہمدانی اور صعصعہ بن صوحان جیسے علم کے پیاسے اس کی گھاٹ پر اُتر کر سیراب ہوتے اور دوسروں کو سیراب کرتے رہے۔ زمانہ گزرتا رہا اور علمِ علیؑ کا چشمہ جاری رہا اور امامؑ کا فرمان پورا ہوتا رہا۔ "يَنْحَدِرُ عَنِّي السَّيْلُ[2]" "علم و معرفت کے سیلاب میری ذات کے کوہِ بلند سے گزر کر نیچے جاتے ہیں"۔ لوگ وسعت بھر اس دریائے رواں سے ظرفِ دل بھرتے رہے۔

سید رضیؒ نے اِس کلام کو کچھ ایسی محبت اور خلوص سے جمع کیا کہ خود ۴۰۶ ہجری میں دنیا کو چھوڑ گئے مگر اِس کلام کے طفیل گھر گھر اُن کا نام ہے اور یہ امامؑ کے اس فرمان کا واضح ثبوت ہے۔ الْعُلَمَاءُ بَاقُوْنَ مَا بَقِيَ الدَّهْرُ "[3] علما رہتی دنیا تک باقی رہتے ہیں"۔

علم کی یہ شمع یونہی روشن سے روشن تر ہوتی رہی اور امامؑ کا فرمان پورا ہوتا رہا۔ "اَيُّهَا النَّاسُ! اسْتَصْبِحُوْا مِنْ شُعْلَةِ مِصْبَاحٍ وَّاعِظٍ مُّتَّعِظٍ، وَ امْتَاحُوْا مِنْ صَفْوِ عَيْنٍ قَدْ رُوِّقَتْ مِنَ الْكَدَرِ "[4] "اے لوگو! واعظ باعمل کے چراغ (ہدایت) کی لو سے اپنے چراغ روشن کر لو اور اس صاف و شفاف چشمہ سے پانی بھر لو جو (شبہات کی) آمیزشوں اور کُدورتوں سے نتھر چکا ہے۔"

اس شمع کی چمک سید جمال الدین افغانی کے ذریعہ مصر کے شہرِ علم قاہرہ تک پہنچی۔ مصر کے مفتی اعظم شیخ محمد عبدہ نے اس چراغِ علم پر ۱۳۰۲ھ میں حاشیہ لکھ کر اس چراغ سے ایک نیا چراغ روشن کیا۔ کچھ لوگوں کی آنکھیں چندھیا گئیں اور انہوں نے نہج البلاغہ کے خلاف لکھنا شروع کیا۔ مگر اسی چراغ نے کچھ لوگوں کے لیے علم کی راہیں روشن کی تو اُنہوں نے نہج البلاغہ پر مزید حاشیے لکھنے شروع کیے جن میں سے ایک مشہور حاشیہ شیخ محمد عبدہ کے شاگرد محی الدین عبدالحمید نے مصر سے ہی شائع کرایا۔

برصغیر میں بھی اس شہرت کا اثر پڑا اور نہج البلاغہ کے حق اور مخالفت میں لکھا جانے لگا۔ مخالفت میں اٹھنے والی ایک آواز خطبہ شقشقیہ کے متعلق تھی جس کے جواب میں متعدد شیعہ علما نے اس خطبہ کی شرحیں لکھیں جن میں سے ایک قدیمی دستیاب شرح

---

[1] نہج البلاغہ، حکمت ۱۴۷

[2] نہج البلاغہ خطبہ ۳

[3] نہج البلاغہ، حکمت ۱۴۷

[4] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۰۳

جناب سید علی اکبر بن سلطان العلما السید محمد بن سید دلدار علی غفران مآب کی ہے۔ ''التوضیحات التحقیقیة فی شرح الخطبة الشقشقیه '' کے نام سے ۳۱۲ صفحات پر مشتمل یہ شرح ۱۳۰۷ ہجری میں مکمل ہوئی۔ اس شرح پر کافی کام انجام پا چکا ہے اور مرکز افکار اسلامی کی طرف سے انشاء اللہ جلد شائع ہوگی۔

برصغیر میں نہج البلاغہ پر انجام پانے والا ایک عظیم کام اب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ کام ہندوستان کے شہر کھجوہ ضلع سارن میں ۱۲۷۷ھ/ ۱۸۶۳ء میں ایک علمی گھرانے میں آنکھ کھولنے والے سید علی اظہر کا ہے۔ ظہیر العلما فخر الحکما مولانا سید علی اظہر جنہیں مولانا سید مرتضی حسین فاضل لکھنوی نے مطلع انوار میں "مجاہد بالقلم" لکھا ہے[1]۔ آپ نے "نہج البلاغہ" کے پیغام کو عام کرنے کے لیے بہت جہاد کیا۔ آپ کا نہج البلاغہ کا ۷۷ صفحات کا مبسوط مقدمہ ہے۔ اس مقدمہ کے صفحہ نمبر ۱۱ پر ایک عنوان قائم کیا۔ اصل سبب تالیف میں آپ نے ہندو سے مسلمان ہو کر اہل سنت کے عالم بننے والے ایک فرد سے "علیؑ کی سچی پیشین گوئیاں" پر گفتگو کا ذکر کیا۔ اس واقعہ کے بعد لکھتے ہیں: "یہ ارادہ میرے دل میں موجزن ہوا کہ کسی طرح اس کنزِ مخفی (نہج البلاغہ) کو عالمِ شہود میں لاؤں اور اپنی قوم کو اس دولت لازوال سے فائدہ پہنچاؤں"۔

اس مقصد کی تکمیل کے لیے نہج البلاغہ کا اردو میں ترجمہ وشرح لکھنا شروع کیا اور اس کے لیے کن مشکل راہوں کو طے کرنا پڑا اور آپ اور آپ کے فرزند سید علی حیدر کس عشق سے اِس کے لیے کوشاں رہے، یہ ایک طویل داستان ہے۔

ہندوستان کے شہر پٹنہ میں جہاں اس اہل سنت عالم سے علیؑ کی پیشین گوئیوں پر بات ہوئی اور نہج البلاغہ کے ترجمہ وشرح کا ارادہ کیا وہیں سے جنوری ۱۸۹۸ء بمطابق شعبان ۱۳۱۵ھ کو ایک رسالہ بنام "اصلاح" کا اجرا کیا۔ کچھ وقت کے بعد پٹنہ کو چھوڑ کر اپنے آبائی وطن "کھجوہ" آنا پڑا، بہرحال ماہنامہ اصلاح بھی جاری رہا۔ ماہنامہ "اصلاح" کی پانچویں جلد کے پہلے چار شماروں میں نہج البلاغہ کا ترجمہ اور شرح شائع کرنا شروع کی۔ یہ تقریباً ۱۹۰۱ء یا ۱۹۰۲ء کا زمانہ ہوگا۔ چار شماروں کے بعد اصلاح میں نہج البلاغہ کے ترجمہ وشرح کی اشاعت روک دی گئی جس کا تذکرہ اصلاح کے بعد والے ایک شمارے میں آپ کے فرزند "سید علی حیدر" نے اس اشتہار میں کیا "شرائط خریدانِ کتاب مستطاب نہج البلاغہ"۔ یہ اشتہار اصلاح کے کس شمارے میں شائع ہوا، معلوم نہ ہوسکا۔ یہاں مکمل اشتہار اس کتاب کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔

جس مقدمہ کا اشتہار میں ذکر کیا گیا ہے وہ مقدمہ ۲۹ محرم ۱۳۲۳ھ کو مکمل ہوا۔ ۷۷ صفحات پر مشتمل یہ مبسوط مقدمہ الگ شائع ہوا جو اس کتاب کے شروع میں درج ہے اور اس کے ٹائٹل کا عکس اس کتاب کے میں شاملِ اشاعت کیا گیا۔ اس مقدمے کے دو صفحات ۷۰ اور ۷۱ بڑی کوشش کے باوجود نہ مل سکے۔

---

[1] مطلع انوار ص ۳۵۴

اصلاح کے بعد کے شماروں میں نہج البلاغہ کی اشاعت کا تذکرہ تو ہوا مگر معذرت بھی کی جاتی رہی کہ نہج البلاغہ شائع نہ ہوسکی۔ اصلاح جلد ۶ ،نمبر محرّم ۱۳۲۱ھ میں نہج البلاغہ کی اشاعت کا تذکرہ ہے۔ جلد ۶ نمبر ۲ میں کچھ خطوط شامل کیے گئے جن میں اصلاح کے مضامین کی تعریف کی گئی اور لکھا گیا "ترجمہ نہج البلاغہ اپنے طرز پر بہت ہی لاجواب تحریریں ہیں"۔ صفحہ نمبر ۲ پر معذرت کے عنوان سے لکھا "نہ نہج البلاغہ کی کوئی کاپی تیار ہوسکی حالانکہ مسودہ صاف ہو چکا ہے، تصحیح باقی ہے"۔ یہ اصلاح کے ابتدائی سالوں کے یعنی تقریباً ۱۹۰۱ء یا ۱۹۰۲ء کی تحریریں ہیں۔ اصلاح کی ۲۹۳ پرانی کاپیاں ریختہ ویب سائٹ پر موجود ہیں۔ افسوس کہ ریختہ پر بھی جلد پانچ کا کوئی شمارہ موجود نہیں ہے جس سے نہج البلاغہ کے ابتدائی حصہ کو دیکھا جاسکتا۔

سید علی اظہر طاب ثراہ نے "اصلاح" کے ساتھ ایک اور رسالہ "الشّمس" بھی جاری کیا تھا جس کے ایڈیٹر آپ کے فرزند سید محمد حیدر تھے۔

اس مجاہد عالم، مصنف و مؤلف نے ۱۳۵۲ھ/ ۱۹۲۳ھ میں کھجوہ میں رحلت فرمائی۔ آپ نے درج ذیل کتب علمی میراث کے طور پر چھوڑیں: مناظرۂ امجدیہ عربی، حاشیہ شرح تہذیب عربی، حاشیہ قطبی عربی، حاشیہ شرح ملا مبین عربی، حاشیہ ملا حسن عربی، حاشیہ حمد اللہ عربی، حاشیہ ملا جلال، رشحۃ الافضال علی طالبی ملا جلال، نخبۃ البیان علم معانی و بیان کی شرح، المرافحات ردّ رسالہ شاہ عبدالعزیز دہلوی، نافع الغرّاء فارسی، ذوالفقار حیدر، کنز مکتوم فی حل فی عقدام کلثوم، تشفی اہل السنۃ والخوارج، تبصرۃ المسائل، دفع الوثوق عن نکاح الفاروق، آلال والاصحاب، تنقید بخاری 5 جلد، رو ملاحدہ دو جلد، کشف الظلمات بجواب آیات بینات 4 جلد، رسالہ وضو، تاریخ الاذان، تصحیح تاریخ، رسالہ الجمرہ، رسالہ تہذیب و عقل اہل سنت[1]۔

سید علی حیدر طاب ثراہ

فخر الحکما سید علی اظہر کے ہاں ۱۳۰۳ھ/ ۱۸۸۵ء میں بیٹے کی ولادت ہوئی۔ علی حیدر نام رکھا۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ ۱۳۲۵ھ/ ۱۹۰۷ء کو آپ کے والد تعلیم کے لیے آپ کو لکھنؤ لائے۔ تین سال کے بعد ۱۳۲۸ھ کو لاہور میں اورنٹیل کالج میں داخلہ لیا اور ۱۳۳۰ھ/ ۱۹۱۲ء کو مولوی فاضل کے امتحان میں پنجاب یونیورسٹی سے فرسٹ پوزیشن حاصل کی۔ اس کامیابی نے علمی حلقوں میں آپ کی دھاک بٹھادی۔ واپس لکھنؤ آکر مدرسہ سلطان المدارس میں جناب باقر العلوم سید باقر صاحب کی سرپرستی میں تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ ۱۳۳۶ میں صدر الفاضل کے امتحانات میں نمایاں کامیابی حاصل کی اور فارغ ہوکر وطن کھجوہ آکر والد کی تصنیفات و تالیفات اور دو رسالوں "اصلاح" اور "الشمس" کے کاموں میں ہاتھ بٹانے لگے۔

---

[1] بے بہا: ۲۵۹، رسالہ الحافظ لاہور

مختصر مدت کے بعد جناب باقر العلوم نے لکھنؤ طلب فرمایا اور سلطان المدارس میں مدرس نامزد ہوئے۔ ۱۳۴۰ھ میں آپ لکھنؤ کے اس قیام کے دوران نہج البلاغہ کے ترجمہ وشرح کی قسط وار اشاعت کے لیے ایک خصوصی رسالے "الکلام" کا اجرا کیا۔ ۱۳۴۴ھ/ ۱۹۲۸ء تک آپ مدرسہ میں مدرس رہے اور ساتھ ہی "الکلام"، جس میں ترجمہ نہج البلاغہ، ترجمہ احقاق الحق اور ترجمہ عروۃ الوثقیٰ سلسلہ وار شائع ہوتا رہا۔

۱۳۴۴ھ میں اپنے بھائی محمد حیدر کی علالت اور والد گرامی کی پریشانیوں کی وجہ سے لکھنؤ سے کھجوہ واپس آ گئے۔ آپ نے لکھنؤ چھوڑا تو "الکلام" کی اشاعت کا سلسلہ بھی رک گیا اور "الکلام" کی اشاعت ختم ہوئی تو نہج البلاغہ کی اشاعت بھی آگے نہ بڑھ سکی۔ کھجوہ میں آپ نے اصلاح کو ادارہ بنا دیا۔ متعدد کتب تصنیف وتالیف فرمائیں اور ایک طویل مدت دین کی خدمت کے بعد ۱۶ رمضان ۱۳۸۰ھ/ ۱۹۶۱ء کو داعی اجل کو لبیک کہا۔

ریختہ کی ویب سائٹ پر "الکلام" کے کچھ شمارے دستیاب ہیں۔ اُن کا ایک ایک صفحہ دیکھا۔ دستیاب شماروں میں نہج البلاغہ کے خطبہ نمبر ۳۵ سے ترجمہ وحاشیہ شروع ہوتا ہے۔ اور آخری دستیاب شمارے میں خطبہ ۱۰۷ کے کچھ حصہ کا ترجمہ وحاشیہ موجود ہے۔ خطبہ ۱۰۷ بھی مکمل نہیں ہے۔ "الکلام" کے دستیاب شماروں میں بھی کبھی نہج البلاغہ شائع ہو سکا کبھی نہیں۔ کبھی مالی مشکلات کا سامنا رہا اور کبھی کاتب کی عدم دستیابی۔ جلد ۶ نمبر ۷ میں نہج البلاغہ شائع نہ ہو سکی۔ اس نمبر میں ایک "مہربان" کے عنوان سے ایک خط کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں: "نہج البلاغہ کے ۳۶۰ صفحات شائع ہو چکے ہیں مگر جنوری ۱۹۲۷ء کو کاتب کو مسودہ بھیجا مگر ۲۸ اکتوبر ۱۹۲۷ء تک کاپیاں نہ آئیں"۔ افسوس یہ "الکلام" کا آخری شمارہ ہے اور نہج البلاغہ کے وہی ۳۶۰ صفحات شائع ہو سکے۔ سید علی حیدر ۱۹۲۸ء میں وطن واپس آ گئے اور نہج البلاغہ کے ترجمہ کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا اور یہ حسرت مکمل نہ ہو سکی۔

''الکلام'' کا پہلا شمارہ کب شائع ہوا۔ وہ شمارے دستیاب نہ ہو سکے البتہ الکلام جلد ۴ نمبر 1 رجب ۱۳۳۸ ہجری کے شمارے میں خطبہ ۳۵ صفحہ ۱۲۹ سے ۱۴۴ ملا اور صفحہ ۳۶۰ پر خطبہ ۱۰۷ ختم ہوا۔ ان شماروں میں سے درمیان کے تین صفحات، صفحہ نمبر ۲۵۰، ۲۵۱ اور صفحہ ۳۴۵ نہ مل سکے۔ یہ خالی صفحات مفتی جعفر حسین کے ترجمہ کے ذریعہ مکمل کیے گئے اور وہاں وضاحت کر دی گئی ہے۔

نہج البلاغہ کے ابتدائی ۱۲۸ صفحات الکلام سے تو نہ مل سکے مگر خوش قسمتی سے لکھنؤ کے ایک مشہور ادارے "احباب پبلشرز" کے مالک محترم سید انصار حسین رضوی (ماہلی) نے ۱۱ اپریل ۱۹۷۰ء کو نہج البلاغہ کے اِس ترجمہ کے پہلے ستر خطبات شائع کیے اور باقی انہیں دستیاب نہ ہو سکے۔ انہوں نے باقی خطبات مفتی جعفر حسین صاحب کے ترجمہ سے، خطوط کا حصہ

جناب عبدالرزاق ملیح آبادی کے ترجمہ سے اور کلمات قصار کا حصہ جناب مولانا سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی کے ترجمہ سے مکمل کیا۔ یوں "الکلام" سے نہ ملنے والے پہلے چونتیس خطبات کے لیے ماہلی صاحب کی کاوش سے استفادہ کیا گیا۔

ماہلی صاحب نے ان ۷۰ خطبات کی اشاعت میں کہیں "الکلام" رسالے کا ذکر تو نہیں کیا مگر خطبہ پینتیس سے الکلام سے ملنے والے خطبات کو جب ہم نے ماہلی صاحب کے نسخے سے مطابقت کی تو یہ سو فیصد وہی الکلام والے نسخے کے مطابق ہیں، گویا ماہلی صاحب نے بھی ابتدائی خطبات الکلام سے ہی حاصل کیے۔

مرکز افکار اسلامی کو یہ سعادت حاصل ہوئی کہ طویل مدت کی تلاش کے بعد یہ ۱۰۷ خطبات الگ شائع کر رہا ہے۔ البتہ درمیان میں سے جو تین صفحات میسر نہ آئے اُن کی تلاش کے لیے ماہلی صاحب مرحوم کے فرزند محترم سید محمد جعفر رضوی ماہلی صاحب سے بھی بات ہوئی ہے اور اصلاح کے مرکز سے بھی رابطہ کیا اور ہندوستان و پاکستان میں جہاں سے توقع تھی تلاش کی مگر ابھی تک وہ تین صفحات میّسر نہ ہو سکے۔ کہیں کسی کو مل جائیں تو مرکز افکار اسلامی کو ای میل پر ضرور مطلع فرمائیں۔

اس ترجمہ کے مفصل حواشی میں سے اکثر کے آخر میں یہ درج ہے کہ "مزید ضمیمہ میں پیش کیا جائے گا" مگر ترجمہ ہی مکمل نہ ہو سکا تو ضمیمہ کی نوبت ہی نہ آئی البتہ خطبہ شقشقیہ کے ۳۲ صفحات کا مفصل ضمیمہ اور تقریباً پچاس صفحات کا دیباچہ جس میں سید رضیؒ کے دیباچے پر حاشیہ لکھا گیا اِن کا "الکلام" کے اکثر شماروں میں تذکرہ کیا گیا اور یہ دونوں اب اس اشاعت میں شامل ہیں۔

ترجمے کے بارے میں خصوصی نوٹ

سید علی اظہر طاب ثراہ کے ستر صفحات کے مقدمے، "اصلاح" رسالے کے شماروں اور الکلام کے مفصل بیان سے ہم نے جو نتیجہ اخذ کیا وہ وہی ہے جو "الذریعہ الی تصانیف الشیعہ" میں علامہ شیخ بزرگ طہرانی نے درج فرمایا:

> تَرْجَمَهُ نَهْجِ الْبَلَاغَةِ اِلَى الْاُرْدُوِيَّةِ لِلسَّيِّدِ عَلِيٍّ اَظْهَرَ كَهْجَوِيٍّ الْهِنْدِيِّ الْمُتَوَفّٰى ۱۳۵۲هـ وَلَهُ تَرْجَمَهُ اِحْقَاقِ الْحَقِّ وَاِرْسَالِ الْيَدَيْنِ وَغَيْرِهِمَا. كَتَبَ التَّرْجَمَةَ بَيْنَ السُّطُورِ، وَكَتَبَ تَحْقِيقَاتٍ فِي الْهَامِشِ وَهُوَ مَطْبُوعٌ.[1]
>
> نہج البلاغہ کا اردو زبان میں ترجمہ سید علی اظہر کھجوی ہندوستانی کا ہے۔ جن کا انتقال ۱۳۵۲ھ میں ہوا۔ انہوں نے احقاق الحق، ارسال الیدین اور دیگر کتب کا بھی ترجمہ کیا ہے۔ انہوں نے یہ ترجمہ اصل متن کی سطروں کے درمیان تحریر کیا ہے اور حاشیے میں تحقیقی مطالب بھی درج کیے ہیں۔ یہ ترجمہ مطبوعہ شکل

---

[1] الذریعہ ج4 ص144

میں موجود ہے۔

خلاصہ یہ کہ نہج البلاغہ کا اردو کا یہ ترجمہ سید علی اظہرؒ کا ہے۔

مقدّمہ کے آخری حصہ کو دیکھا جائے اور "اصلاح" کے اشتہار کو دیکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ سید علی اظہر ترجمہ و حاشیہ مکمل کر چکے تھے اور مقدمہ ترجمہ کے مکمل ہونے کے بعد لکھا گیا۔ آپ کے فرزند سید علی حیدر مترجم نہج البلاغہ نہیں ہیں بلکہ والد کے ترجمہ کی اشاعت کے لیے کوشاں رہے۔ نہج البلاغہ سے متعلق انجام پائی جانے والی خدمات اور کتب و رسائل کو تفصیل سے اکٹھا کر کے کتاب تالیف فرمانے والے محقق ڈاکٹر مولانا سید شہوار حسین نقوی صاحب امروہوی کے ساتھ مسلسل گفتگو ہوئی اُن کا بھی یہی نظریہ ہے اور اُنہوں نے اپنی کتاب "شارحین نہج البلاغہ برصغیر" میں بھی یہی لکھا ہے کہ "یہ ترجمہ سید علی اظہر کا ہے سید علی حیدر کا نہیں"۔

ہم اپنی ایک اور دلیل پر اکتفا کرتے ہیں۔

سید علی اظہر مقدمہ کے آخر میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''ہم مختصر طور پر کچھ اس ترجمہ کے عنوان کو بیان کرتے ہیں۔ ہم نے اس ترجمہ میں ایسی راہ اختیار کی جو دونوں طریقوں کے وسط میں واقع ہے۔ لفظی ترجمہ کے ساتھ ادائے مطلب، سہولتِ افہام و تفہیم کو بھی پورے طور پر ملحوظ رکھا تا کہ فصاحت و بلاغت و جزالتِ بیان کے ساتھ نفس مطلب بھی بخوبی ذہن نشین ہو۔ ہم کو اس ترجمہ میں نہایت دقت اُٹھانی پڑی اور اس میں وہ جان کھپی ہوئی کہ کسی بڑی بڑی تصنیف و تالیف میں بھی اس کا مقابلہ نہ کرنا پڑا۔ اس ترجمہ کے ساتھ ہی ایک شرح بھی لکھنی پڑی جو بطور حاشیہ ہے۔ کیونکہ شرح میں متن کی کل عبارتوں کی تشریح کی جاتی ہے اور یہاں صرف اُن مطالب سے بحث کو تعلق ہے جو کسی اہم مسئلہ حکمت سے متعلق ہے۔ اب ہمارا ارادہ ہے کہ حضرت کے کلاموں کا ایک دوسرا مجموعہ مرتب کریں جس میں حضرت کے وہ خطبات ہوں گے جو اس کتاب میں نہیں ہیں"۔

سید علی حیدر جلد ۶ نمبر ے میں لکھتے ہیں کہ:

> ۳۶۰ صفحات شائع ہو چکے ہیں اور اگر آئندہ ہر شمارے میں ۴۰ صفحات شائع ہوئے تو رجب ۱۳۴۶ھ تک نہج البلاغہ شائع ہو جائے گا۔

الکلام کی یہ تحریر واضح کرتی ہے کہ ترجمہ مکمل ہو چکا تھا، اشاعت جاری تھی۔ سید علی اظہر و سید علی حیدر کی اِن سب تحریروں سے جہاں یہ واضح ہوا کہ ترجمہ سید علی اظہر کا ہے سید علی حیدر کا نہیں، وہیں یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ ایک سو سات خطبات شائع ہوئے مگر باقی ترجمہ بھی کہیں ہوگا۔

دوسری جانب متعدد افراد نے اسے سید علی اظہر کے بجائے سید علی حیدر کا ترجمہ قرار دیا ہے۔ اُن میں سے مولانا سید مرتضی حسین فاضل لکھنوی نے مطلع انوار میں، سید انصار حسین رضوی ماہلی نے اپنے مرتّبہ ترجمہ میں اور سید علی حیدر کے فرزند مولانا سید محمد باقر نے "اصلاح" میں اس ترجمہ کو والد کی تصنیفات میں درج کیا ہے البتہ دادا کے تذکرے میں اُن کے نہج البلاغہ کے مقدمہ کا بھی تذکرہ نہیں کیا جبکہ وہ الگ شائع بھی ہو چکا ہے۔ اسی طرح "مطلع انوار" میں بھی اس مقدمہ کا ذکر نہیں کیا گیا۔

سید علی حیدر کے فرزند مولانا سید رضی جعفر نقوی آف کراچی سے ہماری ملاقات ہوئی تو انہوں نے بھی اسے اپنے والد کا ترجمہ قرار دیا۔ مولانا سید سعید اختر رضوی کی بھی تحریر کہیں پڑھنے کا موقع ملا، وہ واضح فرماتے ہیں کہ "اس ترجمہ کی نسبت سید علی اظہر سے دینا غلط ہے، یہ اُن کے فرزند سید علی حیدر کا ترجمہ ہے"۔

ان تمام بزرگان نے کہیں سید علی حیدر کی کوئی ایسی تحریر پیش نہیں کی کہ یہ ترجمہ ان کا ہے جبکہ ہم چند شواہد پیش کر چکے ہیں۔

اس اشاعت کی خصوصیات

۱۔ مرکز افکار اسلامی اس اشاعت میں پہلی بار مکمل ۱۰۷ خطبات شائع کرا رہا ہے۔

۲۔ عربی عبارتیں مرکز افکار اسلامی کے نہج البلاغہ ترجمہ مفتی جعفر حسین سے لی گئی جن کی تصحیح بہت دقت سے ہو چکی ہے۔

۳۔ اس ترجمہ کے دو نمبروں کے علاوہ سب نمبر مفتی صاحب کے نمبر کے مطابق ہیں۔ اس لیے جو نمبر الگ ہیں وہاں مفتی صاحب والے نمبر بریکٹ میں درج کر دیے گئے ہیں۔

۴۔ خطبات کے حواشی کو متن کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔

۵۔ حواشی ہر صفحہ کے اعتبار سے لکھے گئے ہیں، خطبہ کے حساب سے نہیں لائے گئے۔

اللہ سبحانہ وتعالی ظہیر العلما وفخر الحکما سید علی اظہر و سید علی حیدر کی اس خدمت کو قبول فرمائے اور جوار امیر المومنین علیہ السلام میں مقام عطا فرمائے۔ پروردگار بزرگان کی محنت سے ہمیں مستفید ہونے کی توفیق نصیب فرمائے اور ان کی خدمتوں کی قدر جاننے کی سعادت عطا فرمائے۔

مرکز افکار اسلامی کی کوشش یہی ہے کہ نہج البلاغہ پر ہونے والی گزشتہ محنتوں کو قوم تک پہنچایا جائے۔ کوئی ایسا کام آپ کے مدنظر ہو تو ہمیں ضرور مطلع فرمائیں۔

والسلام

مقبول حسین علوی

مرکز افکار اسلامی

14 اگست 2026ء

وجعلنا لهم لسان صدق علیّ

در آمد ۱۹۳۴

مقدمه نهج البلاغه

من افادات السید السند الحبر المعتمد بحر العلوم العقلیه و النقلیه
مجمع بحار الکمالات الفرعیة و الاصلیة حافظ ثغور الاسلام
من مکائد الفجرة اللئام فی غیبة الامام ناصر شریعة جده
خیر الانام فخر الحکماء العظام ظهیر العلماء الکرام
الذی بذل نفسه فی مجاهدة من جحد و کفر
مولانا السید علی اظهر متع الله المسلمین
بدوام وجوده و زاد نظره الایمان و منه وجوده

مطبع دار الصلاح کهجوه سازان ضلع طبع گردید

مقدمہ نہج البلاغہ

از فخر الحکما مولانا سید علی اظہرؒ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ وَ الصَّلٰوۃُ وَ السَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الۡمُرۡسَلِیۡنَ وَوَصِیِّہٖ اَمِیۡرِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَ اَہۡلِ بَیۡتِہِ الطَّیِّبِیۡنَ الطَّاہِرِیۡنَ.

سبب ترجمہ نہج البلاغہ

کتاب مستطاب ''نہج البلاغہ'' کا ترجمہ اگرچہ اس لحاظ سے بھی ضروری تھا کہ اس میں ایسے ایسے مواعظ وحِکم مجتمع ہیں کہ دوسری کتاب میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ لیکن ماوراء اس کے یہ بھی محرک ہوا کہ ایک اعلیٰ درجہ کے کلام بلیغ عربی کی تاثیر ان لوگوں پر واضح کی جائے جو عربیت سے آشنا نہیں ہیں۔ اگرچہ اصلی اثر اس کلام بلاغت نظام کا انہی لوگوں پر ہوسکتا ہے جو ماہر زبان عربی ہیں، مگر چونکہ یہ کلام حد درجہ کا مؤثر واقع ہوا ہے اس لیے اس کے معانی دوسری زبان میں بھی آکر اثر انداز ہوتے ہیں۔

کلام کی اصلی غرض یہ ہے کہ متکلم اپنے وارداتِ قلبی کو الفاظ کے ذریعہ سے بخوبی ظاہر کردے اور جو بات اس کے دل میں آئی ہے سننے والوں کے سامنے اس طرح بیان کرے کہ ان کے دلوں میں اس کا نقشہ اتار دے۔ یہی سبب ہے کہ عرب میں وہی کلام زیادہ مستند مانا جاتا ہے جو خاص اَعراب یعنی بادیہ نشینوں کا کلام ہوتا ہے کہ وہ چشم دید حالات بیان کرتے ہیں اور ایسے نقشے اپنے کلام میں کھینچتے ہیں کہ واقعہ کی اصلی تصویر سامع کے پیش نظر ہوجاتی ہے، بخلاف شہریوں کے کہ ان کے کلام اکثر ایسے وارداتِ قلبی سے معرّا ہوتے ہیں اور اہل شہر کو چونکہ باریک باتوں میں زیادہ مدخلیت ہوتی ہے اس وجہ سے ان کا کلام اس طرز سے جُداگانہ ہوتا ہے۔ لیکن اگر فصاحت اہل بادیہ معانی اہل حضر کے ساتھ جمع ہوجائے تو کلام کا رتبہ نہایت اعلیٰ ہوجاتا ہے۔ لہٰذا جس پایہ کا جو شخص ہوگا اسی پایہ پر اس کا کلام بھی فائز ہوگا۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ ''کَلَامُ الْمَلِکِ مَلِکُ الْکَلَامِ'' یا ''کَلَامُ الْاِمَامِ اِمَامُ الْکَلَامِ''۔

اب یہاں ہم اپنی نظر کو وسیع کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ یہ متکلم کس پایہ کا ہے؟ آیا کوئی نظیر اس کی دنیا میں مل سکتی ہے یا

نہیں؟اس وقت خود فیصل ہوجائے گا کہ آیا ایسا کلام بھی ممکن ہے یا نہیں؟

ہم اس بحث کو طول دینا نہیں چاہتے، نہ آیات واحادیث سے کچھ کام لیا چاہتے ہیں، نہ تواریخ واقوال علماء سے جو حضرتؑ کے فضائل ومناقب میں مذکور ہیں کہ ایک شمہ بھی اس میں سے قریب قریب ناممکن کے ہے اور بعد مجلّدات کتاب مستطاب عبقات الانوار فی امامۃ الائمۃ الاطہار اس بحث میں قلم اٹھانے کی ضرورت نہیں اور نہ اس مقدمہ کے مناسب ہے۔ بلکہ ہم صرف سلسلہ عنوان زندگی سے جس میں کسی طرح کا کسی کو عذر ہی نہیں ہوسکتا دیکھا چاہتے ہیں کہ اوّلین و آخرین سے کون شخص آپؑ کے مقابلہ کے لیے منتخب ہوسکتا ہے۔ کیونکہ یہ مسلّم ہے کہ عرب میں تہذیبی دنیا کی ابتدا حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام سے ہے اور انہیں کے وقت تک تواریخِ عرب کا کچھ تفصیل وار سلسلہ پہنچتا ہے۔ اس پوری دنیا میں ہم کو کوئی شخص ایسا نہیں نظر آتا کہ بچپنا اس کا تو ایسا ہو کہ تمامی قوم (عرب) کا شہزادہ ہو کہ تمامی قبائل عرب اس کے باپ کے سامنے سربسجود ہوں اور سنِ شعور پر پہنچتے ہی ایک ایسے شخص کے حلقۂ ارادت میں آجائے جس کی مخالفت پر ساری دنیا کمربستہ ہو، حالانکہ سب اس کے ہم قوم اور ہم جد ہیں، بلکہ رعایا۔ یہ ارادت یا متابعت ایسے وقت میں ظاہر کرے جبکہ اس کا پیشوا ایک نئے دین کی بناڈالتا ہو جس سے مخالفت کرنا فطری اور لازمی امر ہو۔

اسی کا یہ نتیجہ ہوا کہ اس وقت میں بجز جناب امیر المومنین علیہ السلام کوئی ساتھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نہ تھا۔ یہاں تک کہ ایک پہاڑ کی کھو (شعب ابی طالبؑ) میں سب بند کیے گئے، آپس میں شادی بیاہ، کھانا پانی سب بند کیا گیا، صرف حضرت علی علیہ السلام ہی ایسے تھے جو راتوں کو چھپ چھپا کر وہاں سے اترتے اور یہاں بازاروں سے کچھ چیزیں کھانے پینے کی لے جاتے۔ اس کے بعد وہ زمانہ آیا کہ کچھ مسلمانوں کی تعداد بڑھی جس کے ساتھ مخالفوں کی مخالفت نے بھی ترقی کی۔ ادھر حضرت ابوطالبؑ نے بھی وفات کی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا اور سرپرست تھے، ادھر حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا نے بھی انتقال کیا جن کی وفات سے حضرتؐ کے آسائش جسمانی کا بھی خاتمہ ہوا۔ مکہ جو اصلی وطن تھا چھوڑ کر آپؐ کو طائف جانا پڑا، وہاں پر بھی مخالفت کی وبا پھیلی ہوئی تھی آخر مکہ آئے اور ہجرت مدینہ منورہ کا سامان ہوا۔

ان کل حالات میں اگر رفیق تھا یا ہمدم تو صرف علی بن ابی طالب علیہ السلام جسے ان جناب نے بضرورت نرغہ اعدا میں تن تنہا چھوڑ کر سفر مدینہ اختیار کیا کیونکہ بہت سی امانتیں تھیں، بہت سے تعلقات جو بغیر ایسے جانشین کے انجام نہیں پاسکتے۔ جب صبح ہوئی اور کفار اپنے ارادوں سے ناکامیاب رہے سب حضرت علی علیہ السلام پر جھک پڑے مگر آپؑ نے نہایت صبر واستقلال سے سب سے معقول طور پر جواب دہی کی اور کل شدائد پر تحمل کیا اور امور مفوضہ سے فارغ ہوکر اپنے آقا کی خدمت میں مدینہ پہنچے۔

یہاں آکر دوسرے مرحلے پیش آئے۔ قریشیوں کے دل کے دل بہادروں نے جنگ کی ٹھہرائی، بدر کی لڑائی سب سے پہلے پہل ہوئی جس میں حضرت علی علیہ السلام کو سینہ سپر ہونا پڑا اور اس کمسنی میں بڑے بڑے بہادروں سے مقابلہ کرنا پڑا، یہاں

تک کہ عام طور پر مان لیا گیا کہ ''لَافَتٰی اِلَّاعَلِیٌّ لَا سَیْفَ اِلَّاذُوالْفِقَارُ''۔ یہ سب بلائیں جب ذاتی کوششوں سے جناب امیر علیہ السلام کی دفع ہوئیں، میدان صاف ہوا، حضرتؑ کا سکّہ تمام عرب میں جم گیا، اسلامی پھریرا چاروں طرف لہرانے لگا، ہر شخص کی زبان پر یہی نام تھا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، علی علیہ السلام، تو زمانہ نے دوسرا تماشا دکھایا۔

آنحضرتؐ نے دنیا سے انتقال کیا، ابھی آنکھوں کے آنسو نہ تھمے تھے، شور وشیون کی آواز بھی نہ دھیمی ہوئی تھی، تجہیز و تکفین کا سامان بھی نہ ہوا تھا، لحد تک نہ کھدی تھی کہ معلوم ہوا قبر کن وغیرہ سب مجمع خلاف قانون میں پنچایتی خلیفہ بنا رہے ہیں۔ جناب امیر علیہ السلام صبر وتحمل سے سب کارروائیاں سنتے رہے اور تجہیز وتکفینِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سب پر مقدّم سمجھا۔ تیسرے روز دفن سے فراغت ہوئی کہ نئی خلافت کے ہرکارے پہنچے، چلیے خلیفۂ رسولؐ بلاتے ہیں بیعت کیجیے۔

اس کا جواب بجز اس کے کیا تھا کہ تم سب تو مدّت ہوئی ہماری بیعت کر چکے، کس استحقاق سے ہم سے طالبِ بیعت ہوتے ہو؟ جس دلیل سے تم نے انصار سے خلافت لی وہی دلیل تو ہماری بھی ہے، بلکہ بمراتب اس سے قوی ہے۔ اس کا جواب بھی تو فطری طور پر یہی ہے کہ جبر کیا جائے اور پورے تشدّد سے کام لیا جائے۔ وہی ہوا بھی۔

یہ کشش وکوشش اپنے حال پر تھی کہ قدرت نے دوسرا واقعہ دکھایا۔ جناب سیّدہ نے بھی وفات پائی جو خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیٹی تھیں اور ہزاروں بے ادبیوں پر بھی آپؑ کا ادب کیا جاتا۔ وہ سہارا بھی نہ رہا، ذاتی عافیت بھی رخصت ہوئی۔ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور سنسان مکان، نہ کوئی آتا ہے نہ جاتا ہے، نہ سلام وکلام کا کوئی روادار۔ اس بے بسی کا وہی نتیجہ ہونا چاہیے جس کو صحیح بخاری صفحہ ۶۰۹ کتاب المغازی میں لکھتے ہیں: ''وَکَانَ لِعَلِیٍّ مِنَ النَّاسِ وَجْهُ حَیَاةِ فَاطِمَةَ فَلَمَّا تُوُفِّیَتْ اسْتَنْکَرَ عَلِیٌّ وُجُوهَ النَّاسِ فَالْتَمَسَ مُصَالَحَةَ اَبِیْ بَکْرٍ''۔

سختی کا یہ زمانہ بھی گیا اور وہ شخص اب خلیفہ ہوا جو پہلی خلافت میں سب سے زیادہ کدوکاوش رکھتا۔ جس سے ہر شخص نتیجہ نکال سکتا ہے کہ اختیارات بڑھنے پر کیا کچھ نہ ہوتا، مگر جہاں اس سے اطمینان ہو گیا تھا کہ کل قوی ضعیف ہو چکے، کوئی مخالفانہ حملہ نہیں کر سکتا، وہاں اکثر فتوحات نے کچھ آسائش دے دی تھی جس سے ظلم وتعدی کی باگ ڈھیلی پڑی اور ملکی ضرورتوں نے بھی اس کا سبق دے دیا تھا کہ ایک ایسے شخص کے وجود کی ضرورت ہے جو ہر طرح سے قائم مقام رسولؐ ہو سکے۔ لہٰذا یہ زمانہ ویسا نہ تھا جو دو ڈھائی برس اس سے پہلے جناب امیر علیہ السلام پر صعوبتیں گزریں۔

انہی وجوہ سے کہ صدہا قسم کے احسان حضرتؑ نے خلیفہ پر اور خلافت پر کیے، خلیفۂ دوم مجبور ہوئے کہ آپؑ کا نام بھی اس فہرست میں داخل کریں جو مستحقین خلافت کی ترتیب دی تھی اور اس ظاہری مروّت کا قاطع ان ترکیبوں کو قرار دیا جس سے اس تیسری خلافت میں بھی حضرتؑ کو محروم رہنا پڑے۔

چونکہ اس تیسرے خلیفہ کی کوئی پالیسی مستقل نہ تھی، آخر میں شاہِ شطرنج بن گیا اور جو کچھ چاہا وزیروں نے انجام دیا جس

سے پھر جناب امیر علیہ السلام کے مصائب تیز ہوئے۔ کبھی مدینہ چھوڑنے کا حکم ہوتا ہے، کبھی تعزیر کا سامان کیا جاتا ہے، کبھی فریاد واستغاثہ کیا جاتا کہ بجز آپؑ کے کوئی مددگار نہیں، جان نہیں بچتی امداد کیجیے۔

اسی حیص بیص میں یہ بارہ برس بھی ختم ہوئے اور اب ہر شخص کو یقین ہو گیا، جب تک خلافت اپنے اصلی مرکز پر نہ آئے گی ہماری ترقی ہماری آسائش ناممکن ہے، نہ فتنہ دبے گا نہ کوئی کام چلے گا۔ سب آتے ہیں اور خوشامدیں کرتے ہیں کہ للہ امت محمدیہ پر رحم کیجیے، خلافت قبول فرمائیے۔ مگر حضرتؑ چونکہ ان طبائع سے مطلع تھے، تجربہ نے علم لدنی کے علاوہ پختہ کر دیا تھا، انکار ہی کرتے رہے کہ ہم کو اپنا مشیر و وزیر ہی رہنے دو خلیفہ نہ بناؤ۔ مگر سب سمجھتے تھے اس وقت خلیفہ بننا آسان نہیں ہے۔ سب نے مجبور کر کے حضرتؑ کو خلیفہ بنایا اور آپؑ کی حکومت قبول کر لی۔

ابھی دو چار مہینہ بلکہ دس بیس روز بھی نہ گزرے تھے کہ سب فتنے دبے، بلوائیوں نے مدینہ چھوڑا، امن وامان کی صورت قائم ہوئی کہ ان لوگوں نے بغاوت کی تیاری شروع کی جن کے استحقاقِ خلافت کو خلیفۂ دوم نے قائم کیا تھا۔ کوئی حج کا بہانہ، کوئی عمرہ کا حیلہ کر کے مکہ کی طرف روانہ ہوا، جہاں جناب امیر علیہ السلام کا ابتدائی قوی دشمن خیمہ زن تھا، یعنی حضرت عائشہ۔

اب مکہ کی پہاڑیاں ہیں اور مخالفین کے پڑاؤ۔ اتنے میں یعلیٰ بن امیّہ آ گیا جو حضرت عثمان کا آوردہ تھا اور صوبہ یمن کا حاکم، جس کے ساتھ وہ سب خزانہ بھی ہے جو بیت المال میں پہلے سے جمع تھا۔ اب مشورے کی ہانڈیاں پکنے لگیں۔ تجویز ہوئی کہ شام چلنا چاہیے جہاں بیس برس سے معاویہ بن ابوسفیان حکمراں ہے اور پورے لشکر وسامان سے مخالفتِ علی بن ابی طالبؑ کے لیے آمادہ ہے۔ مگر یہ تجویز اس وجہ سے نکمی ٹھہری کہ وہ اپنے سامنے تمہاری حکومت کو کب قبول کر سکتا ہے، **دو بادشاہ در اقلیمی نہ گنجند**، لہٰذا بصرہ کا مقام اس کام کے لیے تجویز ہوا کہ وہ مدینہ سے بھی دور ہے اور شام سے بھی، دونوں کے درمیان میں ہے، خالی جگہ ہے، قبضہ کرنا چاہیے۔

گو ہر بغاوت کا دفعیہ جائز حکمرانوں پر بنفسہ لازم ہے چاہے وہ کتنا ہی کمزور ہو، مگر یہاں اس پر یہ بھی مستزاد ہوا کہ خاص مسجد کے اندر صدہا مسلمان رات کے وقت قتل اور قید کیے گئے جن کو امان مل چکی تھی اور مطمئن کر دیئے گئے تھے کہ جب تک مدینہ سے خط نہ آئے گا کوئی کارروائی نہ ہوگی، مگر بیت المال لوٹ لیا گیا، عثمان بن حنیف صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قتل ہونے لگے مگر بخوف مخالفتِ انصار وہ زندہ چھوڑ دیے گئے، لیکن اس طور پر کہ اس بوڑھے باوقار صحابی رسولؐ کے چہرہ پر ایک بال بھی ڈاڑھی مونچھ میں نہ چھوڑا گیا۔

ان مسلمانوں کی صدائے الغیاث وفریاد نے ایسا مجبور کیا کہ جناب امیر علیہ السلام نے مدینہ چھوڑا اور بصرہ کا رخ کیا۔ حالانکہ مدینہ والوں نے آپؑ کا ساتھ نہ دیا اور سب چھوڑ کر علیحدہ ہوئے۔ قریب کوفہ پہنچے تھے، فرمان پر فرمان جاری ہوتے ہیں لشکر تیار ہو، مگر ابوموسیٰ اشعری جو حضرت عمر وعثمان کے زمانہ سے یہاں کا حاکم ہے مزاحمت کرتا ہے۔ نہ صرف بزور حکومت بلکہ وضعی

حدیثیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیان کر کے۔ جس پر حضرتؑ نے خود اپنے فرزند ارجمند جناب امام حسن علیہ السلام کو روانہ کیا اور مالک اشتر کو جنہوں نے ابوموسیٰ کو معزول کیا اور لشکر تیار ہوا۔ آہستہ آہستہ لوگ گھروں سے نکلنے لگے۔

خدا خدا کر کے یہ بغاوت فرو ہوئی، طلحہ و زبیر مارے گئے، حضرت عائشہ مدینہ بھجوائی گئیں کہ تم کو قبر نبی پر بیٹھ کر رونا چاہیے یا فتنہ و فساد کرنا کہ ادھر معاویہ نے سر اٹھایا جس کو اچھی طرح معلوم ہو چکا تھا کہ نہ حضرتؑ کے پاس خزانہ ہے اور نہ ویسا بہادر لشکر۔ کیونکہ نامی نامی افسر ابھی جنگ جمل میں میں کام آ چکے ہیں۔

یہ مخالف ایسا نہ تھا جو اس آہستگی سے سر ہوتا، کیونکہ آٹھ نو برس تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دق کر چکا تھا اور پہلی خلافت سے یہ شخص اسی غرض سے ملایا گیا اور یہ سرحدی صوبہ[1] اسی کام کے لیے علیحدہ کیا گیا تھا کہ اگر سب تدبیریں کمزور ہو جائیں اور کسی طرح سے خاندان رسالتؐ میں خلافت چلی بھی جائے تو یہ ہمارا جانشین اپنے پورے دم خم سے انتقام لینے کو تیار رہے۔ چنانچہ وہی ہوا کہ وہ شخص اس نئی اور صحیح خلافت سے مخالفت پر آمادہ ہوا ہے جس کا دل عداوتِ خاندان رسالتؐ سے موروثی طور پر مملو تھا اور بیس برس سے وہ اس کام کے لیے تیاری کر رہا ہے کہ ہم اس خلافت کو حاصل کریں۔ فوج ایسی تیار کی تھی کہ دن کو اگر افسر رات کہہ دیں تو سب اسے رات ہی مانیں۔

اور جناب امیر علیہ السلام کی یہ حالت کہ نہ ذاتی طور پر کچھ مال تھا، نہ خلافت ملنے پر بیت المال میں کچھ ملا، نہ ان صوبہ داروں نے کچھ مال پہنچایا جو سابق خلافتوں سے مخزون کیا گیا تھا، بلکہ وہی مخزون مال آپؑ کی مخالفت میں خرچ ہو رہا ہے اور لشکر وہ ہے کہ سب انہی قریشیوں کی نسل سے ہیں جن کے باپ دادا نے حضرتؑ کی تیغِ تیز سے راہِ دار البوار دیکھی اور ان کے پسماندوں نے ہمیشہ خلافت کے ادھر ادھر کرنے میں مدد دی۔ اب کس بھروسا پر حضرتؑ اس بغاوت کو فرو کریں اور غنیم سے لڑیں۔ تاہم جس قدر ممکن تھا بلکہ امکان سے زائد تھا آپؑ نے اس بغاوت کے دفعیہ میں کوشش کی کہ شیطان نے دوسرا فتنہ قائم کیا۔ مخالف کے نیزوں پر ضخیم ضخیم جلدیں قرآن کی بلند ہوئیں کہ اس کو ہم پنچ قرار دیتے ہیں جو فیصلہ کرے۔

---

[1] علامہ ابن حجر مکی رسالہ تطہیر الجناں میں ناقل ہیں: اَخْرَجَ اِبْنُ اَبِی الدُّنْیَا بِسَنَدِہٖ اَنَّ عُمَرَ قَالَ اِیَّاکُمْ وَالْفِرْقَۃُ بَعْدِیْ فَاِنْ عَلِمْتُمْ فَاعْلَمُوْا اَنَّ مُعَاوِیَۃَ بِالشَّامِ فَاِذَا وَکَّلْتُمْ اِلٰی رَاْیِکُمْ کَیْفَ یَسْتَبِیْزُھَا مِنْکُمْ۔

اس کے معنی خود ابن حجر لکھتے ہیں: فَالْمَعْنٰی اَنَّہٗ یَضُمُّھُمْ اِذَا وَقَعَتْ فِتْنَۃٌ اَوْحَبَتْ اِفْتِرَاقُ الصَّحَابَۃِ لِمَوْتِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْنَ اَنْ یَخْرُجُوْا اِلٰی مُعَاوِیَۃَ وَ یفَوِّضُوْا اِلَیْہِ اَمْرُ تِلْکَ الْفِتْنَۃِ لِعَظِیْمِ رَاْیِہٖ وَ حُسْنِ تَدْبِیْرِہٖ۔ ص ۳۸ مطبوعہ مصر۔

عمر نے کہا خبردار میرے بعد باخود ہا اختلاف نہ کرنا (جس سے جناب امیرؑ کو حصول خلافت کا موقع ملے) اور اگر ایسا کرو گے تو سمجھ رکھو کہ معاویہ شام میں ہے۔ جب تم اپنی اپنی رائے پر عمل کرو گے تو کس طرح وہ تم سے چھین لے گا۔ اس کی شرح میں لکھتے ہیں کہ حضرت عمر لوگوں کو اس پر آمادہ کر رہے ہیں کہ جب فتنہ پیدا ہو اور باخود ہا اختلاف ہو تو سب کے سب چلے جائیں معاویہ کے پاس ملک شام میں اور اس معاملہ کو اس کی سپرد کر دیں جس سے باصراحت تمام معلوم ہوا کہ معاویہ اسی غرض سے شریک خلافت کیا گیا تھا کہ کسی طرح حضرت علی علیہ السلام کو آرام نہ لینے دے۔

یہ شعبدہ اس وقت چھوڑا گیا جس وقت کی حالت خود معاویہ نے یوں بیان کی ہے کہ "میں اس میں غور کر رہا تھا کہ جناب امیر علیہ السلام کی بیعت کروں یا قتل ہونا گوارا کروں"۔ تمام لشکر میں کھل بلی پڑ گئی، چاروں طرف سے آوازیں بلند ہونے لگیں کہ بے شک پنچایت ہونا چاہیے۔ اگر حضرت علی علیہ السلام نہیں مانتے تو لاؤ ان کو خود قتل کر ڈالیں۔ ہر چند سمجھایا جاتا ہے قرآن کے خود تو گویائی نہیں، زبان نہیں کوئی سمجھ دار آدمی نہیں، یہ قرآن تو چپ کا قرآن ہے اور ہم گویا قران ہیں، جو کہتے ہیں وہ قرآن کے مطابق، جو کرتے ہیں قرآن کے مطابق۔ مگر یہ ایسا جادو نہیں چلا تھا جو کسی طرح ٹلتا۔ آخر پنچایت پر معاملہ ٹھہرا اور پنچ وہ تجویز ہوئے جو جناب امیر علیہ السلام کے دشمن تھے۔ حضرتؑ کہہ رہے ہیں، انکار کرتے ہیں مگر خود آپؑ ہی کے لشکر والے دباؤ ڈالتے ہیں کہ پنچ ہوں گے تو یہی۔ آخر حضرتؑ نے سکوت کیا اور پنچایت نامہ لکھا گیا، فریقین نے اپنے اپنے ملک کا راستہ لیا۔

یہاں دوسرا شعبدہ نکلا۔ اب وہی لوگ جو پنچایت پر زور دیتے تھے کہنے لگے "لَا حُكْمَ اِلَّا لِلّٰهِ": "خدا کے سوا اور کون حکم دے سکتا ہے"۔ اسی بنیاد پر وہ شمشیر برہنہ ہو رہے ہیں کہ کیوں حکم قرار دیا گیا، حالانکہ خود انہیں لوگوں نے یہ سب کیا تھا۔ فہمائش کی جاتی ہے مگر مانتا کون ہے۔ یہاں یہ قیل و قال ہے وہاں فیصلہ کا زمانہ آ گیا۔ بے ایمان پنچوں نے ایک ایسی مہمل کارروائی کی کہ کسی طرح قابل قبول نہ تھی۔

اب حضرتؑ تیاری کرتے ہیں کہ شام پر چڑھائی کرنی چاہیے، ادھر خوارج نے راہ روکی۔ حضرتؑ کی رائے تھی ان کو ابھی چھوڑ دینا چاہیے مگر افسران فوج کی رائے ہوئی اسی کو مقدم کرنا چاہیے۔ آخر خوارج سے جنگ کی ٹھہری۔ بارہ ہزار[1] آدمی سے مقابلہ ہوا، نو آدمی بچے، جو مختلف ملکوں میں بھاگے۔[2]

پھر شام کی تیاری ہونے لگی، فوج لیت و لعل کرتی ہے، حضرتؑ سمجھاتے ہیں، وہ بہانے کر رہے ہیں کہ ۱۹ رمضان کو ابن ملجم ملعون خارجی نے مسجد کوفہ میں حضرتؑ کے سر اقدس پر ایسی ضربت لگائی کہ ۲۱ رمضان کو آپؑ رہ گرائے فردوس بریں ہوئے۔

پس جس شخص نے ابتدائے خلقت سے اس قدر انقلابات دیکھے اور ہر انقلابات میں بذات خاص شریک رہا، بلکہ خود اسی کی ذات مقدس پر یہ سب انقلابات گزرے، کس قدر اس کا تجربہ وسیع ہوگا اور اس تجربہ بھرے کلام سے ہم یا ہماری قوم کس قدر فائدہ اٹھا سکتی ہے اور ایسے شخص کے کلام کے مقابلہ میں کس کا کلام مقابل ترجیح ٹھہر سکتا ہے۔

یہ وہ حالات ہیں جن کے بیان میں ہزار ہا جلدیں اس وقت بھی تیار اور موجود ہیں، اسی لیے اسلامی دنیا میں بلکہ مخالفین

---

[1] وَ كَانُوْا يَوْمَئِذٍ فِيْ اِثْنٰى عَشَرَ اَلْفَ رَجُلٍ اَهْلِ صِيَامٍ وَ صَلٰوةٍ اَعْنِيْ يَوْمَ النَّهَرَوَانِ۔ ملل ونحل ص ۸۶

[2] فَقَاتَلَهُمْ عَلِيٌّ بِالنَّهَرَوَانِ مُقَاتَلَةً شَدِيْدَةً فَمَا اَفْضَلَتْ مِنْهُمْ اِلَّا اَقَلُّ مِّنْ عَشَرَةٍ وَمَا قُتِلَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ اِلَّا اَقَلُّ مِّنْ عَشَرَةٍ فَانْهَزَمَ اِثْنَانِ اِلٰى عُمَّانٍ وَ اِثْنَانِ اِلٰى كِرْمَانٍ وَ اِثْنَانِ اِلٰى سَنْجِسْتَانٍ وَ اِثْنَانِ اِلَى الْجَزِيْرَةِ وَ وَاحِدٌ اِلٰى تَلِّ مُوْرُوْنٍ بِالْيَمَنِ وَ ظَهَرَتْ بَدَعُ الْخَوَارِجِ فِيْ هٰذِهِ الْمَوَاضِعِ۔ ملل ونحل ص ۱۸

اسلام کے یہاں بھی اس مقدس کلام سے کیسے کیسے دینی اور دنیوی فوائد حاصل کئے جاتے ہیں اور اس کے اصول مسلّمہ سے کیسی کیسی ترقیاں وہ پا رہے ہیں۔ مگر افسوس ہم مسلمانوں نے ایسے حکیمِ روحانی کی نہ تب قدر کی اور نہ اب قدر کرتے ہیں، جو اس خزانۂ حکمت سے ہماری تمامی قوم آج تک محروم رہی اور محروم رکھی جاتی ہے۔ کیونکہ اس کتاب کو زمانہ ہوا کہ اس کی متعدد شرحیں لکھی گئیں، حواشی اس پر تحریر ہوئے، ترجمہ کیے گئے، بیروت اور طرابلس میں چھپ بھی گئے مگر ہندوستان کے مدرسِ مدارس جو اکثر اہل سنت ہیں اس کے روادار نہیں کہ ان کے طلاب و متعلمین اس کو ایک ادب ہی کی کتاب جان کر پڑھیں، چہ جائیکہ عوام اس کے مضامین پر مطلع ہوں اور اس کے مواعظ ونصائح پر کاربند ہوں۔

حالت خطبات

یہ حالات بجائے خود اس کے لیے کافی ہیں کہ ہر شخص جو کچھ بھی عقل وفہم سے بہرہ رکھتا ہو اس لاجواب کتاب کی طرف متوجہ ہو اور بغور وفکر ایسے حکیمِ الٰہی کے کلام کا مطالعہ کرے۔ مگر اس سے بڑھ کر یہ امر ہے کہ صاحبِ کلام ابتدائے رحلتِ جناب سالت مآبؐ سے ایسی مصیبت میں مبتلا ہیں کہ کسی وقت بھی آپؑ کو آزادی سے کلام کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ کیونکہ دس روز قبل رحلت رسولؐ تو کسی کو اس کا گمان بھی نہ تھا کہ حضرتؑ یوں مجبور ہوں گے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لشکر اسامہ کی روانگی کا حکم دیا اس وقت یاروں کے تیور ایسے بدلے کہ شہر مدینہ کا رنگ ہی دوسرا ہو گیا۔ آنحضرتؐ نے جب یہ عالم دیکھا تو تحریری وصیت نامہ لکھنا چاہا کہ حجت تمام ہو، مگر اس حکم پر تو کھلم کھلا بغاوت ہو گئی۔ کوئی کہتا ''ہذیان بک رہے ہیں''، کوئی کہتا ہے کہ ''درد کی بے چینی میں یہ کلمات فرماتے ہیں: حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰہِ: ہمارے پاس تو کتاب خدا موجود ہے جو کافی ہے''۔ ایسا شور وہنگامہ قائم ہوا کہ اگر آنحضرتؐ حکمت عملی سے کام نہ لیتے اور یہ کہہ کر ان کو نہ ٹالتے ''قُوْمُوْا عَنِّیْ، لَا یَنْبَغِیْ عِنْدِیَ التَّنَازُعُ'' کہ ''یہاں سے چلے جاؤ کہ ہمارے پاس جھگڑا تکرار مناسب نہیں''، تو شاید یہ پرجوش صحابہ حضرتؐ کو اپنی موت سے بھی نہ مرنے دیتے۔

مکان اب صحبتِ اخیار سے خالی ہے، حضرتؐ کا آخری وقت ہے، امت کی طرف سے مایوسی ہو چکی، بجز اس کے کیا چارہ ہے کہ اب آنحضرتؐ اپنے پیارے داماد کو سمجھا رہے ہیں: ''فتنہ نے اندھیری رات کی طرح رخ کیا، لوگ دنیا کی طرف مائل ہیں تم آخرت کی فکر کرو''۔ اور جو باتیں ہونے والی تھیں سب کو سمجھا دیا اور جو کچھ دیون وغیرہ کے متعلق کہنا تھا سب کہہ چکے۔ اسی حالت میں روح اقدس نے عالم قدس کو پرواز کیا۔ جناب امیر علیہ السلام تجہیز وتکفین کی فکر کر رہے ہیں اور صحابہ سقیفہ سازی میں مشغول ہیں۔

اب جناب امیر المومنین علیہ السلام ہیں اور خلیفۂ اوّل اور ان کے پرجوش وزیر اعظم خلیفۂ دوم۔ صحابہ کا رخ تو حضرتؑ اسی وقت

دیکھ چکے تھے جب حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زندہ تھے، اب کیا امید کرتے۔ اگر حضرتؑ ان لوگوں سے ملتے ہیں تو کسی کو خوش نہیں پاتے، کیونکہ سب کے دل میں کھٹک ہے ان ہی کی بدولت ہم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ناراض گئے۔ نہ کوئی اچھی طرح بات کرتا ہے، نہ لطف ملاقات ہے۔ اگر پورے طور پر ان سے علیحدگی کرتے ہیں تو صدہا قسم کے رخنے اسلام میں الگ پیدا ہوتے ہیں، پھر مخالفتِ خلافت کا الزام قائم ہوکر دوسرا حکم نافذ ہوتا ہے جس سے ہمیشہ کے لیے اسلام کا خاتمہ ہوتا ہے۔ پھر یہ بھی خوف ہے کہ آج کل ان خلافتوں کی بدولت ارتداد کا طوفان پھیلا ہوا ہے جس کو چاہتے ہیں مرتد بنا کر قتل کرتے ہیں۔ ایسا نہ ہو ہم بھی اسی بلا میں جھونکے جائیں اور ناکردہ گناہ مجرم بلکہ معاذ اللہ مرتد بنائے جائیں۔

خلافتِ اوّل تک تو یہ خوف ایک منٹ کے لیے بھی نہ کم نہ ہوا، خلافت دوّم کی پالیسی اب یہ قرار پائی کہ جہاں تک ہو سکے میل موافقت سے کام لو، حضرتؑ کو صلاح مشورے میں شریک رکھو اور روز بروز انہیں کمزور کرتے جاؤ۔ مگر خلافت سوّم میں یہ راز فاش ہو چلا، کیونکہ حضرت امیر علیہ السلام نے متابعتِ سیرت شیخین سے انکار کر دیا جس سے خلیفۂ سوّم منتخب ہوئے۔

غرض بارہ برس اوّل و دوم خلافت کا اور چودہ برس تیسری خلافت کا حضرتؑ پر ایسا گزرا کہ نہ آپؑ پوری آزادی سے ان کے حق میں کچھ کہہ سکتے ہیں نہ امر حق کو ظاہر کر سکتے ہیں۔ کیونکہ صحابہ مہاجرین و انصار تو پہلے ہی سے اس سازش میں تھے اور انہیں کے اتفاق باخود ہانے یہ سب کچھ کیا اور جتنے ممالک اسلام میں فتح ہو رہے ہیں سب میں انہیں خلفاء کا نام سنا جاتا ہے جس سے ان عوام کے دلوں میں یہ لوگ بھی ارکانِ اسلام میں شمار ہو رہے ہیں اور تمامی صحابہ اس استعظام امر خلافت میں کوشاں ہیں۔

اب جو چوتھے درجہ میں حضرتؑ کو خلافت بھی ملی تو ایسے فتنہ و فساد کے ہنگام میں کہ خلیفۂ سوّم اپنی بداعمالیوں کے جہت سے قتل ہو چکے، کوئی حکومت کی قابلیت نہیں رکھتا۔ کیونکہ جتنے لوگ اس کے لیے منتخب ہو سکے تھے وہ سب قتل خلیفۂ سوم میں شریک ہیں جس سے وہ کسی طرح اس کی امید نہیں کرتے کہ بنی امیہ ان کو چین سے رہنے دیں گے۔ جناب امیر علیہ السلام ہر الزام سے پاک تھے اور ابتدائے رحلت سے آپؑ کی حقیت مسلّم تھی۔ امیدوارانِ خلافت نے بھی آپؑ ہی کو مجبور کیا اور بجز اس کے کوئی چارہ کار نہ تھا۔

خلافت قبول کرنا تھا کہ دوسرے قسم کے ہنگامے شروع ہوئے۔ کیونکہ رعایا وہی ہے جو شیخین کو بعد خدا و رسولؐ، بلکہ ان سے بھی بہتر مان رہے ہیں۔ عُمّال جتنے ہیں انہی کے آوردہ اور سب ان کے اہلِ قرابت، طرزِ عمل وہ ہے جو بالکل خدا و رسولؐ کے خلاف۔ صحابہ پہلے ہی سے حضرتؑ سے خار کھائے ہوئے ہیں۔ اب انہوں نے ہر شخص سے کہنا شروع کیا یہ تو پہلے ہی سے ان خلفاء کے مخالف رہے، اب جو کلمہ حضرتؑ کے منہ سے نکلتا ہے اس پر غور و فکر کیا جاتا ہے، جو عمل آپؑ کرتے ہیں خواہ کسی عمل کو مٹائیں یا دوسرا قائم کریں اسی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

یہ تو ابتدائے خلافت کا حال ہے، جب تین مہینے بھی نہ گزرے تھے کہ بی بی عائشہ والی کھلم کھلا بغاوت قائم ہوئی۔ وہ فرو

ہوئی تو معاویہ بن ابی سفیان پورے دم خم سے میدان صفین میں آیا۔ ان سب بغاوتوں اور مخالفتوں کی کامیابی اس میں زیادہ تھی کہ جناب امیر علیہ السلام کو تمامی خلفاء کا دشمن قائم کر دیں تا کہ ابدالآباد کے لیے اس خلافت اور اس خاندان کا خاتمہ ہو جائے جس میں پوری کامیابی بھی ہوئی۔

ایسے ہنگام میں ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ حضرتؑ کے وہ خطبے جو مہمّاتِ خلافت کے متعلق ہوتے کیسے اہم ہوتے، کیونکہ اگر پوری آزادی سے حضرتؑ اپنا خیال ظاہر کرتے ہیں تو بے جنگ و پیکار دشمن فتحیاب ہوتا ہے۔ وہ تو خود ہی حضرتؑ کو خلفاء کا عدو بیان کر رہا ہے اور اس میں اس کی کامیابی ہے۔ اگر حضرتؑ بالائے منبر یا کسی مجمع میں کچھ شائبہ اس کا بیان کریں تو سب کو مخالفت کا یقین ہو جائے اور حضرتؑ کے دشمن ہو جائیں۔ اور اگر اس کے خلاف بیان کریں تو ایسا شخص جو ہادی امّت ہو اور زِمام امّت اس کے ہاتھ میں ہو کیونکر ایسی جرأت کر سکتا ہے کہ خلاف واقع اور خلاف اپنے عقیدہ کے بیان کرے جس سے ہمیشہ کے لیے اسلام تباہ و برباد ہو۔ پھر سامعین بھی تو وہی ہیں جو حضرتؑ کو مخالف خلفاء کا سمجھ رہے ہیں۔ ایسی حالت میں بہت مشکل ہے کہ کوئی متکلم گو وہ کیسا ہی فصیح و بلیغ و حکیم نہ ہو، دونوں باگوں کو لیے ہوئے کلام کرے اور سب کو سیدھی راہ پر لے چلنے کا ارادہ کرے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرتؑ کے بعض خطبے ایسے ہیں جو ایک ہی فریق کے یہاں مقبول ہیں اور دوسرے فرقہ کے نزدیک وہ بے وجود ہیں۔ اس وجہ سے جناب سیّد رضی علیہ الرحمہ نے ہر قسم کے خطبہ کو جہاں جہاں سے ملا جمع کیا اور ہم ان شاء اللہ ہر مقام پر تفصیلی حالت بھی ان خطبوں کی بیان کر دیں گے۔

یہی مغالطہ علمائے مابعد کو بھی اکثر مواقع پر پیش آیا جو اس قسم کے خطبوں سے انہوں نے اپنے اغراض پر استدلال کیا اور کوئی خاص مطلب ثابت کرنا چاہا۔ حالانکہ بہت کچھ ناکامیاب رہے، کیونکہ جب اصل امر مخالفت یا موافقت ہر طرح سے ثابت ہے تو اگر کوئی کلام ایسا مل بھی جائے جس سے اس مخالفت کی ہوا کا زور کچھ کم ہو تو وہ چنداں قابل توجہ نہیں۔ کیونکہ نہ ہر دشمن ایسا ہے کہ کبھی اس سے کوئی بھلائی نہ ہو، نہ ہر مخالف ایسا ہے کہ کبھی وہ معرف نہ ہو۔ چنانچہ ناظرین سیر و تواریخ کو بخوبی معلوم ہے کہ اکثر مشرکین و کفار کے افعال مخصوصہ کی حضرتؐ نے تعریف کی ہے یا بہ الفاظ تعظیمی ان کو یاد کیا ہے۔ اسی طرح کفار و مشرکین نے بھی بہت سے موقع پر حضرتؐ کی مدح و ثنا کی ہے۔ حالانکہ باخود ہا کی عداوت اور کفر و اسلام کا فرق سب کو معلوم ہے۔ پھر ان جزئیات سے کلیات پر کیا اثر پڑ سکتا ہے جیسے وہاں کفر و اسلام کی بحث فارق ہے ویسا ہی یہاں نفاق و ایمان کا مرحلہ حائل ہے۔

بہر حال اس خیال سے بھی یہ کتاب لاجواب کتاب ہے کہ آپؑ نے تمامی محاسنِ اخلاق کی تعلیم فرما دی اور حکمت عملی کا پور اسبق دیا اور زمانہ کی رفتار کو اچھی طرح بتایا اور ایسے فتنہ و فساد کے زمانہ میں ایمان و اتباع حق کے وسائل کو بخوبی ظاہر کیا اور دینی و دنیوی ترقی کی راہوں کو کشادہ کر دیا۔ بہر حال جس پہلو سے اس کتاب پر نظر کی جائے ایسی عدیم المثال کتاب ہے کہ

ابتدائے خلقت عالم سے کوئی کتاب اس کی ہمسری نہیں کرسکتی، نہ کوئی متکلم اس پایہ کا گزرا ہے، نہ کسی پر یہ سوانح گزرے جو ایسا تجربہ کار اور زمانہ کے نشیب وفراز سے واقف کار ہوتا۔ چہ جائیکہ خداوند عالم نے آپؐ کو وہ فضائل ومناقب عطا فرمائے کہ بجز رسالت مآبؐ جو اصل ہیں اور کوئی آپؐ کا ہمسر وہم رتبہ نہیں۔

اصلی سبب تالیف

اس خیال سے اس کا ترجمہ تو ان مقدس علما پر لازم تھا جن کا علم وکمال اور تقدس سب سے بڑھا ہوا اور ہمارا شمار تو ان لوگوں میں ہے جو نہ نحو جانیں نہ صرف، نہ علم معانی وبیان نہ علمِ ادب، نہ ایک دم کے لیے اطمینان ہے نہ کتابیں ہیں، نہ اس کی شرحیں اور ترجمے، پھر کس اعتماد پر ہم اس کے ترجمہ کا حوصلہ کریں، ''چھوٹا منہ بڑی بات'' سب کہہ دیں گے۔ کیونکہ معمولی درجہ کی کتاب کا بھی ترجمہ نہایت مشکل ہے۔ ایک زبان سے دوسری زبان میں نقل کرنا بنفسہ اہم ہے، کیونکہ ہر زبان کے محاورات علیحدہ، ترکیبیں جداگانہ، بندشیں نرالی اور یہ کتاب تو اس درجہ کی ہے کہ بعد کلامِ الٰہی کوئی اس کا ہمسر نہیں۔ پھر ہمارا ایسا نادان کیونکر اس کا ارادہ کرتا۔

مگر اس ارادہ کا محرک دوسرا ہے اور اس کا باعث ایک ایسا امر ہے کہ بجز علام الغیوب کوئی اس کو جانتا نہیں۔ وہ یہ کہ ایک روز جب میں شہر عظیم آباد میں بغرض مطب متوکلاً علی اللہ مقیم تھا تو میرے بعض اہل تعارف نے جو ہندو سے مسلمان ہو کر اہلِ حدیث بنے اور اس مذہب میں ایسے پختہ ہوئے کہ علما میں ان کا بھی شمار ہونے لگا، اثنائے گفتگو میں جب ہر طرف سے بند ہوئے، کیونکہ یہ گفتگو محض دوستانہ تھی اور پتہ پتہ کی باتیں جس سے وہ خوب سمجھ رہے تھے کہ بحیثیت مناظرہ سر برنہیں ہو سکتے یہ کہا: ''ہم اس وقت تبدیل مذہب کر سکتے ہیں یعنی شیعہ ہو سکتے ہیں کہ جب سچی پیشین گوئیوں میں آپ اپنے مذہب کی کوئی ایسی کتاب دکھایئے جس کی نظیر ہمارے مذہب اہل سنت میں نہ ہو۔ کیونکہ آیتوں اور حدیثوں سے استدلال فریقین میں ہے۔ ہم آپ کے مسائل خاصہ پر ہنستے ہیں آپ ہمارے مسائل خاصہ پر، حدیثوں کی جانچ پڑتال آپ کے یہاں بھی ہے ہمارے یہاں بھی، علما ہزار ہا ہمارے یہاں بھی گزرے آپ کے یہاں بھی، علم رجال کی کتابیں ہمارے یہاں بھی ہیں آپ کے یہاں بھی، آپ کے یہاں بھی عقلا، حکما ہمارے یہاں بھی گزرے ہیں، آپ کے یہاں بھی، ''لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' پر آپ کا بھی ایمان ہے ہمارا بھی، صاحبِ شریعت نہ آپ اپنے ائمہؑ کو مانتے ہیں نہ ہم صحابہ یا خلفا کو، ہر امر میں ہم آپ برابر ہیں، لہٰذا ہم نے بھی معیار قائم کی ہے کہ جس کے یہاں پیشین گوئیوں کا ذخیرہ زیادہ ہو وہی مذہب حق ہے اور وہی قابل قبول۔ کیونکہ ہمیشہ پیشین گوئی قبل از وقوع کی جاتی ہے اور تصدیق اس کی واقعات مابعد سے ہوتی ہے۔ آپ چونکہ اس کے قائل ہیں

کہ امام آپ کے یہاں منصوص من اللہ والرسول ہوتا ہے اور ہر عیب وخطا سے معصوم، لہٰذا ان لوگوں کا کلام ضرور ایسی صفت سے موصوف ہوگا اور وہ امورِ غیبیہ کی خبر زیادہ دے گئے ہوں گے۔

میں نے اسی وقت یہ جواب دیا کہ ہم بھی اس معیار کو مانتے ہیں گو ''مِنْ حَیْثُ الشَّرْعِ'' اس کو چنداں دخل نہیں۔ مگر ہم آپ کی فرمائش کے مطابق ایک ایسی کتاب پیش کرتے ہیں جس کو آپ کے تمامی علما نے قبول کیا ہے کہ یہ کتاب نہایت قدیم ہے اور اس میں صرف مقولے جناب امیر علیہ السلام کے جمع کیے گئے ہیں۔ نام اس کا ''نہج البلاغہ'' ہے۔ دیکھیے اس میں کس قدر مغیبات کی خبر ہے اور کس طرح اس کی تصدیق ہوئی۔

یہ نام سنتے ہی چہرہ کا رنگ فق ہوگیا اور خاموش ہوگئے۔ ہر چند میں نے کوشش کی کہ اسی وقت دو چار واقعات اس کے دکھا دوں جن کی خبر حضرتؑ نے قبل از واقعہ دی ہے اور ان کے علما نے اس کا اقرار کیا ہے کہ یہ واقعہ مطابق ہے اس کلام کے جو جناب امیر علیہ السلام خبر دے گئے تھے، مگر انہوں نے ایسا ٹالا کہ کسی طرح اس پر نہ قائم رہے، تاہم صرف نواب صدیق حسن خان کے **''ابجد العلوم''** (ص ۳۸۳) کی یہ عبارت پیش کی گئی:

وَ مِنْ كَلَامِهٖ فِیْ ذٰلِكَ خَرَابُ الْبَصْرَةِ بِالرِّیْحِ بِالرَّآءِ وَالْحَآءِ الْمُهْمَلَتَیْنِ بَیْنَهُمَا اٰخَرُ الْحُرُوْفِ. قَالَ الْحَافِظُ الذَّهْبِیُّ: مَا عُلِمَ تَصْحِیْفُ هٰذِهِ الْكَلِمَةِ اِلَّا بَعْدَ الْمِائَتَیْنِ مِنَ الْهِجْرَةِ بَعْدَ خَرَابِ الْبَصْرَةِ بِالزَّنْجِ بِالزَّآءِ وَ النُّوْنِ وَ الْجِیْمِ.

مگر چونکہ یہ تقریر محض معمولی طور پر تھی انہوں نے کچھ سکوت سے، کچھ ادھر ادھر کی باتوں سے کام لے کر رخصت ہوئے، ہر چند میں کہتا رہا ان پیشین گوئیوں کو دیکھتے جایئے اور ایفائے عہد کیجیے، مگر ایک نہ سنی۔ کیونکہ وہ اپنے فہم میں سمجھے ہوئے تھے یہ ایسی فرمائش ہم کر رہے ہیں جو قریب قریب محال ہے۔ اس کتاب کا نام سنتے ہی حواس باختہ ہوئے۔ اسی وقت سے یہ ارادہ میرے دل میں موجزن ہوا کہ کسی طرح اس کنز مخفی کو عالم شہود میں لاؤں اور اپنی قوم کو اس دولت لازوال سے فائدہ پہنچاؤں، مگر عوائق وعلائق ایسے مانع رہے کہ کچھ نہ ہوسکا، یہاں تک کہ ''**رسالۃ الوضوء**'' کی بدولت مجھے پٹنہ چھوڑ نا پڑا جس پر بہت سے گمنامی خطوط اس مضمون کے آئے کہ ''**رسالۃ الوضوء**'' نے عام طور پر اہل حدیث کو متزلزل کر دیا، ہم اذیتیں پہنچائیں گے اور برسر بازار قتل کریں گے۔ لہٰذا میں نے وطن کا ارادہ کیا جہاں ان خوفوں سے امن تھا۔ الحمدللہ کہ اب وطن میں بیٹھ کر یہ خدمت انجام دے رہا ہوں۔ خدا کرے ہماری قوم اس دُرِّ نایاب سے مستفید ہو اور میرے حق میں دعائے خیر کرے۔ اَللّٰهُمَّ تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ۔

اس تمہید کے بعد اگرچہ اب اس کا موقع تھا کہ کچھ فضائل ومناقب حضرتؑ کے بیان کرتا، مگر جس شخص کے فضائل ومناقب بحر بے پایاں ہوں اس کی کوئی فضیلت کیا بیان ہوسکتی ہے۔ خصوصاً جب کتاب مستطاب ''**عبقات الانوار**'' کی مبسوط

جلدیں صرف ایک ایک حدیث میں اس ضخامت پر فائز ہوں اور تمام عالم میں شہرت پا رہی ہوں تو دوسرا کوئی کیا لکھ سکتا ہے، بس وہی کافی ہے۔ ہاں یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ حضرت مظہر العجائب ومظہر الغرائب علی بن ابی طالب علیہ السلام کی ذات بابرکات بھی عجب طرح پر مجموعہ اضداد ہے کہ کوئی شخص سمجھ نہیں سکتا۔

ایک گروہ کا تو یہ خیال ہے کہ معاذ اللہ وہ حضرتؑ خود خداوند عالم ہیں جو اس ہیکل میں ظاہر ہوئے۔

دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ نہیں خدا نے حضرتؑ کی ذات میں حلول کیا ہے جس سے یہ عجیب وغریب قدرتیں ظاہر ہوتی ہیں۔

تیسرے گروہ کا یہ خیال ہے کہ معاذ اللہ وہ حضرتؑ کافر تھے، ان (نعوذ باللہ) پر لعنت کرنی چاہیے۔

چوتھا گروہ یہ کہتا ہے کہ نہیں وہ مرد مومن تھے، چوتھے درجہ میں خلیفہ ہوئے۔

پانچواں فرقہ یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ نہ وہ خدا ہیں نہ نبی، نہ ان خلفا کے ایسے خلیفہ، بلکہ وہ امام مفترض الطاعۃ ہیں جن کی امامت منصوص من اللہ والرسول ہے اور وقت ولادت سے تا بہ زمانہ شہادت ہر خطا و گناہ سے معصوم تھے جیسا کہ انبیا علیہم السلام معصوم ہوتے ہیں۔ یہ عقیدہ صرف شیعوں کا ہے۔

اور پہلے دونوں گروہ ''نصیری'' یا ''غالی'' کہلاتے ہیں جن کا وجود اس ہندوستان میں نہیں دیکھا جاتا لیکن دیگر بلاد میں بکثرت ہیں۔ اور تیسرا گروہ ''خارجی'' کہلاتا ہے جو مسقط وزنجبار وغیرہ میں آباد ہیں۔

چوتھا فرقہ وہی ہے جو اہل سنت یا سنی کہا جاتا ہے اور ہر جگہ اس فرقہ کی افراط ہے۔ مگر خود ان میں اس مسئلہ میں اس قدر اختلاف ہے کہ آدمی سمجھ نہیں سکتا کیا حالت ہے۔ کیونکہ ان میں جو صوفی ہیں اور اکثر صوفی ہیں ان کا اعتقاد تو قریب قریب وہی ہے جو نصیری اور غلاۃ کا ہے کہ خدا کہنے میں کوئی عذر ہی نہیں۔ رہے دوسرے فرقہ والے جو متکلم کہے جاتے ہیں کہ ان کا کام صرف یہ ہے کہ شیعوں سے لڑیں۔ ان کی خواہش یہ ہے کہ کسی فضیلت میں وہ حضرتؑ خلفائے ثلاثہ سے بڑھنے نہ پائیں۔ جہاں تک ہو سکے ہمسر خلفا بنائے جائیں، بلکہ پست تر، تا کہ ترتیب فضیلت بھی ترتیب خلافت کے مطابق ہو۔

تیسرا فرقہ ان میں اہل حدیث کا ہے جو حدیثیں تو سب وہی لکھتے ہیں جن سے شیعہ استدلال کرتے ہیں اور امامت و عصمت ثابت کرتے ہیں مگر ان محدثین کے دل ان حدیثوں کے بالکل مخالف ہیں اور نہیں چاہتے کہ کوئی فضیلت حضرتؑ کی ظاہر ہو۔ مگر ایسے مجبور ہیں کہ چھپا نہیں سکتے، بجز اس کے کہ تاویل کر کے بات بنائیں۔

یہ اختلاف ان کا صرف فرقوں ہی میں نہیں تقسیم پائے ہوئے ہے بلکہ ایک شخص واحد جب تصوف کے مذاق پر لکھتا ہے تو اس کی دوسری شان ہوتی ہے اور جب علم کلام کی کتاب لکھتا ہے تو دوسرا رنگ پیدا ہوتا ہے۔ اور جب وہ حدیث کے فن میں آتا ہے تو اور ہی شان ہوتی ہے۔ یہ باتیں ایسی ہیں کہ کچھ سمجھ میں نہیں آسکتیں۔ مثال کے طور پر صرف شاہ ولی اللہ صاحب کا قول

ملاحظہ کیجئے کہ کتاب ''تفہیمات الٰہیہ'' میں لکھتے ہیں جو مذاق تصوف پر ہے:

يَا اَخِيْ اِنِّيْ ذَاكَرْتُكَ مِنَ الْوَجَاهَةِ وَاحِدًا مِنَ الْاَلْفِ اِذَا صَارَ الْعَبْدُ وَجِيْهًا جَمُلَ وَكَمُلَ فَتَكُوْنُ كُلُّ خُطْوَةٍ مِنْهُ يَخْطُوْهَا حَسَنَةً وَكُلُّ حَرَكَةٍ يَتَحَرَّكُ بِهَا حَسَنَةً، وَاِذَا دَفَعَ اللُّقْمَةَ اِلٰى فَمِهٖ كَانَتْ حَسَنَةً، وَاِذَا سَنَّتْ فَرَسُهٗ كَانَ لَهٗ بِكُلِّ خُطْوَةٍ حَسَنَةً، وَاِذَا قَامَ كَانَ انْقِلَابَاتُهٗ يُمْنَةً وَ يُسْرَةً كُلُّهَا حَسَنَاتٌ، وَيَشْكُرُ اللّٰهُ مِنْهَا مَا لَا يَشْكُرُ اَضْعَافَهٗ مِنْ غَيْرِهٖ، وَهُوَ الْمَحْبُوْبُ وَلِاَجْلِهٖ خَلَقَ مَاخَلَقَ، وَاِذَا تَمَّتِ الْعِصْمَةُ كَانَتْ اَفَاعِيْلُهٗ كُلُّهَا حَقًّا، لَا اَقُوْلُ اِنَّهَا تُطَابِقُ الْحَقَّ، بَلْ هِيَ الْحَقُّ بِعَيْنِهَا، بَلِ الْحَقُّ اَمْرٌ يَنْعَكِسُ مِنْ تِلْكَ الْاَفَاعِيْلِ كَالضَّوْءِ مِنَ الشَّمْسِ، وَاِلَيْهِ اَشَارَ رَسُوْلُ اللّٰهِ حَيْثُ دَعَى اللّٰهَ تَعَالٰى لِعَلِيٍّ: ''اَللّٰهُمَّ اَدِرِ الْحَقَّ مَعَهٗ حَيْثُ دَارَ'' وَلَمْ يَقُلْ: اَدِرْهُ حَيْثُ دَارَ الْحَقُّ.

اے بھائی! ہم نے وجاہت کے بیان میں ہزار سے ایک تم سے بیان کیا ہے۔ بندہ جس وقت وجیہ ہوتا ہے تو جمیل اور کامل ہوتا ہے، جو قدم اٹھاتا ہے یا کوئی حرکت کرتا ہے یا لقمہ اٹھا کر منہ میں ڈالتا ہے یا گھوڑا اس کا قدم رکھتا ہے ہر امر اس میں سے حسنہ ہوتا ہے۔ سونے میں جو داہنے، بائیں کروٹ لیتا ہے یہ کروٹیں بدلنا بھی حسنہ ہوتا ہے۔ قبول کرتا ہے اس سے خدا اس چیز کو کہ جس کے اضعاف اس کے غیر سے قبول نہیں کرتا۔ وہی محبوب ہے، اسی کے واسطے کل مخلوقات پیدا ہوئی اور جب عصمت تمام ہو جاتی ہے تو ہوتے ہیں تمام افعال اس کے حق۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ افعال مطابق حق ہوتے ہیں، بلکہ وہ افعال اس کے عین حق ہوتے ہیں، بلکہ حق ایک امر ہے کہ منعکس ہوتا ہے اس کے افعال سے جیسا کہ ضوء (روشنی) منعکس ہوتی ہے آفتاب سے اور اسی کی طرف اشارہ کیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جبکہ دعا کی خدا سے علیؑ کے لیے کہ ''خدایا! پھیر تو حق کو ساتھ ان کے جس طرف کہ وہ پھریں''۔ اور یہ نہ فرمایا کہ علیؑ کو پھیر جدھر حق پھرے۔

یہ ایسی تقریر ہے کہ باستثنائے غلاۃ تمامی شیعوں کا یہی عقیدہ ہے اور سر مو اس پر زیادہ یا کم کرنا ان کے مذہب کے خلاف ہے، جس سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ شاہ ولی صاحب نے واقعی تعریف لکھ دی اور یہی ان کا عقیدہ ہے۔ مگر درحقیقت ایسا نہیں ہے، کیونکہ فن کلام کی کتابوں میں جا کر شاہ صاحب دوسرا جلوہ دکھاتے ہیں، بلکہ دوسرے شخص بن جاتے ہیں۔ کیونکہ ''قرۃ

العینین بتفضیل الشیخین'' صفحہ ۱۸۳ میں لکھتے ہیں جس کے تصنیف کی یہ غرض ہے کہ شیخین کو جناب امیرؑ سے افضل قرار دیں: **بلکه غلط از حضرت مرتضیٰ علیہ السلام واقع شده و آن غلط در نفس مسئله فقه بود۔** پھر صفحہ ۱۸۳ پر لکھتے ہیں: **پس عدم ذکر غلطات حضرت مرتضیٰ علیہ السلام در کتب متداوله بجهت اختفائے علم و اختلاط در قضایای اوست، چون رواة او مستور الحال، غیر حفاظ بوده اند۔**

اب کیونکر کوئی سمجھ سکتا ہے کہ ان کی ان دونوں تقریروں میں کونسی تقریر درست ہے اور کونسی غلط اور کون سے عقیدہ کے پابند ہیں۔ کیونکہ دونوں تقریریں شخص واحد کی ہیں، لیکن حق یہ ہے کہ مَا اَضْمَرَ اَحَدٌ شَیْئًا اِلَّا ظَهَرَ فِیْ صَفَحَاتِ وَجْهِهٖ وَ فَلَتَاتِ لِسَانِهٖ: ''جو شخص کسی چیز کو اپنے دل میں چھپاتا ہے وہ اس کے چہرہ کے صفحات میں اور زبان کی بے اختیاری کلمات سے ظاہر ہو جاتی ہے''۔ چونکہ شاہ صاحب کے دل میں بہ نسبت جناب امیر المومنین علیہ السلام کے نہایت درجہ بغض بھرا ہوا ہے لہٰذا وہ ان کی زبان کے بے اختیاری کلمات سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے اہل انصاف نے صاف صاف حکم لگا دیا ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب متبع مذہب نواصب ہیں۔ چنانچہ مولوی حسن الزماں صاحب ''قولِ مستحسن'' صفحہ ۱۶۸ میں لکھتے ہیں کہ

ابن تیمیہ جناب امیر المومنین علیہ السلام کے عدم صحتِ اسلام کا قائل ہے اور ان جناب پر اور ذریّت طاہرہ پر اعتراضات سخیفہ مردودہ کرتا ہے اور اسی طریقہ ابن تیمیہ پر چلے ہیں صاحب قرہ (ولی اللہ) اور ایسے تلوّحیں کی ہیں جو قریب بتصریح ہیں اور ایسے اشارے کیے ہیں جو عبارات میں شبیہ ہیں اور ادنیٰ تغیر کیا ہے ان باتوں میں جو نواصب کہتے ہیں، ساتھ ہی اس کے ہر جگہ حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام کو وبلفظِ مرتضیٰ یاد کیا ہے۔ اور ''اِزَالَةُ الْخِفَآءِ عَنْ خِلَافَةِ الْخُلَفَآءِ'' میں تو ایسی باتیں لکھی ہیں جس سے اس کتاب کا نام ''اِزَالَةُ الْخِلَافَةِ وَالْهِدَايَةِ عَنْ خَاتَمِ الْخِلَافَةِ وَفَاتِحِ الْوِلَايَةِ'' قرار پاتا ہے۔ یعنی یہ کتاب بغرض ازالہ خلافت و ہدایت جناب امیر المومنین علیہ السلام سے کہ جو خاتم خلافت و فاتح ولایت تھے لکھی گئی ہے اور ہم جائز نہیں جانتے کہ کوئی بات ان باتوں سے نقل کریں۔ دونوں کتابیں لوگوں کے درمیان اب تک موجود ہیں۔ اس کے علاوہ اس عالم نے بہت سے اقوال شاہ ولی اللہ صاحب سے نقل کیے ہیں اور ان کی رد کی ہے اور پورے طور پر ناصبیت و خارجیت ان کی ثابت کی ہے جس کو بوجہ اختصار ہم نہیں لکھتے۔ اہلِ فہم کے لیے وہی کافی ہے جو اس رسالہ میں ان کے اقوال منقول ہوئے۔

اب ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ جس شخص کے کمالات نفسانی ایسے ہوں کہ خود ان کا عدو جانی اس کا اقرار کرے اور اس وضاحت سے، تو اس کا کلام کس پایہ عالی پر فائز ہوگا۔ چنانچہ تصدیق اس کی عنقریب ترجمہ میں ظاہر ہوگی۔

نہج البلاغہ کا کلام جناب امیر المومنین علیہ السلام مجموع ہونا

بہ اقرار علمائے اہل سنت

اس کو بھی از آثار علوی حق سمجھنا چاہیے کہ خود علمائے اہلِ سنت نے بتصریحات صریحہ اس کا اقرار کیا ہے کہ کتاب مستطاب ''نہج البلاغہ'' مجموعہ ہے جناب امیر المومنین علیہ السلام کے اس بے بہا کلام کا جس کے نسبت کہا جاتا ہے کہ کلامِ خالق کے ماتحت ہے اور کلام مخلوق کے مافوق۔ اگرچہ اس کے اثبات کی ضرورت نہ تھی کیونکہ یہ امر بہت مشہور ہے، مگر اہل سنت کا یہ خاص خاصہ ہے کہ جہاں چاہتے ہیں اقرار کرتے ہیں اور جہاں چاہتے انکار کر دیتے ہیں۔ لہٰذا تسکین عوام کے لیے ان کے معتبر علما کا اقرار یہاں بالاختصار لکھ دیا جاتا ہے جس کے بعد پھر کسی کو عذر نہ رہے۔

(۱) علامہ احمد بن منصور گازرونی ''**مفتاح الفتوح**'' میں بذیل ذکر جناب امیر علیہ السلام لکھتے ہیں:

وَمَنْ تَاَمَّلَ فِیْ کَلَامِہٖ وَ کُتُبِہٖ وَ خُطُبِہٖ وَ رِسَالَاتِہٖ عَلِمَ اَنَّ عِلْمَہٗ لَا یُوَازِیْ عِلْمَ اَحَدٍ وَّ فَضَآئِلَہٗ لَا یُشَاکِلُ فَضَآئِلَ اَحَدٍ بَعْدَ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ سَلَّمَ وَ مِنْ جُمْلَتِھَا کِتَابُ ''نَھْجِ الْبَلَاغَۃِ''، وَاَیْمُ اللّٰہِ! لَقَدْ وَقَفَ دُوْنَہٗ فَصَاحَۃُ الْفُصَحَآءِ وَ بَلَاغَۃُ الْبُلَغَآءِ وَ حِکْمَۃُ الْحُکَمَآءِ.

یعنی جو شخص بغور و تامل دیکھے حضرتؑ کے کلام کو اور آپؑ کے ناموں کو اور خطبوں کو اور پیاموں کو تو سمجھے گا کہ حضرتؑ کا علم کسی کے علم کے مقابل نہیں ہے (بلکہ سب سے بہتر ہے) اور آپؑ کے فضائل کسی کے فضائل سے مشابہ نہیں ہیں (بلکہ سب سے بالاتر ہیں) بعد جناب رسالت مآبؐ کے۔ اور منجملہ ان کے ہے کتاب ''نہج البلاغہ''۔ قسم خدا کی ٹھہر گئی اس سے پست تر فصاحت سب فصیحوں کی اور بلاغت سب بلیغوں کی اور حکمت سب حکیموں کی (کہ کوئی آپؑ کا مقابلہ نہیں کر سکتا)۔

(۲) ملا یعقوب لاہوری ''**شرح تہذیب الکلام**'' میں لکھتے ہیں:

وَمَنْ اَرَادَ مُشَاھَدَۃَ بَلَاغَتِہٖ وَ مُسَامَعَۃَ فَصَاحَتِہٖ فَلْیَنْظُرْ اِلٰی ''نَھْجِ الْبَلَاغَۃِ''. وَ لَا یَنْبَغِیْ اَنْ یُّنْسَبَ ھٰذَا الْکَلَامُ الْبَلِیْغُ اِلٰی رَجُلٍ شِیْعِیٍّ. وَمَاذُکِرَ فِیْہِ مِنْ بَعْضِ الْاَلْفَاظِ الْمُوْھِمِ بِخِلَافِ مَا عَلَیْہِ اَھْلُ السُّنَّۃِ فَعَلٰی تَقْدِیْرِ ثُبُوْتِہٖ مِنْہُ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ لَہٗ مَحَامِلُ وَ

تَاْوِيْلَاتٌ، وَ قَالَ الْبُلَغَآءُ: اَنَّ كَلَامَهٗ دُوْنَ كَلَامِ الْخَالِقِ وَ فَوقَ كَلَامِ الْمَخْلُوْقِ.

یعنی جو شخص چاہے کہ حضرتؑ کی بلاغت کا مشاہدہ کرے اور فصاحت کو حضرتؑ کی سنے تو لازم ہے کہ وہ نظر کرے کتاب ''نہج البلاغہ'' کی طرف اور کسی طرح مناسب نہیں ہے کہ ایسے کلام بلیغ کی نسبت کی جائے ایک مرد شیعی کی طرف۔ رہا یہ امر کہ کتاب ''نہج البلاغہ'' میں بعض الفاظ ایسے ہیں کہ مخالفتِ مذہب اہل سنت کا وہم اس سے پیدا ہوتا ہے تو اس کے لیے محامل وتاویلات ہیں۔ اور سب بلیغوں کا یہ مقولہ ہے کہ حضرتؑ کا ''کلام تحت کلامِ خالق وفوق کلامِ مخلوق'' ہے۔

(۳) شیخ احمد بن مصطفیٰ معروف بہ طاشکیری زادہ کتاب ''**شقائق نعمانیه فی علماء الدولة العثمانية**'' میں لکھتے ہیں: ملاحظہ ہو حاشیہ ''وفیات الاعیان''، ص ۴۶۹:

وَمِنْهُمُ الْعَالِمُ الْفَاضِلُ الْكَامِلُ الْمَوْلٰى قِوَامُ الدِّيْنِ يُوْسُفُ الْمُشْتَهَرُ بِـ''قَاضِيّ بَغْدَادَ''، وَ كَانَ مِنْ بِلَادِ الْعَجَمِ مِنْ مَدِيْنَةِ شِيْرَازٍ وَ كَانَ قَاضِيًا بِبَغْدَادَ مُدَّةً، فَلَمَّا حَدَثَتْ فِتْنَةُ ابْنِ ارْدَبِيْلَ ارْتَحَلَ اِلٰى مَارِدِيْنَ وَ سَكَنَ هُنَاكَ مُدَّةً، ثُمَّ ارْتَحَلَ اِلٰى بِلَادِ الرُّوْمِ وَ اَعْطَاهُ السُّلْطَانُ بَايَزِيْدَ خَانَ بُرَوْسَهٗ، ثُمَّ اَعْطَاهُ اِحْدَى الْمَدَارِسِ الثَّمَانِ، ثُمَّ ارْتَحَلَ اِلٰى جَوَارِ الرَّحْمٰنِ فِيْ اَوَآئِلِ سَلْطَنَةِ السُّلْطَانِ سَلِيْم خان اَدْخَلَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى دَارَ الْجِنَانِ وَ شَرَّفَهٗ بِالْكَرَامَةِ وِالرِّضْوَانِ، كَانَ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى شَرِيْفًا عَالِمًا صَالِحًا مُتَشَرِّعًا زَاهِدًا ذَا هَيْبَةٍ وَ وَقَارٍ، صَنَّفَ شَرْحًا جَامِعًا لِلْفَوَآئِدِ لِلتَّجْرِيْدِ وَ شَرْحَ نَهْجِ الْبَلَاغَةِ لِلْاِمَامِ الْهُمَامِ عَلِيِّ بْنِ اَبِيْ طَالِبٍ كَرَّمَ اللّٰهُ تَعَالٰى وَجْهَهٗ، وَصَنَّفَ كِتَابًا جَامِعًا لِمُقَدِّمَاتِ التَّفْسِيْرِ وَلَهٗ رَسَآئِلُ وَحَوَاشٍ وَغَيْرُ ذٰلِكَ اِلَّا اَنَّهَا ضَاعَتْ بَعْدَ وَفَاتِهٖ لِصِغَرِ اَوْلَادِهٖ طَيَّبَ اللّٰهُ تَعَالٰى مُهَجَعَهٗ وَ بَرَدَ مَضْجَعَهٗ۔

خلاصہ یہ ہے کہ عالم فاضل کامل قوام الدین یوسف قاضی بغداد مشہور ہیں۔ شیراز کے رہنے والے تھے جو ملک ایران کا ایک شہر ہے ایک مدت تک بغداد کے قاضی رہے۔ بعہد سلطان سلیم خاں انتقال کیا وہ شریف تھے، عالم، صالح، متشرع، زاہد، صاحب ہیبت و وقار۔ انہوں نے تجرید کی شرح لکھی ہے جو جامع فوائد ہے اور کتاب ''نہج البلاغہ'' کی شرح لکھی جو کلام امام ہمام علی ابن ابی طالب کرّم اللہ وجہہ ہے

اورایک اور کتاب لکھی ہے جو جامع مقدمات تفسیر ہے اوران کے اور بھی رسائل وحواشی وغیرہ ہیں مگر بسبب صغرسنی ان کی اولاد کے کتابیں ان کی ضائع ہوئیں۔

(۴)علامہ تفتازانی ''**شرح مقاصد**'' ص۳۰۱،جلدثانی،طبع اسلامبول میں لکھتے ہیں:

وَ اَیْضًا هُوَ اَفْصَحُهُمْ لِسَانًا عَلٰی مَا یَشْهَدُ بِهٖ کِتَابُ نَهْجِ الْبَلَاغَةِ.

یعنی جناب امیرؑ سب سے زیادہ فصیح تھے جیسا کہ شاہداس کی کتاب ''نہج البلاغہ'' ہے۔

(۵)اورعلامہ قوشجی ''**شرح تجرید**'' طبع ایران،ص۱۸۶ میں لکھتے ہیں:

وَ اَفْصَحُهُمْ لِسَانًا عَلٰی مَا یَشْهَدُ بِهٖ کِتَابُ نَهْجِ الْبَلَاغَةِ وَ قَالَ الْبُلَغَآءُ اَنَّ کَلَامَهٗ دُوْنَ کَلَامِ الْخَالِقِ وَ فَوْقَ کَلَامِ الْمَخْلُوْقِ.

یعنی جناب امیر علیہ السلام سب سے زیادہ فصیح تھے جس کی شاہد کتاب نہج البلاغہ ہے۔اور کہا ہے بلیغوں نے کہ حضرتؑ کا کلام فوق کلام مخلوق وتحت کلام خالق ہے۔

یہ آخروالی دونوں عبارتیں اس بیان میں ہے کہ شیعوں کا استدلال لکھا کہ وہ ان وجہوں سے فضیلت جناب امیر علیہ السلام کے قائل ہیں۔ان وجوہِ فضیلت میں فصاحت لسانی کوحضرتؑ کی بیان کیا-اس کی شرح میں علامہ تفتازانی وقوشجی نے لکھا کہ دلیل اس فصاحت کی یہی کتاب ''نہج البلاغہ'' ہے۔اس کے بعد شیعوں کے استدلالات کا جواب دیا ہے مگراس سے نہیں انکار کیا کہ یہ کتاب حضرتؑ کے کلام سے نہیں ہے بلکہ تسلیم کیا۔

(۶)''**وفیات الاعیان**''ابن خلکان میں ہے:

وَ قَدِ اخْتَلَفَ النَّاسُ فِیْ کِتَابِ نَهْجِ الْبَلَاغَةِ الْمَجْمُوْعَةِ مِنْ کَلَامِ عَلِیِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ علیہ السلام، هَلْ هُوَ جَمَعَهٗ اَوْ اَخُوْهُ الرَّضِیُّ ؟ وَقَدْ قِیْلَ: اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ کَلَامِ عَلِیِّ ابْنِ اَبِیْ طَالِبٍ، وَ اِنَّمَا الَّذِیْ جَمَعَهٗ وَ نَسَبَهٗ اِلَیْهِ وَهُوَ الَّذِیْ وَضَعَهٗ، وَاللّٰهُ اَعْلَمُ.

اس عبارت سے گواختلاف لوگوں کا معلوم ہوا کہ کون جامع ہے اور آیا وضعی ہے یا اصلی،مگر علامہ ابن خلکان کی رائے بھی معلوم ہوئی کہ یہ مجموعہ ہے کلام جناب امیر علیہ السلام کا۔

(۷)قریب اسی کلام کے علامہ یافعی نے ''**مرآۃ الجنان**'' میں بھی لکھا ہے۔

(۸)نواب صدیق حسن خاں ''**ابجد العلوم**'' ص۷۵۴ میں لکھتے ہیں بذیل ذکر جناب سیّد مرتضیٰ علم الہدیٰ علیہ الرحمہ:

قَدِ اخْتَلَفَ النَّاسُ فِیْ کِتَابِ نَهْجِ الْبَلَاغَةِ الْمَجْمُوْعِ مِنْ کَلَامِ الْاِمَامِ عَلِیِّ بْنِ اَبِیْ

طَالِبٍ عليه السلام، هَلْ هُوَ جَمَعَهُ اَمْ جَمَعَ اَخُوْهُ الرَّضِيُّ.

یعنی لوگوں نے اس میں اختلاف کیا ہے کہ کتاب نہج البلاغہ جو مجموعہ کلام امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام ہے اس کو سیّد مرتضٰی علیہ الرحمہ نے جمع کیا یا ان کے بھائی رضی نے۔

جس سے اس کی بخوبی تصدیق ہوئی کہ نواب صاحب اس کو مجموعہ کلام جناب امیرؑ جانتے ہیں خواہ جامع اس کے سیّد مرتضٰی علیہ الرحمہ ہوں یا سیّد رضیؒ۔ اس کے بعد یہ بھی لکھا ہے کہ جامع اس کے سیّد رضی علیہ الرحمہ ہیں اور وہی واضع ہیں مگر خود بہ لفظ قیل اس قول کو ضعیف کر دیا۔

ان عبارتوں کے دیکھنے سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ایسے ایسے مستند اور جید علماء نے باوصف علم اس کے کہ اکثر مضامین کتاب مستطاب نہج البلاغہ کے خلاف اصول مقررہ اہل سنت ہے، اس کا اقرار کیا کہ درحقیقت یہ مجموعہ ہے کلامِ جناب امیر علیہ السلام کا اور کسی طرح کا ان کو اس میں تامل نہیں۔ حالانکہ ہم آگے چل کر شرح میں ہر مقام پر بتا دیں گے کہ جن جن فقرات کی نسبت اہل سنت کو اعتراض ہے یا اس کو اپنے مقرر کردہ اصول کے خلاف سمجھتے ہیں وہ خود ان کی صحاحِ ستّہ اور دیگر کتب معتمدہ سے بخوبی ثابت ہے، پھر اس کے کلام جناب امیرؑ ہونے سے انکار کرنا کس درجہ کی ناانصافی ہے۔

چونکہ زمانہ کا رنگ بدل گیا، تقلید جامد کا پھندا ٹوٹ گیا، ظلمت ظلم و جور کم ہو رہی ہے، سفیدی صبح عدل و انصاف پھیل رہی ہے، لہٰذا اب یہ جادو چل نہیں سکتا کہ یہ کلام کسی مرد شیعی نے یا خود جناب سیّد رضی علیہ الرحمہ نے بنا کر حضرتؑ کی طرف منسوب کر دیا۔ کیونکہ حق بینی کی عینک ہم کو بتا رہی ہے کہ یہ کلام دوسری زبان سے نکل ہی نہیں سکتا، محال ہے۔ پھر کیوں اس سے انکار کیا جائے جبکہ اس کلام کے مضامین صحاحِ ستّہ و دیگر مسانید و سنن و تواریخ معتمدہ کے مرویات سے ثابت ہیں۔

(۹) چونکہ علامہ ابن ابی الحدید معتزلی نے جن کی مدح و ثنا ان شاء اللہ تعالیٰ آئندہ لکھی جائے گی اپنی شرح میں نہج البلاغۃ کی صحت کے متعلق اسی عنوان سے ایک نہایت نفیس و متین تقریر کی ہے، لہٰذا ہم اس کو بعینہ یہاں نقل کرتے ہیں۔ علامہ مذکور، ابن ابی الشحناء[1] کا ایک خطبہ نقل کر کے اس طرح لکھتے ہیں:

هٰذِهٖ اَحْسَنُ خُطْبَةٍ خَطَبَهَا هٰذَا الْكَاتِبُ، وَهِيَ كَمَا تَرَاهَا ظَاهِرَةُ التَّكَلُّفِ، بَيِّنَةُ التَّوْلِيْدِ، تَخْطُبُ عَلٰى نَفْسِهَا، وَ اِنَّمَا ذَكَرْتُ هٰذَا لِاَنَّ كَثِيْرًا مِنْ اَرْبَابِ الْهَوٰى يَقُوْلُوْنَ: اِنَّ كَثِيْرًا مِنْ ''نَهْجِ الْبَلَاغَةِ'' كَلَامٌ مُحْدَثٌ صَنَعَهُ قَوْمٌ مِنْ فُصَحَآءِ الشِّيْعَةِ، وَ رُبَّمَا عَزَوْا بَعْضَهُ اِلَى الرَّضِيِّ اَبِي الْحَسَنِ وَغَيْرِهٖ، وَهٰؤُلَآءِ قَوْمٌ اَعْمَتِ الْعَصَبِيَّةُ اَعْيُنَهُمْ، فَضَلُّوْا عَنِ النَّهْجِ الْوَاضِحِ وَ رَكِبُوْا بُنَيَّاتِ الطَّرِيْقِ ضِلَالًا وَ قِلَّةَ

[1] ابن الشحناء ایک شخص ادیب عسقلان کا رہنے والا تھا جس کا کلام متعلق بمواعظ، ابن ابی الحدید کے زمانے میں لوگ بہت پسند کرتے تھے۔

مَعْرِفَةٍ بِاَسَالِيْبِ الْكَلَامِ۔

یہ خطبہ ابن الشحناء اس کے بہترین خطبوں سے ہے لیکن جیسا کہ تم دیکھتے ہو اس خطبہ کا تکلّف ظاہر ہے اور اس کی بناوٹ کھلی ہوئی ہے۔ یہ خطبہ خود ہی اپنے عیوب کو بتا رہا ہے اور اس لیے مَیں نے اس خطبہ کو یہاں نقل کیا کہ اکثر اربابِ ہویٰ کہتے ہیں کہ نہج البلاغہ کا اکثر کلام مصنوعی ہے جسے ایک قوم نے فصحائے شیعہ سے وضع کیا ہے۔ اور کبھی اس کو منسوب کرتے ہیں ابوالحسن سیّد رضی وغیرہ کی طرف۔ حالانکہ یہ گمان کرنے والے وہ لوگ ہیں جن کی آنکھوں کو تعصّب نے اندھا کر دیا جس سے وہ گمراہ ہوئے راہِ واضح سے اور اپنی گمراہی کی وجہ سے بھٹکانے والی راہوں میں چلے اور یہ امر ان سے ظاہر ہوا بوجہ قلت معرفت کے اسلوب کلام سے۔

وَ اَنَا اُوَضِّحُ لَكَ بِكَلَامٍ مُخْتَصَرٍ مَا فِيْ هٰذَا الْخَاطِرِ مِنَ الْغَلَطِ. فَاَقُوْلُ: لَا يَخْلُوْ اِمَّا اَنْ يَّكُوْنَ كُلُّ ''نَهْجِ الْبَلَاغَةِ'' مَصْنُوْعًا مَنْحُوْلًا اَوْ بَعْضُهٗ. وَالْاَوَّلُ بَاطِلٌ بِالضَّرُوْرَةِ؛ لِاَنَّا نَعْلَمُ بِالتَّوَاتُرِ صِحَّةَ اَسْنَادِ بَعْضِهٖ اِلٰى اَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ (عَلَيْهِ السَّلَامُ)، وَقَدْ نَقَلَ الْمُحَدِّثُوْنَ كُلُّهُمْ اَوْ جُلُّهُمْ وَ الْمُؤَرِّخُوْنَ كَثِيْرًا مِنْهُ، وَلَيْسُوْا مِنَ الشِّيْعَةِ لِيُنْسَبُوْا اِلٰى غَرَضٍ فِيْ ذٰلِكَ.

اور میں ایک تقریر مختصر سی اس وہم کے اغلاط کو دفع کئے دیتا ہوں اور کہتا ہوں دو حال سے خالی نہیں یا تو کُل کتاب نہج البلاغۃ وضعی و مصنوعی ہے یا بعض حصہ اس کا وضعی ہے۔ پہلا دعویٰ تو بالبداہۃ باطل ہے، کیونکہ بعض خطبوں کے اسناد حضرتؑ کی طرف ہم کو بتواتر معلوم ہیں۔ کیونکہ کل محدثین نے یا اکثر محدثین اور سب مؤرخین نے بہت سے خطبوں کو حضرتؑ کے روایت کیا ہے۔ وہ محدثین و مؤرخین تو شیعہ نہ تھے جو کسی غرض سے اس کی نسبت حضرتؑ کی طرف کرتے (حالانکہ بہت سے خطبوں سے کوئی غرض بھی شیعوں کی نہیں حاصل ہوتی)۔

وَ الثَّانِيْ يَدُلُّ عَلٰى مَا قُلْنَاهُ؛ لِاَنَّ مَنْ قَدْ اَنِسَ بِالْكَلَامِ وَالْخِطَابَةِ، وَ شَدَا طَرَفًا مِنْ عِلْمِ الْبَيَانِ، وَ صَارَ لَهٗ ذَوْقٌ فِيْ هٰذَا الْبَابِ لَابُدَّ مِنْ اَنْ يُّفَرِّقَ بَيْنَ الْكَلَامِ الرَّكِيْكِ وَ الْفَصِيْحِ، وَبَيْنَ الْفَصِيْحِ وَالْاَفْصَحِ، وَبَيْنَ الْاَصِيْلِ وَالْمُوَلَّدِ، وَاِذَا وَقَفَ عَلٰى كُرَّاسٍ وَاحِدٍ يَتَضَمَّنُ كَلَامًا لِجَمَاعَةٍ مِنَ الْخُطَبَآءِ اَوْ لِاِثْنَيْنِ مِنْهُمْ فَقَطْ فَلَا بُدَّ اَنْ يُّفَرِّقَ بَيْنَ الْكَلَامَيْنِ، وَيُمَيِّزَ بَيْنَ الطَّرِيْقَتَيْنِ، اَلَا تَرٰى اَنَّا مَعَ مَعْرِفَتِنَا بِالشِّعْرِ وَنَقْدِهٖ لَوْ تَصَفَّحْنَا دِيْوَانَ اَبِيْ تَمَامٍ، فَوَجَدْنَاهُ قَدْ كَتَبَ فِيْ اَثْنَآئِهٖ قَصَآئِدَ وَ قَصِيْدَةً

وَاحِدَةً لِغَيْرِهٖ لَعَرَفْنَا بِالذَّوْقِ مُبَايَنَتَهَا لِشِعْرِ اَبِيْ تَمَامٍ وَنَفْسِهٖ وَطَرِيقَتِهٖ وَمَذْهَبِهٖ فِي الْقَرِيْضِ، اَ لَا تَرٰى اَنَّ الْعُلَمَآءَ بِهٰذَا الشَّاْنِ حَذَفُوْا مِن شِعْرِ اَبِيْ نُوَاسٍ شَيْئًا كَثِيْرًا لِمَا ظَهَرَ لَهُمْ اَنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَلْفَاظِهٖ وَلَا مِن شِعْرِهٖ، وَكَذٰلِكَ غَيْرُهُمَا مِنَ الشُّعَرَآءِ وَلَمْ يَعْتَمِدُوْا فِيْ ذٰلِكَ اِلَّا عَلَى الذَّوْقِ خَاصَّةً.

رہا دوسرا دعویٰ کہ بعض خطبے وضعی ہوں، پس خود یہی دعویٰ ہمارے دعویٰ (صحت کُل کلام) کی دلیل ہے کیونکہ جس کو کچھ بھی انس ہے کلام اور فن خطابت سے اور کچھ بھی علم بیان سے اس کو حصہ ملا ہے اور اس کا ذوق رکھتا ہے، ضرور وہ فرق کر لے گا درمیان کلام رکیک اور فصیح اور افصح کے اور درمیان کلام اصل ومولد کے۔ وہ اگر ایک کراس (جز) بھی ایسا دیکھے جس میں مختلف بلیغوں کا کلام ہو خواہ وہ دو ہوں یا زیادہ تو دونوں کلاموں میں فرق کر لے گا اور دونوں کے طریقوں میں تمیز کر لے گا۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ اگر ہم کو شعر کی معرفت حاصل ہے اور ہم اس کو پرکھ سکتے ہیں تو اگر کوئی شخص دیوان ابوتمام میں دو ایک قصیدے غیر کے لگا دے تو ہم اپنے ذوق کلام سے پہچان جاتے ہیں کہ یہ کلام اجنبی ہے جو اس کے انداز وطریقہ سے مماثلت نہیں رکھتا۔ کیا تم کو نہیں معلوم ہے کہ اس فن کے علماء نے ابونواس کے دیوان سے بہت سے شعروں کو نکال دیا، کیونکہ ان کے الفاظ سے سمجھ گئے تھے کہ نہ یہ کلام ابونواس ہے نہ اس کے اشعار۔ یہی حال ہے اور شعراء کا اور علمائے شعر نے صرف اپنے ذوق سلیم کی بنا پر یہ کارروائی کی، اس کے سوا اور کوئی ذریعہ نہ تھا۔

وَاَنْتَ اِذَا تَاَمَّلْتَ ''نَهْجَ الْبَلَاغَةِ'' وَجَدْتَهٗ كُلَّهٗ مَآءً وَاحِدًا وَ نَفْسًا وَاحِدًا وَ اُسْلُوْبًا وَاحِدًا كَالْجِسْمِ الْبَسِيْطِ الَّذِيْ لَيْسَ بَعْضٌ مِنْ اَبْعَاضِهٖ مُخَالِفًا لِبَاقِي الْاَبْعَاضِ فِي الْمَاهِيَةِ، وَ كَالْقُرْاٰنِ الْعَزِيْزِ اَوَّلُهٗ كَاَوْسَطِهٖ وَاَوْسَطُهٗ كَاٰخِرِهٖ، وَكُلُّ سُوْرَةٍ مِنْهُ وَكُلُّ اٰيَةٍ مُمَاثِلَةٌ فِي الْمَاْخَذِ وَالْمَذْهَبِ وَالْفَنِّ وَالطَّرِيْقِ وَالنَّظْمِ لِبَاقِي الْاٰيَاتِ وَالسُّوَرِ، وَلَوْ كَانَ بَعْضُ ''نَهْجِ الْبَلَاغَةِ'' مَنْحُوْلًا وَ بَعْضُهٗ صَحِيْحًا لَمْ يَكُنْ ذٰلِكَ كَذٰلِكَ، فَقَدْ ظَهَرَ لَكَ بِهٰذَا الْبُرْهَانِ الْوَاضِحِ ضَلَالُ مَنْ زَعَمَ اَنَّ هٰذَا الْكِتَابَ اَوْ بَعْضَهٗ مَنْحُوْلٌ اِلٰى اَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَيْهِ السَّلَامُ.

پس اگر تو تامل کرے نہج البلاغہ میں تو پائے گا اسے ایک طرح کا پانی اور ایک نفس اور ایک اسلوب،

مشابہ اس جسم بسیط[1] کے جس کے بعض اجزا مخالف باقی اجزا کے نہیں ہیں، بلکہ تُو نہج البلاغہ کو مشابہ قرآن مجید پائے گا کہ اول واوسط وآخر اس کا ایک ہے، بلکہ ہر ہر سورہ اور آیہ ماخذ ہیں مذہب میں، فن میں، طریق میں اور نظم میں مماثل ہے باقی آیات وسور کے۔ اگر نہج البلاغہ کا کچھ حصّہ وضعی ہوتا اور کچھ اصلی تو ہرگز یہ انداز نہ ہوتا۔ پس اس برہان قوی سے ظاہر ہوئی ضلالت ان لوگوں کی جو اس کا گمان کرتے ہیں کہ نہج البلاغۃ یا بعض اس کا وضعی ہے جو جناب امیر علیہ السلام کی طرف منسوب کیا گیا۔

وَاعْلَمْ اَنَّ قَآئِلَ هٰذَا الْقَوْلِ يَطْرُقُ عَلٰى نَفْسِهٖ مَا لَا قِبَلَ لَهٗ بِهٖ، لِاَنَّا مَتٰى فَتَحْنَا هٰذَاالْبَابَ وَ سَلَّطْنَا الشُّكُوْكَ عَلٰى اَنْفُسِنَا فِيْ هٰذَا النَّحْوِ، لَمْ نَثِقْ بِصِحَّةِ كَلَامٍ مَنْقُوْلٍ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ اَبَدًا، وَ سَاغَ لِطَاعِنٍ اَنْ يَطْعَنَ وَ يَقُوْلَ: هٰذَا الْخَبَرُ مَنْحُوْلٌ، وَهٰذَا الْكَلَامُ مَصْنُوْعٌ، وَكَذٰلِكَ مَا نُقِلَ عَنْ اَبِيْ بَكْرٍ وَ عُمَرَ مِنَ الْكَلَامِ وَالْخُطَبِ وَالْمَوَاعِظِ وَالْاٰدَبِ وَغَيْرِ ذٰلِكَ، وَكُلُّ اَمْرٍ جَعَلَهٗ هٰذَا الطَّاعِنُ مُسْتَنِدًا لَهٗ فِيْمَا يَرْوِيْهِ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَالْاَئِمَّةِ الرَّاشِدِيْنَ وَالصَّحَابَةِ وَالتَّابِعِيْنَ وَالشُّعَرَاءِ وَالْمُتَرَسِّلِيْنَ وَالْخُطَبَآءِ، فَلِنَاصِرِيْ اَمِيْرِالْمُؤْمِنِيْنَ (عَلَيْهِ السَّلَامُ) اَنْ يَسْتَنِدُوْا اِلٰى مِثْلِهٖ فِيْمَا يَرْوُوْنَهٗ عَنْهُ مِنْ ''نَهْجِ الْبَلَاغَةِ'' وَغَيْرِهٖ، وَهٰذَا وَاضِحٌ۔

یہ بھی سمجھ رکھو کہ جو لوگ اس قسم کے شکوک واوہام پیدا کرتے ہیں وہ خود اپنے لیے ایسا اشکال عظیم وارد کرتے ہیں جس کا کسی طرح دفعیہ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اگر یہ باب مفتوح ہو اور شکوک کو ہم اپنے دلوں میں جگہ دیں تو پھر ان کلمات وروایات پر بھی وثوق نہیں رہ سکتا جو جناب رسالت مآبؐ سے منقول ہیں، کیونکہ اس پر بھی یہ اعتراض ہو سکتا ہے اور کہہ سکتے ہیں کہ یہ کلام وضعی ہے یا یہ حدیث جعلی ہے۔ اسی طرح جو کچھ ابوبکر وعمر سے منقول ہے کلام وخطب سے، غرض جس قسم کا اعتراض یہ طاعن نہج البلاغہ کرتا ہے اور جن باتوں سے استناد کر سکتا ہے انہی باتوں سے اس کے مخالف جو ناصر امیر المومنینؑ ہیں وہ بھی

---

[1] اصطلاح علمِ طب میں جسم بسیط اُس کو کہتے ہیں جس کے اگر مختلف حصے کئے جائیں تو اُن میں کسی طرح اختلاف نہ ہو۔ جیسے ہڈی، رگ، پٹھا۔ اور مرکب وہ جسم ہے جس کے اجزا مختلف ہیں مثل گوشت یا اُنگلی کے کہ رگ، ہڈی، پٹھا، جھلی، خون وغیرہ سے مرکب ہے، بہت سے اجزا اس میں نکلتے ہیں اور یہی مطلب ہے ابن ابی الحدید کا کہ نہج البلاغہ کے فقرات مماثل جسم بسیط ہے نہ جسم مرکب ہے جو اجزاء مختلفہ سے مرکب ہوتا ہے، جس کے اعضا میں کسی طرح کا اختلاف نہیں ماہیت میں۔ لؤلف کتاب

اسناد کر سکتے ہیں نہج البلاغہ وغیرہ کے باب میں۔ وَھٰذَا وَاضِحٌ۔[1]

اس تقریر زریں سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ کتاب مستطاب نہج البلاغۃ کس درجہ اور کس پایہ کی ہے کہ اس کے اجزا میں ایسا اتصال ہے جیسا کہ ایک چشمہ کا پانی ہو عذوبت وسہولت میں یا قرآن کے ایک ایک سورہ، بلکہ ایک ایک آیہ میں اتصال ہو کہ ذرّہ برابر فرق نہ ہو۔

(۱۰) آخر میں ہم اس عبارت کو بھی لکھتے ہیں جو مصر کے فاضل اجل شیخ محمد عبدہ نے اپنی شرح میں مدح ''نہج البلاغہ'' میں لکھی ہے، جس سے معلوم ہو کہ آج تک علمائے اہل سنت کس زبان سے اس کا اقرار کرتے ہیں اور اس کی مدح وثنا میں رطب اللسان ہیں۔ پھر حیف ہے کہ بعض جہال مدعی فضل وکمال ہوں اور نہایت جہالت سے یہ دعویٰ کریں کہ ''نہج البلاغہ'' کی نسبت جناب امیر المومنین علیہ السلام کی طرف ثابت نہیں۔ فاضل مذکور لکھتے ہیں:

اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ اَوْفٰی لِیْ حُکْمُ الْقَدْرِ بِالْاِطِّلَاعِ عَلٰی کِتَابِ ''نَھْجِ الْبَلَاغَۃِ'' مُصَادِفَۃً بِلَا تَاَمُّلٍ اَصَبْتُہٗ عَلٰی تَغَبُّرِ حَالٍ وَ تَبَلْبُلِ بَالٍ وَ تَزَاحُمِ اَشْغَالٍ وَ عُطْلَۃٍ مِنْ اَعْمَالٍ فَحَسِبْتُہٗ تَسْلِیَۃً وَ حِیْلَۃً لِلتَّخْلِیَۃِ فَتَصَفَّحْتُ بَعْضَ صَفْحَاتِہٖ وَ تَاَمَّلْتُ جُمَلًا مِنْ عِبَارَاتِہٖ مِنْ مَوَاضِعَ مُخْتَلِفَاتٍ وَ مَوْضُوْعَاتٍ مُتَفَرِّقَاتٍ، فَکَانَ یُخَیَّلُ اِلَیَّ فِیْ کُلِّ مَقَامٍ اَنَّ حُرُوْبًا شُبَّتْ، وَ غَارَاتٍ شُنَّتْ، وَ اَنَّ لِلْبَلَاغَۃِ دَوْلَۃً وَّ لِلْفَصَاحَۃِ صَوْلَۃً، وَ اَنَّ لِلْاَوْھَامِ عَرَامَۃً[2] وَّ لِلرَّیْبِ دَعَارَۃً، وَ اِنَّ جَحَافِلَ الْخِطَابَۃِ، وَ کَتَائِبَ الذَّرَابَۃِ، فِیْ عُقُوْدِ النِّظَامِ، وَ صُفُوْفِ الْاِنْتِظَامِ، تَنَافَحَ بِالصَّفِیْحِ الْاَبْلَجِ[3] وَ الْقَوِیْمِ الْاَمْلَجِ، وَ تَمْتَلِجُ الْمُھَجُ بِرَوَاضِعِ الْحُجَجِ، فَتَفِلُّ مِنْ دَعَارَۃِ الْوَسَاوِسِ،[4] وَ

---

[1] شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید، ج۱۰، ص۱۲۷

[2] اَلْعَرَامَۃُ الشَّرَاسَۃُ. وَالدَّعَارَۃُ سُوْءُ الْخُلُقِ. وَالْجَحَافِلُ الْجُیُوْشُ. وَالْکَتَائِبُ الْفِرَقُ مِنْھَا وَالذَّرَابَۃُ حِدَّۃُ اللِّسَانِ فِیْ فَصَاحَۃٍ. وَالْکَلَامُ تَخْیِیْلٌ حَرْبٌ بَیْنَ الْبَلَاغَۃِ وَھَائِجَاتِ الشُّکُوْکِ وَالْاَوْھَامِ.

[3] تَنَافَحَ تَضَارَبَ اَشَدَّ الْمُضَارَبَۃِ. وَالصَّفِیْحُ السَّیْفُ وَالاَبْلَجُ اللَّامِعُ الْبَیِّاضُ. وَالْقَوِیْمُ الرُّمْحُ وَالاَمْلَجُ الْاَسْمَرُ. وَھِیَ مَجَازَاتٌ عَنِ الدَّلَائِلِ الْوَاضِحَۃِ وَالْحُجَجِ الْقَوِیْمَۃِ الْمُبَرِّدَۃِ لِلْوَھْمِ وَاِنْ خَفِیَ مَدْرَکُھَا وَتَمْتَلِجُ اَیْ تَمْتَصُّ. وَالْمُھَجُ دِمَاءُ الْقُلُوْبِ لَا تَبْقِیْ لِلْاَوْھَامِ شَیْئًا مِنْ مَادَّۃِ الْبَقَاءِ.

[4] فَلَّ الشَّیْءَ ثَلَمَہٗ وَالْقَوْمُ ھَزَمَھُمْ. وَالْخَوَانِسُ خَوَاطِرُ السُّوْءِ تَسْلُکُ مِنَ النَّفْسِ مَسَالِکَ الْخَفَاءِ.

تُصِيبُ مَقَاتِلَ الْخَوَانِسِ.

جب کتاب نہج البلاغہ پر میری نظر پڑی اور اس کے دیکھنے کا اتفاق ہوا حالانکہ اس وقت بہت سے تردداتِ واشتغال کا مجھ پر ہجوم تھا تو اس کتاب کو میں نے ہموم میں باعث تسلّی پایا اور تخلیہ و گوشہ نشینی کا ذریعہ ہوا (کہ بخوبی دیکھ سکوں) جب بعض صفحات اور بعض عبارات کو مختلف مقاموں سے دیکھا تو یہ تخیل ہوتا تھا کہ لڑائیوں کی آگ بھڑکی ہوئی ہے اور غارت کے لیے لشکر پھیلے ہوئے ہیں۔ اور یہ معلوم ہوا کہ علم بلاغت کے لیے دولت ہے (صاحبِ سلطنت ہے) اور فصاحت کے لیے صولت ہے اور اوہام وشک کے لیے بدخلقی ہے۔ اور یہ معلوم ہوا کہ فن خطابت (انشاء کلام، علم ادب) کے لشکر اور تیزیٔ زبان کی فوج اپنے قاعدہ وانتظام کے ساتھ جنگ وجدل میں مصروف ہیں۔ کسی کے ہاتھ میں تلوار ہے تو کسی کے ہاتھ میں گندم گوں نیزہ ہے۔

فَمَا اَنَا اِلَّا وَ الْحَقُّ مُنْتَصِرٌ، وَالْبَاطِلُ مُنْكَسِرٌ، وَ مَرَجَ الشَّكُّ فِيْ خُمُوْدٍ،[1] وَ هَرْجُ الرَّيْبُ فِيْ رُكُوْدٍ. وَ اَنَّ مُدَبِّرَ تِلْكَ الدَّوْلَةِ، وَ بَاسِلَ تِلْكَ الصَّوْلَةِ، هُوَ حَامِلُ لِوَآئِهَا الْغَالِبِ، اَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلِيُّ بْنُ اَبِيْ طَالِبٍ عَلَيْهِ السَّلَامُ.

اس لڑائی میں دیکھ رہا ہوں کہ حق غالب ہوا چاہتا ہے اور باطل کو شکست ہوئی جاتی ہے۔ شکوک واوہام بجھتے جاتے ہیں اور اس دولت کے مدبر اور اس صولت کے شجاع وہی بزرگ ہیں جو اس کے علمدار ہیں امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام۔[2]

بَلْ كُنْتُ كُلَّمَا انْتَقَلْتُ مِنْ مَّوْضِعٍ اِلٰى مَوْضِعٍ اَحُسُّ بِتَغَيُّرِ الْمَشَاهِدِ، وَ تَحَوُّلِ الْمَعَاهِدِ:

بلکہ جب میں ایک عبارت سے دوسری عبارت تک پہنچتا تھا تو حسی طور پر دیکھتا تھا کہ یہاں کا عالم ہی دوسرا ہے، وہاں کا جلوہ ہی نیا ہے۔

فَتَارَةً كُنْتُ اَجِدُنِيْ فِيْ عَالَمٍ يَّغْمُرُهٗ مِنَ الْمَعَانِيْ اَرْوَاحٌ عَالِيَةٌ، فِيْ حُلَلٍ مِّنَ الْعِبَارَاتِ الزَّاهِيَةِ، تَطُوْفُ عَلَى النُّفُوْسِ الزَّاكِيَةِ، وَ تَدْنُوْ مِنَ الْقُلُوْبِ الصَّافِيَةِ، تُوْحِيْ اِلَيْهَا رَشَادُهَا، وَ تُقَوِّمُ مِنْهَا مُرَادُهَا، وَ تَنْفِرُ بِهَا عَنْ مَّدَاحِضِ الْمَزَالِ، اِلٰى جَوَادِ الْفَضْلِ وَ

---

[1] اَلْمَرْجُ الْاِضْطِرَابُ. وَالْهَرْجُ هِيَجَانُ الْفِتْنَةِ.

[2] قائل کلام، فصاحت وبلاغت کو کبھی سلطنت سے تمثیل دیتا ہے اور اُس کا بادشاہ جناب امیر المومنینؑ کو قرار دیتا ہے اور کبھی اس تقریر وزباں آوری کو میدان کارزار بناتا ہے اور جناب امیر کو اس کا علمدار وسپہ سالار بناتا ہے۔

الْكَمَالِ.
کبھی تو مجھے ایک عالم ملتا ہے کہ ارواحِ عالیہ معانی کی اسے آباد کر رہی ہیں اور وہ خوشنما لباسوں سے نفوس زاکیہ پر دورہ کرتی ہیں اور قلوب صافیہ سے مل رہی ہیں جو گویا وحی کرتی ہیں ان کی طرف صلاح و رشاد کو اور راہ خطا و لغزش سے بچا رہی ہیں اور فضل و کمال کی راہیں بتا رہی ہیں۔

وَ طَوْرًا كَانَتْ تَتَكَشَّفُ لِيَ الْجُمَلُ عَنْ وُّجُوْهٍ بَاسِرَةٍ، وَ اَنْيَابٍ كَاشِرَةٍ، وَ اَرْوَاحٍ فِيْٓ اَشْبَاحِ النُّمُوْرِ، وَ مَخَالِبِ النُّسُوْرِ، قَدْ تَحَفَّزَتْ لِلْوِثَّابِ، ثُمَّ انْقَضَّتْ لِلِاخْتِلَابِ. فَخَلِبَتِ الْقُلُوْبَ عَنْ هَوَاهَا، وَ اَخَذَتِ الْخَوَاطِرَ دُوْنَ رِمَاهَا، وَ اغْتَالَتْ فَاسِدَ الْاَهْوَآءِ وَ بَاطِلَ الْاٰرَآءِ.
کبھی یہ نقشہ دکھائی دیتا ہے کہ درندوں کے بگڑے ہوئے چہرے اور کھلے ہوئے دانت اور روحیں تیندووں کی صورت میں اور چنگال شکاری جانوروں کے آمادۂ جست ہیں اور یکا یک ٹوٹ کر سب کے دل اپنی خواہشوں سے پھیر دے اور بری خواہشیں دل سے نکال لی گئیں۔

وَ اَحْيَانًا كُنْتُ اَشْهَدُ اَنَّ عَقْلًا نُوْرَانِيًّا لَّا يَشْبَهُ خَلْقًا جَسَدَانِيًّا، فَصَلَ عَنِ الْمَوْكِبِ الْاِلٰهِيِّ وَ اتَّصَلَ بِالرُّوْحِ الْاِنْسَانِيِّ، فَخَلَعَهٗ عَنْ غَاشِيَاتِ الطَّبِيْعَةِ، وَ سَمَا بِهٖ اِلَى الْمَلَكُوْتِ الْاَعْلٰى، وَ نَمَا بِهٖ اِلٰى مَشْهَدِ النُّوْرِ الْاَجْلٰى. وَ سَكَنَ بِهٖ اِلٰى عَمَارِ جَانِبِ التَّقْدِيْسِ، بَعْدَ اسْتِخْلَاصِهٖ مِنْ شَوَآئِبِ التَّلْبِيْسِ.
اور کبھی میں یہ مشاہدہ کرتا ہوں کہ ایک عقل نورانی ہے جو کسی شے جسمانی سے مشابہ نہیں، لشکر الٰہی سے جدا ہو کر روح انسانی سے متصل ہوئی اور کدورت طبعی سے اسے پاک و صاف کر کے طرف ملکوت اعلیٰ کے لے گئی اور مشہد اجلیٰ نور میں پہنچا دیا۔

وَ اٰنَاتٍ كَاَنِّيْٓ اَسْمَعُ خَطِيْبَ الْحِكْمَةِ يُنَادِيْ بِاَعْلِيَآءِ الْكَلِمَةِ، وَ اَوْلِيَآءِ اَمْرِ الْاُمَّةِ، يُعَرِّفُهُمْ مَوَاقِعَ الصَّوَابِ، وَ يُبَصِّرُهُمْ مَوَاضِعَ الْاِرْتِيَابِ، وَ يُحَذِّرُهُمْ مَزَالِقَ الْاِضْطِرَابِ، وَ يُرْشِدُهُمْ اِلٰى دَقَآئِقِ السِّيَاسَةِ، وَ يَهْدِيْهِمْ طُرُقَ الْكِيَاسَةِ، وَ يَرْتَفِعُ بِهِمْ اِلٰى مَنَصَّاتِ الرِّئَاسَةِ وَ يُصْعِدُهُمْ شَرَفَ التَّدْبِيْرِ، وَ يَشْرُفُ بِهِمْ عَلٰى حُسْنِ الْمَصِيْرِ.
اس عالم سے پلٹتا ہوں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ خطیب حکمت ندا کر رہا ہے اور اولیائے امر اُمت کو راہِ حق و

صواب بتا رہا ہے اور مواضع شک وارتیاب سے بچا رہا ہے اور قواعد سیاست مدن وآداب فہم وفراست کی تعلیم دے رہا ہے، جس سے وہ منصۂ ریاست پر فائز ہوں اور بلندی تدبیر پر پہنچ کر حُسن عاقبت سے کامیاب ہوں۔

ذٰلِكُ الْكِتَابُ الْجَلِيْلُ هُوَ جُمْلَةٌ مَااخْتَارَهُ الشَّرِيْفُ الرَّضِيُّ رَحِمَهُ اللّٰهُ مِنْ كَلَامِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا اَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلِيِّ ابْنِ اَبِيْ طَالِبٍ كَرَّمَ اللّٰهُ وَجْهَهٗ جَمَعَ مُتَفَرَّقَةً وَسَمَّاهُ بِهٰذَا الْاسْمِ ''نَهْجِ الْبَلَاغَةِ'' وَلَا اَعْلَمُ اسْمًا اَلْيَقُ بِالدَّلَالَةِ عَلٰى مَعْنَاهُ مِنْهُ وَلَيْسَ فِيْ وُسْعِيْ اَنْ اَصِفَ هٰذَا الْكِتَابَ بِاَزْيَدَ مِمَّا دَلَّ عَلَيْهِ اسْمُهٗ وَلَا اَنَّ آتِيْ بِشَيْءٍ فِيْ بَيَانِ مَزِيَّتِهٖ فَوْقَ مَا اَتٰى بِهٖ صَاحِبُ الْاِخْتِيَارِ كَمَا سَتَرٰى فِيْ مُقَدَّمَةِ الْكِتَابِ.

وہ کتاب جس میں یہ سب اوصاف بھرے ہوئے ہیں یہی ہے جسے سیّد مرتضیٰ علیہ الرحمہ [1] نے منتخب کیا ہے کلام سیّدنا ومولانا امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام سے اور اس کے متفرقات کو جمع کیا اور بنام ''نہج البلاغہ'' موسوم کیا اور جہاں تک مَیں جانتا ہوں اس سے بہتر کوئی نام نہیں مل سکتا جو اپنے معانی کو بتا سکے اور نہ مجھ میں اس کی قدرت ہے کہ اس کی توصیف کرسکوں زیادہ اس سے جو خود اس نام نامی سے نمایاں ہے۔ اور نہ اس کتاب کے فضل ومرتبت کو اس سے زیادہ بتا سکتا ہوں جسے خود جامع نے شروع کتاب میں بیان کیا ہے۔

وَلَوْلَا اَنَّ غَرَآئِزَ الْجِبِلَّةِ وَقَوَاضِيَ الذِّمَّةِ تَفْرُضُ عَلَيْنَا عِرْفَانَ الْجَمِيْلِ لِصَاحِبِهٖ وَشُكْرَ الْمُحْسِنِ عَلٰى اِحْسَانِهٖ لَمَّا احْتَجْنَا اِلَى الْتَنْبِيْهِ عَلٰى مَا اَوْدَعَ نَهْجَ الْبَلَاغَةِ مِنْ فُنُوْنِ الْفَصَاحَةِ وَمَا خُصَّ بِهٖ مِنْ وُجُوْهِ الْبَلَاغَةِ خُصُوْصًا وَهُوَ لَمْ يَتْرُكْ غَرَضًا مِنْ اَغْرَاضِ الْكَلَامِ اِلَّا اَصَابَهٗ وَلَمْ يَدَعْ لِلْفِكْرِ مُمِرًّا اِلَّا جَابَهٗ،

اگر شکر منعم واجب نہ ہوتا اور محسن کا احسان ظاہر کرنا لازم نہ ہوتا تو اس کی ضرورت نہ تھی کہ ہم اس کتاب ''نہج البلاغہ'' کے محاسن وفوائد پر کچھ تنبہ کرتے کہ کس کس طرح اس نے فنونِ فصاحت کی تعلیم کی اور

---

[1] یہ اشتباہ بھی عجیب اشتباہ ہے جو بعض علمائے اہل سنت کو ابتدا سے چلا آتا ہے اور تعجب ہے کہ باوصف تنبیہ کے بھی نہیں خیال کرتے کہ یہ کتاب جمع کی ہوئی سید رضی علیہ الرحمہ کی ہے نہ کہ سید مرتضیٰ رحمہ اللہ کی۔

وجوہِ بلاغت کی ہدایت کی کہ کلام کی کوئی غرض ایسی نہ رہی جو اس کتاب کی بدولت پوری نہ ہوئی اور نہ قوت فکر کے لیے کوئی راہ باقی رہی جس کی اس نے راہ نمائی نہ کی ہو۔

اِلَّا اَنَّ عِبَارَاتِ الْكِتَابِ لِبُعْدِ عَهْدِهَا مِنَّا وَانْقِطَاعِ اَهْلِ جِيْلِنَا عَنْ اَصْلِ لِسَانِنَا قَدْ نَجِدُ فِيْهَا غَرَائِبَ اَلْفَاظٍ فِيْ غَيْرِ وَحْشِيَّةٍ وَجَزَالَةَ تَرْكِيْبٍ فِيْ غَيْرِ تَعْقِيْدٍ، فَرُبَّمَا وَقَفَ فَهْمُ الْمُطَالِعِ دُوْنَ الْوُصُوْلِ اِلٰى مَفْهُوْمَاتِ بَعْضِ الْمُفْرَدَاتِ اَوْ مَضْمُوْنَاتِ بَعْضِ الْجُمَلِ وَلَيْسَ ذٰلِكَ ضُعْفًا فِيْ اللَّفْظِ اَوْ وَهْنًا فِيْ الْمَعْنٰى وَاِنَّمَا هُوَ قُصُوْرٌ فِيْ ذِهْنِ الْمُتَنَاوِلِ.

مگر چونکہ عبارتِ کتاب دقیق اور ہم لوگ اس زمانہ میں ہیں کہ اصل زبان عرب سے بہت کچھ نا آشنا ہو رہے ہیں، لہذا بعض بعض الفاظ غریب ملتے ہیں مگر وحشت وتنافر سے معرّا[1] اور ایسی نئی ترکیبیں ملتی ہیں مگر تعقید سے مبرّا کہ ناظرین کتاب کو بہت دقت ہو مطالب ومقاصد سمجھنے میں بوجہ قصور ذہن وقلت انس لسان عرب کے، نہ بوجہ ضعف لفظ ووہن معنی۔

وَ مِنْ ثَمَّ هَمَّتْ بِيْ الرَّغْبَةُ اَنْ اَصْحَبَ الْمُطَالَعَةِ بِالْمُرَاجَعَةِ وَالْمُشَارَفَةِ بِالْمُكَاشَفَةِ وَاُعَلِّقُ عَلٰى بَعْضِ مُفْرَدَاتِهٖ شَرْحًا وَ بَعْضِ جُمْلَهٖ تَفْسِيْرًا وَ شَيْءٌ مَنْ اِشَارَاتِهٖ تَعْيِيْنًا وَاقِفًا عِنْدَ حَدِّ الْحَاجَّةِ مِمَّا قَصَدْتُ مُوجَزًا فِي الْبَيَانِ مَا اسْتَطَعْتُ مُعْتَمِدًا فِيْ ذٰلِكَ عَلَى الْمَشْهُوْرِ مِن كُتُبِ اللُّغَةِ والْمَعْرُوْفِ مِنْ صَحِيْحِ الْاَخْبَارِ وَ لَمْ اَتَعَرَّضْ لِتَعْدِيْلِ مَا رُوِيَ عَنِ الْاِمَامِ فِيْ مَسْاَلَةِ الْاِمَامَةِ اَوْ تَجْرِيْحِهٖ، بَلْ تَرَكْتُ لِلْمُطَالِعِ الْحِكَمِ فِيْهِ بَعْدَ الْاِلْتِفَاتِ اِلٰى اُصُوْلِ الْمَذَاهِبِ الْمَعْلُوْمَةِ فِيْهَا وَ الاَخْبَارِ الْمَاثُوْرَةِ الشَّاهِدَةِ عَلَيْهَا غَيْرَ اَنِّيْ لَمْ اَتَحَاشَ تَفْسِيرَالْعِبَارَةِ وَ تَوْضِيْحِ الْاِشَارَةِ، لَا اُرِيْدُ فِيْ وَجْهِيْ هٰذَا اِلَّاحِفْظَ مَا اَذْكُرُ ،وَ ذِكْرَ مَا اَحْفَظُ تَصَوُّنًا مِنَ النِّسْيَانِ وَ تَحَرُّزًا مِنَ الْحَيْدَانِ، وَ لَمْ اَطْلُبْ مِنْ وَجْهِ الْكِتَابِ اِلَّا مَا تَعَلَّقَ مِنْهُ بِسَبَبِ الْمَعَانِيْ الْعَالِيَّةِ فِي الْعِبَارَاتِ الرَّفِيْعَةِ فِيْ كُلِّ ضَرْبٍ مِنْ ضُرُوْبِ الْكَلَامِ وَ حَسْبِيْ هٰذِهِ الْغَايَةُ فِيْ مَا اُرِيْدُ لِنَفْسِيْ وَ لِمَنْ يَطَّلِعُ عَلَيْهِ مِنْ اَهْلِ اللِّسَانِ الْعَرَبِيْ.

لہٰذا میں نے یہ قصد کیا کہ ایک مختصر شرح اس کی لکھوں جس کا مقصود یہ ہے کہ اصل عبارت کے مطلب و

---

[1] ان اوصاف سے کلام کا درجہ فصاحت سے گر جاتا ہے۔

معانی کو بذریعہ لغت باحل مطلب بیان کروں مگر نہایت ایجاز واختصار سے۔جس میں میرا اعتماد مشہور کتب لغت پر ہوگا اور معروف صحاح اخبار پر اوران مطالب سے نہ متعرض ہوں جو امام علیہ السلام سے دربارہ مسئلہ امامت منقول ہے۔ بلکہ اسے ناظر منصف کی رائے پر محول کرتا ہوں کہ بعد تحقیق اصول مذاہب اخبار ماثورہ سے خود اسے معلوم ہوجائے گا۔مگر تفسیر عبارت وتوضیح اشارۃ میں کسی طرح کا قصور نہ کروں گا، کیونکہ مقصود میرا صرف اصل کتاب کا حل کرنا ہے تاکہ وہ باتیں محفوظ ہوجائیں جو مجھے یاد ہیں اور وہ باتیں مذکور ہوں جو محفوظ ہیں تاکہ سہو ونسیان سے امن ملے۔اوراس کتاب سے ہمارا مطلب صرف اسی قدر رہے کہ دکھادوں معانی عالیہ کو عبارت رفیعہ میں کس طرح ادا کیا ہے اور ہر موقع ومحل پر انداز کلام کیا رہا ہے اور یہی مطلب میرے لیے کافی ہے بلکہ ان لوگوں کے لیے جو زبان عربی کی سیر کیا چاہتے ہیں۔

اس عبارت باجزالت کو دیکھیے اور سمجھیے کہ علامہ شیخ محمد عبدہ مصری اس کتاب مستطاب نہج البلاغہ کے حق میں کیا کہہ رہے ہیں اور کن لفظوں سے اظہار عظمت کررہے ہیں کہ کسی طرح کا ان کو اس میں شک نہیں ہے کہ یہ مجموعہ کلام جناب امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام ہے اور ایسا کلام ہے جس کا مماثل ہونا محال ہے۔

چنانچہ آخر میں خود علامہ عبدہ پھر تصریح کرتے ہیں، لکھتے ہیں:

وَلَيْسَ فِيْ اَهْلِ هٰذِهِ اللُّغَةِ اِلَّا قَائِلٌ بِاَنَّ كَلَامَ الْاِمَامِ عَلِيِّ بْنِ اَبِيْ طَالِبٍ هُوَ اَشْرَفُ الْكَلَامِ وَ اَبْلَغُهٗ بَعْدَ كَلَامِ اللّٰهِ تَعَالٰى وَ كَلَامِ نَبِيِّهٖ وَ اَغْزَرُهٗ مَادَّةً وَ اَرْفَعُهٗ اُسْلُوْبًا وَ اَجْمَعُهٗ لِجَلَآئِلِ الْمَعَانِيْ، فَاَجْدَرُ بِالطَّالِبِيْنَ لِنَفَآئِسِ اللُّغَةِ وَ الطَّامِعِيْنَ فِي التَّدَرُّجِ لِمَرَاقِيْهَا اَنْ يَّجْعَلُوْا هٰذَا الْكِتَابَ اَهَمَّ مَحْفُوْظِهِمْ وَ اَفْضَلَ مَاْثُوْرِهِمْ مَعَ تَفَهُّمِ مَعَانِيْهِ فِي الْاَغْرَاضِ الَّتِيْ جَآءَتْ لِاَجْلِهَا وَ تَاَمُّلِ اَلْفَاظِهٖ فِي الْمَعَانِي الَّتِيْ صِيْغَتْ لِلدَّلَالَةِ عَلَيْهَا، لِيُصِيْبُوْا بِذٰلِكَ اَفْضَلَ غَايَةٍ وَ يَنْتَهُوْآ اِلٰى خَيْرِ نِهَايَةٍ۔[1]

جس سے معلوم ہوا کہ تمامی اہل فن کا اس پر اتفاق ہے کہ کلام جناب امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام اشرف وابلغ تمامی کلام ہے بعد کلامِ خدا ورسولؐ کے اور غزارت مادہ ورفع اسلوب میں سب سے بڑھا ہوا ہے اور جمع جلائل معانی میں کوئی اس کا ہمسر نہیں۔طالبین کو مناسب ہے کہ اس کلام کو اہم محفوظ و افضل منقولات سمجھیں اور اس کے مطالب ومقاصد کو بغور دیکھیں اور سمجھیں تاکہ بہترین غایات وافضل نہایات پر فائز ہوں۔

---

[1] مطبوعہ ادبیہ بیروت، ۱۸۸۵ء

پس جس کتاب مستطاب کی یہ عظمت وجلالت ہو کہ از سلف تا خلف سب اس کے معترف ہیں کہ یہ کلام فوق کلام انسانی ہے، حیف کہ ہم اس سے بے خبر رہیں، بلکہ اپنی بے خبری وگمراہی سے اس کا دعویٰ کریں کہ یہ حضرتؑ کا کلام نہیں۔

علامہ شیخ محمد عبدہ مصر کے افاضل علماء سے ہیں۔ بہت سے تصانیف ان کے دائر وسائر ہیں اور ہند کے لوگ بھی ان کی عظمت وجلالت کے معترف اور ان کے افادات جدیدہ سے مستفیض ہو رہے ہیں۔ ان کی تنہا رائے کافی تھی چہ جائیکہ ہم نے تو بہت سے اکابر علماء متقدمین کے اقوال بھی جمع کر دیئے اور سب کا اقرار دکھایا کہ وہ کل حضرات اس کتاب کو مجموعۂ کلام جناب امیر المومنین علیہ السلام نہایت صدق دل سے مان رہے ہیں۔ ﴿فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ﴾۔

احوال جناب سیّد رضی علیہ الرحمہ جامع کتاب نہج البلاغہ

نام ونسب

چونکہ بعض اہل سنت نے اپنے کمال عقل سے اس کا بھی دعویٰ کیا ہے کہ نہج البلاغہ کے خطبے وغیرہ موضوعات سیّد رضی علیہ الرحمہ سے ہیں جس کا بطلان بھی بذیل تصریحات علمائے اہل سنت مذکور ہوا، لہٰذا کچھ حالات جناب سیّد رضی علیہ الرحمہ کے اجمالاً بیان کیے جاتے ہیں تا کہ ان کے جلالت قدر وعظمت مرتبہ سے عوام وخواص مطلع ہوں اور سمجھیں کہ ایسے شخص کی نسبت اس کا احتمال کرنا منافی شان ایمان ہے۔ لقب ان کا ''سیّد رضی'' اور ''ذوالحسبین'' ہے کنیت ابوالحسن، نام محمد۔

نسب ان کا محمد بن ابی احمد حسین بن موسیٰ بن محمد بن موسیٰ بن ابراہیم بن امام موسیٰ کاظمؑ ہے۔ اس لیے سیّد رضی علیہ الرحمہ جناب امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے ساتویں پشت میں ہوئے۔

ا۔ جناب امام موسیٰ کاظم علیہ السلام

جناب امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے حالات کا بیان اس مختصر میں ممکن نہیں ہے۔ تمامی شیعہ جانتے ہیں کہ وہ ان کے ساتویں امام ہیں جو بنص خدا ورسولؐ بعد امام جعفر صادق علیہ السلام حجت خدا اور خلیفہ رسولؐ ہیں۔ ولادت آپؑ کی بمقام ''ابوا'' ہے جو درمیان مکہ و مدینہ ایک قریہ ہے۔ ۱۲۸ھ میں آپؑ پیدا ہوئے اور ۱۸۳ھ میں ۵۵ سال کی عمر میں سندی بن شاہک کے قید میں بمقام بغداد زہر دغا سے رحلت فرمائی۔

چونکہ آپؑ نہایت ہی متحمل تھے اور حد درجہ حلیم تھے اس لیے لقب آپؑ کا ''کاظم'' مشہور ہوا۔ آپؑ اس درجہ سخی تھے کہ اس زمانہ میں ''صُرَّۃُ مُوسٰی'' مشہور تھا اور لوگ کہتے تھے: ''عَجَبًا لِمَنْ جَآءَتْہُ صُرَّۃُ مُوسٰی فَشَکَا الْقِلَّۃَ''[1] یعنی ''جس کو امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کا صرہ مل جائے اور پھر وہ قلّت معاش کی شکایت کرے تو مقام تعجب ہے''۔

اس مثل کے شہرت کی وجہ یہ ہے کہ آپؑ جب بوقت شب دولت سرا سے باہر تشریف لے جاتے تھے اپنے ہمراہ درہم و دینار کے صرے رکھتے تھے اور ارباب حاجت کو مرحمت فرماتے۔

پہلے آپؑ کو خلیفہ موسیٰ ہادی پدر ہارون رشید نے قید کیا، شب کو خلیفہ نے خواب میں دیکھا کہ جناب امیر المومنین علیہ السلام

---

[1] عوالم العلوم، ج ۲۱، ص ۲۹۔

فرماتے ہیں: ﴿فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ ۝﴾[1]۔ اس خواب سے وہ خوف زدہ ہوا اور امامؑ کو قید سے رہا کیا پھر دوبارہ ایذا پہنچانا چاہا مگر قبل اس کے خود واصل بہ جہنّم ہوا۔ بعدہ جب ہارون رشید خلیفہ ہوا تو اس نے ازراہِ مکاری پہلے بہت کچھ حضرتؑ کی تعظیم وتکریم کی مگر آخر قید کیا اور فضل بن یحییٰ برمکی کے حوالہ کیا۔ چند روز بعد سندی بن شاہک کے حوالہ کیا اور خود روانہ ملک شام ہوا اور یحییٰ بن خالد نے سندی کو یہ حکم دیا کہ حضرتؑ کو قتل کر ڈالے۔ چنانچہ ایک قول کے موافق حضرتؑ کو زہر دیا گیا اور بقولے ایک بساط میں حضرتؑ کو اس طرح سے دبایا کہ روحِ اقدس نے مفارقت کی۔ اس کے بعد جب غسل وکفن کی تیاری ہونے لگی تو ایک محضر تیار کیا گیا اس مضمون کا کہ حضرتؑ بقضائے الٰہی فوت ہوئے تاکہ خلیفہ یا ارکان خلیفہ پر کوئی اس کی تہمت نہ دے کہ حضرتؑ کو قتل کیا۔ آپؑ کی نعش اطہر تین روز تک شاہراہ پر رکھی رہی کہ آیندہ وروندہ دیکھیں اور اس محضر پر دستخط کریں۔ بعدہ مقابر قریش میں آپؑ مدفون ہوئے۔[2]

لیکن شیخ مفید رحمہ اللہ نے ارشاد میں حضرتؑ کے حبس اور شہادت کے متعلق جو روایت لکھی ہے وہ اس روایتِ عمدۃ الطالب سے زیادہ تر قابل اعتماد ہے اور اسی سے خلیفۂ وقت کا ہمام تمام حضرتؑ کی شہادت کے متعلق اور اکثر ارکانِ دولت کا اس امر عظیم سے باز رہنا اور آخر میں یحییٰ بن خالد برمکی کا اس امر کے لیے متعہد ہونا بتفصیل ظاہر ہوتا ہے۔ بہرحال چونکہ حضرتؑ کے احوال غرائب اشتمال کا ذکر اس مختصر میں ممکن نہیں اور تمامی اہل اسلام پر حضرتؑ کے فضائل ومناقب مثل آفتاب نمایاں ہیں اس لیے زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔

آپؑ کا مزار انور جس میں آپؑ کے پوتے حضرت امام محمد تقی علیہ السلام کا بھی مزار ہے بہ لقب ''کاظمین'' مشہور ہے جہاں تمامی شیعہ بغرض زیارت جاتے ہیں اور امام ابوداؤد اپنے سنن میں لکھتے ہیں جو اہل سنت کے صحاح ستہ میں داخل ہے کہ ''حضرت امام موسیٰ کاظمؑ کی قبر استجابتِ دعا میں تریاق اعظم ہے''۔

علامہ قرمانی اخبار الدول (ص ۱۱۲) میں لکھتے ہیں:

وَهُوَ الْمَعْرُوْفُ عِنْدَ اَهْلِ الْعِرَاقِ بِبَابِ الْحَوَائِجِ لِاَنَّهٗ مَا خَابَ الْمُتَوَسِّلُ بِهٖ فِيْ قَضَاءِ الْحَاجَةِ.

۲۔ ابراہیم ابن جناب امام موسیٰ کاظم علیہ السلام

ابراہیم بن امام موسیٰ الکاظم لقب ان کا ''مرتضیٰ'' ہے اور انہیں ابراہیم کے نسب سے جناب امام موسیٰ علیہ السلام کی ایک کنیت

---

[1] سورۂ محمد، آیت ۲۲۔

[2] دیکھو عمدۃ الطالب، صفحہ ۱۸۴۔

''ابو ابراہیم'' بھی ہے۔ حضرتؑ کے دو فرزندوں کا نام ابراہیم ہے: ایک ابراہیم اکبر دوسرے ابراہیم اصغر۔ ابراہیم اکبر کی اولاد باقی نہیں رہی۔ انہی ابراہیم اصغر کو ''ابراہیم مرتضیٰ'' کہتے ہیں جن کی نسل سے جناب سیّد رضی علیہ الرحمہ تھے۔

ابراہیم مرتضیٰ نہایت جلیل القدر تھے۔ ۲۰۰ھ میں انہوں نے بھی ظہور کیا۔ قیام ان کا مکہ معظّمہ میں تھا کہ ان کو ابوسرایا کے قتل کی خبر پہنچی کہ مقام نہروان میں وہ قتل ہوا۔ یہ خبر سن کر انہوں نے قیام مکّہ ترک کیا اور ملک یمن کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں اسحٰق بن موسیٰ عباسی عامل تھا مامون کا، جب اسے ابراہیم مرتضیٰ کے آنے کی خبر معلوم ہوئی کہ وہ قریب صنعا پہنچ گئے تو اسحٰق مذکور نے یمن چھوڑ دیا اور مکہ معظّمہ کی طرف فرار کیا، ابراہیم کو بے جنگ وجدال یمن پر قبضہ حاصل ہو گیا۔

جب موسم حج آیا تو ابراہیم مرتضیٰ نے ایک شخص کو جو خاندان حضرت عقیل سے تھے امیر حاج مقرر کر کے روانہ کیا۔ ان سے اور جلودی سے جو ابواسحٰق معتصم کے لشکر کا ایک افسر تھا بمقام بستاں ابن عامر سے لڑائی بھی ہوئی جس میں عقیلی نے شکست کھائی اور ہمراہی ان کے اسیر ہوئے۔[1]

ان حالات سے ذاتی وجاہت اور عزت واقتدار کا ان کے بخوبی پتہ چل سکتا ہے کہ یہ اپنے زمانہ میں اور اپنے خاندان میں کن نظروں سے دیکھے جاتے۔

۳۔ موسیٰ بن ابراہیم

چونکہ اکثر مؤرخین سادات کے بارے میں اخفاء حالات سے کام لیتے ہیں اور بلحاظ محبت خلفائے امویہ وعباسیہ کے حالات کی تشریح پسند نہیں کرتے اسی وجہ سے موسیٰ بن ابراہیم کے حالات ہم سے مخفی ہیں بجز اس کے کہ کنیت ان کی ابوسجہ اور ان کی نسل آٹھ آدمیوں سے پھیلی: عبید اللہ، عیسیٰ، علی، جعفر۔ ان چاروں کی اولاد تو بہت ہی کم ہے۔ البتہ محمد اعرج، احمد اکبر، ابراہیم عسکری، حسین قطیعی کی اولاد کچھ زیادہ ہے۔ محمد اعرج کی نسل صرف ان کے اکلوتے بیٹے موسیٰ اصغر سے قائم رہی جن کو ''موسیٰ ابرش'' بھی کہتے ہیں۔ موسیٰ ابرش کے تین بیٹے ہوئے: ابوطالب محسن، ابواحمد حسین، ابوعبداللہ احمد۔

۴۔ ابواحمد حسین

ابواحمد حسین یہی والد ہیں جناب سیّد رضی علیہ الرحمہ کے۔ نہایت بزرگ اور جلیل المرتبہ تھے۔ لقب آپ کا ''طاہر ذوالمناقب'' ہے۔ نقابت نقبائے طالبین ان سے متعلق تھی۔ بہاء الدولہ نے قاضی القضاۃ بھی مقرر کیا تھا علاوہ منصب نقابت کے، مگر خلیفہ قادر باللہ نے جو اس زمانہ کا خلیفہ تھا اس عہدہ پر نہ رہنے دیا۔ چند مرتبہ امیر حج بھی مقرر ہوئے۔ ۹۰ سال سے

---

[1] تاریخ کامل، ج۶، ص۱۰۵۔۱۰۶۔

زیادہ عمر پا کر ۴۰۰ھ ہجری میں راہ گرائے فردوس بریں ہوئے۔

ان کے تاریخی حالات بھی نہایت ہی عجیب وغریب ہیں۔ زمانہ نے خوب خوب سلوک کیا۔ چند مرتبہ یہ عہدۂ نقابت سے موقوف ہوئے اور پھر بحال ہوئے۔ کیونکہ وہ زمانہ خلافت بنی العباس کا بالکل آخر شاہان دہلی کا سا تھا کہ خلافت صرف برائے نام رہ گئی تھی۔ آل بویہ کا تمام ملک پر قبضہ تھا، اسی سبب سے جب خلیفہ کا داؤں چل جاتا تو یہ معزول ہو جاتے اور جب آل بویہ کا کوئی ممبر آ جاتا، خلیفہ کو آنکھ دکھاتا پھر انتظام درست ہو جاتا۔ کیونکہ خلیفہ اور ان کے ارکان سب کے سب سنّی المذہب تھے، وہ کسی باوجاہت شخص کا کسی اعلیٰ عہدہ پر رہنا پسند نہ کرتے اور آل بویہ سب کے سب شیعہ مذہب تھے اور انہیں کا ہر طرف عمل دخل تھا، لہذا وہ خاص دارالخلافۃ کے معزز عہدوں پر بھی ایسے باوجاہت اشخاص کو مقرر کرتے جو حسبًا نسبًا علم وفضل وکمال وسیاستِ مدن میں بھی سر برآوردہ ہوتا۔ اسی اختلاف سے اکثر سیّد ابواحمد حسین کو زحمتیں بھی پہنچتیں مگر اکثر کامیاب رہا کرتے۔ چنانچہ ''**عمدۃ الطالب**'' صفحہ ۱۹۱ میں شریف ابوالوفاء سے نقل کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ''جب والد میرے ضیق معاش سے تنگ آئے تو بغرض تجارت باہر نکلے اور وطن چھوڑ دیا۔ راہ میں شریف ابواحمد نقیب الطالبین سے ملاقات ہوئی، انہوں نے میرے والد کا حال پوچھا اور نام ونسب دریافت کیا۔ جب سب حال اپنا میرے والد بیان کر چکے تو انہوں نے جواب دیا: ''یَکْفِیْکَ مِنَ الْمَتْجَرِ لِقَآئِیْ'' یعنی تم کو اس تجارت کی عوض یہی کافی ہے کہ ہم سے ملاقات ہوگئی۔

اور کافی ہے ان کے فضل وشرف کے لیے کہ جب نوے برس کے سن میں انہوں نے وفات کی اور چند روز اپنے گھر میں مدفون رہے تو بعد کو ان کی نعش مبارک اس زمانہ میں کربلائے معلّٰی کو نقل کی گئی اور بہت قریب قبر مطہر امام حسین علیہ السلام مدفون ہوئے۔ ان کی وفات کے بعد شعرائے زمانہ نے بہت کثرت سے مرثیے نظم کئے لیکن جیسا قصیدہ فائیہ ان کے مرثیہ میں علامہ ابوالعلاء المعری المتوفّٰی ۴۴۹ھ نے نظم کیا ہے اس کا مثل ونظیر مشکل ہے۔ یہ قصیدہ ابوالعلاء معرّی کے اس دیوان میں جس کا نام **سقط الزند** ہے بالتمام موجود ہے اور یہ دیوان اب چھپ بھی گیا ہے، ہر شخص دیکھ سکتا ہے، مگر ہم اس مقام پر بعض اشعار اس کے نقل کرتے ہیں اور ان اشعار کی شرح میں جو علمائے اہل سنت نے لکھا ہے اس کو بھی لکھتے ہیں، تاکہ فی الجملہ جلالت شان اس سیّد معظم کی واضح ہو۔ ابوالعلاء معرّی قصیدہ مذکورہ میں کہتے ہیں:

طَارَ النَّوَاعِبُ یَوْمَ فَادَ نَوَاعِیَا　　فَنُدُبَتُہٗ لِمُوَافِقٍ وَ مُنَافِ

اُڑتے غراب بروز وفات ان کے خبر مرگ دیتے ہوئے۔ پس ندبہ کیا ہر موافق کے لیے اور ہر مخالف کے لیے۔

صاحب تنویر اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

''اَلنَّوَاعِبُ الْغِرْبَانِ'' یُقَالُ: نَعَبَ الْغُرَابُ یَنْعَبُ نَعْبًا اِذَا صَاحَ، وَ فَادَ یَفِیْدُ وَ یَفُوْدُ اِذَا مَاتَ اَیْ لَمَّا مَاتَ الْمَرْثِیُّ نَعَتْهُ الْغِرْبَانِ یَنْعَبُهَا وَبَکَتْ عَلَیْهِ وَنَدَبَتْهُ لِکُلِّ مُوَافِقٍ لَهٗ فِیْ دِیْنِهٖ وَ مُنَافٍ یُنَافِیْهِ اَیْ یُخَالِفُهٗ فِیْ دِیْنِهٖ یَعْنِیْ نَعَتْهُ الْاَعْرَبَةُ لِلنَّاسِ کَافَّةً مُسْلِمُهُمْ وَ کَافِرُهُمْ، لِاَنَّهُمْ وَاِنِ اخْتَلَفُوْا فِی الْمِلَلِ مُجْمِعُوْنَ عَلٰی فَضْلِهٖ.

''موافق'' سے مراد دینی موافقت ہے اور ''مخالف'' سے مقصود دینی مخالفت ہے۔ یعنی نوحہ اور خبر مرگ پہنچانا ہر مسلم و کافر کے لیے تھا، کیونکہ اگرچہ مذاہب میں لوگوں کے اختلاف تھا مگر سب کا اجماع تھا ان کے فضل و شرف پر۔

پھر کہتے ہیں:

نُبِذَتْ مَفَاتِیْحُ الْجِنَانِ وَ اِنَّمَا رِضْوَانُ بَیْنَ یَدَیْهِ لِلْاِتِّحَافِ

ڈال دی گئیں کنجیاں جنت کی اور نہیں ہے رضوان خازن جنت سامنے ان کے مگر اس غرض سے کہ تحفہ پیش کرے۔

صاحب تنویر اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

اَیْ اُلْقِیَتْ اِلَیْهِ مَفَاتِیْحَ الْجِنَانِ مُحْکَمًا فِیْ خَزَآئِنِهَا وَخَازِنُ الْجَنَّةِ رِضْوَانُ کَالْمُطِیْعِ بَیْنَ یَدَیْهِ یَتَّحِفُهٗ بِمَا یُرِیْدُ مِنْ طَرَفِ الْجَنَّةِ.

ملخص عبارت شرح: جنت کی کنجیاں ان کو دے دی گئیں اور وہ خزانہائے جنت کے حاکم کر دیئے گئے اور خازن جنت رضوان ان کے سامنے مثل مطیع کے ہے کہ عمدہ عمدہ چیزیں جنت کی ان کو تحفہ دیتا ہے۔

پھر کہتے ہیں:

تَکْبِیْرَتَانِ حَیَالُ قَبْرِكَ لِلْفَتٰی مَحْسُوْبَتَانِ بِعُمْرَةٍ وَ طَوَافِ

یعنی دو مرتبہ اللہ اکبر کہنا ان کی قبر کے سامنے عمرہ و طواف کے برابر ہے۔

صاحبِ تنویر اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

یَصِفُهٗ بِالْفَضْلِ وَالدِّیْنِ وَ اِنَّ لِزِیَارَةِ قَبْرِهٖ مِنَ الْفَضِیْلَةِ مَا لِلْعُمْرَةِ وَ الطَّوَافِ بِالْبَیْتِ الْحَرَامِ.

ان کی فضیلت اور ان کا دین اس درجہ پر پہنچا ہوا ہے کہ ان کی زیارت قبر کو وہی فضیلت حاصل ہے جو عمرہ و طواف بیت الحرام کی فضیلت ہے۔

سبحان اللہ کیا جلالت ہے۔!!

پھر کہتے ہیں:

اَبْقَیْتَ فِینَا کَوْکَبَیْنِ سَنَاھُمَا فِی الصُّبْحِ وَ الظُّلَمَآءِ لَیْسَ بِخَافِ

چھوڑ گئے تم ہم لوگوں میں دو ستاروں کو جن کی رفعت و شہرت نہ سفیدیٔ صبح میں مخفی ہے، نہ ظلمتِ شب میں۔

قَالَ صَدْرُ الْاَفَاضِلِ فِیْ ضِرَامِ السِّقْطِ: اَعْنِیْ بِالْکَوْکَبَیْنِ ''الرَّضِیَّ'' وَھُوَ مِنْ اَھْلِ الْاَدَبِ، لَہٗ شِعْرٌ فَصِیْحٌ وَ اَخُوْہُ ''الْمُرْتَضٰی الْمُوْسَوِیُّ'' وَ ھُوَ اِمَامُ الشِّیْعَۃِ، عَارِفٌ بِالْکَلَامِ فِی الْاُصُوْلِ، وَ لَہٗ اَیْضًا شِعْرٌ، وَ ھُمَا اِبْنَا الشَّرِیْفِ الطَّاھِرِ ذِی الْمَنْقَبَتَیْنِ اَبِیْ اَحْمَدِ الْحُسَیْنِ الْعَلَوِیِّ، وَ ھُوَ الْمَرْثِیُّ بِھٰذِہِ الْفَائِیَّۃِ.

صدر الافاضل اس کی شرح میں لکھتے ہیں کہ مراد اس (کوکبین یعنی دو ستاروں) سے ایک سیّد رضی علیہ الرحمہ ہیں جو بڑے ادیب تھے اور بڑے شاعر اور دوسرے بھائی ان کے سیّد مرتضی علیہ الرحمہ ہیں جو شیعوں کے عالم ہیں اور علم کلام و اصول سے بخوبی واقف ہیں اور وہ بھی صاحب شعر ہیں۔ دونوں فرزند ہیں شریف طاہر ذی المنقبتین ابی احمد حسین علوی کے جن کے مرثیہ میں یہ قصیدہ فائیہ کہا گیا۔

سیّد مرتضیٰ و سیّد رضی کے مختصر حالات

اب سیّد مرتضیٰ و سیّد رضی علیہما الرحمہ کے حالات ملاحظہ ہوں کہ یہ دونوں بھائی فرزند ہیں نقیب النقباء سیّد ابو احمد حسین موسوی کے جن کے حالات اجمالاً مذکور ہوئے اور والدہ ماجدہ[1] ان کی فاطمہ بنت ابی محمد الحسن الناصر الصغیر بن ابی الحسن احمد بن ابی محمد الناصر الکبیر الاطروش بن علی بن الحسن بن علی الاصغر بن عمر الاشرف بن علی بن الحسین علیہم السلام ہیں۔ سیّد مرتضیٰ کی ولادت رجب ۳۵۵ھ میں ہے اور سیّد رضی علیہ الرحمہ کی ولادت ۳۵۹ھ میں ہے۔ چار برس کا تفاوت ہے۔

تعلیم کا عجیب واقعہ

تعلیم ابتدائی تو علی بن نباتہ[2] سے متعلق تھی جو مشہور خطیب تھے مگر بعد کو ان دونوں بزرگ زادوں کی تعلیم جناب شیخ مفید علیہ الرحمہ سے متعلق ہوئی جو اعلم علمائے شیعہ سے ہیں۔

اس تعلق تعلیم کا بھی عجیب واقعہ ہے۔ کیونکہ جناب شیخ مفید علیہ الرحمہ نے ایک شب خواب دیکھا کہ ہم مسجد کرخ (محلہ

---

[1] دیکھو عمدۃ الطالب۔

[2] اللؤلؤتی البحرین۔

بغداد) میں مقیم ہیں کہ جناب سیّدہ فاطمہ زہرا صلوات اللہ علیہا تشریف لائیں اور آپؑ کے ساتھ دو فرزند آپؑ کے امام حسن اور امام حسین علیہما السلام بھی تشریف لائے۔

شیخ مفید کہتے ہیں کہ جناب سیّدہ نے ان سے فرمایا: ''اے شیخ! ان دونوں کو فقہ کی تعلیم دو''۔ اس خواب سے شیخ مفید علیہ الرحمہ نہایت متعجب بیدار ہوئے۔ جب صبح ہوئی اور کچھ آفتاب بلند ہوا تو کیا دیکھتے ہیں کہ جناب فاطمہ بنت ناصر مع اپنے دونوں صاحبزادوں سیّد مرتضیٰ و سیّد رضی علیہ الرحمہ کے تشریف لائیں اور لونڈیاں گرداگرد ان کے حلقہ کئے ہوئے ہیں۔ جب داخل مسجد ہوئیں اور شیخ مفیدؒ کی ان پر نظر پڑی بغرض تعظیم اٹھ کھڑے ہوئے اور سلام کیا۔ بعدہ فاطمہ بنت الناصر نے فرمایا: اے شیخ! میں اپنے دونوں لڑکوں کو اس غرض سے آپ کے پاس لائی ہوں کہ ان کو فقہ کی تعلیم دو۔ یہ جملہ سُن کر شیخ مفید رحمہ اللہ رونے لگے اور سارا حال خواب کا بیان کیا۔ بعدہ دونوں صاحب زادوں کی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے اور وہ کمال ان کو حاصل ہوا جو قیامت تک مشہور رہے گا۔

یہ واقعہ اگرچہ اکثر کتب رجال شیعہ میں مذکور ہے کہ ہر شخص نے ان لوگوں کے حال میں اس واقعہ کو لکھا ہے۔ مگر ہم اس واقعہ حقہ کی تصدیق خود علمائے اہل سنت کی کتابوں سے بھی لکھتے ہیں تا کہ حقیقت اس واقعہ کی ظاہر ہو۔

علامہ ابن حجر عسقلانی لسان المیزان میں لکھتے ہیں:

وَكَانَ مَوْلِدُهٗ فِيْ رَجَبٍ ۳۵۵ھ، قَالَ ابْنُ اَبِيْ طَيٍّ: هُوَ اَوَّلُ مَن جَعَلَ دَارَهٗ دَارَ الْعِلْمِ وَ قَرَّرَهَا لِلْمُنَاظَرَةِ، وَيُقَالُ: اِنَّهٗ اَفْتٰى وَ لَمْ يَبْلُغِ الْعِشْرِيْنَ، وَكَانَ قَدْ حَصَلَ عَلٰى رِيَاسَةِ الدُّنْيَا وَالْعِلْمِ مَعَ الْعَمَلِ الْكَثِيْرِ فِي السِّرِّ وَالْمُوَاظَبَةِ عَلٰى تِلَاوَةِ الْقُرْاٰنِ وَ قِيَامِ اللَّيْلِ وَ اِفَادَةِ الْعِلْمِ، وَكَانَ لَا يُؤْثِرُ عَلَى الْعِلْمِ شَيْئًا مَعَ الْبَلَاغَةِ وَفَصَاحَةِ اللَّهْجَةِ، وَكَانَ اَخَذَ الْعُلُوْمَ عَنِ الشَّيْخِ الْمُفِيْدِ، وَ زَعَمَ اَنَّهٗ رَاٰى فَاطِمَةَ الزَّهْرَآءَ لَيْلَةً نَاوَلَتْهُ صَبِيَّيْنِ فَقَالَتْ: خُذِ ابْنَيَّ هٰذَيْنِ فَعَلِّمْهُمَا، فَلَمَّا اسْتَيْقَظَ وَافَاهُ الشَّرِيْفُ اَبُوْ اَحْمَدَ وَمَعَهٗ وَلَدَاهُ الرَّضِيُّ وَالْمُرْتَضٰى فَقَالَ لَهٗ: خُذْهُمَا اِلَيْكَ وَ عَلِّمْهُمَا، فَبَكٰى وَ ذَكَرَ الْقِصَّةَ.

وَ ذَكَرَ اَبُوْ جَعْفَرٍ الطُّوْسِيُّ: لَهٗ مِنَ التَّصَانِيْفِ: ''الشَّافِيْ فِي الْاِمَامَةِ'' خَمْسَ مُجَلَّدَاتٍ، ''الْمُلَخَّصُ وَ الْمُوْجَزُ فِي الْاُصُوْلِ'' وَ ''تَنْزِيْهِ الْاَنْبِيَآءِ'' وَ ''الدُّرَرِ وَالْغُرَرِ'' وَ ''مَسَآئِلِ الْخِلَافِ'' وَ ''الْاِنْتِصَارِ لِمَا انْفَرَدَتْ بِهِ الْاِمَامِيَّةُ''، وَ كِتَابُ ''الْمَسَآئِلِ'' كَبِيْرٌ جِدًّا، وَ كِتَابُ ''الرَّدِّ عَلَى ابْنِ جِنِّيٍّ فِيْ شَرْحِ دِيْوَانِ الْمُتَنَبِّيْ'' وَسَرَّدَ اَشْيَآءَ

كَثِيْرَةً.

يُقَالُ: اِنَّ الشَّيْخَ اَبَا اسْحٰقَ الشِّيْرَازِيَّ كَانَ يَصِفُهٗ بِالْفَضْلِ حَتّٰى نَقَلَ عَنْهُ اَنَّهٗ قَالَ: كَانَ الشَّرِيْفُ الْمُرْتَضٰى ثَابِتَ الْجَاشِ، يَنْطِقُ بِلِسَانِ الْمَعْرِفَةِ وَ يُوْرِدُ الْكَلِمَةَ الْمُسَدَّدَةَ فَتَمْرُقُ مُرُوْقَ السَّهْمِ فِي الرَّمِيَةِ مَا اَصَابَ اَصْمٰى وَ مَا اَخْطَاَ اَشْوٰى:

اِذَا شَرَعَ النَّاسُ الْكَلَامَ رَاَيْتَهٗ لَهٗ جَانِبٌ مِنْهُ وَلِلنَّاسِ جَانِبٌ

وَ ذَكَرَ بَعْضُ الْاِمَامِيَّةِ: اِنَّ الْمُرْتَضٰى اَوَّلُ مَنْ بَسَطَ كَلَامَ الْاِمَامِيَّةِ فِي الْفِقْهِ، وَ نَاظَرَ الْخُصُوْمَ، وَ اسْتَخْرَجَ الْغَوَامِضَ، وَ قَيَّدَ الْمَسَآئِلَ، وَ هُوَ الْقَائِلُ فِيْ ذٰلِكَ:

كَانَ لَوْلَايَ غَائِصًا مُكْرَعٌ اَلْفِقْهُ سَحِيْقُ الْمُدٰى بَحْرُ الْكَلَامِ

وَمَعَانٍ شَحْطِنٌ لُطْفاً عَنِ الْاِفْهَامِ قَرَّبَتْهَا مِنَ الْاِفْهَامِ

وَدَقِيْقٌ اَلْحَقْتُهٗ بِجَلِيْلٍ وَ حَلَالٌ خَلَّصْتُهٗ مِنَ الْحَرَامِ

وَ حَكَى ابْنُ بُرْهَانِ النَّحْوِيِّ: اِنَّهٗ دَخَلَ عَلَيْهِ وَ هُوَ مُضْطَجِعٌ وَ وَجْهُهٗ اِلَى الْحَآئِطِ وَ هُوَ يُخَاطِبُ نَفْسَهٗ وَ يَقُوْلُ: اَبُوْبَكْرٍ وَ عُمَرُ وَلِيَا فَعَدَلَا وَ اسْتَرْحَمَا فَرَحِمَا اَمَّا اَنَا اَقُوْلُ اِرْتَدَّا۔

اس عبارت سے اس واقعہ خواب کی بھی بخوبی تصدیق ہوئی جو سابقاً مذکور ہوا۔ فرق اس قدر ہے کہ وہاں جناب سیّد مرتضیٰ اور سیّد رضی کی والدہ فاطمہ بنت الناصر کا لانا بعد خواب کے مذکور ہے اور یہاں خود ان کے والد ماجد ابواحمد حسین کا جس میں چنداں تفاوت نہیں، کیونکہ ممکن ہے پہلے وہ تشریف لائیں ہوں اور بعدہ ان کے والد ماجد بھی آئے ہوں۔

بہر حال خود بھی خواب جلالت قدر وعظمت شان جناب سیّد مرتضیٰ وسیّد رضی علیہما الرحمہ کے لیے کافی ہے چہ جائیکہ ابن حجر عسقلانی یہ حالات لکھیں کہ

سیّد مرتضیٰ کی ولادت ۳۵۵ھ کو ہے۔ ابن ابی طی کا بیان ہے کہ سیّد مرتضیٰ اول شخص ہیں جنہوں نے اپنے گھر کو دار العلم بنایا اور مناظرہ کے لیے مقرر کیا اور ۲۰ برس کے بھی نہ ہوئے تھے کہ صاحب فتویٰ ہوئے۔ ریاست دنیا اور علم کے ساتھ عمل کثیر ان کا بھی مخفی طور پر ایسا بڑھا ہوا تھا کہ تلاوت قرآن، قیام شب، افادہ علم کے سوا کوئی شغل نہ تھا۔ بلکہ علمی امور کے مقابلہ میں کوئی چیز ان کو پسند نہ تھی۔ بلاغت وفصاحت ان کے علم کے ساتھ ضم تھی۔ شیخ مفید علیہ الرحمہ سے تحصیل علم کیا اور شیخ مفیدؒ کا گمان یہ ہے کہ انہوں نے خواب میں دیکھا جناب سیّدہ سلام اللہ علیہا کو کہ ان حضرتؑ نے دولڑکے بغرض تعلیم ان کے حوالہ کیے۔

اور ابوجعفر طوسیؒ نے ان کی فہرست تصانیف میں کہا ہے: کتاب "الشافی فی الامامہ" ۵ جلد، "ملخص موجز فی الاصول"،

"تنزیہ الانبیاء"، "دررو غرر"، "مسائل خلاف"، "انتصار"، کتاب المسائل جو ایک بہت بڑی کتاب ہے۔ کتاب "الرد علی بن جنی فی شرح دیوان المتنبی" وغیرہ وغیرہ۔

شیخ ابواسحٰق شیرازی بھی سیّد مرتضیٰ کے فضل وکمال کے معرّف تھے۔ چنانچہ ان کا مقولہ ہے کہ سیّد مرتضیٰ ثابت الجاش (قوی دل) تھے اور زبان معرفت سے کلام کرتے۔ ان کا کلام ایسا چست و درست ہوتا تھا جیسے کہ تیر نشانہ پر پڑے۔ جب کوئی ان سے مناظرہ کرتا تو سب ایک طرف ہوتے اور وہ تنہا ایک طرف کہ کوئی ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔

اور بعض امامیہ کا بیان ہے کہ سیّد مرتضیٰ علیہ الرحمہ اول شخص ہیں جنہوں نے فقہ شیعہ میں کلام کو بسط دیا اور مخالفین سے مناظرہ کیا اور غوامض ودقائق کو ضبط کیا جیسا کہ وہ خود بھی اپنے اشعار میں اس کی طرف اشعار کرتے ہیں۔

جو حالات کہ علامہ ابن حجر نے اپنے قلم سے لکھے وہی اظہار فضائل جناب سیّد مرتضیٰ کے لیے کافی ہیں چہ جائیکہ انہوں نے اپنے مذہب کے عالم اجل ابواسحٰق شیرازی سے ایسے اقوال مع ثنا نقل کیے جس سے عظمتِ سیّد کا پایہ اور بھی رفیع ہوا۔ کیونکہ یہ اہل سنت کے شیخ الاسلام ہیں اور ان کے فضائل ومناقب کا احاطہ دشوار ہے۔

علامہ ذہبی "سیر النبلا" میں ناقل ہیں:

قَالَ ابُو بَكْرٍ الشَّاشِيُّ: ''اَبُوْ اسْحٰقَ'' حُجَّةُ اللهِ عَلٰى اَئِمَّةِ الْعَصْرِ، وَ قَالَ الْمُوَفَّقُ الْحَنَفِيُّ: ''اَبُوْ اسْحٰقَ'' اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي الْفُقَهَآءِ.

پھر ایسے شخص کی مدح وثنا بحق جناب سیّد مرتضیٰؒ کیسی مستند ہوگی۔

شیخ مفیدؒ کا مختصر تذکرہ

یہاں چونکہ جناب شیخ مفید علیہ الرحمہ کا ذکر خیر بھی آ گیا کہ انہوں نے سیّد مرتضیٰ وسیّد رضی کی تعلیم کے لیے جناب سیّدہؑ کو خواب میں دیکھا اور سیدین نے جو کچھ حاصل کیا وہ جناب شیخ مفیدؒ سے، لہذا اجمالاً ان کا ذکر خیر بھی مناسب ہے۔ کیونکہ تعلیم کا اثر بھی تولیدی تاثیر سے کم نہیں۔

علامہ ذہبی کتاب ''**العبر**'' میں بذیل وقائع ۴۱۳ھ لکھتے ہیں:

وَالشَّيْخُ الْمُفِيْدُ: اَبُوْ عَبْدِ اللهِ مُحَمَّدُ بْنُ النُّعْمَانِ الْبَغْدَادِيُّ الْكَرْخِيُّ، وَ يُعْرَفُ اَيْضًا بِـ''ابْنِ الْمُعَلِّمِ''، عَالِمُ الشِّيْعَةِ، وَ اِمَامُ الرَّافِضَةِ، وَ صَاحِبُ التَّصَانِيْفِ الْكَثِيْرَةِ، قَالَ ابْنُ اَبِيْ طَيٍّ فِيْ تَارِيْخِ الْاِمَامِيَّةِ: هُوَ شَيْخُ الْمَشَايِخِ الطَّائِفَةِ، وَ لِسَانُ الْاِمَامِيَّةِ، وَ رَئِيْسُ الْكَلَامِ وَ الْفِقْهِ وَ الْجَدَلِ، وَ كَانَ يُنَاظِرُ اَهْلَ كُلِّ عَقِيْدَةٍ مَعَ

الْجَلَالَةِ الْعَظِيْمَةِ فِي الدَّوْلَةِ الْبُوَيْهِيَّةِ، قَالَ: وَ كَانَ كَثِيْرَ الصَّدَقَاتِ، عَظِيْمَ الْخُشُوْعِ، كَثِيْرَ الصَّلٰوةِ وَ الصَّوْمِ، خَشِنَ اللِّبَاسِ، وَ قَالَ غَيْرُهٗ: كَانَ عَضُدُالدَّوْلَةُ رُبَّمَا زَارَ الشَّيْخَ الْمُفِيْدَ وَ كَانَ شَيْخًا رَبْعَةً نَحِيْفًا اَسْمَرَ، عَاشَ سِتًّا وَ سَبْعِيْنَ سَنَةً، وَ لَهٗ اَكْثَرُ مِنْ مِائَتَيْ مُصَنَّفٍ، كَانَتْ جَنَازَتُهٗ مَشْهُوْدَةً وَ شَيَّعَهٗ ثَمَانُوْنَ اَلْفًا مِنَ الرَّافِضَةِ وَ الشِّيْعَةِ، وَ اَرَاحَ اللّٰهُ مِنْهُ وَ كَانَ مَوْتُهٗ فِيْ رَمَضَانَ.

اور علامہ ابن حجر عسقلانی ''**لسان المیزان**'' میں رقمطراز ہیں:

مُحَمَّدُ بْنُ مُحَمَّدِ بْنِ النُّعْمَانِ الشَّيْخُ الْمُفِيْدُ عَالِمُ الرَّافِضَةِ، اَبُوْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنُ الْمُعَلِّمِ صَاحِبًا لِتَصَانِيْفِ الْبِدْعِيَّةِ وَ هِيَ مِائَتَا تَصْنِيْفٍ طَعَنَ فِيْهَا عَلَى السَّلَفِ، لَهٗ صَوْلَةٌ عَظِيْمَةٌ بِسَبَبِ عَضُدِ الدَّوْلَةِ، شَيَّعَهٗ ثَمَانُوْنَ اَلْفَ رَافِضِيٍّ، مَاتَ ۴۱۳ھ اِنْتَهٰى.

قَالَ الْخَطِيْبُ: صَنَّفَ كُتُبًا كَثِيْرَةً فِيْ ضَلَالِهِمْ وَالذَّبِّ عَنِ اعْتِقَادِهِمْ وَ الطَّعْنِ عَلَى الصَّحَابَةِ وَالتَّابِعِيْنَ وَاَئِمَّةِ الْمُجْتَهِدِيْنَ، وَ هَلَكَ بِهَا خَلْقٌ اِلٰى اَنْ اَرَاحَ اللّٰهُ مِنْهُ فِيْ شَهْرِ رَمَضَانَ، قُلْتُ: وَ كَانَ كَثِيْرَ التَّقَشُّفِ وَ التَّخَشُّعِ وَ الْاِكْبَابِ عَلَى الْعِلْمِ، تَخَرَّجَ بِهٖ جَمَاعَةٌ وَ بَرِعَ فِيْ اَفْعَالِهِ الْاِمَامِيَّةِ حَتّٰى كَانَ يُقَالُ: لَهٗ عَلٰى كُلِّ اِمَامِيٍّ مِنَّةٌ، وَ كَانَ اَبُوْهُ مُقِيْمًا بِوَاسِطٍ وَ وُلِدَ الْمُفِيْدُ بِهَا وَقِيْلَ بِعُكْبَرَا، وَ يُقَالُ: اِنَّ عَضُدَ الدَّوْلَةِ كَانَ يَزُوْرُهٗ فِيْ دَارِهٖ وَ يَعُوْدُهٗ اِذَا مَرِضَ.

وَ قَالَ الشَّرِيْفُ اَبُوْ يَعْلَى الْجَعْفَرِيُّ وَ كَانَ تَزَوَّجَ بِنْتَ الْمُفِيْدِ: مَا كَانَ الْمُفِيْدُ يَنَامُ مِنَ اللَّيْلِ اِلَّا هَجْعَةً ثُمَّ يَقُوْمُ يُصَلِّيْ اَوْ يُطَالِعُ اَوْ يُدَرِّسُ اَوْ يَتْلُو الْقُرْاٰنَ.

خلاصہ ان عبارتوں کا یہ ہے کہ شیخ مفیدؒ کا نام محمد بن محمد بن نعمان ہے، لقب شیخ مفید۔ رافضیوں (شیعہ) کے عالم ہیں، لقب ''ابن المعلّم'' مشہور ہیں، صاحبِ تصانیف کثیرہ ہیں، دوسوجلدان کے مصنّفات سے ہے جس میں تمام تر طعن کیا ہے اسلاف اہل سنت پر۔ ان کا حملہ نہایت سخت ہوتا تھا بسبب عضدولہ کے ۴۱۳ھ میں وفات کی۔ ۸۰ ہزار رافضیوں نے ان کے جنازہ کی مشایعت کی۔ یہ کلام ذہبی ہے۔

اور خطیب بغدادی کا بیان ہے کہ بہت سی کتابیں شیعوں کے گمراہ (ہدایت) کرنے کے لیے تصنیف کیں اور ان کے اعتقادات پر جو اعتراض تھا اس کو دفع کیا اور صحابہ و تابعین و ائمہ مجتہدین پر طعن کیا جس سے خلق کثیر ہلاک ہوئی (ہدایت پائی) یہاں تک کہ خدا نے راحت دی سنیوں کو بہ سبب ان کی وفات کے ماہ رمضان ۴۱۳ھ میں۔

ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں کہ جناب شیخ مفید علیہ الرحمہ نہایت ہی زاہد اور خاضع و خاشع اور ہمہ وقت علوم میں منہمک رہتے۔ بہت سے علماء ان کی بدولت درجہ کمال پر فائز ہوئے، یہاں تک کہ کہا جاتا ہے ان کا احسان عام ہے تمامی شیعہ پر۔

ان کے والد "واسط" میں قیام پذیر تھے کہ ان کی ولادت ہوئی اور بعض لوگوں کا بیان ہے کہ مقام "عکبرا" میں قیام تھا۔ لوگوں کا بیان ہے کہ عضد الدولہ (بادشاہ آل بویہ) اکثر ان کی زیارت کے لیے خود ان کے دولت خانہ پر آتا اور عیادت کرتا۔

شریف ابو یعلی دامادِ شیخ مفیدؒ کا بیان ہے کہ شیخ مفیدؒ شب کو بہت ہی کم سوتے تھے، بیدار ہو کر یا نماز پڑھا کرتے یا کتب بینی کرتے یا درس دیتے یا تلاوت قرآن کرتے۔

ان حالات سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ جناب شیخ مفید علیہ الرحمہ کس درجہ کے عالم ربانی تھے کہ بجز عبادت و تلاوت قرآن و درس و تدریس کوئی مشغلہ نہ تھا۔ یہاں تک کہ علمائے اہل سنت ان کے وفات کو اپنے لیے موجب راحت سمجھتے ہیں جس سے معلوم ہوا ان کا وجود ذیجود ان پر عذاب الٰہی تھا جس سے بعد وفات ان کی گلوخلاصی ہوئی۔

لقب ''مفید'' کے بارے میں ایک واقعہ

شیخ مفید علیہ الرحمہ کا لقب ''مفید'' عطاہائے جناب حضرت حجت عجل اللہ ظہورہ سے ہے، جیسا کہ ابن شہر آشوب نے معالم میں تحریر فرمایا ہے، لیکن اہل سنت بھی اس کے معترف و مقر ہوئے ہیں اور ان کو ''مفید'' سے ملقب کیا ہے۔ بعض لوگوں نے اس کی نسبت شیخ علی بن عیسیٰ رمانی کی طرف دی ہے جو اس زمانہ میں معتزلہ کے امام تھے اور بعض لوگوں نے شیخ عبدالجبار معتزلی کی طرف جس کی کتاب ''مغنی'' مشہور ہے اور اسی کا جواب سیّد مرتضیٰ علیہ الرحمہ نے شافی میں دیا ہے۔ خلاصہ اس حکایت کا یہ ہے کہ شیخ مفید کا عنفوان شباب تھا، فارغ التحصیل ہو چکے تھے، کچھ کچھ ان کی شہرت پھیل رہی تھی کہ قاضی عبدالجبار معتزلی کی مجلس درس میں حاضر ہو کر صف نعل میں بیٹھ گئے۔ علمائے فریقین کا مجمع تھا، بڑے بڑے ملّا زانوئے ادب تہہ کیے بیٹھے تھے۔ شیخ مفیدؒ نے اجازت چاہی کہ اگر حکم ہو تو ایک مسئلہ پوچھیں، ان سب علماء کے سامنے یا تخلیہ میں؟ قاضی عبدالجبار کو اپنے علم کا غرہ تھا، کیا جانتا تھا بلائے ناگہانی کا نزول ہے، بے دھڑک کہا جو چاہو سوال کرو۔

شیخ مفیدؒ: حدیث غدیر "مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَعَلِیٌّ مَوْلَاہُ" کے بارے میں آپ کا کیا ارشاد ہے؟ حدیث صحیح ہے یا کیا؟

قاضی: بے شک یہ حدیث صحیح ہے۔

شیخ مفیدؒ: ''مولا'' کے معنی کیا ہیں؟

جواب: وہی اولیٰ بتصرف۔

شیخ مفیدؒ: پھر اس اختلاف کی کیا وجہ جو شیعہ و سنی میں قائم ہے؟ (کیونکہ جب نص صریح موجود پھر اس کی مخالفت کیونکر جائز ہے)۔

عبدالجبار: برادرِ من! حدیث غدیر "روایت" ہے جو سنی جاتی ہے اور خلافت ابوبکر "درایت" ہے (واقعہ چشم دید)، تو "درایت" کے مقابلہ میں کوئی عاقل "روایت" کی کیا وقعت رکھتا ہے۔

شیخ مفیدؒ یہ جواب سُن کر خاموش ہو رہے اور دوسرے مسائل میں کلام کرتے رہے، اس بحث کو چھوڑ دیا۔ پھر یہ سوال کیا کہ اس حدیث کے بارے میں کیا فرماتے ہیں جو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا بحق جناب امیرؑ: "حَرْبُكَ حَرْبِيْ وَسِلْمُكَ سِلْمِيْ"۔

قاضی: بے شک یہ حدیث صحیح ہے۔

شیخ مفیدؒ: پھر اصحاب جمل کے بارے میں کیا حکم ہے جنہوں نے جناب امیرؑ سے قتال کیا۔ کیونکہ بقول تمہارے وہ سب کافر ہوئے۔

قاضی: ان لوگوں نے توبہ کی۔

شیخ مفیدؒ: جنگ کرنا "درایت" (واقعہ چشم دید ہے) اور توبہ کرنا "روایت" ہے اور تم پہلے کہہ چکے ہو کہ "درایت" کے مقابلہ میں "روایت" کوئی چیز نہیں۔

قاضی یہ سن کر مبہوت ہو گئے اور ایک ساعت تک سر جھکائے رہے۔ پھر پوچھا تم کون ہو؟

شیخ مفیدؒ: میں ہوں تمہارا خادم محمد بن محمد بن نعمان۔

یہ سن کر قاضی اپنی جگہ سے اُٹھے اور شیخ مفیدؒ کا ہاتھ پکڑ کر اپنی مسند پر لے گئے اور کہا: "اَنْتَ الْمُفِيْدُ حَقًّا"۔

اس کلام اور حرکت قاضی نے تمامی علما کے چہرے بگاڑ دیے۔ صورت سے ان کی ناراضی نمایاں تھی۔ قاضی نے کہا: "اَيُّهَا الْعُلَمَآءُ وَ الْفُضَلَآءُ"! اس شخص نے مجھ کو لاجواب کر دیا، کوئی جواب مجھ سے نہیں بن پڑتا۔ اگر تم لوگ اس کا جواب دو تو میں اسے اٹھا دوں اور تم لوگ اس کی جگہ پر آؤ۔ مگر جب استاد عاجز تھے تو شاگرد کیا جواب دے سکتے۔ یہ خبر ایسا جلد مشہور ہوئی کہ تمام شہر میں اس کی دھوم مچ گئی۔ عضد الدولہ نے سنا تو اپنے مکان پر بلا بھیجا اور یہ ماجرا خود ان کی زبان سے سنا اور خلعت و انعام دے کر بکمال احترام رخصت کیا۔

علی بن موسیٰ رمانی والی حکایت میں بھی یہی مضمون درایت و روایت ہے جس کے جواب سے وہ عاجز آیا اور نام ان کا اور ان کے استاد کا دریافت کر کے اپنے زنانہ مکان میں گیا، وہاں جا کر ایک رقعہ بنام استاد شیخ مفید علیہ الرحمہ تحریر کیا جس میں شیخ مفید علیہ الرحمہ کے بارے میں بہت کچھ وصیت کی تھی اور سارا ماجرا لکھ کر بہ لقبِ "مفید" ان کو ملقب کیا۔

غرض جناب سیّد مرتضیٰ اور سیّد رضی علیہما الرحمہ ایسے استاد کے شاگرد تھے جن کے فضل و کمال کا تمام دوست و دُشمن کو اقرار تھا اور سب ان کے مقابلہ سے ایسا عاجز تھے کہ بجز ان کی موت کے ان لوگوں کو راحت نہ مل سکتی تھی۔ پھر ان کے ان ارشد تلامذہ کا کیا حال ہوگا جن کی تعلیم عالم رؤیا میں بحکم جناب سیّدہ ان سے متعلق ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ استاد ابو اسحٰق کا بیان مذکور کہ سب ایک طرف ہوتے تھے اور سیّد مرتضیٰ تنہا ایک طرف اور سب پر غالب آتے۔

سیّد مرتضیٰ کا لقب ''علم الہدیٰ'' مشہور ہے۔ ابوسعید محمد بن حسین بن عبدالصمد وزیر نے ۴۲۰ھ میں اس مضمون کا خواب دیکھا تھا کہ جناب امیر علیہ السلام ان سے کہہ رہے ہیں: تم علم الہدیٰ سے یہ کہو۔ اس نے پوچھا علم الہدیٰ کون ہے؟ حضرتؑ نے فرمایا: علی بن حسین موسوی (سیّد مرتضیٰ)۔ چنانچہ جب وزیر نے اس لقب سے سیّد مرتضیٰ کو رقعہ لکھا تو انہوں نے انکار کیا کہ یہ لقب نہایت عظیم الشان ہے ہم اس کے لائق نہیں۔ تب وزیر نے جواب دیا لقب میں نے نہیں دیا بلکہ آپؑ کے جدامجد علی مرتضیٰ علیہ السلام نے آپ کو اس لقب سے ملقّب کیا ہے۔

علمائے اہل سنت نے اس لقب کو بھی بدانست خود غصب کر لیا۔ بہت سے علما کو اس لقب سے ملقب کیا۔ آخری لقب یہ قاضی ثناءاللہ پانی پتی کو دیا گیا جو شاہ ولی اللہ کے شاگرد اور شاہ عبدالعزیز دہلوی کے پیر بھائی ہیں۔

سیّد مرتضیٰ کا ایک لقب ''ثمانینی'' بھی ہے، کیونکہ ہر چیز اَسّی اَسّی جمع کی تھی۔ چنانچہ سن ان کا بھی ۸۰ سال ۸ مہینہ تھا اور کل کتابیں ان کی جس میں ان کے تصنیفات بھی شامل ہیں اور مقررات وغیرہ کی تعداد اسی ہزار ہے۔ اکثر شاگردوں کو اپنے مال سے وظیفہ دیا کرتے اور ایک گاؤں صرف اس غرض سے وقف کیا تھا کہ اس کے محاصل سے طلبہ اور علما کے لیے کاغذ خریدا جائے۔ تصنیفات ان کے کثرت سے ہیں کہ حد و حصر ان کی مشکل ہے۔ چنانچہ دو چار کتابوں کا نام ابن حجر عسقلانی کی عبارت سے سابقاً ظاہر ہوا۔

وفات ان کی ۲۵ ربیع الاول ۴۳۶ھ کو ہے اور نماز جنازہ ان کے فرزند ارجمند ابوجعفر محمد نے پڑھی۔ پہلے اپنے گھر میں مدفون ہوئے، پھر نعش ان کی کربلائے معلّٰی کی طرف منتقل کی گئی اور روضۂ جناب سیّد الشہداءؑ میں مدفون ہوئے۔ ۳۰ برس بعد اپنے بھائی سیّد رضی رحمہ اللہ کے زندہ رہے اور نقابت طالبین و امارتِ حج انہیں سے متعلق تھی۔

سیّد رضی علیہ الرحمہ

سیّد رضی علیہ الرحمہ کا اشترا کی حال تو جناب سیّد مرتضیٰ کے ساتھ مذکور ہوا کہ شیخ مفیدؒ کے خواب میں دونوں بھائیوں کو جناب سیّدہ نے سپرد کیا تھا۔ تعلیم دونوں بھائیوں کی نہایت اعلیٰ پیمانہ پر ہوئی تھی۔ تیزی و حدّت ذہن و ذکا میں یہ اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ چنانچہ ابن السیرافی کی حکایت مشہور ہے کہ فن نحو کا امام تھا سیّد رضی۔ بہت ہی صغیر السّن تھے۔ نحو انہی ابن سیرافی سے پڑھا کرتے۔ ایک روز ابن سیرافی نے بطور امتحان سوال کیا کہ ''عمر'' (یہ لفظ بقاعدہ فن نحو غیر منصرف ہے کہ اس پر تنوین نہیں آتی، اسی بنیاد پر سوال کیا کہ چونکہ ''عمر'' غیر منصرف ہے اس لیے اس پر تنوین تو آتی نہیں پھر اس) میں علامت نصب کیا ہے؟ سیّد رضیؒ نے جواب دیا: اس کے نصب کی علامت بغض علیؑ ہے۔ (کیونکہ ایک معنی ''نصب'' کے بغضِ اہل بیتؑ ہے جس سے ''ناصبی'' کہا جاتا ہے)۔ اس جواب سے ابن سیرافی اور کل حضّارِ جلسہ نہایت متعجب ہوئے۔

دس برس سے کچھ سن متجاوز ہوا تھا کہ انہوں نے شعر کہنا شروع کیا اور اس فن میں ایسا کمال بہم پہنچایا کہ تمامی قریش میں ابتدا سے انتہا تک ان کا کوئی ہمسر نہ ہوا۔ ابوالحسن عامری ناقل ہے کہ سیّد مرتضیٰ نے دو شعر کہے تھے عربی میں جو نہایت اعلیٰ درجہ کے شعر تھے۔ ہم نے ان دونوں شعروں کو جا کر سیّد رضیؒ سے بیان کیا۔ برجستہ انہوں نے اسی ردیف و قافیہ میں ایسے دو شعر کہے کہ معلوم ہوتا ہے ایک ہی شخص کا کلام ہے۔ سیّد مرتضیٰؒ سے ہم نے ان دونوں شعروں کو بیان کیا تو کہا: یہی تیزی ذہن کی ان کو ہلاک کرے گی۔ چنانچہ چند ہی روز بعد سیّد رضی بیمار ہوئے اور انتقال کیا۔

شعر سیّد مرتضیٰؒ

سَرٰی طَیْفُ سَعْدِیْ فَارِقاً فَاسْتَفَزَّنِیْ ھُبُوْباً وَصَحْبِیْ بِالْفَلَاۃِ رُقُوْدٌ

فَقُلْتُ لِعَیْنَیَّ عَاوِدِی النَّوْمَ وَاھْجَعِیْ لَعَلَّ خَیَالاً طَارِقاً سَیَعُوْدُ

شعر سیّد رضی فی البدیہہ

فَرَدَّتْ جَوَابًا وَالدُّمُوْعُ بِوَادِرٍ وَقَد اٰنَ لِلشَّمْلِ الْمُشَتَّتِ وُرُوْدٌ

فَھَیْھَاتَ مَنْ لَقِیَا حَبِیْبٌ تَعَرَّضَتْ لَنَا دُوْنَ لَقِیَاہُ مَھَامَہٌ بِیَدٍ

معلوم ہوتا ہے کہ جناب سیّد رضیؒ پر ابتدا ہی سے علم ادب کا مذاق ایسا غالب تھا کہ باوصفی کہ جناب شیخ مفیدؒ سے تعلیم میں اپنے بھائی کے شریک رہے مگر فطری مذاق سب پر غالب رہا۔ جو لطف آپ کو اس فن ادب سے تھا وہ دلچسپی دیگر فنون میں نہیں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ کہا جاتا ہے کچھ بعد دس برس کے انہوں نے شعر کہنا شروع کیا اور ایسا مذاق غالب تھا کہ ثعالبی سے ادیب نے کہا ہے:

> ھُوَ اَشْعَرُ الطَّالِبِیْنَ مَنْ مَضٰی مِنْھُمْ وَمَنْ غَبَرَ عَلٰی کَثْرَۃِ شُعَرَائِھِمُ الْمُفْلِقِیْنَ وَلَوْقُلْتُ اِنَّہٗ اَشْعَرُ قُرَیْشٍ لَمْ اَبْعُدْ عَنِ الصِّدْقِ.
>
> یعنی تمامی طالبین میں ان کا حصّہ شعر گوئی میں بڑھا ہوا ہے حالانکہ جیسے جیسے عالی درجہ کے شعرا ان میں بکثرت گزرے ہیں وہ سب کو معلوم ہے۔ بلکہ اگر میں کہوں کہ تمامی قریش میں ان کے مقابلہ کا کوئی شاعر نہیں گزرا تو یہ دعویٰ غلط نہیں ہوسکتا۔

کبر نفس و عالی ہمّتی میں بھی یہ سب سے ممتاز تھے۔ کبھی انہوں نے صلہ یا انعام کسی کا نہ قبول کیا۔ یہاں تک کہ اپنے والد ماجد کے صلہ یا انعام کو بھی نہ قبول کرتے تھے۔ سلاطین بنی بویہ نے بہت کچھ کوشش کی کہ کسی طرح ان کا صلہ اور جائزہ و انعام قبول کریں مگر کبھی نہ راضی ہوئے۔ درحقیقت یہ صفت فی نفسہ جیسی اعلیٰ ہے اور خصوصًا اہل علم کے لیے وہ

محتاج بیان نہیں، مگر اس صفت پر سب کی نظر کا پڑنا غالباً بوجہ شاعری کے زیادہ ہے۔ کیونکہ عموماً شعرا جوائز وانعام پاتے ہیں اور وہ طالب ہوتے ہیں۔ مگر سیّد رضیؒ جہاں فن شاعری میں اپنا مثل نہ رکھتے تھے اس کے نقائص ومعائب سے بھی ایسا مبرّا تھے کہ کبھی نہ اس کے روادار ہوئے کہ اپنے باپ کا انعام قبول کریں چہ جائیکہ اور لوگوں کے انعام کو قبول کرتے۔

سیّد رضیؒ کی عالی ہمتی کی ایک حکایت

سیّد رضی علیہ الرحمہ کی یہ صفت اگرچہ بہت مشہور ہے، لیکن اس کے متعلق بعض علمائے اہل سنت نے اپنے طریقہ قدیمہ سے کام لے کر ایک ایسی حکایت بنائی ہے جس سے سیّد رضی علیہ الرحمہ کی تو خوبی نفس ظاہر ہو مگر جناب سیّد مرتضیٰؒ کی جو سرشکن علمائے مخالفین تھے فی الجملہ توہین ہو۔

چنانچہ ابو حامد محمد بن محمد اسفرائینی فقیہ شافعی ناقل ہے کہ مَیں ایک روز فخر الملک کے دربار میں حاضر تھا جو بہاء الدولہ کے وزیر تھے کہ جناب سیّد رضی علیہ الرحمہ تشریف لائے۔ وزیر نے نہایت عظیم وتکریم سے ان کا استقبال کیا اور جس قدر دفتر کے کاغذ وغیرہ تھے دستخط کے لیے حاضر تھے سب کو ہٹا دیا، بکمال ادب ان سے باتیں کرتے رہے، یہاں تک کہ جناب سیّد رضیؒ رخصت ہوئے اور اپنے مکان پر تشریف لے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد جناب سیّد مرتضیٰ علیہ الرحمہ تشریف لائے تو ان کی نہ ویسی تعظیم کی اور نہ وہ احترام، کاروبار میں بھی اشتغال رہا ان سے بھی بات چیت کرتے رہے، یہاں تک کہ وہ بھی رخصت ہوئے اور تشریف لے گئے۔ تب مَیں نے عرض کیا کہ یہ سیّد مرتضیٰ کیسے عالم جلیل القدر ہیں جو تمامی علوم وفنون میں اپنا مثل ونظیر نہیں رکھتے ان کی تو آپ نے معمولی تعظیم کی اور سیّد رضیؒ جو صرف ایک مرد شاعر ہیں ان کی تعظیم وتکریم میں اس درجہ اہتمام کیا، اس کی کیا وجہ؟ وزیر نے کہا: جب مجمع برخاست ہوا اور مَیں فارغ ہو جاؤں تو اس کا جواب دوں گا۔

بعد فراغ کاروبار وزیر نے اپنے خادم سے کہا کہ سیّد رضیؒ کا وہ رقعہ جو ہم نے فلاں مقام پر رکھوایا تھا اور سیّد مرتضیٰؒ کا وہ خط جو فلاں جگہ ہے لے آؤ۔ جب غلام دونوں رقعوں کو لایا تو وزیر نے کہا: دیکھو یہ رقعہ سیّد رضیؒ کا ہے جس کا یہ قصہ ہے کہ جب ان کے یہاں فلاں لڑکے کی ولادت ہوئی تو دوستانہ طور پر مجھ کو اس کی خبر دی۔ اس پر میں نے ہزار اشرفی بطور ہدیہ ان کو بھیجی اور رقعہ لکھا کہ یہ ہدیہ نذر قابلہ کے لیے روانہ کرتا ہوں، آپ اسے قبول فرمائیں۔ کیونکہ باخود ہا دوستوں میں یہی دستور جاری ہے۔ اس کے جواب میں سیّد رضی نے بہت کچھ معذرت کے بعد لکھا تھا کہ ''ہمارے خاندان کا یہ دستور نہیں غیر قابلہ ہمارے حالات سے مطلع ہوں، یہ کل خدمتیں ہمارے گھر کی بزرگ عورتیں خود انجام دیتی ہیں جو نہ کسی طرح اجرت لیتی ہیں نہ کوئی انعام وصلہ''۔ اس کے بعد سیّد مرتضیٰ کے رقعہ کا حال بیان کیا کہ ہم لوگوں نے انہیں اپنے امور سلطنت میں دخل دیا ہے اور بہت سی جائیدادیں اور املاک ان کے قبضہ میں ہے۔ ان کی ایک جائیداد پر صرف ایک دینار مالگذاری لگائی گئی ہے جس کے

بارے میں انہوں نے یہ رقعہ لکھا ہے۔ ابوحامد کا بیان ہے کہ وہ رقعہ سوسطر کا ہوگا جس میں تمام تر خوشامد اور آرزو منّت اس کی ہے کہ یہ مال گذاری معاف کردی جائے۔ بعدہ وزیر نے کہا: اب بتاؤ کون شخص زیادہ مستحق تعظیم ہے؟ سیّد رضیؒ جو اگرچہ مرد شاعر ہیں مگر یہ نفس عالی رکھتے ہیں یا سیّد مرتضیٰؒ جو اگرچہ تمامی صفات کمال سے متصف ہیں مگر نفس ان کا ایسا ہے۔ ابوحامد نے جواب دیا: بے شک وہی زیادہ مستحق تعظیم ہیں [1]

تعجب ہے کہ وزیر نے یا اس فقیہ راوی قصّہ نے اس پر نہ غور کیا کہ چونکہ جناب سیّد رضیؒ نے اپنے تعلقات کو کم کردیا تھا، گوشہ نشیں تھے، لہٰذا اُن کو ضرورت کم تھی، بخلاف سیّد مرتضیٰ علیہ الرحمہ کے جو صرف دنیاوی حیثیت سے نہیں بلکہ علمی اور مذہبی حیثیت سے بھی رئیس مانے گئے تھے۔ صرف کاغذ کے لیے ایک گاؤں وقف کیا تھا۔ اپنے شاگرد شیخ ابوجعفر طوسی علیہ الرحمہ کو روزانہ بارہ اشرفی دیا کرتے، ابن براج کو آٹھ اشرفی کا مہینہ دیتے تھے یہاں تک کہ یہودیوں نے صرف اسی دنیا کی غرض سے ان کی شاگردی قبول کی کہ انعام و جواہر سے ان کے کامیاب ہوں، کیونکہ وہ زمانہ قحط کا تھا۔ چنانچہ چند ہی روز بعد وہ یہودی صدق دل سے مسلمان ہوا۔ [2]

---

[1] یہ حکایت عمدۃ الطالب میں اس طور پر مرقوم ہے کہ شریف مرتضیٰ پہلے تشریف لائے تو وزیر نے کھڑے ہوکر ان کی تعظیم کی اور اپنے پاس بٹھلایا اور اُن سے بات کرتے رہے یہاں تک کہ اُن کے مہمات سے فارغ ہوئے اور وہ تشریف لے گئے۔ وزیر نے تعظیم کرکے اُن کو رخصت کیا بعدہ جناب سید رضیؒ تشریف لائے اس وقت وزیر نے ایک رقعہ لکھنا شروع کیا تھا مگر یہ خبر سنتے ہی سب کام دھندے کو چھوڑ دیا اور دہلیز تک جاکر اُن کی پیشوائی کی اور بکمال ادب اُن کے روبرو بیٹھے رہے۔ یہاں تک کہ وہ بھی رخصت ہوئے اور دہلیز تک پہنچانے گئے۔ ابواسحاق کا بیان ہے کہ جب مجمع برخاست ہوا تو میں نے سوال کرنا چاہا اُس پر خود وزیر نے بیان کیا کہ فلاں نہر کھودنے کا حکم دیا جس سے شریف مرتضیٰ پر ۲۰ درہم عائد ہوا اُس کے بارے میں انہوں نے چند مرتبہ رقعہ لکھا بخلاف اس کے جب سید رضی کے یہاں لڑکا پیدا ہوا تو ہم نے ہزار اشرفیاں بھیجیں مگر انہوں نے واپس کیا یہ کہہ کر کہ وزیر کو خوب معلوم ہے کہ ہم کسی کی کوئی چیز نہیں قبول کرتے دوبارہ میں نے کہلوایا کہ یہ مال قابلہ کے لیے ہے تو جواب دیا ہماری عورتیں بھی اس قسم کا مال نہیں قبول کرتیں۔ تیسری بار ہم نے کہلوایا کہ اچھا طالب العلموں کو تقسیم کردیجئے۔ تو آپ نے فرمایا یہ طالب العلم موجود ہیں جو چاہیں لے لیں۔ ایک طالب علم نے ایک اشرف لی اور اس میں سے ایک ٹکڑا توڑ لیا اور مابقی کو اس طبق میں ڈال دیا سید رضی علیہ الرحمہ نے اس کی وجہ دریافت کی تو جواب دیا شب کو چراغ کے لیے تیل کی ضرورت ہوئی تو آپ کا خزانہ بند تھا اور خازن موجود نہ تھا لہٰذا فلاں بقال سے تیل قرض لیا۔ اس لیے ٹکڑا لیا ہے کہ اس بقال کا قرضہ ادا کردیں۔ چونکہ سید رضی علیہ الرحمہ نے اپنے شاگردوں کے لیے ایک مکان علیحدہ بنوادیا تھا جس کا نام دارالعلم تھا اور طلباء کے لیے ہر طرح کا سامان مہیا کیا تھا اور اس کا خازن بھی تھا لہٰذا سید رضی علیہ الرحمہ نے یہ حکایت سن کر حکم دیا کہ خزانہ کی کنجیاں مطابق عدد طلباء بنوائی جائیں تاکہ ہر طالب علم کے پاس کنجی رہے اور کوئی اس کا محتاج نہ ہو کہ جب خازن آئے اور خزانہ کھولے تب ان لوگوں کی رفع ضرورت ہو۔ ص ۱۹۶۔

[2] وَكَانَ نَحِيْفَ الْجِسْمِ حُسْنَ الصُّوْرَةِ، وَكَانَ يُدَرِّسُ فِيْ عُلُوْمٍ كَثِيْرَةٍ، وَ يَجْرِي عَلٰى تَلَامِذَتِهٖ رِزْقًا، فَكَانَ لِلشَّيْخِ اَبِيْ جَعْفَرٍ الطُّوْسِيِّ اَيَّامَ قَرَاءَتِهٖ عَلَيْهِ كُلَّ يَوْمٍ اِثْنَا عَشَرَ دِيْنَارًا، وَلِلْفَاضِيِّ ابْنِ الْبَرَّاجِ كُلَّ شَهْرٍ ثَمَانِيَةَ دَنَانِيْرٍ، وَاَصَابَ النَّاسَ فِيْ بَعْضِ السِّنِيْنَ قَحْطٌ شَدِيْدٌ فَاحْتَالَ رَجُلٌ يَهُوْدِيٌّ عَلٰى تَحْصِيْلِ قُوَّةٍ يَحْفَظُهُ نَفْسُهُ فَحَضَرَ يَوْمَ مَجْلِسِ الْمُرْتَضٰى وَاسْتَأْذَنَهُ اَنْ يَقْرَأَ عَلَيْهِ شَيْئًا فَاَذِنَ لَهُ وَاَمَرَ بِجَائِزَةٍ يَجْرِي عَلَيْهِ كُلَّ يَوْمٍ فَقَرَأَ عَلَيْهِ بُرْهَةً ثُمَّ اَسْلَمَ عَلٰى يَدِهٖ وَكَانَ قَدْ وَقَفَ قَرْيَةً عَلٰى كَاغَذِ الْفُقَهَاءِ وَكَانَ يُلَقَّبُ بِالثَّمَانِيْنَ لِاَنَّهُ اَحْرَزَ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ثَمَانِيْنَ حَتّٰى اِنَّهُ كَانَ عُمْرُهُ ثَمَانِيْنَ سَنَةً وَثَمَانِيَةَ اَشْهُرٍ۔ الولوٰئی البحرین۔

اس قسم کی صدہا ضرورتیں پیش آیا کرتیں کہ بغیر خرچ مال کثیر وہ دینی مذہبی کام انجام نہ پاتا۔ پھر اگر وہ اس طرح سے ان نا جائز مطالبات کو نہ معاف کراتے تو یہ ضروری امور کیونکر انجام پاتے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ فخر الملک نادان تھے یا ان امور کو نہ سمجھتے ہوں گے۔ بلکہ چونکہ اہل دنیا کی نظر ظاہری امور پر ہوتی ہے لہٰذا سیّد رضی علیہ الرحمہ کا وہ استعفاف نہایت عظیم معلوم ہوا اور جناب سیّد مرتضیٰ علیہ الرحمہ کے ان ضروریات داعیہ پر ان کا خیال نہ راجح ہوا۔

ابو حامد مذکور اگر خود صاحب عقل ہوتا یا نورِ ایمان سے اس کا قلب منوّر رہوتا تو وہ ضرور وزیر کی اس تقریر کا جواب شافی دیتا اور بتاتا کہ یہ فعل جناب سیّد مرتضیٰؒ کا از راہِ حُبّ مال نہ تھا بلکہ ضروریاتِ شرعیہ ان کو اس پر مجبور کئے ہوئے تھیں، مگر ظاہر میں لوگ اس کو کیا سمجھ سکتے ہیں۔

بہر حال عبرت کے لیے یہ حکایت کافی ہے کہ جب جناب سیّد مرتضیٰؒ کی تعظیم میں بوجہ محبت مال جو بضرورت تھی یہ کوتاہی ہوئی تو دوسرے اشخاص کیا اس کی امید کر سکتے ہیں، حالانکہ خود جناب سیّد مرتضیٰ علیہ الرحمہ من حیث المال بھی ایسے امیر کبیر تھے کہ اسّی گاؤں کے مالک تھے۔

جناب سیّد رضی علیہ الرحمہ کے نفس عالی اور بلند ہمتی کے لیے وہ قطعہ کافی ہے جو انہوں نے خلیفہ وقت قادر باللہ عباسی کو لکھا ہے:

عَطْفًا اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ فَاِنَّنَا فِیْ دَوْحَةِ الْعَلْیَآءِ لَا نَتَفَرَّقُ

مَا بَیْنَنَا یَوْمَ الْفَخَارِ تَفَاوُتٌ اَبَدًا کِلَانَا فِی الْمَعَالِیْ مُعَرَّقُ

اِلَّا الْخِلَافَةَ مَیَّزَتْكَ فَاِنَّنِیْ اَنَا عَاطِلٌ مِنْهَا وَ اَنْتَ مُطَوَّقُ

حالانکہ مفاخرت میں وہ خلیفہ کسی طرح ان کا مقابل نہ تھا مگر بخیال مصلحت وقت مساوات سے نہ بڑھنے دیا کہ صرف خلافت سے تم ہم سے متمیز ہو گئے، ورنہ ہم تم مساوی تھے جس پر قادر باللہ نے کہا:

عَلٰی رَغْمِ اَنْفِ الشَّرِیْفِ۔

اس قسم کی ایک حکایت جناب سیّد مرتضیٰ علیہ الرحمہ کی بھی ہے کہ وہ قادر باللہ کی مجلس میں تشریف فرما تھے۔ ایک دفعہ ریش مبارک کو ہاتھوں سے بلند کیا جس پر قادر باللہ نے کہا: "تَشُمُّ مِنْهَا رَآئِحَةَ الْخِلَافَةِ": کیا تم اس ریش سے خلافت کی خوشبو لیتے ہو؟۔ سیّد مرتضیٰ علیہ الرحمہ نے کہا: "بَلْ نَشُمُّ رَائِحَةَ اَلنُّبُوَّةِ"، یعنی رائحہ خلافت کیا ہے، ہم رائحہ نبوت کا استشمام کرتے ہیں۔

اس عالی ہمّتی کا یہ اثر تھا کہ جناب سیّد رضی علیہ الرحمہ نے اپنے والد ماجد ہی کے زمانہ میں ان کل عہدوں پر قبضہ پایا جو ان

کے والد سے متعلق تھا، مثل نقابت طالبین، نظر فی المظالم، امارت حج وغیرہ۔ ان سب امور کے ساتھ کہ جناب سیّد رضی علیہ الرحمہ پر تمام تر فن ادب وشاعری نے قبضہ پایا تھا لیکن ان کے تصانیف کثیرہ سے معلوم ہوسکتا ہے کہ دوسرے فنون میں ان کا کس درجہ بلند پایہ تھا:

(۱) کتاب المتشابه فی القرآن
(۲) کتاب حقائق التنزیل
(۳) کتاب تفسیر القرآن
(۴) کتاب مجازات الاثارا لنبویه
(۵) کتاب تعلیق خلاف الفقهاء
(۶) کتاب تعلیق الایضاح
(۷) کتاب خصائص الائمه
(۸) کتاب نهج البلاغة
(۹) کتاب تلخیص البیان في مجازات القرآن
(۱۰) کتاب الزیادات فی شعر ابی تمام
(۱۱) کتاب سیرة والده الطاهر
(۱۲) کتاب انتخاب شعر ابن الحجاج
(۱۳) کتاب مختار شعر ابی اسحاق الصابی
(۱۴) کتاب دیوان اشعار (۴جلد)
(۱۵) کتاب ما دار بینه و بین ابی اسحق من الرسائل (۳جلد)

تفسیر جناب سیّد رضی کے بارے میں علامہ ابوالحسن عمری کہتے ہیں کہ نہایت عمدہ تفسیر ہے جو حجم میں شیخ ابوجعفر طبرسی کی تفسیر[1] کے برابر ہے یا اس سے زیادہ حجیم ہے۔ جناب سیّد رضیؒ نے قرآن مجید تیس برس کی عمر کے بعد تھوڑی سی مدّت میں حفظ کرلیا تھا۔ تعلیم قرآن میں جوان کے استاد تھے ان سے اور ان سے ایک عطیہ کے باب جو واقعہ گزرا ہے وہ نزاہت نفس سید رضی کی بہت بڑی دلیل ہے۔ ابن ابی الحدید نے اس کو تفصیل سے لکھا ہے۔ جناب سید رضی نے ۶ محرم کو صبح کے وقت ۴۰۶ھ میں انتقال کیا اور تمامی وزراء وارکان سلطنت شریک جنازہ رہے۔ مگر چونکہ جناب سید مرتضٰے کو انتہا سے زیادہ اپنے چھوٹے بھائی سے محبت تھی لہذا ان کے دل میں اس کی تاب نہ رہی کہ ان کا جنازہ تابوت دیکھیں۔ روتے پیٹتے مشہد کاظمین کی طرف چلے گئے۔[2] فخر الملک وزیر نے نماز جنازہ پڑھی اور بعد فراغ دفن وکفن جا کر جناب سیّد مرتضٰی کو سمجھا بجھا کر مکان میں لائے۔ ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ﴾۔

---

[1] تفسیر طبرسی فی الحال مصر میں چھپ گئی ہے جو ۳ جلدوں میں ہے۔

[2] جناب سید رضی وسید مرتضٰی علیہما الرحمہ کی قبریں اب تک مشہد کاظمین علیہما السلام میں مشہور ومعروف ہیں۔ چنانچہ فقیر مؤلف بھی ان مزاروں کے زیارت سے مشرف ہوا۔ فی ۱۳۱۲ھ وقبل ذلک فی ۱۲۹۷ھ۔ منہ

کتب اہل سنت میں جناب سیّد رضیؒ کا تذکرہ

یہاں تک تو اجمالی حالات تھے جناب سیّد رضی اور ان کے تصنیفات کے جو کتب رجال شیعہ و اہل سنت سے لکھے گئے اب کچھ عبارات علمائے اہل سنت لکھی جاتی ہیں تا کہ ناظرین کو معلوم ہو وہ لوگ بھی جناب سیّد رضی کو کن نظروں سے دیکھتے ہیں اور ان کا ذکر کن الفاظ سے لکھتے ہیں۔

علامہ ابن خلکان اپنی کتاب ''**وفیات الاعیان**'' میں لکھتے ہیں:

اَلشَّرِیْفُ الرَّضِیُّ اَبُو الْحَسَنِ مُحَمَّدِ بْنِ الطَّاهِرِ ذِی الْمَنَاقِبِ اَبِیْ اَحْمَدِ الْحُسَیْنِ بْنِ مُوسَی بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ مُوسَی الْکَاظِمِ بْنِ جَعْفَرِ الصَّادِقِ بْنِ مُحَمَّدِ الْبَاقِرِ بْنِ عَلِیٍّ زَیْنِ الْعَابِدِیْنَ بْنِ الْحُسَیْنِ بْنِ عَلِیِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ. اَلْمَعْرُوْفُ بِالْمُوْسَوِیِّ صَاحِبُ دِیْوَانِ الشِّعْرِ. ذَکَرَهُ الثَّعَالِبِیُّ فِیْ کِتَابِ الْیَتِیْمَةِ فَقَالَ فِیْ تَرْجَمَتِهٖ: اِبْتَدَءَ یَقُوْلُ الشِّعْرَ بَعْدَ اَنْ جَاوَزَ عَشْرَ سِنِیْنَ بِقَلِیْلٍ، وَ هُوَ الْیَوْمَ اَبْدَعُ اَنْشَآءِ الزَّمَانِ وَ اَنْجَبُ سَادَةَ الْعِرَاقِ، وَ یَتَحَلّٰی مَعَ مُحْتَدِّهِ الشَّرِیْفِ وَ مَفْخَرِهِ الْمُنِیْفِ بِاَدَبٍ ظَاهِرٍ وَ فَضْلٍ بَاهِرٍ، وَ حَظٍّ مِنْ جَمِیْعِ الْمَحَاسِنِ وَافِرٍ، ثُمَّ هُوَ اَشْعَرُ الطَّالِبِیْنَ مِمَّنْ مَضٰی مِنْهُمْ وَمَنْ غَبَرَ عَلٰی کَثْرَةِ شُعَرَآئِهِمُ الْمُفْلِقِیْنَ، وَلَوْ قُلْتُ اِنَّهٗ اَشْعَرُ قُرَیْشٍ لَمْ اَبْعُدْ عَنِ الصِّدْقِ، سَیَشْهَدُ بِمَا اُخْبِرُ بِهٖ شَاهِدٌ عَدْلٌ مِنْ شِعْرِهِ الْعَالِیْ الْقَدْرِ ،اَلْمُمْتَنِعِ عَنِ الْقَدْحِ، الَّذِیْ یَجْمَعُ اِلَی السَّلَاسَةِ مَتَانَةً وَ اِلَی السُّهُوْلَةِ رِصَانَةً، وَ یَشْتَمِلُ عَلٰی مَعَانٍ یَقْرُبُ جَنَاهَا وَ یَبْعُدُ مُدَاهَا.

پھر لکھتے ہیں:

وَ ذَکَرَ اَبُو الْفَتْحِ بْنِ جِنِّی النَّحْوِیِّ الْمُقَدَّمِ ذِکْرُهٗ فِیْ بَعْضِ مَجَامِیْعِهِ الشَّرِیْفِ الْمَذْکُوْرِ: اَحْضَرَ اِلَی ابْنِ السِّیْرَافِیِّ النَّحْوِیِّ وَهُوَ طِفْلٌ جِدًّا لَمْ یَبْلُغْ عَشْرَ سَنَةٍ، فَلَقَّنَهُ النَّحْوَ وَ قَعَدَ مَعَهٗ یَوْمًا فِی الْحَلْقَةِ فَذَاکَرَهٗ بِشَیْءٍ مِنَ الْاِعْرَابِ عَلٰی عَادَةِ التَّعَلُّمِ، فَقَالَ لَهٗ: اِذَا قُلْنَا ''رَاَیْتُ عُمَرَ'' فَمَا عَلَامَةُ النَّصْبِ فِیْ ''عُمَرَ''؟ فَقَالَ لَهُ الرَّضِیُّ: ''بُغْضُ عَلِیٍّ''، فَعَجَبَ السِّیْرَافِیُّ وَالْحَاضِرُوْنَ مِن حِدَّةِ خَاطِرِهٖ۔ وَ ذَکَرَ

اِنَّهٗ تلَقَّنَ الْقُرْاٰنَ بَعْدَ اَنْ دَخَلَ فِي السِّنِّ فَحَفِظَهٗ فِيْ مُدَّةٍ يَسِيْرَةٍ وَ صَنَّفَ كِتَابًا فِي مَجَازَاتِ الْقُرْاٰنِ فَجَآءَ نَادِرًا فِيْ بَابِهٖ وَ قَدِ اعْتَنٰى بِجَمْعِ دِيْوَانِ الرَّضِيِّ الْمَذْكُوْرِ جَمَاعَةٌ اَجْوَدُ مَا جَمَعَهٗ الَّذِيْ جَمَعَهٗ اَبُوْ حَكِيْمٍ الْخَيْرِيّ.

وَ لَقَدْ اَخْبَرَنِيْ بَعْضُ الْفُضَلَآءِ اَنَّهٗ رَاٰى فِيْ مَجْمُوْعٍ: اَنَّ بَعْضَ الْاُدَبَآءِ اِجْتَازَ بِدَارِ الشَّرِيْفِ الرَّضِيِّ الْمَذْكُوْرِ بِسُرَّمَنْ رَاٰى وَهُوَ لَا يَعْرِفُهَا وَ قَدْ اَخْلٰى عَلَيْهِ الزَّمَانُ وَ ذَهَبَتْ بَهْجَتُهَا وَ اَخْلَقَ دِيْبَاجَتُهَا وَ بَقَايَا رُسُوْمِهَا تَشْهَدُ لَهَا بِالنَّضَارَةِ وَ حُسْنِ النِّسَارَةِ، فَوَقَفَ عَلَيْهَا مُتَعَجِّبًا مِنْ صُرُوْفِ الْاَزْمَانِ وَ طَوَارِفِ الْحَدَثَانِ،

وَ تَمَثَّلَ بِقَوْلِ الشَّرِيْفِ الرَّضِيِّ الْمَذْكُوْرِ وَ هُوَ:

وَ لَقَدْ وَقَفْتُ عَلٰى رُبُوْعِهِمُ ... وَ طَلُوْهَا بِيَدِ الْبَلٰى نَهَبِ
فَبَكَيْتُ حَتّٰى ضَبِحَ مِنْ لَغَبٍ ... نَضْوِيْ وَلِجَ بِعَذْلِيِّ الرَّكْبِ
وَ تَلَفَّتَتْ عَيْنِيْ فَمُذْ خَفِيَتْ ... عَنِّي الطُّلُوْلُ تَلَفَّتِ الْقَلْبُ

فَمَرَّ بِهٖ شَخْصٌ وَ سَمِعَهٗ يُنْشِدُ هٰذِهِ الْاَبْيَاتِ الشَّرِيْفِ فَقَالَ لَهٗ: هَلْ تَعْرِفُ هٰذَا الدَّارَ لِمَنْ هِيَ؟ فَقَالَ: لَا، فَقَالَ: هٰذَا الدَّارُ لِصَاحِبِ هٰذِهِ الْاَبْيَاتِ الشَّرِيْفِ، فَتَعَجَّبَا مِنْ حُسْنِ الْاِتِّفَاقِ.

پھر لکھتے ہیں:

قَالَ الْخَطِيْبُ فِيْ تَارِيْخِ بَغْدَادٍ سَمِعْتُ اَبَا عَبْدِ اللّٰهِ لِكَاتِبٍ بِحَضْرَةِ اَبِي الْحُسَيْنِ بْنِ مَحْفُوْظٍ وَ كَانَ اَوْحَدَ الرُّؤَسَاءِ يَقُوْلُ سَمِعْتُ جَمَاعَةً مِنْ اَهْلِ الْعِلْمِ بِالْاَدَبِ يَقُوْلُوْنَ الرَّضِيُّ اَشْعَرُ قُرَيْشٍ فَقَالَ اِبْنُ مَحْفُوْظٍ هٰذَا صَحِيْحٌ وَ قَدْ كَانَ فِيْ قُرَيْشٍ مَنْ يُجَيِّدُ الْقَوْلَ اِلَّا اَنَّ شِعْرَهٗ قَلِيْلٌ فَاَمَّا مَجِيْدٌ مُكْثِرٌ فَلَيْسَ اِلَّا الرَّضِيُّ وَ كَانَتْ وِلَادَتُهٗ سَنَةَ تِسْعٍ وَ خَمْسِيْنَ وَ ثَلَاثِ مِائَةٍ بِبَغْدَادٍ وَ تَوَفّٰى بُكْرَةَ يَوْمِ الْخَمِيْسِ سَادِسَ الْمُحَرَّمِ وَ قِيْلَ: صَفَرَ سَنَةَ سِتٍّ وَ اَرْبَعِ مِائَةٍ، وَ دُفِنَ فِيْ دَارِهٖ بِحَظِّ مَسْجِدِ الْاَنْبَارِيِّيْنَ بِالْكَرْخِ وَ قَدْ خَرِبَتِ الدَّارُ وَ دَثَّرَ الْقَبْرُ وَ مَضٰى اَخُوْهُ الْمُرْتَضٰى اَبُو الْقَاسِمِ عَلِيٌّ اِلٰى مَشْهَدِ مُوْسَى بْنِ جَعْفَرٍ، لِاَنَّهٗ لَمْ يَسْتَطِعْ اَنْ يَنْظُرَ اِلٰى تَابُوْتِهٖ وَ دَفْنِهٖ، وَ صَلّٰى عَلَيْهِ الْوَزِيْرُ فَخْرُ الْمُلْكِ فِي الدَّارِ مَعَ جَمَاعَةٍ كَثِيْرَةٍ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى.

خلاصہ اس کا یہ ہے کہ جناب سیّد رضی علیہ الرحمہ انجب سادات عراق سے ہیں کہ علو خاندان وشرف دودمان کے ساتھ تمامی فضائل ومناقب کے آپ جامع تھے۔ تمامی قریش میں ازسلف تا خلف کوئی ان کے مقابل کا شاعر نہیں گزرا۔

دس برس کا سن تھا کہ انہوں نے شعر کہنا شروع کیا اور اپنے والد ابواحمد حسین بن موسیٰ کی زندگی ہی میں نقابت طالبین ان سے متعلق ہوئی۔ پہلے ان کے والد نقیب تھے جن سے تمامی خاندان ابوطالب کی حکومت اور ان کے قضایا کا فیصلہ وغیرہ متعلق تھا اور حج کی سرداری بھی ان سے متعلق رہتی۔ یہ سب خدمتیں اپنے باپ کے زمانہ میں ان سے متعلق ہوئیں، حالانکہ وہ ابھی زندہ تھے۔

اس کے بعد چند اشعار لکھے ہیں جن سے معلوم ہوسکتا ہے کہ فصاحت و بلاغت میں سیّد رضیؒ کا کیا درجہ تھا۔ ان کا دیوان چار جلدوں میں مشہور ہے، لہٰذا زیادہ نقل کی ضرورت نہیں۔ ابوالفتح بن جنی نحوی ناقل ہیں کہ سیّد رضی ابن سیرافی نحوی کی شاگردی میں سپرد کئے گئے کہ علم نحو تعلیم کرے۔ اس وقت ان کا سن ۱۰ برس کا بھی نہ تھا۔ ایک روز ابن سیرافی نے بطور امتحان پوچھا کہ ''عمر'' کے نصب کی علامت کیا ہے؟ سیّد رضی علیہ الرحمہ نے جواب دیا کہ اس کی دُشمنی جناب امیرؑ سے بھی علامت نصب ہے۔ اس جواب سے ابن سیرافی اور تمام حاضرین نہایت متعجب ہوئے۔

علامہ ابومحمد عبداللہ بن اسعد الیافعی الیمنی الشافعی کتاب ''مرآۃ الجنان و عبرۃ الیقظان'' ۷۶۸ھ کے حالات میں لکھتے ہیں:

وَ فِیْ السَّنَۃِ الْمَذْکُوْرَۃِ تَوَفّی الشَّرِیْفُ الرَّضِیُّ اَبُو الْحَسَنِ مُحَمَّدُ بْنُ الْحُسَیْنِ بْنُ مُوْسَی الْحُسَیْنِیُّ الْمُوْسَوِیُّ الْبَغْدَادِیُّ الشِّیْعِیُّ نَقِیْبُ الْاَشْرَافِ ذُو الْمَنَاقِبِ وَ مَحَاسِنِ الْاَوْصَافِ صَاحِبُ دِیْوَانِ الشِّعْرِ... اَلْخَ

اور علامہ ابوالحسن باخرزی کتاب ''دمیۃ القصر و عصرۃ اھل العصر'' میں لکھتے ہیں:

اَلسَّیِّدُ الرَّضِیُّ الْمُوْسَوِیُّ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ وَ اَرْضَاہُ لَہٗ صَدْرُ الْوَسَادَۃِ بَیْنَ الْاَئِمَّۃِ وَالسَّادَۃِ، وَ اَنَا اِذَا مَدَحْتُہٗ کُنْتُ کَمَنْ قَالَ: لِذُکَآءٍ: مَا اَنْوَرَکِ!، وَ لِخُضَارَۃٍ(دریا): مَا اَغْزَرَکِ!، وَ لَہٗ شِعْرٌ اِذَا افْتَخَرَ بِہٖ اَدْرَکَ بِہٖ مِنَ الْمَجْدِ اُقَاصِیْہِ وَ عَقَدَ بِالنَّجْمِ نَوَاصِیْہِ، وَ اِذا نَسَبَ اِلَی الرِّقَّۃِ مِنْ نَسِیْبِہٖ فَاِنَّ بِالْقَدْحِ الْمُعَلّٰی صَبِیِّہٖ مِنْ نَصِیْبِہٖ حَتّٰی لَوْ اَنْشَدَ الرَّاوِیُّ غَزْلِیَّاتِہٖ بَیْنَ یَدَیِ الْعُزَّھَاۃِ(زن پیر) لَقَالَتْ لَہٗ مِنَ الْعُزَّھَاۃِ وَ اِذَا وَصَفَ فَکَلَامُہٗ فِیْ اَوْصَافٍ اَحْسَنَ مِنَ الْوَصائِفِ الْوَصَّافِ وَ اِنْ مَدَحَ تَحَیَّرَفِی الْاَوْھَامِ بَیْنَ مَادِحٍ وَ مَمْدُوحٍ لَہٗ بَیْنَ الْمُتَوَاھِنَیْنِ فِی الْحَلْبَتَیْنِ سَبَقٌ سَابِقٌ مُرَوِّحٌ وَ

اِنْ نَثَرَ جَمَدَتْ مِنْهُ الْاَثَرُ وَ رَاَیْتُ هُنَالِكَ خَرَزَاتٍ مِنَ الْعَقْدِ تَنْفَضُّ وَ قَطَرَاتٍ مِنَ الْمُزْنِ تَرْفَضُّ وَلَعَمْرِیْ اِنَّ بَغْدَادَ قَدِ انْبَجَسَتْ بِهٖ قَنَوَاتُهَا وَ طِلَالُهَا وَ اَرْضَعَتْهُ زِلَالُهَا وَ انْشَقَّتْ شِمَالُهَا وَ وَرَدَ شِعْرُهٗ دَجْلَتَهَا فَشَرِبَ مِنْهَا حَتّٰی شَرِقَ وَ انْغَمَسَ فِیْهَا حَتّٰی كَادَ اَنْ یُّقَالَ غَرِقَ فَكُلَّمَا انْشَدَّتْ مَحَاسِنُ كَلَامِهٖ تَنَزَّهَتْ بَغْدَادُ فِیْ نَضْرَةِ نَعِیْمِهَا وَ اِشْتَقَّتْ مِنْ اَنْفَاسِ الْهَجِیْرِ بِمُرَاوِحِ نَسِیْمِهَا فَمِنْ عَقْدِ سِحْرِهٖ وَ عُقُوْدِ دُرِّهٖ قَوْلُهٗ فِیْ مَطْلَعِ قَصِیْدَةٍ لَهٗ۔

وَ ظَبِیْئُهٗ مِنْ ظَبَّاءِ الْاِنْسِ عَاطِلَهٗ تَسْتَوْقِفُ الْعَیْنُ بَیْنَ الْخُمْصِ وَالْهَضْمِ

اِلٰی آخِرِ مَا ذُكِرَ مِنَ الْاَشْعَارِ۔

اس عبارت مقفیٰ و مسجع میں جس کی بلاغت ورزانت ارباب علم پر مخفی نہیں، پہلے تو علامہ باخرزی نے سیّد رضی رحمہ اللہ کو بہ لفظ "رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ وَ اَرْضَاهُ" یاد کیا جو مخصوص کلمہ ہے کہ بحق صحابہ استعمال کیا جاتا ہے، جس سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ جناب سیّد کی کیا عظمت ان کے دل میں تھی۔ دوسرے یہ کہا کہ وہ صدر نشین وسادۂ امامت وسیادت ہیں۔ تیسرے اپنی نسبت بمقابلہ ان کے یہ قرار دی کہ جیسے کوئی آفتاب سے کہے تو کس قدر روشن ہے اور دریا سے کہے کہ تو کس قدر زیادہ ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ علامہ باخرزی اپنی تئیں ان کے مقابلہ میں ذرّۂ بے مقدار قطرۂ ذلیل وخوار تصور کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ بغداد اور اس کی نہریں ان کے باران فیض ولطافت شعر سے سیراب ہوئیں اور ان کے نظم عالی کا یہ پایہ تھا کہ دریائے دجلہ کی تشنگی اس سے بجھی، بلکہ بمقابلہ اس کے غرق عرق ندامت ہوئی۔ جس قدر ان کے محامد واوصاف واشعار مذکور ہوتے ہیں شہر بغداد کی نظارت وتازہ گی میں ترقی ہوتی ہے اور ان اشعار آبدار کے نسیم پر بہار سے بغداد کے روح کو راحت اور امراض سے صحت ہوتی ہے۔

پس جو شخص متکی اریکہ صدر وسادہ ہو درمیان ائمہ وسادہ اور علامہ ابن خلکان وثعالبی ویافعی وصلاح الدین خلیل بن ایبک صفدی وباخرزی وغیرہ ائمہ دین اہل سنت اس کے اس درجہ مداح ہوں اس کے نسبت کون شخص گمان کر سکتا ہے کہ معاذ اللہ! وہ اس امر قبیح کا مرتکب ہو کہ نہج البلاغہ کے خطبے موضوع کر کے جناب امیر علیہ السلام کی طرف منسوب کرے جو فی نفسہ امر محال بھی ہے جیسا کہ مذکور ہوا۔

خرافات علمائے اہل سنت

جہاں علمائے اہل سنت کی عبارت آرائیاں ذکر فضائل ومناقب جناب سیّد رضی علیہ الرحمہ میں ملاحظہ کیں وہاں ان حضرات کی کچھ خرافتیں بھی ملاحظہ ہوں کہ نواب صدیق حسن خان جو مدعی تجدد مائۃ نامہ عشر ہیں اپنی کتاب "ابجد العلوم"

صفحہ ۱۴۷ میں لکھتے ہیں:

رَضِیُّ الدِّیْنِ الْاَسْتَرَاٰبَادِیُّ مُحَمَّدُ بْنُ الطَّاهِرِ الْحُسَیْنُ بْنُ مُوْسَی بْنُ مُحَمَّدِ بْنُ مُحَمَّدُ مُوْسَی بْنُ اِبْرَاهِیْمَ بْنُ مُوْسَی الْکَاظِمُ بْنُ جَعْفَرٌ الصَّادِقُ عَلَیْهِمُ السَّلَامُ الْمَعْرُوْفُ بِالْمُوسَوِیِّ صَاحِبُ دِیْوَانِ الشِّعْرِ ذَکَرَهُ الثَّعَالِبِیُّ فِیْ کِتَابِ الْیَتِیْمَةِ، وَهُوَ الْاِمَامُ الْمَشْهُوْرُ شَارِحُ الْکَافِیَةِ لِابْنِ الْحَاجِبِ الَّذِیْ لَمْ یُؤَلَّفْ عَلَیْهَا وَ لَا فِیْ غَالِبِ کُتُبِ النَّحْوِ مِثْلُهٗ جَمْعًا وَ تَحْقِیْقًا وَ حُسْنَ تَعْلِیْلٍ، وَ لَقَبُهٗ ''نَجْمُ الْاَئِمَّةِ''، قَالَ السُّیُوْطِیُّ: لَمْ اَقِفْ عَلَی اسْمِهٖ وَ لَا عَلٰی شَیْءٍ مِنْ تَرْجَمَتِهٖ اِلَّا اَنَّهٗ فَرِغَ مِنْ تَالِیْفِ هٰذَا الشَّرْحِ سَنَةَ ۶۸۳ھ، وَ اَخْبَرَنِیْ صَاحِبُنَا الْمُؤَرِّخُ شَمْسُ الدِّیْنِ بْنُ عَزْمٍ بِمَکَّةَ اَنَّ وَفَاتَهٗ سَنَةَ ۶۸۴ھ اَوْ سَنَةَ ۶۸ (اَلشَّکُّ مِنِّیْ)، وَ لَهٗ شَرْحٌ عَلَی ''الشَّافِیَةِ'' انْتَهٰی.

قَالَ فِیْ مَدِیْنَةِ الْعُلُوْمِ یُرْوٰی: اَنَّ الرَّضِیَّ کَانَ عَلٰی مَذْهَبِ الرَّفْضِ یُحْکٰی عَنْهُ، کَانَ یَقُوْلُ: الْعَدْلُ فِیْ عُمَرَ لَیْسَ بِتَحْقِیْقٍ مَوْضِعَ قَوْلِهٖ ''الْعَدْلُ فِیْ عُمَرَ تَقْدِیْرِیٌّ''، نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الْغُلُوِّ فِی الْبِدْعَةِ وَالْعَصَبِیَّةِ فِی الْبَاطِلِ، یُقَالُ: اِنَّهٗ لَیْسَ فِی الْمُتَاَخِّرِیْنَ مَنِ اطَّلَعَ عَلٰی تَدْقِیْقَاتِ کِتَابِ سِیْبَوَیْهِ مِثْلَهٗ. اِنْتَهٰی

وَ ذَکَرَ لَهُ ابْنُ الْوَرْدِیِّ فِیْ تَارِیْخِهٖ تَرْجَمَةً قَالَ: ذَاکَرَهٗ شَیْخُهُ السِّیْرَافِیُّ یَوْمًا وَ هُوَ صَبِیٌّ، فَقَالَ: ''رَاَیْتُ عُمَرَ'' مَا عَلَامَةُ النَّصْبِ فِیْ ''عُمَرَ'' قَالَ الرَّضِیُّ: بُغْضُ عَلِیٍّ، اَشَارَ اِلٰی عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ وَ بُغْضِهٖ لِعَلِیٍّ، فَعَجِبَ الْحَاضِرُوْنَ مِنْ ذِهْنِهٖ.

مَوْلِدُهٗ سَنَةَ ۳۵۹ھ وَ مَاتَ فِیْ سَنَةِ ۴۰۶ھ. قُلْتُ: وَلَوْ قَالَ بَدَلَ قَوْلِهٖ: ''بُغْضُ عَلِیٍّ(ع)''، ''خَفْضُ عَلِیٍّ'' لَکَانَ اَبْدَعَ، وَ هُوَ اَشْعَرُ الطَّالِبِیِّیْنَ عَلٰی کَثْرَةِ شُعَرَآئِهِمُ الْمُفْلَقِیْنَ. اِنْتَهٰی

وَذَکَرَ لَهُ ابْنُ خَلِّکَانَ تَرْجَمَةً حَسَنَةً وَ اَثْنٰی عَلَیْهِ: وَ کَانَ اَنْجَبَ سَادَاتِ الْعِرَاقِ وَیَتَحَلّٰی مَعَ مَحْتَدِّهِ الشَّرِیْفِ وَمَفْخَرِهِ الْمُنِیْفِ بِاَدَبٍ ظَاهِرٍ وَفَضْلٍ بَاهِرٍ وَ حَظٍّ مِنْ جَمِیْعِ الْمَحَاسِنِ وَافِرٍ، وَلَوْ قِیْلَ اِنَّهٗ اَشْعَرُ قُرَیْشٍ لَمْ یَبْعُدْ عَنِ الصِّدْقِ، یَشْهَدُ بِذٰلِكَ شَاهِدٌ عَدْلٌ مِنْ شِعْرِهِ الْعَالِی الْقَدْرُ الْمُمْتَنِعُ عَنِ الْقَدْحِ الَّذِیْ یَجْمَعُ اِلَی السَّلَاسَةِ

مَتَانَةً وَ اِلَی السُّهُوْلَةِ رِضَانَةً، وَ یَشْتَمِلُ عَلٰی مَعَانٍ یَقْرُبُ جَنَاهَا وَیَبْعُدُ مُدَاهَا، وَدِیْوَانُهٗ فِیْ اَرْبَعِ مُجَلَّدَاتٍ تَوُفِّیَ بُکْرَةَ یَوْمِ الْاَحَدِ سَادِسَ الْمُحَرَّمِ، وَ قِیْلَ صَفَرَ بِبَغْدَادَ وَ دُفِنَ فِیْ دَارِهٖ بِحَظِّ مَسْجِدِ الْاَنْبَارِیِّیْنَ بِالْکَرْخِ، وَقَدْ خَرِبَتِ الدَّارُ وَ دَثَرَ الْقَبْرُ، وَ مَشٰی اَخُوْهُ الْمُرْتَضٰی اِلٰی مَشْهَدِ مُوْسَی بْنِ جَعْفَرٍ لِاَنَّهٗ لَمْ یَسْتَطِعْ اَنْ یَنْظُرَ اِلٰی تَابُوْتِهٖ وَ دَفْنِهٖ.

اب اس کے اغلاط بلکہ خرافات ملاحظہ فرمائیں کہ

(۱) لقب تو لکھا ''رضی الدین'' اور نام ونسب لکھتے ہیں سیّد رضی علیہ الرحمہ کا، حالانکہ دونوں میں آسمان زمین کا فرق ہے۔ لقب ان کا نجم الائمہ شیخ رضی الدین ہے اور نام ان کا محمد بن حسن۔ وطن ان کا استر آباد ہے جو ملک ایران میں ہے، کافیہ اور شافیہ کے شارح ہیں جو نہایت مشہور ہے اور ہندوستان میں مکرر نسخے اس کے چھپ چکے، علمِ نحو کی تحقیقات کا دارومدار انہی کی تصنیفات پر ہے۔ اور سیّد رضی علیہ الرحمہ جامع نہج البلاغہ سادات رفیع الدرجات سے ہیں اور نام ان کا محمد بن حسین بن موسیٰ بن محمد بن امام موسیٰ کاظم علیہ السلام ہے، جیسا کہ وفیات الاعیان وغیرہ سے مذکور ہوا۔

(۲) شیخ رضی علیہ الرحمہ شارح کافیہ کی وفات حسب تصریح نواب صاحب ۶۸۶ھ بھی ہے اور سیّد رضی علیہ الرحمہ کی وفات حسب تصریح ممدوح ۴۰۶ھ مگر پھر ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ دو شخص ہیں یا ایک شخص۔ اس پر لطف یہ ہے کہ ایک صاحب حاشیہ بھی لکھتے ہیں: ''یُخَالِفُهٗ مَا سَیَاْتِیْ مِنْ سِنِّهٖ مَوْلِدُهٗ وَوَفَاتُهٗ ،وَهُوَ الصَّحِیْحُ''۔ کیوں نہ ہو دونوں صاحب ایک ہی خانوادے کے ہیں کل تحریر کو ایک ہی شخص کے متعلق سمجھ رہے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ یہ خبط ہے جو دو شخص مختلف الاسم والمسمّٰی کو بقاعدہ جنون ایک سمجھ رہے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ جملہ رضی الدین الاستر آبادی تو لکھا کتاب مدینۃ العلوم سے اور نسب نامہ لکھا وفیات الاعیان سے تا جملہ ذَکَرَهٗ ثَعَالِبِیٌّ فِیْ کِتَابِ الْیَتِیْمَةِ تا کہ آپ کا تبحر ظاہر ہو اور ظاہر ہوئی حماقت۔ کیونکہ ایسی خبطگی سے عبارتوں کا سرقہ کیا گیا ہے کہ کچھ نہیں معلوم ہو سکتا کس عالم میں یہ پوری عبارت لکھی گئی۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ۔

(۳) سیوطی سے ناقل ہیں کہ مجھے نام وغیرہ ان کا نہیں معلوم ہوا حالانکہ بہت سے علمائے اہلسنت نے ان کا یعنی ''نجم الائمہ شیخ رضی الدین استر آبادی'' کا تذکرہ لکھا ہے۔

(۴) مدینۃ العلوم سے حکایت ناصبیت عمر کی عجب خبطگی سے لکھا حالانکہ وفیات الاعیان میں پوری حکایت اس کی نہایت وضاحت ومتانت سے لکھی ہے اسی مضمون کو اس خبطگی سے لکھا۔ یہ حال سیّد رضی علیہ الرحمہ کا تھا۔

(۵) اس دوسطر کے بعد پھر شیخ رضی الدین رحمہ اللہ نجم الائمہ کا حال لکھا: "یُقَالُ اِنَّہٗ لَیْسَ فِی الْمُتَاَخِّرِیْنَ"۔

(۶) پھر اسی حکایت سیّد رضی علیہ الرحمہ کو دربارہ نصب عمر، ابن الوردی سے لکھتے ہیں جو تحریر اوّل کے خلاف ہے اور اس جملہ میں بھی حماقت اور اپنے علماء کے دیانت کی داد دی کہ عمر کو عمرو عاص بنایا اور یہ نہ سوجھا کہ ''عمر'' غیر منصرف ہے، اسی کے علامت نصب کا سوال ابن سیرافی نے کیا تھا، بخلاف ''عمرو'' کے کہ وہ غیر منصرف ہے، اس کا نصب ہی علامت نصب ہے۔ مگر علمائے اہل سنت اس کے بھی روادار نہیں ہوتے کہ کسی شیعہ کی زبان سے بھی ناصبیت عمر کا اقرار کریں۔

(۷) یہ تازہ حماقت ہے کہ ''بغض علیؑ'' پر اصلاح دیتے ہیں ''خفض علیؑ'' جس سے کوئی لگاؤ ہی نہیں۔

(۸) کہا تو "قُلْتُ" جس سے معلوم ہوا کہ یہ ان کی عبارت ہے اور چار لفظ کے بعد دوسرے کی عبارت لکھی جس کے بعد "انتھٰی" بھی لکھتے ہیں۔

(۹) اس کے پانچ چھ سطر بعد پھر ابن خلکان سے لکھا وہی حال کہ دیوان آپ کا چار جلدوں میں ہے اور اپنے ہی مکان میں وفات پائی اور سیّد مرتضیٰ علیہ الرحمہ ان کے دفن میں شریک نہ ہوئے مشہد طوس کی طرف۔

غرض ہماری اس عبارت کے نقل اور اظہار خرافت سے یہ ہے کہ چونکہ اہل سنت کو اپنے علما کی تحقیقات پر بہت کچھ ناز ہوتا ہے کہ اگر وہ کچھ لکھ جاتے ہیں تو اس کے خلاف اگر ہزاروں شواہد دوسرے علمائے اہل سنت سے بیان کیے جائیں تو اسے نہیں مانتے۔ اس لیے میں نے یہ عبارت لکھی اور اس کے اغلاط ظاہر کیے تا کہ کوئی ایسے نامحقق علماء کے اقوال پر نہ جائے اور حق و باطل میں تمیز کرے۔ کیونکہ ہم نے ایسے ایسے علماء کی زبانی کتاب مستطاب ''نہج البلاغہ'' کا مجموعۂ کلام جناب امیر المومنین علیہ الصّلاۃ والسّلام ہونا ثابت کیا ہے اور نیز حالات جناب سیّد رضی علیہ الرحمہ ان علما کی تحریر و تقریر سے بیان کیا کہ کسی متنفس کو ان اہل سنت سے اس میں شک و شبہ نہیں رہ سکتا۔

علمائے اہل سنت شارحین نہج البلاغہ

اب کچھ شارحین نہج البلاغہ کا حال بھی اجمالاً لکھتے ہیں تا کہ معلوم ہو کیسے کیسے علما نے اس کتاب کی شرح پر توجہ کی ہے، خصوصاً علامہ ابن ابی لحدید جن کی شرح نہایت درجہ مشہور و معروف ہے اور اکثر مقام پر اس شرح میں بھی اس سے اقتباس کیا گیا ہے۔ لہذا افادہ عوام کے لیے کچھ حالات ان کے بھی مرقوم ہوتے ہیں۔ مگر چونکہ فریقین کے متعدد علما نے اس کتاب مستطاب کی شرحیں لکھی ہیں لہذا دونوں فریق کا علیحدہ علیحدہ تذکرہ مناسب ہے۔

علامہ ابن الحدید معتزلی (پہلے شارح)

علمائے اہل سنت سے جس نے سب سے پہلے اس کی شرح لکھی وہ علامہ ابن ابی الحدید معتزلی ہیں جن کے علم و فضل و کمال کا حال علمائے اہل سنت کے ان عبارات سے بخوبی ظاہر ہے۔ علامہ ابن خلکان وفیات الاعیان میں بترجمہ ابن الاثیر الجزری لکھتے ہیں:

وَلِضِيَاءِ الدِّيْنِ مِنَ التَّصَانِيْفِ الدَّالَّةِ عَلٰى غَزَارَةِ فَضْلِهٖ وَتَحْقِيْقِ نَيْلِهٖ كِتَابُهُ الَّذِىْ سَمَّاهُ ''اَلْمَثَلَ السَّآئِرَ فِىْ اَدَبِ الْكَاتِبِ وَالشَّاعِرِ'' وَهُوَ فِىْ مُجَلَّدَيْنِ جَمَعَ فِيْهِ فَاَوْعٰى وَلَمْ يَتْرُكْ شَيْئًا يَتَعَلَّقُ بِفَنِّ الْكِتَابَةِ اِلَّا ذَكَرَهٗ، وَلَمَّا فَرَغَ مِنْ تَصْنِيْفِهٖ كَتَبَهُ النَّاسُ عَنْهُ فَوَصَلَ اِلٰى بَغْدَادَ مِنْهُ نُسْخَةٌ فَانْتَدَبَ لَهُ الْفَقِيْهُ الْاَدِيْبُ عِزُّ الدِّيْنِ اَبُوْ حَامِدٍ عَبْدُ الْحَمِيْدِ بْنُ هِبَةِ اللّٰهِ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ حُسَيْنِ بْنِ اَبِى الْحَدِيْدِ الْمَدَآئِنِىِّ وَتَصَدّٰى لِمُؤَاخَذَتِهٖ وَالرَّدِّ عَلَيْهِ وَعَنْهُ وَجَمَعَ هٰذِهِ الْمُؤَاخَذَاتِ فِىْ كِتَابٍ سَمَّاهُ ''اَلْفَلَكَ الدَّآئِرَ عَلَى الْمَثَلِ السَّآئِرِ''، فَلَمَّا اَكْمَلَهٗ وَقَفَ عَلَيْهِ اَخُوْهُ مُوَفِّقُ الدِّيْنِ اَبُو الْمَعَالِىْ اَحْمَدُ وَ يَدَّعِى الْقَاسِمُ اَيْضًا فَكَتَبَ اِلٰى اَخِى الْمَذْكُوْرِ قَوْلَهٗ:

اَلْمَثَلُ السَّآئِرُ يَا سَيِّدِىْ صَنَّفْتَ فِيْهِ الْفَلَكَ الدَّآئِرَا
لٰكِنْ هٰذَا فَلَكٌ دَآئِرٌ تَصِيْرُ فِيْهِ الْمَثَلُ السَّآئِرَا

وَ كَانَتْ وِلَادَةُ عِزِّ الدِّيْنِ الْمَذْكُوْرِ بِالْمَدَايِنِ يَوْمَ السَّبْتِ مُسْتَهَلَّ ذِى الْحِجَّةِ سَنَةَ ثَمَانِيْنَ وَ خَمْسِ مِائَةٍ وَ تَوَفّٰى فِىْ بَغْدَادَ سِتَّ خَمْسٍ وَّ خَمْسِيْنَ وَ سِتَّمِائَةٍ وَ تَوَفّٰى اَخُوْهُ

مُوَفِّقُ الدِّيْنُ الْمَذْكُوْرُ بِبَغْدَادَ فِيْ سَنَةِ سِتٍّ وَخَمْسِيْنَ بَعْدَ اَنْ اَخَذَهَا النَّتْرُ بِقَلِيْلٍ وَكَانَا فَقِيْهَيْنِ اَدِيْبَيْنِ فَاضِلَيْنِ لَهُمَا اَشْعَارٌ مَلِيْحَةٌ وَمَوْلِدُ الْمَوَفِّقِ الْمَذْكُوْرِ فِيْ جَمَادِي الْاٰخِرَةِ وَقِيْلَ فِيْ شَهْرِ رَبِيْعٍ الْاَوَّلِ سَنَةَ تِسْعِيْنَ وَخَمْسِ مِائَةٍ بِالْمَدَآئِنِ.

صلاح الدین صفدی ''فوات الوفیات'' میں لکھتے ہیں:

عَبْدُالْحَمِيْدِ ابْنُ هِبَةِ اللّٰهِ مُحَمَّدِ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ اَبِي الْحَدِيْدِ عِزُّ الدِّيْنِ الْمَدَآئِنِيّ الْمُعْتَزِلِيّ الْفَقِيْهِ الشَّاعِرِ اَخُوْ مُوَفَّقِ الدِّيْنِ وُلِدَ سَنَةَ سِتٍّ وَثَمَانِيْنَ وَخَمْسِ مِائَةٍ وَ تَوَفّٰى سَنَةَ خَمْسٍ وَخَمْسِيْنَ وَسِتَّمِائَةٍ وَهُوَ مَعْدُوْدٌ فِي اَعْيَانِ الشُّعَرَآءِ وَلَهٗ دِيْوَانُ شِعْرٍ مَشْهُوْرٍ رَوٰى عَنْهُ الدِّمْيَاطِيُّ وَمِنْ تَصَانِيْفِهٖ ''اَلْفَلَكُ الدَّآئِرُ عَلَى الْمَثَلِ السَّآئِرِ''، صَنَّفَهٗ فِيْ ثَلَاثَةَ عَشَرَ يَوْمًا وَكَتَبَ اِلَيْهِ اَخُوْهُ مُوَفَّقُ الدِّيْنِ:

اَلْمَثَلُ السَّآئِرُ يَا سَيِّدِيْ صَنَّفْتُ فِيْهِ الْفَلَكَ الدَّائِرَا
لٰكِنْ هٰذَا فَلَكٌ دَآئِرٌ اَصْبَحَتْ فِيْهِ الْمَثَلَ السَّآئِرَا

وَنَظْمٌ فَصِيْحٌ ثَعْلَبٌ فِيْ يَوْمٍ وَ لَيْلَةٍ وَ ''شَرَحَ نَهْجَ الْبَلَاغَةِ'' فِيْ عِشْرِيْنَ مُجَلَّدًا وَلَهٗ تَعْلِيْقَاتٌ عَلٰى كِتَابِ ''اَلْمُحَصَّلِ وَالْمَحْصُوْلِ'' لِلْاِمَامِ فَخْرِ الدِّيْنِ... الخ.

علامہ ابن خلکان، ضیاء الدین کے حالات میں لکھتے ہیں کہ ان کے تصنیفات سے کتاب ''مثل السائر فی ادب الکاتب والشاعر'' ہے جسے دو جلدوں میں لکھا اور فن کتابت کے متعلق جتنی باتیں تھیں سب کو اس میں جمع کیا۔ جب وہ کتاب بغداد میں پہنچی تو فقیہ ادیب عزالدین ابوحامد عبدالحمید بن ہبۃ اللہ بن محمد بن حسین بن ابی الحدید مدائنی اس کی رد اور اعتراض کرنے پر آمادہ ہوئے۔ ان کل اعتراضوں کو ایک کتاب میں جمع کیا جس کا نام ''الفلک الدائر علی المثل السائر'' ہے۔ جب عزالدین کے بھائی موفق الدین ابوالمعالی احمد مشہور بہ قاسم اس کتاب پر مطلع ہوئے تو ایک قطعہ میں اس کتاب کی تعریف لکھ کر اپنے بھائی ضیاء الدین کو بھیجا جس میں فلک دائر کی عظمت وجلالت قدر کو واضح طور پر بیان کیا ہے۔ عزالدین ابن ابی الحدید کی ولادت روز شنبہ یکم ذیحجہ ۵۸۶ھ ہے بمقام مدائن اور وفات بغداد میں ہے ۶۵۵ھ اور ان کے بھائی موفق الدین کی ۶۵۶ھ میں جبکہ تاتاریوں نے بغداد پر قبضہ پایا اس کے کچھ دنوں بعد۔ دونوں بھائی بڑے فقیہ اور ادیب تھے اور فاضل تھے۔ اشعار ان کے بہت ملیح ہیں۔

اسی مضمون کو علامہ صلاح الدین صفدی نے بھی کتاب ''فوات الوفیات'' میں باختصار لکھا ہے۔

اور کمال الدین عبدالرزاق بن احمد بن ابی المعالی الشیبانی الفوطی کتاب ''مجمع الآداب فی معجم الالقاب'' میں لکھتے ہیں:

عِزُّ الدِّيْنِ عَبْدُ الْحَمِيْدِ بْنِ اَبِي الْحُسَيْنِ هِبَةِ اللهِ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ اَبِي الْحَدِيْدِ الْمَدَائِنِيّ الْحَكِيْمِ الْاُصُولِيّ وَ كَانَ مِنْ اَعْيَانِ الْعُلَمَاءِ الْاَفَاضِلِ وَ اَكَابِرِ الصُّدُوْرِ الْاَمَاثِلِ حَكِيْمًا فَاضِلًا كَامِلًا عَارِفًا بِاُصُوْلِ الْكَلَامِ يَذْهَبُ مَذْهَبَ الْمُعْتَزِلَةِ وَ خَدَمَ فِي الْوِلَايَاتِ الدِّيَوَانِيَّةِ وَالْقَدَمِ السُّلْطَانِيَّةِ وَ كَانَ مَوْلَدُهُ فِيْ غُرَّةِ ذِي الْحِجَّةِ سَنَةَ سِتٍّ وَ ثَمَانِيْنَ وَ خَمْسِمِائَةٍ وَ اشْتَغَلَ وَ حَصَلَ وَ صَنَّفَ وَ اَلَّفَ فَمِنْ تَصَانِيفِهِ شَرْحُ نَهْجِ الْبَلَاغَةِ عِشْرُوْنَ مُجَلَّدًا وَ قَدِ احْتَوٰى هٰذَا الشَّرْحُ عَلٰى مَا لَا يَحْتَوِيْ كِتَابٌ مِنْ جِنْسِهٖ، صَنَّفَهٗ لِخِزَانَةِ كُتُبِ الْوَزِيرِ مُؤَيِّدِ الدِّيْنِ مُحَمَّدِ بْنِ الْعَلْقَمِيّ رَحْمَةُ اللهِ عَلَيْهِ وَ لَمَّا فَرَغَ مِنْ تَصْنِيفِهٖ اَنْفَذَهٗ عَلٰى يَدِ اَخِيْهِ مُوَفِّقِ الدِّيْنِ اَبِي الْمَعَالِي فَبَعَثَ لَهٗ بِاَلْفِ دِينَارٍ الذَّهَبِيّ وَخُلْعَةٍ سَنِيَّةٍ وَ فَرَسٍ مَعَ سَرْجٍ بِهِبَةٍ فَكَتَبَ اِلَى الْوَزِيرِ۔

کمال الدین لکھتے ہیں: عزالدین عبدالحمید بن ابی الحدید مدائنی حکیم اصولی ہیں، مشاہیر علمائے افاضل سے تھے اور اکابر صدور اماثل سے، حکیم فاضل کاتب کامل تھے اور عارف باصول علم کلام، معتزلی المذہب تھے، شاہی دیوان خانوں میں خدمت کیے ہوئے تھے ولادت ان کی غرہ ذیحجہ ۵۸۶ھ کو ہوئی بمقام مدائن۔ بعدہ مشغول تحصیل علم ہوئے، پھر تصنیف و تالیف کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان کے تصنیفات سے ہے ''شرح نہج البلاغہ'' جو بیس جلدوں میں ہے اور یہ شرح ایسے تحقیقات پر مشتمل ہے کہ دوسری کوئی کتاب اس کے مماثل نہیں۔ تصنیف اس کی خزانۂ کتب وزیر علقمی رحمہ اللہ کے لیے ہوئی تھی۔ اس کے انعام میں وزیر نے ہزار اشرفی اور خلعت عنایت کیا، جس کا شکریہ انہوں نے ایک عربی قطعہ کے ذریعہ سے ادا کیا:

اَ يَا رَبَّ الْعِبَادِ رَفَعْتَ صَبْغِيْ ... وَطُلْتَ بِمَنْكِبِيْ وَبَلَلْتَ رِيقِيْ
وَزَيْغُ الْاَشْعَرِيّ كَشَفْتَ عَنِّيْ ... فَلَمْ اَسْلُكْ نَبِيَّاتِ الطَّرِيْقِ
اُحِبُّ الْاِعْتِزَالَ وَنَاصِرِيْهِ ... ذَوِي الْاَلْبَابِ وَالنَّظَرِ الدَّقِيْقِ
فَاَهْلُ الْعَدْلِ وَالتَّوْحِيدِ اَهْلِيْ ... نِعَمَ وَفَرِيْقُهُمْ اَبَدًا فَرِيقِيْ
وَشَرْحُ النَّهْجِ لَمْ اَدْرِكْهُ اِلَّا ... لِعَوْنِكَ بَعْدَ مُجْهَدَةٍ وَ ضِيْقِ
تَمَثَّلَ اِذْ بَدَأْتُ بِهٖ لِعَيْنِيْ ... اَشُمُّ كَذُرْوَةِ الطَّوْدِ السَّحِيْقِ
فَتَمَّ بِحُسْنِ عَوْنِكَ وَهُوَ اِ نَائِيْ ... مِنَ الْعُيُوقِ اَوْ بِيضِ الْاَنُوْقِ
بِاٰلِ الْعَلْقَمِيّ وَرَدَتْ زِنَادِيْ ... وَقَامَتْ بَيْنَ اَهْلِ الْفَضْلِ سُوقِيْ

فَكَمْ ثَوْبٍ اَنِيْقٍ نِلْتُ مِنْهُمْ وَنِلْتُ بِهِمْ، طَرْفَ عَتِيْقٍ
اَدَامَ اللّٰهُ دَوْلَتَهُمْ وَاَحْيٰى عَلٰى اَعْدَائِهِمْ بِالْخُنْفَقِيْقِ

وَ مِنْ تَصَانِيْفِهٖ اَيْضًا كِتَابُ ''الْعَبْقَرِيِّ الْحِسَانِ'' وَهُوَ كِتَابٌ غَرِيْبُ الْوَضْعِ قَدِ اخْتَارَ فِيْهِ قِطْعَةً وَافِرَةً مِنَ الْكَلَامِ وَالتَّوَارِيْخِ وَالْاَشْعَارِ وَ اَوْدَعَهٗ شَيْئًا مِّنْ اِنْشَائِهٖ وَ رَسَائِلِهٖ وَ مُنْظُوْمَاتِهٖ۔ وَ مِنْ تَصَانِيْفِهٖ كِتَابُ ''الْاِعْتِبَارِ عَلٰى كِتَابِ الذَّرِيْعَةِ فِيْ اُصُوْلِ الشَّرِيْعَةِ'' لِلسَّيِّدِ الْمُرْتَضٰى وَهُوَ ثَلٰثُ مُجَلَّدَاتٍ وَ مِنْهَا كِتَابُ ''اَلْفَلَكِ الدَّائِرِ عَلَى الْمَثَلِ السَّائِرِ'' لِابْنِ اَثِيْرِ الْجَزَرِيِّ وَ مِنْهَا كِتَابُ ''شَرْحِ الْمُحَصَّلِ'' لِلْاِمَامِ فَخْرِ الدِّيْنِ۔ وَهُوَ يَجْرِيْ مَجْرَى النَّقْضِ وَ مِنْهَا كِتَابُ ''نَقْضِ الْمَحْصُوْلِ فِيْ عِلْمِ الْاُصُوْلِ'' لِلْاِمَامِ فَخْرِ الدِّيْنِ۔

ان کے تصنیفات سے کتاب ''عبقری حسان'' بھی ہے جو نہایت ہی عجیب وغریب کتاب ہے اور منجملہ ان تصانیف کے ایک کتاب ''الاعتبار'' ہے جو سیّد مرتضیٰ علیہ الرحمہ کی کتاب ''الذریعہ فی الاصول الشریعہ'' پر ہے۔ یہ کتاب تین جلدوں میں ہے اور ایک کتاب ''الفلک الدائر علی مثل السائر'' ہے اور ایک کتاب ''شرح المحصل'' جس میں امام فخر رازی کی رد لکھا ہے اور نیز ''نقض المحصول فی علم الاصول'' ہے جو امام فخر رازی کے رد میں لکھا۔

احتجاج علمائے اہل سنت

یہاں تک تو بالا جمال فضائل ومناقب علامہ ابن ابی الحدید تھے جس سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ کس پایہ کا عالم ہے اور کیسے کیسے علماء نے ان کے فضل وکمال اور تحقیقات کا اعتراف کیا ہے جس کے ساتھ اس کو بھی لکھا کہ نہج البلاغہ کی شرح بیس جلدوں میں لکھی جس کی مثل ونظیر دوسری کتاب نہیں ہوئی۔ اب اس کو بھی ملاحظہ فرمائیں کہ کیسے کیسے علمائے اہل سنت اور اہل حدیث نے ان ابن ابی الحدید کے اقوال سے استدلال کیا ہے اور اپنی جگہ پر ان کے تحقیقات سے سند لائے ہیں جس سے آپ ان کی عظمت وجلالت قدر کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں:

علامہ فضل بن روزبہان جن کی تحقیقات پر تمامی علمائے متکلمین بعد نے فخر ومباحات کیا ہے اور نہایت عزت سے ان کا نام لکھتے ہیں وہ اپنی کتاب ''ابطال الباطل'' میں لکھتے ہیں جو بجواب ''احقاق الحق'' علامہ حلی علیہ الرحمہ لکھی گئی:

وَ اَمَّا ذِكْرُ اَنَّ مُعَاوِيَةَ ادَّعٰى اَخَاهُ زِيَادَ فَتَفْصِيْلُ هٰذِهِ الرِّوَايَةِ مَا ذَكَرَهُ الْمُؤَرِّخُوْنَ وَ ذَكَرَهُ ابْنُ اَبِي الْحَدِيْدِ فِيْ شَرْحِ نَهْجِ الْبَلَاغَةِ وَ ذَكَرَهُ ابْنُ الْجَوْزِيِّ فِيْ تَارِيْخِهٖ اَنَّ زِيَادًا وُلِدَ عَلٰى فِرَاشِ عُبَيْدٍ الثَّقَفِيِّ... اَلْخ

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ فضل بن روزبہان نے ابن ابی الحدید کو ابن الجوزی کے پہلو بہ پہلو ذکر کیا اور ان کے کلام سے سند لائے، حالانکہ فضل مذکور علمائے متکلمین سے ہیں جو معتزلہ کے دُشمن جانی ہیں مگر ابن ابی الحدید کی تحقیقات ایسے درجہ عالیہ پر فائز ہے کہ فضل بن روزبہان اس سے سند لائے۔

اور علامہ محمد بن اسماعیل بن صلاح الامیر ''**روضه نديه شرح تحفه علويه**''میں بذیل ذکر کتاب امیر علیہ السلام بنام حارث اعور لکھتے ہیں:

قَالَ الْعَلَامَةُ ابْنُ اَبِي الْحَدِيْدِ لَقَدِ اشْتَمَلَ هٰذَا الْفَصْلُ عَلٰى وَصَايَا جَلِيْلَةِ الْمَوْقِعِ مِنْهَا قَوْلُهٗ وَ تَمَسَّكْ بِحَبْلِ الْقُرْاٰنِ جَاءَ فِي الْخَبَرِ الْمَرْفُوعِ لَمَّا ذَكَرَ الثَّقَلَيْنِ فَقَالَ اَحَدُهُمَا كِتَابُ اللّٰهِ حَبْلٌ مَمْدُودٌ مِنَ السَّمَاءِ اِلَى الْاَرْضِ طَرَفٌ بِيَدِ اللّٰهِ وَ طَرَفٌ بِاَيْدِيكُمْ الخ۔

اس جملہ میں ہمارا مقصود صرف اسی جملہ سے ہے کہ علامہ محمد بن اسماعیل وزیر نے علامہ ابن ابی الحدید کے قول سے استدلال کیا ہے اور بلقب ''علامہ'' یاد کیا۔ پس اگر شیعہ اسی ابن ابی الحدید کے اقوال یا روایات سے بمقابلہ اہلسنت استدلال کریں تو کسی طرح وہ یہ کہہ کر نہیں ٹال سکتے کہ یہ عالم معتزلی کی روایت ہے ہم اس کے پابند نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ جب وہ لوگ با خود ہا میں ان کے اقوال و روایات سے استدلال کرتے ہیں تو شیعوں کی حجت ان پر تمام ہوئی۔

اب کچھ ان علامہ محمد بن اسماعیل بن صلاح الامیر کے حالات بھی ملاحظہ فرمائیں جو علامہ ابن ابی الحدید کے اقوال سے استدلال کرتے ہیں اور بہ لفظ ''علامہ'' ان کو یاد کرتے ہیں۔ نواب صدیق حسن خان ''**ابجد العلوم**'' ص ۸۶۸ میں لکھتے ہیں:

اَلسَّيِّدُ الْعَلَامَةُ بَدْرُ الْمِلَّةِ الْمُنِيْرِ الْمُوَيَّدُ بِاللّٰهِ مُحَمَّدُ بْنُ الْاِمَامِ الْمُتَوَكِّلِ عَلَى اللّٰهِ اِسْمَاعِيلَ بْنِ صَلَاحِ الْاَمِيْرِ الصَّنْعَانِيِّ الْيَمَنِيِّ وَهُوَ: اَلْاِمَامُ الْكَبِيْرُ الْمُحَدِّثُ الْاُصُولِيُّ الْمُتَكَلِّمُ الشَّهِيْرُ، قَرَاَ كُتُبَ الْحَدِيْثِ وَبَرَعَ فِيْهَا وَكَانَ اِمَامًا فِي الزُّهْدِ وَالْوَرَعِ يَعْتَقِدُهُ الْعَامَّةُ وَالْخَاصَّةُ وَيَاْتُوْنَهٗ بِالنُّذُوْرِ فَيَرُدُّهَا وَيَقُوْلُ: اِنَّ قَبُوْلَهَا تَقْرِيْرٌ لَهُمْ عَلَى اعْتِقَادِهِمْ اَنَّهٗ مِنَ الصَّالِحِيْنَ وَهُوَ يَخَافُ اَنَّهٗ مِنَ الْهَالِكِيْنَ۔ حَكٰى بَعْضُ اَوْلَادِهٖ: اَنَّهٗ قَرَاَ وَهُوَ يُصَلِّيْ بِالنَّاسِ صَلَاةَ الصُّبْحِ: ﴿هَلْ اَتٰكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ﴾ فَبَكٰى وَغُشِيَ عَلَيْهِ وَكَانَ وَالِدُهٗ وَلِيُّ اللّٰهِ بِلَا نِزَاعٍ مِنْ اَكَابِرِ الْاَئِمَّةِ وَاَهْلِ الزُّهْدِ وَالْوَرَعِ

اسْتَوٰى عِنْدَهُ الذَّهَبُ وَالْحَجَرُ وَخَلَّفَ اَوْلَادًاهُمْ اَعْيَانُ الْعُلَمَآءِ وَالْحُكَمَآءِ، اَعْظَمُهُمْ وَلَدُهٗ هٰذَا.

قَالَ الشَّيْخُ اَحْمَدُ بْنُ عَبْدِ الْقَادِرِ الْحِفْظِيُّ الشَّافِعِيُّ فِيْ ذَخِيرَةِ الْاٰمَالِ فِيْ شَرْحِ عَقْدِ جَوَاهِرِ الْاٰلِ الْاِمَامُ السَّيِّدُ الْمُجْتَهِدُ الشَّهِيْرُ الْمُحَدِّثُ الْكَبِيْرُ السِّرَاجُ الْمُنِيْرُ مُحَمَّدُ بْنُ اسْمَاعِيْلَ الْاَمِيْرِ مُسْتَنِدُ الدِّيَارِ وَمُجَدِّدُ الدِّيْنِ فِي الْاَقْطَارِ، صَنَّفَ اَكْثَرَ مِنْ مِائَةِ مُؤَلَّفٍ وَهُوَ لَا يُنْسَبُ اِلٰى مَذْهَبٍ بَلْ مَذْهَبُهُ الْحَدِيْثُ.

قَالَ: اَخَذَ مِنْ عُلَمَآءِ الْحَرَمَيْنِ وَ اسْتَجَازَ مِنْهُمْ وَارْتَبَطَ بِاَسَانِيْدِهِمْ وَقَرَاَ عَلَى الشَّيْخِ عَبْدِ الْخَالِقِ بْنِ الزَّيْنِ الْمَزْجَاجِيِّ وَالشَّيْخِ عَلَيْهِ وَاسْتَجَازَ مِنْهُ وَاَسْنَدَ عَنْهُ مَعَ تَمَكُّنِهٖ مِنْ عُلُوْمِ الْاٰلِ وَتَاَصُّلِهٖ. اِنْتَهٰى عَلٰى مَا نَقَلَهُ السَّيِّدُ حَامِدُ حُسَيْنُ الْمَعَاصِرُ فِيْ كِتَابِهٖ ''عَبَقَاتِ الْاَنْوَارِ فِيْ اِمَامَةِ الْاَئِمَّةِ الْاَطْهَارِ''.

وَمِنْ شُيُوْخِهِ الشَّيْخُ عَبْدُ الْقَادِرِ بْنُ عَلِيٍّ الْبَدْرِيِّ وَالشَّيْخُ مُحَمَّدُ طَاهِرُ بْنُ اِبْرَاهِيْمَ الْكُرْدِيِّ وَالشَّيْخُ سَالِمُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ الْبَصْرِيِّ وَغَيْرُهُمْ وَتَلَمَّذَ عَلَيْهِ اَيْضًا خَلْقٌ كَثِيْرٌ مِنْهُمْ: الشَّيْخُ عَبْدُ الْخَالِقِ الْمِزْجَاجِيُّ الزُّبِيْدِيُّ وَهُوَ اَيْضًا اُسْتَاذُهٗ كَمَا تَقَدَّمَ، وَاَيْضًا وَلَدُهُ السَّيِّدُ الْعَلَامَةُ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ مُحَمَّدٍ الْاَمِيْرِ وَغَيْرُهُمَا، لَهٗ مُصَنَّفَاتٌ جَلِيْلَةٌ مُمَتَّعَةٌ تُنْبِئُ عَنْ سِعَةِ عِلْمِهٖ وَغَزَارَةِ اطِّلَاعِهٖ عَلَى الْعُلُوْمِ النَّقْلِيَّةِ وَالْعَقْلِيَّةِ.

وَكَانَ ذَا عِلْمٍ كَبِيْرٍ وَرِيَاسَةٍ عَالِيَةٍ وَلَهٗ فِي النَّظْمِ الْيَدُ الطُّوْلٰى، بَلَغَ رُتْبَةَ الْاِجْتِهَادِ الْمُطْلَقِ وَلَمْ يُقَلِّدْ اَحَدًا مِنْ اَهْلِ الْمَذَاهِبِ، وَصَارَ اِمَامًا كَامِلًا مُكَمِّلًا بِنَفْسِهٖ، وَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيَّ بِاَكْثَرِ مُصَنَّفَاتِهٖ وَهِيَ اَزْيَدُ مِنْ اَنْ تُذْكَرَ، مِنْهَا: سُبُلُ السَّلَامِ شَرْحُ بُلُوْغِ الْمَرَامِ، وَهُوَ عِنْدِيْ بِخَطِّ وَلَدِهِ السَّيِّدُ عَبْدُ اللّٰهِ، وَفِيْهِ خَطُّهُ الشَّرِيْفُ اَيْضًا. وَمِنْهَا مِنْحَةُ الْغَفَّارِ حَاشِيَةُ ضَوْءِ النَّهَارِ وَ اسْبَالُ الْمَطَرِ عَلٰى قَصَبِ السُّكَّرِ وَ جَمْعُ التَّشْتِيْتِ فِيْ شَرْحِ اَبْيَاتِ التَّشْبِيْتِ وَ تَوْضِيْحُ الْاَفْكَارِ فِيْ شَرْحِ تَنْقِيْحِ الْاَنْظَارِ اِلٰى غَيْرِ ذٰلِكَ مِنَ الرَّسَائِلِ وَالْمَسَائِلِ الَّتِيْ لَا تُحْصٰى وَكُلُّهَا فَرِيْدَةٌ فِيْ بَابِهَا.

خَطِيْبٌ فِيْ مِحْرَابِهَا، حَجَّ وَ زَارَ وَاسْتَفَادَ مِنْ عُلَمَآءِ الْحَرَمَيْنِ الشَّرِيْفَيْنِ وَغَيْرِهِمْ مِنْ

فُضَلَآءِ الْاَمْصَارِ، فَهُوَ اَكْرَمُ مِنْ اَنْ يَصِفَهٗ مِثْلِيْ، وَقَفْتُ لَهٗ عَلٰى قَصَآئِدَ بَدِيْعَةٍ وَنَظْمٍ رَآئِقٍ، وَكَانَ لَهٗ صَوْلَةٌ فِي الصَّدْعِ بِالْحَقِّ وَاتِّبَاعِ السُّنَّةِ وَتَرْكِ الْبِدْعَةِ لَمْ يَرَ مِثْلَهٗ فِيْ هٰذَا الْاَمْرِ.

وَهُوَ مِنْ مَشَايِخِيْ فِيْ سَنَدِ الْكُتُبِ الْحَدِيْثَةِ عَلٰى مَا صَرَّحْتُ بِهٖ فِيْ سِلْسِلَةِ الْعَسْجَدِ مِنْ ذِكْرِ مَشَايِخِ السَّنَدِ، وَقَدْ ذَكَرْتُ لَهٗ تَرْجَمَةً فِيْ كِتَابِيْ اِتِّحَافِ النُّبَلَآءِ۔ وَنَقَلَهَا عَنْهُ السَّيِّدُ الْمُعَاصِرُ حَامِدُ حُسَيْنٍ فِي الْعَبَقَاتِ عَلٰى تَشَيُّعِهٖ فَلَا نُطِيْلُ الْكَلَامَ هٰهُنَا بِذِكْرِ ذٰلِكَ الْاِمْلَآءِ. تَوَفّٰى رَحِمَهُ اللّٰهُ فِيْ سَنَةِ ۱۱۸۲ھ

وَ خَرَجَ فِيْ زَمَانِهِ الشَّيْخُ مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ الْوَهَّابِ النَّجْدِيِّ الَّذِيْ تُنْسَبُ اِلَيْهِ الطَّآئِفَةُ الْوَهَّابِيَّةُ، فَنَظَمَ قَصِيْدَةً فِيْ ذٰلِكَ وَاَرْسَلَهَا اِلَيْهِ وَاَثْنٰى عَلٰى طَرِيْقَتِهٖ، ثُمَّ لَمَّا سَمِعَ اَنَّهٗ يُكَفِّرُ اَهْلَ الْاَرْضِ وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ رَجَعَ عَمَّا كَانَ قَالَهٗ فِيْ قَصِيْدَتِهٖ كَمَا سَيَاْتِيْ ذٰلِكَ مُفَصَّلًا فِيْ تَرْجَمَةِ: مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِ الْوَهَّابِ.

وَكَانَ لَهٗ اَوْلَادٌ صُلَحَآءُ تَقَدَّمَتْ تَرَاجِمُهُمْ فِيْ هٰذَا الْكِتَابِ وَقَدْ اَثْنٰى عَلَيْهِ وَلَدُهُ السَّيِّدُ عَبْدُ اللّٰهِ فِيْ اِجَازَةٍ كَتَبَهَا لِلشَّيْخِ الْمُحَدِّثِ شَيْخُنَا عَبْدِ الْحَقِّ بْنِ فَضْلِ اللّٰهِ الْمُحَمَّدِيِّ الْهِنْدِيِّ الْمُتَوَفّٰى بِمِئَى سَنَةَ اَلْفٍ وَمَائَتَيْنِ وَثَمَانٍ وَثَمَانِيْنَ الْهِجْرِيَّةِ الْقُدْسِيَّةِ۔ قَالَ فِيْهِ: سَمِعَ مِنِّيْ حِصَّةً مِنْ صَحِيْحِ الْاِمَامِ الْبُخَارِيِّ وَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيَّ بِالْمَثُوْلِ بَيْنَ يَدَيْ اَئِمَّةِ السُّنَّةِ النَّبَوِيَّةِ وَالسِّمَاءِ مِنْهُمْ لِلْاٰثَارِ وَالْاَحَادِيْثِ الْمُصْطَفَوِيَّةِ، مِنْهُمْ وَالِدِيْ وَشَيْخِيْ نَاصِرُ السُّنَّةِ مُجَدِّدُ الْمِائَةِ الْحَادِيَةَ عَشَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ... اِلَخْ وَالشَّيْخُ عَبْدُ الْحَقِّ الْمُحَمَّدِيُّ قَدْ تَلَمَّذَ عَلٰى شَيْخِ شُيُوْخِنَا الشَّوْكَانِيِّ وَكَتَبَ لَهٗ اِجَازَةً بِخَطِّهِ الشَّرِيْفِ يَقُوْلُ فِيْهَا:

اِنِّيْ اَجَزْتُ لِلشَّيْخِ الْعَلَّامَةِ اَبِي الْفَضْلِ عَبْدِ الْحَقِّ بْنِ الشَّيْخِ الْعَلَّامَةِ مُحَمَّدِ فَضْلِ اللّٰهِ الْمُحَمَّدِيِّ الْهِنْدِيِّ ـ كَثَّرَ اللّٰهُ تَعَالٰى بِمَنِّهٖ وَكَرَمِهٖ فَوَآئِدَهٗ وَنَفَعَ بِمَعَارِفِهٖ ـ مَا اشْتَمَلَ عَلَيْهِ هٰذَا الثَّبَتُ الَّذِيْ جَمَعْتُهٗ وَسَمَّيْتُهٗ ''اِتِّحَافُ الْاَكَابِرِ بِاِسْنَادِ الدَّفَاتِرِ'' فَلْيَرْوِ عَنِّيْ مَا اشْتَمَلَ عَلَيْهِ مِنْ كُتُبِ الْاِسْلَامِ عَلَى اخْتِلَافِ اَنْوَاعِهَا كَمَا يَرَاهُ فِيْهِ وَهُوَ اَهْلٌ لِمَا

هُنَالِكَ وَلَمْ اَشْتَرِطْ عَلَيْهِ شَرْطًا فَهُوَ اَجَلُّ مِنْ ذٰلِكَ وَاَعْلٰى. حُرِّرَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ بِتَارِيخِ ۱۰ جُمَادَى الْآخِرَةِ سَنَةَ ۱۲۳۸ھ كَتَبَهُ مُحَمَّدُ بْنُ عَلِيٍّ الشَّوْكَانِيِّ. اِنْتَهٰى.

وَ قَدِ اتَّحَفَنِيْ شَيْخِيْ عَبْدُ الْحَقِّ بِكِتَابِ شَيْخِهِ الشَّوْكَانِيِّ : ''اِتْحَافُ الْاَكَابِرِ بِاِسْنَادِ الدَّفَاتِرِ'' وَ لِيْ اَسَانِيْدُ اُخْرٰى اِلَى الشَّوْكَانِيِّ كَمَا يَلُوْحُ مِنَ الْخُطَّةِ وَ اتْحَافِ النُّبَلَآءِ وَ سِلْسِلَةِ الْعَسْجَدِ. وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَ الْمِنَّةُ.

اس طولانی عبارت سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ علامہ محمد بن صلاح الدین امیر اہل سنت کے یہاں کس پایہ کے عالم ہیں کہ بہ لقب ''سیّد، علامہ، بدر الملۃ المنیر ،مؤید باللہ، امام کبیر، محدث، اصولی، متکلم، مسند الدیار، مجدد دین، مجتہد مطلق'' یاد کیے جاتے ہیں اور اقطار عالم ان کے تبحّر علوم و وسعت نظر و ریاست مذہب پر گواہ ہیں۔ پس ایسا عالم بلکہ امام علامہ ابن ابی الحدید کے اقوال سے استدلال کرے اور بطور سند پیش کرے اور بہ لقب ''علامہ'' یاد کرے تو پھر کس سنی کو ان کے منقولات و روایات میں عذر ہو سکتا ہے؟

اس عبارت سے جہاں علامہ محمد بن صلاح الدین کے امامت کا آپ کو علم حاصل ہوا اور ابن ابی الحدید کے مستند فی النقل ہونے کا، وہاں کتاب مستطاب ''**عبقات الانوار فی امامۃ الائمۃ الاطہار**'' کی عظمت بھی آپ کو معلوم ہوئی کہ اس کے احسان کے زیر بار صرف علمائے شیعہ ہی نہیں ہیں بلکہ علمائے اہل سنت خصوصًا اہل حدیث جو مدعی ''اَنَا وَلَا غَيْرِيْ'' ہیں اس کے ویسے ہی ذلہ خوار ہیں کہ اپنی مذہبی کتابوں میں بلکہ کتب رجال میں جس پر تمامی فن حدیث کا دار و مدار ہے ایسا اس پر اعتماد کرتے ہیں کہ بلا کسی قسم کے تردد و انکار کے اس سے نقل کرتے ہیں اور سند لاتے ہیں۔ فَجَزَى اللّٰهُ مُصَنِّفَهُ الْعَلَّامَةَ عَنِ الْاِسْلَامِ اَحْسَنَ الْجَزَآءِ، فَاِنَّهُ اَحْسَنُ بِالنَّبِيِّ وَاٰلِهِ الْبَرَرَةِ الْاَتْقِيَآءِ۔

اب چونکہ سلسلۂ کلام یہاں تک پہنچ چکا، لہٰذا یہ بتا دینا بھی مناسب ہے کہ درمیان اشاعرہ جو اس زمانے میں اہل سنت کہلاتے ہیں اور درمیان معتزلہ جن کے نام سے بمقابلہ شیعہ نفرت ظاہر کی جاتی ہے کیا فرق ہے؟ کیونکہ توحید و رسالت و خلافت خلفاء و امامت ائمہ اربعہ میں سب مساوی ہیں، حدیث، فقہ، اصول فقہ سب کے ایک ہیں۔ اقرار حقیت خلفائے ثلاثہ میں سب ایک ہیں، شیعوں کی عداوت میں سب ایک ہیں۔ باخود ہا میں ویسا ہی اختلاف ہے، جیسا کہ ایک عالم کو دوسرے عالم سے جزئیات میں اختلاف ہوتا ہے اور اپنے اپنے عقل کے زور سے لڑتے ہیں۔

علامہ شہرستانی ''ملل و نحل''، ص ۳۱، ذکر معتزلہ۔ ص ۷۵، ذکر اشاعرہ، میں لکھتے ہیں کہ تمامی معتزلہ کا اتفاقی عقیدہ یہ ہے:

(۱) صفات خداوند عالم عین ذات ہے، نہ زائد بر ذات۔ عالم لذاتہ ہے، قادر لذاتہ، حی لذاتہ۔ اشاعرہ یعنی اہل سنت

اس کے مخالف ہیں۔ وہ کہتے ہیں: صفات اس کے زائد برذات ہیں۔ یعنی علم جب اس میں ملا تب وہ عالم ہوا، جب حیات خدا کو ملی تب وہ حی ہوا۔ لَا یُقَالُ ''ھُوَ وَلَا غَیْرُہٗ وَلَا لَا ھُوَ وَلَا لَا غَیْرُہٗ'' کہ نہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ صفت عین ذاتِ خدا ہے یا اس کا غیر، نہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ عین ذات نہیں ہے اور غیر ذات نہیں ہے۔ اسی پر امام فخر رازی کہتے ہیں کہ نصاریٰ تو تین قدیم کے قائل ہیں لہٰذا وہ کافر ہوئے اور اشاعرہ دو قدیم کے قائل ہیں۔

(۲) کلامِ خدا حادث ہے اور مخلوق فی المحل حروف صوت وغیرہ جس کی نقل مصحف وغیرہ میں کی جاتی ہے یہ سب حادث ہے۔ اشاعرہ اس کے قائل ہیں کہ کل کلام خدا قدیم ہے یہاں تک کہ قرآن کا کاغذ اور جلد اور روشنائی اور قلم سب قدیم ہیں۔ جیسے خدا موجود ہے یہ بھی موجود ہے۔

یہ بحث اگر چہ آج کل مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے مگر ابتدائے زمانہ میں اس نے ہزاروں کی خونریزی کی جس سے ہزاروں گھر تباہ ہوئے اور ہزاروں علماء جاہل بلکہ کافر بنائے گئے، یہاں تک کہ امام بخاری اسی مسئلہ کے بدولت بخارا سے نکالے گئے اور عجب وحشت خیز سماں رہا۔

(۳) ارادہ، سمع، بصر، معانی قائمہ بذات خدا نہیں۔ اہل سنت اس کو قائم بذات جانتے ہیں۔ اسی وجہ سے خدا کو فاعل خیر و شر مانتے ہیں۔

(۴) رؤیت خداوند عالم آنکھ سے جیسا کہ دنیا میں محال ہے، ویسا ہی آخرت میں بھی محال ہے۔ اہل سنت آخرت میں بلکہ دنیا میں جائز اور ضروری جانتے ہیں۔

(۵) خداوند عالم شبیہ سے ہر طرح مبرّا ہے ''جِھَۃً، مَکَاناً، صُوْرَۃً، جِسْمًا، تَحَیُّزًا، اِنْتِقَالًا، زَوَالًا، تَغَیُّرًا، تَاَثُّرًا''۔ کوئی صفت جو لوازم جسمیت سے ہے خداوند عالم میں نہیں پائی جاتی۔ اہل سنت اس کے بالکل خلاف ہیں، جسمیت، جہت، مکان، سب کے قائل ہیں۔ یہاں تک کہ امام ابن تیمیہ نے منبر کے ایک زینہ سے اتر کر دوسرے زینہ پر بتایا کہ اسی طرح خدا بھی ایک آسمان سے دوسرے آسمان پر اتر آتا ہے اور جس طرح قرآن میں یا حدیث میں الفاظ ''ید، رجل، ساق، صدر، صورت'' وارد ہے اسی طرح ایمان لانا ان کے نزدیک واجب ہے۔

(۶) معتزلہ قائل ہیں کہ بندے اپنے افعال و اعمال میں فاعل مختار ہیں چاہے شر کو اختیار کریں یا خیر کو، خدا نے کسی کو مجبور نہیں کیا ہے، ورنہ اس کا ظلم لازم آتا ہے۔ اہل سنت ہر امر میں بندے کو مجبور مانتے ہیں اور فاعل خیر و شر خدا کو جانتے ہیں۔

(۷) خدا حکیم ہے، جو فعل اس کا ہے وہ مطابق حکمت و مصلحت۔ اہل سنت اس کے خلاف ہیں نہ حکمت کو مانتے نہ مصلحت کو۔

(۸) معتزلہ کہتے ہیں کہ استحقاقِ ثواب طاعت و عمل پر ہے، اگر باتوبہ و با ایمان دنیا سے گیا ثواب پائے گا، ورنہ عذاب کا مستحق ہوگا مگر مومن ہمیشہ جہنم میں نہ رہے گا۔ اہل سنت اس کے خلاف ہیں ثواب و عذاب کو تابع عمل نہیں جانتے، بلکہ جس کو چاہے خدا جہنم میں ڈال دے جس کو چاہے ثواب دے۔

(۹) معتزلہ قائل ہیں کہ حسن و قبح اشیا عقلی ہے۔ اسی بنیاد پر اصولِ معرفت و شکرِ نعمت ہر شخص پر واجب ہے۔ اہل سنت اس کے خلاف ہیں کہ حسن و قبح اشیا تابع شریعت ہے، نہ کہ عقل سے دریافت ہو سکے۔

یہی نو اصول ہیں اتفاقی تمامی معتزلہ کے جس کے خلاف اہل سنت قائل ہیں اور اسی مخالفت کے بنیاد پر جہاں کسی معتزلہ عالم کا قول یا اس کی روایت نقل کی جاتی ہے تو اہل سنت چوکنا ہوتے ہیں اور بھیانک، ڈراؤنے الفاظ سے کہا جاتا ہے کہ یہ روایت تو معتزلی کی ہے۔ حالانکہ خاص معتزلہ کی نہ کوئی کتاب حدیث کی ہے نہ فقہ کی، بلکہ انہیں صحاح ستہ پر ان کا بھی عمل ہے اور انہیں ائمہ اربعہ کے وہ بھی مقلد ہیں، صرف ان مسائل جزئیہ میں وہ تمام اہل سنت کے مخالف ہیں۔ بلکہ خود اہل سنت نے ان کے خلاف اپنا مذہب قائم کیا کیونکہ ابتدا میں سب انہیں معتزلہ کے پیرو تھے۔ ۳۶۴ھ سے ابوالحسن اشعری نے یہ نیا مذہب قائم کیا جو ''اشاعرہ'' کہلاتا ہے اور اہل سنت، ورنہ سب انہی کے شاگرد در شاگرد ہیں۔

اہل سنت اگرچہ بمقابلہ شیعہ معتزلہ کو برا کہتے میں یا کسی قول و روایت کے پابندی سے انکار کیا چاہتے ہیں مگر ہر عاقل سمجھ سکتا ہے کہ ان کل مسائل میں اہل سنت خطا پر ہیں اور معتزلہ بہ نسبت ان کے حق پر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عام طور سے علمائے اہل سنت کو اس کا اقرار کرنا پڑا کہ اصول معتزلہ بہتر ہیں اصول اشاعرہ سے۔

چنانچہ علامہ صلاح الدین خلیل بن ایبک صفدی ''وافی بالوفیات'' میں بذیل ترجمہ محمد بن علی بن طیب ابوالحسین معتزلی المتوفی ۴۳۶ھ لکھتے ہیں:

قَالَ ابْنُ خَلِّكَانَ: اِنَّ الْاِمَامَ فَخْرَ الدِّينِ اَخَذَ كِتَابَهُ الْمَحْصُولَ فِيْ اُصُوْلِ الْفِقْهِ مِنْ كِتَابِ الْمُعْتَمَدِ لِاَبِي الْحُسَيْنِ، قُلْتُ: وَ قَدْ سَمِعْتُ الشَّيْخَ الْاِمَامَ الْعَلَّامَةَ تَقِيَّ الدِّينِ اَحْمَدَ بْنَ تَيْمِيَّةٍ غَيْرَ مَرَّةٍ يَقُوْلُ اُصُوْلُ فِقْهِ الْمُعْتَزِلَةِ خَيْرٌ مِّنْ اُصُوْلِ فِقْهِ الْاَشَاعِرَةِ وَ اُصُوْلُ دِينِ الْاَشَاعِرَةِ خَيْرٌ مِّنْ اُصُوْلِ دِيْنِ الْمُعْتَزِلَةِ، وَ تُوُفِّيَ سَنَةَ سِتٍّ وَ ثَلَاثِينَ وَ اَرْبَعِمِائَةٍ وَ صَلّٰى عَلَيْهِ الْقَاضِيْ اَبُوْ عَبْدِ اللّٰهِ الصَّيْمَرِيّ وَ دُفِنَ فِي مَقْبَرَةِ الشُّونِيْزِيّ.

اس عبارت سے بصراحت معلوم ہوا کہ امام فخر الدین رازی نے اپنی کتاب محصول جو اصول فقہ میں لکھی ہے تو وہ تمام تر کتاب معتمد ابوالحسین معتزلی سے ماخوذ ہے، بلکہ بقول شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ اصول فقہ معتزلہ بہتر ہے اصول فقہ اشاعرہ سے، تو پھر کس منہ سے اہل سنت پر اعتراض کر سکتے ہیں کہ معتزلہ کے اقوال سے بمقابلہ اہل سنت استدلال کیا جاتا ہے۔

اور خود امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں اپنی کتاب ''منہاج السنۃ'' میں:

وَ هٰذَا الْكَلَامُ، وَ اِنْ كَانَ اَصْلُهٗ مِنَ الْمُعْتَزِلَةِ، فَقَدْ دَخَلَ فِي كَلَامِ الْمُثْبِتِيْنَ لِلصِّفَاتِ، حَتّٰى فِيْ كَلَامِ الْمُنْتَسِبِيْنَ اِلَى السُّنَّةِ الْخَاصَّةِ: الْمُنْتَسِبِيْنَ اِلَى الْحَدِيْثِ وَالسُّنَّةِ، وَهُوَ مَوْجُوْدٌ فِيْ كَلَامِ كَثِيْرٍ مِنْ اَصْحَابِ مَالِكٍ وَالشَّافِعِيِّ وَاَحْمَدَ وَاَبِيْ حَنِيْفَةَ وَغَيْرِهِمْ.

وَهٰذَا مِنَ الْكَلَامِ الَّذِي بَقِيَ عَلَى الْاَشْعَرِيِّ مِنْ بَقَايَا كَلَامِ الْمُعْتَزِلَةِ، فَاِنَّهٗ خَالَفَ الْمُعْتَزِلَةَ لَمَّا رَجَعَ عَنْ مَذْهَبِهِمْ فِيْ اُصُوْلِهِمُ الَّتِي اشْتُهِرُوْا فِيْهَا بِمُخَالَفَةِ السُّنَّةِ كَاِثْبَاتِ الصِّفَاتِ وَالرُّؤْيَةِ، وَ اَنَّ الْقُرْاٰنَ غَيْرُ مَخْلُوْقٍ، وَ اِثْبَاتِ الْقَدْرِ، وَغَيْرِ ذٰلِكَ مِنْ مَقَالَاتِ اَهْلِ السُّنَّةِ وَالْحَدِيْثِ، وَذَكَرَ فِيْ كِتَابِ ''الْمَقَالَاتِ'' اَنَّهٗ يَقُوْلُ بِمَا ذَكَرَهٗ عَنْ اَهْلِ السُّنَّةِ وَالْحَدِيْثِ.

وَذَكَرَ فِي ''الْاِبَانَةِ'' اَنَّهٗ يَأْتَمُّ بِقَوْلِ الْاِمَامِ اَحْمَدَ. وَ قَالَ: فَاِنَّهُ الْاِمَامُ الْكَامِلُ، وَالرَّئِيْسُ الْفَاضِلُ، الَّذِيْ اَبَانَ اللّٰهُ بِهِ الْحَقَّ، وَ اَوْضَحَ بِهِ الْمِنْهَاجَ، وَقَمَعَ بِهٖ بِدَعَ الْمُبْتَدِعِيْنَ، وَزَيْغَ الزَّآئِغِيْنَ، وَشَكَّ الشَّاكِّيْنَ.

وَقَالَ: اِنْ قَالَ قَآئِلٌ: قَدْ اَنْكَرْتُمْ قَوْلَ الْجَهْمِيَّةِ وَالْمُعْتَزِلَةِ وَالْقَدَرِيَّةِ وَالْمُرْجِئَةِ وَاحْتَجَّ فِيْ ضِمْنِ ذٰلِكَ بِمُقَدَّمَاتٍ سَلَّمَهَا لِلْمُعْتَزِلَةِ مِثْلِ هٰذَا الْكَلَامِ، فَصَارَتِ الْمُعْتَزِلَةُ وَغَيْرُهُمْ مِنْ اَهْلِ الْكَلَامِ يَقُوْلُوْنَ: اِنَّهٗ مُتَنَاقِضٌ فِيْ ذٰلِكَ. وَكَذٰلِكَ سَآئِرُ اَهْلِ السُّنَّةِ وَالْحَدِيْثِ يَقُوْلُوْنَ: اِنَّ هٰذَا تَنَاقُضٌ، وَاِنَّ هٰذِهٖ بَقِيَّةٌ بَقِيَتْ عَلَيْهِ مِنْ كَلَامِ الْمُعْتَزِلَةِ. وَاَصْلُ ذٰلِكَ هُوَ هٰذَا الْكَلَامُ، وَهُوَ مَوْجُوْدٌ فِيْ كَلَامِ كَثِيْرٍ مِنْ اَصْحَابِ اَحْمَدَ وَالشَّافِعِيِّ وَمَالِكٍ، وَكَثِيْرٌ مِنْ هٰؤُلَآءِ يُخَالِفُ الْاَشْعَرِيَّ فِيْ مَسَآئِلَ، وَقَدْ وَافَقَهٗ عَلَى الْاَصْلِ الَّذِيْ يَرْجِعُ اِلَيْهِ تِلْكَ الْمَسَآئِلُ،

فَيَقُولُ النَّاسُ فِيْ تَنَاقُضِهٖ كَمَا قَالُوْهُ فِيْ تَنَاقُضِ الْاَشْعَرِيِّ، وَكَمَا قَالُوْهُ فِيْ تَنَاقُضِ الْمُعْتَزِلَةِ وَتَنَاقُضِ الْفَلَاسِفَةِ، فَمَا مِنْ طَآئِفَةٍ فِيْهَا نَوْعٌ يَسِيْرٌ مِنْ مُخَالَفَةِ السُّنَّةِ الْمَحْضَةِ وَالْحَدِيْثِ اِلَّا وَيُوْجَدُ فِيْ كَلَامِهَا مِنَ التَّنَاقُضِ بِحَسَبِ ذٰلِكَ، وَاَعْظَمُهُمْ تَنَاقُضًا اَبْعَدُهُمْ عَنِ السُّنَّةِ، كَالْفَلَاسِفَةِ ثُمَّ الْمُعْتَزِلَةِ وَالرَّافِضَةِ.

فَلَمَّا اعْتَقَدَ هٰؤُلَآءِ اَنَّهُمْ اَثْبَتُوْا بِهٰذَا الدَّلِيْلِ حُدُوْثَ الْجِسْمِ، لَزِمَ انْتِفَآءُ ذٰلِكَ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى، لِاَنَّ اللّٰهَ قَدِيْمٌ لَيْسَ بِمُحْدَثٍ، فَقَالَتِ الْمُعْتَزِلَةُ: اِذَا قَامَتْ بِهِ الصِّفَاتُ فَهُوَ جِسْمٌ، لِاَنَّ الصِّفَاتَ اَعْرَاضٌ، وَالْعَرَضُ لَا يَقُوْمُ اِلَّا بِجِسْمٍ، فَنَفَتِ الصِّفَاتِ، وَنَفَتْ اَيْضًا قِيَامَ الْاَفْعَالِ الِاخْتِيَارِيَّةِ بِهٖ، لِاَنَّهَا اَعْرَاضٌ وَلِاَنَّهَا حَوَادِثُ، فَقَالَتْ: الْقُرْاٰنُ مَخْلُوْقٌ، لِاَنَّ الْقُرْاٰنَ كَلَامُهٗ وَهُوَ عَرَضٌ، وَلِاَنَّهٗ يَفْتَقِرُ اِلَى الْحَرَكَةِ وَهِيَ حَادِثَةٌ، فَلَا يَقُوْمُ اِلَّا بِجِسْمٍ. وَقَالَتْ اَيْضًا: اِنَّهٗ لَا يُرٰى فِي الْاٰخِرَةِ، لِاَنَّ الْعَيْنَ لَا تَرٰى اِلَّا جِسْمًا اَوْ قَآئِمًا بِجِسْمٍ. وَقَالَتْ: لَيْسَ هُوَ فَوْقَ الْعَالَمِ، لِاَنَّ ذٰلِكَ مَكَانٌ، وَالْمَكَانُ لَا يَكُوْنُ بِهٖ اِلَّا جِسْمٌ، اَوْ مَا يَقُوْمُ بِجِسْمٍ. وَهٰذَا هُوَ الْمَذْهَبُ الَّذِيْ ذَكَرَهٗ هٰذَا الْاِمَامِيُّ.

اس عبارت سے بخوبی ظاہر ہوا کہ جتنے لوگ پیروان ائمہ اربعہ سے نفی جسمیت خداوند عالم کے قائل ہیں یا استدلال کرتے ہیں وہ سب مقلد اور پیرو ہیں معتزلہ کے جس کے صریحی مطلب یہ ہوئے کہ اگر علمائے اہل سنت تقلید مذہب معتزلہ سے بالکل دست بردار ہوجائیں تو کسی طرح وہ خداوند کریم کی جسمیت سے نہ انکار کر سکتے ہیں نہ اس کا ابطال، بلکہ ابتدا اس نفی جسمیت خدا کی انہی معتزلہ سے ہے جن کا کلام داخل ہوگیا ہے ان لوگوں میں بھی جو صفت خدا کو زائد بر ذات جانتے ہیں کہ وہ خاص اہل سنت بلکہ خاص اہل حدیث ہیں۔ بلکہ لکھتے ہیں: یہ بقایائے کلام معتزلہ سے ہے جو اہل سنت کے ذمہ باقی رہ گیا اور سبکدوش نہ ہو سکے۔ کیونکہ جب اہل سنت نے مذہب معتزلہ سے رجوع کیا ان کے مقالات مخصوصہ سے جو مشہور تھے ان میں اور کتاب مقالات میں لکھا ہے کہ وہ یعنی ابوالحسن اشعری قائل تھے شاید ان عقائد کے جو اہل سنت و اہل حدیث کے عقائد ہیں اور ابانہ میں ہے کہ وہ پیرو تھے امام احمد کے جو امام کامل ہیں۔

اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ تم قول جہمی و معتزلی کے تو مخالف ہو کر ان کے مقدمات کو قبول کرتے ہو جس سے معتزلہ وغیرہ

کہتے ہیں کہ اشاعرہ کے قول میں تناقض ہے، بلکہ اہل سنت اور اہل حدیث بھی اس تناقص کے قائل ہیں اور یہ کہ یہ بقیہ ہے کلام معتزلہ کا اور اصل ان سب کی موجود ہے کلام پیروان امام احمد وشافعی و مالک وغیرہ میں جو سب مخالفت کرتے ہیں اشعری سے، حالانکہ اصل مسئلہ میں سب موافق ہیں۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ بیشک اشاعرہ کا تناقض ایسا ہی ہے اور معتزلہ بلکہ فلاسفہ میں بھی تناقص ہے، بلکہ جس طائفہ کو لو گے اس میں کچھ نہ کچھ تناقض ضرور ہے اور جس قدر تناقص زیادہ ہوگا اسی قدر سنیت سے خلاف زیادہ ہوگا مثل فلاسفہ کے، ان کے بعد رافضیہ (جس سے معلوم ہوا کہ شیعوں کے اقوال میں سب سے کم تناقض ہے)، لہٰذا مخالفت سنت میں بھی ان کا حصہ بہت کم ہے۔

بہر حال اس عبارت سے جہاں اقوال اہل سنت کا متناقض ہونا ثابت ہوا وہاں یہ بھی بخوبی ظاہر ہوا کہ تمامی اہل سنت کاسہ لیس معتزلہ ہیں اور ابھی تک ان کا بقیہ ان کے یہاں چلا جاتا ہے اور جب تک یہ لوگ جسمیت خداوند عالم سے انکار کریں گے تقلید معتزلہ کا بار ان کے گردن سے الگ نہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابن تیمیہ اور ان کے پیرو جتنے اہلحدیث ہیں وہ سب جسمیت خدا کے قائل ہیں۔

یہ تو اصول اہل سنت کا حال تھا، اب فروع کو لیجئے جسے علم الفقہ بھی کہتے ہیں۔ اس میں بھی یہ اسی طرح معتزلہ کے ذلہ خوار ہیں۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب اپنے رسالہ انصاف میں فرماتے ہیں:

وَجَدْتُ بَعْضَهُمْ يَزْعَمُ اِنَّ بِنَاءَ الْمَذْهَبِ عَلٰى هٰذِهِ الْمُحَاوَرَاتِ الْجَدَلِيَّةِ الْمَذْكُورَةِ فِيْ مُبْسُوطِ السَّرْخَسِيِّ وَالْهِدَايَةِ وَالتَّبْيِيْنِ وَ نَحْوِ ذٰلِكَ وَلَا يَعْلَمُ اَنَّ اَوَّلَ مَنْ اَظْهَرَ ذٰلِكَ مِنْهُمُ الْمُعْتَزِلَةُ وَ لَيْسَ عَلَيْهِ بِنَاءُ مَذْهَبِهِمْ ثُمَّ اسْتَطَابَ ذٰلِكَ الْمُتَاَخِّرُوْنَ تَوَسُّعًا وَ تَشْحِيْذًا لِاِذْهَانِ الطَّالِبِيْنَ اَوْ لِغَيْرِ ذٰلِكَ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ.

پس جب یہ اکابر اہل سنت مثل شمس الائمہ سرخسی اور صاحب ہدایہ و مولف تبیین وغیرہ جو کتب فقہ اہل سنت کی جان سمجھی جاتی ہیں معتزلہ کے ذلہ خوار ہوں اور ان کی تقلید کو مایہ فخر و ناز سمجھیں جس سے یہی مباحث جدلیہ عین تحقیقات ہوں تو شیعوں کا استدلال انہی معتزلہ کے اقوال سے کیوں غلط ہوگا اور کیوں نہ وہ روایات و اقوال قابل قبول ہوں گے۔

اب اس سے بھی آگے قدم بڑھایئے تو خود فن رجال کے تحقیقات میں بھی جہاں علما اور محدثین کی توثیق با قدح و جرح بیان کرتے ہیں اور اسی پر صحت و سقم روایت کا دارومدار ہے، وہاں بھی ان علمائے معتزلہ کے اقوال سے سند لاتے ہیں اور مثل دیگر علما کے اقوال کے ان کی تحقیقات کو بھی ذکر کرتے ہیں۔ دیکھیے علامہ ابن حجر عسقلانی، امام ابو یوسف شاگرد امام ابوحنیفہ کے

احوال میں لکھتے ہیں:

يَعْقُوْبُ بْنُ اِبْرَاهِيْمَ الْقَاضِيّ عَنْ عَطَاءِ بْنِ السَّائِبِ وَ هِشَامِ بْنِ وَعْرَوَةٍ، قَالَ الْفَلَاسُ صَدُوْقٌ كَثِيْرُ الْخَطَأِ وَ قَالَ الْبُخَارِيُّ تَرَكُوْهُ وَ قَالَ عُمَرُ وَالنَّاقِدُ صَاحِبُ سُنَّةٍ وَ قَالَ اَبُوْحَاتِمٍ يَكْتُبُ حَدِيْثَهٗ وَ قَالَ الْمُزْنِيُّ هُوَ وَاسِعُ الْحَدِيْثِ وَ قَالَ مَحْمُوْدُ بْنُ غَيْلَانَ قُلْتُ لِيَزِيْدِ بْنِ هَارُوْنَ مَا تَقُوْلُ فِيْ اَبِيْ يُوْسُفَ فَقَالَ اَنَا اَرْوِيْ عَنْهُ وَ قَالَ ابْنُ رَاهَوَيْهِ حَدَّثَنَا يَحْيٰى بْنُ اٰدَمَ قَالَ شَهِدَ اَبُو يُوْسُفَ عِنْدَ شَرِيْكٍ فَرَدَّهٗ وَ قَالَ لَا اَقْبَلُ مَنْ يَزْعَمُ اَنَّ الصَّلٰوةَ لَيْسَتْ مِنَ الْاِيْمَانِ وَ قَدْ رُوِيَ عَنِ ابْنِ مَعِيْنٍ تَلْيِيْنُ اَبِيْ يُوْسُفَ۔

وَ اَمَّا الطَّحَاوِيُّ فَقَالَ سَمِعْتُ اِبْرَاهِيْمَ ابْنَ اَبِيْ دَاوُدَ الْبَرْلَسِيّ يَقُوْلُ سَمِعْتُ يَحْيٰى بْنَ مَعِيْنٍ يَقُوْلُ لَيْسَ فِيْ اَصْحَابِ الرَّاْيِ اَكْثَرُ حَدِيْثًا مِنْهُ وَلَا اَثْبَتَ مِنْ اَبِيْ يُوْسُفَ وَ قَالَ ابْنُ عَدِيٍّ لَيْسَ فِيْ اَصْحَابِ الرَّاْيِ اَكْثَرُ حَدِيْثًا مِنْهُ اِلَّا اَنَّهٗ يَرْوِيْ عَنِ الضُّعَفَاءِ مِثْلِ الْحَسَنِ بْنِ عَمَارَةٍ وَ غَيْرِهٖ وَ كَثِيْرًا مَا يُخَالِفُ اَصْحَابَهٗ وَ يَتَّبِعُ الْاَثَرَ اِذَا رُوِيَ عَنْهُ ثِقَةٌ وَ اِذَا رَوٰى هُوَ عَنْ ثِقَةٍ فَلَا بَاْسَ بِهٖ اِنْتَهٰى۔

وَ قَالَ النِّسَائِيُّ فِيْ كِتَابِ الضُّعَفَاءِ لَمَّا ذَكَرَ اَصْحَابَ اَبِيْ حَنِيْفَةَ اَبُوْ يُوْسُفَ ثِقَةٌ وَ ذَكَرَهُ ابْنُ حَبَّانَ فِي الثِّقَاتِ وَ قَالَ كَانَ شَيْخًا مُتْقَنًا لَمْ يَسْلُكْ مَسْلَكَ صَاحِبَيْهِ اِلَّا فِي الْفُرُوْعِ وَ كَانَ يُنَاسِبُهَا فِي الْاِيْمَانِ وَالْقُرْاٰنِ وَ نَقَلَ عَنْ مُحَمَّدِ ابْنِ الصَّبَّاحِ كَانَ اَبُوْ يُوْسُفَ يَسْلُكُ مَسْلَكَ صَاحِبَيْهِ فِي الْفُرُوْعِ وَ كَانَ رَجُلًا صَالِحًا وَ كَانَ يُسَرِّدُ الصَّوْمَ وَ ذَكَرَ الْعَقَيْلِيُّ بِسَنَدٍ صَحِيْحٍ عَنِ ابْنِ الْمُبَارَكِ اَنَّهٗ وَهَّاهُ وَ عَنْ يَزِيْدِ بْنِ هَارُوْنَ لَا تَحِلُّ الرِّوَايَةُ عَنْهُ، كَانَ يُعْطِيْ اَمْوَالَ الْيَتَامٰى مُضَارَبَةً وَ يَجْعَلُ الرِّبْحَ لِنَفْسِهٖ يَعْنِيْ اَنَّهٗ كَانَ يَقْتَرِضُهَا عَلٰى ذِمَّتِهٖ وَ عَنِ الْفَضْلِ بْنِ عِيَاضٍ وَ قِيْلَ لَهٗ مَا تَقُوْلُ فِيْ عِلْمِ اَبِيْ يُوْسُفَ قَالَ اَيْ، عَلِمَ هُوَ وَ قَالَ الشِّيْرَازِيُّ فِي الْاَلْقَابِ سَمِعْتُ عَبْدَ الْمَلِكِ بْنَ مُحَمَّدٍ السَّوَائِيَّ يَقُوْلُ لَمَّا دُفِنَ اَبُوْ يُوْسُفَ وَقَفَ النِّظَامُ عَلٰى قَبْرِهٖ فَقَالَ:

سَقٰى جَدَثًا بِهٖ يَعْقُوْبَ اَمْسٰى ... مِنَ الْوَسْمِيِّ مُنْبَجِسُ رِكَامِ
تَلَطَّفَ فِي الْقِيَاسِ لَنَا فَاَضْحَتْ ... حَلَالًا بَعْدَ حُرْمَتِهَا الْمُدَامِ

وَلَوْلَا اَنَّ مُدَّتَهٗ نَقَصَتْ وَعَاجِلُهٗ بِمَنِيَّتِهٖ الْحِمَامِ
لَاَعْمَلَ فِي الْقِيَاسِ الْفِكْرَ حَتّٰى يُحِلَّ لَنَا الْخَرِيْدَةَ وَالْغُلَامَ

اِنْتَهٰی

اس عبارت سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ علامہ عسقلانی نے امام ابو یوسف کے حالات میں جہاں فلاس، امام بخاری، مزنی، محمود بن غیلان، یزید بن ہارون، یحیٰ بن معین، ابن عدی، امام نسائی، ابن حبان، عقیلی وغیرہ ائمہ محدثین کے مختلف اقوال لکھے تھے کہ کوئی ان کو ثقہ جانتا ہے کوئی ان کو عادل کہتا ہے کوئی واہی بتاتا ہے۔ چنانچہ یزید بن ہارون کہتے ہیں کہ ابو یوسف کی حدیث کا روایت کرنا حلال نہیں کیونکہ وہ یتیموں کا مال بطور مضاربہ لوگوں کو دیا کرتے اور جو کچھ اس سے نفع ہوتا وہ خود لیتے، وہاں نظام معتزلی کے اشعار بھی لکھے کہ جب نظام قبر امام ابو یوسف پر آ کھڑا تو چند اشعار کہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انہوں نے اس درجہ قیاس میں تلطف کیا کہ شراب کو جو ہمیشہ سے حرام تھی حلال کر دیا۔ اگر ان کی مدت حیات تمام نہ ہو جاتی تو ان کے قیاس اور فکر سے زنا اور لواطہ بھی ہم لوگوں کے لیے حلال اور مباح ہو جاتے۔

پس جب ان علمائے معتزلہ کی یہ قدر و منزلت ہے کہ تمام علمائے اہل سنت بکمال فخر و مباحات اصول دین اور فرع دین اور تحقیق رجال میں ان کے مقلد ہیں اور ان کی اس تقلید پر نازاں ہیں اور ابتدا میں سب انہیں کے مذہب پر تھے اور ان کا بقیہ ابھی تک ان میں چلا جاتا ہے تو بمقابلہ شیعہ ان کے اقوال اور روایات سے کیونکر انکار کر سکتے ہیں حالانکہ صدہا خوارج و معتزلہ صحاح ستہ کی روایتوں میں بھرے ہوئے ہیں۔ بہر حال چونکہ اہل سنت عام طور پر عوام کے فریب دہی کے لیے کہہ دیا کرتے ہیں کہ یہ عالم معتزلی ہے یا یہ قول یا یہ روایت معتزلہ کی ہے اس لیے اس قدر ان کی حالت اور جلالت قدر یہاں دکھائی گئی کہ کسی فن میں اہل سنت ان کی تتبع اور شاگردی سے علیحدہ نہیں ہو سکتے اور اگر ان کے اقوال و روایات ان کے مجموعہ سے نکال دیے جائیں تو پھر ان کا وجود ہی نہیں رہتا ورنہ ہم آئندہ بتا دیں گے کہ جب اقوال یا روایات سے شیعہ بمقابلہ اہل سنت استدلال کرتے ہیں اس کے قائل یا راوی صرف معتزلہ نہیں ہیں بلکہ اہل سنت یعنی اشاعرہ کے اقوال و تصریحات ان ابواب میں کہیں زیادہ ہیں معتزلہ سے۔

شیخ ابو جعفر اسکافی

چونکہ علامہ ابن ابی الحدید نے جن کے حالات ابھی مذکور ہوئے، اکثر مقام پر شرح نہج البلاغہ میں اپنے استاد شیخ ابو جعفر اسکافی کے اقوال بھی نقل کیے ہیں اور مقام استدلال میں لائے ہیں لہٰذا مختصراً ان کی جلالت قدر بھی ملاحظہ فرمائیے۔ علامہ ابو سعید عبد الکریم سمعانی جو مشہور ائمہ اہل سنت سے ہیں اپنی کتاب انساب میں لکھتے ہیں:

اَبُو جَعْفَرٍ مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ الاسْكَافِيّ اَحَدُ الْمُتَكَلِّمِيْنَ مِنْ مُعْتَزِلَةِ الْبَغْدَادِيِّيْنَ لَهٗ

تَصَانِيْفُ مَعْرُوْفَةٌ وَ كَانَ الْحُسَيْنُ بْنُ عَلِيٍّ الْكَرَابِيْسِيّ يَتَكَلَّمُ مَعَهٗ وَ يُنَاظِرُهٗ وَ بَلَغَنِيْ اَنَّهٗ مَاتَ فِيْ سَنَةِ اَرْبَعِيْنَ وَ مِائَتَيْنِ.

اور معجم البلدان حموی میں ہے:

مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ اَبُوْ جَعْفَرٍ الْاِسْكَافِيّ عِدَادُهٗ فِيْ اَهْلِ بَغْدَادَ اَحَدُ الْمُتَكَلِّمِيْنَ مِنَ الْمُعْتَزِلَةِ لَهٗ تَصَانِيْفُ وَ كَانَ يُنَاظِرُ الْحُسَيْنَ بْنَ عَلِيٍّ الْكَرَابِيْسِيّ وَ يَتَكَلَّمُ مَعَهٗ مَاتَ فِيْ سَنَةِ اَرْبَعَةٍ وَ مِائَتَيْنِ۔

اور قاضی القضاۃ عبدالجبار معتزلی لکھتے ہیں جیسا کہ علامہ ابن ابی الحدید نے اپنی شرح نہج البلاغہ میں نقل کیا ہے:

وَ اَمَّا اَبُوْ جَعْفَرٍ الْاِسْكَافِيُّ وَ هُوَ شَيْخُنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ الْاِسْكَافِيّ عَدَّهُ قَاضِي الْقُضَاةِ فِي الطَّبَقَةِ السَّابِعَةِ مِنَ الْمُعْتَزِلَةِ مَعَ عَبَّادِ بْنِ سُلَيْمَانَ الصَّيْمَرِيّ وَ مَعَ زَرْقَانَ وَ مَعَ عِيسَى بْنِ الْهَيْثَمِ الصُّوفِيّ وَ جَعَلَ اَوَّلَ الطَّبَقَةِ ثُمَامَةَ بْنَ اَشْرَسَ اَبَا مَعْنٍ ثُمَّ اَبَا عُثْمَانَ الْجَاحِظَ ثُمَّ اَبَا مُوسى عِيسَى بْنَ صُبَيْحٍ الْمُرْدَارَ ثُمَّ اَبَا عِمْرَانَ يُونُسَ بْنَ عِمْرَانَ ثُمَّ مُحَمَّدَ بْنَ شَبِيْبٍ ثُمَّ مُحَمَّدَ بْنَ اسْمَاعِيلَ الْعَسْكَرِيّ ثُمَّ عَبْدَ الْكَرِيمِ بْنَ رُوحٍ الْعَسْكَرِيّ ثُمَّ اَبَا يَعْقُوبَ يُوسُفَ بْنَ عَبْدِ اللّٰهِ الشَّحَّامَ ثُمَّ اَبَا الْحُسَيْنِ الصَّالِحِ ثُمَّ صَالِحٍ قُبَّةَ الْجُعْفَرَانِ جَعْفَرَ بْنَ جَرِيرٍ وَ جَعْفَرَ بْنَ مَيْسَرٍ ثُمَّ اَبَا عِمْرَانَ بْنَ النَّقَّاشِ ثُمَّ اَبَا سَعِيدٍ اَحْمَدَ بْنَ سَعِيدٍ الْاَسَدِيّ ثُمَّ عِبَادَ بْنَ سُلَيْمَانَ ثُمَّ اَبَا جَعْفَرٍ الْاِسْكَافِيَّ هٰذَا وَ قَالَ: كَانَ اَبُوْ جَعْفَرٍ فَاضِلًا عَالِمًا وَ صَنَّفَ سَبْعِينَ كِتَابًا فِيْ عِلْمِ الْكَلَامِ.

وَ هُوَ الَّذِيْ نَقَضَ كِتَابَ الْعُثْمَانِيَّةِ عَلٰى اَبِيْ عُثْمَانَ الْجَاحِظِ فِيْ حَيَاتِهٖ وَ دَخَلَ الْجَاحِظُ الْوَرَّاقِيْنَ بِبَغْدَادَ فَقَالَ مَنْ هٰذَا الْغُلَامُ السَّوَادِيُّ الَّذِيْ بَلَغَنِيْ اَنَّهٗ تَعَرَّضَ لِنَقْضِ كِتَابِيْ وَ اَبُوْ جَعْفَرٍ جَالِسٌ فَاخْتَفٰى مِنْهُ حَتّٰى لَمْ يَرَهٗ. وَ كَانَ اَبُوْ جَعْفَرٍ يَقُوْلُ بِالتَّفْضِيْلِ عَلٰى قَاعِدَةِ مُعْتَزِلَةِ بَغْدَادَ وَ يُبَالِغُ فِيْ ذٰلِكَ وَ كَانَ عَلَوِيَّ الرَّاْيِ مُحَقِّقًا وَ مُنْصِفًا قَلِيْلَ الْعَصَبِيَّةِ.

ان عبارتوں سے بخوبی ظاہر ہے کہ ابوجعفر اسکافی معتزلۂ بغداد کے اماموں سے ہیں، جن کا شمار طبقہ سابعہ میں ہے۔ ستّر کتابیں علم کلام میں انہوں نے تصنیف کی ہیں۔ ابوعثمان جاحظ کی کتاب عثمانیہ کی انہوں نے رد لکھی اس کے زندگی میں۔ یہ بھی

قائل تفضیل تھے، مطابق قاعدہ معتزلہ بغداد کے علوی الرائے تھے، محقق ومصنف تھے اور قلیل التّعصب۔

اب مختصر طور پر کچھ بقیہ شارحین نہج البلاغہ کا ذکر کیا جاتا ہے تا کہ یہ مقدمہ تمام ہو۔

شارح دوم علمائے اہل سنت سے

شارح دوم علمائے اہل سنت سے قوام الدین یوسف بن حسن ہیں جیسا کہ کشف الظنون میں ہے بعد ذکر شرح ابن ابی الحدید، وشرحہ المولی قوام الدین یوسف بن حسن الشہیر بقاضی بغداد المتوفّٰی ۹۲۲ھ اثنین وعشرین وتسعمائۃ۔ (صفحہ ۴۰۸) یعنی مولا قوام الدین یوسف بن حسن شہیر بقاضی بغداد نے بھی اس کی شرح لکھی تھی۔ چنانچہ مجمل حال ان کا اور اس شرح کا سابقاً مذکور ہوا دیکھو صفحہ (۱۸) کتاب ہٰذا۔

شارح سوم علمائے اہل سنت سے

شارح سوم علمائے اہل سنت سے مفتی محمد عبدہ ہیں جن کی شرح با حاشیہ اصل کتاب کے ساتھ مصر میں چھپی ہے جو پیش نظر ہے اور اس کے حواشی سے بہت کچھ اس ترجمہ اور شرح میں مدد لی گئی ہے، بلکہ اصل عبارت اس کی عربی میں نقل کر دی گئی ہے معہ ترجمہ۔ اس حاشیہ میں بڑی خوبی یہ ہے کہ فریقین کے اختلافات تعصب آمیز سے بہت کچھ اجتناب کیا گیا ہے اور محض حل عبارت کتاب پر اکتفا کیا ہے۔

ذکر علمائے شیعہ شارحین نہج البلاغہ

یہاں تک علمائے اہل سنت کے شرحوں کا ذکر تھا۔ اب کچھ ان شرحوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو علمائے شیعہ نے اس کتاب پر لکھے ہیں جس کی تعداد لَا تُحْصٰی ہے کیونکہ یہ شروح کچھ ایک طور پر نہیں لکھی گئیں، بعض نے تو مفصل شرحیں لکھیں ہیں مثل شرح ابن ابی الحدید کے کہ اصل عبارت کتاب کو پہلے لکھا پھر اس کی شرح کی، بعض نے شرح ممزوج لکھی بغیر اس کے کہ قال یا قولہ لکھا ہو، بعض نے ایک خطبہ کی شرح لکھی اور بعض نے ایک ایک قول میں مبسوط رسائل لکھے جس سے شمار ان کل مصنفات کا نہایت عسیر ہے، تاہم بعض شروح کا ذکر مجملاً کیا جاتا ہے تاکہ معلوم ہو ابتدا سے یہ کتاب کس نظر عظمت سے دیکھی گئی:

(۱) سب سے پہلے جس نے اس کتاب مستطاب پر شرح لکھی وہ علامہ جلیل سیّد علی بن ناصر ہیں معاصر سید رضی علیہ الرحمہ جنہوں نے گویا اس کتاب کے جمع ہوتے ہی شرح لکھی نام اس کا ''اعلام نهج البلاغه'' ہے۔ یہ شرح اگرچہ مختصر ہے مگر نہایت ہی قلّ ودلّ جامع مانع ہے۔ چنانچہ کشف الحجب میں ہے:

"اَعْلَامُ نَهْجِ الْبَلَاغَةِ" لِلسَّيِّدِ الْعَلَامَةِ عَلِيِّ بْنِ نَاصِرِ الْمُعَاصِرِ لِلسَّيِّدِ رَضِيٍّ مُصَنِّفِ نَهْجِ الْبَلَاغَةِ وَ هُوَ اَقْدَمُ الشُّرُوحِ وَالْحَوَاشِيْ الَّتِي عَلَّقَتْ عَلَيْهِ وَ اَوْثَقُهَا وَ اَتْقَنُهَا وَ اَخْصَرُهَا اَوَّلُهُ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ نَجَانَا مِنْ مَهَاوِي الْغَيِّ وَ ظُلُمَاتِهٖ وَ هَدَانَا سَبِيلَ الْحَقِّ بِاٰيَاتِ اٰيَاتِهٖ... الخ

یہ شرح اگرچہ کم یاب ہے مگر لکھنو میں بعض نسخے اس کے موجود ہیں اور علامہ علی بن ناصر اکابر علمائے شیعہ سے ہیں جن کے اوصاف مستغنی عن الاوصاف ہیں۔

(۲) علامہ قطب الدین راوندی شارح ہیں۔ یہ شرح بھی مختصر ہے اور نام اس کا منہاج البراعہ ہے۔

جناب علامہ علی اظہر اعلی اللہ مقامہ کا نہج البلاغہ کا یہ مقدمہ ۷۷ صفحات پر مشتمل ہے اور اس کا صفحہ نمبر ۷۰ اور ۷۱ بہت کوشش کے باوجود نہیں ملا۔ یہ باقی صفحات رضا لائبریری رام پور انڈیا سے ملے ہیں۔ وہاں بھی یہ دو صفحات نہیں ہیں ۷۰ اور ۷۱ اگر کہیں سے توقع کی جاسکتی ہے تو مرحوم کے بیٹے جناب مولانا سیّد علی حیدر جو لکھنو سے ''الکلام'' نام کا ایک رسالہ نکالتے رہے اور نہج البلاغہ کے ترجمے کو قسطوار اس میں شائع کراتے رہے اس کی ممکن ہے پہلی اور دوسری جلدوں میں یہ خطبہ مکمل مل جائے اگر کسی صاحب کو اس تک رسائی ہو تو ہمیں مطلع فرمائیں ہم شکر گزار ہوں گے۔

تَبَیَّنَ لِیْ اَنَّ الْمَحَاسِنَ کُلُّھَا فُرُوْعٌ وَ اَنَّ الْمَالَ فِیْھَا ھُوَ الْاَصْلُ

اس پر سب نے مخالفت ظاہر کی اور لکھا کہ ایسا نہیں ہے بلکہ اصل شے علم وکمال ہے جس پر انہوں نے ایک استاد کا یہ قطعہ لکھا:

قَدْ قَالَ قَوْمٌ بِغَیْرِ عِلْمٍ مَا الْمَرْءُ اِلَّا بِاَکْبَرِیْہِ

فَقُلْتُ قَوْلَ امْرِئٍ حَکِیْمٍ مَا الْمَرْءُ اِلَّا بِدِرْھَمِیْہِ

مَنْ لَمْ یَکُنْ دِرْھَمٌ لَدَیْہِ لَمْ تَلْتَفِتْ عُرْسُہٗ اِلَیْہِ

اس کے بعد ابن میثم نے وہاں کا سفر اختیار کیا اور فقیرانہ لباس میں وارد مجلس علما وکملا ہوئے۔ کسی نے التفات بھی نہ کیا یہ صف نعال میں بیٹھ گئے اور لوگوں کے مذاکرہ علمیہ میں شریک رہے جس جس مسائل میں وہ لوگ عاجز آتے یہ جواب برجستہ فرماتے مگر بجز اس کے کہ طالب العلم کا ان کو خطاب ملے انہیں اور کسی قسم کی عزت وتوقیر نہ ہوئی یہاں تک کہ ان لوگوں نے کھانا بھی ساتھ ان کو نہ کھلایا بلکہ علیحدہ دے دیا گیا۔

دوسرے روز انہوں نے بھی لباس بدلا اور خوب بڑا عمامہ سر پر رکھا اور لباس پر تکلف زیب تن کیا۔ جب سب نے اس شان سے دیکھا خوب تعظیم کی اور صدر مجلس میں جگہ دی۔ انہوں نے عمداً مہمل تقریریں شروع کیں اور سب اٰمَنَّا وَ صَدَّقْنَا کہتے تھے اور ان کے بزرگداشت میں سرمو فرق نہ ہوتا۔ جب دسترخوان چُنا گیا اور کھانے بیٹھے تو انہوں نے اپنی لانبی لانبی آستینوں کو کھانے میں غوطہ دینا شروع کیا اور کہا: اے آستین کھا تو اس کھانے کو۔ تمام حضار نہایت متعجب ہوئے کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ تب ابن میثم نے جواب دیا کہ کل بھی ہم آئے تھے مگر لباس علما وفقرا میں۔ نہ تم لوگوں نے تعظیم کی نہ احترام کیا۔ حالانکہ کیسے کلمات معرفت اور عالمانہ تقریر بھی تمہارے سامنے کی اور آج جو ہم لباس میں جباروں کے آئے تو تم نے کس قدر تعظیم کی حالانکہ آج کی تقریر ہماری جاہلانہ تھی مگر تم سب نے اسے قبول کیا۔ اب تو معلوم ہوا کہ اصل مال ہے نہ علم ہے۔ کیونکہ جب ہم امیرانہ لباس میں آئے تو تم نے تعظیم کیا اور کل جو فقیرانہ لباس میں تھے کچھ قدر نہ کی۔ اب تو ہمارے اشعار کی بخوبی تصدیق ہوئی۔ سب سرنگوں ہوئے اور اپنے خطا کا اعتراف کیا اور بہت کچھ معذرت کی۔

ہم جہاں تک سمجھتے ہیں حکایت علامہ ابن میثم کی ان طلبا اور فضلا سے متعلق ہے جو ابھی درجہ کمال پر نہ فائز تھے ورنہ اگر علم وکمال کے ذریعہ سے تزکیہ نفس ہوا ہوتا تو یہ حالت نہ پیش آتی۔ وہ لوگ کلام سے متکلم کی قدر ومنزلت پہچانتے ہیں نہ لباس و شان وشوکت سے۔ مگر درحقیقت ایسے نفوس قدسیہ بہت کم ہوتے ہیں زیادہ ظاہر میں ہیں جو ظاہری وجاہت پر جاتے ہیں مگر باطن اگر صاف نہیں ہے یا علم وکمال سے معرّا ہے تو یہ سب ظاہر داری ہَوا ہو جاتی ہے اور صاحب باطن کا اثر غالب آتا جاتا ہے یہاں تک کہ آخر میں وہی مسلم الثبوت ہو جاتا ہے۔

بہر حال ابن میثم علیہ الرحمہ کے مصنفات بہت ہیں تبرّ کاً چند کتابوں کا نام لکھا جاتا ہے، علاوہ شرح نہج البلاغہ کے۔ شرح الاشارات حکمت میں، کتاب القواعد علم کلام میں، **معراج سماوی** علم کلام میں، **بحر الخصم، رسالة فی الوحی والالهام، شرح مائة کلمة امیر المؤمنین**علیہ السلام، **کتاب النجاة فی القیامة فی تحقیق امر الامام، استقصاء النظر فی امامة الائمة الاثنی عشر۔**

بعض لوگوں نے کتاب **الاستغاثه فی بدع الثلثه** بھی انہیں کی طرف منسوب کیا ہے مگر یہ نسبت غلط ہے۔ بلکہ اس کے مصنف کا نام علی بن احمد ابوالقاسم کوفی ہے اور کتاب کا نام **بدع محدثه** ہے جیسا کہ علامہ نجاشی نے بھی لکھا ہے۔ وفات ان کی ۶۷۹ھ میں ہوئی ہے، قریہ دوتیح میں جو بلاد بحرین سے ہے مدفون ہوئے۔

معلوم ہوتا ہے کہ علامہ ابن میثم علیہ الرحمہ اور علامہ ابن ابی الحدید معاصر ہیں جس سے ایک کو دوسرے کی شرح پر اطلاع نہیں ہوئی۔ اسی وجہ سے نہ ابن ابی الحدید نے کچھ ان کے کلام سے تعرض کیا نہ ابن میثم علیہ الرحمہ نے ان کے کلام سے۔ کیونکہ ابن ابی الحدید کی وفات ۶۵۵ھ ہے، لہٰذا ممکن ہے وہ شرح ان کو نہ ملی ہو۔ شرح مذکور حسب مرضی شمس الدین محمد علقی وزیر معتصم باللہ لکھی گئی اس کے بعد خود ابن میثم علیہ الرحمہ نے اس کا خلاصہ لکھا جس کا نام ''**مصباح السالکین**'' رکھا۔

(۵) شیخ جلیل قطب الدین محمد بن الحسین اسکندری رحمہ اللہ کی شرح کا نام ''**اصباح**'' ہے مگر یہ بھی نایاب ہے۔

(۶) شیخ حسین ابن شہاب الدین حیدر علی عاملی کرکی کی شرح بھی مبسوط شرح ہے مگر میری نظر سے نہیں گزری۔ شمار ان کا علمائے اصفہان میں ہے مگر اواخر عمر میں بمقام حیدر آباد دکن تشریف لائے اور وہیں وفات پائی بماہ صفر روز دوشنبہ ۱۰۷۶ھ۔

(۷) شیخ نظام الدین علی بن الحسین نظام الدین جیلانی کی شرح کا نام ''**انوار الفصاحة و اسرار البلاغة**'' ہے اور خطبہ اس کا یہ ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ دَلَّ بِذَاتِهٖ عَلٰی ذَاتِهٖ وَجَلَّ عَنْ مَغَائِرِهٖ صِفَاتُهٗ... الخ

قبل شرح ایک مقدمہ اور چار منہج لکھا۔ مگر اکثر اس کا ماخوذ ہے شرح ابن ابی الحدید اور علامہ قطب الدین کی شرح سے کما فی کشف الحجب۔

(۸) علامہ سید سند مرزا علاء الدین محمد بن ابی تراب الحسینی مشہور بہ فاضل گلستانہ کی شرح نہایت مبسوط ہے نام اس کا حدائق الحقایق ہے ۲۰ جلدوں میں یہ شرح لکھی گئی المتوفّٰی ۱۱۱۰ھ۔

(۹) آقا شیخ محمد رضا کی شرح مسمیٰ بدرہ نجفیہ مطبوعہ ایران فی الحال بہت شائع و ذائع ہے شرح مختصر ہے اور زیادہ تر ابن میثم علیہ الرحمہ سے موخوذ ہے۔

(۱۰) اس کی شرحوں میں ایک روضۃ الابرار بھی ہے۔ فاصل زواری کی فارسی میں۔

(۱۱) علامہ سید ماجد ابن محمد بحرانی، معاصر شیخ بہائی علیہ الرحمہ بھی ایک شارح ہیں۔ یہ استاد ہیں ملا محمد محسن کاشانی صاحب وافی کے، وفات ان کی شیراز میں ہوئی ۱۰۲۸ھ۔

(۱۲) ملا فتح اللہ کاشانی المتوفّٰی ۹۹۷ھ کی شرح جو اصل میں ترجمہ ہے فارسی میں نہایت درجہ مشہور و معروف ہے اور اس ترجمہ میں بھی اس سے بہت کچھ مدد لی گئی ہے۔ نام اس کا ''تنبیہ الغافلین'' ہے۔

ملا فتح اللہ مشاہیر علما سے ہیں جن کی مدح و ثنا میں فریقین کے علماء رطب اللسان ہیں۔ مختصر حالات ان کے منتخب التواریخ ملا عبد القادر بدایونی جلد ۲، صفحہ ۳۱۶، سے نقل کیے جاتے ہیں جو نہایت متعصب علمائے اہل سنت سے ہیں جس سے جلالت قدر علامہ مذکور ظاہر ہو:

> و در ربیع الثانی سال نه صد و نود سیادت پناه میر فتح الله شیرازی که در وادی الهٰیات و ریاضیات و طبیعات و سائر اقسام علوم عقلی و نقلی و طلسمات و نیرنجات و جراثقل نظیر خود در عصر نداشت۔ بر حسب فرمان طلب پیش عادل خان دکهنی بفتح پور رسید و حسب الحکم خانِ خانان و حکیم ابو الفتح به استقبال رفته به ملازمت آوردند و به منصب صدارت که سیاه نویسی بیش نبود امتیاز یافت "تا زمین فقرا ببرد نه آنکه بدهد"، و پرگنهٔ بسیار بی داغ و محلی به جایگیر او مقرر شده، چون شنیده بودند که او شاگرد بی واسطه میر غیاث الدین منصور شیرازی است که به نماز و عبادات دیگر چندانی مقید نبود گمان داشتند که مگر در سخنان مذهب و دین با ایشان مماشات خواهد کرد، او در وادی مذهب خود استقامت تمام ورزیده با کمال حب جاه و دنیا داری و امرا پرستی دقیقه ای از دقائق تعصب در دین فرونگذاشت و در عین دیوان خانهٔ خاص که هیچکس یارای آن نداشت که علانیه ادای صلٰوة کند، نماز بفراغ بال و جمعیت خاطر به مذهب امامیه می گزارد و بر این معنی مطلع شده او را از زمره ارباب تقلید شمرده، از آن وادی اغماض فرمود بجهت رعایت علم و حکمت و تدبیر و مصلحت در تربیت او دقیقه فروگذاشت نه رفت۔

پھر دوسرے مقام جلد ۳، صفحہ ۱۵۵، پر بذیل ذکر علمائے عہد اکبر شاہی لکھتے ہیں:

> میر فتح الله شیرازی از سادات شیراز بود، اعلم علمای زمان ست، مدتها مقتدای حکام و اکابر فارس بود، جمیع علوم عقلی از حکمت و هندسه و هیئت و نجوم و رمل و حساب و

طلسمات و نیرنجات و جراثقل نیکو می دانست، و در این فن آنقدر حالت داشت که اگر پادشاہ متوجہ می شد رصد می توانست بست و در علوم عربیت و حدیث و تفسیر و کلام نیز نسبت او مساوی است و تصانیف خوب دارد.

ان عبارتوں سے جہاں جلالت قدر ملا فتح اللہ شیرازی نمایاں ہے، وہاں اس کی بھی وجہ سمجھ میں آسکتی ہے کہ اس کتاب مستطاب کے انتخاب کی ترجمہ کے لیے کیا وجہ تھی۔ کیونکہ یہ کتاب صرف ہادی طریق عقبیٰ ہی نہیں ہے بلکہ علوم عقلیہ وحکمیہ کے لیے بھی یہ کتاب ایسی لاجواب ہے کہ کوئی کتاب اس کے ہمسر نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمامی یا اکثر علما نے جن کو ان علوم حکمیہ سے خاص تعلق رہا ہے اس کتاب کی شرح وحل پر برابر متوجہ رہے۔ چنانچہ علامہ شیخ بہاء الدین عاملی اور جناب ملا میر باقر داماد علیہ الرحمہ نے بہت سے حواشی اس پر لکھے اور یہ بزرگواران مشاہیر حکمائے اسلام سے ہیں کہ خود فن حکمت کو ان پر ناز ہے۔

بہرحال یہ کتاب ایسی کتاب ہے کہ اسلام جہاں تک اس پر فخر کرے بجا ہے اور یہی وہ کتاب ہے جو اس زمانہ کے نئے نئے علوم طبعیہ وسائنس کے مقابلہ میں پیش کی جاسکتی ہے جس سے مخالفین اسلام کو بھی معلوم ہو کہ جن مسائل کی ایجاد وتحقیق پر وہ لوگ آج نازاں ہیں ایسے مسائل ہیں کہ آج سے تیرہ سو برس پہلے قوتِ الہامیہ اسلام نے ان کو حل کر دیا اور تمام عالم پر اس کی حقیقت کھول دی۔ ان سب کے علاوہ تمدنی مسائل اور جنگ کی کارروائیوں کو اور سیاست مدن کے قواعد کو اور دنیا کے نشیب وفراز اور اسلام کی ابتدا وانتہا وترقی وتنزلی کو اور آئندہ جو لوگ اسلام پر حکمران ہونے والے تھے سب کا ایسا نقشہ کھینچا ہے کہ سرمو تفاوت نہیں۔ اور ایسے دلکش انداز سے اس کی تصویر کھینچی ہے کہ کسی طرح عقل بشری کی سمجھ میں نہیں آسکتا کہ کس خداداد قوت سے یہ سب بیانات ہوئے۔

اب ہم مختصر طور پر کچھ اس ترجمہ کے عنوان کو بیان کرتے ہیں جس کی تمنا ایک مدت سے تھی اور اب خداوند عالم نے اس کا سامان کیا اور اس کے فضل وکرم سے امید ہے کہ ہم اس میں کامیاب ہوں۔

(۱) یہ ترجمہ حامل المتن ہوگا کہ اصل عبارت کتاب مستطاب بجنسہ معہ حل لغات عربیہ اس طرح درج رہے کہ جن لوگوں کو عربی زبان کا مذاق کافی ہے وہ اصل عبارت سے منتفع ہوں اور اس کی فصاحت و بلاغت و جزالت سے متمتع ہوں۔ کیونکہ جو لوگ اصل زبان کے ماہر ہیں یا کچھ بھی مذاق اس کا رکھتے ہیں ہرگز ترجمہ سے وہ خوش نہیں ہو سکتے جب تک اصل عبارت نہ ہو۔ ہاں اگر اس کے ساتھ ترجمہ ہوگا تو جہاں اصل عبارت سے محظوظ ہوں گے ترجمہ کے حسن وقبح کا بھی اندازہ کر سکتے ہیں۔

(۲) ترجمہ اگر لفظی ہو تو مترجم ہر الزام سے بری ہے اور جودت اختیار سے کسی قدر قابل تحسین بھی ہوسکتا ہے۔ مگر مقصود اصلی نہ حاصل ہوگا جو افہام وتفہیم عوام ہے اور اگر اصل مطلب کا اظہار ترجمہ میں کیا جائے تو گو افہام وتفہیم میں بہت

کچھ سہولت ہوگی مگر اصل کلام کی لطافتیں بالکل محو ہو جاتی ہیں بلکہ بعض اوقات ان مطالب جزئیہ پر ایسا رنگ چڑھ جاتا ہے کہ اصل مقولہ لغو معلوم ہوتا ہے یا ایک معمولی جملہ نظر آتا ہے جو بہ اعتبار جلالت قدر متکلم مستبعد معلوم ہوتا ہے، حالانکہ وہ اصل میں حکمت کا ایسا جامع جملہ ہے کہ مشکل سے کوئی اس کا ہمسر نکلے۔ لہذا ہم نے اس ترجمہ میں ایسی راہ اختیار کی ہے جو دونوں طریقوں کے وسط میں واقع ہے۔ لفظی ترجمہ کے ساتھ ادائے مطلب و سہولت افہام وتفہیم کو بھی پورے طور پر ملحوظ رکھا تا کہ فصاحت و بلاغت و جزالت بیان کے ساتھ نفس مطلب بھی بخوبی ذہن نشین ہو اور کلام کی وقعت اور متکلم کی عظمت اور اس کی غرض و غایت بھی دلوں میں جاگزین ہو۔ اسی وجہ سے ہم کو اس ترجمہ میں نہایت دقت اُٹھانی پڑی اور اس میں وہ جان کھپی ہوئی جو کسی بڑی بڑی تصنیف و تالیف میں بھی اس کا مقابلہ نہ کرنا پڑا۔

(۳) اس ترجمہ کے ساتھ ہی ایک شرح بھی لکھنی پڑی جو بطور حاشیہ ہے۔ کیونکہ شرح میں متن کی کل عبارتوں کی تشریح کی جاتی ہے اور یہاں صرف ان مطالب سے بحث کو تعلق ہے جو کسی اہم مسئلۂ حکمت سے متعلق ہے یا سیاستِ تمدن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، یا آئندہ واقعات کی نسبت پیشین گوئی کی گئی ہے، یا اسلام کے ان تفریقی مسائل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جن سے فریقین کی دو مہیب فوجیں تیار ہیں جو باخود باخونریزی میں ہمہ وقت مشغول ہیں اور اسی خونریزی نے اسلام کو یہ روزِ بد دکھایا ہے۔ کیونکہ ان کل طریقوں کی انتہا حضرتؑ ہی تک پہنچتی ہے۔

آپؑ جہاں مرکز دائرہ وجود اسلام ہیں وہاں اختلاف کا بی قاعدہ مثلث مختلف الاضلاع آپؑ ہی سے مخالفت کرنے کی بدولت قائم ہوتا ہے۔ لہذا ابتدائی حصوں میں تو ہم کو شروح وحواشی وتواریخ سے کام لینا پڑا مگر آخری حصہ میں بہت کچھ وسعت نظر کی ضرورت تھی۔ کیونکہ اسی بنیاد پر پہلے حضرتؑ کے کلام ہونے سے انکار کیا گیا پھر اس کے شارح پر اعتزال ورفض کا الزام قائم کیا گیا، پھر تاویل کی گئی اور اس کے معانی بگاڑے گئے۔ اب اگر ہم حضرتؑ ہی کے کلام بلاغت نظام سے استدلال کرتے ہیں تو مصادرہ علی المطلوب ہوتا ہے اور اگر اسی شارح کو سند میں پیش کرتے ہیں تو وہ پہلے ہی سے مجروح کر دیا گیا۔ لہذا ضرورت ہوئی کہ اصل کلام یا اس کی شرح کا اثبات ایسے طریقہ سے کیا جائے جس میں کوئی جادو نہ چل سکے۔ اس لیے ہم کو صحاح ستّہ اور دیگر مسانید وسنن اور سیر وتواریخ کے ہزارہا اوراق الٹنے پڑے اور اصل عبارت ان کتابوں کی معہ ترجمہ لکھنی پڑی تا کہ پھر محل شک وشبہ نہ رہے اور انکار وتاویل کے ابواب مسدود ہوں اور پھر کسی کو ایسی جرأت نہ ہو کہ امر حق سے انکار کرے۔ ﴿وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ اِلَيْهِ اُنِيْبُ﴾۔

(۴) آخر میں ہمارا ارادہ ہے کہ حضرتؑ کے کلاموں کا ایک دوسرا مجموعہ مرتّب کریں جس میں حضرتؑ کے وہ کلمات ہوں گے جو اس کتاب میں نہیں ہیں اور اگر ہیں تو ان کی سندیں یہاں مذکور نہیں۔ اب ہم مع سند باحوالہ کتب جمع کریں

گے تا کہ ہماری نسل آئندہ اس مجموعہ سے مستفید ہو جیسا کہ ہم اس مجموعہ سے مستفید ہو رہے ہیں۔ اگر چہ یہ کام اہم ہے اور اس کے لیے وسعتِ نظر، اطمینان خاطر، اجتماع مواد و اعوان و انصار درکار ہے جو ہمارے لیے حکم عنقار رکھتے ہیں مگر اَلْمَیْسُوْرُ لَا یَسْقُطُ بِالْمَعْسُوْرِ۔

(۵) آخر میں یہ بھی عرض کرنا ضروری ہے کہ اصل کتاب نہج البلاغہ میں جہاں ہر طرح کے محاسن و محامد مجتمع ہیں وہاں ایک نقص بھی ہے کہ تالیف کتاب میں ترتیب کا خیال بہت کم رہا جس کا خیال بھی شاید اس زمانہ میں کم ہوتا تھا۔ یا جیسا کہ سیّد رحمہ اللہ نے خطبہ میں اشارہ کیا ان کو موقع نہ ملا کہ تقدیم و تاخر خطب میں ترتیب زمانہ یا واقعات کا خیال فرماتے اور درحقیقت جو شخص ایسے اہم کام کو انجام دینا چاہتا ہے اس سے ایسے فروگذاشتوں کا ہو جانا کچھ تعجب نہیں، بلکہ نہایت ضروری تھا کہ جہاں تک ہو سکے مختلف دفاتر سے ان جواہر آبدار کا مجموعہ مرتّب کر لیا جائے، ترتیب کا اختیار باقی رہتا ہے۔ اس فروگذاشت سے اگر ہم کو نقصان پہنچتا ہے تو صرف اسی قدر کہ تاریخی حیثیت سے ہم کو ان خطبات سے کم تر مدد ملتی ہے، مگر اصل واقعہ پر کسی طرح خلاف اثر نہیں پڑ سکتا جو نہایت متانت و استقلال سے ثابت ہے۔

اب ہم اصل ترجمہ اور شرح کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

﴿وَ اُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَی اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ بَصِیْرٌ بِالْعِبَادِ﴾۔

وَ ھٰذَا اٰخِرُ مَا اَرَدْنَا اِیْرَادَہٗ فِیْ ھٰذِہِ الْمُقَدِّمَۃِ تَوْضِیْحًا لِمَقَاصِدِ الشَّرْحِ وَالتَّرْجَمَۃِ. وَ اَنَا الْعَبْدُ الْمُفْتَقِرُ اِلٰی رَحْمَۃِ رَبِّہِ الْاَکْبَرِ اَلسَّیِّدُ عَلِیُّ اَظْھَرُ بْنُ الْمَوْلٰی الْمُؤْتَمِنُ اَلسَّیِّدُ حَسَنْ طَابَ ثَرَاہُ وَ حَشَرَنَا مَعَ الْاَئِمَّۃِ الْمَیَامِیْنَ الْغُرَرِ وَ اٰخِرُ دَعْوٰینَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰالَمِیْنَ۔ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِہِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاھِرِیْنَ۔

۲۹ محرم، ۱۳۲۳ھ

دیباچہ[1]

مؤلف نہج البلاغہ علامہ شریف رضی علیہ الرحمہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خدائے رحمٰن ورحیم کے نام سے شروع کرتا ہوں

اَمَّا بَعۡدَ حَمۡدِ اللّٰہِ الَّذِیۡ جَعَلَ الۡحَمۡدَ ثَمَنًا[2] لِّنَعۡمَآئِہٖ، وَ مَعَاذًا مِّنۡ بَلَآئِہٖ، وَ سَبِیۡلًا اِلٰی جِنَانِہٖ، وَ سَبَبًا لِّزِیَادَۃِ اِحۡسَانِہٖ.

جس خدا نے حمد (بجالانے) کو اپنی نعمت کی قیمت اور اپنی بلا سے محفوظ رہنے کی جگہ اور اپنی بہشتوں کا راستہ اور اپنے احسان کی زیادتی کا سبب قرار دیا ہے۔

وَالصَّلٰوۃِ عَلٰی رَسُوۡلِہٖ نَبِیِّ الرَّحۡمَۃِ[3]، وَ اِمَامِ الۡاَئِمَّۃِ[4]،

اس کی حمد بجالانے اور اس کے رسول پر جو نبی رحمت

---

[1] یہ خطبہ دیباچہ کتاب ہے جسے جناب سید رضی علیہ الرحمہ نے مطابق قواعد مقررہ علمائے اسلام ابتدائے کتاب میں لکھا مگر اس میں آپ نے وہ بلاغت صَرف کی ہے کہ آپ ہی کا حصہ ہے کیونکہ حمد خدا کے بعد جو اغراض بتائے ہیں وہ ایسے ہیں کہ بطور استقراء کلیہ قرار پا سکتے ہیں کیونکہ شکرِ منعم واجب عقلی ہے۔ اس لیے ''ثَمَنًا لِّنَعۡمَآئِہٖ'' لائے کیونکہ اس کے سوا بندہ کے اختیار میں کیا ہے کہ اس کی نعمات کا شکریہ ادا کرے۔

[2] اس لفظ ''ثَمَنٌ'' سے جس کے معنی قیمت کے ہیں اس طرف اشارہ ہے کہ حمدِ خدا واجب ہے کیونکہ یہ ظاہر ہے مالِ غیر میں تصرف بلا اجازتِ مالک جائز نہیں جس کی اجازت کی دو ہی صورت ہے یا بہ قیمت یا بہ ہبہ۔ بہ قیمت تصرف بہتر ہے۔ پس اسے نعمات خدا میں بھی تصرف بلا ادائے قیمت جائز نہ ہوگا تو حمد واجب ہوا۔ بلاؤں سے اس کا محافظ ہونا بھی واضح ہے۔ وسیلۂ مغفرت ہونا بھی معلوم ہے جس کا نتیجہ حصولِ جنت ہے اور موجبِ زیادتیِ احسان ہونا تو بنص قرآن ثابت ہے کہ ﴿ لَئِنۡ شَکَرۡتُمۡ لَاَزِیۡدَنَّکُمۡ ﴾ (سورۂ ابراھیم، آیہ ۷)
پس معلوم ہوا کہ حمد وثنا کے فوائد بندوں ہی کی طرف عائد ہیں نہ خدا کی طرف جو مستغنی بالذات ہے۔

[3] یہ اشارہ ہے آیہ کریمہ ﴿ وَ مَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَۃً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ﴾ (سورۂ انبیاء، آیہ ۱۰۷) کی طرف۔

[4] یہ اشارہ ہے طرف افضلیت آنحضرتؐ سائر انبیا پر کیونکہ خدا نے بہ خطاب حضرت ابراہیم علیہ السلام فرمایا ﴿ اِنِّیۡ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ﴾ اور یہ درجہ حضرتؑ کو ابتدا میں ملا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے ﴿ وَ اِذِ ابۡتَلٰۤی اِبۡرٰہٖمَ رَبُّہٗ بِکَلِمٰتٍ فَاَتَمَّہُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیۡ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ﴾ (سورۂ البقرہ، آیہ ۱۲۴) یعنی جب خدا نے ابراہیمؑ کی چند باتوں میں آزمائش کی اور وہ اس میں پورے اترے تو خدا نے یہ درجہ دیا کہ فرمایا ہم تم کو امام بنائیں گے۔ اسی لیے امامت کی شرط صبر قرار پائی ﴿ وَ جَعَلۡنٰہُمۡ اَئِمَّۃً یَّہۡدُوۡنَ بِاَمۡرِنَا لَمَّا صَبَرُوۡا ﴾ (سورۂ سجدہ، آیہ ۲۴) یعنی ہم نے ان سے بعض کو امام بنایا کہ ہدایت کریں ہمارے حکم کی جب انہوں نے صبر کیا۔ اور ظاہر ہے کہ رسول اللہؐ سے زیادہ صابر کوئی نبی نہیں ہوا جن کا مقولہ مشہور ہے ''مَا اُوْذِیَ نَبِیٌّ کَمَا اُوْذِیْتُ''۔ میری ایسی اذیت کسی نبی کو نہیں پہنچی اور خود خدا فرماتا ہے ﴿ فَاصۡبِرۡ کَمَا صَبَرَ اُولُوا الۡعَزۡمِ مِنَ الرُّسُلِ ﴾ (سورۂ الاحقاف، آیہ ۳۵)
ان آیات سے جہاں رسول اللہؐ کا امام الائمہ ہونا ثابت ہوا وہاں ائمہ طاہرینؑ کا امام ہونا بھی جو صبر میں رسول خداؐ کے پیرو تھے اور مصداق ﴿ وَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡہِمۡ فِعۡلَ الۡخَیۡرٰتِ ﴾ (سورۂ الانبیاء، آیہ ۷۳)

وَ سِرَاجِ[1] الْاُمَّةِ، الْمُنْتَخَبِ مِنْ طِيْنَةِ الْكَرَمِ[2]، وَ سُلَالَةِ الْمَجْدِ الْاَقْدَمِ، وَ مَغْرِسِ الْفَخَارِ الْمُعْرِقِ[3]، وَ فَرْعِ الْعَلَآءِ الْمُثْمِرِ الْمُوْرِقِ[4].

اور اماموں کے امام اور امّت کے مشعل (ہدایت)، اصل شرف کے برگزیدہ، سب سے بڑھی ہوئی بزرگی کے جوہر، نسبی فخر ومباہات کے اصل الاصول اور رفعت مرتبہ کی (بلند) باردار شاخ ہیں۔

---

[1] یہ اشارہ ہے ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا ۝ وَّ دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ (بقیہ صفحہ مابعد) وَ سِرَاجًا مُّنِيْرًا﴾ (سورۂ الاحزاب، آیہ ۴۵۔۴۶) کی طرف۔

[2] اس جملہ میں اشارہ ہے طرف مذہب حق کے کیونکہ اہل سنت سے بعض تو اس کے بھی قائل ہیں کہ معاذ اللہ حضرتؐ کی نسب میں کچھ خرابی تھی اور اس کا تو جمہوری عقیدہ کہ حضرتؐ کے آبائے کرام عیاذاً باللہ کافر تھے حالانکہ یہ دونوں عقیدے باطل ہیں اور صحیح یہی ہے جو مذہب شیعہ کا عقیدہ ہے کہ کسی قسم کی دنائت نسبی نے آپؐ میں راہ نہ پائی خواہ بذریعہ کفر ہو خواہ بہ ذریعہ اختلال نسب۔

[3] یہ ایسا بلیغ فقرہ ہے کہ کسی طرح اس کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں ایسی لطافت سے نہیں ہوسکتا۔ ''مَغْرِسٌ'' جائے نصب درخت کو کہتے ہیں جہاں درخت بٹھلایا جاتا ہے محاورہ والا ترجمہ تو یا زمین ہوسکتی ہے یا کھیت مگر اصل مطلب بایں بلاغت کسی جملہ سے نہیں نکل سکتا ہے۔ ''فَخَارٌ'' کے معنی ممدوح ہوتا ہے خصال حمیدہ سے ''اَلْمُعْرِقُ'' عرق سے ماخوذ ہے یعنی وہ رگ وریشہ جو نہایت مضبوط و مستحکم ہو۔ تو لفظی ترجمہ یہ ہوا آپ محل نصب ہیں اس درخت فخر کے جس کی جڑیں بہت بڑی اور مستحکم ہیں مگر مطلب یہ ہے کہ فخر کی کوئی اصل خواہ چھوٹی ہو یا بڑی آپ کی ذات بابرکات سے خارج نہیں۔ دنیا میں کسی قسم کا کسی کو فخر ہو سب کی اصل حضرت ہیں کیونکہ اس کا نشوونما اس کا وجود و بقا آپ ہی کی ذات بابرکات پر منحصر ہے۔

[4] یہ بھی سابق ہی ایسا جملہ ہے کیونکہ پہلے جملہ سے فخر کے تحتانی حصہ کا احاطہ منظور تھا اور اس جملہ سے اس کا بالائی حصہ، کیونکہ فخر وشرف کو درخت سے تشبیہ دیا تو پہلے جملہ سے اس کے کل اصول کو آپ کی ذات میں محصور کیا۔ اور اس جملہ سے اس کے کل فروع کو۔ اس لیے وہاں فخار لائے اور یہاں بمناسبت فرع علا کیونکہ شاخیں ہمیشہ مرتفع اور بلند ہوتی ہیں۔ اور چونکہ عام طور سے اشجار دو قسم کے ہوتے ہیں ایک بے ثمر دوسرا باثمر لہٰذا اس جملہ ''اَلْمُثْمِرِ الْمُوْرِقِ'' سے دونوں قسم کے علوئے مرتبت کو محصور کیا اور اس کی طرف بھی اشارہ کیا کہ یہ آپؐ کا فخر وشرف بے ثمر نہیں ہے بلکہ باثمر ہے جس کو بابرگ ہونا بھی لازم ہے۔ جس سے اشارہ ہے طرف آیہ کریمہ ﴿اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ﴾ اور ﴿اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ﴾ (سورۂ الکوثر، آیہ ۱۔۳) کے کیونکہ کفار آپؐ کو ابتر کہتے تھے کہ آپؐ کے کوئی اولاد ذکور نہ تھی خدا آپؐ کے نسل کی کثرت اور ترقی کو کوثر فرمایا اور آپؐ کے دشمن کو ابتر اسی کو اس جملہ سے ظاہر فرمایا۔ غرض دو جملہ تو حضرتؐ کے ذاتی اوصاف میں ہیں اور چار فقرہ آپؐ کے خاندانی شرف کے بارے میں کہ آپؐ کی ذات قدسی صفات ایسی طینت سے منتخب کی گئی ہے جو ہر طرح کے فضائل ومناقب سے مالا مال تھی۔

وَ عَلٰٓی اَھۡلِ بَیۡتِہٖ مَصَابِیۡحِ[1] الظُّلَمِ، وَ عِصَمِ[2] الۡاُمَمِ، وَ مَنَارِ[3] الدِّیۡنِ الۡوَاضِحَۃِ، وَ مَقَاقِیۡلِ[4] الۡفَضۡلِ الرَّاجِحَۃِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡھِمۡ اَجۡمَعِیۡنَ، صَلَاۃً تَکُوۡنُ اِزۡآءً[5] لِّفَضۡلِھِمۡ، وَ

اور ان کے اہل بیتؑ پر جو تاریکی (ضلالت) کے (روشن) چراغ، (خدا کی) امتوں کے نگہبان، دین کے روشن مینارے، فضل (وشرف) کے گرانبار میزان ہیں۔ خدا ان کُل حضرات پر رحمت نازل کرے۔ ایسی رحمت جو

---

[1] جب آنحضرتؐ سراج الامۃ ہیں تو آپؐ کی اولاد امجاد کا مصباح ظلمت ہونا کیسا واضح ہے کیونکہ خود آنحضرتؐ نے فرمایا ہے خُلِقۡتُ اَنَا وَ عَلِیٌّ مِّنۡ نُوۡرٍ وَاحِدٍ۔

[2] ''عِصَمِ الۡاُمَمِ'' جمع عصمہ جس کے معنی روکنے اور حفاظت کے ہیں اسی وجہ سے وہ حضرات ائمہ معصومین کہے جاتے ہیں اور بہ اتفاق اہل سنت محفوظ۔ اس جملہ میں اشارہ ہے طرف حدیث ثقلین ''اِنِّیۡ تَارِکٌ فِیۡکُمُ الثَّقَلَیۡنِ کِتَابَ اللّٰہِ، وَعِتۡرَتِیۡ اَھۡلَ بَیۡتِیۡ، مَا اِنۡ تَمَسَّکۡتُمۡ بِھِمَا لَنۡ تَضِلُّوۡا بَعۡدِیۡ وَلَنۡ یَّفۡتَرِقَا حَتّٰی یَرِدَا عَلَیَّ الۡحَوۡضَ''۔ کے تو مطلب یہ ہوا کہ یہ حضرات حفاظت کرنے والے ہیں امت کے گمراہی سے۔

[3] اصل میں منارہ جائے نور ہے مگر اس کا استعمال ان نشانوں پر ہوتا ہے جو راہ کے لیے بنائے جاتے ہیں (میل) یا کسی زمین کی حد معین کرنے کے لیے۔

[4] مطلب یہ ہے کہ یہی حضرات فضل وکمال کی وہ میزان ہیں جو ہمیشہ بھاری رہتا ہے۔

[5] اس جملہ کی غرض بھی وہی ہے جو سابقاً مذکور ہوئی کہ شکرِ منعم عقلاً واجب ہے پس چونکہ بعد جناب احدیت یہی حضرات منعم ہیں ظاہراً بھی باطناً بھی اس لیے آپ کا شکریہ بھی واجب ہے انعام ظاہری اس لیے کہ اعظم نعمات معرفت خداوند عالم ہے اور اس کے یہی حضرات واسطہ ہیں اور انعام باطنی اس لیے کہ دلائل عقلی ونقلی سے ثابت ہو چکا ہے یہی حضرات علت غائی تمام مخلوق ہیں تو بہر طور ان کا شکریہ واجب ہے اس لیے خداوند عالم نے فرمایا: ﴿اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَ اَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ﴾ (سورۂ المائدہ، آیہ ۳) کہ ''آج کے دن کامل کر دیا ہم نے تمہارے لیے تمہارے دین کو اور تمام کر دی تم پر اپنی نعمت کو'' یہ گویا اشارہ ہے اس دعا کی طرف جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کی تھی ﴿رَبَّنَا وَ ابۡعَثۡ فِیۡھِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡھُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡھِمۡ اٰیٰتِکَ وَ یُعَلِّمُھُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ وَ یُزَکِّیۡھِمۡ ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ﴾ (سورۂ بقرہ، آیہ ۱۲۹) ''خداوندا ان میں تو ایسا رسول ان میں سے بھیج کہ تیری آیتوں کی تلاوت کرے اور ان کو تعلیم دے علم وحکمت کی اور ان کو پاک کرے کہ تو بڑا غالب اور حکمت والا ہے'' کیونکہ جب آنحضرتؐ نے بروز غدیر جناب امیرؑ کو اپنا جانشین وخلیفہ مقرر کیا تو وہ دعا حضرت ابراہیمؑ پوری ہوگئی کہ تو ایسا رسول ان میں بھیج جو ان کو علم وحکمت سکھاتا رہے اور ان کے دلوں کو پاک کرتا رہے کیونکہ اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں ہوسکتا کہ رسول کا نائب ایسا ہو جو انہی صفات کمالیہ کا جامع ہو۔ اب ممکن تھا کہ یہ شکریہ بھی بہ لفظ حمد وشکر ادا کیا جاتا مگر اس سے ایک طرح کا شبۂ شرک پیدا ہوتا کہ جن الفاظ سے خداوند عالم کا حمد کیا جاتا ہے وہی لفظ حق میں رسول اللہ اور آل رسول کے بھی مستعمل ہوتا لہٰذا طرز ادائے شکریہ بدل دیا گیا کیونکہ (بقیہ صفحہ مابعد)

مُكَافَاةً لِّعَمَلِهِمْ، وَ كِفَآءً لِّطِيْبِ فَرْعِهِمْ وَ اَصْلِهِمْ، مَآ اَنَارَ فَجْرٌ سَاطِعٌ، وَ خَوٰى نَجْمٌ طَالِعٌ.

ان کے فضل کے شایان اور ان کے عمل کا عوض اور ان کے خاندانی و ذاتی پاکیزگی کے مساوی ہو جب تک صبح روشن ہوتی اور ستارے غروب کرتے رہیں۔

فَاِنِّيْ كُنْتُ فِيْ عُنْفُوَانِ السِّنِّ، وَ غَضَاضَةِ الْغُصْنِ، ابْتَدَاْتُ بِتَاْلِيْفِ كِتَابٍ فِيْ خَصَآئِصِ الْاَئِمَّةِ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ: يَشْتَمِلُ عَلٰى مَحَاسِنِ اَخْبَارِهِمْ، وَجَوَاهِرِ كَلَامِهِمْ، حَدَانِيْ عَلَيْهِ غَرَضٌ ذَكَرْتُهٗ فِيْ صَدْرِ الْكِتَابِ، وَ جَعَلْتُهٗ اِمَامَ الْكَلَامِ. وَ فَرَغْتُ مِنَ الْخَصَآئِصِ الَّتِيْ تَخُصُّ اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلِيًّا عَلَيْهِ السَّلَامُ، وَ عَاقَتْ عَنْ اِتْمَامِ بَقِيَّةِ الْكِتَابِ مُحَاجَزَاتُ الزَّمَانِ، وَ مُمَاطَلَاتُ الْاَيَّامِ، وَ كُنْتُ قَدْ بَوَّبْتُ مَا خَرَجَ مِنْ ذٰلِكَ اَبْوَابًا، وَ فَصَّلْتُهٗ فُصُوْلًا، فَجَآءَ فِيْ اٰخِرِهَا فَصْلٌ

صلوٰۃ بھیجنے کے بعد (عرض ہے کہ) میں نے شروع جوانی اور ابتدائے شباب میں ایک کتاب حضرات آئمہ علیہم السلام کے خصوصیات میں تالیف کرنا شروع کی تھی جو مشتمل ہے ان حضرات کے بہترین اخبار اور جواہر کلام پر۔ اس امر پر جس غرض نے مجھے آمادہ کیا تھا اسے میں نے شروع کتاب میں لکھ دیا اور اسی کو مقدمۂ کتاب قرار دیا ہے۔ (اس کتاب کو) خصائص امیر المومنین علی علیہ السلام تک میں لکھ چکا تھا کہ موانع زمان اور عوائق دوران نے بقیہ کتاب کے تمام کرنے سے (مجھے) روک دیا اور جس قدر وہ (کتاب) لکھی جا چکی تھی میں نے اس کے ابواب اور فصلیں مقرر کردی تھیں جن کے آخر میں ایک فصل ایسی تھی جو

(بقیہ صفحہ ماقبل) محاورہ عامہ میں یہ الفاظ مخلوقات کی نسبت بھی مستعمل ہوتے ہیں تا کہ خالق ومخلوق کا فرق بھی ظاہر ہو اور شرک کا شائبہ بھی نہ آنے پائے جو اصل الاصول اسلام ہے۔ دوسرے خداوند عالم تو مستغنی بالذات ہے جو نہ ثنا وصفت کا محتاج ہے نہ کسی عبادت کا۔ بخلاف رسولؐ وآل رسولؐ کے وہ بالذات رحمت خداوند عالم کے محتاج ہیں لہٰذا یہ لفظ لایا گیا جس کے معنی دعا یعنی طلب رحمت کے ہیں جو اوّلاً اسی توحید کا معلم ہے اور ثانیاً ان کے فضل وکمال کا معرّف ہے کہ وہ ذوات مقدسہ اس قابل ہیں کہ ان پر صلوات بھیجی جائے۔ پھر اس میں امتثال حکم بھی ہے کہ فرماتا ہے ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا﴾ (سورۂ الاحزاب، آیہ ۵۶)

''اِزَآءً لِّفَضْلِهِمْ'' کا مقصد انہیں مطالب کی توضیح کرتا ہے کہ جس طرح حمد معاوضہ نعمت خدا ہے اسی طرح صلواۃ وسلام معاوضہ فضل وکمال حضرات ہے اور بدلہ ہے ان کی زحمت شاقہ کا جو ہدایت خلق میں حاصل ہوئیں۔ اس کے بعد جناب سیدؒ نے اغراض ومقاصد اس کتاب کے تصنیف وتالیف کے بیان کیے جو واضح ہیں مگر شعر فرزدق علیہ رحمہ کو عجب موقع سے ذکر کیا ہے کہ کسی طرح اس بلاغت کی توصیف نہیں ہوسکتی کیونکہ اگرچہ بمفاد حدیث ''اَنَا وَ عَلِيٌّ اَبَوَا هٰذِهِ الْاُمَّةِ'' ہر مومن خالص اس شعر کو پڑھ سکتا ہے اور وہ اپنے دعوے میں صادق ہوگا۔ مگر حق یہ ہے کہ پورا حق جناب سید ہی کو تھا کیونکہ نسب ظاہری وباطنی دونوں میں ان کو اتصال ہے۔ پھر ان سے بڑھ کر کون مستحق ہوسکتا ہے جو یہ شعر پڑھے:

اُولٰٓئِكَ اٰبَآئِيْ فَجِئْنِيْ بِمِثْلِهِمْ　　اِذَا جَمَعَتْنَا يَا جَرِيْرُ الْمَجَامِعُ

يَتَضَمَّنُ مَحَاسِنَ مَا نُقِلَ عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ مِنَ الْكَلَامِ الْقَصِيْرِ فِي الْمَوَاعِظِ وَ الْحِكَمِ وَالْاَمْثَالِ وَالْاٰدَابِ، دُوْنَ الْخُطَبِ الطَّوِيْلَةِ، وَالْكُتُبِ الْمَبْسُوْطَةِ.

فَاسْتَحْسَنَ جَمَاعَةٌ مِّنَ الْاَصْدِقَآءِ وَ الْاِخْوَانِ مَا اشْتَمَلَ عَلَيْهِ الْفَضْلُ الْمُقَدَّمُ ذِكْرُهٗ، مُعْجَبِيْنَ بِبَدَآئِعِهٖ، وَ مُتَعَجِّبِيْنَ مِنْ نَّوَاصِعِهٖ، وَ سَئَلُوْنِيْ عِنْدَ ذٰلِكَ اَنْ اَبْدَاَ بِتَاْلِيْفِ كِتَابٍ يَّحْتَوِيْ عَلٰى مُخْتَارِ [1] كَلَامِ مَوْلَانَا اَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِيْ جَمِيْعِ فُنُوْنِهٖ، وَ مُتَشَعِّبَاتِ غُصُوْنِهٖ مِنْ خُطَبٍ، وَ كُتُبٍ، وَ مَوَاعِظَ وَ اٰدَابٍ. عِلْمًا اَنَّ ذٰلِكَ يَتَضَمَّنُ مِنْ عَجَآئِبِ الْبَلَاغَةِ، وَ غَرَآئِبِ الْفَصَاحَةِ، وَ جَوَاهِرِ الْعَرَبِيَّةِ، وَ ثَوَاقِبِ الْكَلِمِ الدِّيْنِيَّةِ وَ الدُّنْيَوِيَّةِ، مَا لَا يُوْجَدُ مُجْتَمِعًا فِيْ كَلَامٍ، وَ لَا مَجْمُوْعَ الْاَطْرَافِ فِيْ كِتَابٍ، اِذْ كَانَ اَمِيْرُالْمُؤْمِنِيْنَ عَلَيْهِ السَّلَامُ مَشْرَعَ الْفَصَاحَةِ وَ مَوْرِدَهَا، وَ مَنْشَاَ الْبَلَاغَةِ وَ مَوْلِدَهَا، وَمِنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ ظَهَرَ مَكْنُوْنُهَا، وَعَنْهُ اُخِذَتْ

جناب (امیر) علیہ السلام کے نہایت اعلیٰ احادیث پر مشتمل تھی جن میں حضرتؑ کے چھوٹے چھوٹے فقرے حکمت اور مثال اور ادب کے مضامین میں منقول ہیں نہ وہ خطبے جو طولانی ہیں یا وہ خطوط جو مبسوط ہیں۔

پس جس فصل کا پہلے ذکر ہوا اس کے لطفِ کلام سے خوش اور اس کی خالص ترکیب سے متحیّر ہو کر (میرے) بہت سے احباب واخوان نے اس کو نہایت پسند کیا اور اسی پر مجھ سے درخواست کی کہ میں ایک ایسی کتاب تالیف کرنا شروع کروں کہ ہر فن اور ہر شاخ کے متعلق حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے خطبہ اور فرمان اور مواعظ اور آداب کے جو چیدہ کلام ہیں ان سب پر حاوی ہو، کیونکہ وہ جانتے تھے یہ (کتاب) بلاغت کے عجیب مضامین، فصاحت کے نادر مسائل، فن عربیہ کے جواہر اور دین و دنیا کے ان باریک نکتے اور کلمات پر مشتمل ہوگی جو یک جائی کسی کلام میں اور مجموعی حیثیت سے کسی کتاب میں نہیں مل سکتے، کیونکہ امیر المومنین علیہ السلام ہی علمِ فصاحت کے شروع ہونے کی بلکہ فن بلاغت کے پیدا ہونے اور نشوونما کرنے کی جگہ ہیں اور آپؑ ہی سے ان علوم کے اسرار ظاہر ہوئے اور آپؑ ہی سے ان کے قواعد حاصل کیے گئے اور آپؑ ہی کی روش پر ہر مقرّر اور خطیب چلا اور آپؑ ہی کے کلام سے ہر واعظِ بلیغ نے مدد لی۔

---

[1] اس سے امر کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ میں نے جس قدر خطبہ اور خطوط وغیرہ اس نہج البلاغہ میں جمع کیے ہیں یہ سب حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے کل کلام کے مقابلہ میں صرف ایک جزو کی نسبت رکھتے ہیں کیونکہ حضرتؑ کے بکثرت کلام ایسے ہیں جو متعدد کتابوں میں موجود ہیں اور ایک جگہ مدوّن نہیں ہوئے۔ علامہ ابن میثم علیہ الرحمہ اپنی شرح میں بصفحہ ۴۰ فرماتے ہیں کہ علامہ قطب الدین راوندی علیہ الرحمہ فرماتے تھے کہ میں نے حجاز کے بعض علماء کو فرماتے سنا کہ کہتے تھے میں نے مصر میں جناب امیرؑ کے کلام کا ایک ایسا مجموعہ دیکھا ہے جو بیس سے زیادہ جلدوں میں ہے۔

قَوَانِيْنُهَا، وَ عَلٰٓى اَمْثِلَتِهٖ حَذَا كُلُّ قَآئِلٍ خَطِيْبٍ، وَ بِكَلَامِهٖ اسْتَعَانَ كُلُّ وَاعِظٍ بَلِيْغٍ.

اور باوجود ان امور کے حضرتؑ سب کے آگے اور لوگ پیچھے رہے اور حضرتؑ ہی افضل اور دوسرے لوگ مفضول [1]

---

[1] یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرتؑ کے جمیع فضائل کے متعلق عموماً اور علوم کے متعلق خصوصاً جو تقریر علامہ اہل سنت ابن ابی الحدید معتزلی نے اپنی شرح نہج البلاغہ میں لکھی ہے اس کا ذکر کیا جائے لکھتے ہیں (دیکھو شرح مذکور مطبوعہ مصر جلد اول ص ۵ تا ۷)

فَاَمَّا فَضَائِلُهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَاِنَّهَا قَدْ بَلَغَتْ مِنَ الْعِظَمِ وَ الْجَلَالَةِ وَ الْاِنْتِشَارِ وَ الْاِشْتِهَارِ مَبْلَغًا يُسْمَجُ مَعَهُ التَّعَرُّضُ لِذِكْرِهَا وَ التَّصَدِّيْ لِتَفْصِيْلِهَا.

یعنی امیر المومنینؑ کے فضائل تو عظمت و جلال، شہرت و اشتہار میں اس حد تک پہنچ گئے ہیں کہ اس حد تک ان کا ذکر کرنا گویا دشوار اور ان کی تفصیل کے درپے ہونا امر صعب ہے۔

وَ مَا اَقُوْلُ فِيْ رَجُلٍ اَقَرَّ لَهٗ اَعْدَاؤُهٗ وَ خُصُوْمُهٗ بِالْفَضْلِ، وَ لَمْ يُمْكِنْهُمْ جَحْدُ مَنَاقِبِهٖ وَ لَا كِتْمَانُ فَضَائِلِهٖ، فَقَدْ عُلِمَتْ اَنَّهٗ اسْتَوْلٰى بَنُوْ اُمَيَّةَ عَلٰى سُلْطَانِ الْاِسْلَامِ فِيْ شَرْقِ الْاَرْضِ وَ غَرْبِهَا، وَ اجْتَهَدُوْا بِكُلِّ حِيْلَةٍ فِيْ اِطْفَاءِ نُوْرِهٖ، وَ التَّحْرِيْضِ عَلَيْهِ، وَ وَضْعِ الْمَعَايِبِ وَ الْمَثَالِبِ لَهٗ، وَ لَعَنُوْهُ عَلٰى جَمِيْعِ الْمَنَابِرِ، وَ تَوَعَّدُوْا مَادِحِيْهِ، بَلْ حَبَسُوْهُمْ وَ قَتَلُوْهُمْ، وَ مَنَعُوْا مِنْ رِّوَايَةِ حَدِيْثٍ يَتَضَمَّنُ لَهٗ فَضِيلَةً، اَوْ يَرْفَعُ لَهٗ ذِكْرًا، حَتّٰى حَظَرُوْا اَنْ يُسَمّٰى اَحَدٌ بِاسْمِهٖ، فَمَا زَادَهٗ ذٰلِكَ اِلَّا رِفْعَةً وَ سُمُوًّا وَ كَانَ كَالْمِسْكِ كُلَّمَا سُتِرَ اِنْتَشَرَ عَرْفُهٗ، وَ كُلَّمَا كُتِمَ تَضَوَّعَ نَشْرُهٗ، وَ كَالشَّمْسِ لَا تُسْتَرُ بِالرَّاحِ، وَ كَضَوْءِ النَّهَارِ اِنْ حُجِبَتْ عَنْهُ عَيْنٌ وَاحِدَةٌ، اَدْرَكَتْهُ عُيُوْنٌ كَثِيْرَةٌ.

اور میں اس بزرگ کے متعلق کیا رائے ظاہر کر سکتا ہوں۔ جس کے مخالفوں اور دشمنوں نے بھی اس کے فضائل کا اقرار کر لیا اور جس کے اعدا تک کو اس کے مناقب سے انکار کرنا یا ان فضائل کا پوشیدہ کرنا ممکن نہ ہو سکا۔ دنیا جانتی ہے کہ بنو امیہ مشرق سے مغرب تک سلطنت اسلام پر قابض ہو چکے تھے اور اس سبب سے حضرت علی علیہ السلام کے انوار ہدایت کے گل کر دینے کے لیے اور آپؑ کے حالات اصلیہ پر پردہ ڈال دینے میں اپنی تمام ممکن تدبیریں اور کوششیں صرف کر دی تھیں۔ آپؑ کے عیوب اور فضائح میں بکثرت حدیثیں خاص اہتمام سے وضع کرائی تھیں۔ منبروں پر آپؑ کو سبّ و شتم کرتے رہے۔ آپؑ کے مداحوں کو دھمکی دی۔ قید کیا، قتل کیا۔ آپؑ کی فضیلت میں ایک حدیث تک بیان کرنے کی سخت ممانعت کرا دی۔ یہاں تک کہ آپؑ کا نام تک رکھنا جرم عظیم قرار دے دیا گیا۔ لیکن ان کل کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپؑ کی جلالت مرتبہ اور عظمت منزلت بڑھتی ہی گئی جو مشک کی حالت ہے کہ اس کو جتنا چھپاؤ اتنا ہی اس کی خوشبو پھیل جائے گی یا جو آفتاب کی حالت ہے کہ ہتھیلی کی آڑ سے وہ چھپ نہیں سکتا یا جو دھوپ کی حالت ہے کہ اگر ایک آنکھ اس سے بند کر لی جائے تو بہت سے آنکھیں دیکھتی رہیں گی۔

وَ مَا اَقُوْلُ فِیْ رَجُلٍ تُعْزٰی اِلَیْهِ کُلُّ فَضِیْلَةٍ، وَ تَنْتَهِیْ اِلَیْهِ کُلُّ فِرْقَةٍ، وَ تَتَجَاذَبُهُ کُلُّ طَائِفَةٍ۔ فَهُوَ رَئِیْسُ الْفَضَائِلِ وَ یَنْبُوْعُهَا، وَ اَبُوْ عُذْرِهَا، وَ سَابِقُ مِضْمَارِهَا، وَ مُجَلِّیْ حَلْبَتِهَا، کُلُّ مَنْ بَزَغَ فِیْهَا بَعْدَهٗ فَمِنْهُ اَخَذَ، وَ لَهٗ اِقْتَفٰی، وَ عَلٰی مِثَالِهٖ احْتَذٰی.

اور میں اس شخص کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں جس کی طرف ہر فضیلت منسوب اور جس کی جانب ہر فرقہ (اپنے علوم وکمالات میں) منتہی ہوتا ہے اور جس کی پیروی کا دعویٰ ہر گروہِ اسلام کرتا ہے۔ پس وہی بزرگوار فضائل ومناقب کے سردار، سرچشمہ، مالک مختار اور اس میدان کے شہسوار ہیں۔ ہر صاحب فضیلت آپؑ کا ہی شاگرد اور ہر صاحب کمال آپؑ ہی کا پیرو ہے۔

وَ قَدْ عَرَفْتَ اَنَّ اَشْرَفَ الْعُلُوْمِ هُوَ الْعِلْمُ الْاِلٰهِیُّ، لِاَنَّ شَرَفَ الْعِلْمِ بِشَرَفِ الْمَعْلُوْمِ، وَ مَعْلُوْمُهٗ اَشْرَفُ الْمَوْجُوْدَاتِ، فَکَانَ هُوَ اَشْرَفَ الْعُلُوْمِ۔ وَ مِنْ کَلَامِهٖ اُقْتُبِسَ، وَ عَنْهُ نُقِلَ، وَ اِلَیْهِ اِنْتَهٰی، وَ مِنْهُ ابْتَدَاَ، فَاِنَّ الْمُعْتَزِلَةَ الَّذِیْنَ هُمْ اَهْلُ التَّوْحِیْدِ وَ الْعَدْلِ، وَ اَرْبَابُ النَّظَرِ، وَ مِنْهُمْ تَعَلَّمَ النَّاسُ هٰذَا الْفَنَّ تَلَامِذَتُهٗ وَ اَصْحَابُهٗ ،لِاَنَّ کَبِیْرَهُمْ وَاصِلُ بْنُ عَطَاءٍ تِلْمِیْذُ اَبِیْ هَاشِمٍ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ الْحَنَفِیَّةِ، وَ اَبُوْ هَاشِمٍ تِلْمِیْذُ اَبِیْهِ، وَ اَبُوْهُ تِلْمِیْذُهٗ (عَلَیْهِ السَّلَامُ) وَ اَمَّا الْاَشْعَرِیَّةُ فَاِنَّهُمْ یَنْتَمُوْنَ اِلٰی اَبِی الْحَسَنِ عَلِیِّ بْنِ اِسْمَاعِیْلَ بْنِ اَبِیْ بِشْرٍ الْاَشْعَرِیِّ، وَ هُوَ تِلْمِیْذُ اَبِیْ عَلِیٍّ الْجُبَّائِیُّ وَ اَبُوْ عَلِیٍّ اَحَدُ مَشَایِخِ الْمُعْتَزِلَةِ، فَالْاَشْعَرِیَّةُ یَنْتَهُوْنَ بِاٰخِرَةٍ اِلٰی اَسْتَاذِ الْمُعْتَزِلَةِ وَ مُعَلِّمِهِمْ، وَ هُوَ عَلِیُّ بْنُ اَبِیْ طَالِبٍ عَلَیْهِ السَّلَامُ. وَ اَمَّا الْاِمَامِیَّةُ وَ الزَّیْدِیَّةُ فَانْتِمَاؤُهُمْ اِلَیْهِ ظَاهِرٌ.

تمام علوم کا اشرف واعلیٰ علمِ الٰہی ہے جو حضرتؑ ہی کے کلام سے اقتباس کیا گیا، آپؑ ہی سے منقول اور آپؑ ہی کی طرف منتہی ہوتا ہے، اس لیے کہ فرقۂ معتزلہ جو اہل توحید وعدل اور اہل بصیرت وعقل ہیں اور جن سے لوگوں نے اس علم (الٰہیات) کو حاصل کیا ہے آپؑ کے شاگرد خاص اور اصحاب مخصوصین سے ہیں۔ کیونکہ اس فرقہ کا سردار واصل بن عطا شاگرد تھا ابو ہاشم عبداللہ بن محمد بن الحنفیہ کا، جو شاگرد تھے محمد بن حنفیہ کے اور آپ شاگرد تھے اپنے پدر بزرگوار جناب امیرؑ کے۔ اسی طرح فرقۂ اشاعرہ منسوب ہے ابوالحسن اشعری شاگرد ابوعلی جبائی کی طرف جو مشائخ معتزلہ سے تھا۔ لہٰذا اشعریہ بھی اپنے آخری استاد تک پہنچ کر حضرت علی علیہ السلام کے شاگرد ہوئے۔ اور فرقہ امامیہ زیدیہ کا شیعہ علیؑ ہونا تو ظاہر ہے۔

وَ مِنَ الْعُلُوْمِ عِلْمُ الْفِقْهِ، وَ هُوَ عَلَیْهِ السَّلَامُ اَصْلُهٗ وَ اَسَاسُهٗ، وَ کُلُّ فَقِیْهٍ فِی الْاِسْلَامِ فَهُوَ عِیَالٌ عَلَیْهِ، وَ مُسْتَفِیْدٌ مِنْ فِقْهِهٖ۔ اَمَّا اَصْحَابُ اَبِیْ حَنِیْفَةَ کَاَبِیْ یُوْسُفَ وَ مُحَمَّدٍ وَ غَیْرِهِمَا فَاَخَذُوْا عَنْ اَبِیْ حَنِیْفَةَ، و اَمَّا الشَّافِعِیُّ فَقَرَءَ عَلٰی مُحَمَّدِ بْنِ الْحَسَنِ، فَیَرْجِعُ فِقْهُهٗ اَیْضًا اِلٰی اَبِیْ حَنِیْفَةَ، و اَمَّا اَحْمَدُ بْنُ حَنْبَلٍ فَقَرَاَ عَلَی الشَّافِعِیِّ، فَیَرْجِعُ فِقْهُهٗ اَیْضًا اِلٰی اَبِیْ حَنِیْفَةَ، وَ اَبُوْ حَنِیْفَةَ قَرَاَ عَلٰی جَعْفَرِ بْنِ مُحَمَّدٍ عَلَیْهِ السَّلَامُ وَ

قَرَاَ جَعْفَرٌ عَلٰی اَبِیْهِ عَلَیْهِ السَّلَامُ وَ یَنْتَهِی الْاَمْرُ اِلٰی عَلِیٍّ عَلَیْهِ السَّلَامُ وَ اَمَّا مَالِكُ بْنُ اَنَسٍ فَقَرَاَ عَلٰی رَبِیْعَةِ الرَّایِ، وَ قَرَاَ رَبِیْعَةُ عَلٰی عِكْرَمَةَ وَ قَرَاَ عِكْرَمَةُ عَلٰی عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ، وَ قَرَءَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ عَلٰی عَلِیِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ، وَ اِنْ شَاءَتْ فَرَدَّدْتَ اِلَیْهِ فِقْهَ الشَّافِعِیِّ بِقَرَاءَتِهٖ عَلٰی مَالِكٍ كَانَ لَكَ ذٰلِكَ، فَهٰؤُلَاءِ الْفُقَهَاءُ الْاَرْبَعَةُ.

دوسرا ضروری اسلامی علم فقہ ہے جس کے حضرت علی علیہ السلام ہی اصل اور بانی ہیں۔ اس میں بھی اسلام کا ہر فقیہ آپؑ ہی کا شاگرد ہے۔ اس طرح کہ فرقہ حنفیہ کے امام ابو یوسف اور محمد وغیرہ نے تو ابوحنیفہ سے علم حاصل کیا۔ شافعی خود محمد بن الحسن کے شاگرد تھے پس ان کی فقہ بھی ابوحنیفہ کی طرف راجع ہوئی۔ احمد بن حنبل شاگرد تھے شافعی کے پس وہ بھی ابو حنیفہ کے شاگرد ہوئے۔ اور ان تینوں فرقوں کے استاد امام ابوحنیفہ صاحب امام جعفر صادق علیہ السلام کے شاگرد تھے جنہوں نے اپنے جد امجد حضرت علی علیہ السلام سے علوم حاصل کیے تھے۔ رہے امام مالک بن انس تو وہ شاگرد تھے ربیعۃ الرائ شاگرد عکرمہ شاگرد عبداللہ بن عباس کے اور ابن عباس نے کل علوم حضرت علی علیہ السلام سے حاصل کیے تھے اس طرح اسلام کے یہ چاروں امام حضرت علی علیہ السلام کے شاگرد ثابت ہوئے۔

وَ اَمَّا فِقْهُ الشِّیْعَةِ فَرُجُوْعُهٗ اِلَیْهِ ظَاهِرٌ۔ وَ اَیْضًا فَاِنَّ فُقَهَاءَ الصَّحَابَةِ كَانُوْا: عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ وَ عَبْدَ اللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ، وَ كِلَاهُمَا اَخَذَا عَنْ عَلِیٍّ عَلَیْهِ السَّلَامُ اَمَّا ابْنُ عَبَّاسٍ فَظَاهِرٌ، وَ اَمَّا عُمَرُ فَقَدْ عَرَفَ كُلُّ اَحَدٍ رُجُوْعَهٗ اِلَیْهِ فِیْ كَثِیْرٍ مِّنَ الْمَسَائِلِ الَّتِیْ اُشْكِلَتْ عَلَیْهِ وَ عَلٰی غَیْرِهٖ مِنَ الصَّحَابَةِ، وَ قَوْلَهٗ غَیْرُ مَرَّةٍ لَوْ لَا عَلِیٌّ لَهَلَكَ عُمَرُ، وَ قَوْلَهٗ لَا بَقِیْتُ لِمُعْضَلَةٍ لَیْسَ لَهَا اَبُو الْحَسَنِ، وَ قَوْلَهٗ لَا یُفْتِیْنَ اَحَدٌ فِی الْمَسْجِدِ وَ عَلِیٌّ حَاضِرٌ.

رہی شیعہ کی فقہ آپؑ کا اس کا مرجع ہونا واضح ہے، رہے صحابہ تو ان میں حضرت عمر بن الخطاب اور عبداللہ بن عباس خاص طور پر فقیہ مشہور ہیں اور یہ دونوں شاگرد تھے حضرت علی علیہ السلام کے۔ ابن عباس کی شاگردی تو ظاہر ہے اور بیان بھی ہوئی، رہے حضرت عمر تو ان کا بہت کثرت سے مسائل کا حضرت علی علیہ السلام سے دریافت کر کے سیکھنا مشہور و معروف ہے، اور ان کا بار بار ''لَوْلَا عَلِیٌّ لَهَلَكَ عُمَرُ'' (علیؑ نہ ہوتے تو عمر تباہ ہو جاتا) اور ''لَا بَقِیْتُ لِمُعْضِلَةٍ لَیْسَ لَهَا اَبُو الْحَسَنِ'' (علیؑ نہ ہوں تو بارالہا کسی مشکل کے لیے میں زندہ نہ رہوں) اور ''لَا یُفْتِیْنَ اَحَدٌ فِی الْمَسْجِدِ وَعَلِیٌّ حَاضِرٌ'' (خبردار علیؑ کے مسجد میں موجود رہتے کوئی شخص فتویٰ نہ دے) کہنا آج بچہ بچہ جانتا ہے۔

فَقَدْ عُرِفَ بِهٰذَا الْوَجْهِ اَیْضًا اِنْتِهَاءُ الْفِقْهِ اِلَیْهِ. وَ قَدْ رَوَتِ الْعَامَّةُ وَ الْخَاصَّةُ قَوْلَهٗ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اَقْضَاكُمْ عَلِیٌّ. وَ الْقَضَاءُ هُوَ الْفِقْهُ فَهُوَ اِذًا اَفْقَهُهُمْ، و رَوَی الْكُلُّ اَیْضًا اَنَّهٗ عَلَیْهِ السَّلَامُ قَالَ لَهٗ و قَدْ بَعَثَهٗ اِلَی الْیَمَنِ قَاضِیًا ''اَللّٰهُمَّ اهْدِ قَلْبَهٗ وَ ثَبِّتْ لِسَانَهٗ'' قَالَ: فَمَا شَكَكْتُ بَعْدَهَا فِیْ قَضَاءٍ بَیْنَ اثْنَیْنِ۔ وَ هُوَ عَلَیْهِ

السَّلَامُ اَلَّذِیْ اَفْتٰی فِی الْمَرْاَۃِ الَّتِیْ وُضِعَتْ لِسِتَّۃِ اَشْھُرٍ، وَ ھُوَ الَّذِیْ اَفْتٰی فِی الْحَامِلِ الزَّانِیَۃِ، وَ ھُوَ الَّذِیْ قَالَ فِی الْمِنْبَرِیَّۃِ صَارَ ثَمَنُھَا تِسْعًا۔ وَ ھٰذِہِ الْمَسْاَلَۃُ لَوْ فَکَّرَ الْفَرَضِیُّ فِیْھَا فِکْرًا طَوِیْلًا لَاسْتُحْسِنَ مِنْہُ بَعْدَ طُوْلِ النَّظَرِ ھٰذَا الْجَوَابِ، فَمَا ظَنُّکَ بِمَنْ قَالَہٗ بَدِیْھَۃً وَ اقْتَضَبَہٗ اِرْتِجَالًا!.

اس طرح علم فقہ کا آپؑ تک منتہی ہونا ظاہر و باہر ہے۔ اور خاصہ وعامہ نے روایت کی ہے کہ حضرت رسول خداصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''اَقْضَاکُمْ عَلِیٌّ''، کہ ''تم سب سے زیادہ فقہ جاننے والے علیؑ ہیں'' کیونکہ علم قضاء فقہ ہی کو کہتے ہیں۔ اور سب نے یہ بھی روایت کی ہے کہ آنحضرتؐ نے آپؑ کو یمن بھیجتے وقت فرمایا تھا۔ ''اَللّٰھُمَّ اھْدِ قَلْبَہٗ وَ ثَبِّتْ لِسَانَہٗ''۔ ''بارالہا تو علیؑ کے دل کو ہدایت اور زبان کو ثبات پر قائم رکھ''۔ آپؑ ہی نے اس لڑکے کے بارے میں جو چھ ماہ میں پیدا ہوا تھا فتویٰ دیا تھا کہ یہ ولد الزنا نہیں ہے۔ آپؑ ہی نے حاملہ زانیہ کے بارے میں فتویٰ دیا تھا اور آپؑ ہی نے منبر پر ایک ایسا مسئلہ بیان کیا تھا کہ اگر بڑا ریاضی داں بھی نہایت غور وفکر کے بعد وہ جواب دے تو نہایت تعجب ہو حالانکہ آپؑ نے فی البدیہ کہا تھا۔

وَ مِنَ الْعُلُوْمِ عِلْمُ تَفْسِیْرِ الْقُرْاٰنِ، وَ عَنْہُ اُخِذَ وَ مِنْہُ فُرِّعَ۔ وَ اِذَا رَجَعْتَ اِلٰی کُتُبِ التَّفْسِیْرِ عَلِمْتَ صِحَّۃَ ذٰلِکَ۔ لِاَنَّ اَکْثَرَہٗ عَنْہُ وَ عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَبَّاسٍ، وَ قَدْ عَلِمَ النَّاسُ حَالَ اِبْنِ عَبَّاسٍ فِیْ مُلَازَمَتِہٖ لَہٗ، وَ اِنْقِطَاعِہٖ اِلَیْہِ وَ اَنَّہٗ تِلْمِیْذُہٗ وَ خَرِیْجُہٗ، وَ قِیْلَ لَہٗ اَیْنَ عِلْمُکَ مِنْ عِلْمِ اِبْنِ عَمِّکَ؟ فَقَالَ: کَنِسْبَۃِ قَطْرَۃٍ مِّنَ الْمَطَرِ اِلَی الْبَحْرِ الْمُحِیْطِ۔

اور علوم سے علم تفسیر قرآن ہے کہ آپؑ ہی اس کے اصل اور ماخذ ہیں۔ کیونکہ تفسیر اکثر آپؑ سے یا آپؑ کے شاگرد عبداللہ بن عباس ہی سے مروی ہے، جن سے سوال ہوا کہ تمہارے علم کو علی علیہ السلام کے علم سے کیا نسبت ہے؟ تو کہا جو ایک قطرۂ باراں کو دریائے ذخار سے ہوتی ہے۔

وَ مِنَ الْعُلُوْمِ عِلْمُ الطَّرِیْقَۃِ وَ الْحَقِیْقَۃِ وَ اَحْوَالُ التَّصَوُّفِ، وَ قَدْ عَرَفْتَ اَنَّ اَرْبَابَ ھٰذَا الْفَنِّ فِیْ جَمِیْعِ بِلَادِ الْاِسْلَامِ اِلَیْہِ یَنْتَھُوْنَ، وَ عِنْدَہٗ یَقِفُوْنَ، وَ قَدْ صَرَّحَ بِذٰلِکَ الشِّبْلِیُّ، وَ الْجُنَیْدُ، وَ سَرِیٌّ، وَ اَبُوْ یَزِیْدِ الْبِسْطَامِیِّ، وَ اَبُوْ مَحْفُوْظٍ مَعْرُوْفِ الْکَرْخِیِّ وَ غَیْرُھُمْ۔ وَ یَکْفِیْکَ دَلَالَۃً عَلٰی ذٰلِکَ الْخِرْقَۃِ الَّتِیْ ھِیَ شِعَارُھُمْ اِلَی الْیَوْمِ، وَ کَوْنُھُمْ یُسْنِدُوْنَھَا بِاِسْنَادٍ مُتَّصِلٍ اِلَیْہِ عَلَیْہِ السَّلَامُ.

اور نیز علوم سے علم طریقت وحقیقت واحوال تصوف ہے اور واضح ہے کہ فرقہ صوفیہ دنیا بھر میں آپ ہی کی طرف منسوب ہے۔ چنانچہ شبلی، جنید، سری، ابو یزید بسطامی، ابومحفوظ معروف الکرخی وغیرہ نے اس کی تصریح کر دی ہے اور واضح دلیل اس کی یہ ہے کہ وہ خرقہ جو آج تک صوفیوں کا مذہبی شعار ہے اس کو صوفی حضرات باسناد متصل آپؑ ہی تک پہنچاتے ہیں۔

وَ مَعَ ذٰلِكَ فَقَدْ سَبَقَ وَ قَصَّرُوْا، وَ تَقَدَّمَ وَ تَاَخَّرُوْا، لِاَنَّ كَلَامَهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ الْكَلَامُ الَّذِیْ عَلَيْهِ مَسْحَةٌ مِّنَ الْعِلْمِ الْاِلٰهِیِّ، وَ فِيْهِ عَبْقَةٌ مِّنَ الْكَلَامِ النَّبَوِیِّ. فَاَجَبْتُهُمْ اِلَى الْاِبْتِدَآءِ بِذٰلِكَ، عَالِمًا بِمَا فِيْهِ مِنْ عَظِيْمِ النَّفْعِ، وَ مَنْشُوْرِ الذِّكْرِ، وَ مَذْخُوْرِ الْاَجْرِ۔

وَ اعْتَمَدْتُّ بِهٖۤ اَنْ اُبَيِّنَ مِنْ عَظِيْمِ قَدْرِ اَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِیْ هٰذِهِ الْفَضِيْلَةِ، مُضَافَةً اِلَى الْمَحَاسِنِ الدَّثِرَةِ، وَ الْفَضَآئِلِ الْجَمَّةِ، وَ اَنَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ انْفَرَدَ بِبُلُوْغِ غَايَتِهَا عَنْ جَمِيْعِ السَّلَفِ الْاَوَّلِيْنَ الَّذِيْنَ اِنَّمَا يُؤْثَرُ عَنْهُمْ مِنْهَا الْقَلِيْلُ النَّادِرُ، وَ الشَّاذُّ الشَّارِدُ، وَ اَمَّا كَلَامُهٗ فَهُوَ الْبَحْرُ الَّذِیْ لَا يُسَاجَلُ، وَ الْجَمُّ الَّذِیْ لَا يُحَافَلُ، وَ

ٹھہرے۔ اس لیے کہ آپؑ کا کلام وہ کلام ہے جس پر پرتو ہے علمِ الٰہی کا اور جس میں بو باس (بھری ہوئی) ہے کلامِ نبویؐ کی۔ لہٰذا میں نے اس کے شروع کرنے میں ان (احباب و اخوان) کی درخواست منظور کی کیونکہ میں جانتا ہوں اس کثیر نفع اور بڑی شہرت اور عظیم ثواب کو جو اس (عمل) میں ہے۔

اور میرا مقصود اس تالیف سے یہ ہے کہ اس فضیلت (فصاحت و بلاغت) میں امیر المومنین علیہ السلام کی جلالت قدر ساتھ ہی آپؑ کے محاسن کثیرہ اور فضائل عظیم کو (تمام دنیا پر) ظاہر کروں اور اس (امر) کو (بھی) کہ حضرتؑ اس فضیلت کی آخری حد تک پہنچنے میں متفرد ہیں تمام سابقین اولین سے جن سے شاذ و نادر ہی (ایسے علم و حکمت کی باتیں) منقول ہیں۔ رہا حضرتؑ کا کلام پس وہ تو دریائے ناپیدا کنار اور ذخیرۂ بے نظیر و مثال ہے۔ اور (جب حضرتؑ

وَ مِنَ الْعُلُوْمِ عِلْمُ النَّحْوِ وَالْعَرَبِيَّةِ، و قَدْ عَلِمَ النَّاسُ كَافَّةً اَنَّهٗ هُوَ الَّذِیْ اِبْتَدَعَهٗ وَ اَنْشَاَهُ وَ اَمْلٰى عَلٰى اَبِی الْاَسْوَدِ الدُّئَلِیِّ جَوَامِعَهٗ وَ اُصُوْلَهٗ، مِنْ جُمْلَتِهَا: اَلْكَلَامُ كُلُّهٗ ثَلَاثَةُ اَشْيَاءَ: اِسْمٌ وَ فِعْلٌ وَ حَرْفٌ. وَ مِنْ جُمْلَتِهَا تَقْسِيْمُ الْكَلِمَةِ اِلٰى مَعْرِفَةٍ وَ نَكِرَةٍ، وَ تَقْسِيْمُ وُجُوْهِ الْاِعْرَابِ اِلَى الرَّفْعِ وَ النَّصْبِ وَ الْجَرِّ وَ الْجَزْمِ، وَ هٰذَا يَكَادُ يُلْحَقُ بِالْمُعْجِزَاتِ لِاَنَّ الْقُوَّةَ الْبَشَرِيَّةَ لَا تَفِیْ بِهٰذَا الْحَصْرِ، وَ لَا تَنْهَضُّ بِهٰذَا الْاِسْتِنْبَاطِ۔

اور جملہ علوم سے علم صرف و نحو و بلاغت ہے اور سب کو معلوم ہے کہ اس کے موجد حضرتؑ ہی ہیں کہ ابوالاسود دُئلی کو اس کے اصول و قواعد تعلیم فرما دیے از آنجملہ یہ کہ فرمایا کلام تین قسموں میں منحصر ہے اسم، فعل، حرف، اور اسم یا نکرہ ہوگا یا معرفہ، اور اعراب رفع، نصب، جر، اور جزم میں منحصر ہے۔ یہ مختصر لیکن جامع قوانین معجزات میں داخل ہو سکتے ہیں کیونکہ انسانی قوت ایسے حصر و احاطہ سے عاجز ہے۔ (شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید، ج ۱، ص ۱۶۔۱۷، مطبوعہ قم)

اَرَدْتُّ اَنْ یَّسُوْغَ لِیَ التَّمَثُّلُ فِی الْاِفْتِخَارِ بِہٖ عَلَیْہِ السَّلَامُ بِقَوْلِ الْفَرَزْدَقِ:

اُولٰٓئِکَ اٰبَآئِیْ فَجِئْنِیْ بِمِثْلِھِمْ
اِذَا جَمَعَتْنَا یَا جَرِیْرُ الْمَجَامِعُ

وَ رَاَیْتُ کَلَامَہٗ عَلَیْہِ السَّلَامُ یَدُوْرُ عَلٰی اَقْطَابٍ ثَلَاثَۃٍ:

اَوَّلُھَا: الْخُطَبُ وَ الْاَوَامِرُ۔
وَ ثَانِیْھَا: الْکُتُبُ وَ الرَّسَآئِلُ۔
وَ ثَالِثُھَا: الْحِکَمُ وَ الْمَوَاعِظُ۔

فَاَجْمَعْتُ بِتَوْفِیْقِ اللّٰہِ تَعَالٰی عَلَی الْاِبْتِدَآءِ بِاخْتِیَارِ مَحَاسِنِ الْخُطَبِ، ثُمَّ مَحَاسِنِ الْکُتُبِ، ثُمَّ مَحَاسِنِ الْحِکَمِ وَ الْاَدَبِ، مُفْرِدًا لِّکُلِّ صِنْفٍ مِّنْ ذٰلِکَ بَابًا، وَ مُفَصِّلًا فِیْہِ اَوْرَاقًا، لِتَکُوْنَ مُقَدِّمَۃً لِّاسْتِدْرَاکِ مَا عَسَاہُ یَشُذُّ عَنِّیْ عَاجِلًا، وَ یَقَعُ اِلَیَّ اٰجِلًا، وَاِذَا جَآءَ شَیْءٌ مِّنْ کَلَامِہٖ عَلَیْہِ السَّلَامُ الْخَارِجِ فِیْٓ اَثْنَاءِ حِوَارٍ، اَوْجَوَابِ سُؤَالٍ، اَوْغَرَضٍ اٰخَرَ مِنَ الْاَغْرَاضِ ۔ فِیْ غَیْرِ الْاَنْحَآءِ الَّتِیْ ذَکَرْتُھَا، وَ قَرَّرْتُ الْقَاعِدَۃَ عَلَیْھَا ۔ نَسَبْتُہٗٓ اِلَی الْاَلْیَقِ الْاَبْوَابِ بِہٖ، وَاَشَدِّھَا مُلَاءَمَۃً لِّغَرَضِہٖ. وَ رُبَّمَا جَآءَ فِیْمَآ اَخْتَارُہٗ مِنْ ذٰلِکَ فُصُوْلٌ غَیْرُ مُتَّسِقَۃٍ، وَ مَحَاسِنُ کَلِمٍ غُیِّرُ

کے علوم کی یہ حالت ہے تو) مجھے مناسب ہے کہ آپؑ پر فخر کرنے میں فرزدق کا یہ شعر بطور مثال پیش کروں:

میرے آباؤ اجداد ایسے عظیم الشان حضرات ہیں جریر (مخاطب)، اگر تمہارے بھی ایسے آباؤ اجداد ہوں تو پیش کرو۔

اور میں حضرتؑ کے کلام کو تین قسموں میں دائر پاتا ہوں:

قسم اول: خطبے اور احکام۔
قسم دوم: خطوط اور فرامین۔
قسم سوم: حکمت اور مواعظ (کے مسائل)

پس خدائے تعالیٰ کی توفیق سے میں نے عزم کیا ہے کہ حضرتؑ کے چیدہ خطبوں سے ابتدا کروں، پھر آپؑ کے اعلیٰ درجہ کے خطوط، پھر حکمت اور ادب کے عمدہ کلمات (ذکر کروں اس طرح کہ) ان (مضامین) سے ہر قسم کے لیے ایک (خاص) باب قرار دوں اور اس میں (خالی) اوراق زیادہ کرتا جاؤں تا کہ جلدی میں جو مجھ سے چھوٹ جائے اور پھر ملے وہ بعد میں (وہاں) بڑھایا جا سکے۔ اور (یہ بھی معلوم رہے کہ) جو قسمیں میں نے بیان کی ہیں اور جو قاعدہ میں نے مقرر کیا ہے اس سے خارج حضرتؑ کے کلام سے اگر ایسا کلام ملے گا جو کسی گفتگو سے متعلق یا کسی سوال کے جواب میں یا کسی دوسری غرض کے لیے ہو تو میں اس کو اس باب میں داخل کر دوں گا جو سب سے زیادہ اس (کلام) کے شایان اور سب سے زیادہ اس (کلام) کی غرض سے مناسب ہوگا۔ اور میں نے جو کلام انتخاب کیا ہے اس میں بعض فصلیں ایسی بھی ملیں گی، کلمات ایسے بھی

مُنْتَظِمَةٍ، لِاَنِّیْٓ اُوْرِدُ النُّكَتَ وَ اللُّمَعَ، وَ لَآ اَقْصِدُ التَّتَالِیَ وَ النَّسَقَ.

وَ مِنْ عَجَآئِبِهٖ عَلَيْهِ السَّلَامُ الَّتِی انْفَرَدَ بِهَا، وَ اَمِنَ الْمُشَارَكَةَ فِيْهَا، اَنَّ كَلَامَهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ الْوَارِدَ فِی الزُّهْدِ وَ الْمَوَاعِظِ، وَ التَّذْكِيْرِ وَ الزَّوَاجِرِ، اِذَآ تَاَمَّلَهُ الْمُتَاَمِّلُ، وَ فَكَّرَ فِيْهِ الْمُتَفَكِّرُ، وَ خَلَعَ مِنْ قَلْبِهٖ اَنَّهٗ كَلَامُ مِثْلِهٖ مِمَّنْ عَظُمَ قُدْرُهٗ، وَ نَفَذَ اَمْرُهٗ، وَ اَحَاطَ بِالرِّقَابِ مُلْكُهٗ، لَمْ يَعْتَرِضْهُ الشَّكُّ فِیْٓ اَنَّهٗ مِنْ كَلَامِ مَنْ لَّا حَظَّ لَهٗ فِیْ غَيْرِ الزَّهَادَةِ، وَ لَا شُغْلَ لَهٗ بِغَيْرِ الْعِبَادَةِ، قَدْ قَبَعَ فِیْ كِسْرِ بَيْتٍ، اَوِ انْقَطَعَ اِلٰی سَفْحِ جَبَلٍ، لَا يَسْمَعُ اِلَّا حِسَّهٗ، وَ لَا يَرٰی اِلَّا نَفْسَهٗ، وَ لَا يَكَادُ يُوْقِنُ بِاَنَّهٗ كَلَامُ مَنْ يَّنْغَمِسُ فِی الْحَرْبِ مُصْلِتًا سَيْفَهٗ، فَيَقُطُّ الرِّقَابَ، وَ يُجَدِّلُ الْاَبْطَالَ، وَ يُعْوِدُ بِهٖ يَنْطُفُ دَمًا، وَ يَقْطُرُ مُهَجًا، وَ هُوَ مَعَ تِلْكَ الْحَالِ زَاهِدُ الزُّهَّادِ، وَ بَدَلُ الْاَبْدَالُ.

دکھائی دیں گے جو باخود ہا غیر منتظم ہیں اس لیے کہ میں (محض حضرتؑ کے) عجیب وغریب نکتے اور روشن کلمے نقل کروں گا اور ترتیب (ذکر) و (نظم) ونسق مجھے مقصود نہیں۔

حضرتؑ کے ان عجائب سے جن میں آپؑ متفرد ہیں اور جن میں آپؑ کا کوئی شریک نہیں یہ ہے کہ حضرتؑ کا وہ کلام جو زہد، مواعظ (امور آخرت کی) یاددہانی اور (افعال قبیحہ سے) زجر وتوبیخ میں وارد ہے۔ جب اس میں غور وفکر کرنے والا غور کرے اور اس (خیال) کو اپنے دل سے نکال دے کہ یہ کلام اس شخص کا ہے جس کی قدر (ومنزلت دنیاوی حیثیت سے بھی) عظیم ہے اس کی حکومت (تمام) جاری ہے اور سلطنت اس کی کل (رعایا کی) گردنوں پر محیط ہے تو اس کو اس میں ذرا شک نہ ہوگا کہ یہ ایسے شخص کا کلام ہے جس کے حصہ میں زہد کے سوا کچھ نہیں اور جس کا شغل عبادت کے سوا کوئی نہیں، جو کسی گوشۂ تنہائی میں پڑا ہوا یا دامنِ کوہ میں عزلت گزیں ہے (جہاں) اپنی سانس کے سوا کچھ نہیں سنتا اور اپنے سوا کسی کو نہیں دیکھتا اور (وہ غور کرنے والا) کبھی یہ یقین نہیں کرسکتا کہ یہ کلام اس کا ہے جو تلوار کھینچنے (بحر) جنگ میں ڈوبا ہوا لوگوں کی گردنیں اڑاتا اور شہسواران (زمانہ) کو پچھاڑتا ہے اور (پھر) اس (تلوار) کو لے کر اس طرح پلٹتا ہے کہ اس سے خون بہتا اور روحیں پھڑکتی ہیں۔[1] باین ہمہ وہ زہد میں ہر زاہد سے بڑھا ہوا اور ہر ولیٔ خدا سے افضل ہے۔

---

[1] علامہ ابن ابی الحدید حضرتؑ کے شجاعت کے بارے میں اپنی شرح مطبوعہ مصر صفحہ ۷ میں لکھتے ہیں: ''اگر فضائل نفسانی اور خصائل انسانی حضرتؑ کے ملاحظہ ہوں تو واضح ہو کہ آپؑ ان امور میں سب کے سردار اور سب سے زیادہ جامع ہیں۔ آپؑ کی شجاعت نے اگلوں کی شجاعت دلوں سے بھلا دی اور پچھلوں کے نام مٹا ڈالے۔ آپؑ کے واقعات جنگ مشہور ومعروف ہیں اور یہ واقعات قیامت تک ضرب المثل رہیں گے۔ صرف آپؑ ہی ایسے شجاع تھے کہ میدان جنگ سے کبھی فرار نہیں کیا اور نہ کبھی کسی لشکر سے (بقیہ صفحہ مابعد)

وَ هٰذِهٖ مِنْ فَضَآئِلِهِ الْعَجِيْبَةِ، وَ خَصَآئِصِهِ اللَّطِيْفَةِ، الَّتِيْ جَمَعَ بِهَا بَيْنَ الْاَضْدَادِ، وَ اَلَّفَ بَيْنَ الْاَشْتَاتِ، وَ كَثِيْرًا مَّآ اُذَاكِرُ الْاِخْوَانَ

اور یہ (صفت) آپؑ کے ان فضائل عجیبہ اور خصائص لطیفہ سے ہے جن کے سبب سے آپؑ نے (گویا) اضداد کو جمع اور مبائن اوصاف کو یکجا کیا۔[1] چنانچہ میں اکثر اپنے بھائیوں

(بقیہ صفحہ ماقبل) خوفزدہ ہوئے۔ کوئی دشمن مقابلہ میں نہ آیا کہ پھر زندہ پھرا ہو اور کوئی وار نہ لگا یا کہ پھر دوسرے وار کی ضرورت رہی ہو۔ حدیث میں ہے کہ آپؑ کا وار طاق ہوا کرتا تھا۔ جنگ صفین میں جب آپؑ نے معاویہ سے کہلایا کہ مسلمانوں کو کیوں تباہ ہونے دیا جائے آؤ میں اور تم دست بدست لڑ کر فیصلہ کر لیں اور جو قتل ہو جائے اس کی جماعت دوسرے کے ساتھ ہو جائے تو عمرو بن عاص نے معاویہ سے کہا بے شک علیؑ نے یہ بات انصاف کی کہی تو معاویہ نے اس کا جواب دیا کہ آج کے ایسی فریب آمیز رائے تو تو نے کبھی نہیں دی تھی باوجود یکہ تجھ کو یقین ہے کہ علیؑ سے دست بدست لڑنے میں میں ضرور قتل ہوں گا پھر بھی تو مجھے ان سے لڑنے کی رائے دیتا ہے اس طمع میں کہ میرے بعد شام کی حکومت تجھ کو مل جائے چنانچہ معاویہ کو حضرتؑ کے مقابلہ میں جانے کی جرأت نہیں ہوئی۔ عرب سے جو شخص آپؑ کے مقابلہ میں لڑنے کو نکلتا ہمیشہ اس پر فخر کرتا کہ میں علیؑ سے لڑنے کو نکلا تھا۔ اور جو آپؑ کے ہاتھ سے قتل ہو جاتا اس کی قوم فخر کرتی کہ وہ علیؑ کے ہاتھ سے مارا گیا جس کے واقعات بکثرت مشہور ہیں۔ جنگ خندق میں عمرو بن عبدود حضرتؑ کے ہاتھ سے قتل ہوا تو اس کی بہن نے اس کا مرثیہ کہا:

لَوْ كَانَ قَاتِلُ عَمْرٍو غَيْرَ قَاتِلِهٖ ... بَكَيْتُ اَبَدًا مَا دُمْتُ فِي الْاَبَدِ

لٰكِنَّ قَاتِلَهٗ مَنْ لَا نَظِيْرَ لَهٗ ... وَلٰكِنْ يُدْعٰى اَبُوْهُ بَيْضَةَ الْبَلَدِ

یعنی میرے بھائی عمرو کو علیؑ کے سوا دوسرا کوئی قتل کیے ہوتا تو میں اپنے بھائی پر عمر بھر روتی لیکن (اب تو خوش ہوں کیونکہ) اس کا قاتل وہ شخص ہے جو شجاع یگانہ اور دلیر بے مثل ونظیر اور بادشاہ حجاز کا فرزند ارجمند ہے کہ اس سے لڑنے میں ہر شخص کو فخر ہے اور اس کے ہاتھ سے قتل ہونے میں کوئی عیب وعار نہیں۔

نقل ہے کہ ایک روز معاویہ بیدار ہوا تو عبداللہ بن زبیر کو اپنے تخت پر بیٹھا پایا۔ عبداللہ نے مزاح سے کہا اے امیر اگر اس وقت میں تم کو قتل کر دوں تو کیا ہو؟ معاویہ نے کہا ابن زبیر! میرے سامنے تو شجاعت کا دعویٰ کرتا ہے؟ عبداللہ نے کہا تم میری شجاعت سے کس طرح انکار کر سکتے ہو حالانکہ میں صف جنگ میں علیؑ کے مقابل ہوا ہوں۔ معاویہ نے کہا اگر ایسا ہوتا تو تجھ کو اور تیرے باپ کو بائیں ہاتھ کے ایک ہی وار سے قتل کر کے علیؑ دوسرے شخص کو داہنے ہاتھ سے قتل کرنے کے لیے ڈھونڈے ہوتے تم لوگ کیا ان کے مقابلوں میں جا سکتے ہو۔

مختصر یہ کہ دنیا کا ہر شجاع آپؑ ہی تک منتہی ہوتا ہے اور آپؑ ہی کا نام لے کر لڑتا ہے خواہ مشرق میں ہو خواہ مغرب میں۔

[1] جناب سیدؒ نے بہت صحیح لکھا کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ فضائل ومناقب امیر المومنینؑ ایسے عظیم الشان ہیں کہ کوئی ان کا احصا نہیں کر سکتا۔ اسی لیے جناب سیدؒ نے اس کے متعلق کچھ نہ لکھا بلکہ صرف ایک حالت جمع اضداد کا ایسا مختصر نقشہ کھینچا ہے کہ اس سے اچھی (بقیہ صفحہ مابعد)

بِهَا، وَ اَسْتَخْرِجُ عَجَبَهُمْ مِنْهَا، وَ هِيَ مَوْضِعٌ لِّلْعِبْرَةِ بِهَا، وَ الْفِكْرَةِ فِيْهَا.

سے اس کا ذکر کرتا اور (اس سے) ان کو متحیّر کرتا رہتا ہوں کیونکہ یہ عبرت پکڑنے اور (نہایت غور و) فکر کرنے کا محل ہے۔

وَ رُبَّمَا جَآءَ فِيْ اَثْنَآءِ هٰذَا الْاِخْتِيَارِ اللَّفْظُ الْمَرَدَّدُ، وَ الْمَعْنَى الْمُكَرَّرُ، وَ الْعُذْرُ فِيْ ذٰلِكَ اَنَّ رِوَايَاتِ كَلَامِهٖ عَلَيْهِ السَّلَامُ تَخْتَلِفُ اخْتِلَافًا

اور (یہ بھی واضح رہے کہ حضرتؑ کے کلام کے) اس انتخاب میں اکثر الفاظ و مطالب مکرر آ گئے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ آپؑ کے کلام کی روایتیں بے حد

(بقیہ صفحہ ماقبل) تصویر کھینچنا نہایت دشوار ہے کیونکہ ایک طرف تو حضرتؑ کا وہ زہد اور انقطاعُ الخلائق دکھلایا ہے کہ پہاڑ کے درہ میں ایک شخص بیٹھا ہے جو نہ اپنے سوا کسی کا تنفس سنتا ہے نہ اپنے سوا کسی کی صورت دیکھتا ہے۔ دوسری طرف انتظام مہام سلطنت میں آپؑ کا وہ اہتمام دکھایا کہ ہر وقت آپؑ کی تلوار سے دشمنوں کا خون ٹپک رہا ہے اور مُردے پھڑک رہے ہیں۔ کیونکہ سلاطین زمانہ اکثر ایسے ہوتے ہیں جو خود تو لہب ولعب میں مشغول رہتے ہیں اور سپہ سالاری کو دوسروں کے حوالہ کر دیتے ہیں۔ مگر شاذ و نادر ایسے ہوتے ہیں جن کو اس قدر انہماک ہوتا ہے کہ اس کام کو بھی خود ہی انجام دیں۔ اسی کو جناب سیّدؒ نے دکھایا ہے کہ حضرتؑ کی یہ حالت نہ تھی کہ مثل سلاطین زمانہ ان امور کو دوسرے کے حوالہ کریں بلکہ بنفس نفیس ان کو انجام دیتے تھے۔ ایسی حالت میں اس طرح کے خطبے زہد وغیرہ کے متعلق نہایت عجیب ہیں۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ حیرت خیز خود آپؑ کا زہد فی الدنیا ہے۔

چنانچہ شرح ابن ابی الحدید صفحہ ۸ میں آپؑ کے زہد کے متعلق ہے۔ ''حضرتؑ سید الزہاد و بدل الابدال تھے۔ کبھی سیر ہو کر کھانا نہ کھایا، سب سے زیادہ خشن اور موٹا کپڑا آپؑ ہی پہنتے، جَو کی روٹی کے خشک ٹکڑے تناول فرماتے اور روٹی کی تھیلی کو بند کر کے اور مُہر لگا کر رکھتے تا کہ آپؑ کے اعزّہ سے کوئی شخص روغن زیت یا گھی اس میں نہ ملا دے۔ کپڑوں میں چمڑے اور پوست خرما کے پیوند لگاتے۔ جوتہ بھی خرما کی چھال کا ہوتا۔ روٹی اکثر روکھی اور شاذ و نادر صرف سرکہ یا نمک سے کھاتے۔ باوجود اس کے قوت و طاقت سب سے زیادہ تھی اور جوع و فاقہ سے اس میں کچھ کمی نہ آئی تھی اور نہ قلت مال آپ کے جود و سخا میں کسی قسم کا حرج پیدا کرتی۔ آپؑ نے دنیا کو اس طرح طلاق دے رکھا تھا کہ سوائے شام کے تمام ممالک اسلام کا خراج آپؑ کے پاس آتا اور آپؑ کل کو برابر تقسیم فرما دیا کرتے تھے''۔

اور حضرتؑ کے جود و سخا کے متعلق صفحہ ۷ میں یہ بھی لکھا ہے۔ ''جود و سخا آنحضرت کا ظاہر ہے خود تو دنوں کو روزہ رکھتے تھے اور شب کو فاقہ کرتے لیکن اپنا تمام مال و متاع فقرا و مساکین کو تقسیم کر دیتے، آپ ہی حضرات کی شان میں سورۂ ''ھَلْ اَتٰی'' نازل ہوا ہے۔ مفسرین نے روایت کی ہے کہ حضرت علیؑ کے پاس ایک دفعہ چار درہم تھے تو ایک دن کو، ایک شب کو، ایک اعلانیہ اور ایک مخفی طور پر صدقہ دیا جس پر آیہ ﴿اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَ النَّهَارِ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ ''یعنی جو لوگ رات کو، دن کو چھپا کر یا دکھا کر خدا کی راہ میں اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں ان کے لیے ان کا اجر و ثواب ان کے پروردگار کے پاس ہے نہ ان پر کسی قسم کا خوف ہوگا اور نہ وہ آزردہ خاطر ہوں گے''۔ (سورۂ البقرہ، آیہ ۲۴) دیکھو تفسیر کشاف جلد اول صفحہ ۲۸۶ و دُرِّ منثور جلد اول صفحہ ۳۶۳ مطبوعہ مصر۔

شَدِيْدًا: فَرُبَّمَا اتَّفَقَ الْكَلَامُ الْمُخْتَارُ فِيْ رِوَايَةٍ فَنُقِلَ عَلٰى وَجْهِهٖ، ثُمَّ وُجِدَ بَعْدَ ذٰلِكَ فِيْ رِوَايَةٍ اُخْرٰى مَوْضُوْعًا غَيْرَ وَضْعِهِ الْاَوَّلِ: اِمَّا بِزِيَادَةٍ مُخْتَارَةٍ، اَوْ بِلَفْظٍ اَحْسَنَ عِبَارَةً، فَتَقْتَضِي الْحَالُ اَنْ يُّعَادَ، اسْتِظْهَارًا لِّلْاِخْتِيَارِ، وَ غَيْرَةً عَلٰى عَقَآئِلِ الْكَلَامِ. وَ رُبَّمَا بَعُدَ الْعَهْدُ اَيْضًا بِمَا اخْتِيْرَ اَوَّلًا فَاُعِيْدَ بَعْضُهٗ سَهْوًا اَوْ نِسْيَانًا، لَا قَصْدًا وَ اعْتِمَادًا.

وَ لَآ اَدَّعِيْ ـ مَعَ ذٰلِكَ ـ اَنِّيْٓ اُحِيْطُ بِاَقْطَارِ جَمِيْعِ كَلَامِهٖ عَلَيْهِ السَّلَامُ حَتّٰى لَا يَشِذَّ عَنِّيْ مِنْهُ شَآذٌّ، وَ لَا يَنِدَّ نَآدٌّ، بَلْ لَآ اَبْعِدُ اَنْ يَّكُوْنَ الْقَاصِرُ عَنِّيْ فَوْقَ الْوَاقِعِ اِلَيَّ، وَ الْحَاصِلُ فِيْ رِبْقَتِيْ دُوْنَ الْخَارِجِ مِنْ يَّدَيَّ، وَ مَا عَلَيَّ اِلَّا بَذْلُ الْجُهْدِ، وَ بَلَاغُ الْوُسْعِ، وَ عَلَى اللّٰهِ سُبْحَانَهٗ فَتْحُ السَّبِيْلِ، وَ رَشَادُ الدَّلِيْلِ، اِنْ شَآءَ اللّٰهُ.

وَ رَاَيْتُ مِنْ بَعْدُ تَسْمِيَةَ هٰذَا الْكِتَابِ بِـ"نَهْجِ الْبَلَاغَةِ"، اِذْ كَانَ يَفْتَحُ لِلنَّاظِرِ فِيْهِ اَبْوَابَهَا، وَ يُقَرِّبُ عَلَيْهِ طِلَابَهَا، وَ فِيْهِ حَاجَةُ الْعَالِمِ وَ الْمُتَعَلِّمِ، وَ بُغْيَةُ الْبَلِيْغِ وَ الزَّاهِدِ، وَ يَمْضِيْ فِيْٓ اَثْنَآئِهٖ مِنْ عَجِيْبِ

مختلف ہیں۔ پس اکثر ایک روایت کا کلام بعینہ نقل کیا گیا، پھر دوسری روایت میں وہ سابق سے مختلف طریقہ پر ملا، خواہ اس میں عبارت زیادہ تھی یا اس کی عبارت کے الفاظ بہتر تھے لہٰذا مناسب حال (یہ معلوم) ہوا کہ دوبارہ اس کو لکھا جائے تا کہ اس کلام کی خوبیاں ظاہر اور اس کے محاسن واضح ہوں اور (کبھی ایسا بھی ہوا کہ) پہلا کلام نقل کیے مدت ہو گئی پھر بھولے سے یا غلطی سے وہ دوبارہ لکھ گیا نہ قصداً اور عمداً۔

پھر بھی میں اس کا مدعی نہیں کہ حضرتؑ کے کلام کے ہر پہلو و جوانب کا احاطہ کر لوں گا جس سے کوئی جملہ مجھ سے چھوٹنے یا کوئی فقرہ رہنے نہ پائے بلکہ (میں تو یہ بھی کہتا ہوں کہ) بعید نہیں ہے کہ جو کلام مجھ سے چھوٹ گیا ہے وہ اس سے بہت زیادہ ہو جو ملا ہے۔ اور جو میرے قبضہ میں آیا ہے وہ کم ہو اس سے جو خارج ہے۔ کیونکہ میرا فرض صرف محنت اور سعی بلیغ کرنا ہے اور راہ دکھانی اور طریقہ بتانا تو خدا کے متعلق ہے بشرطیکہ (وہ) خدا چاہے۔

(جمع کرنے کے) بعد میری رائے ہوئی کہ اس کتاب کا نام "نہج البلاغہ" رکھوں کیونکہ یہ اپنے ناظرین پر بلاغت کے دروازے کھولتی اور اس کی تحصیل آسان کر دیتی ہے اور اس کی احتیاج ہے ہر استاد و شاگرد کو اور یہ مطلوب ہے ہر بلیغ و زاہد کی۔ اور اثنائے کتاب میں توحید (عدل) (ذات خدا کے) مخلوقات سے بے نظیر

الْكَلَامِ فِي التَّوْحِيْدِ وَ الْعَدْلِ، وَ تَنْزِيْهِ اللهِ سُبْحَانَهٗ عَنْ شَبَهِ الْخَلْقِ، مَا هُوَ بِلَالُ كُلِّ غُلَّةٍ، وَ جِلَآءُ كُلِّ شُبْهَةٍ.

وَ مِنَ اللهِ سُبْحَانَهٗ اَسْتَمِدُّ التَّوْفِيْقَ وَ الْعِصْمَةَ، وَاَتَنَجَّزُ التَّسْدِيْدَ وَ الْمَعُوْنَةَ، وَ اَسْتَعِيْذُهٗ مِنْ خَطَلِ الْجَنَانِ، قَبْلَ خَطَلِ اللِّسَانِ، وَمِنْ زَلَّةِ الْكَلِمِ، قَبْلَ زَلَّةِ الْقَدَمِ، وَهُوَ حَسْبِيْ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ.

ہونے کے متعلق (حضرتؑ کے) عجیب (وغریب) کلام میں جو ہر پیاس کے لیے سیرابی اور ہر شبہ کے رفع (کا باعث) ہے۔

اور (ان امور میں) خدا سے توفیق اور حفاظت چاہتا اور سیدھی راہ دکھانے اور مدد کرنے کی درخواست کرتا ہوں اور خطائے لسانی کے قبل خطائے قلبی سے اور لغزش قدم سے قبل لغزش کلام سے پناہ چاہتا ہوں کیونکہ وہی میرے لیے کافی اور بہترین کارساز ہے۔

بَابُ الْمُخْتَارِ مِنْ خُطَبِ اَمِيْرِالْمُؤْمِنِيْنَ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَ اَوَامِرِهٖ

امیرالمومنین علیہ السلام کے منتخب خطبات واحکام کا باب [1]

وَ يَدْخُلُ فِيْ ذٰلِكَ الْمُخْتَارِ مِنْ كَلَامِهِ الْجَارِيْ مَجْرَى الْخُطَبِ فِي الْمَقَامَاتِ الْمَحْصُوْرَةِ وَالْمَوَاقِفِ الْمَذْكُوْرَةِ وَالْخُطُوْبِ الْوَارِدَةِ۔

اوراسی (باب) میں آپؑ کے کلام کا وہ انتخاب (بھی) رہے گا جو بمنزلہ خطبوں کے ہے (اور جو) متعدد مجلسوں اور معرکوں اور دشوار امور میں (بیان ہوا ہے)۔

❁ خطبہ :۱ ❁

فَمِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

خطبہ (۱)

حضرتؑ کا وہ خطبہ

يَذْكُرُ فِيْهَا ابْتِدَاءَ خَلْقِ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ وَ خَلْقِ اٰدَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ۔

جس میں ابتدائے خلقت آسمان و زمین اور خلقت حضرت آدمؑ کو بیان فرماتے ہیں۔ [2]

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَا يَبْلُغُ مِدْحَتَهُ الْقَآئِلُوْنَ، وَ لَا يُحْصِيْ نَعْمَآئَهُ الْعَادُّوْنَ وَ

ہر طرح کی حمد اللہ (ہی) کو (زیبا) ہے جس کی مدح (بڑے بڑے) مقرر نہیں کر سکتے۔ [3] نہ گننے والے اس

---

[1] اگرچہ جناب سید رضی علیہ الرحمہ نے باب کا لفظ استعمال کیا ہے لیکن اس کو نہج البلاغہ کی پہلی جلد سمجھنا چاہیے کیونکہ ممدوح نے کل کتاب کے دو باب قرار دیے ہیں۔ پہلے باب کو جس میں حضرتؑ کے خطبے اور مختلف کلام، مواعظ ونصائح اوامر ونواہی کے متعلق ہیں جلد اول قرار دیا ہے۔ اور دوسرے باب کو جس میں آپ کے فرمان، خطوط، عہد نامہ، وصایا، احکام سلطنت، قوانین حکومت اور چھوٹے چھوٹے اخلاقی جملے ہیں، جلد ثانی قرار دیا ہے۔

[2] یہ خطبہ مباحث عظیم الشان اور مہمات مسائل پر مشتمل ہے بترتیب علم طبعی اور چونکہ واجب الوجود کو بالذات تقدم ہے مراتب اربعہ موجودات پر کیونکہ وہ مبداء جمیع کائنات اور منشاء تمامی مخلوقات ہے اور واجب الوجود کی توحید کا ثابت کرنا اسلام کا اصل الاصول ہے لہٰذا جناب امیر علیہ السلام نے نہایت وضاحت سے اس کے مباحث کو ادا فرمایا ہے لیکن چونکہ علم کلام کے مباحث ہیں اور اس بزرگ کا کلام ہے جو ہر علم کا استاد مسلّم الثبوت ہے لہٰذا نہایت دقت نظر سے مطالعہ کرنا چاہیے۔

[3] اگر دقت نظر سے کام لیا جائے تو معلوم ہو کہ حضرتؑ کے کلام اور خداوند عالم کے کلام میں بہت کچھ مشابہات پائے جاتے ہیں اور اس کی وجہ وہی ہے جس کو جناب سید رضی علیہ الرحمہ نے اپنے خطبہ میں لکھا ہے کہ ''اِنَّ كَلَامَهُ الَّذِيْ عَلَيْهِ مَسْحَةٌ مِّنَ الْعِلْمِ الْاِلٰهِيْ'' کہ حضرتؑ کے کلام پر علمِ الٰہی کا پرتو ہے۔ خداوند عالم کی حمد ومدح سے لوگوں کے عاجز رہنے میں حضرتؑ نے جو فرمایا ہے اس کی تصدیق کلام مجید کی ان آیات سے بھی ہوتی ہے:

﴿قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَ لَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا﴾ (سورۂ الکھف، آیہ ۱۰۹)

(بقیہ صفحہ مابعد)

لَا يُؤَدِّیْ حَقَّهٗ الْمُجْتَهِدُوْنَ، الَّذِیْ لَا يُدْرِكُهٗ بُعْدُ الْهِمَمِ، وَ لَا يَنَالُهٗ غَوْصُ الْفِطَنِ، الَّذِیْ لَيْسَ لِصِفَتِهٖ حَدٌّ مَّحْدُوْدٌ، وَ لَا نَعْتٌ مَّوْجُوْدٌ، وَ لَا وَقْتٌ مَّعْدُوْدٌ، وَ لَآ اَجَلٌ مَّمْدُوْدٌ.

کی نعمتوں کا شمار کر سکتے ہیں۔[1] نہ بڑی کوشش کرنے والے اس کے حق کو ادا کر سکتے ہیں۔ (وہ خدا) ایسا (ہے) کہ بلند ہمت والے نہ اس کا ادراک کر سکتے ہیں نہ (غور و) خوض کرنے والی عقلیں اس کو سمجھ سکتی ہیں۔[2] جس کی کنہ وحقیقت کی کوئی مخصوص حد ہے نہ موجود صفت۔ نہ معین وقت نہ مقرر مدت۔[3]

(بقیہ صفحہ ماقبل) کہ اگر پروردگار کی باتوں کے لکھنے کے لیے سمندر کا پانی سیاہی بن جائے تو قبل اس کے کہ پروردگار کی باتیں ختم ہوں سمندر ہی ختم ہو جائے گا اگر چہ خدا ویسا ہی ایک اور سمندر پیدا کر دے۔

﴿وَلَوْ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَا نَفِدَتْ كَلِمَاتُ اللّٰهِ۔﴾ (سورۂ لقمان، آیہ ۲۷)

کہ جتنے درخت زمین میں ہیں سب کے سب قلم بن جائیں اور سمندر اس کی سیاہی بنے اور اس کے (ختم ہونے کے) بعد (اور) سات سمندر (سیاہی) ہو جائیں (اور خدا کا علم اور اس کی باتیں لکھی جائیں) تو بھی خدا کی باتیں ختم نہ ہوں۔

اگر چہ ان آیات میں کلمات خدا کا ذکر ہے لیکن وہ شامل ہیں حمد، مدح، نعمت اوصاف سب کو۔

[1] اس دعوے کی تصدیق کلام مجید کے اس آیہ سے ہوتی ہے:

﴿وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا﴾ (سورۂ ابراھیم، آیہ ۳۴)

کہ اگر تم خدا کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو نہیں گن سکتے۔

اور آنحضرتؐ کی حدیث ہے: لَا اُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَيْكَ اَنْتَ كَمَا اَثْنَيْتَ عَلٰی نَفْسِكَ

کہ بار الٰہا میں تیری حمد وثنا کا شمار نہیں کر سکتا تو ویسا ہی ہے جیسا تو نے خود اپنی مدح وثنا کی ہے۔

[2] یہ جملے اس امر کے بیان کے لیے ہیں کہ خدا کی کنہ وحقیقت کو کوئی شخص نہیں سمجھ سکتا نہ اس کی ذات کی ماہیت کا ادراک کر سکتا ہے، نہ اس کی حالت کا احاطہ کر سکتا ہے، نہ اور طرح اس کا تصور کر سکتا ہے کیونکہ جو چیز انسان کے ذہن میں آ سکتی ہے وہ تین حال سے خالی نہیں۔ یا محسوس ہوگی جیسے شیرینی، سردی، گرمی وغیرہ یا فرضی ہوگی جیسے کوئی شخص کسی آدمی کو اڑتا ہوا یا کسی دریا کو خون سے بھرا ہوا خیال کرے۔ یا نفس میں کیفیت اس کی موجود ہوگی جیسے رنج، خوشی وغیرہ اور چونکہ خدا کی ذات ان کل قسموں سے خارج ہے لہٰذا اس کا تصور کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اس کی کسی صفت یا حالت سے بھی اس کا ادراک نہیں ہو سکتا۔

[3] اسلام کے بعض فرقوں کا جو آخرت میں خدا کی دیدار حاصل ہونے کا یقین رکھتے ہیں اعتقاد ہے کہ خدا کی کنہ وماہیت گو اس دنیا میں نہیں معلوم ہوتی لیکن آخرت میں معلوم ہوگی۔ اس کلام سے حضرتؑ نے ان کے اعتقاد کو باطل کر دیا، کبھی بھی اس کی ماہیت نہیں معلوم ہو سکتی اور یہ کہ اس کی حقیقت معلوم ہونے کی کوئی مدت نہیں مقرر ہے۔

فَطَرَ الْخَلَائِقَ بِقُدْرَتِهٖ، وَ نَشَرَ الرِّيَاحَ بِرَحْمَتِهٖ، وَ وَتَّدَ بِالصُّخُوْرِ مَيَدَانَ اَرْضِهٖ.

(صرف) اپنی قدرت کاملہ سے تمام مخلوقات کو پیدا کیا۔ اور اپنی رحمت سے ہواؤں کو پھیلایا۔ اور پہاڑوں کو میخ بنا کر[1] اپنی زمین کی حرکت کو روکا۔

اَوَّلُ الدِّيْنِ مَعْرِفَتُهٗ، وَ كَمَالُ مَعْرِفَتِهِ التَّصْدِيْقُ بِهٖ، وَ كَمَالُ التَّصْدِيْقِ بِهٖ تَوْحِيْدُهٗ، وَ كَمَالُ تَوْحِيْدِهِ الْاِخْلَاصُ لَهٗ، وَ

دین کا پہلا (جز) اس کی معرفت ہے اور معرفت کا کمال اس کا یقین کرنا ہے۔ اور یقین کا کمال اس کی توحید ہے۔ اور توحید کا کمال اخلاص کرنا ہے۔ اور اخلاص اس کا

---

[1] علامہ ابن ابی الحدید صفحہ ۲۰ میں لکھتے ہیں کہ

''فَطَرَ الْخَلَائِقَ'' سے یہاں تک۔ حضرتؑ کے جملے قرآن مجید سے مشتق ہیں اس طرح کہ ''فَطَرَ الْخَلَائِقَ' مشتق ہے آیہ

﴿قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا﴾ (سورۂ الشعراء، آیہ ۲۴)

یعنی آسمانوں اور زمین کا کون رب ہے۔

سے اور ''وَ نَشَرَ الرِّيَاحَ بِرَحْمَتِهٖ' مشتق ہے آیہ

﴿وَ هُوَ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ﴾ (سورۂ الاعراف، آیہ ۵۷)

یعنی وہی خدا تو وہ ہے جو اپنی رحمت ابر سے پہلے خوشخبری دینے والی ہواؤں کو بھیجتا ہے۔

اور بعض قرأت میں بشراً کی جگہ نشراً ہے۔

اور ''وَتَّدَ بِالصُّخُوْرِ مَيَدَانَ اَرْضِهٖ' مشتق ہے آیہ

﴿اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۙ وَّ الْجِبَالَ اَوْتَادًا ۙ﴾ (سورۂ النباء، آیہ ۶۔۷)

یعنی کیا میں نے زمین کو بچھونا اور پہاڑ کو زمین کی میخیں نہیں بنایا۔

سے، اس مضمون کی دوسری آیہ کلام مجید میں یہ ہے:

﴿وَ اَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ﴾ (سورۂ النحل، آیہ ۱۵)

یعنی خدا نے زمین پر بھاری بھاری پہاڑوں کو (میخ کی طرح) گاڑ دیا تاکہ زمین تمہیں لے کر کہیں جھک نہ جائے۔

اسی کو حضرتؑ بھی بیان فرماتے ہیں کہ خدا نے اپنی زمین میں پہاڑوں کی میخ لگا دی ہے تاکہ زمین حرکت نہ کرے، یعنی جس طرح کوئی شی ادنی حرکت سے ہلنے لگتی ہے اور جب اس میں میخ لگا دی جاتی ہے تو وہ مستحکم ہو جاتی اور اس کا ہلنا موقوف ہو جاتا ہے، اسی طرح زمین میں بھی جھک جانے کی استعداد تھی لہٰذا خدا نے پہاڑوں کو زمین پر پیدا کر کے اس کو مستحکم اور مستقر کر دیا جس سے اب ہل نہیں سکتی۔ یا جس طرح کشتی کہ اس میں اگر وزنی چیزیں نہ ہوں تو پانی پر سیدھی نہ ٹھہرے اور حرکت کرتی رہے اسی طرح چونکہ زمین پانی پر قائم ہے، اگر اس میں پہاڑ ایسی وزنی چیز نہ ہوتی تو یہ بھی ہلنے لگتی۔ (حضرتؑ نے اس جملہ میں حکمت کے ایک دقیق مسئلہ کو بیان فرمایا ہے جو طولانی مبحث چاہتا ہے۔ لہٰذا اس کی تفصیل ضمیمہ میں آئے گی)

كَمَالُ الْاِخْلَاصِ لَهٗ نَفْيُ الصِّفَاتِ عَنْهُ، لِشَهَادَةِ كُلِّ صِفَةٍ اَنَّهَا غَيْرُ الْمَوْصُوْفِ، وَ شَهَادَةِ كُلِّ مَوْصُوْفٍ اَنَّهٗ غَيْرُ الصِّفَةِ.

فَمَنْ وَّصَفَ اللّٰهَ سُبْحَانَهٗ فَقَدْ قَرَنَهٗ، وَ مَنْ قَرَنَهٗ فَقَدْ ثَنَّاهُ، وَ مَنْ ثَنَّاهُ فَقَدْ جَزَّاَهٗ، وَ مَنْ جَزَّاَهٗ فَقَدْ جَهِلَهٗ، وَ مَنْ جَهِلَهٗ فَقَدْ اَشَارَ اِلَيْهِ، وَ مَنْ اَشَارَ اِلَيْهِ فَقَدْ حَدَّهٗ، وَ

کامل ہوسکتا ہے جس نے ہر صفت (زائد) کا اس سے انکار کیا کیونکہ ہر صفت (خود) شاہد ہے کہ وہ غیر موصوف ہے اور ہر موصوف شاہد ہے کہ وہ غیر صفت [1] ہے۔

پس جس نے خدا کی صفت (زائدہ برذات) کا اعتقاد کیا اس نے خدا کا ہمسر مانا اور جس نے اس کا ہمسر مانا اس نے اس کا ثانی ٹھہرایا اور جس نے ثانی ٹھہرایا اس نے اس کا تجزیہ کیا اور جس نے تجزیہ کیا وہ اس سے جاہل رہا۔ اور جو اس سے جاہل رہا اس نے اس کی طرف (گویا) اشارہ کیا اور جس نے اس کی طرف اشارہ کیا وہ اس کو محدود

[1] ''اَوَّلُ الدِّيْنِ مَعْرِفَتُهٗ'' سے اس مقام تک حضرتؑ نے اس امر کو بیان فرمایا ہے کہ دین کی بنیاد خدا کی معرفت ہے اس طرح کہ انسان صرف اس قدر سمجھ لے کہ اس دنیا کا کوئی پیدا کرنے والا ہے جو دنیا کے سوا کوئی اور ذات ہے۔ لیکن یہ ناقص معرفت ہے اور کامل معرفت یہ ہے کہ انسان سمجھے کہ اس دنیا کا کوئی پیدا کرنے والا ہے جو سلسلۂ ممکنات سے خارج ہے اور جو ذات سلسلۂ ممکنات سے خارج ہوگی وہ ممکن نہیں ہوسکتی اور جو ممکن نہیں ہوسکتی وہی واجب الوجود ہے۔ پس جب اس شخص نے یہ سمجھ لیا کہ اس دنیا کا پیدا کرنے والا ایک ذات واجب الوجود ہے اس کو ایسی معرفت حاصل ہوئی جو پہلی معرفت سے کامل تر ہے۔ پس اسی معرفت کو تصدیق کہتے ہیں اس لیے کہ وہ مخصوص صفت جس سے خداوند عالم اپنی مخلوقات سے ممتاز ہوتا ہے یہی ہے کہ وہ واجب الوجود اور اس کے سوا سب ممکن الوجود ہیں۔ اسی طرح یہ تصدیق کامل معرفت تو ہے لیکن تصدیق ناقص ہے۔ ہاں جب یہ خیال کرلیا کہ ذات واجب الوجود کے لیے تنہا ہونا لازم ہے اور دو چیزیں کبھی واجب الوجود ہو نہیں سکتیں اس لیے کہ اگر دو چیزیں واجب الوجود ہو جائیں تو واجب الوجود ہونا تو دونوں میں پایا گیا اب ان میں امتیاز ہونے کے لیے کوئی دوسری صفت ہونی چاہیے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ واجب الوجود کی ذات مرکب مانی جائے واجب الوجود ہونے اور اس دوسری صفت سے حالانکہ واجب الوجود کا مرکب ہونا منافی ہے اس کے واجب الوجود ہونے کے۔

پس جس شخص نے خدا کو واحد سمجھا، یعنی یہ کہ اس کے سوائے کوئی واجب الوجود نہیں تو اس کو کمال تصدیق صانع حاصل ہوگئی۔ اور اعتقاد توحید نہیں کامل ہوسکتا بغیر اس کے کہ انسان اپنے اعمال سے بھی اس کی توحید کا اقرار کرے، یعنی اپنے کل اعمال کو خالص اس کے لیے انجام دے اور کسی شخص یا کسی ذاتی غرض کو اس کا شریک نہ کرے بلکہ جو کرے وہ خالصاً لوجہ اللہ۔ اور یہ اخلاص اس وقت تک کامل نہیں ہوسکتا جب تک انسان یہ اعتقاد نہ کرے کہ خدا کی صفات اس کی عین ذات ہیں کہ کوئی صفت اس کی ذات سے زائد نہیں ہے اس لیے کہ اگر اس کی ذات سے کوئی صفت زائد تسلیم کی جائے گی تو اس کو بھی قدیم ماننا ہوگا پس دو قدیم کا اعتقاد کرنا ہوگا جو عین شرک ہے اس لیے کہ واضح ہے صفت علیحدہ چیز ہے اور موصوف علیحدہ چیز، کیونکہ یہ صفت موصوف میں پائی تو جاتی ہے لیکن اس کی ذات تو نہیں ہوسکتی۔ اس سے زیادہ توضیح ضمیمہ میں آئے گی۔

مَنْ حَدَّهٗ فَقَدْ عَدَّهٗ، وَ مَنْ قَالَ: «فِيْمَ؟» فَقَدْ ضَمَّنَهٗ، وَ مَنْ قَالَ: «عَلَامَ؟» فَقَدْ اَخْلٰى مِنْهُ.

كَآئِنٌ لَّا عَنْ حَدَثٍ، مَّوْجُوْدٌ لَّا عَنْ عَدَمٍ، مَعَ كُلِّ شَيْءٍ لَا بِمُقَارَنَةٍ، وَ غَيْرُ كُلِّ شَيْءٍ لَّا بِمُزَايَلَةٍ، فَاعِلٌ لَّا بِمَعْنَى الْحَرَكَاتِ وَ الْاٰلَةِ، بَصِيْرٌ اِذْ لَا مَنْظُوْرَ اِلَيْهِ مِنْ خَلْقِهٖ، مُتَوَحِّدٌ اِذْ لَا سَكَنَ يَسْتَأْنِسُ بِهٖ وَ لَا يَسْتَوْحِشُ لِفَقْدِهٖ.

اَنْشَاَ الْخَلْقَ اِنْشَآءً، وَ ابْتَدَاَهُ ابْتِدَآءً، بِلَا رَوِيَّةٍ اَجَالَهَا، وَ لَا تَجْرِبَةٍ اسْتَفَادَهَا، وَ لَا حَرَكَةٍ اَحْدَثَهَا، وَ لَا هَمَامَةِ

سمجھا اور جو اس کو محدود سمجھا اس نے اس کو (محدثات سے) شمار کیا اور (اسی طرح) جس نے کہا خدا کس میں ہے اس نے اس کے لیے ظرف تجویز کیا۔ اور جس نے کہا خدا کس چیز پر ہے اس نے (کسی چیز کو) اس سے خالی سمجھا۔ [1]

(حالانکہ خدا کی) ہستی (تو) ہے لیکن حادث [2] نہیں موجود ہے (مگر پہلے) معدوم نہ تھا۔ ہر چیز کے ساتھ ہے لیکن پاس نہیں اور ہر چیز سے مغائر ہے مگر جدا نہیں۔ فاعل ہے لیکن نہ بمعنی حرکات و آلہ (اس وقت سے) بینا ہے جب اس کی مخلوق سے کوئی چیز قابل نظر نہ تھی (اس وقت سے) تنہا ہے جب کوئی ہم جلیس نہ تھا جس سے مانوس ہوتا اور جس کے مفقود ہونے سے گھبراتا۔

خلق کو بوجہ اتم پیدا کیا اور اس کو ایجاد کیا جو حق ہے ایجاد کرنے کا (یہ سب) بغیر کوئی فکر کیے یا کسی طرح کا تجربہ حاصل کیے اور بغیر کچھ (نقل و) حرکت کیے اور بغیر تردد نفس کے جس میں مضطرب ہوا ہو، کل چیزوں کو ان کے

---

[1] ''فَمَنْ وَّصَفَ اللّٰهَ'' سے یہاں تک حضرتؑ نے دعوئے سابقہ کی تاکید اور توضیح فرمائی ہے کہ اگر خدا کی کوئی صفت زائد بر ذات مانی جائے تو اس کو اس کا ہمسر مانا جائے گا کیونکہ وہ صفت بھی خدا کی طرح قدیم ہوگی اور جب اس کو ہمسر مان لیا تو دو قدیم کے قائل ہوئے جس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک قدیم اس کی ذات ہے اور دوسرا قدیم اس کی صفت ہے اور جب یہ اعتقاد کر لیا تو خدا کا جز و قرار دیا ایک اس کی ذات جو خالی تھی صفت سے اور دوسری صفت جو علیحدہ تھی ذات سے دونوں سے مل کر خدا ہوا، پس خدا مرکب ٹھہرا اور یہ اعتقاد عین جہالت ہے کیونکہ مرکب ہونا خاصہ ہے جسمانی چیزوں کا پس خدا کو جسمانی ماننا پڑے گا اور جب جسمانی مانا تو جس طرح دوسرے اجسام کی طرف اشارہ کرتے ہیں اسی طرح اس کی طرف اشارہ کرنے کا بھی اعتقاد ہوگا اور جب اشارہ کیا تو تسلیم کیا کہ وہ محدود ہے یعنی فلاں طرف ہے جب ہی تو اشارہ ہوگا اور اس کو شمار کیا کہ وہ اس حد کے اندر ہے۔

[2] جب حضرتؑ خدا کی صفات سلبیہ اور اوصاف ممتنعہ کا ذکر کر چکے تو یہاں سے اس کے صفات ثبوتیہ کو بیان فرماتے ہیں کہ وہ ہے لیکن ایسا نہیں کہ پہلے نہ تھا جس طرح اس کی مخلوق کہ وہ بھی ہے لیکن ایسی کے پہلے نہ تھی بہ خلاف خدا کے کہ اب بھی ہے اور پہلے بھی تھا کوئی زمانہ ایسا نہ ملے گا جس میں اس کا وجود نہ رہا ہو۔ بقیہ مطالب ضمیمہ میں آئیں گے۔

نَفْسٍ اضْطَرَبَ فِيْهَا. اَحَالَ الْاَشْيَآءَ لِاَوْقَاتِهَا، وَ لَـئَمَ بَيْنَ مُخْتَلِفَاتِهَا، وَ غَرَّزَ غَرَآئِزَهَا وَ اَلْزَمَهَا اَشْبَاحَهَا. عَالِمًا بِهَا قَبْلَ ابْتِدَآئِهَا، مُحِيْطًا بِحُدُوْدِهَا وَ انْتِهَآئِهَا، عَارِفًا بِقَرَآئِنِهَا وَ اَحْنَآئِهَا.

مقرر وقت میں پیدا کیا اور ان کے مختلف اجزا میں ترکیب دیا۔ اور ہر ایک کے خواص ولوازم طبیعت کو پیدا کیا اور ان کی قسموں یا شخصوں کے لیے لازم کر دیا جن کو ایجاد کے پہلے سے جانتا، جن کے حدود وانتہا پر (اس کا علم) حاوی تھا اور ان کے مناسبات اور (ہر پہلو) جوانب[1] سے وہ واقف تھا۔

ثُمَّ اَنْشَاَ ـ سُبْحَانَهٗ ـ فَتْقَ الْاَجْوَآءِ، وَ شَقَّ الْاَرْجَآءِ، وَ سَكَآئِكَ الْهَوَآءِ[2]، فَاَجْرٰى فِيْهَا مَآءً مُّتَلَاطِمًا تَيَّارُهٗ، مُتَرَاكِمًا زَخَّارُهٗ، حَمَلَهٗ عَلٰى مَتْنِ الرِّيْحِ الْعَاصِفَةِ، وَ الزَّعْزَعِ الْقَاصِفَةِ، فَاَمَرَهَا بِرَدِّهٖ، وَ سَلَّطَهَا عَلٰى شَدِّهٖ، وَ قَرَنَهَا اِلٰى

پھر اس نے فضاؤں کی کشادگی اور اطراف کی فراخی اور ہوا کے آنے جانے کی راہوں اور (خلا) کو پیدا کیا۔ پھر اس میں پانی جاری کیا جس کی موجیں متلاطم اور جس کا ذخیرہ تہ بتہ تھا (اور) جس کو تیز ہوا اور تند آندھی پر بار کر دیا، پھر اس (پانی) کے روکے رکھنے پر اس (ہوا) کو مامور اور اس کے محکم کرنے پر مسلط کر دیا اور اس کو پانی کی حد سے ملا دیا

---

[1] مقصود یہ ہے کہ خدا نے جن چیزوں کو پیدا کیا ان کی طبیعت کے خواص وآثار بھی ان میں ودیت فرما دیے اور پھر ان خواص وآثار کو ان چیزوں کے لیے لازم کر دیا کہ ان سے علیحدہ نہیں ہو سکتے اور یہ حق ہے کیونکہ ہر شخص اور ہر چیز ایک ایسی طبیعت کے ساتھ پیدا ہوئی ہے جو اس کے لیے لازم ہے کہ کبھی جدا نہیں ہو سکتی مثلاً انسان میں تعجب کرنے یا ہنسنے کا خاصہ ضرور ہی رہے گا، شیر سے شجاعت کی صفت کبھی جدا نہیں ہو سکتی، لومڑی سے مکر وفریب زائل نہیں ہو سکتا۔

[2] یہاں حضرتؑ نے تین لفظ ذکر کیے ہیں ''اَجْوَآءِ۔ اَرْجَآءِ۔ سَكَآئِكَ الْهَوَآءِ''۔ ''اَجْوَآءٌ''، جمع ہے جَوٌّ کی اور جَوٌّ اس فضا کو کہتے ہیں جو زمین سے آسمان تک ہے یعنی زمین سے آسمان تک جو خالی ہے اس وسعت کو جَوّ کہتے ہیں۔ ''اَرْجَآءٌ'' جمع ہے رَجَا کی جس کے معنی کنارہ کے ہیں اور مراد اس سے فضا کا وہ حصّہ ہے جو نیچے زمین سے متصل ہے اور ''سَكَآئِكَ''، جمع ہے سَكَاكَةٌ کی اور یہ فضا کا وہ حصّہ ہے جو زمین سے اوپر آسمان سے ملا ہوا ہے لیکن چونکہ اردو میں خاص لفظ ہر ایک کے لیے علیحدہ علیحدہ نہیں ملتا لہٰذا ترجمہ میں گویا ہم معنی لفظ لکھ دیے گئے اور فرق کو اس حاشیہ سے واضح کر دیا گیا۔ پس حضرتؑ کا مقصود یہ ہے کہ خدا نے آسمان اور زمین کی درمیان کی پوری فضا اور نیز زمین کے قریب کی اور آسمان کے قریب کی خاص فضا کو پیدا کیا۔ علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ اس کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فضا جو تمام اجسام کا حیّز ہے خدا کی پیدا کی ہوئی ہے اور یہ کہ یہ پہلے نہ تھی اور یہ تحقیق غلط نہیں ہے کیونکہ بعض حکما بھی اس کے قائل ہیں کہ فضا مخلوق ہے اور پہلے معدوم تھی اور یہ بھی ایک لطیف جسم ہے جو دوسرے اجسام سے مشابہ نہیں ہے اور بعض حکما نے اس کو مجرد کہا ہے۔

حَدِّهٖ، اَلْهَوَآءُ مِنْ تَحْتِهَا فَتِيْقٌ وَّ الْمَآءُ مِنْ فَوْقِهَا دَفِيْقٌ.

ثُمَّ اَنْشَاَ سُبْحَانَهٗ رِيْحًا اِعْتَقَمَ مَهَبَّهَا، وَ اَدَامَ مُرَبَّهَا، وَ اَعْصَفَ مَجْرَاهَا، وَ اَبْعَدَ مَنْشَاهَا، فَاَمَرَهَا بِتَصْفِيْقِ الْمَآءِ الزَّخَّارِ، وَ اِثَارَةِ مَوْجِ الْبِحَارِ، فَمَخَضَتْهُ مَخْضَ السِّقَآءِ، وَ عَصَفَتْ بِهٖ عَصْفَهَا بِالْفَضَآءِ، تَرُدُّ اَوَّلَهٗ اِلٰٓى اٰخِرِهٖ، وَ سَاجِيَهٗ اِلٰى مَآئِرِهٖ حَتّٰى عَبَّ عُبَابُهٗ، وَ رَمٰى بِالزَّبَدِ رُكَامُهٗ، فَرَفَعَهٗ فِيْ هَوَآءٍ مُّنْفَتِقٍ، وَ جَوٍّ مُّنْفَهِقٍ، فَسَوّٰى مِنْهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ، جَعَلَ سُفْلَاهُنَّ مَوْجًا

(اس طرح کہ) خلا اس کے نیچے کشادہ اور پانی اس کے اوپر بہا ہوا ہے۔[1]

پھر ایک (دوسری) ہوا پیدا کی جس کے ہر طرف بہنے کو روکا اور ایک ہی جگہ اس کو قائم رکھا اور رفتار میں تیزی دی اور اس کے منشا کو بہت دور رکھا۔ پھر اس (ہوا) میں اس زخّار پانی کے تھپیڑہ دینے اور سمندروں کے موج زن کرنے کی خاصیت عطا کی۔ پس اس (ہوا) نے فضا میں پانی کو مشک کی طرح جنبش دی اور اس قوت سے ہلایا کہ اوپر کو نیچے اور ساکن کو متحرک کی طرف پھیر (کرتہ و بالا) کرتی تھی یہاں تک کہ اس پانی کا اوپر کا حصّہ بلند ہو گیا اور اس کے خزانہ نے جھاگ پھینک دیا، پھر اس جھاگ کو (جو پانی کے بخارات ہیں) خدا نے کشادہ خلا اور وسیع فضا میں اونچا کیا اور اس سے سات آسمان پیدا کیے۔[2] جو آسمان

---

[1] ''اَجْرٰى فِيْهَا مَآءً مُّتَلَاطِمًا'' سے یہاں تک حضرتؑ نے اس مسئلہ کو بیان فرمایا ہے کہ خدا نے آسمان و زمین کے درمیانی حصّہ کو اجسام کے لیے حیّز اور مکان قرار دیا ہے اور اس میں پانی کو پیدا کر کے جاری کر دیا پھر آندھی ایسی تیز ہَوا پیدا کی اور اسی ہوا کے اوپر اس پانی کو رکھا اور اس تیز ہوا میں اس کی قوت بخشی کہ اس پانی کو روکے رکھے تا کہ وہ اوپر سے نیچے نہ گرنے پائے کہ اگر نیچے گر جاتا تو جس غرض کے لیے خدا نے اس کو پیدا کیا تھا وہ فوت ہو جاتی پس اب صورت یہ ہوئی کہ اوپر پانی ہے اس کے نیچے ایک تیز اور مضبوط ہَوا ہے جو اس کو روکے ہوئے ہے اور اس ہوا کے نیچے فضا ہے جو خالی جگہ آسمان کی طرف نظر آتی ہے۔

[2] یعنی پھر خدا نے اس تیز اندھی کے اوپر جس پر پانی تھا ایک اور ہَوا پیدا کی جو تھی تو نہایت تیز لیکن صرف اس کا ایک ہی مصرف تھا کہ اس پانی کو خوب اچھی طرح ہلائے اور اس میں تموّج پیدا کرے جس طرح مشک میں پانی یا دودھ کے ہلانے سے اس میں کف اور جھاگ پیدا ہو جاتا ہے اسی طرح اس ہَوا کو پیدا کیا تا کہ وہ اس پانی کو پوری طرح ہلا کر اس میں کف اور جھاگ پیدا کر دے اور چونکہ اس کے سوائے اور کوئی غرض اس ہَوا کے پیدا کرنے کی نہ تھی لہٰذا اوصاف کو اس سے سلب کر لیا اسی حلقہ میں اس کو محدود کر دیا جس کی طرف '' اَدَامَ مُرَبَّهَا'' سے اشارہ فرمایا ہے۔ پس اس ہوا نے اس پانی کو ہلا کر اس میں کف پیدا کر دیا جو بخارات تھے پس اسی کف (بخارات) سے خدا نے سات آسمان پیدا کیے چنانچہ علم ہیئت کی تحقیقات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ پہلے صرف پانی ہی پانی تھا، اس میں خدا کی قدرت سے حرارت پیدا ہوئی، اسی سے جھاگ نکلا پھر اسی سے بخارات بلند ہوئے اور (بقیہ صفحہ مابعد)

مَكْفُوْفًا وَ عُلْيَاهُنَّ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا، وَ سَمْكًا مَّرْفُوْعًا بِغَيْرِ عَمَدٍ يَّدْعَمُهَا، وَ لَا دِسَارٍ يَّنْظِمُهَا. ثُمَّ زَيَّنَهَا بِزِيْنَةِ

سب سے نیچا تھا اس کو (تو مثل) تھمی ہوئی موج کے اور جو سب سے اونچا تھا اس کو (مانند) محفوظ چھت اور بلند بام کے قرار دیا جس کے نہ کوئی ستون ہے جو روکے اور نہ میخ ہے جو اسے جوڑے۔[1] پھر ان (آسمانوں) کو کواکب کی

(بقیہ صفحہ ماقبل) ان بخارات سے آسمان بنایا گیا اور جھاگ سے زمین بنی۔

علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں ''بہت سے حکما کا یہی مذہب ہے جو حضرتؑ نے بیان فرمایا۔ چنانچہ ان میں ''تالیس الاسکندرانی'' بھی ہے جو اس کا قائل ہے کہ کل عناصر کی اصل پانی ہے کیونکہ جب وہ منجمد ہوگیا تو زمین بن گئی اور جب اس میں لطافت پیدا ہوگئی تو ہوا پیدا ہوئی اور مستحیل ہوکر آگ ہوگئی۔ تورات کے سفر اول کی ابتدا میں بھی اسی طرح کا کلام ہے کہ خدا نے ایک جوہر کو پیدا کیا اور پھر اس کی طرف ہیبت سے نظر کی تو اس کے اجزا پگھل گئے جس سے پانی بنا پھر اس پانی سے بخارات دھواں کی طرح اٹھے تو اس سے خدا نے آسمانوں کو پیدا کیا اور اس پانی کے اوپر کف جمع ہوگیا تو اس سے خدا نے آسمانوں کو پیدا کیا''۔ اور آسمانوں کے دھواں ایسے بخار سے پیدا ہونے کا اشارہ قرآن مجید میں بھی ہے چنانچہ خدا نے فرمایا ہے:

﴿ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ وَ هِيَ دُخَانٌ۔۔۔ فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ﴾ (سورۂ فصلت، آیہ ۱۱۔۱۲)

یعنی خدا پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ اس وقت دھواں تھا تو اس دھوئیں سے سات آسمان بنائے۔

اسی طرح احادیث ائمہ طاہرین میں بھی یہ مضمون موجود ہے۔ (چونکہ یہ نہایت عظیم الشان مسئلہ علمِ ہیئت کا ہے لہٰذا اس کی کافی اور محققانہ تفصیل ضمیمہ میں آئے گی انشاءاللہ)

[1] سب سے نیچے آسمان کو ''مَوْجٌ مَكْفُوْفٌ'' سے تشبیہ دی ہے کہ جس طرح موج پانی سے اونچی ہوتی ہے اسی طرح یہ آسمان بھی بلند ہے اور جو رنگ موج کا ہوتا ہے وہی قریب قریب اس نیچے کے آسمان کا بھی ہے۔ اور ''مَكْفُوْفٌ'' سے مطلب یہ ہے کہ خدا نے اس کو روک رکھا ہے ورنہ نیچے زمین پر آجاتا۔ اس کے بعد ''سَقْفًا مَّحْفُوْظًا'' فرمایا ہے جو قرآن مجید کی ان آیات ﴿ وَ جَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا﴾ (سورۂ الانبیاء، آیہ ۳۲) ''ہم ہی نے آسمان کو چھت بنایا جو ہر طرح محفوظ ہے''

﴿وَ حَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ﴾ (سورۂ الحجر، آیہ ۱۷) اور ہر شیطان مردود کی آمد و رفت سے آسمانوں کو محفوظ رکھا۔ وغیرہ کے مثل ہے اور ''سَمْكًا مَّرْفُوْعًا بِغَيْرِ عَمَدٍ يَّدْعَمُهَا'' سے مطلب یہ ہے کہ آسمانوں کے قیام کے لیے کوئی ستون اور پایہ نہیں ہے اور یہ اس آیہ: ﴿خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا﴾ (سورۂ لقمان، آیہ ۱۰) یعنی خدا نے بغیر ستون کے آسمانوں کو بنایا جن کو تم دیکھتے ہو۔

اور آیہ: ﴿وَ يُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ﴾ (سورۂ حج، آیہ ۶۵) یعنی خدا آسمان کو روکے ہوئے ہے کہ زمین پر نہ گر پڑے مگر جب اس کی اجازت ہو کے مثل ہے۔

پس مقصود یہ ہے کہ صرف قدرت خداوند عالم سے یہ آسمان کھڑے ہیں اور کسی ستون یا میخ یا رسّی وغیرہ کی محتاج نہیں۔ (بقیہ صفحہ مابعد)

الْكَوَاكِبِ، وَ ضِيَآءِ الثَّوَاقِبِ وَ اَجْرٰى فِيْهَا سِرَاجًا مُّسْتَطِيْرًا، وَ قَمَرًا مُّنِيْرًا فِيْ فَلَكٍ دَآئِرٍ، وَ سَقْفٍ سَآئِرٍ، وَ رَقِيْمٍ مَّآئِرٍ.

ثُمَّ فَتَقَ مَا بَيْنَ السَّمٰوٰتِ الْعُلَا، فَمَلَاَهُنَّ اَطْوَارًا مِّنْ مَلٰٓئِكَتِهٖ:

زینت اور روشن ستاروں کی چمک سے آراستہ کیا اور ان میں ایک چراغ درخشندہ (آفتاب) اور ایک مہتاب تاباں جاری کیا۔[1] (جو) گھومنے والی فلک، چکر لگانے والے آسمان اور متحرک لوح میں (ہے)۔

پھر بلند آسمانوں کو کشادہ کیا اور طرح طرح کے فرشتوں سے ان کو بھر دیا۔[2]

---

[1] آسمانوں کی زینت کا ستاروں سے ہونا واضح اور بدیہی ہے قرآن مجید میں بھی ہے:

﴿اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ۨ الْكَوَاكِبِ﴾ (سورۂ صافات، آیہ ۶)

یعنی ہم ہی نے نیچے والے آسمان کو تاروں کی آرائش سے آراستہ کیا۔

اور آسمانوں میں آفتاب و مہتاب کے پیدا ہونے کے متعلق یہ آیہ ہے:

﴿وَّ جَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّ جَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا﴾ (سورۂ نوح، آیہ ۱۶)

یعنی خدا ہی نے آسمانوں میں چاند کو نور اور سورج کو روشن چراغ بنایا۔

(ان کل امور کی تفصیل وجود سماء کا اثبات آفتاب و مہتاب کے آسمان میں ہونے کے متعلق فلسفہ جدیدہ کی تحقیقات اور اسلامی بیانات میں تطبیق ضمیمہ میں آئے گی انشاء اللہ) اور حضرتؑ کا کلام ''فَتَقَ مَا بَيْنَ السَّمٰوٰتِ الْعُلَا'' قرآن مجید کے آیہ:

﴿اَوَ لَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا﴾ (سورۂ انبیاء، آیہ ۳۰)

یعنی کیا کافروں نے اس پر غور نہیں کیا کہ آسمان اور زمین دونوں بستہ تھے تو ہم نے دونوں کو شگافتہ کیا، کے مثل ہے۔

[2] یہاں سے ملائکہ کی خلقت اور ان کے اقسام بیان فرماتے ہیں۔ علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں ''فرقہ معتزلہ کی تحقیق میں فرشتہ ایک نوری حیوان ہے بعض ان میں سے بالکل صاف شفاف بغیر کسی رنگ کے ہیں مثل ہوا کے اور بعض کا رنگ مثل آفتاب کے ہے اور فرشتہ ویسے ہی قادر، عالم، اور زندہ ہیں جیسے ہم لوگ اور ویسے ہی مکلف ہیں جیسے ہم لوگ۔

اور حضرت امیر المومنینؑ نے اس فصل میں ان کی چار قسمیں کی ہیں۔ پہلی قسم کے فرشتے عبادت کرنے والے ہیں جن سے بعض ہمیشہ سجدہ ہی میں رہتے ہیں اور بعض ہمیشہ رکوع ہی میں اور بعض خدا کے حضور میں صف بستہ ہیں، نماز وغیرہ عبادات میں مشغول رہتے ہیں کہ کبھی ان کی صف ٹوٹتی نہیں اور بعض ایسے ہیں جو شب و روز تسبیح و تحمید خداوند عالم میں مصروف رہتے ہیں جس سے کبھی تھکتے نہیں۔ دوسری قسم کے وہ فرشتے ہیں جو وحی الٰہی کو رسولوں تک پہنچا کر احکام خدا کو بندوں تک پہنچاتے ہیں اور اس کے قضا و قدر کے فرمان لے کر آتے جاتے ہیں۔ تیسری قسم کے فرشتے دو طرح کے ہیں ایک وہ ہیں جو بندوں کے محافظ ہیں جیسے کرام کاتبین یا وہ فرشتے جو مصائب و آفات سے بندوں کو اکثر اوقات خدا کی طرف سے بچاتے ہیں کہ اگر یہ نہ ہوتے تو بہت کم انسان آفات سے محفوظ رہا کرتے۔ دوسرے وہ جو بہشتوں کے دربانی کی خدمت پر مقرر ہیں۔ چوتھی قسم کے وہ فرشتے ہیں جو عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں''۔ (بقیہ صفحہ ماقبل)

مِنْهُمْ سُجُوْدٌ لَّا يَرْكَعُوْنَ، وَ رُكُوْعٌ لَّا يَنْتَصِبُوْنَ، وَ صَآفُّوْنَ لَا يَتَزَايَلُوْنَ، وَ مُسَبِّحُوْنَ لَا يَسْأَمُوْنَ، لَا يَغْشَاهُمْ نَوْمُ الْعُيُوْنِ، وَ لَا سَهْوُ الْعُقُوْلِ، وَ لَا فَتْرَةُ الْأَبْدَانِ، وَ لَا غَفْلَةُ النِّسْيَانِ.

جن میں سے بعض سجدہ میں ہیں رکوع کرتے ہی نہیں اور بعض رکوع میں ہیں کھڑے ہوتے ہی نہیں اور بعض صف بستہ جو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے اور بعض تسبیح کرنے والے ہیں جو نہ تھکتے ہیں نہ ان کی آنکھوں میں نیند سماتی ہے نہ عقلوں میں سہو نہ جسموں میں تکان نہ نسیان والی غفلتیں۔

(بقیہ صفحہ ماقبل) یہ بھی واضح رہے کہ ان کل اقسام کا ذکر خدا نے کلام مجید میں بھی فرمایا ہے۔

چنانچہ سجدہ کرنے والوں کے بارے میں فرماتا ہے:

﴿وَ لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضِ﴾ (سورۂ رعد، آیہ ۱۵)

کہ آسمان اور زمین میں جو فرشتے جن اور انس ہیں خدا کا سجدہ کرتے ہیں۔

﴿وَ لَهٗ يَسْجُدُوْنَ﴾ (سورۂ اعراف، آیہ ۲۰۶) یعنی ''فرشتے خدا کا سجدہ کرتے رہتے ہیں'' اور صف بستہ فرشتوں کے بارے میں فرماتا ہے ﴿وَّ اِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ﴾ (سورۂ صافات، آیہ ۱۶۵) یعنی ''فرشتے کہتے ہیں کہ ہم خدا کی عبادت میں صف باندھے کھڑے رہتے ہیں'' اور تسبیح سے نہ تھکنے والوں کے بارے میں فرماتا ہے:

﴿يُسَبِّحُوْنَ لَهٗ بِالَّيْلِ وَ النَّهَارِ وَ هُمْ لَا يَسْئَمُوْنَ﴾ (سورۂ فصلت، آیہ ۳۸)

کہ وہ فرشتے دن رات خدا کی تسبیح کرتے رہتے ہیں اور ذرا نہیں تھکتے۔

اور ان کے جسموں میں تکان نہ ہونے کے بارے میں فرماتا ہے ﴿يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ﴾ (سورۂ انبیاء، آیہ ۲۰) کہ ''وہ فرشتے دن رات تسبیح کرتے ہیں اور ان کے جسموں میں تکان نہیں ہوتا'' اور وحی خدا کے امین فرشتوں کے بارے میں فرماتا ہے ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ﴾ (سورۂ الشعراء، آیہ ۱۹۳) یعنی ''اے رسول، خدا نے امین فرشتہ کو تمہارے قلب پر نازل کیا'' اور ''اَلْسِنَةٌ اِلٰى رُسُلِهٖ'' کے بارے میں فرماتا ہے ﴿جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا﴾ (سورۂ فاطر، آیہ ۱) کہ ''خدا نے فرشتوں کو پیغام پہنچانے والا قرار دیا'' اور قضا و حکم الٰہی کے لے کر آنے جانے والے فرشتوں کے بارے میں فرماتا ہے:

﴿تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ الرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ﴾ (سورۂ القدر، آیہ ۴)

کہ ہر امر کو لے کر فرشتے شب قدر میں خدا کی اجازت سے نیچے آتے ہیں۔

اور بندوں کی حفاظت کرنے والے فرشتوں کے متعلق فرماتا ہے: ﴿وَ يُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً﴾ (سورۂ الانعام، آیہ ۶۱) کہ ''خدا حفاظت کرنے والے فرشتوں کو تمہارے پاس بھیجتا ہے'' اور حاملانِ عرش فرشتوں کے متعلق فرماتا ہے:

﴿وَ يَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ﴾ (سورۂ الحاقہ ۱۷، آیہ)

یعنی اس دن خدا کے عرش کو آٹھ فرشتے اٹھائے ہوں گے۔

وَ مِنْهُمْ اُمَنَآءُ عَلٰى وَحْيِهٖ، وَ اَلْسِنَةٌ اِلٰى رُسُلِهٖ، وَ مُخْتَلِفُوْنَ بِقَضَآئِهٖ وَ اَمْرِهٖ. وَ مِنْهُمُ الْحَفَظَةُ لِعِبَادِهٖ، وَ السَّدَنَةُ لِاَبْوَابِ جِنَانِهٖ. وَ مِنْهُمُ الثَّابِتَةُ فِي الْاَرَضِيْنَ السُّفْلٰى اَقْدَامُهُمْ، وَ الْمَارِقَةُ مِنَ السَّمَآءِ الْعُلْيَا اَعْنَاقُهُمْ، وَ الْخَارِجَةُ مِنَ الْاَقْطَارِ اَرْكَانُهُمْ، وَ الْمُنَاسِبَةُ لِقَوَآئِمِ الْعَرْشِ اَكْتَافُهُمْ، نَاكِسَةٌ دُوْنَهٗ اَبْصَارُهُمْ، مُتَلَفِّعُوْنَ تَحْتَهٗ بِاَجْنِحَتِهِمْ، مَضْرُوْبَةٌ بَيْنَهُمْ وَ بَيْنَ مَنْ دُوْنَهُمْ حُجُبُ الْعِزَّةِ، وَ اسْتَارُ الْقُدْرَةِ، لَا يَتَوَهَّمُوْنَ رَبَّهُمْ بِالتَّصْوِيْرِ، وَ لَا يُجْرُوْنَ عَلَيْهِ صِفَاتِ الْمَصْنُوْعِيْنَ، وَ لَا يَحُدُّوْنَهٗ بِالْاَمَاكِنِ، وَ لَا يُشِيْرُوْنَ اِلَيْهِ بِالنَّظَآئِرِ.

ان میں سے بعض وحی خدا کے امین، اس کے رسولوں تک پیغام رسانی کے ذریعہ اور اس کے قضا (وقدر) اور حکم کو لے کر آنے جانے والے ہیں اور بعض بندگان خدا کے حافظ اور (بعض) اس کے دروازہ ہائے جنت کے دربان ہیں۔ اور بعض ایسے ہیں جن کے قدم تو تحت الثریٰ میں جمے ہوئے اور گردنیں بلند ترین آسمان کے (بھی) پار۔ اور پہلو و جوانب اطراف (عالم) سے (بھی) باہر اور شانے عرش کے پایوں سے لگے ہوئے ہیں۔ ان کی آنکھیں عرش کے نیچے گڑی ہوئی اور (خود یہ فرشتے) اس کے نیچے اپنے پیروں میں لپٹے ہوئے ہیں۔ ان کے اور ان سے نیچے والوں کے درمیان (خدا کی) عزت کے حجاب اور قدرت کے پردے پڑے ہیں (یہ لوگ) اپنے رب کا تو ہم (بھی) کسی تصویر سے نہیں کرتے اور نہ صفات مخلوق سے اس کو متصف کرتے ہیں۔ نہ کسی مکان یا جگہ سے اسے محدود کرتے ہیں اور نہ کسی شبیہ ونظیر کے ذریعہ سے اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

[صِفَةُ خَلْقِ اٰدَمَ عَلَيْهِ السَّلَام]

خلقت (حضرت) آدم علیہ السلام کی کیفیت

ثُمَّ جَمَعَ سُبْحَانَهٗ مِنْ حَزْنِ الْاَرْضِ وَ سَهْلِهَا، وَعَذْبِهَا وَ سَبَخِهَا، تُرْبَةً سَنَّهَا بِالْمَآءِ حَتّٰى خَلَصَتْ، وَ لَاطَهَا بِالْبَلَّةِ حَتّٰى لَزَبَتْ، فَجَبَلَ مِنْهَا صُوْرَةً ذَاتَ اَحْنَآءٍ وَّ

پھر خدائے تعالیٰ نے سخت، نرم، شیریں اور شور زمیں سے مٹی جمع کی جس کو پانی سے بھگویا کہ خالص ہوگئی اور تر کر کے اس کو گوندھا کہ لسدار ہوگئی، پھر اس سے ایک صورت پیدا کی۔[1] جس کے اطراف و جوانب جوڑ بند۔ اور اعضاء

---

[1] خلقت آدم کے بارے میں قدیم الایام سے اختلاف چلا آتا ہے مسلمان اور جتنے لوگ آسمانی مذہب کے پیرو ہیں خواہ یہود ہوں خواہ نصاریٰ وہ سب اس کے قائل ہیں کہ زمانہ حادث ہے اور جو چیز موجودات عالم سے ہے وہ سب حادث ہے کہ پہلے نہ تھی اب ہوگئی۔ یہ لوگ صرف ذات باری کو قدیم مانتے ہیں اس لیے ان سب کا عقیدہ یہی ہے کہ نوعِ انسانی کے پہلے شخص حضرت آدمؑ (بقیہ صفحہ مابعد)

(بقیہ صفحہ ماقبل) ہیں جن کی خلقت کا قصہ اس طرح پر قرآن میں بھی موجود ہے۔ خاص کر سورۂ بقرہ، اعراف، حجر، بنی اسرائیل، کہف، طٰہٰ، اور ص میں جیسے:

﴿اِنَّ مَثَلَ عِیۡسٰی عِنۡدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَہٗ مِنۡ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ﴾ (سورۂ آل عمران، آیہ ۵۹) جیسے ﴿وَ اِذۡ قَالَ رَبُّکَ لِلۡمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیۡ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنۡ صَلۡصَالٍ مِّنۡ حَمَاٍ مَّسۡنُوۡنٍ ۝ فَاِذَا سَوَّیۡتُہٗ وَ نَفَخۡتُ فِیۡہِ مِنۡ رُّوۡحِیۡ فَقَعُوۡا لَہٗ سٰجِدِیۡنَ﴾ (سورۂ الحجر، آیہ ۲۸۔۲۹)

یا جیسے ﴿اِذۡ قَالَ رَبُّکَ لِلۡمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیۡ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنۡ طِیۡنٍ ۝ فَاِذَا سَوَّیۡتُہٗ وَ نَفَخۡتُ فِیۡہِ مِنۡ رُّوۡحِیۡ فَقَعُوۡا لَہٗ سٰجِدِیۡنَ ۝ فَاِذَا سَوَّیۡتُہٗ وَ نَفَخۡتُ فِیۡہِ مِنۡ رُّوۡحِیۡ فَقَعُوۡا لَہٗ سٰجِدِیۡنَ ۝ فَسَجَدَ الۡمَلٰٓئِکَۃُ کُلُّہُمۡ اَجۡمَعُوۡنَ اِلَّاۤ اِبۡلِیۡسَ ؕ اَبٰی وَ اسۡتَکۡبَرَ وَ کَانَ مِنَ الۡکٰفِرِیۡنَ ۔ قَالَ یٰۤاِبۡلِیۡسُ مَا مَنَعَکَ اَنۡ تَسۡجُدَ لِمَا خَلَقۡتُ بِیَدَیَّ ؕ اَسۡتَکۡبَرۡتَ اَمۡ کُنۡتَ مِنَ الۡعَالِیۡنَ ۔ قَالَ اَنَا خَیۡرٌ مِّنۡہُ ؕ خَلَقۡتَنِیۡ مِنۡ نَّارٍ وَّ خَلَقۡتَہٗ مِنۡ طِیۡنٍ﴾۔ (سورۂ ص، آیہ ۷۱۔۷۶)

ان سب کا خلاصۂ مضمون وہی ہے جس کو حضرت امیر المومنینؑ نے ارشاد فرمایا ہے اور تورات میں بھی اور تمام احادیث مسلّمہ اہل اسلام میں اسی طرح قبول کیا گیا ہے جیسا کہ اس خطبہ میں مذکور ہے۔ اس عقیدہ میں شریک ہیں اکثر مجوسی بھی مگر وہ آدم ایک دوسرے شخص کیومرث کو بتلاتے ہیں اور ان آدم کی اوّلویت کے قائل نہیں ہیں اور اس کی خلقت کے متعلق بھی ان کے خیالات جداگانہ ہیں۔ رہے فلاسفہ وہ چونکہ عالم کو قدیم مانتے ہیں اس لیے وہ نوع انسانی کے لیے کسی شخص کی اوّلیت کے قائل نہیں ہیں بلکہ حیوانات وغیرہ کے لیے بھی کسی کو اول نہیں مانتے کیونکہ وہ مادہ کو قدیم جانتے ہیں لہٰذا ان کے عقیدہ میں دنیا یوں ہی رہی اور یوں ہی رہے گی۔

فلسفہ جدیدہ کا مشہور حکیم نیوٹن لکھتا ہے کے خلاف نیچر معلوم ہوتا ہے کہ انسان ساذی عقل و ہوش جو سائر حیوانات سے اشرف ہے وہ یوں ہی دفعۃً واحدۃً پیدا ہو جائے لہٰذا یہ سلسلہ قائم کیا کہ انسان پہلے ایک کیڑا تھا لوٹ پوٹ کرتا ہوا بڑھتا گیا یہاں تک کہ بندر ہوا اس کے بعد انسان ہوا جس کے اثبات کے لیے آج تک ہزار ہا کوششیں ہو رہی ہیں لیکن کوئی کوشش اعتراض اور خدشہ سے خالی نہیں اور جو ادلہ پیش کیے جاتے ہیں وہ بھی تحقیق کے خلاف ثابت ہوتے ہیں حتّٰی کہ حکمائے یورپ و امریکہ کا بھی اس پر اتفاق نہیں اور جو لوگ قائل ہیں ان کو بھی اس کا یقین نہیں (جس کے شواہد ضمیمہ میں آئیں گے)۔

اور جو لوگ حضرت آدمؑ کی خلقت کے قائل ہیں اور کلام مجید اور احادیث کے بیان کو صحیح سمجھتے ہیں ان میں اس امر میں اختلاف ہے کہ یہ سب قصہ حضرت آدمؑ کا جو تورات اور قرآن مجید و کتب احادیث میں مذکور ہے یعنی ان کا خاک سے پیدا ہونا اور ملائکہ کو سجدہ کا حکم ہونا، پھر ابلیس کا ان کو دھوکا دینا اور بہشت سے نکلنا اور زمین کو آباد کرنا، آیا حضرت آدمؑ نبی اللہ سے متعلق ہے جو ابوالبشر بھی کہے جاتے ہیں اور آدم بھی یا تمام بنی آدم سے۔ جو لوگ فلسفہ نیوٹن کے معتقد ہیں وہ جب نہ صانع عالم کے قائل ہیں نہ کسی شخص معین کو آدم مانتے ہیں تو اس قصّہ کو کیوں ماننے لگے؟ اسی وجہ سے نیچریوں نے آدم سے انکار کر کے بنی آدم سے اس قصّہ کو متعلق کیا ہے اور قصّہ کے بھی واقعیت کے نہیں قائل ہیں بلکہ فرضی اور بطور مثال بتلاتے ہیں اور جو لوگ کتب سماوی کے پیرو ہیں وہ اسی طرح قبول کرتے ہیں جس طرح پر آیات و احادیث میں مذکور ہے اور ان سب واقعات کو اصلی اور حقیقی سمجھتے ہیں نہ فرضی یا مثالی۔ اسی طرح جنت و نار میں بھی اختلاف ہے کہ اس سے کیا مراد ہے؟ حقیقی جنت یا خیالی آرام و خوشی؟ پھر اس میں بھی اختلاف ہے کہ شیطان سے (بقیہ صفحہ مابعد)

وُصُوْلٍ، وَ اَعْضَآءٍ وَّ فُصُوْلٍ، اَجْمَدَهَا حَتّٰی اسْتَمْسَکَتْ، وَ اَصْلَدَهَا حَتّٰی صَلْصَلَتْ، لِوَقْتٍ مَّعْدُوْدٍ، وَ اَمَدٍ مَّعْلُوْمٍ.

ثُمَّ نَفَخَ فِیْهَا مِنْ رُّوْحِهٖ فَمَثُلَتْ اِنْسَانًا ذَا اَذْهَانٍ یُّجِیْلُهَا، وَ فِکَرٍ یَّتَصَرَّفُ بِهَا، وَ جَوَارِحَ یَخْتَدِمُهَا، وَ اَدَوَاتٍ یُّقَلِّبُهَا، وَ مَعْرِفَةٍ یَفْرُقُ بِهَا بَیْنَ الْحَقِّ وَ الْبَاطِلِ، وَ الْاَذْوَاقِ وَ الْمَشَامِّ، وَ الْاَلْوَانِ وَ الْاَجْنَاسِ، مَعْجُوْنًا بِطِیْنَةِ الْاَلْوَانِ الْمُخْتَلِفَةِ، وَ الْاَشْبَاهِ الْمُؤْتَلِفَةِ، وَ الْاَضْدَادِ الْمُتَعَادِیَةِ، و الْاَخْلَاطِ

ومفاصل تھے، پھر اس صورت کو خشک کیا کہ بستہ ہوگئی اور سخت کیا کہ کھنکھنانے لگی (یہ صورت اسی طرح) ایک محدود وقت اور معین زمانہ تک (رہی)۔

پھر اس میں (خدا نے) اپنی (پیدا کی ہوئی) روح پھونک دی جس سے وہ انسان بن کر کھڑی ہوگئی، جس کے ذہن تھے جن کو وہ (انسان) سمجھنے کے کام میں لاتا اور (قوت) فکر تھی جس سے سوچتا اور اعضا و جوارح تھے جن سے کام لیتا اور آلات (دست و پا) تھے جن کو استعمال کرتا اور معرفت تھی جس سے حق و باطل، مزے، بو، رنگ اور دوسری چیزوں میں تمیز کرتا تھا۔ (کیونکہ) اس کی خمیر کی گئی ہے رنگ برنگ کی مٹی اور ان چیزوں سے جو باہم مشابہ اور ملتی جلتی ہیں (مثل ہڈی، رگ، پٹھے وغیرہ کے) اور ان چیزوں سے جو ایک دوسری کی ضد اور ان خلطوں سے جو

(بقیہ صفحہ ماقبل) کیا مراد ہے، آیا یہ بھی کوئی مخلوق ہے یا قوائے بہیمیہ کا نام شیطان رکھا گیا ہے؟

جو لوگ قرآن و حدیث کا ظاہری اقرار کر کے چاہتے ہیں کہ فلسفہ نیوٹن کے مطابق کریں وہ زبانی ان ناموں کا اقرار کرتے ہیں اور حقیقت میں سب کے منکر ہیں کیونکہ آج تک انہوں نے شیطان کی صورت نہیں دیکھی پھر کسی غیر مرئی و غیر محسوس کا کیوں کر اقرار کریں، لیکن جو لوگ عقل سلیم اور قلب میں بصیرت رکھتے ہیں وہ حدیث امیر المومنین علیہ السلام ''مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ'' ''جس نے اپنے نفس کی حقیقت سمجھ لی اس نے خدا کو بھی پہچان لیا'' کے مطابق ان چیزوں کا ویسا ہی اعتقاد رکھتے ہیں جیسا خدا، رسول اور ائمہ نے فرمایا ہے۔ کیونکہ خدا جب ایک قطرۂ آب سے ایسے عقل و شعور والے انسان کو پیدا کر سکتا ہے جو ذہن سے سوچتا ہے، ناک سے سونگتا ہے، دانہ مسور کے برابر پُتلی سے تمام جہان کو دیکھتا ہے، کان سے سنتا ہے حالانکہ عقل انسانی ان امور کو کسی طرح نہیں سمجھ سکتی کہ کیوں وہی گوشت، وہی ہڈی، وہی سوراخ رہتے ہوئے انسان کی ناک میں سننے کی اور کان میں سونگھنے کی قوت نہیں اور کیوں انسان زبان سے تو مزہ پہچان لیتا ہے اور ہاتھ سے نہیں پہچانتا؟ حالانکہ زبان میں بھی وہی خون گوشت ہے جو ہاتھ میں ہے، منہ کے اندر آنے سے کوئی نئی چیز نہیں ہوگئی پھر بھی ہر عضو کے آثار و خواص علیحدہ ہیں جو سب کے سب صرف خدا ہی ایسے قادر علی الاطلاق کی قدرت کے کرشمہ ہیں تو ایسے جلیل القدر ذات کی قدرت سے جنت، نار، شیطان، جن، انسان صاحب ہوش و حواس کا دفعۃً واحدۃً پیدا ہونا کچھ عجب نہیں۔

الْمُتَبَايِنَةِ، مِنَ الْحَرِّ و الْبَرْدِ، وَ الْبَلَّةِ وَ الْجُمُوْدِ،

وَاسْتَأْدَى اللهُ سُبْحَانَهُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَدِيْعَتَهٗ لَدَيْهِمْ، وَ عَهْدَ وَصِيَّتِهٖٓ اِلَيْهِمْ، فِي الْاِذْعَانِ بِالسُّجُوْدِ لَهٗ، وَ الْخُشُوْعِ لِتَكْرِمَتِهٖ، فَقَالَ سُبْحَانَهٗ: ﴿اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ﴾، اعْتَرَتْهُ الْحَمِيَّةُ، وَ غَلَبَتْ عَلَيْهِ الشِّقْوَةُ، وَ تَعَزَّزَ بِخِلْقَةِ النَّارِ، وَ اسْتَوْهَنَ خَلْقَ الصَّلْصَالِ، فَاَعْطَاهُ اللهُ النَّظِرَةَ اسْتِحْقَاقًا لِّلسُّخْطَةِ، وَاسْتِتْمَامًا لِّلْبَلِيَّةِ، وَ اِنْجَازًا لِّلْعِدَةِ، فَقَالَ: ﴿اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ۙ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ۝﴾.

ثُمَّ اَسْكَنَ سُبْحَانَهٗ اٰدَمَ عليه السلام دَارًا اَرْغَدَ فِيْهَا عِيْشَتَهٗ، وَ اٰمَنَ فِيْهَا مَحَلَّتَهٗ، وَ حَذَّرَهٗٓ اِبْلِيْسَ وَ عَدَاوَتَهٗ، فَاغْتَرَّهٗ عَدُوُّهٗ نَفَاسَةً عَلَيْهِ بِدَارِ الْمُقَامِ، وَ مُرَافَقَةِ الْاَبْرَارِ، فَبَاعَ الْيَقِيْنَ بِشَكِّهٖ، وَ الْعَزِيْمَةَ بِوَهْنِهٖ، وَاسْتَبْدَلَ بِالْجَذَلِ وَجَلًا، وَ بِالْاِغْتِرَارِ نَدَمًا.

ثُمَّ بَسَطَ اللهُ سُبْحَانَهٗ لَهٗ فِيْ تَوْبَتِهٖ، وَ لَقَّاهُ كَلِمَةَ رَحْمَتِهٖ، وَ وَعَدَهُ الْمَرَدَّ اِلٰى جَنَّتِهٖ، فَاَهْبَطَهٗٓ اِلٰى دَارِ الْبَلِيَّةِ، وَ تَنَاسُلِ

ایک دوسرے سے مغائر ہیں یعنی حرارت، برودت (صفراو بلغم) اور رطوبت دیبوست (خون وسودا) سے۔

اور (اس طرح انسانِ اول یعنی حضرت آدمؑ کو پیدا کر کے) خدا نے فرشتوں سے اپنی اس امانت کو جو ان کے حوالہ تھی ادا اور اس عہد ووصیت کو جو ان کے ذمہ تھی پورا کرانا چاہا اس امر میں کہ آدمؑ کی تعظیم میں سجدہ اور فروتنی کرنے میں (خدا کی) اطاعت کریں گے۔ پس خدا نے کہا ''سجدہ کرو آدم کو'' تو سب نے سجدہ کیا سوائے شیطان اور اس کی جماعت کے جس کو ننگ وعار معلوم ہوا اور جس پر شقاوت غالب آئی اور آگ کی مخلوق ہونے سے اپنے کو معزز اور مٹی کی مخلوق (آدمؑ) کو ذلیل سمجھا۔ پس خدا نے اس کو مہلت دی کہ وہ غضب کا مستحق اور اس کا امتحان کامل اور (خدا کا) وعدہ پورا ہو جائے۔ پس فرمایا'' تو قیامت تک مہلت پانے والوں میں ہے''۔

پھر خدا نے آدمؑ کو ایسے گھر میں جگہ دی جس میں ان کی زندگی کو خوشگوار اور ان کی سکونت کو با امن و امان کیا اور شیطان اور اس کی عداوت سے ان کو ڈرا دیا۔ پس ابلیس نے ان کی اچھی جگہ اور نیکوکاروں کی صحبت پر حسد کر کے ان کو فریب دیا۔ تو (آدمؑ) نے یقین کو اپنے شک اور ثبات و استقلال کو اپنی سستی سے بیچ ڈالا اور خوشی سے خوف کو اور عزت سے حسرت کو بدل لیا۔

پھر (بھی) خدائے سبحانہ نے ان کے توبہ میں وسعت دی۔ انہیں اپنی رحمت کا کلمہ سکھایا اور اپنی جنت میں واپس لانے کا وعدہ کیا (جس کے لیے) آزمایش کے گھر اور اولاد کے ذریعہ

الذُّرِّيَّةِ.

وَ اصْطَفٰى سُبْحَانَهٗ مِنْ وَّلَدِهٖ اَنْبِيَآءَ، اَخَذَ عَلَى الْوَحْيِ مِيْثَاقَهُمْ، وَ عَلٰى تَبْلِيْغِ الرِّسَالَةِ اَمَانَتَهُمْ، لَمَّا بَدَّلَ اَكْثَرُ خَلْقِهٖ

نسل بڑھانے کی جگہ (یعنی دنیا) میں اتارا[1] (اور آباد کیا)۔

پھر خدائے سبحانہ نے ان کی اولاد سے کچھ (لوگوں کو) نبی منتخب کیا جن سے اپنی وحی پہنچانے پر عہد و پیمان اور تبلیغ رسالت کرنے پر امانت (کا اقرار) لیا۔ جب اکثر مخلوق نے اپنے اس عہد کو بدل دیا جو خدا نے ان سے

---

[1] حضرت آدمؑ کا یہ قصّہ کلام اللہ کے بالکل شروع میں یعنی سورۂ بقرہ نیز سورۂ اعراف، حجر اور طٰہٰ میں تفصیل سے مذکور ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا نے جب آدم کو پیدا کر کے جنت میں یہ احترام رکھا اور شیطان کو ذلیل کیا پھر آدمؑ کو ایک خاص درخت کے پاس جانے سے منع کیا تو شیطان نے مختلف طریقوں سے حضرت آدمؑ و حوا کو فریب دے کر اسی قسم کے ایک دوسرے درخت کا پھل کھلا دیا۔ تو چونکہ حضرت آدمؑ اس خاص درخت کے پاس نہ گئے لہٰذا کوئی گناہ تو نہ کیا لیکن چونکہ اسی قسم کے دوسرے درخت سے شیطان کے کہنے سے پھل کھا لیا حالانکہ یہ بھی آپ کی شان کے خلاف تھا لہٰذا خدا کی طرف سے آپ پر عتاب ہوا جس پر آپ نے توبہ کیا خدا نے ان کو رحمت کا کلمہ سکھایا جیسا کہ قرآن مجید میں بھی ہے:

﴿فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ﴾ (سورۂ البقرہ، آیہ ۳۷)

کہ آدمؑ نے اپنے پروردگار سے معذرت کے چند الفاظ سیکھے، پس خدا نے ان الفاظ کی برکت سے آدم کی توبہ قبول کر لی۔

بعض روایات میں ہے کہ وہ کلماتِ رحمت یہ تھے:

﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ (سورۂ الاعراف، آیہ ۲۳)

یعنی اے رب! میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا اور اگر تو مجھے نہ بخش دے گا اور نہ رحم کرے گا تو بے شک میں گھاٹے میں رہوں گا۔

اور حضرات اہل سنت کی مشہور ترین تفسیر دُرِ منثور سیوطی جلد اول صفحہ ۱۶، مطبوعہ مصر میں ہے کہ وہ کلمات رحمت اسمائے پنجتن پاک یعنی محمدؐ و علیؑ و فاطمہؑ و حسنؑ و حسینؑ تھے۔ غرض توبہ قبول کرنے کے بعد آپ کو دنیا میں نازل کیا جیسا کہ قرآن مجید میں بھی ہے کہ پہلے خدا نے آدمؑ کی توبہ قبول کی بعد ازاں آپ دنیا میں تشریف لائے جس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں آپ کا آنا بطور سزا نہیں تھا کیونکہ توبہ قبول کرنے کے بعد سزا کیسی بلکہ یہ تو توبہ قبول ہونے کی علامت ہے کہ آپ کا درجہ بلند کیا گیا دنیا کی آبادی کا سبب قرار پائے جو نہ فرشتوں سے ہو سکتا تھا نہ جنات سے۔ اس کے بعد یہ درجہ دیا گیا کہ آپ کو اور انبیا و اوصیا کے جدّ اعلیٰ قرار پانے کا شرف حاصل ہوا۔

حضرتؑ نے اس خطبہ میں عجیب طرح کی ترتیب کا لحاظ رکھا ہے کہ مشکل ہے کوئی اس کو ادا کر سکے کیونکہ پہلے تو اس کو فرمایا کہ خدا نے ان کو توبہ کی توفیق دی اور کلمات رحمت کے تعلیم فرمائے پھر اس کا وعدہ کیا کہ ان کو جنت میں جگہ دے گا۔ ان تین امروں کے لیے خدا نے تین باتیں کیں کہ دارِ دنیا میں اتارا اور ذریعہ ترقی نسل قرار دیا اور انبیا کو ان کی نسل سے پیدا کیا۔

عَهْدَ اللّٰهِ اِلَيْهِمْ، فَجَهِلُوْا حَقَّهٗ، وَ اتَّخَذُوا الْاَنْدَادَ مَعَهٗ، وَ اجْتَالَتْهُمُ الشَّيٰطِيْنُ عَنْ مَّعْرِفَتِهٖ، وَ اقْتَطَعَتْهُمْ عَنْ عِبَادَتِهٖ، فَبَعَثَ فِيْهِمْ رُسُلَهٗ، وَ وَاتَرَ اِلَيْهِمْ اَنْۢبِيَآئَهٗ،

لیا تھا،[1] پھر خدا کا حق بھول گئے، (بتوں کو) اس کا شریک تجویز کیا، شیطان نے ان کو معرفت خدا سے پھیر دیا اور اس کی عبادت سے جدا کر دیا لہٰذا خدا نے ان میں اپنے رسولوں کو مبعوث کیا اور اپنے نبیوں کو متواتر بھیجا تا کہ ان سے فطرت کے عہد[2] کو پورا کرائیں۔ اس کی بھولی ہوئی

---

[1] شارحین کتاب سے علمائے شیعہ فرماتے ہیں کہ یہ اشارہ ہے اس عہد ''اَلَسْتُ'' کی طرف جس کو خدا نے کلام مجید سورۂ اعراف کے اس آیہ میں ذکر فرمایا ہے:

﴿وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَ اَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى﴾ (سورۂ الاعراف، آیہ ۱۷۲)

یعنی جب تمہارے پروردگار نے اولاد آدم سے ان کی پشت در پشت اولاد کو لیا اور ان کو انہیں پر گواہ قرار دے کر کہا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں تو ان سب نے کہا ہاں۔

لیکن علامہ ابن ابی الحدید اس کی شرح میں لکھتے ہیں کہ اس طرف اشارہ مراد لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے بلکہ حضرت امیر المومنینؑ کی مراد اس عبارت سے یہ ہے کہ چونکہ خداوند عالم کی معرفت اور توحید و عدل کی دلیلیں انسان کی عقل میں فطرت کے وقت ہی سے مرکوز رہتی ہیں اور دنیاوی لغویات میں مبتلا ہو کر انسان ان کو بھول جاتا ہے لہٰذا خداوند عالم نبیوں کو بھیجتا رہا تا کہ عقل کی ان فطری دلیلوں کو تازہ کرتے رہیں اور ان کی تقویت فرمایا کریں۔ چنانچہ اسی فطرت کا اس حدیث شریف میں بھی ذکر ہے کہ

كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلٰى فِطْرَةِ الْاِسْلَامِ وَ اَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهٖ اَوْ يُنَصِّرَانِهٖ۔

یعنی ہر بچہ دین فطرت (اسلام) ہی پر پیدا ہوتا ہے ہاں بعد پیدا ہونے کے والدین اس کو یہودی یا نصرانی وغیرہ مذہب پر لگا دیتے ہیں۔

مگر حق وہی ہے جو علمائے شیعہ نے فرمایا کیونکہ یہ حدیث اسی قول باری کی شرح کرنے والی ہے اور حضرتؑ کا جملہ ''اَخَذَ عَلَى الْوَحْيِ مِيْثَاقَهُمْ'' صاف بتا رہا ہے کہ یہ کلام خدا ﴿وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ﴾ سے مقتبس ہے۔

[2] اس عہد فطرت سے مراد بھی وہی عالم ذر کا عہد ہے جس کے متعلق پہلے ذکر ہو چکا لیکن مفتی محمد عبدہ مفتی مصر اس کی شرح میں لکھتے ہیں کہ خدا نے انسان میں طبیعتوں اور قوتوں کو پیدا کر کے اور اس کے لیے اپنی قدرت و حکمت کے شواہد اور علامات قائم فرما کر گویا اس پر انسان سے عہد لیا ہے کہ ان طبیعتوں اور قوتوں کو انہیں کاموں میں صَرف کرے گا جن کے لیے وہ طبیعتیں اور قوتیں خدا نے پیدا کی ہیں اور انسان بھی اپنی فطرت کے مطابق اس عہد پر ہی عمل کرتا رہتا اگر شیطان اس کے دل میں شہوات کے وسوسوں سے شبہ نہیں پیدا کر دیتا۔ لہٰذا خدا نے نبیوں کو بھیجا کہ انسان سے اس کی اسی فطرت کے مقتضیٰ کو ادا کرائیں یعنی انسان سے وہی اعتقادات قبول اور وہی اعمال انجام کرائیں جو اس کی فطرت کے حسب حال ہیں اور جن کو عقل مستقیم صحیح بتاتی ہے مگر قرآن مجید کا بیان نہایت شافی ہے، وہی زیادہ قابل اعتماد و وثوق ہے۔

لِيَسْتَأْدُوْهُمْ مِيْثَاقَ فِطْرَتِهٖ، وَ يُذَكِّرُوْهُمْ مَنْسِيَّ نِعْمَتِهٖ، وَ يَحْتَجُّوْا عَلَيْهِمْ بِالتَّبْلِيْغِ، وَ يُثِيْرُوْا لَهُمْ دَفَآئِنَ الْعُقُوْلِ، وَ يُرُوْهُمُ الْاٰيَاتِ الْمُقَدَّرَةَ: مِنْ سَقْفٍ فَوْقَهُمْ مَرْفُوْعٍ، وَ مِهَادٍ تَحْتَهُمْ مَوْضُوْعٍ، وَ مَعَايِشَ تُحْيِيْهِمْ، وَ اٰجَالٍ تُفْنِيْهِمْ، وَ اَوْصَابٍ تُهْرِمُهُمْ، وَ اَحْدَاثٍ تَتَابَعُ عَلَيْهِمْ.

وَ لَمْ يُخْلِ اللّٰهُ سُبْحَانَهٗ خَلْقَهٗ مِنْ نَّبِيٍّ مُّرْسَلٍ، اَوْ كِتَابٍ مُّنْزَلٍ، اَوْ حُجَّةٍ لَّازِمَةٍ، اَوْ

نعمتوں کو یاد دلائیں۔ تبلیغ (احکام) کر کے حجت تمام کریں۔ ان کی عقلوں کے خزانے کھولیں اور قدرت (خدا) کی نشانیاں دکھائیں۔ جن میں سے ایک چھت (ایسا آسمان) ہے جو ان کے اوپر بلند ہے اور ایک فرش (ایسی زمین) ہے جو ان کے نیچے بچھی ہوئی ہے اور ذرائع معاش ہیں جو انہیں زندہ رکھتے ہیں اور اجلیں ہیں جو فنا کرتی ہیں اور بیماریاں ہیں جو بوڑھا کرتی ہیں اور (اسی طرح دوسرے) حوادث ہیں جو متواتر واقع ہوتے رہتے ہیں۔

غرض خدائے سبحانہ نے کبھی اپنی مخلوق کو کسی نبی مرسل یا نازل کی ہوئی کتاب یا حجت لازمہ (امام) یا واضح طریقہ سے خالی نہیں رکھا۔[1] رسول (بھی) ایسے جن کی تعداد کی

---

[1] اس جملہ میں حضرتؑ نے صاف طور پر ظاہر کیا کہ خلق خدا کبھی خالی نہ رہی ان تین چیزوں سے یا تو کوئی نبی مرسل رہا جو خلائق پر احکام تبلیغ کرتا رہا مثل آدم ونوح وابراہیم وموسیٰؑ وعیسیٰ علیہم السلام کہ یہ لوگ نبی بھی تھے، رسول بھی، صاحب شریعت بھی۔ اور اگر رسول کا زمانہ نہ رہا جس کو زمانہ فترت کہتے ہیں تو اس رسول کی کتاب رہی جس پر خلائق عمل کرتی، یا حجت لازمہ یعنی امام رہا جو اپنے رسول کے احکام کو بتاتا اور خلائق کو اس کی تعلیم دیتا۔

ابن ابی الحدید اس کی شرح میں لکھتے ہیں کہ ''امامیہ اس کے قائل ہیں کہ مراد اس سے امام معصوم ہے جس سے زمانہ کبھی خالی نہیں رہتا اور ممکن ہے کہ اس سے مراد عقل ہو کہ وہ بھی حجت ہے''۔ لیکن سیاق کلام کہتا ہے کہ مراد اس سے وجود امام معصوم ہے کیونکہ پہلے اغراض بعثت انبیا کو حضرتؑ نے بتایا ہے کہ تبلیغ رسالت کریں اور ان کے عقلی خزانوں کو ظاہر کریں، جس سے معلوم ہوا کہ عقلیں ان لوگوں کی ضعیف تھیں اور حرص وہوا کے نیچے دبی ہوئی تھیں جس کے لیے ضرورت ہوئی بعثت انبیا کی، تو اب ان عقول ضعیفہ کو بشمول ان حجتوں کے کیوں کر ذکر کر سکتے ہیں۔ کیونکہ اگر مجرد عقل کافی ہوتی تو بعثت انبیا کی ضرورت نہ تھی۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ مراد اس سے وہی امام معصوم ہے جو نبی سابق کا وصی ہو جو اس کے احکام کی تبلیغ کرتا رہے۔ اسی وجہ سے اس کو سب کے آخر میں ذکر کیا تا کہ معلوم ہو کہ اس حجت لازمہ کی ضرورت ہر حالت میں ہے خواہ نبی مرسل صاحب کتاب ہو یا نہیں جیسا کہ آئندہ مذکور ہوگا۔

اور جملہ ''لَا تُقَصِّرُ بِهِمْ قِلَّةُ عَدَدِهِمْ'' سے اشارہ ان انبیا اور اوصیا اور اولیا کے حالات کی طرف ہے کہ اگرچہ ان انبیا و اوصیا کی تعداد قلیل تھی اور ان کے دشمنوں اور مکذبوں (جھٹلانے والوں) کی تعداد زیادہ رہی مگر وہ اظہار حق سے باز نہ آئے خواہ رعیت قبول کرے یا نہ کرے۔ بعضوں کا یہ خیال ہے کہ نبوت یا امامت میں اس کی بھی شرط ہے کہ لوگ ان کے مطیع ہوں، (بقیہ صفحہ مابعد)

مَحَجَّةٍ قَآئِمَةٍ، رُسُلٌ لَّا تُقَصِّرُ بِهِمْ قِلَّةُ عَدَدِهِمْ، وَلَا كَثْرَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ لَهُمْ، مِنْ سَابِقٍ سُمِّيَ لَهٗ مَنْ بَعْدَهٗ، اَوْ غَابِرٍ عَرَّفَهٗ مَنْ قَبْلَهٗ.

کمی اور جھٹلانے والوں کی زیادتی (تبلیغ رسالت سے) ان کو قاصر نہیں رکھتی تھی جن میں سے بعض جانے والے کو آنے والے (رسول) کا نام بتا دیا جاتا اور بعض آنے والے کی تعریف پہلا نبی کر جاتا تھا۔

عَلٰى ذٰلِكَ نَسَلَتِ الْقُرُوْنُ، وَ مَضَتِ الدُّهُوْرُ، وَ سَلَفَتِ الْاٰبَآءُ، وَ خَلَفَتِ الْاَبْنَآءُ. اِلٰٓى اَنْ بَعَثَ اللّٰهُ سُبْحَانَهٗ مُحَمَّدًا رَّسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ لِاِنْجَازِ عِدَتِهٖ وَ تَمَامِ نُبُوَّتِهٖ، مَاْخُوْذًا عَلَى النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقُهٗ، مَشْهُوْرَةً سِمَاتُهٗ، كَرِيْمًا مِيْلَادُهٗ. وَ اَهْلُ الْاَرْضِ يَوْمَئِذٍ مِلَلٌ مُّتَفَرِّقَةٌ، وَ اَهْوَآءٌ مُّنْتَشِرَةٌ، وَ طَرَآئِقُ

(غرض) اسی طرح صدیاں گزریں اور زمانے بسر ہوئے، پرانے لوگ مرتے اور نئے لوگ ان کی جگہ لیتے رہے، یہاں تک کہ خدائے سبحانہ نے اپنا وعدہ پورا کرنے اور نبوت کو ختم کرنے کے لیے محمد ﷺ کو مبعوث کیا جن (کے اقرار نبوت) کا عہد نبیوں سے لیا گیا تھا[1] اور علامتیں ان کی (پہلے ہی سے) مشہور ہو رہی تھیں۔ جن کی ولادت کا زمانہ نہایت مکرم تھا (کیونکہ) اس زمانہ میں سب اہل زمین متفرق مذہبوں، پراگندہ خواہشوں اور مختلف راہوں میں (بھٹک رہے) تھے۔ کوئی خدا کو اس کی مخلوق

(بقیہ صفحہ ماقبل) ان کی حکومت کو قبول کریں حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ شیخ ابوشکور کہ علمائے اہل سنت سے ہیں اپنی کتاب تمہید میں لکھتے ہیں کہ امام کی اطاعت رعایا پر فرض ہے اگر غلبہ نہ ہو تو یہ بسبب نافرمانی رعایا ہے اس سے امام خلافت سے معزول نہیں ہوتا۔ جناب رسالت مآبؐ ابتدائے رسالت میں غلبہ نہ رکھتے تھے کیونکہ کفار سرکشی کرتے تھے تو اس سے حضرتؐ کی رسالت کو کیا ضرر ہوا۔ اسی طرح جناب امیرؑ کی خلافت کو بھی تمام مسلمانوں نے نہ قبول کیا اور اس کے ساتھ بھی وہ حضرت امامت سے معزول نہ تھے بلکہ میں کہتا ہوں کہ قوم مسلمان اگر مرتد بھی ہو جائے تو بھی امام امامت سے معزول نہ ہوگا۔

[1] اس عہد و پیمان انبیا کی حقیقت تفسیر شیخ عبدالوہاب میں یوں ہے ابوہریرہ روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا کہ جب میں شب معراج میں آسمان پر گیا تو کل انبیا جمع ہوئے اور سب نے مجھ سے بیان کیا کہ ہم لوگ اس پر مبعوث ہوئے کہ ''لا الہ الا اللہ'' کی شہادت دیں اور آپ کی نبوت اور علی ابن ابی طالبؑ کی ولایت کا اقرار کریں۔ توضیح الدلائل، شہاب الدین اور مفاتیح الاعجاز و معرفۃ علوم الحدیث امام حاکم اخطب خوارزم و تفسیر ثعلبی و مفتاح النجا، مرزا محمد بدخشی و ینابیع المودہ شیخ سلیمان قندوزی میں بھی اس قسم کی روایتیں موجود ہیں۔

مُتَشَتِّتَةٌ، بَيْنَ مُشَبِّهٍ لِلّٰهِ بِخَلْقِهٖ، اَوْ مُلْحِدٍ فِي اسْمِهٖ، اَوْ مُشِيْرٍ اِلٰى غَيْرِهٖ، فَهَدَاهُمْ بِهٖ مِنَ الضَّلَالَةِ، وَ اَنْقَذَهُمْ بِمَكَانِهٖ مِنَ الْجَهَالَةِ.

ثُمَّ اخْتَارَ سُبْحَانَهٗ لِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ اٰلِهٖ لِقَآئَهٗ، وَ رَضِيَ لَهٗ مَا عِنْدَهٗ، وَ اَكْرَمَهٗ عَنْ دَارِ الدُّنْيَا، وَ رَغِبَ بِهٖ عَنْ مُقَارَنَةِ الْبَلْوٰى، فَقَبَضَهٗ اِلَيْهِ كَرِيْمًا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، وَ خَلَّفَ فِيْكُمْ مَا خَلَّفَتِ الْاَنْبِيَآءُ فِيْٓ اُمَمِهَا، اِذْ لَمْ يَتْرُكُوْهُمْ هَمَلًا، بِغَيْرِ طَرِيْقٍ وَّاضِحٍ، وَ لَا عَلَمٍ قَآئِمٍ:

سے مشابہ کرتا۔ کوئی اس کے نام میں الحاد کرتا (اور) کوئی (بالکل ہی) غیر خدا کی طرف لو لگاتا۔[1] پس خدا نے آنحضرتؐ کے سبب سے ان کو ضلالت سے نکال کر ہدایت کی طرف پہنچایا اور جہالت کے گڑھے سے آپؐ کی بدولت ان کو نجات دی۔

پھر خدائے سبحانہ نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی درگاہ میں طلب کرنا چاہا اور اپنی بارگاہ کی نعمتوں کو آپؐ کے لیے پسند کیا تو عزت کے ساتھ دنیا سے اٹھا لیا اور امتحان گاہ (عالم) سے متنفر کر دیا۔ غرض (خدا نے) آنحضرتؐ کو اپنی درگاہ میں نہایت احترام سے بلایا تو حضرتؐ تم لوگوں میں وہ چیزیں چھوڑتے گئے جو گزشتہ انبیاء اپنی امتوں میں چھوڑتے رہے ہیں کیونکہ وہ حضرات اپنی امتوں کو یوں ہی بغیر واضح طریقہ اور روشن دلیل کے تو چھوڑتے نہیں تھے۔

---

[1] اس زمانہ کے حالات کی تفصیل علامہ ابن ابی الحدید نے مجمل طور پر یہ لکھی ہے کہ جس زمانے میں حضرت مبعوث برسالت ہوئے دنیا میں بہت سے دین پھیلے ہوئے تھے۔ یہود، نصاریٰ، مجوس، صابئون بت پرست، فلاسفہ، زنادقہ اور جس امت میں آپ کی بعثت ہوئی عرب کی یہ حالت تھی کہ بعض تو معطلہ تھے جو صانع عالم کے منکر تھے کہ نہ کوئی ہمارا خالق ہے نہ قیامت ہوگی نہ مُردے زندہ ہوں گے بلکہ جیسا کہ قرآن مجید میں ان کے حالات مذکور ہیں یہی ان کا عقیدہ تھا کہ جو کچھ ہے یہی دنیا اور اسی کی زندگی۔ اور زمانہ ہی ہم کو ہلاک کرتا ہے۔ بعض کا یہ مذہب تھا کہ خالق عالم کا تو اقرار کرتے تھے مگر قیامت کے منکر تھے اور بعضوں کا یہ مذہب تھا کہ اقرار خالق کے ساتھ فی الجملہ حشر ونشر کے بھی قائل تھے مگر رسالت انبیا کے منکر تھے اور بت پرستی کرتے تھے، بعض عرب کا مذہب یہ تھا کہ وہ تناسخ کے قائل تھے کہ ایک بدن سے روح نکل کر دوسرے قالب میں جاتی ہے، بعض عرب مشبہ اور مجسمہ تھے۔ کچھ لوگ یہودیت کی طرف مائل تھے اور کچھ نصرانیت کی طرف اور کچھ سابئہ کی طرف کہ نجوم وکواکب کی پرستش کرتے، بعض لوگ محفوظ تھے مثل عبدالمطلب وابوطالب وغیرہ کے۔

كِتَابَ رَبِّكُمْ فِيكُمْ مُبَيِّنًا حَلَالَهُ وَ حَرَامَهُ، وَ فَرَآئِضَهُ وَ فَضَآئِلَهُ، وَ نَاسِخَهُ وَ

(لہٰذا آنحضرتؐ نے بھی) تم میں تمہارے رب کی کتاب (قرآن) چھوڑی [1] جو اس کے حلال و حرام،

---

[1] حضرتؑ کا یہ فقرہ کہ رسول اللہؐ نے بھی تم لوگوں میں وہی چیزیں چھوڑیں جو انبیائے ماسبق نے چھوڑی تھیں، عجب طرح کا بلیغ فقرہ ہے کہ جہاں حضرتؐ کی رسالت ثابت کی وہاں اپنی امامت بھی ثابت کر دی۔ کیونکہ کل انبیائے ماسبق صاحبِ کتاب نہ تھے بلکہ اکثر صاحبِ شریعت بھی نہ تھے، تابع تھے دوسرے رسول کے، تو جب رسالت میں یا صاحبِ شریعت ہونے میں نہ سب مساوی ہیں نہ سب صاحبِ کتاب ہیں بلکہ بعض صاحبِ کتاب ہیں بعض نہیں۔ تو اب اس قدر مشترک کو دیکھنا چاہیے جس میں کل انبیا شریک ہیں وہ یہی وصی کا مقرر کرنا ہے!! کہ کوئی نبی، کوئی رسول بلا وصی نہیں گزرا ہے۔ تو اب معلوم ہوا کہ آنحضرتؐ نے بھی اپنے وصی کو اپنی امت میں خلیفہ مقرر کیا۔ جس طرح حضرت آدمؑ نے حضرت شیث ہبۃ اللہ کو، حضرت شیثؑ نے اپنے فرزند انوش کو اور حضرت انوش نے اپنے صاحبزادے قنیان کو اور قنیان نے اپنے فرزند مہلائیل کو، مہلائیل نے اپنے فرزند یرد کو، یرد نے حضرت ادریسؑ کو، حضرت ادریسؑ نے اپنے فرزند متوشلخ کو، متوشلخ نے اپنے فرزند لمک کو، حضرت نوحؑ نے جو نبی مرسل ہیں اپنے فرزند سام کو، حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے اپنے فرزند اسحاقؑ کو، حضرت اسحاقؑ نے حضرت یعقوبؑ کو، حضرت یعقوبؑ نے اپنے فرزند حضرت یوسفؑ کو، حضرت ایوبؑ نے اپنے فرزند حوبل کو، حضرت موسیٰؑ نے حضرت ہارونؑ اپنے بھائی کو، پھر ان کی وفات پر ان کی اولاد تک پہنچانے کو حضرت یوشعؑ کو، حضرت یوشعؑ نے کالب بن یوقنا کو، کالب نے اپنے فرزند یوشا فاش کو، حضرت الیاسؑ نے الیسعؑ کو، حضرت الیسعؑ نے ذوالکفلؑ کو، حضرت داؤدؑ نے اپنے فرزند سلیمانؑ کو، حضرت سلیمانؑ نے اپنے فرزند رحیعم کو اور حضرت عیسیٰؑ نے شمعون کو اپنا وصی کیا۔ (تاریخ کامل و روضۃ الصفا وغیرہ)

یہ اکیس نام صرف اس غرض سے لکھے گئے تا کہ معلوم ہو ہر طبقہ میں ہر نبی نے اپنی ہی زندگی میں اپنا وصی مقرر کیا اور امت کو بتا دیا کہ یہ ہمارا وصی ہے۔ تو پھر کیوں کر ممکن ہے کہ خاتم الانبیا سید المرسلین اس کے خلاف کرے اور کسی شخص کو اپنا وصی و خلیفہ نہ مقرر کر جائے۔ حالانکہ خداوند عالم فرماتا ہے ﴿قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ﴾ (سورۂ الاحقاف، آیہ ۹) کہہ ''اے محمد کہ میں رسولوں سے نیا نہیں ہوں'' اور ﴿فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ﴾ (سورۂ الانعام، آیہ ۹۰) تو پھر سب انبیائے ماسبق کی مخالفت کیوں کر سکتے تھے۔ تو اب قول جناب امیرؑ کی حقیقت بھی معلوم ہوئی جو حضرتؑ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تم لوگوں میں انہیں چیزوں کو چھوڑا یعنی خلیفہ کیا جن چیزوں کو انبیائے ماسبق اپنی امت میں چھوڑ گئے تھے یعنی ایک وصی دوسرا قرآن، جس کی توضیح اس حدیث میں موجود ہے جو بتواتر حضرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

اِنِّیْ تَارِكٌ فِيكُمُ الثَّقَلَيْنِ مَا اِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِیْ كِتَابَ اللّٰهِ، وَعِتْرَتِیْ اَهْلَ بَيْتِیْ۔

جس سے معلوم ہوا کہ دونوں چیزیں ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گی۔ (بقیہ تفصیل ضمیمہ میں آئے گی)

''كِتَابَ رَبِّكُمْ'' سے حضرتؑ قرآن مجید کے صفات بیان کرتے ہیں حلال جیسے پانی، حرام جیسے شراب، واجب جیسے نماز، مستحب جیسے صدقہ، ناسخ جیسے ﴿اُقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ﴾ منسوخ جیسے ﴿لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ﴾ رخصت وہ امر جس کی باوجود حرمت اجازت دے دی گئی ہو جیسے روزہ ترک کرنا مسافر کے لیے۔ عزیمت وہ حکم جس کے ترک کی اجازت نہ ہو جیسے خدا کو ایک ماننا۔ خاص وہ جس میں کوئی حکم ایک ہی فرد سے مخصوص ہو۔ عام وہ جس میں سب برابر ہوں۔ نصائح و امثال پہلے لوگوں کے (بقیہ صفحہ مابعد)

مَنْسُوْخَهٗ، وَ رُخَصَهٗ وَ عَزَآئِمَهٗ، وَ خَاصَّهٗ وَ عَامَّهٗ، وَ عِبَرَهٗ وَ اَمْثَالَهٗ، وَ مُرْسَلَهٗ وَ مَحْدُوْدَهٗ، وَ مُحْكَمَهٗ وَ مُتَشَابِهَهٗ، مُفَسِّرًا مُجْمَلَهٗ، وَ مُبَيِّنًا غَوَامِضَهٗ.

واجبات ومستحبات، ناسخ ومنسوخ، رخصت وعزیمت، خاص وعام، نصائح وامثال، مطلق ومقید اور محکم ومتشابہ کی بیان کرنے والی اور مجمل کی تفسیر اور مشکلات کی توضیح کرنے والی ہے۔

بَيْنَ مَاْخُوْذٍ مِّيْثَاقُ عِلْمِهٖ، وَ مُوَسَّعٍ عَلَى الْعِبَادِ فِيْ جَهْلِهٖ، وَ بَيْنَ مُثْبَتٍ فِي الْكِتَابِ فَرْضُهٗ، وَ مَعْلُوْمٍ فِي السُّنَّةِ نَسْخُهٗ، وَ وَاجِبٍ فِي السُّنَّةِ اَخْذُهٗ، وَ مُرَخَّصٍ فِي الْكِتَابِ تَرْكُهٗ. وَ بَيْنَ وَاجِبٍ بِوَقْتِهٖ، وَ زَآئِلٍ فِيْ مُسْتَقْبَلِهٖ، وَ مُبَايَنٍ بَيْنَ مَحَارِمِهٖ، مِنْ كَبِيْرٍ اَوْعَدَ عَلَيْهِ نِيْرَانَهٗ، اَوْ صَغِيْرٍ اَرْصَدَ لَهٗ غُفْرَانَهٗ، وَ بَيْنَ مَقْبُوْلٍ فِيْ

(یہ کتاب منقسم ہے) درمیان ان امور کے جن کے جاننے کا عہد (ہر شخص سے) لیا گیا ہے اور ان کے جن سے جاہل رہنے کی بندوں کو اجازت دی گئی ہے۔ اور درمیان ان امور کے جن کا فرض ہونا تو کتاب میں ثابت لیکن منسوخ ہونا حدیث سے معلوم ہے۔[1] اور درمیان ان کے جن کا اختیار کرنا حدیث میں واجب ہے لیکن کتاب میں ان کے ترک کی اجازت ہے۔[2] اور درمیان ان کے جو اپنے وقت میں واجب لیکن آئندہ ساقط ہیں۔[3] (اسی طرح یہ کتاب) تفریق کرنے والی ہے اس کے محارم میں کہ گناہ کبیرہ پر جہنم کا خوف دلایا ہے اور گناہ صغیرہ کے لیے اپنی مغفرت مہیا رکھی ہے اور (اسی طرح یہ کتاب منقسم ہے) درمیان ان امور کے کہ جن کا تھوڑا مقبول ہے اور

(بقیہ صفحہ ماقبل) وہ حکایات جن سے عبرت حاصل ہو۔ مطلق وہ حکم جس میں کوئی قید نہ ہو جیسے وضو میں منہ دھونے کا حکم بے قید ہے۔ مقیّد وہ جس میں کوئی قید ہو جیسے وضو کرنے میں ہاتھ دھونے کا حکم ہے کہ قید کر دی گئی ہے کہنیوں تک دھونے کی۔ محکم وہ جس کے سمجھنے میں کوئی شبہ نہ ہو جیسے ﴿وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ کہ خدا ہر چیز سے واقف ہے۔ متشابہ وہ جس کے سمجھنے میں شبہ ہو جیسے ﴿يَدُ اللّٰهِ مَبْسُوْطَتٰنِ﴾ (سورۂ المائدہ، آیہ ۶۴) ''خدا کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں'' کہ اس میں ید کے معنی میں شبہ ہوتا ہے کہ مراد اس سے ہاتھ ہے یا قوت یا اختیار۔ پھر قرآن مجید کی تقسیم دوسری طرف فرمائی کہ بعض چیز کا جاننا ہر شخص کو ضروری ہے جیسے وجود خدا کا جاننا اور بعض سے جاہل رہنے کی اجازت ہے جیسے کٓهٰيٰعٓصٓ وغیرہ۔

[1] جیسے پہلے بیوہ کے زنا پر اس کو مرتے وقت تک قید رکھنے کا حکم تھا لیکن حدیث سے یہ حکم منسوخ ہوا کہ اس کو سنگسار کیا جاوے۔

[2] جیسے ابتدائے اسلام میں حدیث سے بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز کا حکم تھا اور قرآن سے وہ منسوخ ہو گیا۔

[3] جیسے مستطیع ہونے کے بعد ایک دفعہ حج واجب ہے پھر کبھی واجب نہیں ہوتا۔

اَدْنَاهُ، وَ مُوَسَّعٍ فِيْۤ اَقْصَاهُ.

[مِنْهَا: ذَكَرَ فِي الْحَجِّ]

وَ فَرَضَ عَلَيْكُمْ حَجَّ بَيْتِهِ الْحَرَامِ، الَّذِيْ جَعَلَهُ قِبْلَةً لِّلْاَنَامِ، يَرِدُوْنَهُ وُرُوْدَ الْاَنْعَامِ، وَ يَاْلَهُوْنَ اِلَيْهِ وُلُوْهَ الْحَمَامِ.

جَعَلَهُ سُبْحَانَهُ عَلَامَةً لِّتَوَاضُعِهِمْ لِعَظَمَتِهٖ، وَ اِذْعَانِهِمْ لِعِزَّتِهٖ، وَ اخْتَارَ مِنْ خَلْقِهٖ سُمَّاعًا اَجَابُوْۤا اِلَيْهِ دَعْوَتَهُ، وَ صَدَّقُوْا كَلِمَتَهُ، وَ وَقَفُوْا مَوَاقِفَ اَنْۢبِيَآئِهٖ، وَ تَشَبَّهُوْا بِمَلٰٓئِكَتِهِ الْمُطِيْفِيْنَ بِعَرْشِهٖ، يُحْرِزُوْنَ الْاَرْبَاحَ فِيْ مَتْجَرِ عِبَادَتِهٖ، وَ يَتَبَادَرُوْنَ عِنْدَ مَوْعِدِ مَغْفِرَتِهٖ.

جَعَلَهُ سُبْحَانَهُ وَ تَعَالٰى لِلْاِسْلَامِ عَلَمًا، وَ لِلْعَآئِذِيْنَ حَرَمًا، فَرَضَ حَجَّهُ، وَ اَوْجَبَ حَقَّهُ، وَ كَتَبَ عَلَيْكُمْ وِفَادَتَهُ، فَقَالَ سُبْحَانَهُ: ﴿وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ؕ وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ﴾.

زیادہ میں وسعت دے دی گئی ہے۔[1]

(اسی خطبہ کا ایک جز جس کو حج کے متعلق فرمایا)

اور (خدا نے) تم پر حج واجب کیا اپنے خانۂ کعبہ کا، جس کو مخلوق کا قبلہ قرار دیا ہے جہاں لوگ اس طرح ٹوٹتے ہیں جس طرح (پانی پر) جانور اور اس طرح فریفتہ ہوتے ہیں جس طرح کبوتر۔

اور جسے خدائے سبحانہ نے اس کی علامت قرار دی ہے کہ بندے اس کی عظمت کے سبب سے تواضع کریں اور اس کی عزت کے مقر ہوں۔ اور اپنی مخلوق سے ایسے سننے والے بندوں کو چنا جنہوں نے اس کی دعوت قبول کی۔ اس کے کلمہ کی تصدیق کی۔ مقامات انبیاء میں ٹھہرے اور عرش خدا کے طواف کرنے والے فرشتوں کے مثل قرار پائے۔ (کیونکہ وہ) عبادت خدا کی تجارت کے منافع جمع کرتے اور اس کے وعدۂ مغفرت کی طرف بڑھتے ہیں۔

خدائے سبحانہ نے اس (کعبہ) کو اسلام کا علَم اور پناہ لینے والوں کے امن کی جگہ قرار دی ہے۔ (لہٰذا) اس کے حج کو فرض اور اس کے حق کو واجب کیا۔ اور تم پر وہاں کی حاضری لازم کی۔ پس فرمایا ''اور لوگوں پر واجب ہے کہ خدا کے لیے خانۂ کعبہ کا حج کریں جنہیں وہاں تک پہنچنے کی استطاعت ہو اور جس نے انکار کیا تو (خیر) خدا سارے جہان سے مستغنی ہے''۔

---

[1] جیسے قسم کے خلاف کرنے میں کفارہ ہے کہ خواہ ایک بندہ آزاد کرے خواہ دس مسکین کو کھانا یا کپڑا دے یہ زیادہ ہے جس میں وسعت ہے لیکن اگر تینوں چیزوں سے عاجز ہو تو تین روز روزہ رکھے کہ اگرچہ یہ تھوڑا ہے لیکن مقبول ہے۔

❁ خطبہ :۲ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

بَعْدَ انْصِرَافِهٖ مِنْ صِفِّيْنَ۔

اَحْمَدُهٗ اسْتِتْمَامًا لِّنِعْمَتِهٖ، وَ اسْتِسْلَامًا لِّعِزَّتِهٖ، وَ اسْتِعْصَامًا مِّنْ مَّعْصِيَتِهٖ، وَ اَسْتَعِيْنُهٗ فَاقَةً اِلٰى كِفَايَتِهٖ،

خطبہ (۲)

حضرتؑ نے جو خطبہ فرمایا اس کا ایک حصّہ [۱]

جنگ صفّین سے لوٹنے کے بعد۔

میں اس (خدا) کی حمد کرتا ہوں تا کہ اس کی نعمت تمام اور اس کی عزت کی فرمانبرداری (ثابت) اور اس کے گناہوں سے بچنے کی قوت حاصل ہو۔ اور اس کی مدد چاہتا ہوں، اس کی کفایت کا محتاج [۲] ہو کر کیونکہ اس نے جس کی ہدایت کی

---

[۱] صفّین ملک شام کے قریب کا ایک مقام ہے جہاں جنگ جمل کے بعد صفر ۳۷ ہجری میں جناب امیر المؤمنینؑ اور معاویہ میں جنگ ہوئی تھی اور جس میں شکست کے وقت معاویہ نے کلام مجید کو نیزہ پر صلح کا فریب دینے کے لیے بلند کیا تھا۔

[۲] حضرتؑ نے اگرچہ ''اَحْمَدُهٗ'' کا لفظ استعمال فرمایا ہے لیکن مقصود شکر ہے اور ''اِسْتِتْمَامًا'' سے ''اِسْتِعْصَامًا مِّنْ مَّعْصِيَتِهٖ'' تک گویا اس شکر کی غرض و غایت بیان کی ہے۔ پس حضرتؑ نے حمد و شکر ادا کرنے کی تین غرض فرمائی ہے۔ نعمات خدا کا تمامہا طلب کرنا بمفاد ﴿وَلَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ﴾ اس کی عزت و جبروت کے سامنے سر تسلیم خم کرنا بمفاد ﴿وَ لَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ﴾ (سورۂ ابراھیم، آیہ ۷) اور اس کی نافرمانیوں سے بچنا جس سے مذہب شیعہ کے عقیدۂ توفیق کی تائید ہوتی ہے کیونکہ گو بندے اپنے افعال میں پورے مختار ہیں لیکن چونکہ ہوا و ہوس نفسانی میں مبتلا رہ کر نفس امارہ سے مغلوب ہو جاتے ہیں لہٰذا خدا کی توفیق کی ضرورت ہوتی ہے جس سے بندے اچھے اعمال کرنے کی طرف راغب اور برے افعال سے متنفر ہوتے ہیں۔ یہاں شبہ ہو سکتا ہے کہ حضرتؑ نے طلب نعمت کو مقدم کیا ہے اور استسلام عزت کو مؤخر حالانکہ چاہیے خلاف کہ پہلے ہم اس کی معرفت حاصل کریں تب نعمت طلب کریں لیکن چونکہ ہمارا وجود، شعور، ادراک یہ سب اسی کی نعمتیں ہیں لہٰذا پہلا فرض ہمارا طلب نعمت ہے اور یہی طلب نعمت استسلام عزت بھی ہے کیونکہ جب ہم نے سمجھ لیا کہ وہی منعم حقیقی ہے تو اس سے زیادہ استسلام عزت کیا ہو سکتا ہے اور اسی کے ساتھ ''اِسْتِعْصَامٌ عَنِ الْمَعْصِيَتِهٖ'' بھی حاصل ہوگا کیونکہ جب ہم نے اس کے انعام و اکرام پر خیال کیا اور اپنی ناچیز ہونے پر تو خود بخود خیال ہوگا کہ بجز اس کے کوئی بچانے والا نہیں ہے۔ بہر حال معنوی حیثیت سے تو ہر جملہ میں ایسا اتحاد و ارتباط ہے کہ اس سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا اور لفظی حیثیت کو علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں:

وَ قَوْلُهٗ۔ ''اِسْتِتْمَامًا وَ اسْتِعْصَامًا'' مِنْ لَطِيْفِ الْكِنَايَةِ وَ بَدِيْعِهَا فَسُبْحَانَ مَنْ خَصَّهٗ بِالْفَضَائِلِ الَّتِيْ لَا تَنْتَهِيْ "اَلْسِنَةُ الْفُصَحَاءِ" اِلٰى وَصْفِهَا وَ جَعَلَهٗ اِمَامَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ وَ قُدْوَةَ كُلِّ حَقِيْقَةٍ۔

کہ آپ کی عبارت نہایت لطیف اور بالکل جدید اور بدیع کنایہ سے ہے پس کیا ہی بزرگ خدا ہے جس نے حضرت علیؑ کو ایسے فضائل سے مخصوص کیا جن تک بڑے بڑے فصحا کی زبانیں تک نہیں پہنچ سکتیں، خدا نے حضرتؑ کو ہر ذی علم کا امام اور حقیقت کا پیشوا قرار دیا ہے۔ (شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید، ج ۱، ص ۱۳۳)

اِنَّهٗ لَا يَضِلُّ مَنْ هَدَاهُ، وَ لَا يَئِلُ مَنْ عَادَاهُ، وَ لَا يَفْتَقِرُ مَنْ كَفَاهُ، فَاِنَّهٗ اَرْجَحُ مَا وُزِنَ، وَ اَفْضَلُ مَا خُزِنَ.

وہ گمراہ نہیں ہوسکتا اور جس نے اس کی مخالفت کی وہ نجات نہیں پاسکتا اور جس کی اس نے کفایت کی وہ فقیر نہیں ہوسکتا۔ پس یہ (حمد) ہر اس چیز سے بہتر ہے جو وزن کی جاسکے اور ہر اس چیز سے افضل ہے جو خزانہ میں رکھی جاسکے۔

وَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، شَهَادَةً مُّمْتَحَنًا اِخْلَاصُهَا، مُعْتَقَدًا مُّصَاصُهَا، نَتَمَسَّكُ بِهَآ اَبَدًا مَّآ اَبْقَانَا، وَ نَدَّخِرُهَا لِاَهَاوِيْلِ مَا يَلْقَانَا، فَاِنَّهَا عَزِيْمَةُ الْاِيْمَانِ، وَ فَاتِحَةُ الْاِحْسَانِ، وَ مَرْضَاةُ الرَّحْمٰنِ، وَ مَدْحَرَةُ الشَّيْطٰنِ.

اور میں شہادت دیتا ہوں کہ سوائے اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کے کوئی معبود نہیں، ایسی شہادت جس کا اخلاص آزمایا ہوا، اور جس کا خلوص طے شدہ ہے۔ (خدا) جب تک ہمیں رکھے اسی (شہادت) سے متمسک رہیں گے اور آنے والے (قیامت کے) اندوہوں کے لیے (بھی) اسی کو ذخیرہ رکھیں گے کیونکہ یہی ایمان کا اصل مقصود اور (باب) احسان کا کھولنے والا ہے اور (یہی خدائے) رحمٰن کے خوش ہونے اور شیطان کے دفع ہونے کا سبب ہے۔

وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهٗ بِالدِّيْنِ الْمَشْهُوْرِ، وَ الْعَلَمِ الْمَاْثُوْرِ، وَ الْكِتَابِ الْمَسْطُوْرِ، وَ النُّوْرِ

اور میں اس کی بھی شہادت دیتا ہوں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کے (مخصوص) بندہ اور رسول ہیں، جن کو مبعوث کیا اس دین کے ساتھ جو مشہور [1] ہے اور ایسے نشان (ہدایت)

---

[1] دین مشہور میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ اس میں اشارہ ہے اس شہرت کی طرف جو دین اسلام کو قبل سے حاصل تھی کہ ہر نبی اولوالعزم اس کی خبر اور بشارت دیتا آیا حضرت ابراہیمؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک، تورات، انجیل، زبور میں اس کی صریحی بشارتیں موجود ہیں لہٰذا اس قدیم شہرت کی طرف اشارہ فرمایا ہو۔ دوسرا احتمال یہ کہ اس شہرت کی طرف اشارہ ہو کہ باوصفے کہ آپ مکّہ معظّمہ میں مظلوم و مقہور رہے مگر آپ کے دین کی شہرت تمام پھیل گئی تھی یہاں تک کہ نجاشی بادشاہ حبشہ آپ پر غائبانہ ایمان لایا، یا اس کی طرف اشارہ ہو کہ صرف ۲۳ سال میں اس دین کو ایسی شہرت حاصل ہوئی کہ ادیان مشہورہ کے ساتھ اس کا نام بھی مشہور ہو گیا۔ بلکہ بہ استثنا یہود و نصاریٰ و مجوس جو ایک ایک سلطنت کے مذہب تھے کل مذاہب اسلام کے مقابلہ میں گمنام ہوئے۔

''اَلْعَلَمِ الْمَاْثُوْرِ'' کی شرح میں علامہ ابن ابی الحدید کو تردد ہوا کہ کیا مراد ہے، کیونکہ ماثور کے معنی منقول کے ہیں اور علَم بمعنی نشان، لہٰذا قرآن کو مراد لیا جس کی غلطی اسی سے ظاہر ہے کہ حضرتؑ ہی نے قرآن کو علیحدہ ذکر کیا۔ اور بعض نے معجزات مراد لی ہے مگر اس تکلف کی ضرورت نہیں کیونکہ مقصود اس سے حضرتؐ کے وہ اخلاق و احسانات بھی ہو سکتے ہیں جو قیامت تک مذکور رہیں گے خواہ کوئی اسلام قبول کرے یا نہ کرے لیکن حضرتؐ کا مداح رہے گا۔ لہٰذا حضرتؐ کا ہر فعل اور ہر امر یہ حیثیت رکھتا ہے کہ نشان کہا جائے۔

السَّاطِعِ، وَ الضِّيَآءِ اللَّامِعِ، وَ الْاَمْرِ الصَّادِعِ، اِزَاحَةً لِّلشُّبُهَاتِ، وَ احْتِجَاجًا بِالْبَيِّنَاتِ، وَ تَحْذِيْرًا بِالْاٰيَاتِ، وَ تَخْوِيْفًا بِالْمَثُلَاتِ.

کے ساتھ جو (گزشتہ انبیا سے) نقل ہوتا آیا ہے اور ایسی کتاب کے ساتھ جو لکھی ہوئی ہے اور ایسے نور کے ساتھ جو تاباں ہے اور ایسی ضیا کے ساتھ جو درخشاں ہے اور ایسے حکم کے ساتھ جو فیصل کر دینے والا ہے تاکہ (آپؐ) شبہات دفع کریں، معجزات سے حجت قائم کریں، آیات بیّنات سے ڈرائیں اور عقوبات الٰہی سے خوف دلائیں۔

وَ النَّاسُ فِيْ فِتَنٍ انْجَذَمَ فِيْهَا حَبْلُ الدِّيْنِ، وَ تَزَعْزَعَتْ سَوَارِي الْيَقِيْنِ، وَ اخْتَلَفَ النَّجْرُ وَ تَشَتَّتَ الْاَمْرُ، وَ ضَاقَ الْمَخْرَجُ وَ عَمِيَ الْمَصْدَرُ، فَالْهُدٰى خَامِلٌ، وَ الْعَمٰى شَامِلٌ. عُصِيَ الرَّحْمٰنُ، وَ نُصِرَ

(غرض حضرتؐ کی بعثت تو اس لیے ہوئی مگر) اب یہ حالت ہے کہ لوگ ایسے فتنوں میں ہیں جن سے دین کی رسی ٹوٹ گئی [1]، ارکان ایمان متزلزل ہو گئے، اصل (دین) میں اختلاف پڑ گیا، احکامِ الٰہی پراگندہ ہو گئے [2] اور ان (فتنوں) سے نکلنے کی راہ تنگ اور راہ (ہدایت) پر آنے کی جگہ گم ہو گئی۔ غرض (نور) ہدایت تو گل ہو گئی تاریکی

---

[1] ''وَ تَخْوِيْفًا بِالْمَثُلَاتِ'' تک تو مطلب واضح ہے کہ حضرت امیر المومنینؑ نے آنحضرتؐ کی بعثت اور آپؐ کے صفات بیان فرمائے ہیں لیکن ''وَ النَّاسُ فِيْ فِتَنٍ انْجَذَمَ فِيْهَا حَبْلُ الدِّيْنِ'' کے مقصود میں شارحین کو تردد ہے کہ حضرتؑ کا اشارہ کس طرف ہے۔ علمائے شیعہ کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ کی وفات کے بعد لوگ جن فتنہائے ضلالت و دنیا پرستی میں مبتلا ہو گئے تھے حضرتؑ انہیں کا ذکر فرماتے ہیں لیکن علامہ ابن ابی الحدید ایک احتمال یہ بھی پیدا کرتے ہیں ''یہ جملے بھی زمانۂ جاہلیت ہی سے متعلق ہو سکتے ہیں جن میں حضرتؑ نے زمانۂ بعثت کے وقت کی حالت عرب کو ذکر فرمایا ہے'' مگر حق یہ ہے کہ ایسا احتمال پیدا کرنا بالکل دادِ تعصّب دیتا ہے کیونکہ جب جناب امیرؑ آنحضرتؐ کی بعثت کے اغراض و مقاصد بیان کر چکے جن میں ایام جاہلیّت کا ذکر بھی آ چکا ہے کہ آنحضرتؐ نے ان سب تاریکیوں کو دور کر دیا تو پھر ان فتنوں کا ذکر جو ایام جاہلیّت میں ہو چکے بالکل خلاف بلاغت ہے اور ظاہر ہے کہ زمین مکّہ یا عرب کبھی بھی آنحضرتؐ کے پہلے ایسی نہ تھی کہ کہا جائے اس میں اعلام ایمان روشن تھے جو بجھ گئے یا مسالک دین واضح تھے جو مٹ گئے لہٰذا کسی طرح زمانۂ جاہلیت سے ان فقرات کا تعلق مربوط نہیں بلکہ حضرتؑ یہ حالت موجودہ اپنے زمانہ کی بیان فرما رہے ہیں۔

[2] یعنی آنحضرتؐ کے وقت تک تو سب لوگ ایک ہی دین اسلام پر تھے لیکن آپ کی وفات کے وقت سے نئے نئے مذہب جاری ہو گئے۔ آنحضرتؐ کی حدیث ثقلین کے مقابلہ میں روح نکلتے وقت ہی ''حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰهِ'' کا شور ہوا۔ پھر تینوں خلافتوں میں مختلف قسم کے تغیرات اسلام میں علیحدہ ہوئے غرض مذہب باطل بھی صرف ایک ہی نہ رہا۔ پھر معاویہ کے عہد میں تو آنکھ بند کر کے اسلام سے انحراف کر لیا گیا اور جو کچھ ہوا دنیا جانتی ہے۔

الشَّيْطٰنُ، وَ خُذِلَ الْاِيْمَانُ، فَانْهَارَتْ دَعَآئِمُهٗ، وَ تَنَكَّرَتْ مَعَالِمُهٗ، وَ دَرَسَتْ سُبُلُهٗ، وَ عَفَتْ شُرُكُهٗ.

(جہالت) چھا گئی، خدا کی نافرمانی کی جاتی ہے اور شیطان کی نصرت اور ایمان چھوڑ دیا گیا ہے۔ جس سے اس کے ارکان منہدم اور آثار متغیّر ہو گئے اور راہیں ناپدید ہو گئیں (یہاں تک کہ) اس کی شاہراہیں (تک) محو ہو گئیں۔

اَطَاعُوا الشَّيْطٰنَ فَسَلَكُوْا مَسَالِكَهٗ، وَ وَرَدُوْا مَنَاهِلَهٗ، بِهِمْ سَارَتْ اَعْلَامُهٗ وَ قَامَ لِوَآئُهٗ، فِيْ فِتَنٍ دَاسَتْهُمْ بِاَخْفَافِهَا وَ وَطِئَتْهُمْ بِاَظْلَافِهَا وَ قَامَتْ عَلٰى سَنَابِكِهَا. فَهُمْ فِيْهَا تَآئِهُوْنَ حَآئِرُوْنَ جَاهِلُوْنَ مَفْتُوْنُوْنَ، فِيْ خَيْرِ دَارٍ، وَ شَرِّ جِيْرَانٍ، [2] نَوْمُهُمْ سُهُوْدٌ، وَ

(غرض) لوگوں نے شیطان کی اطاعت کی، اسی کی راہ پر چلنے لگے اور اسی کی گھاٹ اترنے لگے۔ (پس خشکی و تری دونوں پر شیطان ہی کا قبضہ ہے) لہٰذا ان لوگوں کی بدولت شیطان کے جھنڈوں نے رواج پایا اور اس کے نشان قائم ہوئے۔ (غرض لوگ) ایسے فتنوں میں ہیں جو انہیں (اونٹ کی طرح) روندتے اور (گائے بیل کی طرح) پائمال کرتے ہیں اور (خود وہ فتنے) اپنے سموں پر قائم ہیں۔ [1] غرض یہ لوگ انہی (فتنوں) میں سرگرداں، حیران، جاہل اور فتنوں میں مبتلا ہیں۔ گھر تو بہتر ہے (ملک شام جس میں صدہا انبیاء مدفون ہیں) مگر ہمسایہ (اصحاب معاویہ) بہت برے ہیں۔ ان کی نیند بے خوابی ہے (خوف سے اپنے دشمن کے)، اور

---

[1] آنحضرتؐ کے انتقال کے بعد جو فتنے دنیائے اسلام میں نمودار ہوئے ان کو جناب امیرؑ نے شریر اونٹ سے تشبیہ دی ہے جو اپنے پیروں کو جما کر زمین پر کھڑا ہوا اور جو چیزیں سامنے آتی ہوں چاروں طرف سے ان کو روندتا اور پائمال کرتا ہو۔ کہ اس زمانے کے فتنوں کا یہ حال تھا کہ ہر چار طرف سے لوگ باطل سرداروں کے مظالم میں پائمال ہو رہے تھے۔ عقبیٰ تو تباہ ہوتا ہی تھا دنیا بھی برباد ہو رہی تھی اور حضرتؑ نے بغرض تعمیم کل جانوروں کی طرف اشارہ کیا جو روندتے اور پائمال کرتے ہیں۔ اسی سبب سے ''اَخْفَافٌ'' کہا جو اونٹ کے سُم کو کہتے ہیں اور ''اَظْلَافٌ'' بھی کہا جو گائے بکری وغیرہ کے سُم کو کہتے ہیں۔

[2] لفظ ''فِيْ خَيْرِ دَارٍ، وَ شَرِّ جِيْرَانٍ'' میں بھی اختلاف ہے کہ اس سے کیا مراد ہے۔ شارحین نے تین احتمال ذکر کیے ہیں اس احتمال کی بنا پر کہ یہ سب اوصاف زمانۂ جاہلیت کے ہیں۔ خیر دار سے مراد مکہ اور شرِ جیران سے قریش ہیں اور اس احتمال کی بنا پر کہ حضرتؑ اپنے زمانہ کی شکایت فرما رہے ہیں یا تو خیر دار سے مراد شام اور شرِ جیران سے اصحاب معاویہ ہیں یا خیر دار سے مراد عراق اور شرِ جیران سے آپ کے اپنے اصحاب بے وفا ہیں جنہوں نے حضرتؑ کا ساتھ آخر میں چھوڑ دیا۔ مگر صحیح یہی ہے کہ مراد خیر دار سے شام ہے جو مثل مکہ معظّمہ ہمیشہ خیر دار مشہور تھا بخلاف عراق کے کہ اس کی خیریت کبھی بھی نہیں مشہور تھی۔

كُحْلُهُمْ دُمُوْعٌ، بِاَرْضٍ عَالِمُهَا مُلْجَمٌ وَّ جَاهِلُهَا مُكْرَمٌ.

وَ مِنْهَا: يَعْنِيْ قَوْمًا اٰخَرِيْنَ

وَ مِنْهَا: يَعْنِيْ اٰلَ النَّبِيِّ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ

هُمْ مَوْضِعُ سِرِّهٖ، وَ لَجَاُ اَمْرِهٖ، وَ عَيْبَةُ عِلْمِهٖ، وَ مَوْئِلُ حِكَمِهٖ، وَ كُهُوْفُ كُتُبِهٖ، وَ جِبَالُ دِيْنِهٖ، بِهِمْ اَقَامَ انْحِنَآءَ ظَهْرِهٖ، وَ اَذْهَبَ ارْتِعَادَ فَرَآئِصِهٖ.

ان کا سُرمہ آنسو ہے (جو بوجہ صدمات بہتا رہتا ہے۔)[1] (یہ لوگ) ایسی زمین (شام) میں ہیں جہاں کے عالم پر تو ذلت کے لگام چڑھی ہے اور جاہل مکرم ہے۔[2]

اسی خطبہ کا ایک حصّہ جس میں آل نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی طرف اشارہ فرماتے ہیں:

یہی حضرات اسرارِ خدا کے محل، امورِ الٰہی کے ملجا و ماویٰ، علومِ باری کے معدن، اس کی حکمتوں کے مرجع، اس کی کتابوں کے مخزن، اور اس کے دین کے (مثل) کوہ (رکن) محکم ہیں۔ انہی سے خدا نے دین کی پشت کو سیدھی کیا (کہ کجی نہ رہی) اور اس کے شانوں کے رعشہ کو دفع کیا (یعنی انہی حضرات سے دین کو محکم کیا)۔[3]

---

[1] یعنی اصحاب معاویہ شب بھر سامان جنگ میں مصروف رہتے ہیں یا حضرتؑ سے جنگ کرنے کی وہ ہیبت عظیمہ ان کے دلوں میں ہے کہ شب بھر بیداری میں بسر ہوتی ہے اور اپنے بکثرت مقتولین پر چونکہ ہر وقت روتے رہتے ہیں اس وجہ سے ان کی آنکھوں میں بجائے سرمہ کے ہر وقت آنسو بھرے رہتے ہیں۔

[2] عالم سے مراد خود حضرتؑ ہیں کہ آپؑ کی باتیں سنی نہیں جاتیں اور جاہل سے مراد معاویہ ہے جس نے چہار شنبہ کو نماز جمعہ پڑھا دی اور کل مسلمانوں نے پڑھ لی۔ (تاریخ مروج الذہب مسعودی برحاشیہ تاریخ کامل جلد ۶ صفحہ ۱۰۷)

[3] اس خطبہ میں حضرت علیہ السلام نے اہل بیت نبوی علیہم السلام کے اوصاف بیان فرما رہے ہیں۔ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ ''مَوْضِعُ سِرِّهٖ'' سے آخر تک کی ضمیریں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف پھرتی ہیں۔ یعنی آل محمد جناب رسالت مآبؐ کے رازوں کے محل اور ان کے علم کے ظرف ہیں'' لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ ضمیریں خداوند عالم کی طرف راجع ہوتی ہیں یعنی یہ حضرات خداوند عالم کے رازوں کے محل ہیں اس لیے کہ دو ہی جملہ کے بعد ''كُهُوْفُ كُتُبِهٖ، وَ جِبَالُ دِيْنِهٖ'' فرمایا ہے اور ظاہر ہے کہ کتابیں تو خدا کی ہیں اور دین بھی اسی کا ہے۔ پس یہ حضرات ان کتابوں کے حافظ ہیں یعنی وہ تمام علوم و احکام جو آسمانی کتابوں میں خدا نے نازل فرمائے تھے وہ سب ان حضرات کے سینوں میں بھرے ہوئے ہیں اور جس طرح پہاڑوں سے زمین سیدھی ٹھہری ہوئی ہے کہ اگر پہاڑ نہ ہوں تو زمین ہلنے لگے اسی طرح آل محمدؐ کا وجود دین کے لیے ہے کہ اگر یہ حضرات نہ ہوں تو دین اسلام برباد ہو جائے۔

زَرَعُوا الْفُجُوْرَ، وَ سَقَوْهُ الْغُرُوْرَ، وَ حَصَدُوا الثُّبُوْرَ.

لَا يُقَاسُ بِاٰلِ مُحَمَّدٍ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ مِنْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اَحَدٌ، وَ لَا يُسَوّٰى بِهِمْ مَنْ جَرَتْ نِعْمَتُهُمْ عَلَيْهِ اَبَدًا. هُمْ اَسَاسُ الدِّيْنِ، وَ عِمَادُ الْيَقِيْنِ، اِلَيْهِمْ يَفِيْٓءُ الْغَالِيْ وَ بِهِمْ يَلْحَقُ التَّالِيْ، وَ لَهُمْ خَصَآئِصُ حَقِّ الْوِلَايَةِ، وَ فِيْهِمُ الْوَصِيَّةُ وَ الْوِرَاثَةُ، اَلْاٰنَ اِذْ رَجَعَ الْحَقُّ اِلٰٓى اَهْلِهٖ، وَ نُقِلَ اِلٰى مُنْتَقَلِهٖ۔

اسی خطبہ کا حصّہ منافقین [1] کے حق میں انہوں نے (فسق و) فجور کی زراعت کی اور اس کو فریب (کے پانی) سے سینچا اور بربادی کو (بطور حاصل) کاٹ لائے۔

آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر تو اس امت سے کسی کا قیاس نہیں ہو سکتا اور وہ لوگ کیوں کر برابر ہو سکتے ہیں جنہوں نے آنحضرتؐ کی بدولت ہمیشہ نعمت (ہدایت) پائی۔ یہی حضرات اسلام کے بنیاد اور ایمان کے ستون ہیں۔ (دین میں) بڑھ [2] جانے والا انہی کی طرف رجوع کرتا اور پیچھے رہنے والا بھی انہی سے ملحق ہوتا ہے۔ انہی کے لیے حقِ امامت کی خصوصیات ہیں اور انہی (کے حق) میں (آنحضرتؐ کی) وصیت (ہوئی) اور وراثت (پہنچی) ہے۔ [3] (ہاں) اب حق اپنے اہل کی طرف پلٹا اور اپنے مرکز کی طرف منتقل ہوتا ہے۔

---

[1] علامہ ابن ابی الحدید نے بجائے لفظ ''فِيْ قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ'' کے ''فِي الْمُنَافِقِيْنَ'' لکھا ہے اور دوسرے نسخوں میں ''قَوْمًا اٰخَرِيْنَ'' ہے لیکن بہرصورت مراد منافقین ہی ہیں جن میں اصحاب جنگ جمل، اصحاب معاویہ، خوارج سب ہی داخل ہیں۔ اس میں حضرتؑ نے واضح کر دیا کہ آل محمد علیہم السلام کے برابر دنیا میں کوئی بھی نہیں ہے، انہیں حضرات سے لوگوں کو نعمت ہدایت وارشاد اور دولت اسلام وایمان ملی ہے۔

[2] مقصود یہ ہے کہ دین کے سیدھے راستہ سے جو تجاوز کر جاتا ہے اس کو بھی صراط مستقیم پر آنے کے لیے انہیں کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے اور جو لوگ امور دین میں کوتاہی کرنے سے پیچھے رہ جاتے ہیں وہ بھی انہیں سے ملتے ہیں تب راہ راست پر آتے ہیں۔ غرض ہدایت وارشاد اور صراط مستقیم کے معیار صرف یہی حضرات بلکہ عین صراط مستقیم ہیں۔

[3] اس سے ثابت ہوا کہ جناب رسالت مآبؐ نے اپنے اہل بیتؑ کے امام وخلیفہ ہونے کی وصیت بھی فرمائی تھی اور حکم خدا کے مطابق آنحضرتؐ کے وارث بھی یہی حضرات ہوئے۔

❁ خطبہ :۳ ❁

خطبہ (۳)

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

حضرتؑ کے ایک خطبہ کا حصّہ

وَ هِيَ الْمَعْرُوْفَةُ بِالشِّقْشِقِيَّةِ۔

معروف بہ خطبۂ شقشقیہ [۱] ہے۔

اَمَا وَ اللّٰهِ! لَقَدْ تَقَمَّصَهَا[۲] ابْنُ اَبِيْ

خدا کی قسم خلافت کو ابوبکر نے (تنگ) کرتہ کی طرح

---

[۱] یہ وہی معرکۃ الآرا خطبہ شقشقیہ ہے جس میں حضرتؑ نے غصبِ خلافت کے واقعات کو بیان کیا ہے اور زیادہ تر اسی خطبہ کی وجہ سے بعض حضرات اہل سنت اصل نہج البلاغہ کے ہی کلام جناب امیرؑ ہونے سے انکار کرتے ہیں۔ لیکن خود علماء اہل سنت اس کثرت سے اس کو قبول کرتے ہیں کہ انکار ممکن ہی نہیں۔ چنانچہ علامہ سبط ابن جوزی نے اپنی کتاب ''تذکرہ خواص الامۃ'' میں چند روایات سے پورے خطبہ کو نقل کیا ہے اور اسے کلام جناب امیرؑ تسلیم کیا ہے۔ اسی طرح علامہ ابن اثیر جزری نے اپنی کتاب ''نہایہ'' میں ۱۵ مقام پر، علامہ محمد طاہر گجراتی نے ''مجمع البحار'' میں، علامہ فیروزہ آبادی نے ''قاموس'' میں، ابوالفضل میدانی نے ''مجمع الامثال'' میں، ابن خشاب نے اپنے شاگرد کے درس دینے میں، حسن ابن عبداللہ بن مسعود عسکری صاحب کتاب ''مواعظ وزواجر'' نے اپنے شرح میں جو اس خطبہ کی لکھی ہے اور علاء الدولہ شمنانی نے کتاب ''العروۃ الوثقیٰ'' میں تصریح کی ہے کہ خطبہ شقشقیہ کلامِ حضرت علیؑ ہے اور علامہ تفتازانی نے ''شرح مقاصد'' میں، علامہ قوشجی نے ''شرح تجرید'' میں، علامہ گازرونی نے ''شرح مصابیح'' میں، ملا یعقوب لاہوری نے ''شرح تہذیب'' میں، امام شوکانی نے کتاب ''اتحاف الاکابر باسناد الدفاتر'' میں، علامہ ابن ابی الحدید نے شرح میں اعتراف کیا ہے کہ نہج البلاغہ کلام جناب امیرؑ ہے بلکہ علامہ ابن ابی الحدید نے اس خطبہ کے کلام جناب امیر علیہ السلام سے ہونے کی دلچسپ بحث لکھی ہے۔ اس خطبہ کے مورد کے متعلق ''معانی الاخبار''، ''امالی''، ''علل الشرائع'' وغیرہ میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ ایک دفعہ بارگاہ حضرت امیر المومنینؑ میں تذکرہ خلافت ہوا تو حضرتؑ نے فرمایا۔ ''اَمَا وَ اللّٰهِ! لَقَدْ تَقَمَّصَهَا ابْنُ اَبِيْ قُحَافَةَ''۔

[۲] قَوْلُهٗ: اَمَا وَ اللّٰهِ! لَقَدْ تَقَمَّصَهَا۔ اگرچہ ظلم دنیا میں ہمیشہ ہوا ہے اور اس کی شکایت بھی ہمیشہ کی گئی ہے مگر جس طرح جناب سیدہؑ کے شعر:

صُبَّتْ عَلَيَّ مَصَائِبُ لَوْ اَنَّهَا ۔۔۔ صُبَّتْ عَلَى الْاَيَّامِ صِرْنَ لَيَالِيَا

مجھ پر تن تنہا اتنی مصیبتیں پڑیں کہ اگر وہ تمام دنوں پر پڑتیں تو کل دن شب تیرہ وتاریک ہو جاتے۔

کو خصوصیت ہے کہ ابتدائے قیام دنیا سے آج تک کسی زبان کے کسی شاعر یا ادیب یا مصیبت زدہ کو یہ تشبیہ نہ سوجھی، اسی طرح ''لَقَدْ تَقَمَّصَهَا'' بھی جناب امیرؑ کا ایسا لفظ ہے جس کی نظیر کہیں بھی نہیں ملتی کہ کسی نے بھی ظلم یا غصب سلطنت وحکومت میں اس لفظ کو استعمال کیا ہو۔ لہٰذا حضرتؑ کا یہ کلام بجائے خود ایک معجزہ ہے۔ کیونکہ اس ایک لفظ سے حضرتؑ نے ظالم وغاصب خلافت کے ان حالات و اطوار کو ظاہر کر دیا جو بڑی بڑی کتابوں میں بھی نہیں بیان ہو سکتے کیونکہ دنیا میں جس قدر لباس ہیں دو ہی غرض سے مستعمل ہوتے ہیں یا ستر کے لیے جیسے پائجامہ، شلوار، لنگی وغیرہ یا زینت کے لیے جیسے تاج، عبا، رداء، کساء۔ مگر کرتہ کی پوشش نہ بغرض ستر ہوتی ہے جو واجب ہو نہ بغرض زینت کے جو مستحب ہو بلکہ محض بغرض آسائش نفس وآرام ہے لہٰذا ممکن ہے کہ حضرتؑ نے اس لفظ کو اس (بقیہ صفحہ مابعد)

قُحَافَةَ، وَ اِنَّهٗ لَيَعْلَمُ اَنَّ مَحَلِّيْ (کھینچ تان کر) پہن لیا۔ حالانکہ وہ جانتے تھے کہ میرا
مِنهَا مَحَلُّ الْقُطْبِ مِنَ الرَّحٰى، مرتبہ اس میں ایسا ہے جیسا میخ کا چکّی ۳؎ میں (کیونکہ علم و

(بقیہ صفحہ ماقبل) لیے اختیار کیا ہو کہ ان لوگوں نے جو خلافت پر قبضہ کیا تو نہ کسی دینی ضرورت سے، نہ کسی قومی مفاد سے بلکہ محض اپنی آسائش نفس اور ذاتی اغراض سے اس پر متصرف ہوئے۔

حضرات اہل سنت نے اس تحصیل خلافت کو ایسا اہم قرار دیا ہے کہ کہتے ہیں یہ ایسا ضروری امر تھا کہ صحابہ نے دفن وکفنِ رسول پر اس کو ترجیح دی۔ مگر جو لوگ عقل رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ انتہا درجہ کے حرص کی دلیل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جناب امیرؑ نے مطلقاً ادھر توجہ نہ کی جب تک آپ دفن وکفن رسول سے فارغ نہ ہو لیے۔ حق یہ ہے کہ امام کا ہر فعل ہر قول معجزہ ہوتا ہے۔ دیکھیے صرف اسی موقع پر جناب امیرؑ نے دفن وکفن کی اہمیت نہیں ظاہر کی جس میں کسی عاقل کو بھی شبہ نہیں ہوسکتا بلکہ جب چوتھے درجہ میں آپ کو خلافت حاصل ہوئی ہے تو حضرتؑ فرماتے ہیں:

فَقُلْتُ وَاللّٰهِ اِنِّيْ لَاَسْتَحْيِيْ اَنْ اُبَايِعَ قَوْمًا قَتَلُوْا عُثْمَانَ وَ اِنِّيْ لَاَسْتَحْيِيْ مِنَ اللّٰهِ اَنْ اُبَايِعَ وَ عُثْمَانُ لَمْ يُدْفَنْ بَعْدُ۔ (صواعق محرقہ، ص ٦٧)

کہ لوگوں نے مجھ سے بیعت کے لیے کہا تو میں نے کہا خدا کی قسم مجھے اس سے شرم آتی ہے کہ ان لوگوں کی بیعت لوں جنہوں نے عثمان کو قتل کیا اور مجھے اس سے بھی شرم آتی ہے کہ ابھی تک عثمان نہیں دفن ہوئے اور میں بیعت لینا شروع کر دوں۔

آہ کیا یہ جملہ کوئی صحابی دفن رسولؐ کی نسبت نہیں کہہ سکتا تھا کہ جب تک حضرتؐ دفن نہ ہو لیں گے کوئی کام نہ ہوگا؟ غرض حضرتؑ نے جو لفظ ''تَقَمَّصَهَا'' فرمایا ہے اس میں اس طرف واضح اشارہ ہے کہ ان لوگوں نے جو خلافت کو حاصل کیا تو محض ذاتی اغراض سے۔ دوسرے یہ کہ قمیص ایک ایسا لباس ہے جو پورے طور پر اغراض انسانی کو کافی نہیں ہوتا بلکہ کم از کم عمامہ کی احتیاج باقی رہ جاتی ہے تو ممکن ہے کہ حضرتؑ نے اس طرف اشارہ فرمایا ہو کہ گو ان لوگوں نے اس کو قمیص بنا لیا مگر کسی طرح کافی نہیں ہوا بلکہ اور لباس کا محتاج رہ گیا۔ تیسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ جس طرح قمیص کل لباسوں میں سبک ہوتا ہے اسی طرح اس خلافت کو انہوں نے بالکل خفیف سمجھا۔ غرض حضرتؑ نے اس ایک لفظ سے بتا دیا کہ ان لوگوں کا سلوک خلافت رسول کے ساتھ کیسا تھا کہ اس کو ایک معمولی کرتہ قرار دیا جس کو اگر نااہل کھینچ تان کر پہنتا ہے تو جلد پھٹ جاتا ہے یا ایسا بدنما معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص کہے اس نے دوسرے کا کپڑا پہن لیا ہے۔

قَوْلُهٗ: اِبْنُ اَبِيْ قُحَافَةَ بعض نسخوں میں بجائے اس کے لفظ فلاں ہے اور بعض میں صریح یہی نام ہے اور یہی حق ہے۔ چنانچہ علامہ ابن ابی الحدید نے بھی ابن ابی قحافہ ہی لکھا ہے۔

۳؎۔ قَوْلُهٗ: وَ اِنَّهٗ لَيَعْلَمُ ۔ یعنی ابوبکر کو علم الیقین معلوم تھا کہ ہمارے سوا کوئی مستحق خلافت نہیں ہے، بنظر ان آیات کے جو آپ کی شان میں قرآن میں نازل ہوئیں یا احادیث متواترہ کے جن کو رسول اللہؐ وقت بعثت سے وقت رحلت تک فرماتے رہے اور بنظر ان خدمات اسلام کے جو حضرتؑ تاحیات رسولؐ انجام دیتے رہے اور بہ سبب ان علمی فضائل وکمالات اور دینی خصوصیات کے جو حضرتؑ کو حاصل تھے اور ''مَحَلِّيْ مِنهَا مَحَلُّ الْقُطْبِ مِنَ الرَّحٰى''، میں حضرتؑ نے ان کل اوصاف کو جمع کر دیا ہے جو تقمّص کے خلاف ہے، کیونکہ کرتہ پہننا ذاتی اغراض کے لیے ہوتا ہے اور چکی اغراض عامہ، کے لیے اس لیے آپ نے خلافت کو چکی سے (بقیہ صفحہ مابعد)

يَنْحَدِرُ عَنِّي السَّيْلُ، وَ لَا يَرْقٰى اِلَيَّ الطَّيْرُ،

حکمت و ہدایت کا) سیل مجھ ہی سے گر کر نیچے آتا ہے اور میرے مرتبہ کی بلندی تک پرندہ بھی پَر نہیں مار سکتا۔ (ان

(بقیہ صفحہ ماقبل) تشبیہ دی کہ اس کی غرض خلائق کی نفع رسانی ہوتی ہے اور اپنی ذات اقدس کو اس کے قطب سے تشبیہ دی جس کے بغیر کسی طرح چکی چل نہیں سکتی، پس جس طرح چکی بغیر قطب کے اپنا کام انجام نہیں دے سکتی اسی طرح خلافت رسول تھی کہ بغیر حضرت امیر المومنینؑ کے اس کی حقیقی خدمات اور صحیح فرائض انجام نہیں پا سکتے۔

غرض حضرتؑ نے اس جملہ سے خلافت کی عظمت و جلالت قدر کی طرف بھی اشارہ کیا کہ یہ ایسی نہیں ہے کہ جو چاہے قمیص بنا کر پہن لے اور جب چاہے اتار دے جیسا کہ حضرت عثمان نے کہا ''لَا اَنْزَعُ قَمِيْصًا لَبَسَنِيَ اللّٰهُ'' کہ ''ہم وہ کرتہ نہ اتاریں گے جو خدا نے پہنا دیا'' بلکہ یہ مثل آسیا ہے جس کی غرض محض نفع رسانی خلائق ہے اور خدا ہی مقرر کرتا ہے اور اس طرف بھی اشارہ کیا کہ جس طرح چکی چلنے کے لیے اس کے اندر قطب کا ہونا ضروری ہے اسی طرح خلافت کے لیے میرا وجود لازمی ہے۔ اسی طرح ممکن ہے آنحضرتؐ کی اس حدیث کی طرف بھی اشارہ ہو کہ

تَدُوْرُ رَحَى الْاِسْلَامِ مِنْ مُهَاجِرِكَ فَتَلْبَثُ بِذٰلِكَ عَشْرًا ثُمَّ تَدُوْرُ رَحَى الْاِسْلَامِ عَلٰى رَاْسِ خَمْسٍ وَّثَلَاثِيْنَ مِنْ مُّهَاجِرِكَ فَتَلْبَثُ بِذٰلِكَ خَمْسًا، ثُمَّ لَا بُدَّ مِنْ رَحٰى ضَلَالَةٍ هِيَ قَائِمَةٌ عَلٰى قُطْبِهَا، ثُمَّ مُلْكُ الْفَرَاعِنَةِ۔

یعنی آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا کہ جبرئیل امین نے مجھے خبر دی ہے کہ اسلام کی چکی تمہاری ہجرت کے بعد دس برس تک چلے گی پھر تمہاری ہجرت کے پینتیس برس بعد پانچ برس تک چلے گی اس کے بعد گمراہی کی چکی ہے جو اپنے قطب پر قائم ہوگی پھر ملک فراعنہ ہے۔

تو حضرتؑ نے اس جملہ سے اس حدیث کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ اسلام یا خلافت سے ہم کو وہی نسبت ہے جو قطب کو رحی سے ہوتی ہے جس کی خبر آنحضرتؐ بھی دے گئے ہیں کہ میری وفات کے بعد یہ چکی بند ہو جائے گی چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ آنحضرتؐ کے انتقال کرتے ہی حقیقی اسلام کی اشاعت رک گئی آخر جب آنحضرتؐ کے ارشاد کے مطابق ۳۵ھ کے بعد جناب امیر المومنینؑ خلیفہ ہوئے تو پھر حقیقی اسلام کی اشاعت ہونے لگی۔

قَوْلُهٗ: يَنْحَدِرُ عَنِّي السَّيْلُ، وَ لَا يَرْقٰى اِلَيَّ الطَّيْرُ۔ میں حضرتؑ نے اپنے نفس مقدس کو اس عالی شان پہاڑ سے تشبیہ دی ہے جہاں پرندے بھی نہیں پہنچ سکتے۔ اگر صرف ''يَنْحَدِرُ عَنِّي السَّيْلُ'' فرماتے تو یہ ضرور معلوم ہوتا کہ آپ کی شان بہت ارفع و اجل ہے مگر یہ نہ معلوم ہوتا کہ وہاں تک اور کسی کی بھی رسائی نہیں ہو سکتی۔ غرض اس سے یہ ہے کہ آپ ہر کمال کے جامع ہیں جس سے ہر قسم کے علم اور سیاسیات کا فیضان آپ سے ہوتا ہے اور آپ کو خدا نے ایسا درجہ رفیعہ عطا کیا ہے کہ طائر خیال بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتا پھر کیوں کر ایسے شخص کے رہتے پسر ابوقحافہ نے خلافت کا کرتہ پہن لیا اور قوم نے بھی پہنا دیا۔ علامہ مفتی محمد عبدہ جو حال کے علمائے مصر میں بہت مشہور عالم گزرے ہیں اور جنہوں نے نہج البلاغہ کی شرح بھی لکھی ہے اس جملہ کی شرح میں لکھتے ہیں: (بقیہ صفحہ ماقبل)

فَسَدَلْتُ دُوْنَهَا ثَوْبًا، وَ طَوَيْتُ عَنْهَا كَشْحًا، وَ طَفِقْتُ اَرْتَئِیْ بَيْنَ اَنْ اَصُوْلَ بِيَدٍ جَذَّآءَ، اَوْ اَصْبِرَ عَلٰى طَخْيَةٍ عَمْيَآءَ،

سب کے ساتھ غصب خلافت کے وقت) میں نے پردہ (صبر) گرالیا، اس سے پہلوتہی کر لی اور سوچنے لگا کہ آیا (اپنے) دست بریدہ سے حملہ کر بیٹھوں یا اس اندھیر پر صبر کرلوں جس کے صدمہ میں بڑے توضیعف اور چھوٹے

(بقیہ صفحہ سابق) ''تَمْثِيْلٌ لِلسَّمُوِّ قَدْرِهٖ كَرَّمَ اللّٰهُ وَجْهَهٗ وَقُرْبِهٖ مِنْ مَّهْبِطِ الْوَحْيِ وَاَنَّ مَا يَصِلُ اِلٰى غَيْرِهٖ مِنْ فَيْضِ الْفَضْلِ فَاِنَّمَا يَنْدَفِقُ مِنْ حَوْضٍ ثُمَّ يَنْحَدِرُ مِنْ مَّقَامِهِ الْعَالِیْ فَيُصِيْبُ مِنْهُ مَنْ شَاءَ اللّٰهُ وَعَلٰى ذٰلِكَ قَوْلُهٗ وَلَا يَرْقٰى الخ غَيْرَ اَنَّ الثَّانِیَ اَبْلَغُ مِنَ الْاُوْلٰى فِی الدَّلَالَةِ عَلَى الرِّفْعَةِ''۔ (صفحہ ۲۲)

یعنی يَنْحَدِرُ عَنِّی السَّيْلُ میں حضرتؑ نے اپنی جلالت قدر کو ظاہر کیا ہے کہ کس قدر آپ قریب ہیں مہبط وحی سے اور جو کچھ غیروں کو ملتا ہے وہ حضرتؑ ہی کا فیضان ہے کہ ہر شخص بقدر اپنے حوصلہ کے پاتا ہے اور وہیں سے اس کا فیضان ہوتا ہے اسی طرح حضرتؑ کا قول ''لَا يَرْقٰى اِلَیَّ الطَّيْرُ'' ہے مگر بہ نسبت پہلے جملہ کے اس جملہ سے آپ کی کمال رفعت پر زیادہ دلالت ہوتی ہے''۔

مفتی صاحب کی یہ تشریح کہ حضرتؑ مہبط وحی سے زیادہ قریب ہیں غالباً اشارہ ہے حدیث ''اَنَا مَدِيْنَةُ الْعِلْمِ وَ عَلِیٌّ بَابُهَا'' کی طرف کیونکہ اگرچہ اور صحابہ بھی آنحضرتؐ ہی سے فیض پاتے مگر یہ درجہ کسی کو نہ حاصل ہوسکا جو شہر علم نبی کا دروازہ ہو سکے لہٰذا جملہ فیوض کی انتہا جناب امیرؑ ہی کی طرف ہوئی اور واقعات تاریخی بھی اس کے شاہد ہیں کہ خلفاء اور صحابہ کی کس کس طرح حضرتؑ نے مدد فرمائی ہے اور غوامضِ علوم و اسرارِ حکم کو حل کر کے کس طرح تعلیم فرماتے رہے ہیں خواہ وہ قضا اور دیگر علمی مسائل کے متعلق ہوں خواہ سیاسیات ملکی کے متعلق۔

قَوْلُهٗ : فَسَدَلْتُ دُوْنَهَا ثَوْبًا، وَ طَوَيْتُ عَنْهَا كَشْحًا۔ اس کی شرح میں علامہ ابن ابی الحدید اور مفتی محمد عبدہ نے صرف ''اَرْخَيْتُ'' لکھا ہے لیکن ''اَرْخَيْتُ'' یا ''اَلْقَيْتُ'' نہ لانا اور ''سَدَلْتُ'' فرمانا کوئی خاص معنی رکھتا ہے۔ مجمع بحارالانوار، ص ۱۰۵ میں ہے:

فِيْهِ نَهٰى عَنِ السَّدْلِ فِی الصَّلَاةِ وَهُوَ اَنْ يَّلْتَحِفُ بِثَوْبِهٖ وَ يُدْخِلَ يَدَيْهِ مِنْ دَاخِلٍ فَيَرْكَعُ وَيَسْجُدُ كَذٰلِكَ وَكَانَتِ الْيَهُوْدُ تَفْعَلُهٗ وَهٰذَا مُطَّرِدٌ فِی الْقَمِيْصِ مِنَ الثِّيَابِ۔

یعنی سدل کے معنی یہ کہ کپڑے کو اس طرح لپیٹ لے کہ دونوں ہاتھوں کو اندر سے داخل کرے اور اس طرح رکوع و سجود کرے۔ یہود ایسا ہی کرتے تھے مگر آنحضرتؐ نے اس سے منع کیا۔ اس کا استعمال قمیص وغیرہ میں زیادہ جاری ہے۔

يَهْرَمُ فِيْهَا الْكَبِيْرُ، وَ يَشِيْبُ فِيْهَا الصَّغِيْرُ، وَ يَكْدَحُ فِيْهَا مُؤْمِنٌ حَتّٰى يَلْقٰى رَبَّهٗ. فَرَاَيْتُ اَنَّ الصَّبْرَ عَلٰى هَاتَآ اَحْجٰى،

بوڑھے ہو جائیں اور مومن رنج وصدمہ اٹھاتا رہے یہاں تک کہ اپنے رب سے ملاقات کرے، تو مجھے اس (مصیبت) پر صبر ہی مناسب معلوم ہوا۔ لہٰذا میں نے صبر کیا (مگر) اس طرح کہ (اس صدمہ سے گویا میری) آنکھ

(بقیہ صفحہ ماقبل) تو چونکہ جناب امیرؑ نے ابوبکر کی نسبت فرمایا ''لَقَدْ تَقَمَّصَهَا'' یعنی ''قمیص بنا کر ابوبکر نے خلافت کو لے لیا'' لہٰذا اسی مناسبت سے یہ لفظ لائے کہ جب ایسا ہوا تو ہم نے بھی اس طرح کی چادرِ صبر وتحمّل لپیٹ لی جس سے ہاتھ پیر سب گھر گئے اور ہم نے کسی طرح جنبش نہیں کی۔

قَوْلُهٗ : يَهْرَمُ فِيْهَا ۔۔۔ يَلْقٰى رَبَّهٗ۔ حضرتؑ نے زمانہ خلافت خلفائے ثلاثہ کے اوصاف میں یہ سب جملے ارشاد فرمائے ہیں کہ یہ زمانہ ایسے اندھیر اور سختی کا تھا کہ بڑے بوڑھے ہو جائیں اور لڑکے بوڑھے ہو جائیں، مومن مشقت میں رہے یہاں تک کہ خدا سے ملاقات کرے۔ ان اوصاف کے بعد کوئی شخص باور کر سکتا ہے کہ جس زمانہ کی یہ حالت ہو اس کو آنحضرتؐ ''خَيْرُ الْقُرُوْنِ'' فرمائیں؟ جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے اور اس کی رد تنقید ''بخاری جلد ۴'' میں بتصریح مذکور ہے۔

قَوْلُهٗ : فَرَاَيْتُ اَنَّ الصَّبْرَ عَلٰى هَاتَآ اَحْجٰى ۔ یعنی اسلام کی حفاظت مجھے اسی میں نظر آئی کہ میں صبر کروں''۔ رہا یہ امر کہ ایسی حالت میں صبر کرنا حضرتؑ کے نزدیک قرین عقل کیوں قرار پایا تو اس کی تصریح کی ضرورت نہیں کیونکہ مقصود آپ کا کوئی ذاتی نفع یا آسائش تو تھی نہیں جس کو آپ نے جملہ ''مَحَلِّيْ مِنْهَا مَحَلُّ الْقُطْبِ مِنَ الرَّحٰى'' سے بھی ظاہر کر دیا ہے بلکہ محط نظر صرف اقامت دین تھا۔ مطابق قواعد شرعیہ کے کہ جس دین کامل کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لائے تھے وہ مطابق انہی احکام کے جاری ہو اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کل مسلمان تابع احکام شریعت ہوں یا آپ کو ایسے اعوان وانصار ملیں جو آپ کی نصرت کریں اور مخالفین کو راہ حق پر لائیں لیکن یہاں معاملہ برعکس ہے کہ تمام مسلمانوں نے اس طرح احکام شریعت سے روگردانی کر لی کہ کسی کو آنحضرتؐ کے دفن وکفن کی بھی فکر نہ ہوئی ایسی حالت میں جناب امیرؑ کیا کر سکتے تھے لہٰذا صبر کرنا ہی انسب واولیٰ قرار پایا۔

اس مطلب کو حضرت نے حدیث رافع بن رافع میں اور بھی توضیح سے بیان کیا ہے۔ استیعاب جلد اول صفحہ ۱۸۲ میں ہے:

قَالَ عَلِيٌّ، اَلْعَجَبُ لِطَلْحَةَ وَالزُّبَيْرِ، اِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ لَمَّا قَبَضَ رَسُوْلَهٗ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قُلْنَا نَحْنُ اَهْلُهٗ وَاَوْلِيَاؤُهٗ لَا يُنَازِعُنَا سُلْطَانَهٗ اَحَدٌ فَاَبٰى عَلَيْنَا قَوْمُنَا فَوَلَّوْا غَيْرَنَا وَاَيْمُ اللّٰهِ لَوْلَا مَخَافَةُ الْفُرْقَةِ وَاَنْ يَّعُوْدَ الْكُفْرُ وَيَبُوْءُ الدِّيْنُ لِغَيْرِنَا فَصَبَرْنَا عَلٰى مَضَضٍ مِّمَّا لَمْ۔

جناب امیرؑ نے کہا تعجب ہے طلحہ وزبیر سے کیونکہ جب رسول خداؐ نے انتقال کیا تو ہم نے کہا ہم حضرتؐ کے ولی اور مستحق تر ہیں اس خلافت کے مگر قوم نے انکار کیا اور غیروں کو خلیفہ بنا لیا۔ خدا کی قسم اگر اسلام میں تفرقہ پڑ جانے، کفر کے لوٹ آنے اور دین پر دوسروں کے قبضہ ہو جانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو دیکھ لیتے لیکن انہیں وجوہ سے ان سختیوں پر ہم نے صبر کیا۔

(بقیہ صفحہ بالا)

فَصَبَرتُ وَ فِی الْعَیْنِ قَذًی، وَ فِی الْحَلْقِ شَجًا، اَرٰی تُرَاثِیْ نَهْبًا.

میں خس وخاشاک پڑا تھا اور حلق میں ہڈی پھنسی تھی۔ میں اپنی میراث (خلافت وفدک کو) لٹتی ہوئی دیکھ رہا تھا۔

(بقیہ صفحہ ماقبل) یہ روایت اچھی طرح بتا رہی ہے کہ حضرتؑ نے محض اس خیال سے کہ قوم میں تفریق نہ پیدا ہو اور دین اسلام مضمحل ہو کر کفار کو غلبہ نہ ہو، ترک منازعات کیا جس کی تائید ان واقعات سے بھی ہوتی ہیں کہ ابوسفیان جو قوم مفتوح سے تھا آ کر جناب امیرؑ کو طلب خلافت پر اُبھار رہا ہے اور حضرتؑ اس کو ڈانٹ رہے ہیں کہ تو ہمیشہ کا دُشمن اسلام ہے مگر خلیفہ اول و دوم باوصفی کہ خلافت پر کامیاب ہیں اس سے ڈر رہے ہیں اور اس کو ملا رہے ہیں (جس کی تفصیل آئندہ آئے گی)۔ جس سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اگر جناب امیرؑ اس وقت صبر وسکوت نہ فرماتے تو اسلام مٹ چکا تھا کیونکہ خلفائے ثلاثہ ہر طرح کی سازش پر تیار تھے اگرچہ اسلام نیست و نابود ہی کیوں نہ ہو جائے۔ غرض ان مجموعی حالات کی طرف اشارہ کر کے حضرتؑ فرماتے ہیں کہ ان متضاد حالات پر غور کر کے ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ کٹے ہوئے ہاتھوں سے حملہ کرنا نہیں مقتضائے وقت و مصلحت ہے بلکہ صبر کرنا اس حالت میں زیادہ مناسب ہے۔ (بقیہ حواشی ضمیمہ میں ہیں)

قَوْلُهٗ : فَصَبَرتُ وَ فِی الْعَیْنِ قَذًی، وَ فِی الْحَلْقِ شَجًا۔ حضرت امیر المومنینؑ فرماتے ہیں کہ غصب خلافت پر میں نے صبر کیا (مگر) اس طرح کہ اس صدمہ سے (گویا میری) آنکھ میں خس وخاشاک پڑا تھا اور حلق میں ہڈی پھنسی تھی۔ اس سے بڑھ کر کوئی جملہ نہیں ہو سکتا جس میں کوئی شخص اپنی روحانی تکلیف کو ظاہر کر سکے کیونکہ عرب کا مشہور فقرہ ہے۔

لَا وَجَعَ اِلَّا وَجَعُ الْعَیْنِ، وَلَا هَمَّ اِلَّا هَمُّ الدِّیْنِ۔

یعنی نہ آنکھ کے درد سے بڑھ کر کوئی درد ہے نہ دین کی فکر سے بڑھ کر کوئی فکر ہے۔

اسی کو حضرتؑ فرماتے ہیں کہ یہ زمانہ اندھیر ایسا سخت اور ناگوار تھا کہ اس پر صبر کرنا ایسا تھا جیسے کوئی دردِ چشم پر صبر کرے یا اس حالت پر کہ حلق میں ہڈی یا لقمہ پھنسا ہوا ہے کہ نہ کچھ بول سکتا ہے نہ کوئی تدبیر کر سکتا ہے، یہی حالت اس زمانہ کی تھی کہ زندہ تھے اور دیکھتے تھے مگر اختیار نہ تھا کہ اس مصیبت کو دفع کریں۔

قَوْلُهٗ : اَرٰی تُرَاثِیْ نَهْبًا۔ یعنی میں اپنی میراث (خلافت وفدک) کو لٹتی ہوئی دیکھ رہا تھا۔ اس سے اشارہ ہے طرف آیہ کریمہ :

﴿ وَ تَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا وَّ تُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ﴾ (سورۂ الفجر، آیہ ۱۹۔۲۰)

کہ تم لوگ میراث کے مال کو سمیٹ کر کھائے جاتے ہو اور مال کو بہت ہی پیارا رکھتے ہو۔

جس کی تصریح خداوند عالم نے سورۂ آل عمران میں فرمائی ہے:

﴿ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ﴾

کہ اے صحابہ بعض تم سے دنیا کے طلبگار رہو اور بعض آخرت کے۔

مطلب حضرتؑ کا اس جملہ سے یہ ہے کہ خدا نے جن لوگوں کی حالت قرآن میں بتائی تھی وہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ ہماری میراث لٹ رہی تھی اور کسی کو اس کی فکر نہ تھی کہ کوئی تو ان صحابہ سے حق کا طرفدار ہوتا اور بتاتا کہ یہ کیا ظلم (بقیہ صفحہ مابعد)

حَتّٰی مَضَی الْاَوَّلُ لِسَبِیْلِہٖ، فَاَدْلٰی بِھَا اِلَی ابْنِ الْخَطَّابِ بَعْدَہٗ۔

یہاں تک کہ پہلے صاحب نے اپنی راہ لی تو اپنے بعد اس (خلافت) کو عمر ابن الخطاب کی طرف جھونکتے گئے۔

(بقیہ صفحہ ماقبل) ہورہا ہے۔ میراث مطلب حضرتؑ کا اس جملہ سے یہ ہے کہ خدا نے جن لوگوں کی حالت قرآن میں بتائی تھی وہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ ہماری میراث لٹ رہی تھی اور کسی کو اس کی فکر نہ تھی کہ کوئی تو ان صحابہ سے حق کا طرفدار ہوتا اور بتاتا کہ یہ کیا ظلم ہورہا ہے۔ میراث سے اگر فدک مراد لیں تو بھی ممکن ہے لیکن خلافت کا مراد لینا زیادہ انسب ہے کیونکہ حضرتؑ نے دعوت عشیرۃ میں جناب امیرؑ کے نسبت فرمایا تھا:

''اَنْتَ اَخِیْ وَ وَارِثِیْ وَ وَزِیْرِیْ وَ خَلِیْفَتِیْ''

تو جس میراث کو رسول نے اول روز آپ کے حوالے کیا تھا اسی کی نسبت جناب امیرؑ فرماتے ہیں:

''اَرٰی تُرَاثِیْ نَھْبًا'' چنانچہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں:

''قَوْلُہٗ: اَرٰی تُرَاثِیْ نَھْبًا کَنّٰی عَنِ الْخِلَافَ بِالتُّرَاثِ وَھُوَ الْمَوْرُوْثُ مِنَ الْمَالِ''۔

کہ حضرتؑ نے ''تُرَاثِیْ'' سے خلافت کو مراد لیا۔

قَوْلُہٗ: حَتّٰی مَضَی الْاَوَّلُ لِسَبِیْلِہٖ: یعنی ان ظلموں کی ابتدا جو بعد وفات رسول ہوئی اس وقت تک باقی رہی کہ خلیفہ اول نے اپنی راہ لی۔ اس میں بھی عجب طرح کا کنایہ ہے کہ حضرتؑ نہ ان کے جنتی ہونے کو فرماتے ہیں نہ دوزخی ہونے کو، بلکہ گول لفظوں میں فرماتے ہیں اپنی راہ لی، جس سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ان کی راہ کیا تھی۔

قَوْلُہٗ: فَاَدْلٰی بِھَا اِلَی ابْنِ الْخَطَّابِ بَعْدَہٗ۔ شرح ابن ابی الحدید میں ہے:

قَوْلُہٗ: فَاَدْلٰی بِھَا مِنْ قَوْلِہٖ تَعَالٰی ﴿وَ لَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ وَ تُدْلُوْا بِھَآ اِلَی الْحُکَّامِ﴾ اَیْ تَدْفَعُوْھَا اِلَیْھِمْ رِشْوَۃً ۔ وَ اَصْلُہٗ مِنْ اَدْلَیْتُ الدَّلْوَ فِی الْبِئْرِ اَرْسَلْتُھَا فَاِنْ قُلْتَ فَاِنَّ اَبَابَکْرٍ اِنَّمَا دَفَعَھَا اِلٰی عُمَرَ حِیْنَ مَاتَ وَلَا مَعْنٰی لِلرِّشْوَۃِ عِنْدَ الْمَوْتِ۔ قُلْتُ لَمَّا کَانَ عَلَیْہِ السَّلَامُ یَرٰی اَنَّ الْعُدُوْلَ بِھَا عَنْہُ اِلٰی غَیْرِہٖ اِخْرَاجُھَا لَھَا اِلٰی غَیْرِ جِھَۃِ الْاِسْتِحْقَاقِ شَبَّہَ ذٰلِکَ بِاِدْلَاءِ الْاِنْسَانِ بِمَالِہٖ اِلَی الْحَاکِمِ فَاِنَّہٗ اِخْرَاجٌ لِلْمَالِ اِلٰی غَیْرِ وَجْھِہٖ فَکَاَنَّ ذٰلِکَ مِنْ بَابِ الْاِسْتِعَارَۃِ۔

یعنی حضرتؑ کا کلام ''فَاَدْلٰی بِھَا'' ماخوذ ہے آیہ کریمہ ﴿وَ لَا تَاْکُلُوْٓا﴾ الآیہ یعنی ''نہ کھاؤ اپنے مالوں کو اپنے درمیان باطل کے ذریعہ سے اور نہ ان کو اپنے حکام کی خدمت میں بطور رشوت پیش کرو'' سے۔ اس کی اصل ''اَدْلَیْتُ الدَّلْوَ فِی الْبِئْرِ'' ہے کہ ''میں نے ڈول کنویں میں لٹکایا''۔ پس اگر کوئی کہے کہ ابوبکر نے تو مرتے وقت خلافت عمر کے حوالے کی پھر اس وقت یہ رشوت کیوں کر کہی جائے گی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ حضرتؑ نے دیکھا کہ اس خلافت کا آپ سے ہٹا کر دوسرے کی طرف لے جانا بلا وجہ استحقاق دوسرے کو دینا ہے لہذا اس کو اس سے تشبیہ دی کیونکہ یہ بھی مال کا بغیر کسی وجہ کے خارج کرنا ہے۔ پس یہ گویا باب استعارہ سے ہے۔ (بقیہ صفحہ مابعد)

(بقیہ صفحہ ماقبل) اس شرح سے یہ تو معلوم ہوا کہ جناب امیرؑ نے حضرت ابوبکر کی حوالگیٔ خلافت کو اس آیہ کے ماتحت قرار دیا مگر معترض کا یہ کہنا کہ ابوبکر نے تو بوقت موت عمر کو خلافت دی جس سے وہ رشوت سے خارج ہے درست نہیں، کیونکہ جناب امیرؑ نے اس کو تو اسی روز ظاہر فرمایا جس روز حضرت عمر جناب امیرؑ سے بیعت ابوبکر کے طلب گار ہوئے۔

فَقَالَ لَهٗ عَلِيٌّ: اِحْلِبْ حَلَبًا لَكَ شَطْرَهٗ، وَشُدَّ لَهُ الْيَوْمَ يُرْدِدْهُ عَلَيْكَ غَدًا۔

کہ حضرت علیؑ نے فرمایا اے عمر آج اس دودھ کو دوہ لو جس کا ایک حصّہ تمہارے لیے ہے اور ابوبکر کی خلافت آج مستحکم کر دو تا کہ کل وہ تمہیں لوٹا دیں (کتاب الامامۃ والسیاسۃ لابن قتیبہ مطبوعہ مصر ص ۱۹)۔

پھر جب لفافہ سربمہر خلیفہ اول کا پیش ہوا کہ اس پر بیعت کیجیے۔

فَقَالَ لَهٗ رَجُلٌ مَا فِي الْكِتَابِ يَا اَبَا حَفْصٍ؟ قَالَ لَا اَدْرِيْ وَلٰكِنِّيْ اَوَّلُ مَنْ سَمِعَ وَ اَطَاعَ قَالَ لٰكِنِّيْ وَاللّٰهِ اَدْرِيْ مَا فِيْهِ، اَمَّرْتَهٗ عَامَ اَوَّلٍ وَ اَمَّرَكَ الْعَامَ۔

تو ان سے ایک شخص (حضرت علیؑ) نے کہا عمر! اس لفافہ میں کیا لکھا ہے کہا میں نہیں جانتا لیکن میں نے سب سے پہلے اس کو قبول کیا اور اس کی اطاعت کی ہے (علیؑ نے) جواب دیا لیکن میں جانتا ہوں کہ اس میں کیا ہے سال گزشتہ تم نے ان کو خلیفہ مقرر کیا لہذا اب وہ تم کو خلیفہ کر دیتے ہیں۔ (کتاب الامامۃ والسیاسۃ، ص ۳۳)۔

جس سے معلوم ہوا کہ حضرتؑ اس کو قبل واقعہ سے یقینی جانتے تھے کہ ایسا ہی ہوگا۔

قصّہ خلافت عمر کو علامہ ابن ابی الحدید نے کچھ تفصیل سے لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے۔ ''جب ابوبکر کی حالت آخر ہوئی تو انہوں نے عبدالرحمن بن عوف کو بلا بھیجا (یاد رکھو یہی حق عبدالرحمن بن عوف تھا جس سے حضرت عمر نے شوریٰ میں ان کو مختار بنایا) اور پوچھا عمر کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ عبدالرحمن نے کہا جو تمہاری رائے ان کے بارے میں ہے اس سے بھی اچھی ہماری رائے ہے مگر ان میں غلظت ہے، ابوبکر نے کہا چونکہ ہم کو نرم پاتے ہیں اس لیے وہ سخت ہو جاتے ہیں اور جب خلافت ان کو ملے گی تو اکثر باتیں ترک ہو جائیں گی۔ اس کے بعد عثمان کو بلا بھیجا انہوں نے بھی عمر کی تعریف کی کہ باطن اس کا ظاہر سے اچھا ہے اور اس کا کوئی مثل ہم میں نہیں ہے۔ ابوبکر نے کہا! دیکھو تم دونوں اس کا تذکرہ نہ کرنا (جب خلافت اجماع و شوریٰ سے ہوتی ہے تو پھر اخفا کی کیا وجہ؟) اور اے عثمان اگر ہم عمر کو چھوڑ دیتے تو تم کو نہ چھوڑتے (عمر کے موافق بھی دو رائے تھی جو بطلب مشورہ ابوبکر حاصل ہوئی) اس کے بعد طلحہ آئے اور کہا اے خلیفۂ رسول ہم سنتے ہیں تم عمر کو خلیفہ کیا چاہتے ہو تو خدا کو کیا جواب دو گے کیونکہ تمہارے ساتھ تو وہ یہ سختی کرتے ہیں جب تنہا وہی ہوں گے تو کیا کریں گے؟ ابوبکر نے کہا ہم کو اٹھا کر بٹھاؤ اور کہا کہ خدا سے ہم کو ڈراتے ہو ہم کہہ دیں گے کہ بہترین شخص کو خلیفہ کیا ہے:

فَقَالَ طَلْحَةُ اَعُمَرُ خَيْرُ النَّاسِ؟

طلحہ نے کہا اَیں! کیا عمر بہترین ناس ہیں؟

(بقیہ صفحہ مابعد)

(بقیہ صفحہ سابق) فَاشْتَدَّ غَضَبُهٗ وَ قَالَ اِیْ وَ اللّٰهِ! هُوَ خَیْرُهُمْ وَ اَنْتَ شَرُّهُمْ، اَمَا وَ اللّٰهِ لَوْ وَلَّیْتُكَ لَجَعَلْتَ اَنْفَكَ فِیْ قَفَاكَ وَ لَرَفَعْتَ نَفْسَكَ فَوْقَ قَدْرِهَا حَتّٰی یَكُوْنَ اللّٰهُ هُوَ الَّذِیْ یَضَعُهَا اَتَیْتَنِیْ وَ قَدْ دَلَكْتُ عَیْنَكَ تُرِیْدُ اَنْ تَفْتِنَنِیْ عَنْ دِیْنِیْ وَ تُزِیْلَنِیْ عَنْ رَاْیِیْ قُمْ لَا اَقَامَ اللّٰهُ رِجْلَیْكَ۔ اَمَا وَ اللّٰهِ لَئِنْ عِشْتُ فُوَاقَ نَاقَةٍ وَ بَلَغَنِیْ اَنَّكَ غَمَصْتَهٗ فِیْهَا اَوْ ذَكَرْتَهٗ بِسُوْءٍ لَاُلْحِقَنَّكَ بِحَصَاتِ قِنَّةٍ حَیْثُ كُنْتُمْ تَسْقُوْنَ وَ لَا تَرِدُوْنَ وَ تَرْعَوْنَ وَ لَا تَشْبَعُوْنَ وَ اَنْتُمْ بِذٰلِكَ الْجُحُوْنِ رَاضُوْنَ فَقَامَ طَلْحَةُ فَخَرَجَ۔ (شرح نہج البلاغہ، ج۱،ص۱۶۵)

اس عبارت سے معلوم ہوسکتا ہے کہ حضرت ابوبکر کو طلحہ کا کلام کیسا ناگوار گزرا اور کس درجہ ان کی توہین کی اور کس طرح اپنے دربار سے نکال دیا اور کہا کہ دور ہو یہاں سے اگر کبھی تو نے بھولے سے بھی اس کا نام لیا تو تیری وہ سزا کروں گا کہ تو بھی یاد کرے گا۔ مگر افسوس حضرت عمر نے ان کو بھی بمقابلہ جناب امیرؑ حقدار خلافت بنا دیا اور اصحاب شوریٰ میں داخل کیا۔ یہ طلحہ بھی عشرہ مبشرہ سے ہیں اور خلیفہ اول کی بدولت یہ بھی مسلمان ہوئے تھے اور یہ اور زبیر حواری رسول اللہؐ کہلاتے ہیں۔ مگر حضرت ابوبکر ان کے حق میں یہ کلمات استعمال کرتے ہیں ''وَ اَنْتَ شَرُّهُمْ'' ''تم ان سب سے بدتر ہو'' (تو پھر خیر القرون میں کیوں کر شامل ہوسکتے ہیں اور عشرہ مبشرہ میں کس طرح داخل ہوئے؟)۔

مگر اہل سنت شیعوں پر ہی الزام دیتے ہیں کہ وہ صحابہ کو نہیں مانتے حالانکہ باخود ہا اس طرح کی باتیں کرتے ہیں اور آیندہ چل کر معلوم ہوگا کہ حضرت عمر نے اسی قسم کے کلمات ان کے حق میں استعمال کیے ہیں۔

کتاب الامامۃ والسیاسۃ ابن قتیبہ میں ہے:

فَدَخَلَ عَلَیْهِ اناسٌ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِیِّ، فِیْهِمْ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ فَقَالَ لَهٗ كَیْفَ اَصْبَحْتَ یَا خَلِیْفَةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ؟ فَاِنِّیْ اَرْجُوْ اَنْ تَكُوْنَ بَارِئًا۔ قَالَ اَتَرٰی ذٰلِكَ؟ قَالَ نَعَمْ۔ قَالَ اَبُوْبَكْرٍ وَاللّٰهِ اِنِّیْ لَشَدِیْدُ الْوَجَعِ وَمَا بَقِیَ مِنْكُمْ یَا مَعْشَرَ الْمُهَاجِرِیْنَ اَشَدُّ عَلَیَّ مِنْ وَجَعِیْ اِنِّیْ وَلَّیْتُ اَمْرَكُمْ وَ لَسْتُ خَیْرَكُمْ فِیْ نَفْسِیْ فَكُلُّكُمْ وَرِمَ اَنْفُهٗ اِرَادَ اَنْ یَّكُوْنَ هٰذَا الْاَمْرُ لَهٗ وَ ذٰلِكَ لَمَّا رَاَیْتُمُ الدُّنْیَا قَدْ اَقْبَلَتْ۔

کہ حضرت ابوبکر کے پاس صحابہ نبوی آئے جن میں عبدالرحمن بن عوف بھی تھے انہوں نے پوچھا کہ اے خلیفہ کیسا مزاج ہے؟ میں امید کرتا ہوں کہ اب اچھے ہوں گے کہا کیا تم کو ایسا معلوم ہوتا ہے؟ کہا ہاں۔ ابوبکر نے کہا واللہ سخت درد ہے اور اے گروہ مہاجرین جب میں تم سے ملتا ہوں تو میرا درد بہت سخت ہوجاتا ہے کیونکہ میں تمہارا خلیفہ ہوگیا حالانکہ میں اپنے نفس میں جانتا ہوں کہ تم سے بہتر نہیں ہوں۔ پس تم سب لوگ نہایت غضبناک ہو صرف اس خلافت کی تمنا میں اور یہ بھی اس لیے کہ تم دیکھ رہے ہو دنیا ادھر ہی آگئی ہے۔ (صفحہ ۳۰)

(بقیہ صفحہ مابعد)

(بقیہ صفحہ ماقبل)

اس سے معلوم ہوا کہ مہاجرین خود ابوبکر کی خلافت سے ناراض تھے اور ہر شخص کی ناک مارے غصّہ کے پھول رہی تھی اور یہ کیوں صرف اس لیے کہ دنیا رخ کیے ہوئے تھی تو پھر کب وہ خلیفہ دوم سے راضی ہو سکتے تھے یہی وجہ ہے کہ اسی کتاب (صفحہ ۳۴) میں ہے:

وَكَانَ اَهْلُ الشَّامِ قَدْ بَلَغَهُمْ مَرَضُ اَبِيْ بَكْرٍ وَاسْتَبْطَؤُا الْخَبَرَ فَقَالُوْا اِنَّا لَنَخَافُ اَنْ يَّكُوْنَ خَلِيْفَةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ قَدْمَاتَ وَوَلِيَ بَعْدَهٗ عُمَرُ فَاِنْ كَانَ عُمَرُ هُوَ الْوَالِيَ فَلَيْسَ لَنَا بِصَاحِبٍ وَاِنَّا نَرٰى خُلْعَهٗ۔

جس سے معلوم ہوا کہ جو صحابہ ملک شام میں لڑ رہے تھے ان کو بھی معلوم تھا کہ ابوبکر کے بعد خلیفہ عمر خلیفہ ہوں گے لہٰذا وہ قبل از خلافت خلع کر رہے تھے کہ اگر وہ خلیفہ ہوں تو ہم پہلے سے خلع کر رہے ہیں۔

غرض حضرتؑ نے اس جملہ ''فَاَدْلٰى بِهَا اِلَى ابْنِ الْخَطَّابِ'' سے ان سب واقعات کی طرف اشارہ کر دیا کہ ابوبکر کا یہ فعل محض اسی معاوضہ کے بنا پر تھا جو عمر نے ان کے خلیفہ بنانے میں کوشش کی تھی جس پر اس صحابی نے جس سے عمر نے کہا تھا ہم نہیں جانتے صاف کہہ دیا کہ اگر تم نہیں جانتے تو ہم جانتے ہیں کہ پہلے سال تم نے ان کو خلیفہ بنایا اور اس سال انہوں نے تم کو خلیفہ بنایا۔

کیفیت خلافت حضرت عمر

ان تحریروں سے اس قدر تو یقیناً معلوم ہوا کہ بجز عبدالرحمن بن عوف وعثمان کل صحابہ اس خلافت سے ناراض تھے جس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ خلافت بہ اجماع نہیں ہوئی نہ بہ شوریٰ بلکہ محض ابوبکر کی ذاتی رائے تھی۔ تو کیا رسول اللہؐ کی ذاتی رائے جو یقیناً موافق رائے خدا تھی کسی طرح قابل قبول نہ تھی؟

علامہ ابن ابی الحدید تو واقعہ خلافت کو اسی قدر لکھتے ہیں (صفحہ ۵۵) کہ جب حسب الحکم خلیفہ اول طلحہ چلے گئے تو آپ نے عثمان کو بلا بھیجا اور یہ وقت تھا آپ کی جان کنی کا پھر عثمان سے کہا لکھو:

هٰذَا مَا عَهِدَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنِ عُثْمَانَ اِلَى الْمُسْلِمِيْنَ اَمَّا بَعْدُ۔

اس قدر کہہ کر وہ غش کر گئے اور عثمان نے اس کے ساتھ یہ بھی لکھ دیا۔

قَدْ اسْتَخْلَفْتُ عَلَيْكُمْ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ۔

کہ ''میں نے تم پر عمر کو خلیفہ کیا''۔

جب حضرت ابوبکر کو غش سے افاقہ ہوا تو کہا کیا لکھا ہے۔ عثمان نے پورا جملہ پڑھ کر سنا دیا تو ابوبکر نے کہا اللہ اکبر اور خوش ہو گئے۔ اور کہا کہ تم کو اس کا خوف ہوا کہ ہم اگر اس غشی میں مر گئے تو اختلاف ہوگا لہذا یہ لکھ دیا۔ عثمان نے کہا ہاں۔ ابوبکر نے دعائے خیر دی اور کہا کہ یہ فرمان سب کو سنایا جائے انتھیٰ۔ مگر تاریخ طبری میں کچھ اور مزید تفصیل سے کام لیا گیا ہے جو نہایت دلچسپ ہے۔ (بقیہ صفحہ مابعد)

(بقیہ صفحہ ماقبل)

عَنْ اَبِي السَّفَرِ، قَالَ: اَشْرَفَ اَبُوْ بَكْرٍ عَلَى النَّاسِ مِنْ كَنِيْفِهٖ وَاَسْمَاءُ بِنْتُ عُمَيْسٍ مُمْسِكَةٌ، مَوْشُوْمَةُ الْيَدَيْنِ، وَهُوَ يَقُوْلُ: اَتَرْضَوْنَ بِمَنْ اِسْتَخْلَفْتُ عَلَيْكُمْ؟ فَاِنِّيْ وَاللّٰهِ مَا اَلَوْتُ مِنْ جُهْدِ الرَّاْيِ، وَلَا وَلَّيْتُ ذَا قَرَابَةٍ، وَاِنِّيْ قَدِ اسْتَخْلَفْتُ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ، فَاسْمَعُوْا لَهٗ وَاَطِيْعُوْا، فَقَالُوْا: سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا. (صفحہ ۵۱ جلد ۴)

یعنی حضرت ابوبکر پائخانہ سے سر نکال کر لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے درحالی کہ اسماء بنت عمیس (جن کے ہاتھ مہندی سے رنگین تھے) ان کو پکڑے ہوئے تھیں۔ پس ابوبکر نے کہا کیا تم لوگ اس شخص سے راضی ہو جو تم پر خلیفہ مقرر کیا گیا ہے کیونکہ واللہ میں نے اپنی رائے کے قائم کرنے میں کوئی کمی نہیں کی اور نہ اپنے کسی قرابت مند کو خلیفہ کیا ہے بلکہ عمر ابن الخطاب کو خلیفہ مقرر کیا ہے۔ پس ان کی بات سنو اور ان کی اطاعت کرو۔ پس لوگوں نے کہا ہم نے سنا اور اطاعت کیا۔

مگر کتاب ''الامامۃ والسیاسۃ'' ابن قتیبہ (صفحہ ۳۲) سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ حضرت ابوبکر نے یہ حکم پائخانہ میں دیا تھا مگر عمر کا نام نہ ظاہر کر سکے، چنانچہ لکھتے ہیں:

ثُمَّ اَمَرَ اَنْ يَجْتَمِعَ لَهُ النَّاسُ، فَاجْتَمَعُوْا، فَقَالَ: يَا اَيُّهَا النَّاسُ قَدْ حَضَرَنِيْ مِنْ قَضَاءِ اللّٰهِ مَا تَرَوْنَ، وَاَنَّهٗ لَا بُدَّ لَكُمْ مِنْ رَجُلٍ يَلِيْ اَمْرَكُمْ، وَيُصَلِّيْ بِكُمْ، وَيُقَاتِلُ عَدُوَّكُمْ، فَيَاْمُرُكُمْ۔ فَاِنْ شِئْتُمْ اِجْتَمَعْتُمْ فَاْتَمَرْتُمْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ عَلَيْكُمْ مَنْ اَرَدْتُمْ وَاِنْ شِئْتُمْ اِجْتَهَدْتُ لَكُمْ رَاْيِيْ، وَوَاللّٰهُ الَّذِيْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَا اَلُوْكُمْ فِيْ نَفْسِيْ خَيْرًا۔ قَالَ: فَبَكٰى وَبَكَى النَّاسُ، وَقَالُوْا: يَا خَلِيْفَةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ، اَنْتَ خَيْرُنَا وَاَعْلَمُنَا، فَاَخْتَرْ لَنَا، قَالَ: سَاَجْتَهِدُ لَكُمْ رَاْيِيْ، وَاَخْتَارُ لَكُمْ خَيْرَكُمْ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ. قَالَ: فَخَرَجُوْا مِنْ عِنْدِهٖ، ثُمَّ اَرْسَلَ اِلٰى عُمَرَ فَقَالَ: يَا عُمَرُ، اَحَبَّكَ مُحِبٌّ، وَاَبْغَضَكَ مُبْغِضٌ، وَقَدِيْمًا يُحِبُّ الشَّرَّ، وَيُبْغِضُ الْخَيْرَ. فَقَالَ عُمَرُ: لَا حَاجَةَ لِيْ بِهَا، فَقَالَ اَبُوْ بَكْرٍ: لٰكِنَّ بِهَا اِلَيْكَ حَاجَةً، وَاللّٰهِ مَا حَبَوْتُكَ بِهَا، وَلٰكِنْ حَبَوْتُهَا بِكَ. ثُمَّ قَالَ: خُذْ هٰذَا الْكِتَابَ وَاخْرُجْ بِهٖ اِلَى النَّاسِ، وَاَخْبِرْهُمْ اَنَّهٗ عَهْدِيْ، وَسَلْهُمْ عَنْ سَمْعِهِمْ وَطَاعَتِهِمْ. فَخَرَجَ عُمَرُ بِالْكِتَابِ وَاَعْلَمَهُمْ، فَقَالُوْا: سَمْعًا وَطَاعَةً، فَقَالَ لَهٗ رَجُلٌ: مَا فِي الْكِتَابِ يَا اَبَا حَفْصٍ؟ قَالَ: لَا اَدْرِيْ، وَلٰكِنِّيْ اَوَّلُ مَنْ سَمِعَ وَاَطَاعَ. قَالَ: لٰكِنِّيْ وَاللّٰهِ اَدْرِيْ مَا فِيْهِ: اَمَّرْتَهٗ عَامَ اَوَّلٍ، وَاَمَّرَكَ الْعَامَ۔

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابوبکر نے لوگوں کو اکٹھا کرا کر کہا کہ قضائے خدا سے جو امر مجھے درپیش ہے وہ تم لوگ دیکھتے ہو اور تم کو ایک ایسے شخص کی بھی ضرورت ہے جو تمہارا والی ہو اور نماز پڑھائے اور تمہارے دشمنوں سے جہاد کرے پس تم پر حکومت کرے پس اگر چاہو تو تم لوگ خود مشورہ کر کے کسی کو خلیفہ کر لو اور چاہو تو میں اپنی رائے سے کسی کو مقرر کروں اور اس میں بخدا کوئی کوتاہی نہیں کروں گا۔ لوگوں نے کہا آپ بہتر ہیں آپ ہی انتخاب کر دیجیے کہا اچھا میں سوچوں گا اور انتخاب

(بقیہ صفحہ مابعد)

(بقیہ صفحہ سابق) تو ابوبکر نے عمر کو بلا بھیجا اور کہا کہ یہ فرمان لے کر لوگوں کے پاس جاؤ اور کہو کہ یہی میرا دستاویز ہے اور لوگوں سے اس کے ماننے اور اس پر اطاعت کرنے کو کہو۔ پس عمر وہ فرمان لے گئے، لوگوں سے کہا تو سب نے کہا ''سمعاً وطاعۃً'' پھر ایک شخص (علیؑ) کے پاس گئے تو کہا اے عمر اس میں کیا ہے کہا میں نہیں جانتا لیکن میں نے سب سے پہلے اسے مانا اور اس کی اطاعت کی ہے۔ (علیؑ نے) کہا لیکن میں واللہ جانتا ہوں کہ اس میں کیا ہے ابوبکر کو پہلے سال تم نے خلیفہ کیا اور اب وہ تم کو خلیفہ کرتے ہیں''۔ اس عبارت سے معلوم ہوا کہ حضرت ابوبکر نے سمجھا بجھا کر سب اختیار اپنے ہاتھ میں لیا مگر پھر بھی خلیفہ مابعد کا نام نہ بتایا بلکہ حضرت عمر کو حکم دیا کہ بند لفافہ پر سب سے بیعت لو۔ جس پر حضرت عمر کو جھوٹ بولنا بھی پڑا کہ ہم کو نہیں معلوم اس میں کیا ہے مگر اس صحابی نے کہہ دیا تم کو نہیں معلوم تو ہم کو معلوم ہے اس میں تمہاری خلافت کا حکم ہے کہ اس سال تم نے ان کو خلیفہ کیا اور اس سال وہ تم کو خلیفہ کرتے ہیں۔

کیفیت تبلیغ فرمان ابوبکر

اب اس کی حالت ملاحظہ ہو کہ حضرت عمر نے اس حکم نامہ ابوبکر کو کس طرح سنایا ہے۔ مسند احمد بن حنبل (صفحہ ۵۸ جلد اول مطبوعہ بمبئی) میں ہے۔

عَنِ ابْنِ اَبِیْ خَالِدٍ عَنْ قَیْسٍ قَالَ رَاَیْتُ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ وَبِیَدِہٖ عَسِیْبُ نَخْلٍ وَھُوَ یَجْلِسُ النَّاسَ وَیَقُوْلُ اسْمَعُوْا لِقَوْلِ خَلِیْفَۃِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَجَاءَ مَوْلٰی لِاَبِیْ بَکْرٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ یُقَالُ لَہٗ شُدَیْدٌ بِصَحِیْفَۃٍ فَقَرَاَھَا عَلَی النَّاسِ فَقَالَ یَقُوْلُ اَبُوْ بَکْرٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ اِسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا لِمَنْ فِیْ ھٰذِہِ الصَّحِیْفَۃِ فَوَاللّٰہِ مَا اٰلَوْتُکُمْ قَالَ قَیْسٌ فَرَاَیْتُ بَعْدَ ذٰلِکَ عَلَی الْمِنْبَرِ۔

قیس کہتا ہے کہ میں نے عمر کو خرمہ کا ایک ڈنڈا لیے دیکھا کہ لوگوں کو بٹھا رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ خلیفہ رسول اللہ کے قول کو سنو۔ اتنے میں شدید ابوبکر کا غلام ان کا فرمان لے کر پہنچا اور لوگوں کے سامنے پڑھ کر کہا ابوبکر کہتے ہیں کہ اس فرمان میں جس شخص کا نام لکھا ہے اس کی بات سنو اور اطاعت کرو۔ واللہ میں اس میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کرتا۔ قیس نے کہا میں نے اس کے بعد فوراً عمر کو منبر پر پایا۔

ان مسلسل واقعات کو ملا جایئے تو پھر آپ کو کلام جناب امیرؑ میں ذرا شک نہ رہے کہ حضرتؑ نے ایک جملہ '' فَاَدْلٰی بِھَا اِلَی ابْنِ الْخَطَّابِ'' سے کیوں کر ان کل معاملات کو ظاہر کر دیا کہ یہ خلافت عمر کو ابوبکر سے کس طرح پہنچی؟ اور کیا یہ خلافت کسی طرح نیک نیتی سے ہوئی۔ یہاں قدرتی طور پر سوال ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ نے جو بوقت وفات فرمایا تھا کاغذ اور دوات لاؤ کہ ہم ایسی کتاب لکھ جائیں جس کے بعد تم گمراہ نہ ہو اور حضرت عمر نے کہا رسول اللہؐ ہذیان بک رہے ہیں۔ اس میں کیا راز مضمر تھا۔ جس طرح ابوبکر کے حکم نامہ کی عزت کی گئی اسی طرح رسول اللہؐ کے قول کا احترام کیا جاتا تو کیا ممکن تھا رسول اللہؐ کے فرمان سے کوئی سرتابی کرتا اور کسی طرح امت محمدیہؐ میں اختلاف پیدا ہوتا؟۔ اللہ اللہ وصیت نامہ رسولؐ جس پر ہدایت امت کا انحصار تھا وہ تو اس طرح لکھنے سے روک دیا گیا اور ابوبکر کے وصیت نامہ کی یہ عزت کی گئی کہ حضرت عمر ڈنڈا لیے ہوئے سب کو چپ کرا رہے ہیں کہ فرمان خلیفہ سنو اور جب ابوبکر کا غلام آ کر سناتا ہے تو پھر اس کا بھی انتظار نہیں کیا جاتا کہ کسی کا کلام سنیں حضرت عمر فوراً منبر پر پہنچ جاتے ہیں اور اس پر کہا جاتا ہے کہ جو کام ہوا خوش نیتی اور درد اسلام سے!! (بقیہ صفحہ مابعد)

ثُمَّ تَمَثَّلَ بِقَوْلِ الْاَعْشٰی:

شَتَّانَ مَا یَوْمِیْ عَلٰی کُوْرِھَا وَ یَوْمُ حَیَّانَ اَخِیْ جَابِرِ

فَیَا عَجَبًا! بَیْنَا ھُوَ یَسْتَقِیْلُھَا فِیْ حَیَاتِہٖ اِذْ عَقَدَھَا لِاٰخَرَ بَعْدَ وَفَاتِہٖ،

(پھر مثالاً اعشیٰ کا یہ شعر پڑھا)

کہاں میرا یہ دن کہ اپنے ناقہ کی پشت پر مارا مارا پھرتا ہوں اور کہاں وہ جو یہاں برادر جابر کے ساتھ بسر ہوا۔

پس عجب!!! یا تو وہ (ابوبکر) اپنی زندگی ہی میں اس سے استعفا دیتے تھے یا مرنے کے بعد (یہی) چھوڑ دوسرے صاحب سے جکڑتے گئے۔اُف! (شتر)

(بقیہ صفحہ ماقبل) قَوْلُہٗ: ثُمَّ تَمَثَّلَ بِقَوْلِ الْاَعْشٰی۔ اعشیٰ ایک شاعر تھا اور حیان وجابر دو بھائی تھے۔حیان بڑا متمول اور سردار شخص تھا اسی کا مصاحب اعشیٰ تھا جو کہتا ہے کہ ایک زمانہ وہ تھا جب میں حیان کی مصاحبت میں عیش وآرام کرتا تھا اور ایک روز اب ہے کہ اونٹ پر سوار تمام جہان کی خاک چھانتا پھرتا ہوں۔اس شعر سے حضرتؓ کا مقصودِ بیان یہ ہے کہ افسوس ایک وہ زمانہ تھا جب جناب رسالت مآبؐ کے وقت میری اطاعت کی جاتی اور اسلام کی اشاعت کا مجھے موقع ملتا اور ایک روز آج ہے کہ اسلام کی حفاظت میں مجھے عراق شام وغیرہ مقامات کی خاک چھاننا پڑ رہی اور ساری مصیبتیں سر پر اٹھانی پڑتی ہیں اور اطمینان نصیب نہیں۔

قَوْلُہٗ: فَیَا عَجَبًا! بَیْنَا ھُوَ یَسْتَقِیْلُھَا۔ یہ فقرہ ایک مستقل طعن ہے مطاعن ابوبکر سے جس کی تفصیل ''تشیید المطاعن'' جلد اول میں قابل دید ہے۔''الریاض النضرہ'' میں ہے۔

لَمَّا بُوْیِعَ اَبُوْ بَکْرٍ قَامَ دُوْنَ مَقَامِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَقَالَ: اَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ شَیْخٌ کَبِیْرٌ، فَاسْتَعْمِلُوْا عَلَیْکُمْ مَنْ ھُوَ اَقْوٰی مِنِّیْ عَلٰی ھٰذَا الْاَمْرِ وَاَضْبَطُ لَہٗ، فَضَحِکُوْا وَقَالُوْا: لَا نَفْعَلُ، اَنْتَ صَاحِبُ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِی الْمَوَاطِنِ وَاَحَقُّ بِھٰذَا الْاَمْرِ، فَقَالَ: اَمَّا اِذَا قُلْتُمْ فَاَحْسِنُوْا طَاعَتِیْ وَمُؤَازَرَتِیْ وَاعْلَمُوْا اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ وَمَعِیْ شَیْطَانٌ یَعْتَرِیْنِیْ، فَاِذَا رَاَیْتُمُوْنِیْ عَصَیْتُ فَقُوْمُوْا عَنِّیْ لَا اُوْثِرُ فِیْ اَشْعَارِکُمْ وَاَنْسَابِکُمْ، وَاتَّبِعُوْنِیْ مَا اسْتَقَمْتُ، فَاِنْ زِغْتُ فَقَوِّمُوْنِیْ۔

اور علامہ ابن حجر مکی ''صواعق محرقہ'' باب اول فصل اول میں لکھتے ہیں:

اَلَا وَاِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ وَلَسْتُ بِخَیْرٍ مِنْ اَحَدِکُمْ فَرَاعُوْنِیْ فَاِذَا رَاَیْتُمُوْنِیْ اِسْتَقَمْتُ فَاتَّبِعُوْنِیْ وَاِذَا رَاَیْتُمُوْنِیْ زِغْتُ فَقَوِّمُوْنِیْ وَاعْلَمُوْا اَنَّ لِیْ شَیْطَانًا یَعْتَرِیْنِیْ فَاِذَا رَاَیْتُمُوْنِیْ غَضِبْتُ فَاجْتَنِبُوْنِیْ۔

دونوں کا مطلب یہ ہے کہ ابوبکر نے خطبہ میں کہا ''میں ایک معمولی آدمی ہوں اور تم سے کسی طرح بہتر نہیں پس میری حفاظت کرو اور جب دیکھو کہ میں سیدھی راہ پر ہوں تو میری پیروی کرو اور جب دیکھو کہ میں کج راہ ہوں تو مجھے سیدھا کر دو اور جان لو کہ مجھ پر ایک شیطان مسلّط رہتا ہے۔پس جب میں نافرمانی خدا کروں تو مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ اور جب سیدھی راہ چلوں تو اطاعت کرو۔

علمائے متکلمین کا اعتراض اس پر یہ ہے کہ اس سے صاف معلوم ہوا کہ حضرت ابوبکر کو اپنی نااہلی خلافت کا یقین تھا بلکہ اقرار کر رہے ہیں کہ ہم نہ قوی ہیں نہ ضابط بلکہ ہم پر شیطان مسلّط رہتا ہے تو ایسا شخص کب امام ہو سکتا ہے جو خود اس کا محتاج (بقیہ صفحہ مابعد)

(بقیہ صفحہ ماقبل) رہے کہ رعایا اس کی اصلاح کرتی رہے حالانکہ امام کو معصوم ہونا چاہیے کہ وہ نائب رسول ہے۔ مگر کوئی تصریح اس کی تواریخ میں نہیں معلوم ہوتی کہ یہ خطبہ کب بیان کیا۔ امام طبری نے تو اس کو اس وقت میں نقل کیا ہے جب ابوبکر نے چاہا کہ اسامہ بن زید کے لشکر کو روانہ کریں، مگر افسوس یہ واقعہ لکھا گیا ہے اس طرح کہ اصل مطلب کا پتہ نہ چلے کیونکہ اسی تاریخ میں اس کے بعد لکھتے ہیں کہ حضرت عمر نے آکر عرض کیا کہ یا خلیفہ رسول لوگ چاہتے ہیں کہ اسامہ سے زیادہ بزرگ شخص سردار بنایا جائے۔

فَوَثَبَ اَبُوْ بَكْرٍ وَكَانَ جَالِسًا فَاَخَذَ بِلِحْيَةِ عُمَرَ، فَقَالَ لَهٗ: "ثَكَلَتْكَ اُمُّكَ وَعَدَمَتْكَ يَا ابْنَ الْخَطَّابِ! اِسْتَعْمَلَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَتَاْمُرُنِيْ اَنْ اَنْزَعَهٗ! ". فَخَرَجَ عُمَرُ اِلَى النَّاسِ، فَقَالُوْا لَهٗ: "مَا صَنَعْتَ؟" فَقَالَ: "امْضُوْا، ثَكَلَتْكُمْ اُمَّهَاتُكُمْ، مَا لَقِيْتُ فِيْ سَبَبِكُمْ مِنْ خَلِيْفَةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ" (جلد ۳، ص ۲۱۲)

کہ یہ سن کر ابوبکر نے اچھل کر عمر کی داڑھی پکڑ لی اور کہا تیری ماں تجھے روئے اور تجھے کھو بیٹھے اے پسر خطاب۔ رسول اللہ نے تو اسامہ کو سردار کیا اور تو مجھے اس کو معزول کرنے کو کہتا ہے؟ پس عمر لوگوں کی طرف چلے گئے جنہوں نے پوچھا کیا کر آئے تو کہا چلے چلو تمہاری مائیں تم کو روئیں تمہارے ہی سبب سے خلیفہ نے میری توہین کی۔

اس روایت سے پتہ چلتا ہے کہ چونکہ حضرت عمر نے یہ گستاخی کی تھی جس پر خلیفہ اول نے ان کی داڑھی پکڑ کر گالیاں دیں اور عمر نے اکثر صحابہ کو گالیاں دیں اس لیے حضرت ابوبکر نے اپنی خلافت سے اقالہ کیا ہو تو مناسب ہے کیونکہ باقی فقرات بھی اس کے مؤید ہیں جس میں فرماتے ہیں، اگر ہم کو خلافت سے علیحدہ نہیں کرتے تو ہماری فرمانبرداری کرو۔ دوسرا وقت وہ ہے جب جناب سیدہ نے فدک کا مطالبہ کیا۔ چنانچہ کتاب ''الامامۃ والسیاسۃ'' ابن قتیبہ میں ہے۔

فَقَالَ اَبُوْ بَكْرٍ اَنَا عَائِذٌ بِاللّٰهِ تَعَالٰى مِنْ سَخَطِهٖ وَسَخَطِكِ يَا فَاطِمُ، ثُمَّ انْتَحَبَ اَبُوْ بَكْرٍ يَبْكِيْ، حَتّٰى كَادَتْ نَفْسُهٗ اَنْ تَزْهَقَ، وَهِيَ تَقُوْلُ: وَاللّٰهِ لَاَدْعُوَنَّ عَلَيْكَ فِيْ كُلِّ صَلَاةٍ اُصَلِّيْهَا، ثُمَّ خَرَجَ بَاكِيًا فَاجْتَمَعَ اِلَيْهِ النَّاسُ، فَقَالَ لَهُمْ: يَبِيْتُ كُلُّ رَجُلٍ مِّنْكُمْ مُعَانِقًا حَلِيْلَتَهٗ، مَسْرُوْرًا بِاَهْلِهٖ، وَتَرَكْتُمُوْنِيْ وَمَا اَنَا فِيْهِ، لَا حَاجَةَ لِيْ فِيْ بَيْعَتِكُمْ، اَقِيْلُوْنِيْ بَيْعَتِيْ۔ (ص ۲۴)

یعنی ابوبکر نے کہا فاطمہ! میں خدا کے غضب اور تمہارے غضب دونوں سے پناہ مانگتا ہوں پھر ابوبکر چیخ مار کر رونے لگے کہ قریب تھا ان کی روح نکل جائے اور جناب فاطمہؑ فرماتی تھیں واللہ میں ہر نماز کے بعد تمہارے لیے بددعا کروں گی۔ یہ سن کر ابوبکر روتے ہوئے وہاں سے اٹھ گئے پس لوگوں نے ان کو گھیر لیا تو کہا تم میں ہر شخص اپنی زوجہ کے پہلو میں مزے سے شب کو آرام کرتا ہے اور مجھ کو اس حالت میں مبتلا کر دیا ہے، مجھے اس خلافت کی کوئی ضرورت نہیں اپنی بیعت اٹھا لو۔

غرض جناب امیرؑ کا مقصود یہ ہے کہ ابوبکر اپنی زندگی میں تو اس خلافت سے اقالہ کرتے تھے کہ لوگوں سے کہتے کہ ہم کو اس سے معاف کرو مگر مرتے وقت وہ دوسرے کو خلیفہ کر جاتے ہیں۔ یہ کس قسم کی بات ہے کیونکہ جس شخص نے اس خلافت کے لیے نہ وفات رسولؐ کا خیال کیا، نہ شرکت جنازہ کا نہ دفن وکفن کا وہ کیوں کر اس خلافت سے اقالہ کر سکتا ہے حالانکہ طالب جو قوی وامین ہے وہ طلب کر رہا ہے مگر نہیں دیتے اور پھر مجمع میں اقالہ کرتے ہیں تو اگر کسی طرح بھی وہ اپنے قول میں صادق ہوتے تو کم سے کم اتنا تو کرتے کہ اپنے مابعد کسی کو نامزد نہ کرتے مسلمانوں پر چھوڑ دیتے کہ وہ جس کو چاہیں منتخب کریں۔ جیسا کہ بقول اہل سنت ابوبکر منتخب (بقیہ صفحہ مابعد)

لَشَدَّ مَا تَشَطَّرَا ضَرْعَيْهَا! فَصَيَّرَهَا فِيْ حَوْزَةٍ خَشْنَآءَ، يَغْلُظُ كَلْمُهَا وَ يَخْشُنُ مَسُّهَا،

خلافت کی دونوں پستانوں کو ہر دو نے کس شدت سے دوہ لیا۔ غرض (ابوبکر نے) اس (خلافت) کو ایک درشت مزاج کے حوالہ کر دیا جس کا زخم گہرا اور جس کا چھونا

(بقیہ صفحہ ماقبل) ہوئے یا عمر نے بظاہر اپنے بعد کسی کو نامزد نہ کیا تو آپ اس پر تعجب فرماتے ہیں کہ یہ کس قسم کی بات ہے کہ اپنی زندگی میں تو استعفا دیتے تھے اور مرتے وقت وہ کام کر گئے کہ پوری ذمّہ داری اپنے سر لی کیونکہ آپ کتاب ''الامامۃ والسیاسۃ'' کی عبارت پڑھ آئے ہیں کہ حضرت ابوبکر نے مجمع کر کے لوگوں سے کہا یا تو خود کسی کو منتخب کر لو یا ہم کو اختیار دو کہ جس کو چاہیں مقرر کریں مگر قسم بخدا ہم بجز خیر خواہی کوئی کام نہ کریں گے جس پر سب نے کہا کہ تم ہم سے بہتر جانتے ہو۔ پس جب اس طرح قسم کھا کھا کر اپنا اعتبار ظاہر کریں تو رعایا کی کیا مجال کہ خلاف خلیفہ کریں۔ طلحہ نے کچھ اعتراض کیا تو گھر سے نکال دیا پھر اور کی کیا حقیقت تھی۔

قَوْلُهٗ: لَشَدَّ مَا تَشَطَّرَا ضَرْعَيْهَا! شرح ابن ابی الحدید میں ہے:

تَشَطَّرَا ضَرْعَيْهَا، اقْتَسَمَا فَائِدَتَهَا وَ نَفْعَهَا ، وَالضَّمِيْرُ لِلْخِلَافَةِ۔

کہ اس میں حضرتؑ نے خلافت کو شیر دار ناقہ سے تشبیہ دی ہے اور بتایا ہے کہ ابوبکر و عمر نے اس ناقہ کو خوب اچھی طرح دوہا اور پوری طرح منتفع ہوئے۔

قَوْلُهٗ: فَصَيَّرَهَا فِيْ حَوْزَةٍ خَشْنَآءَ۔ اب یہاں سے حضرتؑ نے حضرت عمر کی خلافت کا بیان شروع کیا ہے۔ شرح ابن ابی الحدید میں ہے ''اَیْ فِيْ جِهَةِ صَعْبَةِ الْمِرَاءِ شَدِيْدَةِ الشَّكِيْمَةِ''۔ مقصود یہ ہے کہ ابوبکر نے اس خلافت کو ایسی سخت اور تند مزاج کے حوالہ کیا جس کا زخم بہت گہرا ہوتا تھا، اس پر اعتراض ہو سکتا ہے کہ زخم لگانا تو ایسی چیز نہیں ہے جس کو غلیظ کہیں کیونکہ غلظت تو خواص اجسام سے ہے تو اس کا جواب ابن ابی الحدید دیتے ہیں کہ یہ معترض کی حماقت ہے کیونکہ خدا نے

﴿وَ نَجَّيْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ﴾ (سورۂ ھود، آیہ ۵۸) فرمایا ہے۔

اس لیے کہ جب عذاب تہ بہ تہ ہوگا تو وہ غلیظ کہا جائے گا۔

اسی طرح زخم جب عرضی و عمقی گہرا ہوتا ہے تو وہ بھی غلیظ کہا جاتا ہے۔ دوسری لطافت اس میں یہ ہے کہ حضرت عمر کی غلظت لسانی سب کو معلوم ہے تو ایسے الفاظ سے حضرتؑ نے اس کو ظاہر کیا جس سے ان کی سخت گوئی اور بدزبانی بھی ظاہر ہو چنانچہ کلام اسی سے ماخوذ ہے۔ شرح ابن ابی الحدید میں ہے:

اِنْ قِيْلَ: قَدْ قَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ ''فِيْ حَوْزَةٍ خَشْنَاءَ'' فَوَصَفَهَا بِالْخُشُوْنَةِ، فَكَيْفَ اَعَادَ ذِكْرَ الْخُشُوْنَةِ ثَانِيَةً، فَقَالَ ''يَخْشُنُ مَسُّهَا''. قِيْلَ: الْاِعْتِبَارُ مُخْتَلِفٌ لِاَنَّ مُرَادَهٗ بِقَوْلِهٖ ''فِيْ حَوْزَةٍ خَشْنَاءَ'' اَیْ لَا يُنَالُ مَا عِنْدَهَا وَ لَا يُرَامُ۔ يُقَالُ: اِنَّ فُلَانًا لَخَشِنُ الْجَانِبِ وَ وَعْرُ الْجَانِبِ وَ مُرَادُهٗ بِقَوْلِهٖ ''يَخْشُنُ مَسُّهَا'' اَیْ تُؤْذِیْ وَ تَضُرُّ وَ تُنْكِیْ مَنْ يَمَسُّهَا، يَصِفُ جَفَاءَ اَخْلَاقِ الْوَالِیْ الْمَذْكُوْرِ وَ نُفُوْرَ طَبْعِهٖ وَ شِدَّةَ بَادِرَتِهٖ۔

یعنی اگر کوئی کہے کہ حضرتؑ نے ''فِيْ حَوْزَةٍ خَشْنَآءَ'' کہہ کر ان کو خشونت سے متصف کیا ہے پھر کیوں دوبارہ (بقیہ صفحہ مابعد)

وَ يَكْثُرُ الْعِثَارُ فِيْهَا وَ الْاِعْتِذَارُ مِنْهَا، فَصَاحِبُهَا كَرَاكِبِ الصَّعْبَةِ، اِنْ اَشْنَقَ لَهَا خَرَمَ وَ اِنْ اَسْلَسَ لَهَا تَقَحَّمَ،

(تک) ناگوار ہوتا تھا، جس میں لغزشیں بہت تھیں اور (پھر) عذر (گناہ بھی) بکثرت تھا۔ پس ایسا آدمی اس شخص کے مثل ہے کو سرکش ناقہ پر سوار ہو کہ اگر مہار کھینچتا ہے تو نکیل نکل آتی ہے اور اگر مہار ڈھیلی کرتا ہے

(بقیہ صفحہ ماقبل) ان کی صفت اسی خشونت سے کی اور ایک ہی جملہ کے بعد فرمایا ''يَخْشُنُ مَسُّهَا'' تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ یہاں حیثیت بدل گئی ہے کیونکہ پہلے جملہ ''حَوْزَةٍ خَشْنَآءَ'' سے مراد حضرتؑ کی یہ ہے کہ وہ ایسی طبیعت کے تھے جس سے اس کی کوئی چیز حاصل نہیں ہوسکتی اور نہ کسی کو اس کے قصد کرنے کی جرأت ہوسکتی ہے چنانچہ کہا جاتا ہے فلاں شخص سخت اور دُشوار پہلو کا ہے اور دوسرے جملہ ''يَخْشُنُ مَسُّهَا'' سے مراد یہ ہے کہ وہ ایسی طبیعت کے ہیں کہ جو شخص اس کو مس کرے اس کو وہ اذیت پہنچائے، نقصان پہنچائے اور زخمی کر دے۔

پس حضرت امیر المومنینؑ اس آخری جملہ میں حضرت عمر کے بیہودہ اخلاق، ناگوار طبیعت اور سخت مزاج ہونے کے عیوب کو بیان کرتے ہیں۔

قَوْلُهٗ: وَ يَكْثُرُ الْعِثَارُ فِيْهَا وَ الْاِعْتِذَارُ مِنْهَا ۔ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ کہا جاتا ہے یہ راہ صاف نہیں ہے بلکہ ایسی ہے جس میں پتھر زیادہ ہے چلنے والا گرتا ہے مگر حضرتؑ نے جو ''وَ الْاِعْتِذَارُ مِنْهَا'' فرمایا:

فَيُمْكِنُ اَنْ تَكُوْنَ ''مِنْ'' عَلٰى اَصْلِهَا يَعْنِىْ اَنَّ عُمَرَ كَانَ كَثِيْرًا مَا يَحْكُمُ بِالْاَمْرِ ثُمَّ يَنْقُضُهٗ وَ يُفْتِىْ بِالْفُتْيَا ثُمَّ يَرْجِعُ عَنْهَا وَ يَعْتَذِرُ مِمَّا اَفْتٰى بِهٖ اَوَّلًا وَ يُمْكِنُ اَنْ تَكُوْنَ ''مِنْ'' هُنَا لِلتَّعْلِيْلِ وَالسَّبَبِيَّةِ اَىْ وَ يَكْثُرُ اِعْتِذَارُ النَّاسِ عَنْ اَفْعَالِهِمْ وَ حَرَكَاتِهِمْ لِاَجْلِهَا۔

تو ممکن ہے کہ ''مِنْ'' اپنی اصل پر ہو کہ اس سے معذرت کرتے تھے کیونکہ عمر اکثر ایک حکم دیتے پھر توڑ دیتے، ایک فتویٰ دیتے پھر اس سے رجوع کر جاتے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ''مِنْ'' تعلیل اور سببیّت کے لیے ہو کہ لوگ اپنے افعال و حرکات سے معذرت کرتے تھے۔

مگر اصل یہی ہے کہ ''مِنْ'' اپنی اصل پر ہے کیونکہ حضرت عمر کا ایک فتویٰ دینا پھر اس کے خلاف کرنا ایسا مشہور و معروف ہے جس میں زیادہ تحقیق کی ضرورت نہیں بلکہ یہ بھی ایک مستقل طعن ہے خلیفہ دوم کا کہ وہ مسائل شرعیہ سے جاہل تھے اور جاہل شخص کسی طرح خلیفۂ اسلام نہیں ہوسکتا اس کی تفصیل کتاب ''تشیید المطاعن'' میں قابل ملاحظہ ہے۔ مختصر طور پر یہاں بھی کچھ ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) حضرت عمر نے ایک دفعہ ایک حاملہ عورت کے رجم کرنے کا حکم دیا جس پر جناب امیرؑ نے فرمایا جو لڑکا شکم مادر میں ہے اس پر تم کو کیا اختیار ہے۔ حضرت عمر اس حکم سے باز آئے اور کہا ''لَوْلَا عَلِيٌّ لَهَلَكَ عُمَرُ'' (شرح مواقف)

(۲) مغنی قاضی القضاۃ عبد الجبار معتزلی میں ہے کہ ٹوکنے والے معاذ بن جبل ہیں جس پر حضرت عمر نے کہا ''لَوْلَا مَعَاذٌ لَهَلَكَ عُمَرُ''۔ (بقیہ صفحہ مابعد)

(بقیہ صفحہ ماقبل)

(۳) ایک مجنونہ کے رجم کا حکم دیا تو جناب امیرؑ نے فرمایا کہ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ تین شخصوں سے ہر قسم کی تکلیف ساقط ہے، سونے والے سے جب تک بیدار نہ ہوجائے، بچہ سے جب تک بالغ نہ ہوجائے اور مجنون سے جب تک صحیح نہ ہوجائے (فواتح میبذی)

(۴) ایک عورت کی کچھ سزا کی تو اس کا حمل ساقط ہوگیا صحابہ سے پوچھا تو کہا تم پر کوئی الزام نہیں کیونکہ تادیباً ایسا کیا لیکن جناب امیرؑ نے کہا تم کو اس کی دیت دینا چاہیے۔

(۵) چاہا کہ خانہ کعبہ کی طلائی زیورات کو تجہیز لشکر میں صرف کریں تو جناب امیرؑ نے کہا رسول اللہؐ کو تم سے زیادہ ضرورت تھی مگر ایسا نہ کیا۔ جس پر حضرت عمر نے کہا ''لَوْلَا کَ افْتَضَحْنَا'' کہ اگر تم نہ ہوتے تو ہم فضیحت ہوجاتے اور اپنے ارادہ سے باز رہے۔

(۶) جنین کی دیت آپ کو نہ معلوم تھی تو جناب امیرؑ نے بتایا جس پر عمر نے کہا اللہ اکبر اگر میں یہ آپ سے نہ سن لیتا تو اس کے خلاف حکم دے دیے ہوتا۔

(۷) ایک عورت نے زمانہ عدت میں نکاح کرلیا تو عمر نے دونوں میں تفریق کر کے اس کے مہر کو داخل بیت المال کیا اور دونوں کو ہمیشہ کے لیے علیحدہ کر دیا۔ جناب امیرؑ نے یہ سن کر فرمایا کہ اگر اس عورت نے از راہِ جہل یہ کام کیا تو وہ مہر کی مستحق ہے اور بعد عدہ اس مرد کو اختیار ہے کہ اس سے عقد کرے۔ چنانچہ عمر نے اس سے کہا ''رُدُّوْا الْجَهَالَاتِ اِلَی السُّنَّةِ'' اور قول جناب امیرؑ پر عمل کیا۔

(۸) آپ نے ایک عورت سے ڈرا دھمکا کر زنا کا اقرار کرالیا اور رجم کا حکم دیا تو جناب امیرؑ نے فرمایا کہ آنحضرتؐ نے فرمایا تھا کہ جو قیدِ حبس یا خوف سے اقرار کرلے اس کا اقرار اقرار ہی نہیں ہے۔ تب حضرت عمر نے اس کو چھوڑ دیا۔

(۹) آپ نے ایک شخص کو زنا کرتے دیکھا، صبح کو صحابہ سے پوچھا تو سب نے کہا تم امام ہو جو چاہو کرو۔ جناب امیرؑ نے کہا جب تک چار گواہ نہ ہوں گے تمہارا دیکھنا کافی نہ ہوگا۔ دو مرتبہ حضرت عمر نے اس کو دریافت کیا، صحابہ وہی کہتے رہے اور جناب امیرؑ وہ کہتے رہے، جس پر شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ امام غزالی کہتے ہیں کہ عمر اس مسئلہ میں متردّد رہے۔

(۱۰) آپ کے پاس ایک شخص لایا گیا جس نے کسی کو قتل کیا تھا۔ مقتول کے بعض اولیا نے قاتل کو معاف کر دیا تو بھی آپ نے حکم قتل جاری کیا۔ تب ابن مسعود نے کہا اس خون کا حق سب کو تھا جب بعض نے معاف کر دیا تو تم کیوں قتل کرتے ہو، لہٰذا اس کی دیّت دینا چاہیے۔

(۱۱) ایک صحابی نے ایک ذمی کو مارا تو عمر نے چاہا قصاص جاری کریں تو زید بن ثابت نے کہا غلام کے عوض آزاد سے قصاص لیا جائے گا؟ لہٰذا اس کی دیت دو۔

(۱۲) آپ نے باپ بیٹے میں بھی قصاص جاری کرنا چاہا تو معاذ نے کہا باپ بیٹے میں قصاص نہیں ہے۔

(۱۳) زینب بنت جحش زوجہ رسول اللہؐ نے انتقال کیا تو عمر نے چاہا ان کو خود قبر میں اُتاریں ازواج نبی نے منع کیا اور کہا وہی قبر میں اُتار سکتا ہے جو اس کا محرم ہو۔

(۱۴) انبیا کے نام پر نام رکھنا آپ ناجائز جانتے تھے چنانچہ ابو عیسٰی، ابو یحیی وغیرہ پر اعتراض کیا تو ان دونوں نے کہا خود رسول اللہؐ نے ہماری یہ کنیّت رکھی ہے۔

(بقیہ صفحہ مابعد)

(بقیہ صفحہ ماقبل)

(۱۵) حضرت ابوبکر عمر کے پاس کچھ مال تقسیم سے بچ گیا تو صحابہ نے کہا اس کو وقت حاجت کے لیے جمع رکھنا چاہیے، لیکن جب جناب امیرؑ سے پوچھا تو فرمایا اس کو بھی تقسیم کر دینا چاہیے، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

(۱۶) نماز کے رکعات میں شک ہونے کا مسئلہ بھی آپ کو نہ معلوم تھا تو عبدالرحمن بن عوف نے بتایا۔

(۱۷) آپ نے حالت صوم میں ایک لونڈی سے مباشرت کی تو صحابہ سے پوچھا کیا کیا جائے؟ سب ساکت ہو گئے کہ یہ تو نہایت عظیم امر ہے۔ تب جناب امیرؑ سے پوچھا، حضرتؑ نے فرمایا وہ تیری لونڈی حلال تھی، روزہ کا قضا کر دو اور کفارہ ادا کر دو۔

(۱۸) آپ کو حالت احرام میں بیضۂ شتر مرغ توڑنے کا حکم نہیں معلوم تھا تو جناب امیرؑ نے بتایا۔

(۱۹) ایک شخص کا ہاتھ اور پیر جرم سرقہ میں کٹ چکا تھا، تیسری بار آپ نے پیر کاٹنے کا حکم دیا تو جناب امیرؑ نے منع کیا اور کہا یا تعزیر اس پر جاری کرو یا قید کر دو۔

(۲۰) آپ کو لونڈی کے طلاق کا حکم معلوم نہ تھا تو جناب امیرؑ نے بتا دیا۔

(۲۱) آپ کو یہ نہ معلوم تھا کہ کسی کا گھر زبردستی داخل مسجد کر لینا کیسا ہے، تو ابی بن کعب نے بتایا۔ یہ واقعہ قصّہ حضرت عباس کا ہے۔

(۲۲) آپ کو یہ نہ معلوم تھا کہ دختران سلاطین کے ساتھ کس طرح برتاؤ کرنا چاہیے جناب امیرؑ نے بتایا۔

(۲۳) آپ کو یہ نہ معلوم تھا کہ عورتوں کو کتنے دنوں کے بعد مرد کی خواہش ہوتی ہے تو جا کر اپنی صاحب زادی حفصہ زوجہ رسول اللہؐ سے دریافت کیا۔

(۲۴) آپ کو یہ بھی نہ معلوم تھا کہ مجرد دخول سے غسل جنابت واجب ہوتا ہے اگرچہ انزال نہ ہو جناب امیرؑ نے بتایا۔

(۲۵) آپ کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ بچوں کی حضانت ماں سے متعلق ہوتی ہے، چنانچہ آپ نے اپنی ایک زوجہ کو طلاق دیا تو اس سے بچہ چھیننے لگے مگر ابوبکر نے سمجھایا کہ حق حضانت ماں سے متعلق ہے۔

(۲۶) ایک عورت کے چھ مہینے پر بچہ ہوا تو آپ نے اس کو رجم کرنا چاہا، جناب امیرؑ نے آیہ:

﴿وَ حَمْلُهٗ وَ فِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا﴾

کی تلاوت فرما کر اس مسئلہ کو سمجھایا۔

(۲۷) آپ کو یہ بھی نہ معلوم تھا کہ مجوس سے جزیہ کس قدر لینا چاہیے تو عبدالرحمن بن عوف نے حدیث رسول سنائی۔

(۲۸) آپ کو یہ بھی نہ معلوم تھا کہ عورت اپنے شوہر کے دیّت سے حصّہ پا سکتی ہے یا نہیں۔

(۲۹) آپ کو دیّت اصابع کا حکم بھی نہیں معلوم تھا۔

(۳۰) آپ کو میراث عمہ کا حال نہیں معلوم تھا اس پر بھی ایک کتاب اس کی تحقیقات میں تصنیف کی مگر آخر با کمال شرمندگی پانی سے دھوڈالا اور کہا اگر خدا اس تصنیف سے راضی ہوتا تو باقی رکھتا۔

(۳۱) آپ کو کلالہ نہ معلوم تھا جس کا حکم قرآن میں ہے۔ (بقیہ صفحہ مابعد)

(بقیہ صفحہ ماقبل)

(۳۲) آپ نے ایک شخص سے صحیح وسالم گھوڑا خریدا اور دوسرے شخص کو اس پر سوار کیا جس کے بعد وہ گھوڑا مر گیا تو آپ نے اس گھوڑے کی قیمت دینے سے انکار کیا، آخر شریح قاضی نے فیصلہ کیا کہ قیمت آپ پر لازم ہے۔

(۳۳) ایک شخص سے اونٹ خریدا تو چاہا اس کا پالان بھی اسی قیمت میں لے لیں حالانکہ اس کا کوئی معاہدہ نہیں ہوا تھا آخر بہ تعلیم جناب امیرؑ عمر کو پالان سے باز آنا پڑا۔

(۳۴) آپ نے حجر اسود کو دیکھ کر کہا یہ پتھر ہے جو نہ نفع پہنچا سکتا ہے نہ ضرر، تب جناب امیرؑ نے حدیث رسول سنایا جس پر عمر نے کہا۔

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ اَنْ اَعِیْشَ فِیْ قَوْمٍ لَسْتَ فِیْھِمْ یَا اَبَا حَسَنٍ۔

یعنی اے ابوالحسن میں خدا سے پناہ چاہتا ہوں ایسی قوم میں رہنے سے جس میں آپ نہ ہوں۔

(۳۵) دو عورتوں میں ایک لڑکے اور ایک لڑکی کی نسبت تکرار تھی دونوں لڑکے کی مدعی تھیں اور لڑکی سے انکار کرتیں اس واقعہ سے حضرت عمر اس قدر پریشان ہوئے کہ کسی طرح حل نہ کر سکے، صحابہ سے پوچھتے ہیں تو وہ کہتے ہیں آپ خلیفہ ہیں خلیفہ غصّہ ہوتے ہیں کہ خدا کے لیے اس کو حل کرو، آخر جناب امیرؑ کے پاس آتے ہیں اور آپ زمین سے ایک تنکا اٹھا کر فرماتے ہیں کہ اس کا فیصلہ تو اس سے بھی زیادہ آسان ہے۔ آخر دونوں کا دودھ تلوا کر فیصلہ کر دیا کہ اس کا لڑکا ہے اور اس کی لڑکی ہے جس پر حضرت عمر نے کہا:

یَا اَبَا الْحَسَنِ لَا اَبْقَانِیَ اللّٰہُ لِشَدِیْدَۃٍ لَسْتَ لَھَا۔

کہ اے ابوالحسن خدا ہم کو کسی ایسی مصیبت کے وقت تک باقی نہ رکھے جس کو دفع کرنے کے لیے آپ نہ موجود ہوں۔

(۳۶) ایک عورت کے ایک لڑکا ہوا جس کی دوھری خلقت تھی، دو پیٹ چار ہاتھ دو سر دو شرم گاہ، اس کا فیصلہ حضرت عمر کو نہ معلوم تھا تو جناب امیرؑ نے اس کا فیصلہ کیا جو نہایت طولانی قصہ ہے۔

(۳۷) دو شخص بیٹھے تھے کہ ایک قیدی کا گزر ہوا جس کے پیر میں وزنی بیڑیاں تھیں، ایک نے کہا اس بیڑی کا وزن اس قدر ہے ورنہ میری عورت کو طلاق ہو، دوسرے نے کہا کہ نہیں اس کا وزن اس قدر ہے ورنہ میری زوجہ طالق ہے، اب اس کا حل کیوں کر ہو کیونکہ قیدی نے بھی قسم کھالی تھی کہ بیڑی پیر سے جدا نہیں کروں گا۔ آخر یہ قضیہ حضرت عمر کے پاس گیا تو وہ بھی حل کرنے سے عاجز رہے، آخر جناب امیرؑ کے پاس یہ قضیہ گیا اور آپ نے اس کو اس طرح حل کیا کہ ایک ظرف میں پانی منگوایا اور بیڑیاں اس میں گرائی گئیں، جس سے پانی کا مقدار بڑھا وہاں نشان کر دیا گیا۔ پھر اسی مقدار کا لوہا ڈالا گیا کہ اس مقدار تک اس کا حجم بڑھا ان لوہوں کو تلوا کر فرما دیا اس قدر وزن ہے۔

(۳۸)۔ بادشاہ روم نے چند مسائل دریافت کیے تو حضرت عمر سے جواب نہ ہو سکا جناب امیرؑ نے لکھوا دیا۔

(۳۹)۔ پھر دوسری روایت ''زین الفتی'' میں ہے جس میں چند مسائل اور دریافت کیے گئے تھے۔

(۴۰)۔ نجران کا ایک پادری خدمت خلیفہ دوم میں آیا اور سوال کیا مگر آپ جواب نہ دے سکے آخر جناب امیرؑ نے جواب دیا۔

(۴۱)۔ قصص الانبیا ثعلبی میں بھی ایک طولانی روایت اس کی ہے کہ جناب امیرؑ نے ان مسائل کا جواب دیا۔

(۴۲)۔ آپ کو اس کا حکم بھی نہ معلوم تھا کہ غلام کے عقد کر سکتا ہے جناب امیرؑ نے بتایا۔ (بقیہ صفحہ مابعد)

فَمُنِيَ النَّاسُ ۔ لَعَمْرُ اللّٰهِ! ۔ بِخَبْطٍ وَّ شِمَاسٍ وَّ تَلَوُّنٍ وَّ اعْتِرَاضٍ.

تو منہ کے بل گر پڑتا ہے۔ پس بخدا (یہاں بھی) لوگ (اونٹ کے) بھٹکنے، سرکشی کرنے، رنگ بدلنے اور ٹیڑھے ہونے (کی طرح برے اوصاف) میں مبتلا

(بقیہ صفحہ ماقبل)

(۴۳) عمرہ کرنے کی جگہ بھی آپ کو نہ معلوم تھی، جناب امیرؑ نے بتایا۔

(۴۴) آپ کو یہ بھی نہ معلوم تھا کہ قبل طواف عطر کا لگانا جائز ہے، جناب امیرؑ نے تعلیم فرمایا۔

(۴۵) آپ کو ربا کا بھی حکم معلوم نہ تھا۔

(۴۶) آپ یہ بھی نہ جانتے تھے کہ مومن کو مومن کہنا جائز ہے۔

(۴۷) آپ کو رنگین چادروں کی طہارت بھی نہ معلوم تھی جو عہد رسول اللہؐ میں مستعمل ہوتیں تو ابی ابن کعب نے بتایا۔

(۴۸) آپ کو خود رسول اللہؐ کا حلیہ بھی نہ معلوم تھا جسے جناب امیرؑ نے بتایا۔

(۴۹) آپ کو حد استیذان بھی نہ معلوم تھا چنانچہ ابوموسیٰ اشعری پر بگڑے تو ابوسعید خدری نے آکر بتایا۔

(۵۰) آپ کو یہ بھی نہ معلوم تھا کہ رسول اللہؐ نماز عید میں کون کون سورے پڑھتے تھے۔

یہ پچاس مسائل مختصر طور پر ''تشیید المطاعن'' سے اس غرض سے نقل کیے گئے کہ معلوم ہو خلیفہ ثانی صاحب باایں ہمہ دعویٰ ہمہ دانی ان سے جاہل تھے، جس سے بخوبی معلوم ہوا کہ جناب امیرؑ نے اپنے قول ''وَ یَکْثُرُ الْعِثَارُ فِیْهَا'' میں انہیں امور کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

قَوْلُهٗ: فَمُنِيَ النَّاسُ ۔ لَعَمْرُ اللّٰهِ! ۔ بِخَبْطٍ وَّ شِمَاسٍ۔ یعنی اس خلافت ثانیہ میں مسلمانوں کی ایسے حالت ہوگئی جیسے کوئی اس اونٹ پر سوار ہو جو مزاج میں نہایت شریر ہو اور جس کی رفتار سیدھی نہ ہو کبھی ٹیڑھا چلے کبھی سیدھا، کبھی بے راہ چلے کبھی راہ پر۔ اس کی تفصیل کا تو موقع نہیں مگر صرف ایک مسئلہ میراثِ جد کو لیجیے کہ حضرت عمر نے اس میں سو طرح کا حکم دیا، چنانچہ اس کی تفصیل ''تشیید المطاعن'' صفحہ ۹۶۳ میں بخوبی مذکور ہے۔ فتح الباری میں ہے:

عَنْ عُبَيْدَةِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ اِنِّیْ حَفِظْتُ عَنْ عُمَرَ فِی الْجَدِّ مِائَةَ قَضِيَّةٍ كُلَّهَا يَنْقُضُ بَعْضُهَا بَعْضًا۔

یعنی عبیدہ بن عمرو کہتے ہیں کہ مجھے جد کے میراث میں عمر کے سو حکم یاد ہیں جو سب کے سب ایک دوسرے کے مخالف ہے۔

''توضیح فی شرح جامع الصحیح'' میں بھی ہے:

قَالَ عُبَيْدَ السَّلْمَانِیُّ اِنِّیْ لَاَحْفَظُ عَنْ عُمَرَ فِی الْجَدِّ مِائَةَ قَضِيَّةٍ كُلَّهَا يَنْقُضُ بَعْضُهَا بَعْضًا۔

یہی عبارت ''قسطلانی شرح بخاری'' اور ''طبقات ابن سعد'' میں بھی ہے جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ زمانہ مسلمانوں کے لیے کیسا سخت اور جانکاہ تھا کہ ایک مسئلہ میں سو طرح کا حکم ملتا ہے۔ طرہ یہ ہے کہ یہ حدیث بھی روایت کرتے ہیں جیسا کہ ''کنز العمال'' میں ہے:

عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ عَنْ عُمَرَ قَالَ سَاَلْتُ النَّبِیَّ كَيْفَ قُسِّمَ الْجَدُّ قَالَ مَا سُؤَالُكَ عَنْ ذٰلِكَ (بقیہ صفحہ مابعد)

(بقیہ صفحہ ماقبل) یَا عُمَرُ اِنِّیْ اَظُنُّکَ اَنْ تَمُوْتَ قَبْلَ اَنْ تَعْلَمَ ذٰلِکَ قَالَ سَعِیْدُ بْنُ الْمُسَیَّبِ فَمَاتَ عُمَرُ قَبْلَ اَنْ یَّعْلَمَ ذٰلِکَ۔

کہ ''سعید بن المسیب روایت کرتا ہے کہ عمر نے کہا میں نے رسول اللہؐ سے دریافت کیا کہ جد کی میراث کیوں کر تقسیم ہوگی؟ تو آنحضرتؐ نے فرمایا عمر! اس کے متعلق تم کیا پوچھتے رہتے ہو میں دیکھتا ہوں کہ تم مر بھی جاؤ گے اور یہ مسئلہ تم کو نہ آئے گا۔ سعید بن المسیب کہتا ہے کہ واقعی عمر مر گئے لیکن یہ مسئلہ نہ سمجھ سکے۔

اگر خیال اختصار نہ ہوتا تو صدہا ایسے واقعات دکھائے جا سکتے تھے جن سے جناب امیرؑ کے اس قول کی تصدیق ہوتی کہ اس خلافت کی بدولت مسلمان کس مصیبت میں مبتلا تھے، کیونکہ ایک طرف قرآن تھا جو تمام ملک میں رائج تھا کہ ہر شخص کو تھوڑا بہت یاد تھا، دوسری طرف خود احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھیں جن کے راوی اور ناقل صدہا نہیں بلکہ ہزارہا صحابی، ہیں تیسری طرف خلفائے ثلاثہ کے فتاوے ہیں جو سب کے خلاف ہیں۔ تعمیل حکم میں تو کسی کو عذر ہی نہیں کیونکہ برسر حکومت ہیں مگر تطبیق قرآن وحدیث میں وہ الجھن ہے کہ منوں کاغذ سیاہ ہو گئے اور کوئی بات بنتی نہیں۔ یہاں تک کہ آخر اقرار کرنا پڑا کہ ہر مجتہد کو اختیار ہے کہ دوسرے کے خلاف کرے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی مجتہد تھے، خلفاء بھی مجتہد تھے، لہذا اگر مخالفت کی تو کیا حرج ہے۔

چنانچہ علامہ قوشجی ''شرح تجرید'' میں بجواب طعن ''حَیَّ عَلٰی خَیْرِ الْعَمَلْ'' لکھتے ہیں:

فَاِنَّ مُخَالَفَۃَ الْمُجْتَھِدِ لِغَیْرِہٖ فِی الْمَسَائِلِ الْاِجْتِھَادِیَّۃِ لَیْسَ بِقَدْحٍ۔

ایسا ہی شمس الدین اصفہانی اور تفتازانی نے بھی لکھا ہے (تشیید المطاعن، صفحہ ۱۸۸۵)

یعنی ایک مجتہد کی مخالفت دوسرے مجتہد سے مسائل اجتہادیہ میں باعث قدح نہیں ہے۔

غالباً اسی طرح علامہ ابن ابی الحدید بھی اس میں اشارہ کرتے ہیں:

وَ یُمْکِنُ اَنْ یَّکُوْنَ ''مِنْ'' ھٰھُنَا لِلتَّعْلِیْلِ وَالسَّبَبِیَّۃِ اَیْ وَ یَکْثُرُ اِعْتِذَارُ النَّاسِ عَنْ اَفْعَالِھِمْ وَ حَرَکَاتِھِمْ لِاَجْلِھَا۔

یعنی جناب امیرؑ نے جو فرمایا وَ یَکْثُرُ الْعِثَارُ فِیْھَا وَ الْاِعْتِذَارُ مِنْھَا۔ تو ''مِنْھَا'' کا ''مِنْ'' ہوسکتا ہے کہ تعلیل اور سببیت کے لیے ہو کہ لوگوں کا عذر کرنا ان کے افعال وحرکات کے سبب سے بڑھ گیا۔

جس کی تصدیق ملاحظہ کتب مناظرہ سے بخوبی ہوسکتی ہے کہ شیعہ وسنی کے تمام تر مناظرات اسی اصول پر ہیں کہ شیعہ خلفائے ثلاثہ کی مخالفت قرآن وحدیث سے دکھاتے ہیں اور اہل سنت صدہا قسم کے عذر پیش کرتے ہیں جس سے اکثر اوقات قرآن وحدیث میں تحریف کرنی پڑتی ہے اور آخر میں جب سب سے عاجز آتے ہیں تو کہہ دیتے ہیں کہ ایک مجتہد کو دوسرے مجتہد سے مخالفت جائز ہے۔ اب حضرتؑ کے کلام کی تصدیق میں تو کوئی عذر ہی نہیں ہوسکتا جو حضرتؑ فرماتے ہیں اس طبیعت کا آدمی مثل اس شتر سرکش اور بدمست و شریر کے ہے جس پر کبھی سواری نہیں ہوئی اور وہ ابھی رام نہیں ہوا۔ اگر نکیل دے کر مہار کھینچتے ہیں تو وہ اپنی شرارت سے اپنی ناک کو زخمی کرتا ہے اور اگر مہار چھوڑ دی جاتی ہے تو پھر اس کا اختیار ہے جہاں چاہے لے جائے، جہاں چاہے گرا دے، خواہ جنگل ہو یا بیابان آگ ہو یا پانی۔ (بقیہ صفحہ مابعد)

فَصَبَرْتُ عَلٰی طُوْلِ الْمُدَّةِ، وَ شِدَّةِ الْمِحْنَةِ.

ہو گئے تھے۔ لہٰذا (پھر) میں نے اس طویل مدت اور شدید محنت پر صبر کیا۔

(بقیہ صفحہ ماقبل) جناب امیرؑ فرماتے ہیں ''کَرَاکِبِ الصَّعْبَةِ'' یعنی وہ سرکش اونٹ جس پر سوار ہونا نہایت دُشوار ہو۔

علامہ ابن ابی الحدید حضرت عمر کے وصف میں لکھتے ہیں ''عمر بہت ہی سخت اور نہایت پر ہیبت شخص تھے اور سیاست میں بہت سخت کہ کسی کا خیال نہ کرتے، نہ شریف کا نہ رذیل کا۔ بزرگان صحابہ ان سے بچتے رہتے اور ملاقات کرنا تک پسند نہ کرتے۔ حضرت ابن عباس نے جب مسئلہ عول کے ناجائز ہونے کا فتویٰ دیا تو کسی نے کہا عمر کے زمانہ میں کیوں نہ یہ فتویٰ دیا؟ تو کہا ان کے خوف کے مارے، کیونکہ وہ خوفناک شخص تھے۔ اسی طرح ایک عورت عمر کے سامنے آئی جو حاملہ تھی تو عمر کے خوف کے مارے اس کا حمل ساقط ہو گیا، مردہ لڑکا ساقط ہوا جس پر آپ نے صحابہ سے استفتا کیا تو سب نے کہا تم پر کوئی حرج نہیں کیونکہ تم تو اَدب دینے والے تھے، لیکن جناب امیرؑ نے فرمایا: اگر انہوں نے تمہارے خیال سے ایسا فتویٰ دیا تو سب نے تم کو دھوکا دیا اور اگر یہی ان کا اجتہاد تھا تو سب نے خطا کی (کیا اس سے صحابہ کا اجماع خطا پر اور خلاف حق کہنا نہیں ثابت ہوا)۔ تم پر ایک غلام کا آزاد کرنا ضرور ہے، چنانچہ حضرت عمر اور سب صحابہ نے حضرتؑ کے قول کی طرف رجوع کیا۔ یہی عمر وہ شخص ہیں جنہوں نے حضرت ابوبکر کی بیعت کو مستحکم کیا اور مخالفین کو دبایا۔ آپ ہی نے زبیر کی تلوار کو توڑ ڈالا تھا جب انہوں نے کھینچا تھا اور مقداد کو دھکا دیا اور سعد بن عبادہ کو کچل ڈالا اور کہا اس کو قتل کرو اور جناب ابن منذر کی ناک کو توڑ ڈالا اور بنی ہاشم سے جن لوگوں نے خانہ جناب سیدہ میں پناہ لی تھی انہیں ڈرا دھمکا کر باہر نکالا۔ پس اگر آپ نہ ہوتے تو نہ حضرت ابوبکر کی بیعت کی جاتی نہ ان کی خلافت قائم ہوتی''۔

حضرت عمر کی سیاست کے ذکر میں علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں:

''سب سے پہلے جو عمر نے درّہ مارا ہے وہ اُمّ فروہ بنت ابی قحافہ خواہر ابوبکر کو کہ ابوبکر کے مرنے پر عورتیں رونے لگیں تو عمر نے چند بار منع کیا مگر کسی نے نہ مانا تب اُمّ فروہ خواہر ابوبکر کو ان سب کے درمیان سے باہر نکالا اور درّہ چلایا جس کے بعد وہ سب بھاگیں اور متفرق ہوئیں۔ چنانچہ مشہور ہے کہ عمر کا دُرّہ حجاج بن یوسف کی تلوار سے بھی زیادہ ہیبت ناک تھا''۔

پھر لکھتے ہیں:

''عمر ہی وہ شخص ہیں جنہوں نے جبلہ بن ایہم پر نہایت درجہ غلظت کی یہاں تک کہ اس نے مدینہ چھوڑ دیا بلکہ تمامی بلاد اسلامیہ سے جلاوطن ہو گیا اور آخر اسلام سے مرتد ہو کر نصرانی ہو گیا۔ اس کے ساتھ ساٹھ ہزار کا قبیلہ تھا جو سب کا سب نصرانی ہو گیا اور مدتوں مسلمانوں سے لڑتا رہا جس میں ہزاروں بلکہ لاکھوں مسلمانوں کا خون ہوا''۔

قَوْلُهٗ: فَصَبَرْتُ عَلٰی طُوْلِ الْمُدَّةِ، وَ شِدَّةِ الْمِحْنَةِ۔ خلیفہ دوم صاحب کے متعلق حضرتؑ کا یہ آخری فقرہ ہے جس میں فرماتے ہیں کہ ہم نے اس طویل مدت اور شدید محنت پر صبر کیا اس لیے کہ خلیفہ دوم کی خلافت دس برس رہی ہے برخلاف خلیفہ اول کے کہ جن کی خلافت ڈھائی سال رہی۔

(بقیہ صفحہ مابعد)

حَتّٰی اِذَا مَضٰی لِسَبِیْلِہٖ جَعَلَھَا فِیْ جَمَاعَۃٍ زَعَمَ اَنِّیْٓ اَحَدُھُمْ.

یہاں تک کہ جب (دوسرے صاحب بھی دنیا سے) سدھارے تو اس (خلافت) کو ایک ایسی جماعت کے حوالہ کر دیا جس میں مجھ کو بھی شمار کیا۔

فَیَا لَلّٰہِ وَ لِلشُّوْرٰی! مَتَی اعْتَرَضَ الرَّیْبُ فِیَّ مَعَ الْاَوَّلِ مِنْھُمْ، حَتّٰی صِرْتُ اُقْرَنُ اِلٰی ھٰذِہِ النَّظَآئِرِ لٰکِنِّیْٓ اَسْفَفْتُ اِذْ اَسَفُّوْا، وَ طِرْتُ اِذْ طَارُوْا،

پس بار الٰہا! شوریٰ (کو کیا ربط)؟ کب شک ہوا تھا میری (حقیت خلافت) کے بارے میں بمقابلہ ان کے (خلیفہ اول کے) جو اَب میں ایسوں میں شامل کیا جانے لگا۔ لیکن (خیر) جب یہ لوگ پست ہوئے تو میں بھی پست ہو گیا اور جب بلند ہوئے تو میں بھی بلند ہو گیا۔ (غرض ان سے کسی حال میں مخالفت نہیں ظاہر کی)۔ پس (جب شوریٰ ہوا تو) ان

(بقیہ صفحہ ماقبل) قَوْلُہٗ: حَتّٰٓی اِذَا مَضٰی لِسَبِیْلِہٖ۔ یہاں سے حضرتؑ نے دور عثمانی کا تذکرہ شروع کیا کہ جب حضرت عمر بھی جانے لگے تو انہوں نے اس خلافت کو ایک ایسی جماعت کے حوالہ کیا جس کی نسبت یہ گمان کیا کہ میں بھی ایک انھیں سے ہوں۔ یہ اشارہ ہے قصہ شوریٰ کی طرف جو بہت مشہور واقعہ ہے اور آئندہ بتفصیل مذکور ہوگا۔

قَوْلُہٗ: فَیَا لَلّٰہِ وَ لِلشُّوْرٰی! اس میں ''لَلّٰہِ'' کا لام مفتوح ہے اور ''لِلشُّوْرٰی'' کا لام مکسور کیونکہ اللہ سے استغاثہ ہے اور شوریٰ مکسور اس سبب سے کہ اس کا استغاثہ ہے یعنی اس کی فریاد ہے۔ ظاہراً مقصود یہ ہے کہ خداوندا اس شوریٰ کو دیکھ کہ اس کو تیرے احکام میں کیا دخل، کیونکہ خلافت تو نیابت نبی ہے جس کو نبی ہی مقرر کر سکتا ہے پس اس میں شوریٰ پنچایت کو کیا دخل۔

قَوْلُہٗ: مَتَی اعْتَرَضَ الرَّیْبُ فِیَّ۔ یعنی جب لوگوں نے خلیفہ اول کو خلیفہ بنایا تو اس وقت میری حقیت میں کب شک ہوا تھا جو اب میری یہ بے عزتی کی جاتی ہے کہ ان لوگوں کے برابر قرار دیا جاتا ہوں۔ پس جس طرح پہلے مجھ پر ظلم کیا گیا کہ میری موجودگی میں حضرت ابوبکر خلیفہ بنا دیے گئے اسی طرح اب یہ ظلم ہوا کہ مجھ کو ان لوگوں کا ہمسر قرار دیا گیا۔

قَوْلُہٗ: لٰکِنِّیْٓ اَسْفَفْتُ اِذْ اَسَفُّوْا۔ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں:

وَاَسَفُ الرَّجُلِ اِذَا دَخَلَ فِی الْاَمْرِ الدَّنِیِّ، اَصْلُہٗ مِنْ اَسَفِ الطَّائِرِ اِذَا دَنَا مِنَ الْاَرْضِ فِیْ طَیَرَانِہٖ۔

یعنی ''اَسَفٌ'' کا استعمال وہاں ہوتا ہے جہاں کسی امر ذلیل میں انسان داخل ہو جو ماخوذ ہے ''اَسَفِ الطَّائِرِ'' سے کہ یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب طائر اڑنے میں زمین سے قریب ہو۔

یہاں چونکہ یہ اعتراض ہو سکتا تھا کہ کوئی کہے جبکہ ذات اقدس ایسی تھی کہ اس کی حقیت میں بہ مقابلہ خلیفہ اول بھی کسی طرح کا شک وشبہ نہ تھا تو آپ نے ان کی شرکت کیوں قبول فرمائی؟ اسی کا جواب یہ حضرت دیتے ہیں، جس کی شرح میں ابن ابی الحدید لکھتے ہیں:

ثُمَّ تَعَجَّبَ مِنْ ذٰلِکَ، فَقَالَ ''مَتَی اعْتَرَضَ الشَّکُّ فِیَّ مَعَ اَبِیْ بَکْرٍ حَتّٰی اَقْرَنَ بِسَعْدِ بْنِ اَبِیْ (بقیہ صفحہ مابعد)

فَصَغٰی رَجُلٌ مِّنْهُمْ لِضِغْنِهٖ وَ مَالَ الْاٰخَرُ لِصِهْرِهٖ، مَعَ هَنٍ وَّهَنٍ.

کاایک شخص (سعد) تواپنے (قدیم) کینہ کے سبب سے (مجھ سے) منحرف ہوگیااور دوسرا (عبدالرحمن) اپنے سالے عثمان اور چند دوسرے لغواور بیہودہ وجوہ کے سبب سے پھر گیا۔

(بقیہ صفحہ مابعد) وَقَاصٍ وَ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ وَ اَمْثَالِهِمَا لَكِنِّیْ طَلَبْتُ الْاَمْرَ وَ هُوَ مَوْسُوْمٌ بِالْاَصَاغِرِ مِنْهُمْ كَمَا طَلَبْتُهٗ اَوَّلًا وَ هُوَ مَوْسُوْمٌ بِاَكَابِرِهِمْ۔

یعنی حضرتؑ نے اس سے تعجب کیا کہ جب بہ مقابلہ ابوبکر ہماری حقیت میں کسی طرح کا اعتراض نہ تھا۔تو پھر اس وقت سعد بن ابی وقاص اور عبدالرحمن بن عوف وغیرہ شامل کیوں کیے گئے مگر میں نے ہر طرح اپنے حق کو طلب کیا، چھوٹوں کے ساتھ بھی اور بڑوں کے ساتھ بھی۔

یعنی یہ میرا حق ہے تو پھر اس کے طلب میں مجھے کسی طرح ننگ و عار نہیں خواہ میرا مد مقابل جلیل القدر شخص ہو جیسا کہ حضرت ابوبکر سمجھے جاتے یا چھوٹے لوگ ہوں جیسے سعد بن وقاص وغیرہ۔

قَوْلُهٗ: فَصَغٰی رَجُلٌ مِّنْهُمْ لِضِغْنِهٖ۔ یہاں سے حضرتؑ نے شوریٰ کی حقیقت ظاہر کی کہ یہ شوریٰ جو چھ آدمیوں کا قرار پایا تھا۔ان میں سے دوتو اس وجہ سے ہمارے خلاف ہو گئے کہ ان میں ایک شخص سعد تھا اس کے دل میں مجھ سے کینہ تھا اور دوسرا عبدالرحمن بن عوف جناب عثمان کا بہنوئی تھا کیونکہ اُمّ کلثوم بنت عقبہ ابن ابی معیط جو حضرت عثمان کی مادری بہن تھی وہ عبدالرحمن بن عوف کی زوجہ تھی اسی سبب سے عبدالرحمن جناب عثمان کے طرف دار ہو گئے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ جناب عثمان کی ماں کا نام اروی بنت کریز تھا، پہلے وہ عفان پدر جناب عثمان خلیفہ ثالث کی زوجہ تھی جس سے حضرت عثمان پیدا ہوئے۔ بعدہٗ اس نے عقبہ ابن ابی معیط سے نکاح کر لیا جس سے اُمّ کلثوم پیدا ہوئی جس کا نکاح عبدالرحمن بن عوف سے ہوا۔ان دونوں کے اتفاق سے خلافت کا جناب امیرؑ کے ہاتھ سے نکلنا ایسا یقینی تھا کہ حضرت امیرؑ نے قبل واقعہ ہی اس کی خبر دے دی تھی۔ چنانچہ جب حضرت عباس سے ملاقات ہوئی ہے تو فرمایا ''چچا اس دفعہ بھی خلافت نکل گئی'' پوچھا ''کیوں کر معلوم ہوا'' تو فرمایا ''میرے ساتھ عثمان کو بھی شریک کیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ اگر دو دو آدمی ایک شخص کو منتخب کریں تو اس طرف خلافت ہوگی جدھر عبدالرحمن بن عوف ہوں، پس ظاہر ہے کہ عبدالرحمن تو عثمان ہی کا ساتھ دیں گے کیونکہ ان کے بہنوئی ہیں اور سعد بن ابی وقاص عبدالرحمن کو نہ چھوڑیں گے، پھر اگر دو آدمی میرے ساتھ ہوں بھی تو کیا فائدہ''۔

اس واقعہ کی تفصیل بنا بر تحریر علامہ ابن ابی الحدید یہ ہے (از شرح ابن ابی الحدید مطبوعہ مصر جلد اول صفحہ ۶۲) کہ جب حضرت عمر کو ابولولو نے زخمی کیا اور ان کو اپنی موت کا یقین ہوا تو اس میں مشورہ کرنے لگے کہ میرے بعد کون خلیفہ بنایا جائے؟ کسی نے کہا کہ اپنے فرزند عبداللہ کو بناؤ جس پر عمر نے کہا خدا نہ کرے کہ وہ خلیفہ ہو، دو آدمی اولاد خطاب سے خلیفہ نہیں ہو سکتے عمر ہی کافی ہے۔ میں زندگی اور موت دونوں میں اس کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ پھر کہا رسول اللہ نے جب وفات پائی تو وہ قریش کے ان چھ آدمیوں سے راضی تھے (اس سے معلوم ہوا کہ باقی صحابہ سے حضرت ناراض تھے تو پھر نامعلوم شیعوں پر کیوں اعتراض کیا جاتا ہے جو وہ اکثر صحابہ کے ارتداد کے قائل ہیں۔ مؤلف) علی، عثمان، طلحہ، زبیر، سعد اور عبدالرحمن بن عوف۔ (مگر افسوس آگے چل کر پھر حضرتؑ کی ناراضگی کو بھی اس سے بیان کرتے ہیں۔مؤلف) لہذا میری رائے ہے کہ خلافت کو ان لوگوں میں شوریٰ قرار دوں کہ وہ جس کو چاہیں منتخب کریں۔ (بقیہ صفحہ مابعد)

(بقیہ صفحہ ماقبل) پھر کہا کہ میں کسی کو خلیفہ بناؤں تو یہ بھی ہوسکتا ہے کیونکہ مجھ سے بہتر شخص (ابوبکر) نے خلیفہ بنایا ہے۔ اور اگر نہ بناؤں تب بھی کوئی حرج نہیں کیونکہ مجھ سے بہتر شخص (رسول اللہ) نے خلیفہ نہیں مقرر کیا (مگر یہ بالکل افترا ہے۔ مؤلف) پھر سب کو اس حالت میں بلوایا کہ وہ دم توڑ رہے تھے۔ سب کو دیکھ کر کہا تم سب کو اس کی طمع ہے کہ میرے بعد خلیفہ بنو۔ اس کے جواب میں سب خاموش رہے۔ پھر دوبارہ سوال کیا تو زبیر نے جواب دیا آخر ہم کس بات میں تم سے کم ہیں کہ تم تو خلیفہ بنے اور ہم نہ ہوں؟ نہ قریشی ہونے میں تم سے کم ہیں، نہ قرابت میں، نہ سابقہ میں (سبقت میں بھی یہ بڑے ہوئے ہیں کیونکہ عمر کے پہلے اسلام لائے۔ مؤلف) عمر نے کہا میں تم لوگوں کے کچھ حالات بیان کروں؟ سب نے کہا کہو، کیونکہ اگر ہم لوگ منع بھی کریں گے تو تم نہ مانو گے۔

عمر نے کہا: اے زبیر تو دعق نفس (تنگ دل، بدمزاج) ہے۔ خوشی کے وقت مومن اور غضب کے وقت کافر، ایک روز انسان تو دوسرے روز شیطان۔ اگر تجھے خلافت ملے تو ایک مُد (پون سیر) جَو پر دن بھر مار پیٹ کرتا رہے۔ اب بتاؤ کہ اگر خلافت تمہیں ملے تو رعایا کا کیا حال ہوگا اس دن جس روز تم شیطان بن جاؤ گے اور تمہارے غضب کے روز لوگوں کا پناہ کون ہوگا؟ ہرگز خدا تمہیں ان صفات پر خلافت نہ دے گا۔

پھر طلحہ کی طرف متوجہ ہوئے (جن سے ان کو پہلے سے بغض تھا کیونکہ انہوں نے ابوبکر سے کہا تھا کہ عمر کو خلیفہ نہ کرو) پس پوچھا کہو میں کچھ کہوں یا چپ رہوں؟ طلحہ نے جواب دیا کہو کیونکہ میں جانتا ہوں تمہارے مُنہ سے کبھی کلمہ خیر نہ نکلے گا۔ (یہاں اس حدیث اہل سنت کو یاد کرنا چاہیے ''اَلْحَقُّ یَنْطِقُ عَلٰی لِسَانِ عُمَرَ'' کہ عمر کی زبان پر کلمۂ حق جاری رہتا ہے۔ اور یہاں حضرت طلحہ فرماتے ہیں ''فَاِنَّكَ لَا تَقُوْلُ مِنَ الْخَیْرِ شَیْئًا'' کہ تمہاری زبان پر کبھی کلمہ خیر آئے گا ہی نہیں۔ مؤلف) اس پر عمر نے کہا: اے طلحہ میں تم کو اس روز سے جانتا ہوں کہ جنگ اُحد میں جب تمہاری انگلی کو زخم پہنچا تو اس روز سے تمہارا دماغ (بوجہ غرور) بگڑ گیا حالانکہ رسول اللہؐ نے ایسی حالت میں انتقال فرمایا کہ وہ تم سے ناراض تھے بوجہ اس کلمہ کے جو تم نے روز نزول آیہ حجاب کہا تھا۔

(یہاں اس اختلاف بیانی کو دیکھیے کہ شروع میں کہا تھا رسول اللہؐ ان چھ آدمیوں سے راضی گئے اور یہاں کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ مرتے وقت تم سے ناراض رہے۔ مؤلف)

شیخ ابوعثمان جاحظ کہتے ہیں کہ وہ کلمہ طلحہ کا یہ تھا کہ جب آیہ حجاب نازل ہوا تو طلحہ نے کہا حضرتؐ کو اس پردہ داری سے کیا فائدہ ہوگا کیونکہ حضرت کل مرجائیں گے اور ہم آپؐ کی ازواج سے نکاح کرلیں گے۔ (اسی کلمہ سے حضرتؐ ناراض رہے بلکہ خدا بھی ناراض رہا کہ حکم ممانعت نکاح بعد از وفات رسول اللہؐ نازل کیا)۔ ابوعثمان کہتے ہیں اگر کوئی عمر سے یہ سوال کرتا کہ پہلے تو تم نے کہا تھا کہ رسول اللہؐ ان چھ آدمیوں سے راضی تھے اب یہ کہتے ہو کہ حضرت طلحہ سے بوجہ اس کلمہ کے ناراض گئے تو عمر کا کیا حال ہوتا؟ مگر کون تھا جو ایسی جرأت کرتا۔

پھر سعد ابن ابی وقاص سے کہا کہ تم صرف جنگ و پیکار، تیر کمان نیزہ کے کام کے ہو۔ پھر عبدالرحمن بن عوف سے کہا کہ خلافت کے لائق ایسا شخص نہیں ہوسکتا جس میں تمہارا سا ضعف (رائے) ہو۔ علاوہ بریں تمہارے قبیلہ زہرہ کو خلافت سے کیا تعلق۔ پھر حضرت علیؑ سے کہا خدا گواہ ہے پس تم ہی اس کام کے تھے اگر تم میں مزاح نہ ہوتا (حالانکہ یہ وہ صفت ہے جو رسول اللہ میں سب سے زیادہ تھی۔ مؤلف) خدا کی قسم اگر تم ان کے والی ہو تو ضرور حق واضح اور کشادہ پر ان کو لے چلو (مگر ہائے تدبیر ایسی کی کبھی بھی خلافت نہ ملے۔ مؤلف) پھر عثمان کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا خوش ہو میں دیکھ رہا ہوں کہ قریش نے تمہاری گردن میں قلادہ (بقیہ صفحہ مابعد)

(بقیہ صفحہ ماقبل) خلافت ڈالا ہے کیونکہ سب کو تم سے محبت ہے اور تم نے بنی امیہ اور بنی ابی معیط کو لوگوں کی گردنوں پر سوار کر دیا ہے اور مال غنیمت وخراج جو کچھ آتا ہے وہ ان کو دیتے ہو جس پر بہت سے بھیڑیے عرب کے آتے ہیں اور تجھے تیرے فرش پر ذبح کرتے ہیں۔ قسم خدا کی اگر ایسا کریں گے تو تم ضرور کرو گے اور تم کرو گے تو وہ بھی ضرور کریں گے۔ (یہ پیشین گوئی آپ نے اس سبب سے کی کہ کعب الاحبار ایک بڑا جوتشی تھا جو یمن کے یہودیوں کا بڑا عالم اور حضرت عمر کا بڑا یار غار تھا اس نے ازراہِ علم نجوم کل واقعات کی خبر عمر کو دے دی تھی۔ مؤلف)

اس کے بعد حضرت عمر نے اہل شوریٰ سے کہا: اگر تم مدد کرو گے اور ایک دوسرے کا معین وخیر خواہ وناصح رہے گا تو تم بھی کھاؤ گے اور تمہاری اولاد بھی اور اگر باخود باحسد کرو گے اور ایک دوسرے کی مدد نہ کرے گا تو معاویہ بن ابی سفیان تم سب پر دوڑ پڑے گا اور غالب آجائے گا۔ اس کے بعد ابوطلحہ انصاری سے کہا کہ ہمارے دفن ہونے پر تم پچاس ہتھیار بند انصاریوں کو حاضر کرنا اور ان چھ آدمیوں کو جمع کر کے کہنا کہ خلافت کا جلد فیصلہ کر ڈالیں۔ سب کو ایک مکان میں جمع کرنا اور اپنے اصحاب کے ساتھ تم دروازہ پر تلواریں لیے کھڑے رہنا پس اگر پانچ آدمی ایک رائے ہوں اور ایک شخص ان کے خلاف تو اس کو قتل کر دینا۔ اور اگر چار ایک طرف اور دو ایک طرف ہوں تو ان دو کو قتل کر دینا اور اگر تین ایک طرف اور تین دوسری طرف ہوں تو جن تین میں عبدالرحمن بن عوف ہوں ان سے موافق دوسرے تین ہو جائیں تو خیر ورنہ ان تین آدمیوں کو قتل کر دینا۔ اگر تین روز گزر جائیں اور باخود اتفاق نہ ہو تو ان چھ آدمیوں کو قتل کر دینا اور مسلمانوں کو چھوڑ دینا جس کو چاہیں منتخب کریں۔

پس جب دفن عمر سے فراغت ہوئی تو ابوطلحہ نے سب کو ایک جگہ جمع کیا اور تلوار لے کر دروازہ پر کھڑے ہو گئے۔ اب شوریٰ میں سب سے پہلے طلحہ نے لوگوں کو گواہ کر کے اپنا حق عثمان کو دے دیا تا کہ عثمان کا پہلو قوی ہو جائے اور جناب امیرؑ ضعیف ہو جائیں۔ یہ دیکھ کر زبیر کو خاندانی حمیت نے اس پر مجبور کیا کہ اپنا حق جناب امیرؑ کو دے دیں کیونکہ زبیر صفیہ بنت عبدالمطلب کے بیٹے اور جناب ابوطالب کے بھانجے تھے۔ (مگر افسوس حمیت اسلامی کسی میں نہیں آتی۔ مؤلف) طلحہ کا میل عثمان کی طرف اس سبب سے تھا کہ وہ جناب امیرؑ سے منحرف تھے کیونکہ وہ بھی قبیلہ تیم سے تھے اور ابن عم ابوبکر بھی اور بنی تیم کے دلوں میں بنی ہاشم سے کینہ تھا اور یہ امر فطری ہے جو تمامی طبائع بشر کی خلقت میں داخل ہے خصوصاً طینت عرب میں اور اس کی طبیعت میں جس کا آج تک تجربہ مؤید ہے۔

غرض دو تو یوں نکل گئے چار باقی رہے۔ ان میں سے سعد بن ابی وقاص نے اپنا حق عبدالرحمن کو دے دیا کیونکہ دونوں قبیلہ بنی زہرہ سے تھے اب تین ہی رہ گئے۔ پس عبدالرحمن نے جناب امیرؑ وعثمان سے کہا کہ تم دونوں سے جو شخص اپنے نفس کو علیحدہ کر لے گا اسی کو اس کا اختیار ہوگا کہ خلیفہ بنائے۔ اس پر دونوں ساکت رہے تو عبدالرحمن نے کہا اچھا تم لوگ گواہ رہو کہ میں اپنے کو علیحدہ کیے لیتا ہوں اس شرط پر کہ تم دونوں سے جسے چاہوں خلیفہ بناؤں۔ اس کا بھی کوئی جواب نہ ملا تو عبدالرحمن نے جناب امیرؑ سے کہا (یہ شروع سے چلا آتا ہے کہ جس کو خلیفہ کرنا منظور نہیں ہوتا اس سے ابتدا کی جاتی ہے۔ مؤلف) میں تم سے اس شرط پر بیعت کرتا ہوں کہ کتاب خدا وسنت رسولؐ اور سیرت شیخین (طریق ابوبکر وعمر) پر عمل کرو۔ جناب امیرؑ نے فرمایا میں تو صرف کتاب خدا وسنت رسول پر ہی عمل کروں گا۔ تب عبدالرحمن حضرتؑ کا ہاتھ چھوڑ کر عثمان کی طرف متوجہ ہوئے عثمان نے ان شرائط کو قبول کر لیا۔ عبدالرحمن نے پھر جناب امیرؑ سے کہا اور حضرتؑ نے وہی جواب دیا اور حضرت عثمان نے قبول کیا۔ جب تین مرتبہ اس طرح کا کلام ہو چکا تو عبدالرحمن نے عثمان کے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور کہا یا امیر المومنین۔ (بقیہ صفحہ مابعد)

(بقیہ صفحہ ماقبل) اس کے بعد علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں:

فَيُقَالُ اِنَّ عَلِيًّا قَالَ لَهٗ: وَاللّٰهِ مَا فَعَلْتُهَا اِلَّا لِاَنَّكَ رَجَوْتَ مِنْهُ مَا رَجَا صَاحِبُكُمَا مِنْ صَاحِبِهٖ دَقَّ اللّٰهُ بَيْنَكُمَا عِطْرَ مُنَشَّمٍ. قِيْلَ فَفَسَدَ بَعْدَ ذٰلِكَ بَيْنَ عُثْمَانَ وَ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ فَلَمْ يُكَلِّمْ اَحَدُهُمَا صَاحِبَهٗ حَتّٰى مَاتَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ۔

عبدالرحمن نے حضرت عثمان کی بیعت کر لی تو جناب امیرؑ نے فرمایا: تم نے یہ بیعت اس لیے کی ہے جس غرض سے ابوبکر کی بیعت عمر نے کی تھی تا کہ عثمان کے بعد تم کو خلافت ملے۔ خدا تم لوگوں میں اختلاف شدید پیدا کر دے گا۔ کہا گیا ہے کہ واقعی اس کے بعد عبدالرحمن اور عثمان میں ایسا شدید اختلاف ہوا کہ عبدالرحمن مر گئے اور دونوں میں کلام نہ ہوا۔

علامہ ابن ابی الحدید اس کلمہ ''فَصَغٰى رَجُلٌ مِّنْهُمْ لِضِغْنِهٖ'' کی شرح میں لکھتے ہیں کہ ''مراد اس سے طلحہ ہے، مگر قطب راوندی علیہ الرحمہ کا قول نقل کیا ہے کہ وہ سعد بن ابی وقاص کو مراد لیتے ہیں'' پس یہ بھی صحیح ہو سکتا ہے کیونکہ جناب امیرؑ نے سعد کے ماموں کو جنگ بدر میں قتل کیا تھا اس وجہ سے اس کے دل میں کینہ تھا۔ ان امور سے معلوم ہوا کہ یہ شوریٰ کس طرح کا زہر قاتل بنایا گیا تھا کہ کل دشمنان جناب امیرؑ کا مجموعہ مرتّب کیا گیا ہے کہ کسی طرح حضرتؑ کو کامیابی نہ ہو۔ یہاں تک جو کچھ ذکر کیا گیا وہ خلاصہ ہے واقعہ شوریٰ کا بروایت علامہ ابن ابی الحدید و مؤرخ طبری وغیرہ۔ اس سے زیادہ تفصیل ''تشہید المطاعن'' جلد ۳۔ اور ''ذوالفقار حیدر'' جلد ۳ میں ملاحظہ ہو سکتی ہے۔

اس کے بعد علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں جس کا ترجمہ یہ ہے کہ جناب امیرؑ نے جو بددعا دی تھی وہ قبول ہوئی کہ دونوں (عثمان اور عبدالرحمن بن عوف) اس حالت میں مرے کے باخود باہم عداوت بڑھ گئی اور ایک دوسرے سے علیحدہ رہا۔ ایک دفعہ عبدالرحمن نے عثمان کے پاس پیغام بھیجا کہ میں نے اپنے رہتے تم کو مسلمانوں کا خلیفہ مقرر کیا حالانکہ مجھ کو وہ فضائل حاصل ہیں جو تم کو نہیں کیونکہ میں جنگ بدر میں شریک تھا اور تم نہیں۔ میں بیعت رضوان میں شامل تھا تم نہیں۔ تم نے جنگ اُحد میں فرار کیا اور میں ثابت قدم رہا۔ عثمان نے اس کے جواب میں کہلا بھیجا کہ میں بوجہ تیمارداری دختر رسولؐ جنگ بدر میں شریک نہ ہو سکا مگر حضرتؐ نے مجھ کو بھی اسی طرح حصّہ دیا جس طرح تم کو دیا۔ اور وہی اجر فرمایا جو تم کو ملا۔ اور بیعتِ رضوان تو تمہارے ہی سبب سے ہوئی کہ تمہارے قتل کی خبر آئی تو حضرتؐ نے یہ بیعت لی اور میری طرف سے بیعت کی۔ رہا فرار از جنگ اُحد تو خدا اس کو بخش چکا پھر کیوں تم ایسے گناہ پر ملامت کرتے ہو جس کو خدا نے بخش دیا حالانکہ تمہارے ایسے گناہ ہیں جن کو ہم لوگ نہیں جانتے کہ بخشے گئے یا نہیں۔

عثمان نے جب اپنا نہایت عالی شان قصر زور ابنوایا تو لوگوں کی دعوت کی جس میں عبدالرحمن بھی تھے۔ عبدالرحمن نے جب اس مکان اور اس دعوت کے اہتمام پر نظر کی تو کہا: اس نے ان باتوں کی تصدیق کر دی جس کی ہم تکذیب کرتے تھے خدا ہم کو پناہ دے تمہاری بیعت سے۔ اس پر حضرت عثمان کو غصّہ آیا اور کہا اے غلام اس کو یہاں سے نکال دے۔ چنانچہ وہ نکال دیے گئے، اس کے بعد حکم دیا کہ کوئی شخص عبدالرحمن کے پاس آمد و رفت نہ رکھے جس پر سب نے ان کے پاس آنا جانا چھوڑ دیا بہ استثنا حضرت ابن عباس کے وہ آیا جایا کرتے اور فرائض و علمِ قرآن ان سے سیکھتے۔ جب عبدالرحمن بیمار ہوئے تو عثمان عیادت کو آئے اور بات چیت بھی شروع کی مگر عبدالرحمن نے کوئی کلام نہ کیا یہاں تک کہ مر گئے۔

اَقُوْلُ۔ بعض ناعاقبت اندیش جناب سیدہ کو الزام دیتے ہیں کہ حضرت کو ابوبکر وغیرہ سے اس قدر کینہ تھا کہ (بقیہ صفحہ مابعد)

اِلٰٓی اَنْ قَامَ ثَالِثُ الْقَوْمِ، نَافِجًا حِضْنَیْهِ بَیْنَ نَثِیْلِهٖ وَ مُعْتَلَفِهٖ وَ قَامَ مَعَهٗ بَنُوْۤ اَبِیْهِ

تااینکہ اس جماعت کے تیسرے صاحب اپنے دونوں پہلوؤں کو آنتوں اور معدہ کے درمیان پھولائے ہوئے قائم ہوئے اور ان کے ساتھ ان کے خاندانی

(بقیہ صفحہ ماقبل) وہ معذرت کرتے رہے مگر آپ نے نہ مانا اور تادم مرگ کلام نہ کیا، مگر عبدالرحمن بن عوف کے بارے میں کچھ نہیں کہتے کہ انہوں نے کیوں ایسا کیا حالانکہ مظلوم کے اختیار میں اس کے سوا کیا ہے؟ کیونکہ عبدالرحمن کا اقتدار اور مالداری ایسی تھی کہ عثمان کو خلیفہ بنا ہی دیا اور کوئی کچھ نہ کر سکا۔ اس پر بھی حضرت عثمان نے خلافت پانے پر یہ حکم دیا کہ ان سے کوئی بات چیت نہ کرے، نہ آمدورفت رکھے۔ پھر اگر جناب سیدہؑ نے ابوبکر کے ساتھ یہ برتاؤ کیا تو کیوں تعجب ہوتا ہے۔

سیرت شیخین پر عمل کرنے سے انکار کرنے کو تو سب نے لکھا ہے کہ جناب امیرؑ نے اس شرط کو قبول نہیں کیا مگر کتاب ''الامامۃ والسیاسۃ'' ابن قتیبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک دوسری شرط بھی پیش کی گئی تھی۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

ثُمَّ اَخَذَ بِیَدِ عَلِیٍّ، فَقَالَ لَهٗ: اُبَایِعُكَ عَلٰی شَرْطِ عُمَرَ اَنْ لَا تَجْعَلَ اَحَدًا مِّنْ بَنِیْ هَاشِمٍ عَلٰی رِقَابِ النَّاسِ، فَقَالَ عَلِیٌّ عِنْدَ ذٰلِكَ: مَا لَكَ وَلِهٰذَا اِذَا قَطَعْتَهَا فِیْ عُنُقِیْ؟ فَاِنَّ عَلَیَّ الْاِجْتِهَادَ لِاُمَّةِ مُحَمَّدٍ حَیْثُ عَلِمْتُ الْقُوَّةَ وَالْاَمَانَةَ اِسْتَعَنْتُ بِهَا، كَانَ فِیْ بَنِیْ هَاشِمٍ اَوْ غَیْرِهِمْ، قَالَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ: لَا وَاللّٰهِ حَتّٰی تُعْطِیَنِیْ هٰذَا الشَّرْطَ، قَالَ عَلِیٌّ: وَاللّٰهِ لَا اُعْطِیْكَهٗ اَبَدًا، فَتَرَكَهٗ۔ (صفحہ ۴۵، مطبوعہ مصر)

کہ عبدالرحمن نے حضرت علیؑ سے یہ شرط پیش کی کہ عمر نے خلافت کے لیے یہ شرط بھی کی ہے کہ بنی ہاشم سے کوئی شخص برسرِ حکومت نہ لایا جائے۔ جناب امیرؑ نے فرمایا: اس شرط سے تم کو کیا واسطہ، جب خلافت کو ہماری گردن میں ڈال دیا تو اب اجتہاد کرنا ہمارا کام ہے کہ اُمّت محمدیہؐ کی خیرخواہی کے لیے کوشش کریں، جس میں قوت اور امانت پائیں گے اس سے مدد لیں گے چاہے وہ بنی ہاشم میں ہو یا غیر بنی ہاشم میں۔ عبدالرحمن نے کہا: قسم بخدا جب تک اس شرط کو نہ قبول کرو گے ہم خلافت نہ دیں گے۔ جناب امیرؑ نے کہا: قسم بخدا ہم کبھی اس شرط کو منظور نہیں کر سکتے۔ اس پر عبدالرحمن نے آپؑ کو چھوڑ دیا۔

اس سے صاف معلوم ہوا کہ یہ خلافت کیا تھی بالکل غلامی کہ جو عمر کہہ گئے تھے ہمیشہ اسی پر عمل ہوتا رہے مگر ہائے فرمان رسولؐ کا کسی شخص کو بھی خیال نہ تھا کہ آپؐ کا کیا حکم ہے۔

قَوْلُهٗ: اِلٰی اَنْ قَامَ ثَالِثُ الْقَوْمِ۔ یعنی بعد از خرابی بسیار تیسرا شخص قائم مقام ہوا تو اس کی یہ حالت تھی ''نَافِجًا حِضْنَیْهِ''۔ ''نَفْجٌ'' معنی اٹھانا اور ''حِضْنٌ'' اس مقام کو کہتے ہیں جو بغل سے کولھے تک ہے۔ اس کا استعمال دو مقام پر ہوتا ہے ایک متکبر پر دوسرے اس پر جس کا پیٹ بھرا ہو۔ ''نَثِیْلٌ'' گوبر غلیظ کو کہتے ہیں اور ''مُعْتَلَفٌ'' مَوْضِعُ عَلَفٍ مطلب یہ ہے کہ اس شخص کا کام سوائے کھانے اور فضلہ دفع کرنے کے اور کچھ نہ تھا۔

قَوْلُهٗ: وَ قَامَ مَعَهٗ بَنُوْۤ اَبِیْهِ۔ یعنی اس کے خاندان والے بھی اس کے ساتھ کھڑے ہو گئے اس سے اشارہ اس طرف ہے کہ باوصفی کہ حضرت عمر نے مرتے وقت کہلایا تھا کہ عثمان! اگر تم نے اپنے خاندان والوں کو مسلط کیا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ تم (بقیہ صفحہ مابعد)

يَخْضِمُوْنَ مَالَ اللهِ خَضْمَةَ الْاِبِلِ نِبْتَةَ الرَّبِيْعِ. اِلٰى اَنِ انْتَكَثَ فَتْلُهٗ. وَ اَجْهَزَ عَلَيْهِ عَمَلُهٗ وَ كَبَتْ بِهٖ بِطْنَتُهٗ.

حضرات (بنی امیہ بھی) اٹھ کھڑے ہوئے جو مال خدا کو اس طرح کھائے جاتے جس طرح اونٹ فصل بہار کی ہری دوب کھاتے ہیں۔ تا اینکہ (جب) ان کا (بھی) تار پود ٹوٹ گیا۔ ان کے عمل (ناشائستہ) نے ان کا کام تمام کر دیا اور ان کی بے جا شکم پری نے ان کو لے ڈالا۔

(بقیہ صفحہ مابعد) قتل کیے جاؤ گے اور جب عبدالرحمن نے خلیفہ بنایا ہے تو اس وقت بھی کہا تھا:

وَشَرَطَ عُمَرُ اَنْ لَّا تَجْعَلَ اَحَدًا مِّنْ بَنِيْ اُمَيَّةَ عَلٰى رِقَابِ النَّاسِ، فَقَالَ عُثْمَانُ: نَعَمْ۔ (کتاب الامامۃ والسیاسۃ ص ۴۴)

کہ عمر نے خلافت کی شرط یہ بھی قرار دی تھی کہ بنی اُمیہ سے کسی کو لوگوں کی گردن پر نہ سوار کرنا جس پر عثمان نے کہا ہاں نہیں سوار کروں گا۔

تو یہ اشارہ ہے اس طرف کہ عثمان نے خلافت لیتے وقت تو اس شرط پر لیا تھا کہ اپنے خاندان والوں کو حکومت نہ دیں گے مگر خلافت پاتے ہی وہ شرط توڑ دی جس سے خلافت بھی ان کی باطل ہو چکی ہے۔ یہیں سے اس کی مصلحت معلوم ہوتی ہے کہ جناب امیرؑ نے کیوں نہ اس شرط کو قبول کیا تھا کیونکہ یہ بالکل خلاف شریعت ہے کہ آدمی کوئی عہد کرے اور پھر اس کو توڑ دے۔

قَوْلُهٗ: يَخْضِمُوْنَ مَالَ اللهِ خَضْمَةَ الْاِبِلِ۔ ''خَضْمٌ'' اور ''قَضْمٌ'' دو لفظ ہیں ''خَضْمٌ'' بھر منہ کھانے کو کہتے ہیں کہ منہ میں کوئی چیز بھر لیں اور پورے منہ سے کھائیں اور ''قَضْمٌ'' دانتوں کے کناروں سے چبا کر کھانے کو کہتے ہیں جس میں کم کھانا ہوتا ہے۔ چنانچہ قول ابوذر علیہ الرحمہ ہے۔

بَنِيْ اُمَيَّةُ يَخْضِمُوْنَ وَ نَقْضُمُ۔

یعنی بنی امیہ بھر منہ کھاتے ہیں اور ہم لوگ تھوڑا تھوڑا۔

ابن ابی الحدید لکھتے ہیں۔

وَهُوَ اَتَّهُمْ عَلٰى قِدَمِ عَظِيْمَةٍ مِنَ النَّهَمِ وَ شِدَّةِ الْاَكْلِ وَ امْتِلَاءِ الْاَفْوَاهِ۔

یعنی بنی امیہ پیٹو بنے اور بے حد کھانے اور منہ بھرے رہنے میں مشغول رہتے۔

قَوْلُهٗ: اِلٰى اَنِ انْتَكَثَ فَتْلُهٗ۔ ''فَتْلٌ'' بٹی ہوئی ڈوری یا رسّی کو کہتے ہیں اور ''كَبَتْ'' ''كَبْوٌ'' سے ہے جس کے معنی منہ کے بھل گرتے کے ہیں۔ ''ضرورت سے زیادہ کھانے کو کہتے ہیں۔ پس مطلب یہ ہے کہ عثمان نے جو ہر امر میں اس طرح کی زیادتی کی، اسی کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ اس طرح قتل کیے گئے۔

ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ عمر کی فراست ان کے بارے میں پوری ہوئی کیونکہ عثمان نے تمامی بنی امیہ کو لوگوں کی گردن پر سوار کر دیا۔ بڑے بڑے ملک پر ان کو حاکم بنایا اور بہت سی جاگیریں ان کو دیں۔ ان کے زمانہ میں آرمینیہ فتح ہوا اس کا خمس (بقیہ صفحہ مابعد)

فَمَا رَاعَنِیْٓ اِلَّا وَ النَّاسُ کَعُرْفِ الضَّبُعِ اِلَیَّ، یَنْثَالُوْنَ عَلَیَّ مِنْ کُلِّ جَانِبٍ، حَتّٰی لَقَدْ وُطِئَ الْحَسَنَانِ، وَ شُقَّ عِطْفَایَ، مُجْتَمِعِیْنَ حَوْلِیْ کَرَبِیْضَةِ الْغَنَمِ،

تو مجھے اس سے نہایت حیرت ہوئی کہ لوگ مجھ پر بجّوں کے بال کی طرح اژدہام کرنے لگے اور ہر طرف سے مجھ پر ٹوٹے پڑتے تھے یہاں تک کہ (اسی ہجوم میں) حسن وحسین علیہما السلام کچل گئے اور میرے دونوں پہلو شکستہ ہو گئے،

(بقیہ صفحہ ماقبل) جس قدر تھا سب مروان کو دے دیا۔ عبداللہ بن خالد بن اسید طالبِ صلہ ہوا تو چار کروڑ درہم دے دیا۔ حکم ابن ابی العاص کو آنحضرتؐ نے مدینہ سے نکال دیا تھا، عمر، ابوبکر نے اس کو آنے نہیں دیا مگر عثمان نے اس کو بُلوا لیا اور ایک لاکھ درہم انعام بھی دیا۔ آنحضرتؐ نے ایک بازار کو جو مھزول کہا جاتا تھا مسلمانوں پر وقف کر دیا تھا مگر عثمان نے اس کو حرث بن حکم برادر مروان کی جاگیر میں دے دیا۔ فدک کو مروان کی جاگیر میں دے دیا۔ چراگاہ حوالی مدینہ جو مسلمانوں کا حق تھا اس کو خاص بنی امیہ کے لیے مقرر کیا۔ عبداللہ بن ابی سرح کو (جس نے عبدالرحمن بن عوف کو شوریٰ کے وقت رائے دی تھی کہ عثمان کو خلیفہ بناؤ) فتح افریقہ سے جو مال غنیمت ملا تھا سب دے دیا اور دوسرے کسی مسلمان کو کچھ بھی نہ دیا۔ ابوسفیان کو بیت المال سے دو لاکھ دلوا دیا۔

جب مروان کو ایک لاکھ دیا اور اپنی بیٹی ام امان کا اس سے عقد کیا تو زید بن ارقم خزانہ دار نے خزانہ کی کُنجیاں لا کر رکھ دیں اور رونے لگے، اس پر عثمان نے کہا ہم اگر صلہ رحم کرتے ہیں تو تم روتے ہو۔ زید نے کہا یہ نہیں ہے بلکہ جو کچھ تم نے عہدِ رسولؐ میں خرچ کیا تھا وہ سب وصول کر لیا۔ مروان کو اگر سو درہم بھی دیتے تو زیادہ تھا (چہ جائیکہ ایک لاکھ دیا جائے)۔ اس پر عثمان نے کہا خزانہ کی کنجیاں رکھ دو تم سے زیادہ مستحق ہیں۔ اسی طرح ابوموسیٰؑ بہت سارہ مال عراق سے لائے تو عثمان نے سب بنی امیہ کو دے دیا۔ حرث بن حکم برادر مروان سے اپنی بیٹی عائشہ کو بیاہا تو ایک لاکھ بیت المال سے دلوایا۔ ان سب کے ساتھ اور بدعتیں بھی شریک ہوئیں کہ جناب ابوذر رضی اللہ عنہ کو مدینہ سے ربذہ کی طرف نکلوا دیا اور عبداللہ بن مسعود کو اس قدر مارا کہ ان کی پسلی کی ہڈیاں بھی ٹوٹ گئیں، دربان مقرر کیا جو قواعد وضوابط خلیفہ دوم نے اقامت حدود میں مقرر کیے تھے سب کو درہم و برہم کر دیا۔ آخر میں وہ خط جو معاویہ کو لکھا تھا کہ ایک جماعت مسلمین کو قتل کرو یہاں تک ان کے مظالم بڑھ گئے کہ آخر اکثر اہل مدینہ نے اتفاق کر کے ان کو قتل کر ڈالا اور مصریوں کی آمد نے اور ان قاتلین کی مدد کی۔ (ملاحظہ ہو شرح ابن ابی الحدید ص ۶۷ اور اس سے زیادہ تفصیل کے لیے تشیید المطاعن)

قَوْلُہٗ: فَمَا رَاعَنِیْٓ اِلَّا وَ النَّاسُ۔ یہاں سے حضرتؑ نے اپنی خلافت کی حالت شروع کی کہ ہم پر اس طرح اژدہام ہوا کہ ہم مجبور ہو گئے۔ کیونکہ سابق خلافتوں کا حال مذکور ہو چکا ہے، ہر خلیفہ نے تحصیل خلافت میں ایسی ناجائز کوششیں کیں جن سے آج تک اسلام شرمندہ ہے۔ خلیفہ اول و دوم نے تو اس خلافت کے لیے دفن وکفن رسول کی بھی ضرورت نہ سمجھی۔ عمر نے پروانہ خلافت لکھوا کر کس طرح ہاتھ میں ڈنڈا لیا اور سب سے زبردستی بیعت لی۔ عثمان نے کیسی کیسی سازشیں کیں اور ہر شرط پر خلافت قبول کرنے کو آمادہ ہو گئے مگر خلافت پاتے ہی ان سب شرائط کو توڑ دیا۔ لیکن کسی خلافت میں یہ اژدہام یہ ہجوم نہ ہوا جو جناب امیرؑ کے وقت نظر آیا، جس سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اگر جمہور اسلام اپنے ارادے پر چھوڑ دیے جاتے اور خلافت جمہوری قرار پاتی جب بھی جناب امیرؑ ہی خلیفہ ہوتے، مگر سازشوں نے مجبور رکھا اور خلاف خواہش اہل اسلام اپنا کام کیا۔ (بقیہ صفحہ مابعد)

(بقیہ صفحہ ماقبل) تفصیل اس واقعہ کی حسب تحریر علامہ ابن اثیر جزری یہ ہے کہ ذی الحجہ ۳۵ھ میں بعد قتل عثمان اصحاب رسول نے جن میں مہاجرین وانصار سب تھے جمع ہوکر جناب امیرؑ سے استدعا کی کہ آپ خلافت قبول کریں۔ حضرتؑ نے فرمایا ہم کو اس کی حاجت نہیں جس کو تم اختیار کرو ہم راضی ہیں۔ سب نے کہا ہم بجز آپ کے کسی کو اس کا مستحق نہیں سمجھتے۔ نہ قرابت رسول میں آپ کا کوئی ہمسر ہے نہ سابقہ اسلامی میں۔ حضرتؑ نے فرمایا ایسا نہ کرو بلکہ ہماری وزارت تمہارے لیے بہتر ہے خلافت سے۔ سب نے جواب دیا ایسا نہیں ہوسکتا۔

فَغَشَى النَّاسُ عَلِيًّا فَقَالُوْا: نُبَايِعُكَ فَقَدْ تَرٰى مَا نَزَلَ بِالْاِسْلَامِ وَمَا ابْتُلِيْنَا بِهٖ مِنْ بَيْنِ الْقُرٰى. فَقَالَ عَلِيٌّ دَعُوْنِيْ وَالْتَمِسُوْا غَيْرِيْ اِنَّا مُسْتَقْبِلُوْنَ اَمْرًا لَهٗ وُجُوْهٌ ،وَلَهٗ اَلْوَانٌ لَا تَقُوْمُ بِهِ الْقُلُوْبُ وَلَا تَثْبُتُ عَلَيْهِ الْعُقُوْلُ۔ فَقَالُوْا: نُنْشِدُكَ اللّٰهَ اَلَا تَرٰى مَا نَحْنُ فِيْهِ، اَلَا تَرَى الْاِسْلَامَ، اَلَا تَرَى الْفِتْنَةَ، اَلَا تَخَافُ اللّٰهَ، فَقَالَ قَدْ اَجَبْتُكُمْ ،وَاعْلَمُوْا اَنِّيْ اِنْ اَجَبْتُكُمْ رَكِبْتُ بِكُمْ مَا اَعْلَمُ وَاِنْ تَرَكْتُمُوْنِيْ فَاِنَّمَا اَنَا كَاَحَدِكُمْ اِلَّا اَنِّيْ مِنْ اَسْمَعِكُمْ وَ اَطْوَعِكُمْ لِمَنْ وَلَّيْتُمُوْهُ''۔ (تاریخ کامل جلد ۳ ص ۷۵)

پس سب نے جناب امیرؑ کو گھیر لیا اور کہا ہم آپ ہی کی بیعت کریں گے۔ آپ نے فرمایا ہم کو چھوڑ دو دوسرے کو تلاش کرو کیونکہ ہم کو ایسے پیش آنے والے امور نظر آتے ہیں جن کے بہت سے وجوہ اور مختلف رنگ ہیں کہ نہ کوئی دل ان کا متحمل ہو سکتا ہے نہ عقلیں ان پر ثابت رہ سکتی ہیں۔ سب نے کہا ہم آپ کو خدا کی قسم دیتے ہیں۔ کیا آپ اس آفت کو نہیں دیکھتے جس میں ہم مبتلا ہیں؟ کیا آپ کو اسلام پر رحم نہیں آتا؟ کیا اس عظیم فتنہ کا خیال نہیں کرتے؟ کیا خدا سے نہیں ڈرتے؟ تب جناب امیرؑ نے فرمایا: اچھا ہم قبول کر لیتے ہیں لیکن یہ سمجھ رکھو کہ ہم اس کو قبول کر کے اپنے علم کے موافق کام کریں گے اور اگر چھوڑ دو گے تو ہم بھی مثل تمہارے ہوں گے، پس جس کو خلیفہ بناؤ گے اس کی تم سب سے زیادہ اطاعت کریں گے۔

قتل عثمان ۱۸ ذی الحجہ ۳۵ھ کو ہوا (تاریخ طبری، ص ۱۴۵) اور بیعت جناب امیرؑ ۲۶ ذی الحجہ روز پنج شنبہ کو ہوئی (تاریخ طبری، صفحہ ۱۵۷) ان آٹھ روزوں میں نہ معلوم کتنی مرتبہ جناب امیرؑ سے قبول خلافت کی استدعا کی گئی مگر آپ ہمیشہ انکار ہی کرتے رہے۔ مؤرخ طبری لکھتا ہے:

فَاخْتَلَفُوْا اِلَيْهِ بَعْدَ مَا قُتِلَ عُثْمَانُ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ مِرَارًا، ثُمَّ اَتَوْهُ فِيْ اٰخِرِ ذٰلِكَ، فَقَالُوْا لَهٗ: اِنَّهٗ لَا يَصْلَحُ النَّاسُ اِلَّا بِاَمِيْرٍ، وَقَدْ طَالَ الْاَمْرُ، فَقَالَ لَهُمْ: اِنَّكُمْ قَدِ اخْتَلَفْتُمْ اِلَيَّ وَاَتَيْتُمْ، وَاِنِّيْ قَائِلٌ لَكُمْ قَوْلًا اِنْ قَبِلْتُمُوْهُ قَبِلْتُ اَمْرَكُمْ، وَاِلَّا فَلَا حَاجَةَ لِيْ فِيْهِ۔ قَالُوْا: مَا قُلْتَ مِنْ شَيْءٍ فَقَبِلْنَاهُ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ. فَجَاءَ فَصَعِدَ الْمِنْبَرَ، فَاجْتَمَعَ النَّاسُ اِلَيْهِ، فَقَالَ: اِنِّيْ قَدْ كُنْتُ كَارِهًا لِاَمْرِكُمْ، فَاَبَيْتُمْ اِلَّا اَنْ اَكُوْنَ عَلَيْكُمْ، اَلَا وَاِنَّهٗ لَيْسَ لِيْ اَمْرٌ دُوْنَكُمْ، اِلَّا اَنَّ مَفَاتِيْحَ مَالِكُمْ مَعِيْ، اَلَا وَاِنَّهٗ لَيْسَ لِيْ اَنْ اٰخُذَ مِنْهُ دِرْهَمًا دُوْنَكُمْ، رَضِيْتُمْ؟ قَالُوْا: نَعَمْ، قَالَ: اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ عَلَيْهِمْ، ثُمَّ بَايَعَهُمْ عَلٰى ذٰلِكَ۔ ج ۴، ص ۴۲۸۔

یعنی لوگ برابر حضرت علیؑ کو آ کر گھیرا کرتے پھر سب اکٹھے ہو کر آخری مرتبہ آئے تو کہا کہ بغیر خلافت کے لوگوں کی حالت درست نہیں رہ سکتی اور اب بہت تاخیر ہوگئی۔ پس حضرتؑ نے فرمایا تم لوگ بار بار میرے پاس آتے رہے اب میں ایک بات (بقیہ صفحہ مابعد)

فَلَمَّا نَهَضْتُ بِالْاَمْرِ نَكَثَتْ طَآئِفَةٌ وَّ مَرَقَتْ اُخْرٰى وَ قَسَطَ اٰخَرُوْنَ، كَاَنَّهُمْ لَمْ يَسْمَعُوْا كَلَامَ اللّٰهِ حَيْثُ يَقُوْلُ: ﴿تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَ لَا فَسَادًا ؕ وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ۝﴾، بَلٰى! وَاللّٰهِ لَقَدْ سَمِعُوْهَا وَ وَعَوْهَا، وَ لٰكِنَّهُمْ حَلِيَتِ الدُّنْيَا فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ، وَ رَاقَهُمْ زِبْرِجُهَا.

گلۂ گوسفند کی طرح سب میرے گرد بھیڑ لگائے ہوئے تھے۔ پس جب (مجبور ہوکر) میں حکومت پر قائم ہوا تو ایک جماعت نے عہد شکنی کر لی، دوسری دین سے خارج ہوگئی۔ اور کچھ اور لوگ نافرمان ہو بیٹھے۔ گویا ان لوگوں نے کلام خدا سنا ہی نہیں جو فرماتا ہے ''اس آخرت کے گھر کو ہم نے ان کے لیے مہیّا کیا ہے جو زمین میں نہ سرکشی کرنی چاہتے ہیں اور نہ فساد، کیونکہ عاقبت (کی بھلائی) صرف پرہیزگاروں ہی کے لیے ہے'' مگر نہیں اس آیت کو انہوں نے بخدا سنا ہے اور انہیں یاد بھی ہے لیکن (بات یہ ہے کہ) دُنیا ان کی آنکھوں میں بھلی معلوم ہوئی اور اس کی زینت نے انہیں لبھالیا۔

(بقیہ صفحہ مابعد) کہتا ہوں اگر تم نے مانا تو میں خلافت قبول کروں گا ورنہ مجھے ضرورت نہیں۔ لوگوں نے جواب دیا آپ جو بھی فرمائیں گے ہم لوگ مان لیں گے۔ پس حضرتؑ منبر پر تشریف لے گئے اور لوگوں نے آپ کو گھیر لیا۔ پھر حضرتؑ نے فرمایا کہ لوگو! میں تمہاری خلافت سے متنفر ہوں لیکن تم لوگ مانتے نہیں۔ پس میں (خلیفہ ہوکر) تم سے زیادہ کوئی حق نہیں حاصل کروں گا سوائے اس کے کہ بیت المال کی کنجیاں تو میرے پاس رہیں گی اور اس میں سے ایک درہم بھی تم لوگوں کے حصّہ سے زیادہ نہ لوں گا۔ نہ تم میں سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دوں گا پس اس کو تم لوگ پسند کرتے ہو؟ سب نے کہا ہاں۔ تب حضرتؑ نے فرمایا خداوندا گواہ رہنا۔ پھر لوگوں سے انھیں شرائط پر بیعت لی۔ (جلد ۵، ص ۱۵۲)

اس روایت سے معلوم ہوا کہ خلافت جمہوری کیسی ہوتی ہے کیونکہ آٹھ روز تک حضرتؑ نے انکار کیا جب سب نے مجبور کیا تو حضرتؑ نے ان شرائط کے ساتھ قبول فرمایا۔ پس کیا کسی سابق خلیفہ کے بارے میں بھی کوئی ایسی نفرت یا کراہت اور انکار کی مثال دکھا سکتا ہے؟ ان حالات سے کہ آٹھ روز تک جناب امیرؑ نے خلافت کو قبول نہ فرمایا، اندازہ ہوسکتا ہے کہ جب جناب امیرؑ نے قبول کیا ہے تو کس طرح کا اژدہام ہوا ہوگا اور کیسا ہجوم کہ جناب امیرؑ فرماتے ہیں کہ حسنین اس میں کچل گئے ہمارے دونوں پہلوں چھل گئے۔

قَوْلُهٗ: فَلَمَّا نَهَضْتُ بِالْاَمْرِ۔ یعنی جب ہم نے خلافت کو قبول کر لیا اور اس کے انتظام میں مشغول ہوئے تو تین گروہ نے تین طرف سے مخالفت شروع کر دی۔ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں:

فَاَمَّا الطَّائِفَةُ النَّاكِثَةُ فَهُمْ اَصْحَابُ الْجَمَلِ، وَاَمَّا الطَّائِفَةُ الْقَاسِطَةُ فَاَصْحَابُ صِفِّيْنَ وَسَمَّاهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهِ الْقَاسِطِيْنَ، وَاَمَّا الطَّائِفَةُ الْمَارِقَةُ فَاَصْحَابُ النَّهْرَوَانِ. وَاَشَرْنَا نَحْنُ بِقَوْلِنَا: سَمَّاهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ الْقَاسِطِيْنَ اِلٰى قَوْلِهٖ عَلَيْهِ السَّلَامُ: " سَتُقَاتِلُ بَعْدِيْ النَّاكِثِيْنَ وَالْقَاسِطِيْنَ

وَالْمَارِقِيْنَ " وَهٰذَا الْخَبَرُ مِنْ دَلَائِلِ نُبُوَّتِهٖ صَلَوَاتُ اللّٰهِ عَلَيْهِ، لِاَنَّهٗ اَخْبَارٌ صَرِيْحٌ بِالْغَيْبِ لَا يَحْتَمِلُ التَّمْوِيْهَ وَالتَّدْلِيْسَ كَمَا تَحْتَمِلُهُ الْاَخْبَارُ الْمُجْمَلَةُ. وَصَدَقَ قَوْلُهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ: "اَلنَّاكِثِيْنَ كَوْنُهُمْ نَكَثُوا الْبَيْعَةَ بِادِئَ بَدْءٍ" وَقَدْ كَانَ عَلَيْهِ السَّلَامُ يَتْلُوْ وَقْتَ مُبَايَعَتِهِمْ لَهٗ "﴿ وَمَنْ نَكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ ﴾۔ (جلداول،ص ۶۷،۶۸)

یعنی جناب امیر علیہ السلام کے اس قول میں ناکثین سے مراد اصحاب جمل ہیں جن کی سردار حضرت عائشہ تھیں اور طلحہ وزبیر اور قاسطین سے اصحاب صفین طرفداران معاویہ ہیں اور مارقین سے اصحاب نہروان خوارج ہیں۔ان سب کا نام خود رسول اللہؐ نے یہ سب رکھا اور اس کی خبر دی چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ہے کہ اے علی تم ہمارے بعد ناکثین، قاسطین اور مارقین سے مقابلہ کروگے اور یہ حدیث آنحضرتؐ کے دلائل نبوت سے ہے کیونکہ اس میں صریح خبر غیب ہے جس میں کسی طرح جعل وفریب یا تحریف وتاویل کی گنجائش نہیں جیسا کہ اور اخبار مجملہ میں ہوتی ہے اور آنحضرتؐ کے کلام مارقین کا صدق آپ کے اس قول سے ثابت ہوتا ہے جس کو پہلے خوارج کے بارے میں فرمایا کہ یہ لوگ دین سے اس طرح نکل جائیں گے جس طرح تیر نشانہ کے پار ہوجاتا ہے پھر اس کا کوئی اثر اس نشانہ میں نہیں رہتا اور آنحضرتؐ کے قول ناکثین کا صدق اس سے ثابت ہوا کہ اصحاب جنگ جمل نے سب سے پہلے حضرتؑ کی بیعت توڑ ڈالی چنانچہ جناب امیرؑ جس وقت ان سے بیعت لیتے تھے اس آیہ کی تلاوت فرماتے تھے ﴿وَ مَنْ نَكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ﴾ (سورۂ الفتح، آیہ ۱۰) پس جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غیب کی خبر دی تھی اسی طرح جناب امیرؑ نے بھی اس آیہ کی تلاوت کرکے اشارہ کردیا کہ یہ لوگ اس کے مصداق ہوں گے۔

وَاَمَّا اَصْحَابُ صِفِّيْنَ فَاِنَّهُمْ عِنْدَ اَصْحَابِنَا رَحِمَهُمُ اللّٰهُ۔مُخَلَّدُوْنَ فِي النَّارِ فَصَحَّ فِيْهِمْ قَوْلُهٗ ﴿ وَ اَمَّا الْقَاسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا ﴾ (سورہ الجن، آیہ ۱۵) (شرح ابن ابی الحدید ص ۶۸)

پس فرقہ قاسطین ہمارے اصحاب کے نزدیک مخلد فی النار رہیں گے تو خدا کا قول ''وَ اَمَّا الْقَاسِطُوْنَ'' الآیہ درست ہوا کہ یہ ہمیشہ آتش جہنم کے کندے بنے رہیں گے۔

قَوْلُهٗ: ''كَاَنَّهُمْ لَمْ يَسْمَعُوْا الخ''۔ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ وعید خدا صرف اس سے نہیں متعلق ہے کہ فتنہ وفساد اور علوے درجہ دُنیوی کو ترک کرو بلکہ چاہیے اس کا ارادہ بھی نہ کریں۔

چنانچہ دوسرے آیہ میں خدا فرماتا ہے:

﴿ وَ لَا تَرْكَنُوْا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ﴾ (سورۂ ھود، آیہ ۱۱۳)

یعنی ان لوگوں کی طرف میل اور رغبت بھی نہ کرو جنہوں نے ظلم کیا ہے کہ تم کو آتش جہنم جلادے گی۔

اس میں نہ صرف ظلم کی مذمّت کی گئی ہے بلکہ ظالموں کی طرف میل اور خواہش کی بھی سخت ممانعت ہے۔مگر افسوس آپ حضرات اہل سنت کی تصانیف میں اس کو بخوبی ملاحظہ کرتے ہوں گے کہ کوئی ظالم ایسا نہیں گزرا جس کے وہ طرفدار نہ ہوں بشرطیکہ وہ خلافت خلفائے ثلاثہ کو مانتا ہو خواہ وہ یزید ہو یا شمر، عمرو بن سعد ہو یا زیاد وحجاج۔ (بقیہ صفحہ مابعد)

اَمَا وَ الَّذِیْ فَلَقَ الْحَبَّةَ وَ بَرَاَ النَّسَمَةَ! لَوْ لَا حُضُوْرُ الْحَاضِرِ وَ قِیَامُ الْحُجَّةِ بِوُجُوْدِ النَّاصِرِ وَ مَآ اَخَذَ اللّٰهُ عَلَی الْعُلَمَآءِ اَنْ لَّا یُقَارُّوْا عَلٰی کِظَّةِ ظَالِمٍ وَّ لَا سَغَبِ مَظْلُوْمٍ، لَاَلْقَیْتُ حَبْلَهَا عَلٰی غَارِبِهَا وَ لَسَقَیْتُ اٰخِرَهَا بِکَاْسِ اَوَّلِهَا، وَ لَاَلْفَیْتُمْ دُنْیَاکُمْ هٰذِهِ اَزْهَدَ عِنْدِیْ مِنْ عَفْطَةِ عَنْزٍ.

(رہا میرے متعلق تو) آگاہ ہو قسم اس ذات کی جس نے دانہ کو شگافتہ اور انسان کو پیدا کیا کہ اگر حاضرین مجھے نہ گھیرتے اور مددگاروں کے (ظاہراً) موجود رہنے سے حجت خدا (مجھ پر) نہ قائم ہو جاتی اور خدا نے علما سے یہ عہد نہ لیا ہوتا کہ ظالم کی سیری اور مظلوم کی بھوک پر (کسی طرح) قرار نہ لیں تو میں اس (ناقہ خلافت) کی مہار اس کے کوہان (ہی) پر چھوڑ دیتا اور اس (خلافت) کے آخری (مرتبہ) کو (بھی) اول ہی (مرتبہ) کے کاسہ (نفرت وعلیحدگی) سے سیراب کرتا اور تم لوگ اپنی اس دنیا کو میری نظروں میں بکرے کی ناک کے پانی سے بھی زیادہ بے حقیقت پاتے۔

قَالُوْا: وَ قَامَ اِلَیْهِ رَجُلٌ مِّنْ اَهْلِ السَّوَادِ عِنْدَ بُلُوْغِهٖ اِلٰی هٰذَا الْمَوْضِعِ مِنْ خُطْبَتِهٖ، فَنَاوَلَهٗ

(لوگوں کا بیان ہے کہ) خطبہ میں حضرتؑ اس مقام تک پہنچے تھے کہ اہل عراق سے ایک شخص کھڑا ہو گیا اور آپؑ کی خدمت

(بقیہ صفحہ ماقبل) قَوْلُهٗ: اَمَا وَ الَّذِیْ فَلَقَ الْحَبَّةَ ۔ اب یہاں سے حضرتؑ اپنی مجبوری کو ظاہر فرماتے ہیں کہ میں نے کیوں خلافت کو قبول کیا اور کیوں ترک نہیں کرتا۔ تو فرماتے ہیں کہ جب بیعت ہو چکی اور ایک لشکر نصرت کے لیے تیار ہے تو اب حجت خدا پوری ہو گئی اور خدا نے جو عہد عالموں سے لیا ہے کہ مظلوم کی مصیبت اور ظالم کے مظالم پر چشم پوشی نہ کرو بلکہ مظلوم کی حمایت کرو اور ظالم کو سزا دو۔ پس اگر یہ دو عذر نہ ہوتے تو میں خلافت کو چھوڑ دیتا۔

ابن ابی الحدید لکھتے ہیں:

یَقُوْلُ عَلَیْهِ السَّلَامُ: لَوْلَا وُجُوْدُ مَنْ یَّنْصُرُنِیْ لَا کَمَا کَانَتِ الْحَالُ عَلَیْهَا اَوْ لَا بَعْدَ وَفَاتِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فَاِنِّیْ لَمْ اَکُنْ حِیْنَئِذٍ وَاجِدًا لِلنَّاصِرِ مَعَ کَوْنِیْ مُکَلَّفًا اَنْ لَّا اُمَکِّنَ الظَّالِمَ مِنْ ظُلْمِهٖ لَتَرَکْتُ الْخِلَافَ وَلَرَفَضْتُهَا اَلْآنَ کَمَا رَفَضْتُهَا قَبْلُ۔ (ص ۶۸)

یعنی اگرچہ بعد وفات رسول اللہ بھی مجھ پر لازم تھا کہ ظالم کے ظلم کو روکوں کیونکہ میں اس کا مکلف تھا مگر چونکہ کوئی ناصر و مددگار نہ تھا اس سبب سے میں ساکت رہا۔ اسی طرح اب بھی خلافت کو ترک کر دیتا لیکن کیا کروں مجبور ہو گیا کہ کچھ لوگ تو مددگار مل گئے ہیں جن کی امداد و اعانت سے دفع ظلم مجھ پر لازم ہو گیا۔

قَوْلُهٗ: وَ لَاَلْفَیْتُمْ۔ یہ بھی عجب طرح کی تشبیہ ہے کہ شاید اس سے بڑھ کر کوئی کلمۂ تحقیر اور مذمت دنیا میں نہ کہا گیا ہو کہ آپ فرماتے ہیں تمہاری دنیا میرے نزدیک بکری کی ناک کے پانی سے بھی زیادہ ذلیل ہے۔ (بقیہ صفحہ مابعد)

كِتَابًا، فَاَقْبَلَ يَنْظُرُ فِيْهِ، فَلَمَّا فَرَغَ مِنْ قِرَآئَتِهٖ قَالَ لَهُ ابْنُ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا: يَآ اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ! لَوِ اطَّرَدْتَّ خُطْبَتَكَ مِنْ حَيْثُ اَفْضَيْتَ. فَقَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ:

هَيْهَاتَ يَا ابْنَ عَبَّاسٍ! تِلْكَ شِقْشِقَةٌ هَدَرَتْ ثُمَّ قَرَّتْ.

قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: فَوَاللّٰهِ مَآاَسِفْتُ عَلٰى كَلَامٍ قَطُّ كَاَسَفِيْ عَلٰى هٰذَا الْكَلَامِ اَنْ لَّا يَكُوْنَ اَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَيْهِ السَّلَامُ بَلَغَ مِنْهُ حَيْثُ اَرَادَ.

میں ایک خط پیش کیا جس کے دیکھنے میں حضرتؑ متوجہ ہو گئے۔(جب فارغ ہوئے تو عبداللہ) ابن عباس رضی اللہ عنہما نے آپؑ سے کہا ''یا امیر المومنینؑ آپؑ نے جہاں سے اپنا خطبہ چھوڑا تھا کاش وہاں سے پھر بیان فرمایئے تو ارشاد فرمایا:

''افسوس! ابن عباس! یہ (اونٹ کے ایسی) ایک بلبلاہٹ تھی جو (جوش میں) اٹھی پھر تھم گئی''!!

ابن عباس کہتے ہیں'' خدا کی قسم مجھ کو کسی کلام پر اتنا افسوس نہیں ہوا جتنا افسوس اس کلام پر ہوا کہ (جناب) امیر المومنین علیہ السلام نے اپنے کلام کو وہاں تک کیوں نہ پہنچایا جہاں تک مقصود تھا۔

قَوْلُهٗ: قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: فَوَاللّٰهِ مَآاَسِفْتُ۔

مصنف: اس پر ابن ابی الحدید لکھتے ہیں:

فَحَدَّثَنِيْ شَيْخِيْ اَبُو الْخَيْرِ مُصَدِّقُ بْنُ شَبِيْبٍ الْوَاسِطِيُّ فِيْ سَنَةِ ثَلَاثٍ وَسِتِّمِائَةٍ، قَالَ: قَرَاْتُ عَلَى الشَّيْخِ اَبِيْ مُحَمَّدٍ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ اَحْمَدَ الْمَعْرُوْفِ بِابْنِ الْخَشَّابِ هٰذِهِ الْخُطْبَةَ، فَلَمَّا انْتَهَيْتُ اِلٰى هٰذَا الْمَوْضِعِ، قَالَ لِيْ: لَوْ سَمِعْتُ ابْنَ عَبَّاسٍ يَقُوْلُ هٰذَالَقُلْتُ لَهٗ: وَهَلْ بَقِيَ فِيْ نَفْسِ ابْنِ عَمِّكَ اَمْرٌ لَمْ يَبْلُغْهُ فِيْ هٰذِهِ الْخُطْبَةِ لِتَتَاَسَّفَ اَلَّا يَكُوْنَ بَلَغَ مِنْ كَلَامِهٖ مَا اَرَادَ! وَاللّٰهِ مَا رَجَعَ عَنِ الْاَوَّلِيْنَ وَلَا عَنِ الْاٰخَرِيْنَ، وَلَا بَقِيَ فِيْ نَفْسِهٖ اَحَدٌ لَمْ يَذْكُرْهُ اِلَّا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ.

یعنی میرے استاد ابوالخیر مصدق نے ۶۰۳ھ میں مجھ سے بیان کیا کہ میں نے اس خطبہ شقشقیہ کو اپنے استاد علامہ ابن الخشاب سے پڑھا تھا۔ پس جب میں ابن عباسؓ کے اس قول تک پہنچا تو استاد ابن الخشاب نے کہا کاش میرے سامنے ابن عباسؓ یہ کہتے تو میں پوچھتا کہ حضرت امیر المومنینؑ نے اپنے دل کی چھوڑی ہی کون سی بات جس کو اس خطبہ میں کہہ نہ ڈالا ہو اور جس پر آپ کو صدمہ ہے؟ خدا کی قسم حضرتؑ نے تو نہ پہلوں کو چھوڑا اور نہ پچھلوں کو۔ اور سوائے جناب رسالت مآبؐ کے اور تو آپؑ کے ذہن میں کوئی نہ رہا جس کا ذکر نہ کر دیا ہو۔

قَالَ مُصَدِّقٌ: وَكَانَ ابْنُ الْخَشَّابِ صَاحِبَ دُعَابَةٍ وَهَزْلٍ، قَالَ: فَقُلْتُ لَهٗ: اَتَقُوْلُ اِنَّهَا مَنْحُوْلَةٌ! فَقَالَ: لَا وَاللّٰهِ، وَاِنِّيْ لَاَعْلَمُ اَنَّهَا كَلَامُهٗ، كَمَا اَعْلَمُ اَنَّكَ مُصَدِّقٌ. قَالَ فَقُلْتُ لَهٗ: (بقیہ صفحہ مابعد)

(بقیہ صفحہ ماقبل) اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ يَقُوْلُوْنَ اِنَّهَا مِنْ كَلَامِ الرَّضِيِّ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى. فَقَالَ: اَنّٰى لِلرَّضِيِّ وَلِغَيْرِ الرَّضِيِّ هٰذَا النَّفْسُ وَهٰذَا الْاُسْلُوْبُ! قَدْ وَقَفْنَا عَلٰى رَسَائِلِ الرَضِيِّ، وَعَرَفْنَا طَرِيقَتَهٗ وَفَنَّهٗ فِي الْكَلَامِ الْمَنْثُوْرِ، وَمَا يَقَعُ مَعَ هٰذَا الْكَلَامِ فِيْ خَلٍّ وَلَا خَمْرٍ:

مصدق کہتے ہیں میں نے ان سے دریافت کیا کہ کیا آپ کے خیال میں یہ خطبہ جعلی ہے (اور حضرت علیؑ کا کلام نہیں ہے)؟ علامہ ابن الخشاب نے کہا نہیں نہیں خدا کی قسم مجھے اس کے کلام جناب امیرؑ ہونے کا ایسا ہی یقین ہے جیسا اس کا یقین ہے کہ تم جو میرے سامنے بیٹھے ہو مصدق ہو کوئی دوسرے نہیں۔ میں (مصدق) نے کہا اکثر لوگ کہتے ہیں کہ یہ خطبہ رضی علیہ الرحمۃ کا ہے۔ اس کے جواب میں کہا، کہاں بیچارے رضی وغیرہ اور کہاں یہ الٰہی کلام۔ بھلا رضی وغیرہ کو ایسا پاکیزہ نفس اور یہ حسن کلام کہاں نصیب۔ میں نے سید رضیؒ کے بہت سے رسائل دیکھے ہیں اور ان کے طریقۂ کلام اور ان کے مذاق اور ان کے نثر کے کلام کی قابلیت کو بھی خوب جانتا ہوں پس وہ تو نہ کسی کی مدح ہی میں ایسا کلام کہہ سکتے ہیں نہ مذمت ہی میں۔

ثُمَّ قَالَ: وَاللّٰهِ لَقَدْ وَقَفْتُ عَلٰى هٰذِهِ الْخُطْبَةِ فِيْ كُتُبٍ صُنِّفَتْ قَبْلَ اَنْ يُّخْلَقَ الرَّضِيُّ بِمِائَتَيْ سَنَةٍ، وَلَقَدْ وَجَدْتُّهَا مَسْطُوْرَةً بِخُطُوْطٍ اَعْرِفُهَا، وَاَعْرِفُ خُطُوطَ مَنْ هُوَ مِنَ الْعُلَمَاءِ وَاَهْلِ الْاَدَبِ قَبْلَ اَنْ يُّخْلَقَ النَّقِيْبُ اَبُوْ اَحْمَدَ وَالِدُ الرَّضِيِّ. قُلْتُ:

خدا کی قسم میں نے تو اس خطبہ کو ان کتابوں میں دیکھا ہے جو سید رضی کے پیدا ہونے سے بھی دوسو برس قبل تصنیف کی گئی تھیں (پس اس وقت کیا عالم ارواح سے رضیؒ نے وہ خطبہ بھیج دیا تھا؟) بلکہ میں نے تو اس خطبہ کو ان خطوط سے لکھا ہوا پایا ہے جن کو میں پہچانتا ہوں اور ان خطوط کے لکھنے والے علما اور ادیب حضرات کو بھی جانتا ہوں کہ وہ سب سید رضیؒ کے والد نقیب ابواحمد کے بھی پیدائش کے قبل گزرے ہیں۔

وَقَدْ وَجَدْتُ اَنَا كَثِيْرًا مِّنْ هٰذِهِ الْخُطْبَةِ فِيْ تَصَانِيْفِ شَيْخِنَا اَبِي الْقَاسِمِ الْبَلْخِيِّ اِمَامِ الْبَغْدَادِيِّيْنَ مِنَ الْمُعْتَزِلَةِ، وَكَانَ فِيْ دَوْلَةِ الْمُقْتَدِرِ قَبْلَ اَنْ يُّخْلَقَ الرَّضِيُّ بِمُدَّةٍ طَوِيْلَةٍ. وَوَجَدْتُ اَيْضًا كَثِيْرًا مِّنْهَا فِيْ كِتَابِ اَبِيْ جَعْفَرِ بْنِ قُبَّةَ اَحَدُ مُتَكَلِّمِي الْاِمَامِيَّةِ وَهُوَ الْكِتَابُ الْمَشْهُوْرُ الْمَعْرُوْفُ بِكِتَابِ ''اَلْاِنْصَافِ''.

وَكَانَ اَبُوْ جَعْفَرٍ هٰذَا مِنْ تَلَامِذَةِ الشَّيْخِ اَبِي الْقَاسِمِ الْبَلْخِيِّ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى، وَمَاتَ فِيْ ذٰلِكَ الْعَصْرِ قَبْلَ اَنْ يَّكُوْنَ الرَّضِيُّ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى مَوْجُوْدًا۔ (ص۶۹، ج۱، ص۲۰۷، مطبوعہ مصر)

میں (ابن ابی الحدید) عرض کرتا ہوں کہ میں نے اس خطبہ کو اپنے شیخ یعنی بغدادی معتزلہ کے امام و پیشوا ابوالقاسم البلخی کی تصنیفات تک میں پایا ہے جو خلیفہ مقتدر باللہ کے زمانہ میں یعنی سید رضی علیہ الرحمہ کے پیدا ہونے سے بہت قبل گزرے ہیں (کیونکہ خلیفہ مقتدر باللہ ۲۹۵ھ میں خلیفہ ہوا ہے اور جناب سید رضی علیہ الرحمہ ۴۰۴ھ میں گزرے ہیں) اسی طرح میں نے اس خطبہ کو ابوجعفر ابن قبہ کی مشہور و معروف کتاب ''الانصاف'' میں بھی پایا ہے جو علمائے متکلمین شیعہ سے تھے اور ہمارے شیخ ابوالقاسم بلخی کے شاگرد تھے اور اسی زمانہ میں مر گئے قبل اس کے کہ سید رضی علیہ الرحمہ حیّز وجود میں بھی آئیں۔

(قَالَ الشَّرِيْفُ الرَّضِيُّ عَلَيْهِ الرَّحْمَةُ) قَوْلُهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ: فِيْ هٰذِهِ الْخُطْبَةِ «كَرَاكِبِ الصَّعْبَةِ، اِنْ اَشْنَقَ لَهَا خَرَمَ وَ اِنْ اَسْلَسَ لَهَا تَقَحَّمَ»: يُرِيْدُ اَنَّهٗ اِذَا شَدَّدَ عَلَيْهَا فِيْ جَذْبِ الزِّمَامِ وَ هِيَ تُنَازِعُهٗ رَاْسَهَا خَرَمَ اَنْفَهَا، وَ اِنْ اَرْخٰى لَهَا شَيْئًا مَّعَ صُعُوْبَتِهَا تَقَحَّمَتْ بِهٖ فَلَمْ يَمْلِكْهَا، يُقَالُ: اَشْنَقَ النَّاقَةَ اِذَا جَذَبَ رَاْسَهَا بِالزِّمَامِ فَرَفَعَهٗ، وَ شَنَّقَهَا اَيْضًا، ذَكَرَ ذٰلِكَ ابْنُ السِّكِّيْتِ فِيْ «اِصْلَاحِ الْمَنْطِقِ».

وَ اِنَّمَا قَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ: «اَشْنَقَ لَهَا» وَ لَمْ يَقُلْ: اَشْنَقَهَا لِاَنَّهٗ جَعَلَهٗ فِيْ مُقَابَلَةِ قَوْلِهٖ: «اَسْلَسَ لَهَا»، فَكَاَنَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالَ: اِنْ رَّفَعَ لَهَا رَاْسَهَا بِمَعْنٰى اَمْسَكَهٗ عَلَيْهَا بِالزِّمَامِ.

وَ فِي الْحَدِيْثِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ خَطَبَ عَلٰى نَاقَتِهٖ وَ قَدْ شَنَّقَ لَهَا فَهِيَ تَقْصَعُ بِجَرَّتِهَا وَ مِنَ الشَّاهِدِ عَلٰى اَشْنَقَ بِمَعْنٰى شَنَّقَ قَوْلُ عَدِيِّ بْنِ زَيْدِ الْعِبَادِيِّ۔

سَائَهَا مَالَهَا تَبَيَّنَ فِي الْاَيْدِيْ

وَ اِشْنَاقُهَا اِلَى الْاَعْنَاقِ

(علامہ سید شریف رضی علیہ الرحمہ کا قول ہے کہ) (اس خطبہ میں حضرت علیہ السلام کے اس قول ''كَرَاكِبِ الصَّعْبَةِ، اِنْ اَشْنَقَ لَهَا خَرَمَ وَ اِنْ اَسْلَسَ لَهَا تَقَحَّمَ'' سے مراد یہ ہے کہ اگر سوار مہار کھینچ کر ناقہ پر سختی کرتا ہے اور اس پر وہ ناقہ اپنا سر کھینچتی ہے تو اس کی نکیل پھٹ جاتی ہے اور اگر مہار کچھ ڈھیلی کرتا ہے تو وہ علاوہ اس کی صعوبت کے ناقہ اس کو لے کر گر پڑتی ہے پس خود سوار نہیں بچتا ہے۔ جب سوار ناقہ کے سر کو مہار سے کھینچ کر اونچا کرتا ہے تو اس کو ''اَشْنَقَ النَّاقَةُ'' اور ''شَنَقَ النَّاقَةُ'' (دونوں) کہتے ہیں جس کو ابن السکیت نے (اپنی کتاب) ''اصلاح المنطق'' میں ذکر کیا ہے۔

اور جناب (امیر) علیہ السلام نے ''اَشْنَقَ لَهَا'' کہا اور ''اَشْنَقَهَا'' نہ کہا اس سبب سے کہ اس کو اپنے دوسرے قول ''اَسْلَسَ لَهَا'' کے مقابلہ میں رکھا ہے پس گویا حضرتؑ نے یہ فرمایا کہ اگر سوار ناقہ کے سر کو مہار سے اونچا کرتا ہے یعنی مہار سے اس کے سر کو روکتا ہے۔

چنانچہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ناقہ پر خطبہ فرمایا ''وَ قَدْ شَنَقَ لَهَا'' یعنی جس کی مہار کھینچے ہوئے تھے اور وہ ناقہ جگالی کر رہا تھا اور ''اَشْنَقَ'' بمعنی ''شَنَقَ'' (مستعمل) ہونے کی نظیر عدی بن زید عبادی کا یہ شعر بھی ہے جس کا ترجمہ یہ ہے ''ناگوار ہوئی اس ناقہ کو وہ چیز جو ہاتھوں میں ظاہر ہوئی اور اس کے سر کا گردن کی طرف کھینچنا''۔

(لوگو!) ہم ہی سے تم لوگوں نے تاریکی (کفر و جہالت) میں ہدایت پائی اور (اسلام کے) بلند مرتبہ تک (پہنچ کر) رفعت حاصل کی اور ہماری ہی بدولت (ضلالت کی) اندھیری راتوں سے نکل کر صبح (ہدایت) میں آئے۔

پس ثابت ہوا کہ یہ خطبۂ شقشقیہ سوائے جناب امیرؑ کے کسی اور کا کلام نہیں۔ الحمدللہ کہ شرح خطبۂ شقشقیہ تمام ہوا اور اگر کچھ بسط سے کام لیا جاتا تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جاتی۔ فقط

❁ خطبہ :۴ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

بِنَا اهْتَدَيْتُمْ فِي الظَّلْمَآءِ، وَ تَسَنَّمْتُمُ الْعَلْيَآءِ، وَ بِنَا انْفَجَرْتُمْ عَنِ السَّرَارِ. وُقِرَ سَمْعٌ لَّمْ يَفْقَهِ الْوَاعِيَةَ، وَ كَيْفَ يُرَاعِي النَّبَاَةَ مَنْ اَصْمَتْهُ الصَّيْحَةُ، رُبِطَ جَنَانٌ لَّمْ يُفَارِقْهُ الْخَفَقَانُ، مَا زِلْتُ اَنْتَظِرُ بِكُمْ عَوَاقِبَ الْغَدْرِ، وَ اَتَوَسَّمُكُمْ بِحِلْيَةِ الْمُغْتَرِّيْنَ، سَتَرَنِيْ عَنْكُمْ جِلْبَابُ الدِّيْنِ،

خطبہ (۴)

اور حضرت علیہ السلام کے خطبہ کا ایک حصّہ [۱]

(پس) وہ کان بہرا ہو جو یاد رکھنے والی باتیں نہ سنے [۲] (مگر بات یہ ہے کہ) ہلکی آواز (یعنی ہماری نصیحتوں) کو وہ کیوں کر سن سکتا ہے جس کو گرجنے والی آواز (یعنی احکام خدا و رسولؐ) نے بہرا [۳] رد یا (کہ نہ سنا)۔ (ہاں) وہ دل مطمئن رہیں جو (خوف خدا سے) لرزتے رہتے ہیں۔ (رہے تم لوگ تو) میں ہمیشہ تمہارے عذر و بے وفائی کا منتظر رہا اور تمہیں فریب خوردہ لوگوں کی روش میں تاڑتا رہا [۴] (لیکن) پردۂ دین نے مجھے تم سے چھپائے

---

[۱] یہ کلمات و امثال جناب سید رضی علیہ الرحمہ نے حضرتؑ کے ایک طویل خطبہ سے انتخاب کیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ اس خطبہ کو حضرتؑ نے طلحہ اور زبیر کے قتل ہونے کے بعد ان دونوں اور ان کے ساتھیوں کو مخاطب کر کے فرمایا ہے جیسا کہ جناب رسالت مآبؐ نے جنگ بدر میں کفار قریش کے قتل اور ان کے کنویں میں ڈالے جانے کے بعد ان کو مخاطب کر کے کچھ ارشاد فرمایا تھا، جس پر خلیفہ دوم حضرت عمر نے آنحضرتؐ پر اعتراض کیا کہ ''یا رسول چہ سخن می کنی با اجسادے کہ نیست دراں روح''

جس کے جواب میں حضرتؐ نے فرمایا: ''سوگند بہ آں خدا کہ نفس من بید قدرت اوست کہ نیستید شما شنواتر از یشاں این سخن را کہ می گویم، ایشاں می شنوند و لیکن ایشاں جواب نہ می گویند''۔ (مدارج النبوۃ، ج ۲، ص ۱۲۰)

اور بعض شروح میں ہے کہ حضرتؑ نے طلحہ و زبیر کی زندگی میں ہی ان کو اور ان کے ساتھیوں کو خطاب کر کے یہ ارشاد فرمایا ہے۔

[۲] اس جملہ میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ حضرتؑ بددعا دے رہے ہیں کہ جو شخص توجہ سے سننے والی باتیں نہ سنے اور ان کو یاد نہ رکھ لے تا کہ ان پر آئندہ عمل کر سکے اس کا کان بہرا ہو جائے۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ جملہ خبریہ ہو کہ جس شخص نے ایسی باتیں نہ سنیں وہ گویا بہرا ہو گیا کہ درحقیقت اس کو سامع کہنا مناسب ہی نہیں۔

[۳] ''نَبَاَۃٌ''، خفیف اور ہلکی آواز کو کہتے ہیں اور ''صَیْحَۃٌ''، خوب سخت آواز کو۔ یہاں ''نَبَاَۃٌ'' سے مراد حضرتؑ کے ارشادات ہیں اور ''صَیْحَۃٌ'' سے زواجر قرآن و احادیث رسولؐ۔ پس مقصود یہ ہے کہ ان لوگوں (طلحہ و زبیر وغیرہم) نے خدا و رسولؐ کے اوامر و نواہی کی جن کی اہمیت نہایت سخت ہے پروانہ کی تو میری چھوٹی باتوں کی کب پروا کر سکتے ہیں۔

[۴] ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ اس جملہ میں کئی احتمال ہیں۔ سب سے واضح یہ کہ تم لوگ جو اسلام کا دعویٰ اور اس کے شعار کا اظہار کرتے ہو اسی نے تم کو مجھ سے محفوظ کر لیا ہے۔ باوجودیکہ میں تمہارے قلب کی حالت نفاق کو اچھی طرح جانتا ہوں اور اس (بقیہ صفحہ مابعد)

وَ بَصَّرَنِيْكُمْ صِدْقُ النِّيَّةِ. اَقَمْتُ لَكُمْ عَلٰى سَنَنِ الْحَقِّ فِيْ جَوَادِّ الْمَضَلَّةِ، حَيْثُ تَلْتَقُوْنَ وَ لَا دَلِيْلَ وَ تَحْتَفِرُوْنَ وَ لَا تُمِيْهُوْنَ.

اَلْيَوْمَ انْطِقُ لَكُمُ الْعَجْمَآءَ ذَاتَ الْبَيَانِ، غَرَبَ رَأْيُ امْرِئٍ تَخَلَّفَ عَنِّيْ، مَا شَكَكْتُ فِي الْحَقِّ مُذْ اُرِيْتُهٗ، لَمْ يُوْجِسْ مُوْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ خِيْفَةً عَلٰى نَفْسِهٖ،

رکھا (کہ مسلمان سمجھتا رہا مگر میری) خالص نیت نے تمہاری صحیح حالت کو مجھ پر واضح کر دیا۔ تم لوگوں (کی ہدایت) کے لیے میں نے گمراہی کی راہوں سے سیدھی راہ پر اقامت کی کیونکہ تم لوگ آپس میں ملتے تھے مگر تمہارا کوئی رہنما نہ تھا اور کنواں کھودتے تھے لیکن پانی نہیں نکلتا تھا۔[1]

آج میں بے زبانوں کو تمہارے لیے گویا کیے دیتا ہوں (گویائے) فصیح البیان۔[2] (تو اب) جو شخص مجھ سے علیحدہ ہو (سمجھو کہ) اس کی عقل زائل ہوگئی (کیونکہ) جب سے مجھے راہ حق دکھائی گئی میں نے اس میں شک کیا ہی نہیں۔ (اور جس طرح) حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی جان کا خوف نہیں ہوا تھا (بلکہ) جاہلوں اور گمراہی کی دولتوں کے

(بقیہ صفحہ ماقبل) نفاق کو اور تمہاری قلبی خباثتوں کو میں نے اپنے خالص نیت سے پہچانا ہے جیسا کہ حدیث ہے ''اَلْمُؤْمِنُ يُبْصِرُ بِنُوْرِ اللّٰهِ'' کہ مومن نورِ خدا سے باطنی امور کو دیکھ لیتا ہے۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ پردۂ دین نے مجھ کو تم سے چھپا لیا ہے اور مجھے اس سے منع کر دیا ہے کہ میں اپنی حقیقت تم پر ظاہر کروں اور اپنے کو تمہیں پہچنواؤں۔ تیسرا احتمال یہ ہے کہ پردۂ دین میرے تمہارے درمیان حائل ہوگیا، جس سے تم میری عقل و فراست اور تدبیر و سیاستِ دنیا و یہ کو سمجھ نہیں سکتے کیونکہ بسبب شدتِ وثاقت دین میں ہمیشہ مکائد دنیا سے بچتا اور تم لوگوں پر شفقت و مہربانی کرتا رہتا ہوں اور تمہارے جرموں کو معاف کرتا ہوں، جس سے تم سمجھتے ہو کہ علی ضعیف ہیں اور دنیاوی امور کا سلیقہ نہیں رکھتے حالانکہ صرف دین کے خیال نے مجھے ایسا کر رکھا ہے کہ نمونۂ رحمت خدا ہو رہا ہوں ورنہ میں تم کو بتا دیتا کہ خدا نے کیسی قوت مجھے عطا کی ہے۔

[1] یہ سب استعارات ہیں کہ تم لوگ گمراہ ہو کر بھٹکتے پھرتے تھے۔ تمہارا کوئی ہادی نہ تھا۔ انتظام اور امن و امان کے پیاسے تھے۔ کوئی ساقی نہ تھا لہٰذا جو بہت سی راہیں تھیں ان سے سیدھی راہ کو میں نے بتا دیا اور ٹیڑھی راہوں کو جو اس کے چاروں طرف تھیں چھوڑ دیا۔

[2] مطلب یہ ہے کہ جس طرح آسمان و زمین اشجار و احجار اپنی زبانِ بے زبانی سے خدا کی توحید اور اس کے خالق ہونے کا اقرار کر رہے ہیں اسی طرح حقائق و معارف، واقعات و حالات، آیات خدا و احادیث نبویؐ جو سب بے زبان ہیں بولنے والوں کی طرح گواہی دے رہے ہیں کہ میرے معیت میں فلاح دنیا و دین اور میری مخالفت میں خسران دنیا و دین ہے۔ پس باوجود یکہ یہ اشارات و رموز خفیہ ہیں لیکن صاحبان عقل و فہم کے لیے گویا زبان سے بول رہے ہیں۔

اَشْفَقَ مِنْ غَلَبَةِ الْجُهَّالِ وَ دِوَلِ الضَّلَالِ، الْيَوْمَ تَوَاقَفْنَا عَلٰى سَبِيْلِ الْحَقِّ وَ الْبَاطِلِ مَنْ وَّثِقَ بِمَآءٍ لَّمْ يَظْمَأْ.

غلبہ کا خوف [1] تھا (اسی طرح مجھے اپنی فکر نہیں بلکہ گمراہی پھیلنے سے ڈرتا ہوں پس) آج ہم (تو) راہ حق پر قائم ہیں اور (تم) باطل پر۔ (لہٰذا سمجھ رکھو کہ) جو شخص پانی پر بھروسا رکھے گا وہ پیاسا نہیں رہ سکتا (یعنی تم لوگ مجھ پر اعتماد رکھو گے تو گمراہ نہیں ہو سکتے)۔

❁ خطبہ :۵ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

لَمَّا قُبِضَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وَ خَاطَبَهُ الْعَبَّاسُ وَ اَبُوْ سُفْيَانَ بْنُ حَرْبٍ فِيْٓ اَنْ يُّبَايِعَا لَهٗ بِالْخِلَافَةِ:

اَيُّهَا النَّاسُ! شُقُّوْا اَمْوَاجَ الْفِتَنِ

خطبہ (۵)

حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتقال پر جناب عباس اور ابوسفیان بن حرب نے جناب امیرؑ سے آپ کے (ہاتھ پر) بیعت کرنے کو کہا تو آپ نے جو فرمایا اس کا (یہ) ایک حصہ (ہے) [2]

لوگو! فتنوں کی موجوں کو نجاۃ (صبر وصلح) کی کشتیوں

---

[1] یعنی خدا نے کلام مجید میں حضرت موسیٰؑ کے بارے میں جو فرمایا ہے کہ ﴿ فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ﴾ (سورۂ طٰہٰ، آیہ ۶۷) کہ ''حضرت موسیٰؑ اپنے دل میں ڈرے'' تو اس سے یہ مطلب نہیں کہ انہیں اپنی جان کی ہلاکت کا خوف ہوا بلکہ مقصود یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ اس بات سے ڈرے کہ ایسا نہ ہو کہ جہالت وضلالت غالب آ جائے۔ کیونکہ فرعون کے جادوگروں کے بدولت شبہات کے پیدا ہونے کا خوف تھا۔ اسی طرح میں جوان لوگوں کے بارے میں ڈرتا ہوں تو اس خیال سے نہیں کہ ان کے مکر وفریب یا جنگ سے میرا کچھ نقصان ہو جائے گا بلکہ خوف یہ ہے کہ ان کے چال بازیوں اور مکاریوں کو دیکھ کر دوسرے لوگ اسی کو دلیلِ حقیت نہ سمجھ لیں اور اس طرح گمراہ نہ ہو جائیں۔

[2] اس کلام کا باعث یہ ہوا کہ بعد وفات رسول اللہؐ جب خلیفہ اول صاحب بہ مشورہ عمر صاحب وابوعبیدہ خلیفہ بنائے گئے تو ابوسفیان نے چاہا کہ مسلمانوں کو آپس میں لڑا کر دین اسلام کو برباد کر دیں کیونکہ اس کی دشمنی اسلام سے باوصف قبول اسلام ایسی تھی کہ کسی کو اس سے انکار نہیں اور اس کو ناراضی جناب امیرؑ اس خلافت سے معلوم تھی اور جانتا تھا کہ خلیفہ اول بلاحکم رسول خلیفہ بنے ہیں اور یہ خلیفہ اس قبیلہ سے ہے جو ہمیشہ ذلیل وخوار رہا۔ انہیں چار باتوں نے اس کو اس پر آمادہ کیا کہ جناب عباس کے پاس آیا اور کہنے لگا ''دیکھتے ہو ان لوگوں نے خلافت کو خاندان بنی ہاشم سے نکال کر سردست بنی تیم میں پہنچا دیا اب کل بنی عدی کا یہ فظ غلیظ (عمر) ہم پر حکومت کرے گا لہٰذا جلد ہم تم حضرت علیؑ کی بیعت کر لیں۔ تم رسول خداؐ کے چچا ہو لہٰذا تمہارا اثر ہوگا اور میری بات قریش میں برابر مانی جاتی ہے پس اگر لوگوں نے اس میں ہماری مخالفت کی تو ہم ان کو جنگ کر کے ہلاک کر ڈالیں گے''۔ یہ مشورہ کر کے جناب امیرؑ کی (بقیہ صفحہ مابعد)

بِسُفُنِ النَّجَاةِ، وَ عَرِّجُوْا عَنْ طَرِيْقِ الْمُنَافَرَةِ، وَ ضَعُوْا عَنْ تِيْجَانِ الْمُفَاخَرَةِ. اَفْلَحَ مَنْ نَّهَضَ بِجَنَاحٍ، اَوِ اسْتَسْلَمَ فَاَرَاحَ، هٰذَا مَآءٌ اٰجِنٌ، وَ لُقْمَةٌ يَّغَصُّ بِهَا اٰكِلُهَا، وَ مُجْتَنِي الثَّمَرَةِ لِغَيْرِ وَقْتِ اِيْنَاعِهَا كَالزَّارِعِ بِغَيْرِ اَرْضِهٖ.

فَاِنْ اَقُلْ يَقُوْلُوْا: حَرَصَ عَلَى الْمُلْكِ، وَ

سے شق کردو اور راہِ مخالفت سے علیحدہ ہو جاؤ اور فخر (ومباہات) کے (خیالی) تاجوں کو اتار ڈالو۔[1] یہ بھی جان لو کہ کامیابی اس نے حاصل کی جو (قوی) بازو کے ساتھ کھڑا ہوا یا جس نے مطیع ہو کر لوگوں کو آسودہ کر دیا[2]، یہ (دنیا گویا) متعفن پانی اور وہ لقمہ ہے جس سے کھانے والے کو اُچّھو ہو جائے (اور اس کے سوا بھی اس وقت بیعت لینا مناسب نہیں کیونکہ) بے وقت میووں کا چننے والا مثل اس شخص کے ہے جو نامناسب زمین میں زراعت کرے۔

پس (دیکھو) اگر میں (معاملۂ خلافت میں دخل

(بقیہ صفحہ ماقبل) خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرتؑ تو ابوسفیان کی قلبی حالت سے واقف تھے کہ یہ اسلام کی خیر خواہی میں کلام نہیں کرتا بلکہ مقصود اصلی مسلمانوں کو آپس میں لڑا کر اسلام کو تباہ کرنا ہے۔ پس آپ نے اس کلام سے ابوسفیان کو سمجھایا کہ اس وقت اسلامی بہبودی صلح وامن میں ہے نہ جنگ وخون ریزی میں۔ (شرح ابن ابی الحدید معتزلی جلد اول صفحہ ۴۲ وشرح ابن میثم ص ۱۰۴)

اس کلام سے حضرات اہل سنت کا وہ اعتراض کامل طور پر رفع ہو جاتا ہے کہ حضرت علیؑ نے غصب خلافت پر تلوار میان سے کیوں نہ نکالی کیونکہ اس کی وجہ خود حضرتؑ نے ظاہر کر دی کہ اس میں اسلام کی تباہی یقینی ہے اور ہمارا سا محافظِ حقیقیٔ اسلام اس کو پسند نہیں کر سکتا کہ اسلام تباہ ہونے پائے۔ (اس کے متعلق تفصیل ضمیمہ میں ملاحظہ ہو)

[1] سیاق وسباق خطبہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں تک خطاب ابوسفیان سے تھا اس لیے کہ اس نے حضرتؑ سے بیعت کرنے کی خواہش اس سبب سے ظاہر کی تھی کہ بنی تیم کی اطاعت نہ کرنا پڑے، نہ اس لیے کہ واقعی حضرت علیؑ کو وہ حقیقی نائب رسولؐ اور خلیفۃ اللہ سمجھتا ہو۔ لہٰذا حضرتؑ نے اس کو سمجھایا کہ اسلام نے خاندان پرستی، گدی نشینی اور ذاتی وجاہت واقتدار کی حکومت کو باطل کر دیا ہے بلکہ ریاست اصلیہ اولیاء اللہ کو حاصل ہے۔ پس اے ابوسفیان اس خیال سے باز آ کہ خاندانی وجاہت سے خلافت رسولؐ حاصل ہوتی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو بنو ہاشم جن کو تو قابل سرداری کہتا ہے ان میں سب سے بزرگ عباس ہیں، ان کو سردار دین ہونا چاہیے حالانکہ ایسا نہیں ہے کیونکہ ولی اللہ صرف وہی ہو سکتا ہے جس کو خداوند عالم کے حکم سے رسول خداؐ مقرر فرما دیں۔

[2] معلوم ہوتا ہے کہ ''اَفْلَحَ مَنْ نَّهَضَ'' سے خطاب خاص حضرت عباس سے ہے اور مقصود حضرتؑ کا یہ ہے کہ جب سوائے چند مخصوص اشخاص کے سب کے سب حق سے منہ موڑ چکے میرا بیعت کے لیے کھڑا ہونا باعث خرابیٔ اسلام ہے اور مثل اس شخص کے ہوگا جو درخت سے خام میووں کو توڑے کہ میوے بھی ضائع ہو جائیں گے اور اس کو کوئی نفع بھی نہ ہوگا۔ اسی طرح اگر میں بیعت لینا چاہوں تو اسلام بھی تباہ ہو جائے گا اور میری بیعت کر کے لوگ حق کے تابع بھی نہ ہوں گے۔ لہٰذا صبر وسکوت سے کام لو کہ اسلام کی ظاہری حالت تو درست رہے۔

اِنْ اَسْكُتْ يَقُوْلُوْا: جَزَعَ مِنَ الْمَوْتِ! هَيْهَاتَ بَعْدَ اللَّتَيَّا وَ الَّتِيْ! وَ اللهِ! لَابْنُ اَبِيْ طَالِبٍ اٰنَسُ بِالْمَوْتِ مِنَ الطِّفْلِ بِثَدْيِ اُمِّهٖ، بَلِ انْدَمَجْتُ عَلٰى مَكْنُوْنِ عِلْمٍ لَوْ بُحْتُ بِهٖ لَاضْطَرَبْتُمْ اضْطِرَابَ الْاَرْشِيَةِ فِي الطَّوِيِّ الْبَعِيْدَةِ.

دے کر) کچھ کہتا ہوں تو لوگ کہیں گے کہ ملک کے حریص ہیں، اور اگر سکوت کرتا ہوں تو کہیں گے کہ موت سے ڈر گئے۔ افسوس (میرے) چھوٹے بڑے (معرکہ دیکھنے) کے بعد (ان کا یہ خیال ہے حالانکہ) قسم بخدا پسر ابوطالب (خود ذات مبارک) موت سے اس قدر مانوس ہے کہ اتنا کوئی بچہ اپنی ماں کے پستان سے بھی مانوس نہ ہوگا۔[1] (پس موت کے خوف سے علیؑ کو کیا تعلق) بلکہ (میرے سکوت کی وجہ یہ ہے کہ) ایسے مخفی علم پر میں مطلع ہوں جس کو ظاہر کروں تو تم لوگ اس طرح مضطرب ہو جاؤ جیسے گہرے کنوؤں میں ڈول وغیرہ کی رسّیاں ہلتی (اور ڈول سے ٹکراتی) ہیں[2] (اور انہیں سکون و قرار نہیں ہوتا)۔

❁ خطبہ :٦ ❁

وَ مِنْ كَلَامٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ لَمَّا اُشِيْرَ عَلَيْهِ بِاَنْ لَّا يَتْبَعَ طَلْحَةَ وَ الزُّبَيْرَ

خطبہ (٦)

حضرتؑ کے اس وقت کے کلام کا کچھ حصّہ جب آپؑ کو مشورہ دیا گیا کہ طلحہ[3] و زبیر کا تعاقب نہ

---

[1] غالباً یہ اشارہ ہے ان واقعات شجاعت اور عدم مبالاۃ بالموت کی طرف جن میں حضرتؑ نے اپنی جان کی ذرّہ برابر بھی پرواہ نہ کی مثلاً شب ہجرت بستر رسولؐ پر نہایت گہری نیند اطمینان سے تلواروں کے سائے میں سونا، جنگ بدر میں ستّر سے زیادہ کفار کو قتل کرنا، غزوہ اُحد میں بخلاف دیگر صحابہ کے ثابت قدم رہ کر آنحضرتؐ کی حمایت کرنا، عمرو بن عبدود کو خندق میں اور مرحب کو خیبر میں قتل کرنا کہ جب ان مواقع پر ہر شخص اپنے کو موت کے مُنہ میں سمجھتا تھا میں نے موت سے خوف نہ کیا تو یہ امور ان کے مقابلہ میں کیا وقعت رکھتے ہیں۔

[2] یہ اشارہ ہے ان خرابیوں اور فسادات کی طرف جو حضرتؑ کے تلوار نکالنے اور بیعت لینے سے اسلام میں پیدا ہوتے۔ اللہ اکبر کیسی بلیغ تشبیہ حضرتؑ نے دی ہے کہ دوسری اس معنویت کی مقصود نہیں۔

[3] طلحہ و زبیر جناب رسالت مآبؐ کے مشہور صحابی ہیں اور اہل سنت کے یہاں عشرہ مبشرہ سے ہیں کہ جناب رسالت مآبؐ نے ان لوگوں کو جنت کی بشارت دی تھی۔ قتل حضرت عثمان خلیفہ ثالث کے بعد ان دونوں نے نہایت اصرار سے جناب امیرؑ کو قبول خلافت پر آمادہ کیا، نہایت مستعدی سے آپ کی بیعت کی لیکن بعد ان سب کے سخت مخالف ہو گئے اور بی بی عائشہ کے ساتھ جنگ جمل میں شریک ہو کر آپ سے لڑے آخر کار مارے گئے۔ اس بارے میں حضرتؑ کو مشورہ دیا گیا کہ ان سے جہاد نہ فرمائیں۔

وَ لَا يَرْصُدَ لَهُمَا الْقِتَالَ:

وَاللّٰهِ! لَآ اَكُوْنُ كَالضَّبُعِ: تَنَامُ عَلٰى طُوْلِ اللَّدْمِ حَتّٰى يَصِلَ اِلَيْهَا طَالِبُهَا، وَ يَخْتِلَهَا رَاصِدُهَا، وَ لٰكِنِّيْٓ اَضْرِبُ بِالْمُقْبِلِ اِلَى الْحَقِّ الْمُدْبِرَ عَنْهُ، وَ بِالسَّامِعِ الْمُطِيْعِ الْعَاصِيَ الْمُرِيْبَ اَبَدًا، حَتّٰى يَأْتِيَ عَلَيَّ يَوْمِيْ، فَوَاللّٰهِ! مَا زِلْتُ مَدْفُوْعًا عَنْ حَقِّيْ، مُسْتَاْثَرًا عَلَيَّ، مُنْذُ قَبَضَ اللّٰهُ تَعَالٰى نَبِيَّهٗ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حَتّٰى يَوْمِ النَّاسِ هٰذَا.

کریں اور نہ ان سے جنگ کا سامان فرمائیں۔

بخدا میں بجّو ایسا نہ ہوں گا جو دیر تک کھٹکھٹانے سے سو جاتا ہے یہاں تک کہ اس کا پکڑنے والا اس تک پہنچ جاتا ہے اور تاک والا فریب دے کر پکڑ لیتا ہے۔[1] بلکہ میں حق کی طرف آنے والے کے ساتھ لڑتا رہوں گا۔ اس سے جو اس سے منہ پھیرے گا اور فرمانبردار کے ساتھ اس سے جو نافرمانی (یا) شک کرے گا یہاں تک کہ میرے اجل معین کا دن آ جائے کیونکہ خدا کی قسم جب سے خدا نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو (دُنیا سے) اٹھا لیا آج تک میں برابر اپنے حق سے ہٹایا جاتا رہا ہوں اور (غیروں کو) مجھ پر ترجیح دی جاتی رہی ہے۔

خطبہ :۷

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

اِتَّخَذُوا الشَّيْطٰنَ لِاَمْرِهِمْ مِلَاكًا، وَ اتَّخَذَهُمْ لَهٗٓ اَشْرَاكًا، فَبَاضَ وَ فَرَّخَ فِيْ

خطبہ (۷)

حضرت علیہ السلام کے ایک خطبہ کا کچھ حصّہ۔

(لوگوں نے) شیطان کو اپنے ہر امر کا مالک و مختار بنا رکھا ہے اور اس نے بھی ان کو اپنا شریک (یا پھندا) بنایا ہے۔ پس انہی کے سینوں میں اس نے انڈے بچے دیے

---

[1] علّامہ ابن ابی الحدید ابوعبیدہ سے نقل کرتے ہیں کہ بجّو (جانور) کا شکار کرنے والا اس کے سوراخ کے پاس آتا ہے تو وہاں کی زمین کو آہستہ آہستہ کھٹکھٹاتا ہے اور کچھ بولتا جاتا ہے جس سے بجّو فریب میں آ کر سو رہتا ہے، پس صیاد اس کے پیر میں رسّی باندھ کر اس کو گرفتار کر لیتا ہے۔ اسی حالت سے حضرتؑ اپنی حالت کو تشبیہ دیتے ہیں کہ میں جنگ سے باز نہ آؤں گا کیونکہ پھر یہ لوگ میری خاموشی سے جو چاہیں گے کر گزریں گے اور میرا وہی حال ہوگا جو بجّو کا حال ان کی آوازوں کو سن کر سو رہنے سے ہوتا ہے بلکہ میں ان لوگوں کو جو میری اطاعت کریں گے اور حق کو مانیں گے ہمراہ لے کر ان لوگوں سے جہاد کروں گا جو مجھ سے مخالفت اور احکام خدا و رسولؐ سے روگردانی یا ان میں شک و شبہ کرتے ہیں، یہاں تک کہ میں درگاہ خدا میں حاضر ہو جاؤں کیونکہ وفات رسولؐ سے آج تک ان لوگوں کی یہی حالت رہی ہے کہ باطل کو حق پر ترجیح دیتے رہے اور مستحق کو ترک کر کے غیر مستحق کو اختیار کرتے رہے۔

صُدُوْرِهِمْ، وَ دَبَّ وَ دَرَجَ فِيْ حُجُوْرِهِمْ، فَنَظَرَ بِاَعْيُنِهِمْ، وَ نَطَقَ بِاَلْسِنَتِهِمْ، فَرَكِبَ بِهِمُ الزَّلَلَ، وَ زَيَّنَ لَهُمُ الْخَطَلَ، فِعْلَ مَنْ قَدْ شَرِكَهُ الشَّيْطٰنُ فِيْ سُلْطَانِهٖ، وَ نَطَقَ بِالْبَاطِلِ عَلٰى لِسَانِهٖ.

اور انہی کی گودوں میں (وہ شیطانی بچّے) چلے پھرے (اور جوان ہو رہے ہیں) تو اب (شیطان نے جو کچھ) دیکھا انہی کی آنکھوں سے اور (جو کچھ) باتیں کیں انہی کی زبانوں سے۔ پھر تو ان کو (ہر طرح کے) گناہ پر آمادہ کیا اور ہر برائی کو ان کے لیے آراستہ کیا مثل اس شخص کے افعال کے جس کے (ہر) کام میں شیطان شریک ہو اور اسی کے زبان سے کلام باطل کرتا ہو۔[1]

❁ خطبہ :۸ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

يَعْنِيْ بِهِ الزُّبَيْرَ فِيْ حَالٍ اقْتَضَتْ ذٰلِكَ:

خطبہ (۸)

حضرت علیہ السلام کے ایک کلام کا کچھ حصّہ زبیر کے متعلق ایسی حالت کے بارے میں جو اسی (کلام) کو مقتضی تھی۔[2]

---

[1] اس خطبہ میں جناب امیر علیہ السلام نے ایسی لطیف تشبیہات ذکر فرمائی ہیں جن کے محاسن کا بیان بھی نہیں ہوسکتا۔ حضرتؑ اپنے زمانہ کے مخالفین کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ان لوگوں نے شیطان کو اپنے تمام امور کا مدار المہام بنا رکھا ہے کہ جو کچھ کرتے ہیں اسی کی اطاعت سے لہٰذا شیطان نے بھی ان لوگوں کو اپنا شریک یعنی شیطان بنا لیا ہے۔ یا یہ کہ اپنا پھندا بنایا کہ لوگوں کو اس سے پھانستے ہیں کیونکہ اگر اشراک جمع شریک ہو تو وہ معنی ہوں گے اور اگر شریک کی جمع لی جائے تو بمعنی پھندا ہوگا۔ غرض دونوں کے اتحاد کی یہ حد ہوگئی کہ جس طرح چڑے گھونسلوں میں انڈے دے کر بچے نکالتے ہیں اور انہیں گھونسلوں میں وہ بچے بڑے ہوتے ہیں اسی طرح ان لوگوں کے سینوں میں شیطان اپنے انڈے بچے دیتا ہے چنانچہ وہ شیطانی بچے بڑھتے اور جوان بھی انہیں کے سینوں میں ہوتے ہیں۔ یعنی یہ لوگ باطل و گمراہی کو جو گویا شیطان کی محبوب اولاد ہے اسی طرح اپنے سینوں میں پرورش کرتے ہیں جس طرح طائر اپنے بچوں کو گھونسلوں میں۔ لہٰذا جب ان لوگوں اور شیطان میں اس قدر اتحاد ہو گیا تو شیطان جو کچھ دیکھتا ہے انہیں کی آنکھوں سے اور جو کچھ بولتا ہے انہیں کی زبانوں سے۔ غرض ان کے رگ و ریشہ میں شیطان پیوست ہو گیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ یہ سب کے سب شیطان کی اطاعت اور محبت کرتے کرتے خود بھی شیطان مجسم ہو گئے ہیں کہ اب اگر کوئی شخص ان لوگوں میں اور شیطان میں فرق کرنا چاہے تو نہ کر سکے۔

[2] زبیر بن العوام صحابی رسالت مآبؐ نے پہلے جناب امیرؑ کی بیعت کی بعد ازاں آپؑ کا مخالف ہو گیا اور نقض عہد و بیعت کر کے جنگ جمل میں آ کر حضرتؑ سے لڑا تو آنحضرتؑ نے اس سے کہلایا کہ تم نے تو میری بیعت کر لی تھی لہٰذا وہ بیعت تمہاری گردن میں لازم اور میری اطاعت تم پر واجب اور متحتم ہے۔ زبیر نے کہا بیعت کرتے وقت میں نے توریہ کر لیا تھا۔ کبھی کہا کہ ظاہراً صرف (بقیہ صفحہ مابعد)

يَزْعُمُ اَنَّهٗ قَدْ بَايَعَ بِيَدِهٖ، وَ لَمْ يُبَايِعْ بِقَلْبِهٖ، فَقَدْ اَقَرَّ بِالْبَيْعَةِ، وَ ادَّعَى الْوَلِيْجَةَ، فَلْيَاْتِ عَلَيْهَا بِاَمْرٍ يُّعْرَفُ، وَ اِلَّا فَلْيَدْخُلْ فِيْمَا خَرَجَ مِنْهُ.

وہ گمان کرتا ہے کہ اس نے (میری) بیعت اپنے ہاتھ سے کی ہے اور اپنے دل سے بیعت نہیں کی پس اقرار بیعت تو اس نے کر لیا (رہا یہ کہ) دلی مخالفت کا دعویٰ کیا تو اسے چاہیے کہ (اپنے) اس (دعویٰ) پر کوئی ایسی دلیل لائے جو واضح ہو ورنہ جس امر (بیعت) سے نکل گیا ہے اس میں داخل ہو۔

❁ خطبہ :۹ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

وَ قَدْ اَرْعَدُوْا وَ اَبْرَقُوْا وَ مَعَ هٰذَيْنِ الْاَمْرَيْنِ الْفَشَلُ، وَ لَسْنَا نُرْعِدُ حَتّٰى نُوْقِعَ، وَ لَا نُسِيْلُ حَتّٰى نُمْطِرَ.

خطبہ (۹)

حضرت علیہ السلام کے کلام کا کچھ حصّہ۔

یہ لوگ (خوب) گرجے (بھی) اور چمکے (بھی) مگر پھر بھی وہی بزدلی!! اور (برخلاف اس کے) ہم جب تک ہلاک نہیں کر لیتے گرجتے نہیں اور جب تک برس نہیں لیتے بہتے نہیں۔[1]

❁ خطبہ :۱۰ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

خطبہ (۱۰)

حضرت علیہ السلام کے ایک خطبہ کا کچھ حصّہ۔

(بقیہ صفحہ ماقبل) ہاتھ سے بیعت کر لی تھی اور دل میں یہ نیت تھی کہ آپؑ کی بیعت نہیں کروں گا۔ غرض اسی قسم کے بیہودہ جواب دیتا تھا۔ حضرتؑ نے جب یہ سنا تو فرمایا کہ اس کا تو اسے بہرحال اقرار ہے کہ میری بیعت کی۔ اب یہ جو دعویٰ کرتا ہے کہ اس وقت دل میں اس کے خلاف امر تھا تو چاہیے کہ اس دعویٰ پر کوئی دلیل پیش کر کے اس کو ثابت کر دے تاکہ واضح ہو جائے وہ میری بیعت میں نہیں ہے ورنہ جب اقرار بیعت کر چکا تو اسی بیعت میں باقی رہ کر میری اطاعت کرتا رہے۔

[1] یہ جملے جنگ جمل کے فریق مخالف یعنی بی بی عائشہ وطلحہ وزبیر کے لشکر کی حالت میں ہیں کہ یہ لوگ جنگ سے قبل زمین میں زلزلہ ڈالے ہوئے تھے کہ ہم یوں لڑیں گے، یوں ہلاک کریں گے لیکن یہ سب دعوے لڑنے کے قبل ہی تھے۔ جب جنگ شروع ہو گئی تو ویسے ہی بودے نکلے۔ برخلاف اس کے ہم لوگوں کی حالت ہے کہ پہلے بالکل مطمئن اور خاموش رہتے ہیں لیکن جب لڑتے ہیں تو رن ہل جاتے ہیں اور جب تلوار پکڑ لیتے ہیں تو خون کی ندیاں بہ جاتی ہیں۔

اَلَا وَ اِنَّ الشَّيْطٰنَ قَدْ جَمَعَ حِزْبَهٗ، وَ اسْتَجْلَبَ خَيْلَهٗ وَرَجْلَهٗ، وَاِنَّ مَعِيْ لَبَصِيْرَتِيْ. مَا لَبَّسْتُ عَلٰى نَفْسِيْ وَ لَا لُبِّسَ عَلَيَّ. وَايْمُ اللّٰهِ! لَاُفْرِطَنَّ لَهُمْ حَوْضًا اَنَا مَاتِحُهٗ، لَا يَصْدُرُوْنَ عَنْهُ وَ لَا يَعُوْدُوْنَ اِلَيْهِ.

خبردار ہو جاؤ کہ شیطان ۱؎ نے اپنا گروہ (گمراہی کے لیے) جمع کر لیا اور اپنے سوار و پیادے اکٹھا کر لیے (مگر) میرے ساتھ تو میری وہی بصیرت (دین) موجود ہے ۲؎ کہ نہ تو میرے نفس ہی نے میری بصیرت کو اشتباہ میں ڈالا اور نہ (اور ہی کسی طرح) میں اشتباہ میں ڈالا گیا۔ ۳؎ خدا کی قسم میں ان کے لیے (جنگ کا) ایک ایسا حوض بھروں گا جس کا پانی کھینچنے والا بھی میں ہی ہوں گا کہ یہ سب نہ تو اس سے نکل سکیں گے اور نہ (اس سے بھاگنے والے) ادھر ۴؎ لوٹ سکیں گے۔

خطبہ :۱۱

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

خطبہ (۱۱)

لِابْنِهٖ مُحَمَّدِ بْنِ الْحَنَفِيَّةِ لَمَّآ اَعْطَاهُ الرَّايَةَ يَوْمَ الْجَمَلِ:

کچھ حصّہ حضرت علیہ السلام کے کلام کا (جسے) اپنے صاحب زادہ محمد بن حنفیہ سے (فرمایا) جب جنگ جمل میں ان کو لشکر کا علم عطا کیا۔

۱؎ علّامہ ابن ابی الحدید اس کی شرح میں لکھتے ہیں کہ ممکن ہے حضرتؑ کی مراد یہاں شیطان سے شیطان حقیقی ہو اور ممکن ہے کہ اس سے مراد معاویہ ہو۔ پس اگر معاویہ مراد ہے تو لشکر جمع کرنے اور سوار و پیادے اکٹھا کرنے کا مضمون واقعات کے بیان کرنے کے لیے ہو اور اگر شیطان حقیقی مراد ہے تو لشکر جمع کرنے سے مراد استعارات ہوں کہ شیطان نے سب کو گمراہ کر دیا اور اپنی جماعت تیار کر لی ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ اس سے مراد معاویہ ہی ہے۔

۲؎ یعنی جناب رسالت مآبؐ کے زمانہ سے جو بصیرتِ دین مجھے حاصل ہے وہ اس وقت تک موجود ہے جس میں کسی قسم کا تغیر ہوا ہی نہیں لہٰذا مجھے شیطان کی طرح لوگوں کے بہکانے اور شر و فساد کے لیے لشکر آراستہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

۳؎ اس کے متعلق ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ یہ نہایت عمدہ تقسیم ہے کیونکہ جو شخص بھی راہ ہدایت کو ترک کر کے گمراہ ہوتا ہے اس کی دو ہی صورت ہوتی ہیں۔ یا اس کا نفس ہی گمراہی کی طرف مائل ہو جاتا ہے یا دوسرے لوگ اس کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں پس حضرتؑ کے بارے میں دونوں صورتیں مفقود ہیں۔

۴؎ حضرتؑ کا مقصود یہ ہے کہ اس شیطان معاویہ کے مقابلہ میں جنگ و جدال کا ایسا گڑھا تیار کروں گا اور اس میں ان لوگوں کو اس طرح پھنساؤں گا کہ جو اس میں آ جائیں گے وہ نکل نہ سکیں گے اور جو اس سے بھاگیں گے وہ لوٹ نہ سکیں گے۔

تَزُوْلُ الْجِبَالُ وَ لَا تَزُلْ، عَضَّ عَلٰى نَاجِذِكَ، اَعِرِ اللّٰهَ جُمْجُمَتَكَ، تِدْ فِي الْاَرْضِ قَدَمَكَ، اِرْمِ بِبَصَرِكَ اَقْصَى الْقَوْمِ، وَ غُضَّ بَصَرَكَ، وَ اعْلَمْ اَنَّ النَّصْرَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ سُبْحَانَهٗ.

(بیٹا) پہاڑ ٹل جائیں (تو ٹل جائیں) تم نہ ٹلنا (بلکہ) دانت کو (دانت پر) خوب جمائے رہنا، اپنا سر خدا کو عاریت دے دینا، اپنے قدم کو زمین میں میخ کی طرح گاڑ دینا، لشکر کی آخری صف پر اپنی نگاہ ڈالنا اور (وہیں) اسے جما دینا اور یقین رکھنا کہ خدائے سبحانہ کی درگاہ سے (تمہاری) مدد (ضرور) ہوگی۔[1]

❁ خطبہ: ۱۲ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

لَمَّآ اَظْفَرَهُ اللّٰهُ بِاَصْحَابِ الْجَمَلِ وَ قَدْ قَالَ لَهٗ بَعْضُ اَصْحَابِهٖ: وَدِدْتُّ اَنَّ اَخِيْ فُلَانًا كَانَ شَاهِدَنَا لِيَرٰى مَا نَصَرَكَ اللّٰهُ بِهٖ عَلٰى اَعْدَآئِكَ. فَقَالَ لَهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ:

اَهَوٰى اَخِيْكَ مَعَنَا؟

فَقَالَ: نَعَمْ. قَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ:

فَقَدْ شَهِدَنَا، وَ لَقَدْ شَهِدَنَا فِيْ عَسْكَرِنَا هٰذَآ اَقْوَامٌ فِيْ اَصْلَابِ الرِّجَالِ وَ اَرْحَامِ

خطبہ (۱۲)

حضرت علیہ السلام کے کلام کا کچھ حصّہ۔

جب خدا نے آپؑ کو اصحاب (جنگ) جمل پر فتح دی اور آپؑ سے آپؑ کے بعض اصحاب نے کہا کہ ''میری خواہش تھی کہ میرا فلاں بھائی ہم میں موجود رہتا کہ دیکھتا خدا نے آپؑ کو آپؑ کے دشمنوں پر کس طرح غالب کیا'' تو حضرت علیہ السلام نے اس سے فرمایا:

''کیا تیرے بھائی کا میلان ہماری طرف ہے؟''

اس نے عرض کی ''ہاں'' فرمایا:

''(اگر ایسا ہے) تو بے شک وہ ہم میں حاضر تھا اور ہمارے اس لشکر میں تو وہ لوگ بھی موجود تھے جو (ابھی) مردوں کی پشتوں میں اور عورتوں کی رحموں میں ہیں کہ

[1] تمام دنیا کے کلام کو ڈھونڈ لیا جائے پھر بھی جنگ کی ہدایت اور میدان حرب کی استقامت میں اس قدر مختصر الفاظ میں ایسے مواعظ و نصائح نہیں مل سکتے۔ ایک ایک لفظ میں حضرتؑ نے ایک ایک دفتر کے مطالب کو ادا فرما دیا ہے اور ظاہر ہے کہ جنگ کا موقع ایسا نازک ہوتا ہے کہ سردار کو نہایت مختصر الفاظ میں پوری شجاعت و قوت قلب اور اجتماعِ حواس و استقامت کی تاکید کرنا پڑتی ہے لیکن پھر بھی حضرتؑ نے جیسے مختصر الفاظ فرمائے ہیں اگر دوسرے معانی بھی ہوں جب بھی ایسے مختصر الفاظ استعمال کرنا گویا محال معلوم ہوتا ہے اور اگر الفاظ دوسرے اور زیادہ بھی ہوں جب بھی اس سے زیادہ جوش دلانے اور حرارت پیدا کرنے والا کلام صادر ہونا گویا ناممکن نظر آتا ہے۔

النِّسَآءِ، سَيَزْعَفُ بِهِمُ الزَّمَانُ، وَ يَقْوٰى بِهِمُ الْاِيْمَانُ.

عنقریب ان کو زمانہ پیدا کرے گا اور ایمان کو ان سے قوت حاصل ہوگی''۔[1]

---

[1] ماخذ اس کا کلامِ الٰہی ہے ﴿ يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۭ بِاِمَامِهِمْ ﴾ (سورۂ بنی اسرائیل، آیہ ۷۱) کہ ہر شخص اپنے امام کے ساتھ محشور ہوگا اور آنحضرتؐ کی حدیث مشہور ہے ''اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ'' کہ ''ہر شخص اپنے محبوب کے ساتھ ہے'' پس چونکہ وہ شخص بھی حضرتؐ کے ہوا خواہوں سے تھا لہٰذا اگرچہ وہ یہاں موجود نہ تھا مگر اس حکم میں تھا کہ وہ موجود ہے۔ چنانچہ آنحضرتؐ نے تو بہت سے صحابہ کو اسی بنا پر مال غنیمت سے حصّہ بھی دیا ہے۔ اب اس کے بعد حضرتؑ ترقی فرماتے ہیں کہ محض اس شخص کو یہ درجہ اور نفع نہ حاصل ہوگا جو دنیا میں اس وقت موجود ہے اور یہاں سے اس وقت غائب ہے۔ لیکن تمنا ہمارے ہمراہ ہونے کی رکھتا ہے بلکہ ان لوگوں کو بھی یہی درجہ حاصل ہوگا جو حیّز وجود میں نہیں آئے ہیں بلکہ ابھی اپنے مردوں کے صلبوں میں یا عورتوں کے رحموں میں ان کا مادہ ہے اور عرصہ کے بعد زمانہ میں پیدا ہوں گے کیونکہ ''اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ'' مسلّم ہے۔

ابن ابی الحدید ص ۸۳ میں اس خطبہ کی شرح میں لکھتے ہیں:

جب حضرت علی علیہ السلام جنگ جمل میں فتحیاب ہوئے اور امن قائم ہو گیا تو حضرتؑ بصرہ کے بیت المال میں بہت سے مہاجرین کو ساتھ لے کر تشریف لے گئے۔ وہاں اس مال کی بے حد و انتہا کثرت اور فراوانی ملاحظہ فرمائی تو ان مالوں کو خطاب کر کے کئی مرتبہ کہا:

غُرِّیْ غَیْرِیْ ، غُرِّیْ غَیْرِیْ۔

کسی اور کو دھوکہ دے کسی اور کو فریب دے۔

پھر حضرتؑ نے ایک مرتبہ مال کی طرف نظر کی اور نظر جما کر ان مالوں کو دیکھا اور اس تعداد کا اندازہ کیا تو فوراً حکم دیا کہ ان کل مالوں کو ان لوگوں میں پانچ پانچ سو تقسیم کرا دو۔ پس وہ کل مال اسی وقت تقسیم کر دیا گیا''۔

فَلَا وَالَّذِیْ بَعَثَ مُحَمَّدًا بِالْحَقِّ مَا نَقَصَ دِرْهَمًا وَلَا زَادَ دِرْهَمًا، كَاَنَّهٗ كَانَ يَعْرِفُ مَبْلَغَهٗ وَ مِقْدَارَهٗ وَ كَانَ سِتَّةَ اٰلَافِ اَلْفِ دِرْهَمٍ وَالنَّاسُ اِثْنَا عَشَرَ اَلْفًا۔

یعنی قسم ہے اس ذات کی جس نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث بحق کیا کہ لوگوں نے نہ کسی کو ایک درہم زیادہ دیا اور نہ کم دیا اور سب پر برابر کل مال تقسیم ہو گیا گویا کہ حضرتؑ کو علم غیب سے معلوم تھا کہ یہ مال کتنا ہے اور اس کی مقدار کتنی ہے چنانچہ بعد کو معلوم ہوا کہ وہ پورے ساٹھ لاکھ درہم تھے اور جن لوگوں پر وہ تقسیم ہوا وہ پورے بارہ ہزار تھے۔

اللہ اکبر اس علم کی کوئی انتہا ہے؟۔ سچ ہے ''عَلِیٌّ هُوَ بَابُ مَدِيْنَةِ الْعُلُوْمِ''۔ حضرتؑ نے اس جنگ میں جس قدر سلاح، دابہ مملوک، متاع عروض تھا اسی کو لیا اور اسی کو مجاہدین پر تقسیم کیا باقی اشیاء کو چھوڑ دیا جب صحابہ نے اعتراض کیا کہ مثل مال کفار تقسیم کر دیا جائے تو حضرتؑ نے فرمایا اچھا بتاؤ عائشہ کس کے حصّہ میں دی جائے؟ سب نے گزارش کی کہ ان کی تقسیم صحیح نہیں ہے۔

❁ خطبہ : ۱۳ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

فِيْ ذَمِّ اَهْلِ الْبَصْرَةِ

كُنْتُمْ جُنْدَ الْمَرْاَةِ وَ اَتْبَاعَ الْبَهِيْمَةِ، رَغَا فَاَجَبْتُمْ، وَ عُقِرَ فَهَرَبْتُمْ. اَخْلَاقُكُمْ دِقَاقٌ وَّ عَهْدُكُمْ شِقَاقٌ، وَ دِيْنُكُمْ نِفَاقٌ، وَ مَآؤُكُمْ زُعَاقٌ، وَ الْمُقِيْمُ بَيْنَ اَظْهُرِكُمْ مُرْتَهَنٌ بِذَنْبِهٖ، وَ الشَّاخِصُ عَنْكُمْ مُتَدَارَكٌ بِرَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ. كَاَنِّيْ بِمَسْجِدِكُمْ

خطبہ (۱۳)

حضرتؑ کے کلام کا ایک حصّہ۔ ۱؎

اہل بصرہ کی مذمّت میں

(بصرہ والو!) تم لشکر تھے (ناقص العقل) عورت کے اور پیرو تھے ایک چوپایہ (یعنی شتر عائشہ) کے (کہ جہاں) وہ بولا تم نے لبیک کہی اور جب پے ہوا تو بھاگ کھڑے ہوئے۔ ۲؎ تمہارے اخلاق ذلیل اور تمہارا عہد و پیمان بے وفائی، تمہارا دین نفاق، تمہارے شہر کا پانی شور و تلخ ہے ۳؎ اور (علاوہ بریں) تم میں رہنے والا گناہوں میں گھرا ہوا رہتا ہے اور تم سے علیحدہ ہو جانے والے کی دستگیری خدا کی رحمت کرتی رہتی ہے۔ (یہ بھی جان لو کہ آئندہ بصرہ غرق ہوگا)

۱؎ جمادی الآخر ۳۶ھ کے آخر میں جناب امیرؑ جنگ جمل سے کامیابی کے ساتھ فارغ ہوئے تو ایک شخص سے فرمایا کہ بصرہ والوں میں عام طور پر ندا کر دو کہ تین روز کے بعد کل اہل بصرہ نماز جمعہ میں حاضر ہوں اور جو شخص بھی بغیر کسی سبب کے حاضر نہیں ہوگا اس سے باز پرس کی جائے گی اور کوئی عذر نہ سنا جائے گا۔ پس روز معین میں کل اہل بصرہ جمع ہوئے اور حضرتؑ نے مسجد جامع میں نماز پڑھائی، بعدہٗ خطبہ بیان فرمانا شروع کیا۔ حمد و نعت و استغفار برائے مومنین و مومنات کے بعد یہ الفاظ بیان فرمائے جن میں بصرہ والوں کی مذموم صفتیں بیان فرمائی ہیں۔

۲؎ عورت سے مراد بی بی عائشہ بنت خلیفہ اول ہیں جن کے ہاتھ میں جنگ جمل کی کمان تھی اور جانور سے وہ اونٹ مراد ہے جس پر آپ سوار تھیں۔ وجہ مذمت ظاہر ہے کہ ایک تو یوں ہی عورتوں کی پیروی کرنا شان علم و عقل کے منافی ہے کیونکہ عورتوں کا ناقص العقل ہونا ظاہر ہے۔ اس پر مستزاد جناب امیرؑ کی مخالفت میں تابع ہونا جن کی ضلالت میں کوئی شبہ نہیں۔

''رَغَا فَاَجَبْتُمْ'' سے مراد یہ ہے کہ جس وقت بی بی عائشہ اس شتر پر سوار ہو کر میدان جنگ میں آئیں اور اونٹ کی آواز لوگوں نے سنی تو جمع ہو گئے اور جنگ چھیڑ دی اور جب جناب امیرؑ کے حکم سے شتر کے چاروں پیر قطع کر دیے گئے جس سے وہ اونٹ گر گیا تو کل اہل لشکر بھاگ کھڑے ہوئے۔

۳؎ بصرہ کا پانی شور اس سبب سے ہے کہ سمندر کے کنارے یہ شہر واقع ہے اور سمندروں کا پانی عموماً شور ہوا کرتا ہے۔ حالانکہ ایسے پانی سے بکثرت امراض مثل بدمزاجی، کج خلقی، فساد، طحال، خارش وغیرہ کے پیدا ہوتے ہیں جس سے اچھے لوگ ان لوگوں کے ہمراہ رہنا پسند نہیں کرتے اور شرفا کی صحبت ان کو نصیب نہیں ہوتی۔

كَجُؤْجُؤِ سَفِيْنَةٍ، قَدْ بَعَثَ اللّٰهُ عَلَيْهَا الْعَذَابَ مِنْ فَوْقِهَا وَ مِنْ تَحْتِهَا، وَ غَرِقَ مَنْ فِيْ ضِمْنِهَا.

گویا تمہاری مسجد کو میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ مثل سینہ سفینہ کے (محسوس ہو رہی) ہے جس پر خدا نے اوپر کی جانب سے بھی عذاب بھیج دیا ہو اور نیچے کی جانب سے بھی اور جو جو اس میں سوار ہوں (سب) غرق ہو گئے ہوں۔[1]

[وَ فِيْ رِوَايَةٍ]

وَايْمُ اللّٰهِ لَتَغْرَقَنَّ بَلْدَتُكُمْ حَتّٰى كَاَنِّيْٓ اَنْظُرُ اِلٰى مَسْجِدِهَا كَجُؤْجُؤِ سَفِيْنَةٍ، اَوْ نَعَامَةٍ جَاثِمَةٍ.

[اور دوسری روایت میں ہے]

اور قسم بخدا تمہارا شہر غرق ہو جائے گا حتی کہ میں تمہاری مسجد کو مثل کشتی کے بالائی حصّہ کے یا لیٹے ہوئے شتر مرغ کے دیکھ رہا ہوں۔

[وَ فِيْ رِوَايَةٍ]

كَجُؤْجُؤِ طَيْرٍ فِيْ لُجَّةِ بَحْرٍ.

[اور ایک دوسری روایت میں ہے]

مثل سینہ پرند کے (ہوگی) جو قعر دریا میں ڈوبا ہو۔

[وَ فِيْ رِوَايَةٍ اُخْرٰى]

بِلَادُكُمْ اَنْتَنُ بِلَادِ اللّٰهِ تُرْبَةً، اَقْرَبُهَا مِنَ الْمَاءِ وَ اَبْعَدُهَا مِنَ السَّمَآءِ وَ بِهَا تِسْعَةُ اَعْشَارِ الشَّرِّ، الْمُحْتَبَسُ فِيْهَا

[اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ]

تمہارے شہر کی مٹی خدا کے کل شہروں سے زیادہ گندہ اور پانی سے سب سے زیادہ قریب اور آسمان سے سب سے زیادہ دور ہے اور شر (وفساد) کے دس حصّوں سے نو حصّہ اسی (شہر) میں ہیں۔ (پس) اس میں پھنسنے والا

---

[1] نہج البلاغہ میں آئندہ ہونے والے واقعات کے متعلق حضرت امیر المومنینؑ کی جو کثیر التعداد پیش گوئیاں ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ حضرتؑ فرماتے ہیں کہ ہماری نظروں میں تم لوگوں کی وہ حالت گھوم رہی ہے کہ یہ شہر غرق ہو جائے گا، اس کے مکانات اور عمارتیں گر جائیں گی اور سوائے مسجد کے بالائی حصّہ کے اور کچھ باقی نہ رہے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا جیسا کہ مشہور سنی معتزلی مؤرخ علامہ ابن ابی الحدید لکھتا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ بصرہ کے آئندہ زمانہ میں تباہ اور غرق ہونے کے متعلق جو پیشین گوئی حضرتؑ نے فرمائی وہ ہو بہو واقع ہوئی کیونکہ بصرہ دو مرتبہ غرق ہوا، ایک دفعہ قادر باللہ (جو خلیفہ عباسی ہے اور جس نے ۳۸۱ھ سے ۴۲۲ھ تک خلافت کی ہے) کے زمانہ میں اور دوسری مرتبہ خلیفہ قائم بامر اللہ (جو قادر باللہ کا جانشین تھا) کے عہد میں جبکہ کل بصرہ غرق ہو گیا اور سوائے جامع مسجد کے کنکروں کے کوئی شے بالائے آب نہیں تھی۔ یہ سیلاب بحر فارس کا تھا جو مقام جزیرۃ الفارس اور جبل سنام سے آیا تھا اس سے بصرہ کے کل مکانات گر گئے اور کل موجوداتِ شہر غرق ہو گئیں۔ اس غرق ہونے کی خبر اہل بصرہ میں مشہور ہے اور گزشتہ و موجودہ لوگ برابر اس کا ذکر کرتے رہے ہیں (شرح نہج البلاغہ، علامہ ابن ابی الحدید سنی معتزلی، جلد اول، ص ۲۹، مطبوعہ ایران)

بِذَنْبِهٖ، وَ الْخَارِجُ بِعَفْوِ اللّٰهِ. كَاَنِّیْٓ اَنْظُرُ اِلٰی قَرْیَتِكُمْ هٰذِهٖ قَدْ طَبَّقَهَا الْمَآءُ، حَتّٰی مَا یُرٰی مِنْهَا اِلَّا شُرَفُ الْمَسْجِدِ، كَاَنَّهٗ جُؤْجُؤُ طَیْرٍ فِیْ لُجَّةِ بَحْرٍ.

(درحقیقت) اپنے گناہ میں (پھنستا ہے) اور اس سے نکلنے والا (گویا) خدا کی معافی کے ساتھ (نکلتا ہے)۔ گویا میں تمہارے اس گاؤں کو دیکھ رہا ہوں کہ پانی اس پر چڑھ گیا ہے یہاں تک کہ (اس کی) مسجد کے کنگروں کے سوا کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ گویا وہ بیچ سمندر میں ڈوبے ہوئے پرند کا سینہ ہے۔

❁ خطبہ: ۱۴ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَیْهِ السَّلَامُ

فِیْ مِثْلِ ذٰلِكَ

اَرْضُكُمْ قَرِیْبَةٌ مِّنَ الْمَآءِ، بَعِیْدَةٌ مِّنَ السَّمَآءِ، خَفَّتْ عُقُوْلُكُمْ، وَ سَفِهَتْ

خطبہ (۱۴)

حضرت علیہ السلام کے ایک (اور) کلام کا کچھ حصّہ۔

اسی (مذمّت اہل بصرہ) کے مثل

تمہاری زمین پانی سے تو نزدیک (لیکن) آسمان سے دور ہے۔[1] تمہاری عقلیں ناقص ہوگئیں اور تمہارا حلم فاسد اور بیہودہ ہوگیا ہے۔ پس (اب) تم لوگ ہر تیر انداز

---

[1] بصرہ کے پانی سے نزدیک ہونے کا ایک مطلب تو واضح ہے کہ سمندر سے ملا ہوا یہ شہر اور مشہور بندرگاہ ہے گویا عراق عرب کا دہانہ ہے۔ لیکن شرح ابن ابی الحدید میں ہے کہ حضرتؑ کے قول ''قَرِیْبَةٌ مِنَ الْمَاءِ بَعِیْدَةٌ مِّنَ السَّمَاءِ'' کا معنی پہلے ذکر ہو چکا ہے اور یہ کہ بحر فارس کے سیلاب سے بصرہ دو مرتبہ غرق ہو چکا ہے پس حضرتؑ کی مراد ''قَرِیْبَةٌ مِنَ الْمَاءِ'' سے یہی ہے کہ اس کے پانی سے ڈوبنے کا زمانہ قریب ہے، رہا آسمان سے دور ہونا پس علم ہیئت کے ماہرین اور منجمین کاملین بیان کرتے ہیں کہ زمین میں آسمان سے سب سے زیادہ بُعد پر جو مقام ہے وہ ابلۃ ہے اور یہ موافق ہے حضرتؑ کے اس قول کے پس یہاں آسمان سے دور ہونے کا مطلب دائرہ معدل النہار سے اس مخصوص زمین کا بہت دُور ہونا ہے اور مختلف اقطاع اور بلاد اس امر میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور علم نجوم اور علم ہیئت کے آلات اور رصدگاہیں بھی یہی بتاتی ہیں کہ دنیا کے آباد حصّہ میں دائرہ معدل النہار سے سب سے زیادہ دور جو مقام ہے وہ ابلہ ہے اور ابلہ بصرہ کا ایک قصبہ ہے اور یہ مضمون حضرت امیر المومنینؑ کے خصائص عجیبہ سے ہے کیونکہ حضرتؑ نے ایک ایسے امر کی خبر دی ہے جس کو عرب جانتے ہی نہ تھے اور نہ کبھی وہ اس علم سے آشنا ہوئے بلکہ یہ علم اور یہ خبر تو حکما و فلسفیین سے بھی جو بڑا ماہر اور متبحر اور مدقق ہے اس سے مخصوص ہے۔ پس یہ مضمون حضرتؑ کے اسرار عجیبہ اور غرائب بدیعہ سے ہے'' الخ۔ (چونکہ اس خطبہ کی شرح کے لیے بعض مطالب و مسائل علم ہیئت کا مقدمہ مذکور ہونا ضروری ہے لہٰذا اس کی بقیہ شرح ان شاء اللہ ضمیمہ میں آئے گی)

حُلُوْمُكُمْ، فَاَنْتُمْ غَرَضٌ لِّنَابِلٍ، وَ اُكْلَةٌ لِّاٰكِلٍ، وَ فَرِيْسَةٌ لِّصَآئِلٍ.

کے نشانہ اور ہر کھانے والے کے لقمہ اور ہر شکار کرنے والے کے شکار ہو۔[1]

خطبہ :۱۵

خطبہ(۱۵)

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِيْمَا رَدَّهٗ عَلَى الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَطَآئِعِ عُثْمَانَ

حضرت علیہ السلام کے کلام کا کچھ حصّہ عثمان کی جاگیروں کے بارہ میں جنہیں آپؑ نے مسلمانوں کو واپس کر دیا۔[2]

---

[1] حلم کے فاسد ہو جانے کا مطلب یہ ہے کہ تم لوگوں میں سبکی اور بے صبری پیدا ہو گئی ہے پس عقل کے زائل اور حلم کے غائب ہو جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ تم لوگ اپنے امور معاشرت کی تدبیر اور تصرف سے عاجز ہو گئے پس تمہارے دشمن تم کو قبضہ میں کیے ہوئے ہیں کہ جو چاہتا ہے تم کو اذیت پہنچاتا ہے اور جو چاہتا ہے تمہارا مال و دولت اور جائیداد تم سے چھین کر کھا جاتا ہے اور جو چاہتا ہے تم کو قتل کر کے تم کو ہلاک کر دیتا اور برباد کر ڈالتا ہے۔

[2] شرح ابن ابی الحدید میں ہے کہ ''عثمان نے بنی امیہ وغیرہ کے خاندان سے بہت سے اپنے اعزّا و احباب و مصاحبین کو بیت المال کی زمینیں بلا وجہ بطور جاگیر کے دے دی تھیں اور عمر نے بھی لوگوں کو جاگیریں عطا کی تھیں مگر عثمان نے بہت زیادہ اسراف سے کام لیا تھا اور سب کے سب صرف اپنی قرابت اور رشتہ اور ذاتی محبت و تعلق کے سبب سے نہ کسی دوسری غرض سے اور اس خطبہ کو کلبی نے پورا ذکر کیا ہے جس کی روایت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے کی ہے کہ حضرت امیر المومنینؑ کی بیعت جس روز مدینہ میں کی گئی اس کے دوسرے دن حضرتؑ نے خطبہ بیان فرمایا جس میں ارشاد کیا:

اَلَا اِنَّ كُلَّ قَطِيْعَةٍ اَقْطَعَهَا عُثْمَانُ، وَكُلَّ مَالٍ اَعْطَاهُ مِنْ مَّالِ اللّٰهِ، فَهُوَ مَرْدُوْدٌ فِيْ بَيْتِ الْمَالِ، فَاِنَّ الْحَقَّ الْقَدِيْمَ لَا يُبْطِلُهٗ شَيْءٌ، وَلَوْ وَجَدْتُهٗ قَدْ تُزُوِّجَ بِهِ النِّسَاءُ، وَفُرِّقَ فِي الْبُلْدَانِ، لَرَدَدْتُهٗ اِلٰى حَالِهٖ، فَاِنَّ فِي الْعَدْلِ سَعَةً، وَمَنْ ضَاقَ عَلَيْهِ الْعَدْلُ، فَالْجَوْرُ عَلَيْهِ اَضْيَقُ۔

یعنی لوگو! سنو کہ مالِ خدا سے جو جاگیریں اور جو مال عثمان نے لوگوں کو دے رکھے تھے وہ سب بیت المال میں واپس ہو جائے کیونکہ حق قدیم کو کوئی چیز مٹا نہیں سکتی اور اگر میں اس مال کو اس طرح پاؤں کہ اس کے مہر سے عورتوں کا نکاح کیا گیا ہو اور وہ مال تمام شہروں میں پھیلا دیا گیا ہو جب بھی اس کو واپس کر لوں گا۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کی بیعت جب مدینہ میں کی گئی تو اس کے دوسرے روز یہ خطبہ ارشاد فرمایا جس میں ارشاد کیا کہ عثمان نے جتنی جاگیریں تقسیم کیں اور مال خدا سے جو جو مال لٹایا ہے ان سب کو میں بیت المال میں واپس کر لوں گا۔

وَاللّٰهِ! لَوْ وَجَدْتُّهٗ قَدْ تُزُوِّجَ بِهِ النِّسَآءُ وَ مُلِكَ بِهِ الْاِمَآءُ لَرَدَدْتُّهٗ، فَاِنَّ فِي الْعَدْلِ سَعَةً، وَ مَنْ ضَاقَ عَلَيْهِ الْعَدْلُ، فَالْجَوْرُ عَلَيْهِ اَضْيَقُ.

بخدا اگر میں اس (مال خدا) کو (اس حالت میں بھی) پاتا کہ اس سے عورتوں کا نکاح کیا گیا اور کنیزیں خریدی گئیں جب بھی اس کو واپس لے لیتا کیونکہ انصاف ہی میں تو وسعت ہے اور جس پر انصاف تنگ ہوا اس پر ظلم تو بہت زیادہ تنگ ہوگا۔[1]

❁ خطبہ :۱۶ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ لَمَّا بُوْيِعَ بِالْمَدِيْنَةِ۔

ذِمَّتِيْ بِمَآ اَقُوْلُ رَهِيْنَةٌ، ﴿وَ اَنَا بِهٖ زَعِيْمٌ﴾. اِنَّ مَنْ صَرَّحَتْ لَهُ الْعِبَرُ عَمَّا بَيْنَ

خطبہ (۱۶)

حضرت علیہ السلام کے اس وقت کے خطبہ کا کچھ حصّہ جب مدینہ میں آپؑ کی بیعت کی گئی۔[2]

میں جو کچھ کہتا ہوں اس (کے درست ہونے) کا میں ذمّہ دار ہوں اور میں (ہی) اس کا ضامن بھی ہوں۔[3] جس شخص کو اس کے سامنے کی چیزوں کی عبرت ناک حالتیں

---

[1] مراد یہ ہے کہ جو حاکم یا امام ہو اس کو عدل کرنے میں اگر دقت ہوگی اور لوگوں کا خوف دامن گیر ہوگا تو ظلم یعنی خلاف عدل کرنے میں اور بھی زیادہ دقتیں پیدا ہوں گی اور مشکلات میں اضافہ ہوگا کیونکہ جب عدل کرنے سے لوگ اس کو روکیں گے تو وہ لوگ کب پسند کریں گے کہ ان پر ظلم کیا جائے لہٰذا ظلم و جور سے انسان اور زیادہ مشکلات اور آفات انتظام میں مبتلا ہوتا ہے۔

[2] علامہ ابن ابی الحدید جلد اول صفحہ ۹۱ میں لکھتے ہیں: ''یہ خطبہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے نہایت جلیل القدر، عظیم الشان اور ان مشہور و معروف خطبوں سے ہے جن کو تمام علماء و محدثین نے روایت کی ہے۔ اس کے بہت سے حصّہ کو سید رضی علیہ الرحمہ نے اختصاراً حذف کر دیا ہے لیکن علامہ ابوعثمان الجاحظ نے کتاب البیان والتبیین میں بعینہا ابوعبیدۃ معمر بن المثنی سے روایت کیا ہے۔ ابوعبیدہ کا بیان ہے کہ حضرت امیر المومنینؑ کی جب بیعت ہوئی تو اس کے بعد سب سے پہلا جو خطبہ مدینہ میں فرمایا یہی تھا (انشاء اللہ پورا خطبہ مع شرح ضمیمہ میں درج کیا جائے گا) مگر تاریخ روضۃ الاحباب جلد ۳ صفحہ ۶ میں ہے ''اول خطبہ این بود''

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى اِحْسَانِهٖ قَدْ رَجَعَ الْحَقُّ اِلٰى مَكَانِهٖ۔

کہ شکر ہے خدا کے احسان کا کہ حق اپنے مرکز پر لوٹ آیا ہے۔

[3] لفظ ''ذِمَّةٌ'' سے مراد عہد و پیمان ہے چنانچہ قرآن مجید میں ہے ﴿لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّ لَا ذِمَّةً﴾ (سورہ التوبہ، آیہ ۱۰) کہ مومنین کے بارے میں نہ قرابت کا خیال کرتے ہیں نہ اپنے عہد و پیمان کا، اور ''رَهِيْنٌ'' کا لفظ بطور استعارہ ہے چنانچہ خدا فرماتا ہے: ﴿كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ﴾ (سورہ المائدہ، آیہ ۳۸) ہ ''رشخص اپنے اعمال میں (بقیہ صفحہ مابعد)

يَدَيْهِ مِنَ الْمَثُلَاتِ حَجَزَتْهُ التَّقْوٰى عَنْ تَقَحُّمِ الشُّبُهَاتِ۔[1] اَلَا وَ اِنَّ بَلِيَّتَكُمُ قَدْ

(دنیا) کی سختیاں کھول (کر دکھا) دیں اس کو تقویٰ مشتبہ امور (تک) میں پھنسانے سے روک دے گا (تا کہ اس کا دامن یقیناً پاک رہے)۔خبردار ہو جاؤ تمہاری پہلی [2]

(بقیہ صفحہ ماقبل) رہن ہے''۔مگر میں چونکہ زمام خلافت کا قابض ہوں اس لیے میری ذمہ داریاں اور بھی سخت ہیں اور جو کچھ کہتا ہوں اس کا پورے طور پر ذمہ دار ہوں ﴿وَ اَنَا بِهٖ زَعِيْمٌ﴾ (سورہ یوسف، آیہ ۷۲) یعنی ''میں خود اس کا کفیل اور ضامن ہوں'' کہ کسی کو اس کلام کے سننے اور باور کرنے میں شک وشبہ نہ رہے کیونکہ حضرتؑ جانتے تھے کہ قوم کس درجہ آپ سے عناد رکھتی ہے اس لیے ضرورت ہوئی کہ اس کا تدارک کیا جائے تا کہ ہر شخص بصدق دل اس کو قبول کرے۔

[1] اس جملہ کا ترجمہ نہایت مشکل ہے کیونکہ ''عِبَرُ''، جمع عبرت ہے جو بمعنی نصیحت ہے اور ''مَثُلَاتٌ''، بمعنی عقوبت ہے مقصود یہ ہے کہ جو شخص روز مرّہ کے حالات اور گزشتہ زمانہ کے واقعات پر نظر رکھتا ہے اور اس سے کچھ عبرت حاصل کرتا ہے اس شخص کو بخوبی معلوم ہوگا کہ وہ آفات ومصائب جو لوگوں پر نازل ہوتے ہیں وہ ان لوگوں کے ظلم وجور، جہل، شر، فساد، کبر، رعونت وغیرہ کے سبب سے، پس ان امور کے معائنہ سے اس کو ایسی عبرت حاصل ہوگی کہ باطل امور میں پھنسنے سے رک جائے گا۔ بلکہ جن امور کے حق و باطل ہونے میں اس کو شک وشبہ ہوگا اس سے بھی وہ اجتناب کرے گا تا کہ اس کا دامن یقیناً پاک رہے کیونکہ دنیا وآخرت کے صلاح وفلاح کا دارومدار تقویٰ پر ہے پس اس سے بڑھ کر کون متقی ہوسکتا ہے جو بنظر عبرت ہر حالت پر غور کرے پھر وہ ان امور میں کب مبتلا ہوسکتا ہے جس سے اور لوگ ہلاک وبرباد ہو چکے۔

[2] یعنی جو آفت افتراق واختلاف، مصیبت بغض ونفاق جاہلیت کے وقت تھی اور جس کو اسلام نے مٹا دیا تھا افسوس پھر لوٹ آئی کہ اب تم میں نہ اتفاق نظر آتا ہے نہ الفت دین، نہ انس ایمان بلکہ تباغض، تنافر، دنیاداری میں اچھی طرح مشغول ہو گئے، ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے ہو اور حق کو ترک کر دیا باطل کے پیرو ہو گئے۔ یہی حالت قوموں کو ہلاک اور دنیا کے امن وترقی کو برباد کرنے والی ہے۔امام فخر الدین رازی نے اسی مضمون کی ایک مفصل تقریر اپنی تفسیر کبیر جلد ۴ صفحہ ۵۶۲ میں کی ہے جس کا آخری حصّہ یہ ہے:

اَلْعَرَبُ كَانُوْا قَبْلَ مَقْدَمِ الرَّسُوْلِ طَالِبِيْنَ لِلْمَالِ وَالْجَاهِ وَالْمُفَاخَرَةِ، وَكَانَتْ مَحَبَّتُهُمْ مُعَلَّلَةً بِهٰذِهِ الْعِلَّةِ، فَلَا جَرَمَ كَانَتْ تِلْكَ الْمَحَبَّةُ سَرِيْعَةَ الزَّوَالِ، وَكَانُوْا بِاَدْنٰى سَبَبٍ يَقَعُوْنَ فِي الْحُرُوْبِ وَالْفِتَنِ، فَلَمَّا جَاءَ الرَّسُوْلُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَدَعَاهُمْ اِلٰى عِبَادَةِ اللّٰهِ تَعَالٰى وَالْاِعْرَاضِ عَنِ الدُّنْيَا وَالْاِقْبَالِ عَلَى الْاٰخِرَةِ، زَالَتِ الْخُصُوْمَةُ وَالْخُشُوْنَةُ عَنْهُمْ. وَعَادُوْا اِخْوَانًا مُتَوَافِقِيْنَ، ثُمَّ بَعْدَ وَفَاتِهٖ عَلَيْهِ السَّلَامُ لَمَّا انْفَتَحَتْ عَلَيْهِمْ اَبْوَابُ الدُّنْيَا وَتَوَجَّهُوْا اِلٰى طَلَبِهَا عَادُوْا اِلٰى مُحَارَبَةِ بَعْضِهِمْ بَعْضًا، وَمُقَاتَلَةِ بَعْضِهِمْ مَعَ بَعْضٍ، فَهٰذَا هُوَ السَّبَبُ الْحَقِيْقِيُّ فِيْ هٰذَا الْبَابِ.

یعنی عرب لوگ آنحضرتؐ کے دنیا میں تشریف لانے کے قبل طالب مال وجاہ اور خواہان مفاخرت وعزت تھے پس ان کی محبت بھی انہیں اغراض پر مبنی تھی اس لیے جلد زائل ہوگئی اور وہ لوگ ہر وقت ذرہ ذرہ بات پر آمادۂ فتنہ وفساد ہو جاتے۔ پھر جب رسول خداؐ مبعوث ہوئے اور ان لوگوں کو دین اسلام اور عبادت خدا کی طرف

(بقیہ صفحہ بالا)

عَادَتْ كَهَيْئَتِهَا يَوْمَ بَعَثَ اللّٰهُ نَبِيَّكُمْ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، وَ الَّذِیْ بَعَثَهٗ بِالْحَقِّ لَتُبَلْبَلُنَّ بَلْبَلَةً، وَ لَتُغَرْبَلُنَّ غَرْبَلَةً وَ لَتُسَاطُنَّ سَوْطَ الْقِدْرِ [1] حَتّٰی یَعُوْدَ اَسْفَلُكُمْ اَعْلَاكُمْ، وَ اَعْلَاكُمْ

بلا پھر اسی طرح پلٹ آئی جس طرح اس روز تھی جبکہ خدا نے تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث کیا۔ (پس) قسم اس ذات کی جس نے حضرتؐ کو مبعوث بحق کیا کہ تم لوگ اچھی طرح پھینٹے جاؤ گے اور پوری طرح چھانے جاؤ گے اور دیگ [2] کے ابال کی طرح تہ و بالا کیے جاؤ گے یہاں تک کہ تمہارا ادنی اعلیٰ ہو جائے گا اور اعلیٰ ادنی۔ اور وہ سبقت کرنے

توضیح: دعوت دی اور دنیا سے علیحدگی اور آخرت کی طرف سبقت کرنے کی ہدایت کی تو آپس کا وہ بغض وعناد زائل ہوا اور سب کے سب مثل بھائی بند کے ہو گئے یہاں تک کہ جب آنحضرتؐ کا انتقال ہو گیا اور ان لوگوں پر دنیا کے دروازے کھل گئے اور اس کے حاصل کرنے کی طرف وہ لوگ متوجہ ہوئے تو پھر اپنی سابق حالت پر عود کر گئے اور آپس میں جنگ وجدال کا بازار گرم ہو گیا پس یہی سبب ہے ان لوگوں کی منازعت اور جنگ وجدال وحرب وقتال کا۔

[1] ''سَوْطَ الْقِدْرِ''، یہاں حضرتؑ لوگوں کی مصیبت جاہلیت میں مبتلا ہونے کی خبر دینے کے بعد اس کے نتائج کو بیان کر رہے ہیں۔ ''تَبَلْبَلَ'' خوب اچھی طرح مخلوط کرنے کو کہتے ہیں اسی سے ہے ''تَبَلْبَلَتِ الْاَلْسُنُ''، یعنی زبانیں مخلوط ہو گئیں۔ ''تَغَرْبَلُ'' (غربال سے ہے) چھلنی سے چھاننے کو کہتے ہیں اور ''سَوْطٌ'' یہ ہے کہ کسی ظرف میں کچھ چیزیں ڈالی جائیں اور اس شدت سے ہلائی جائیں کہ سب اوپر نیچے ہو کر اچھی طرح مل جائیں۔ پس مطلب یہ ہے کہ جس طرح بہت سے لوگ مل کر ایک وقت میں شور کریں تو ایک دوسری زبان پیدا ہو جاتی ہے اور جس طرح چھلنی میں چھانتے وقت سب آٹا ملا دیا جاتا ہے یا دیگچیوں کے چاول وغیرہ پکتے وقت خوب اچھی طرح تہ و بالا کر کے ملائے جاتے ہیں اسی طرح تم لوگ بھی مصائب وآفات میں خوب تہ و بالا ہو کے صاف کر دیے جاؤ گے۔ جو پہلے شریف تھا وہ اب رذیل سمجھا جائے گا اور جو رذیل تھا وہ شریف ہو جائے گا۔

[2] ''لَيَقْصُرَنَّ سَبَّاقُوْنَ كَانُوْا سَبَقُوْا''، مفتی محمد عبدہ مصری اپنی شرح نہج البلاغہ میں اس مقام پر لکھتے ہیں:

وَ لَقَدْ سَبَقَ مُعَاوِيَةُ اِلٰى مَقَامِ الْخِلَافَةِ وَ قَدْ كَانَ فِيْ قُصُوْرٍ عَنْهُ بِحَيْثُ لَا يُظَنُّ وُصُوْلُهٗ اِلَيْهِ وَ قَصُرَ اٰلِ بَيْتِ النُّبُوَّةِ عَنْ بُلُوْغِهٖ وَ قَدْ كَانَ اَسْبَقَ النَّاسِ اِلَيْهِ۔

یعنی جیسا کہ معاویہ کے بارے میں ہوا کہ وہ سبقت کر کے مسند خلافت پر پہنچ گیا حالانکہ وہ اس پستی میں تھا کہ کسی کو وہم وگمان بھی نہ تھا کہ اس درجہ اعلیٰ پر پہنچ جائے گا اور اہل بیتؑ رسالت مآبؐ مسند خلافت سے محروم رہ گئے حالانکہ وہی حضرات تمام آدمیوں سے زیادہ مستحق اور اہل تھے۔

حضرتؑ فرماتے ہیں کہ ہم جو یہ کہتے ہیں تو بنظر حالات زمانہ نہیں ہے بلکہ اس کی خبر ہم کو خود رسول کریمؐ سے مل چکی ہے اور پہلے سے ہم جانتے ہیں جو کچھ ہونے والا ہے۔

اَسْفَلَكُمْ، وَ لَيَسْبِقَنَّ سَابِقُوْنَ كَانُوْا قَصُرُوْا، وَ لَيَقْصُرَنَّ سَبَّاقُوْنَ كَانُوْا سَبَقُوْا. وَاللّٰهِ! مَا كَتَمْتُ وَشْمَةً وَّ لَا كَذَبْتُ كِذْبَةً، وَ لَقَدْ نُبِّئْتُ بِهٰذَا الْمَقَامِ وَ هٰذَا الْيَوْمِ.

اَلَا وَ اِنَّ الْخَطَايَا خَيْلٌ شُمُسٌ حُمِلَ عَلَيْهَآ اَهْلُهَا، وَ خُلِعَتْ لُجُمُهَا فَتَقَحَّمَتْ بِهِمْ فِي النَّارِ، اَلَا وَ اِنَّ التَّقْوٰى مَطَايَا ذُلُلٌ حُمِلَ عَلَيْهَآ اَهْلُهَا، وَ اُعْطُوْآ اَزِمَّتَهَا، فَاَوْرَدَتْهُمُ الْجَنَّةَ.

حَقٌّ وَّ بَاطِلٌ، وَ لِكُلٍّ اَهْلٌ، فَلَئِنْ اَمِرَ الْبَاطِلُ لَقَدِيْمًا فَعَلَ، وَ لَئِنْ قَلَّ الْحَقُّ فَلَرُبَّمَا وَ لَعَلَّ، وَ لَقَلَّمَآ اَدْبَرَ شَيْءٌ فَاَقْبَلَ.

والے جو (پہلے) پیچھے تھے بڑھ جائیں گے اور وہ بڑھے ہوئے لوگ جو (پہلے) مقدم تھے پیچھے کو دب جائیں گے۔ بخدا (اس بیان میں) میں نے کوئی بات چھپائی نہیں اور نہ کوئی جھوٹ کہا ہے اور (کیوں کر میں غلط کہہ سکتا ہوں اس لیے کہ) مجھے اس مقام (خلافت) اور اس روز (بیعت) کی خبر (پہلے ہی آنحضرتؐ سے) مل چکی ہے۔

(پس) سمجھ رکھو کہ گناہ (مثلاً) سرکش گھوڑے ہیں جن پر ان کے اہل سوار کیے گئے ہوں اور جن کے لگامیں چھوڑ دی گئی ہوں پس ان (گھوڑوں) نے ان لوگوں کو جہنم میں جھونک دیا ہو۔ اور (اس کے مقابل) تقویٰ (گویا) سدھائی ہوئی سواریاں ہیں جن پر ان کے اہل سوار کیے گئے ہوں اور جن کی لگامیں انہیں دے دی گئی ہوں پس ان (سواریوں) نے ان لوگوں کو بہشت میں اتار دیا ہو۔

(غرض دو ہی قسم ہے) حق اور باطل اور ہر ایک کے کچھ لوگ ہیں پس اگر باطل زیادہ ہو جائے تو پہلے ہی سے ہوتا آیا ہے اور اگر حق کم رہے تو اکثر اوقات کم ہی دیکھا گیا اور شاید (آئندہ بھی ایسا ہی ہو) کیونکہ بہت کم کوئی چیز جا کر پھر آئی ہے (تو حق کے لوٹنے کی کیا امید کی جائے)۔[1]

---

[1] مقصود یہ ہے کہ اگر تم لوگوں کو باطل کی ظاہری کثرت اور غلبہ اور حق کی کمزوری اور ناپرسانی سے کوئی خیال ہوتا ہے تو سمجھ رکھو کہ ظاہری حالات کے اعتبار سے ہمیشہ باطل ہی کی کثرت اور غلبہ رہا ہے اور حق برابر کمزور اور قلیل ہی رہا ہے اور کیا عجب کے آئندہ بھی ایسا ہی ہو۔ یا یہ مطلب ہے کہ اگرچہ اس وقت حق قلیل، مغلوب اور ضعیف ہو گیا ہے لیکن بسا اوقات وہ زیادہ رہا ہے اور شاید آئندہ بھی زیادہ اور غالب ہو کر اپنے اہل کو قوت دے اور ان کا عوض باطل سے لے کر حالت موجودہ کی مکافات کرے مگر پھر حضرتؑ اپنی اس اُمید کی رد فرماتے ہیں کیونکہ ایسا بہت کم ہوا ہے کہ جو چیز جا چکی ہو وہ پھر آئے اور جو چیز مغلوب اور کمزور ہو گئی ہو وہ غالب اور قوی ہو جائے خصوصاً حق اور ایمان کہ یہ تو برابر ظاہری حالت سے قلیل اور مغلوب ہی رہا ہے اور باطل اور کفر قوی، کثیر اور غالب رہا ہے (اس کے متعلق اور مطالب انشاءاللہ ضمیمہ میں آئیں گے)۔

(قَالَ الشَّرِيْفُ الرَّضِيُّ) اَقُوْلُ: اِنَّ فِيْ هٰذَا الْكَلَامِ الْاَدْنٰى مِنْ مَّوَاقِعِ الْاِحْسَانِ مَا لَا تَبْلُغُهُ مَوَاقِعُ الْاِسْتِحْسَانِ، وَ اِنَّ حَظَّ الْعَجَبِ مِنْهُ اَكْثَرُ مِنْ حَظِّ الْعَجَبِ بِهٖ، وَفِيْهِ مَعَ الْحَالِ الَّتِيْ وَصَفْنَا زَوَآئِدُ مِنَ الْفَصَاحَةِ، لَا يَقُوْمُ بِهَا لِسَانٌ، وَ لَا يَطَّلِعُ فَجَّهَا اِنْسَانٌ، وَ لَا يَعْرِفُ مَآ اَقُوْلُ اِلَّا مَنْ ضَرَبَ فِيْ هٰذِهِ الصِّنَاعَةِ بِحَقٍّ، وَ جَرٰى فِيْهَا عَلٰى عِرْقٍ، ﴿وَ مَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ﴾.

(سید شریف رضی اللہ عنہ کہتے ہیں) ''میں عرض کرتا ہوں کہ اس مختصر کلام میں اتنے اعلیٰ مطالب ہیں جن تک پسندیدگی کے مضامین کی رسائی بھی نہیں ہوسکتی اور اس (بے مثل و بے نظیر کلام) سے جو تعجب ہوتا ہے اس کی مقدار اس کے لطف و مسرت کی مقدار سے بہت زیادہ ہے اور اس میں علاوہ اس خوبی (مطالب و پاکیزگی مضامین) کے جس کو میں نے بیان کیا فصاحت (و بلاغتِ عبارت) اس کثرت سے ہے جس (کے بیان یا حاصل کرنے) پر نہ کوئی زبان قادر ہوسکتی ہے اور نہ جس کی تہ تک کوئی انسان پہنچ سکتا ہے اور میرے اس قول کو کچھ وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس نے اس فن کی کما حقہ سیر کی ہو اور اس کے رگ و ریشہ تک پہنچا ہو کیونکہ (اس فن کے) جاننے والوں کے سوا اور کون اس کو سمجھ سکتا ہے''۔

❁ خطبہ :۱۷ ❁

وَ مِنْ هٰذِهِ الْخُطْبَةِ

شُغِلَ مَنِ الْجَنَّةُ وَ النَّارُ اَمَامَهٗ. سَاعٍ سَرِيْعٌ نَجَا. وَ طَالِبٌ بَطِيْءٌ رَّجَا. وَ مُقَصِّرٌ فِي النَّارِ هَوٰى. اَلْيَمِيْنُ وَ الشِّمَالُ مَضَلَّةٌ. وَ

خطبہ:۱۷(۱۶)

اور اس خطبہ کا ایک جزو (یہ بھی ہے)۔

بہشت اور دوزخ جس کے پیش نظر ہیں وہ (انہی کی فکر میں) مشغول ہے (پس لوگ تین ہی قسم کے ہیں ایک) تیز کوشش کرنے والا جس نے (گویا) نجات پائی اور دوسرا سستی سے طلب کرنے والا جو امیدوار ہے اور (تیسرا) کوتاہی کرنے والا جو (گویا) جہنم میں گر گیا۔[1] (سمجھ لو

---

[1] مقصود یہ ہے کہ جس کو دیدہ بصیرت حاصل ہے وہ جنت اور دوزخ کو اپنے آگے سمجھتا ہے کہ یہ دونوں چیزیں پیش نظر ہیں، اگر وہ سمجھدار ہے تو امور دنیاویہ میں مشغول نہیں ہوسکتا بلکہ بہشت کو حاصل کرنے اور دوزخ سے بچنے کی فکر میں منہمک رہے گا اور مکلفین خداوند عالم تین ہی قسم کے ہیں: پہلی قسم وہ لوگ جنہوں نے اطاعت خدا میں نہایت مستعدی کو راہ دی اور معاصی سے بچے ہوئے (بقیہ صفحہ مابعد)

الطَّرِيْقُ الْوُسْطٰى هِيَ الْجَادَّةُ عَلَيْهَا بَاقِي الْكِتَابِ وَ اٰثَارُ النُّبُوَّةِ، وَ مِنْهَا مَنْفَذُ السُّنَّةِ، وَ اِلَيْهَا مَصِيْرُ الْعَاقِبَةِ.

کہ) دائیں اور بائیں گمراہی ہے اور درمیانی راہ ہی (ہدایت کی) شاہراہ ہے۔ اسی پر ہے وہ کتاب جو باقی ہے (قرآن) اور نبوت کے آثار۔ اور سنت کے جاری ہونے کی راہ اسی سے ہے اور اسی کی طرف عاقبت کی بازگشت ہے۔

هَلَكَ مَنِ ادَّعٰى، وَ خَابَ مَنِ افْتَرٰى، مَنْ اَبْدٰى صَفْحَتَهٗ لِلْحَقِّ هَلَكَ، وَ كَفٰى بِالْمَرْءِ جَهْلًا اَلَّا يَعْرِفَ قَدْرَهٗ، لَايَهْلِكُ عَلَى التَّقْوٰى سِنْخُ اَصْلٍ، وَ لَا يَظْمَأُ عَلَيْهَا زَرْعُ قَوْمٍ. فَاسْتَتِرُوْا فِيْ بُيُوْتِكُمْ، ﴿وَ اَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ﴾، وَ التَّوْبَةُ مِنْ

(پس) جس نے (اس کے خلاف) دعویٰ کیا[1] ہلاک ہوا اور جس نے افترا کیا محروم رہا (اور) جس نے حق کا مقابلہ کیا تباہ ہوا اور آدمی کی (انتہائے) جہالت کے (ثبوت کے) لیے یہی کافی ہے کہ وہ اپنی آپ قدر نہ جانے۔ (غرض) راہ تقویٰ پر رہ کر نہ کوئی اصل تباہ ہوسکتی ہے اور نہ اس پر کسی قوم کی زراعت خشک ہوسکتی ہے۔ پس (تقویٰ اختیار کر کے) اپنے گھروں میں چھپے (بیٹھے رہو) اور باخود ہا اصلاح کرتے رہو اور (اپنے گناہوں سے) توبہ (کرو کہ وہ) تمہارے پیچھے ہے اور بہ جز خدا

(بقیہ صفحہ ماقبل) ہیں کہ یہ لوگ معصومین ہیں اور یقیناً نجات پائیں گے۔ دوسری قسم وہ لوگ جو اطاعت خدا میں کوشش تو کرتے ہیں لیکن وہ قوت ایمان اور صفائی قلب نہیں رکھتے لہٰذا اس میں سست رہتے ہیں اور معاصی سے بھی بالکل نہیں بچتے، پس یہ لوگ رحمت و مغفرت خدا کے صرف امیدوار ہیں۔ تیسری قسم وہ لوگ ہیں جو اشقیا اور فساق ہیں اور جو اطاعت خدا کے عوض اس کے معاصی میں مبتلا رہتے ہیں اس گروہ کے نجات کی امید بھی نہیں ہے۔ چنانچہ خود قرآن مجید میں ہے:

﴿فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَ مِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَ مِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾

(سورۂ فاطر، آیہ ۳۲)

کہ بعض بندگان خدا اپنے نفس کے ظالم اور بعض معتدل روش کے اور بعض اعمال حسنہ کی طرف سبقت کرنے والے ہیں۔

بلکہ اس آیت کلام مجید اور خطبۂ جناب امیرؑ کا مضمون ایک ہی ہے صرف ترتیب کا فرق ہے۔ دوسری روایت میں دو قسم کا اور اضافہ ہے ''مَلَكٌ طَارَ بِجَنَاحَيْهِ وَ نَبِيٌّ اَخَذَ اللّٰهُ بِيَدِهٖ لَا سَادِسَ''۔ یعنی چوتھی قسم اپنے پروں سے اُڑنے والے فرشتوں کی ہے۔ پانچویں انبیاء کی جن کو خدا نے معصوم بنایا ہے ان کے سوا کوئی چھٹی قسم نہیں ہے۔

[1] علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں یعنی جس شخص نے امامت کا دعویٰ کیا ہلاک ہوا اور جس نے اسے بلا استحقاق حاصل کیا تباہ ہوا، کیونکہ اس خطبہ میں حضرتؑ کا کلام امامت اور خلافت ہی کی طرف اشارہ ہے نہ کسی دوسرے امر کی طرف۔

وَرَآئِكُمْ، وَ لَا يَحْمَدْ حَامِدٌ اِلَّا رَبَّهٗ، وَ لَا يَلُمْ لَآئِمٌ اِلَّا نَفْسَهٗ.

کے نہ کسی کی کوئی حمد کرے اور نہ اپنے نفس کے سوا کسی کی ملامت کرے۔[1]

❁ خطبہ :۱۸ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

فِيْ صِفَةِ مَنْ يَّتَصَدّٰى لِلْحُكْمِ بَيْنَ الْاُمَّةِ وَ لَيْسَ لِذٰلِكَ بِاَهْلٍ:

اِنَّ اَبْغَضَ الْخَلَآئِقِ اِلَى اللّٰهِ رَجُلَانِ:

رَجُلٌ وَّكَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى نَفْسِهٖ، فَهُوَ جَآئِرٌ عَنْ قَصْدِ السَّبِيْلِ، مَشْغُوْفٌۢ بِكَلَامِ بِدْعَةٍ وَّ دُعَآءِ ضَلَالَةٍ، فَهُوَ فِتْنَةٌ لِّمَنِ افْتَتَنَ بِهٖ، ضَالٌّ عَنْ هَدْيِ مَنْ كَانَ قَبْلَهٗ، مُضِلٌّ لِّمَنِ اقْتَدٰى

خطبہ:۱۸(۱۷)

حضرت علیہ السلام کے ایک کلام کا کچھ حصّہ

اس شخص کے بارے میں جو امّت (اسلام) میں حکم (اور فتویٰ) دینے کے درپے ہو۔ حالانکہ اس کی (ذرہ بھی) اہلیت نہ رکھتا ہو۔

خدا کے نزدیک اس کی مخلوقات میں سب سے زیادہ دشمن دو ہی شخص ہیں:

ایک وہ شخص جسے خدا نے اس کی حالت پر چھوڑ دیا ہے۔ پس وہ (حکم خدا کو نہیں مانتا اور) سیدھی راہ سے پھرا ہوا (اور) کلامِ بدعت و دعوتِ گمراہی پر فریفتہ ہے۔ ایسا شخص فتنہ ہے ہر اس آدمی کے لیے جو اس سے فریب کھائے، (خود) گمراہ ہے اپنے سے پہلے (لوگوں) کی راہ راست سے (اور) گمراہ کرنے والا ہے ہر اس شخص کا جو

---

[1] خلاصہ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ دل میں خدا کا خوف رکھیں۔ معارف خدا اور اوامر و انواہی الٰہی کے امتثال کو اپنے نفس میں استعمال کریں (یہاں حضرتؑ نے نفس کو زمین سے تشبیہ دی ہے جو زمین صالح ہے یعنی جو لوگ اپنے نفس کو احکام خدا کا پابند رکھیں) ان کی زراعت بجائے خشک اور پژمردہ ہونے کے سرسبز اور شاداب رہے گی (یعنی نفس پاکیزہ اور منور رہے گا) اور وہ لوگ اس کا پھل (جو آخرت کی نجات اور رفع درجات ہے) باحسن وجوہ حاصل کر سکیں گے۔ لہٰذا تم لوگوں کو چاہیے کہ دنیاوی فتنہ و فساد سے علیحدہ ہو کر اپنے گھروں میں بیٹھے رہو، تقویٰ اختیار کر کے مرضی باری تعالیٰ کو حاصل کرنے کی کوشش کرو، آپس میں اصلاح اور اتفاق قائم کرو اور جو گناہ کر چکے ہو اس سے توبہ کر لو کہ دروازہ انابت و توبہ ہر وقت تمہارے لیے کھلا ہوا ہے اور چونکہ مستحق حمد و شکر صرف خدا کی ذات ہے لہٰذا اس کی حمد کرو اور اس سبب سے کہ انسان اپنے ہر فعل کا خود ہی فاعل ہے لہٰذا ملامت بھی اپنے نفس ہی کی کرنی چاہیے نہ خدا کی، جیسا کہ گمراہ فرقوں کا اعتقاد ہے۔

بِهٖ فِيْ حَيَاتِهٖ وَ بَعْدَ وَفَاتِهٖ، حَمَّالٌ خَطَايَا غَيْرِهٖ، رَهْنٌۢ بِخَطِيْٓئَتِهٖ

اس کی زندگی میں اور اس کے مرنے پر اس کی پیروی کرے، دوسروں کے گناہوں کا بوجھ اٹھانے والا (اور) اپنے گناہوں میں آپ گرو ہے۔ ۱؎

وَ رَجُلٌ قَمَشَ جَهْلًا مُّوْضِعٌ فِيْ جُهَّالِ الْاُمَّةِ، عَادٍ فِيْٓ اَغْبَاشِ الْفِتْنَةِ، عَمٍ بِمَا فِيْ عَقْدِ الْهُدْنَةِ، قَدْ سَمَّاهُ اَشْبَاهُ النَّاسِ عَالِمًا وَّ لَيْسَ بِهٖ، بَكَّرَ فَاسْتَكْثَرَ مِنْ جَمْعٍ، مَا قَلَّ مِنْهُ خَيْرٌ مِّمَّا كَثُرَ، حَتّٰٓى اِذَا

دوسرا وہ شخص ہے جس نے جہالت محض کو سمیٹ لیا ہے۔ جاہلان امّت میں (گمراہی کو) تیزی سے پھیلاتا ہے۔ فتنہ وفساد کی تاریکیوں ۲؎ میں تیز دوڑتا ہے (کہ ہے جاہل محض مگر بے پرواہی سے فتوے دیتا رہتا ہے) اور صلح و سکون میں جو نفع ہے اس سے اندھا ہے۔ ۳؎ ظاہری لوگوں نے اس کا نام عالم رکھا ہے حالانکہ وہ ایسا نہیں ہے۔ اس نے جلد جلد بہت کچھ (جہالتوں سے) جمع کر لیا (کہ) جس کا کم ہونا بہتر تھا اس کی زیادتی سے ۴؎ یہاں تک کہ

۱؎ یعنی چونکہ یہ شخص اپنی دعوت میں خود بھی گمراہ ہے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرنے والا ہے لہٰذا وہ اپنے گناہوں کا بھی ذمّہ دار ہے اور اپنے پیروؤں کے گناہوں کا بھی۔ پس وہ دو قسم کے گناہوں میں گرو ہے کہ کسی طرح چھوٹ نہیں سکتا۔ اور یہ مضمون کلام مجید کی اس آیت کے مثل ہے۔

﴿ لِيَحْمِلُوْٓا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۙ وَ مِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ ﴾ (سورہ الانعام، آیہ ۳۱)

یعنی قیامت کے روز یہ لوگ اپنے گناہوں کے پورے بوجھ بھی اٹھائیں گے اور ان کے گناہوں کے بوجھ بھی جن کو انہوں نے گمراہ کیا ہے افسوس کیسا برا بوجھ اپنے اوپر لادیں گے۔

۲؎ ''اَغْبَاشٌ''، جمع ہے غبش کی جو شب کے آخری حصّہ کی تاریکی اور ظلمت کو کہتے ہیں۔

۳؎ ''اَشْبَاہٌ''، جمع ہے شبہ کی جس کے معنی ہیں مانند اور مثل اور مراد یہ ہے کہ وہ لوگ جو آدمیوں کا سا صرف ہاتھ، پیر، صورت شکل رکھتے ہیں انسانیت، عقل، معرفت وغیرہ اوصاف ان میں پائے نہیں جاتے، دیکھنے میں تو وہ آدمی معلوم ہوتے ہیں لیکن حقیقت میں انسانیت کی کوئی صفت ان میں نہیں ہے۔

۴؎ ''بَكَّرَ فَاسْتَكْثَرَ''۔ تبکیر کے اصلی معنی صبح کو آنا اور جلدی کرنا ہے۔ یہاں حضرتؑ نے استعارۃً استعمال کیا ہے اور مقصود یہ ہے کہ اس جاہل شخص نے جس کا ذکر ہو رہا ہے اپنی ابتدائے عمر میں ایسے علوم اور اعتقادات کے حاصل اور جمع کرنے میں سبقت اور مستعدی ظاہر کی جو باطل، گمراہ کرنے والے، غلط اور بے کار محض تھے۔ یعنی شروع سے مرتے وقت تک علوم باطلہ ہی حاصل کرتا رہا، آخر قاضی بن کر بیٹھ گیا اور لوگوں کو فتوے دینے لگا لیکن چونکہ صحیح علوم نہیں حاصل کیے ہیں لہٰذا جو جواب دیتا ہے غلط اور جو مسئلہ بتاتا ہے باطل۔

ارْتَوٰى مِنْ مَّآءٍ اٰجِنٍ، وَ اكْتَنَزَ مِن غَيْرِ طَآئِلٍ. جَلَسَ بَيْنَ النَّاسِ قَاضِيًا ضَامِنًا لِّتَخْلِيْصِ مَا الْتَبَسَ عَلٰى غَيْرِهٖ، فَاِنْ نَزَلَتْ بِهٖٓ اِحْدَى الْمُبْهَمَاتِ هَيَّاَ لَهَا حَشْوًا رَثًّا مِّنْ رَّاْيِهٖ، ثُمَّ قَطَعَ بِهٖ. فَهُوَ مِنْ لَّبْسِ الشُّبُهَاتِ فِيْ مِثْلِ نَسْجِ الْعَنْكَبُوْتِ، لَا يَدْرِيْٓ اَصَابَ اَمْ اَخْطَاَ، فَاِنْ اَصَابَ خَافَ اَنْ يَّكُوْنَ قَدْ اَخْطَاَ، وَ اِنْ اَخْطَاَ رَجَآ اَنْ يَّكُوْنَ قَدْ اَصَابَ. جَاهِلٌ خَبَّاطُ جَهَالَاتٍ، عَاشٍ رَّكَّابُ عَشَوَاتٍ، لَمْ يَعَضَّ عَلَى الْعِلْمِ بِضِرْسٍ قَاطِعٍ، يُذْرِي الرِّوَايَاتِ اِذْرَآءَ الرِّيْحِ الْهَشِيْمَ. لَا مَلِيٌّ وَاللّٰهِ!

جب وہ گندا پانی (علوم باطلہ وعقائد فاسدہ) سے سیراب ہو گیا اور مہملات (یعنی غلط اور باطل مسائل) کو (اپنے دفاع میں) بھر لیا تو لوگوں میں قاضی بن بیٹھا اور ضامن ہو گیا ان مسئلوں کے حل کرنے کا جو دوسروں پر پوشیدہ تھے۔ اب اگر اس پر کوئی مشکل مسئلہ نازل ہوتا ہے تو اپنی رائے سے اس کے لیے بیکار باتیں بناتا ہے اور مہمل جواب گڑھتا ہے، پھر اس پر یقین کر لیتا ہے۔ غرض (درحقیقت) ان شبہوں کے مشتبہ رہنے سے وہ تار عنکبوت ایسے کمزور پھندوں میں پھنس گیا ہے [1] کہ یہ بھی نہیں جانتا درست جواب دیا یا غلط۔ اب اگر (اتفاق سے) اس نے صحیح کہا ہے تو ڈرتا ہے کہ کہیں غلط نہ کہا ہو اور اگر غلط کہا ہے تو اس کی امید کرتا ہے کہ صحیح ہے۔ (غرض وہ) سخت جاہل (بلکہ) جہالتوں میں ٹھوکریں کھانے والا، ٹٹول کر چلنے والا اور ایسی سواریوں کا سوار ہے جنہیں اپنے آگے دکھائی نہیں دیتا۔ اس نے علم کو صحیح طور پر نہیں حاصل کیا جس سے حدیثوں کو اس طرح اڑاتا ہے [2] جیسے ہَوا سوکھی گھاس کو۔ جو مسئلہ اس

---

[1] یعنی جاہل مذکور کی یہ حالت ہے کہ جب کسی مسئلہ کو صحیح بتاتا ہے تو اس کو شبہ ہوتا ہے کہ کہیں غلط نہ کہا ہو اور جب غلط بتاتا ہے تو اس کو امید ہے کہ شاید صحیح ہو۔ غرض وہ فتوے دیتے وقت نہایت اضطراب میں رہتا ہے جس طرح تار عنکبوت میں مکھی پھنس کر باوجود اس تار کے انتہائی درجہ کی کمزوری کے بے دست و پا ہو جاتی ہے اسی طرح یہ جاہل شخص اپنے مہمل شبہات کے پھندوں میں پھنس کر اندھا ہو جاتا ہے۔ اس تشبیہ پر مصر کے نامور علامہ مفتی محمد عبدہ مصری اپنی شرح نہج البلاغہ میں لکھتے ہیں: وَ قَدْ جَاءَ لِلْاِمَامِ فِيْ تَمْثِيْلِ حَالِهٖ بِاَبْلَغِ مَا يُمْكِنُ التَّعْبِيْرُ عَنْهُ۔ یعنی حضرت امامؑ نے جاہل مفتی کی حالت کو اس مثال سے تشبیہ دینے میں ایسی بلیغ تعبیر فرمائی ہے جس سے زیادہ بلیغ تعبیر ممکن نہیں ہے۔

[2] شارحین شیعہ وسنی نے لکھا ہے کہ اکثر نسخوں میں بجائے ''يَذْرِيْ'' کے ''يَذْرُو الرِّوَايَاتِ'' ہے اور یہی بہتر ہے۔ چنانچہ کلام مجید میں بھی ہے ۔ ﴿ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ ﴾ بہرکیف مقصود یہ ہے کہ جس طرح ہوا خشک گھاس کو اُڑا کر پراگندہ کر دیتی ہے اسی طرح جاہل مفتی حدیثوں کو ضائع و برباد کر دیتا ہے کیونکہ اس کے سمجھنے سے عاجز اور اس کی قدر سے ناواقف ہے۔

بِاِصْدَارِ مَا وَرَدَ عَلَيْهِ، وَ لَا هُوَ اَهْلٌ لِّمَا فُوِّضَ اِلَيْهِ، لَا يَحْسَبُ الْعِلْمَ فِيْ شَيْءٍ مِّمَّآ اَنْكَرَهٗ، وَ لَا يَرٰى اَنَّ مِنْ وَّرَآءِ مَا بَلَغَ مَذْهَبًا لِّغَيْرِهٖ، وَ اِنْ اَظْلَمَ عَلَيْهِ اَمْرٌ اكْتَتَمَ بِهٖ لِمَا يَعْلَمُ مِنْ جَهْلِ نَفْسِهٖ، تَصْرُخُ مِنْ جَوْرِ قَضَآئِهِ الدِّمَآءُ، وَ تَعِجُّ مِنْهُ الْمَوَارِيْثُ.

اِلَى اللّٰهِ اَشْكُوْ مِنْ مَّعْشَرٍ يَّعِيْشُوْنَ جُهَّالًا، وَ يَمُوْتُوْنَ ضُلَّالًا، لَيْسَ فِيْهِمْ سِلْعَةٌ اَبْوَرُ مِنَ الْكِتَابِ اِذَا تُلِيَ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ، وَلَا سِلْعَةٌ اَنْفَقُ بَيْعًا وَّ لَآ اَغْلٰى ثَمَنًا مِّنَ الْكِتَابِ اِذَا حُرِّفَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ، وَ

پر وارد ہوتا ہے اس کے جواب پر بخدا (کسی طرح) قادر نہیں ہے۔ نہ اس (منصب) کا اہل ہے جو اس کو دیا گیا ہے۔ (ایسا جاہل ہے کہ) اس کو گمان بھی نہیں ہے کہ جس چیز سے انکار کرتا ہے (دراصل) اسی میں علم ہے اور نہ یہ سمجھتا ہے کہ جہاں (اس کا ذہن) پہنچا ہے اس کے علاوہ بھی دوسروں کی کوئی راہ ہے اور اگر کوئی امر اس پر پوشیدہ رہتا ہے تو اسے چھپا دیتا ہے کیونکہ اپنی جہالت کو جانتا ہے۔ اس کے (غلط) فیصلوں کے ظلم سے خون ہائے (ناحق) چیختے رہتے ہیں اور میراثیں [1] فریاد کرتی رہتی ہیں۔

(پس جاہل قاضیوں کی) اس جماعت کی شکایت میں خدا ہی سے کرتا ہوں جو جہالت میں تو زندگی بسر کرتے ہیں اور گمراہوں کی موت مرتے ہیں۔ ان میں قرآن سے زیادہ بے قدر کوئی چیز نہیں جب حق طور پر تلاوت کیا جائے اور جب (اس) قرآن کے مقامات (احکام) میں تحریف (یا تاویل) کر دی جائے تو (پھر) نہ اس سے زیادہ قابل قدر کوئی چیز ہے اور نہ زیادہ بیش بہا۔ [2] اور نہ ان کے

---

[1] یعنی چونکہ احکام خدا و شرائع دین سے محض جاہل ہیں لہٰذا جہاں قصاص کا حکم دینا چاہیے وہاں معاف کر دیتا ہے اور جہاں خون کا وقوع نہیں ہوتا وہاں قصاص کا حکم دے دیتا ہے۔ پس خون ناحق جس کو لوگوں نے خود بہایا ہے وہ بھی اور جو اس کے فتووں سے بہا گیا ہے وہ بھی خدا سے فریاد کرتا رہتا ہے اور اس کے ظلم کی شکایت میں مشغول رہتا ہے اور جو حقدار ورثہ ہوتے ہیں وہ اس کے غلط فتووں سے محروم رہتے ہیں اور جو غیر مستحق ہیں وہ میراث پاتے ہیں لہٰذا مالِ میراث بھی فریاد کرتا رہتا ہے۔

[2] یعنی قرآن کے صحیح احکام ان کے سامنے بیان کیے جائیں تو یہ لوگ ذرّہ بھی اسے نہیں پوچھنے کے اور اگر قرآن کا مطلب بدل کر غلط اور باطل احکام اسی قرآن کی طرف منسوب کیے جائیں تو اس کے قبول کرنے کے لیے لبیک کہتے ہیں۔ اللہ اکبر حضرتؑ کا یہ کلام کیسا سچا ہے اور یہ پیشین گوئی کیسی درست نکلی۔ آج کس کثرت سے اسلام میں فرقے پیدا ہو گئے ہیں اور سب اپنے مذہب کی حقیت قرآن ہی سے ثابت کرتے ہیں اس لیے کہ اس کا صحیح مطلب نہیں سمجھنا چاہتے بلکہ بالکل غلط اور اپنے ذاتی مفاد کے مطلب کو اپنا متمسک قرار دے کر قرآن مجید کے الفاظ کو زبردستی اس مطلب باطل پر منطبق کرنا چاہتے ہیں اور اگر کوئی شخص ان آیات کے صحیح (بقیہ صفحہ مابعد)

لَا عِنْدَهُمْ اَنْكَرُ مِنَ الْمَعْرُوْفِ، وَ لَآ اَعْرَفُ مِنَ الْمُنْكَرِ.

نزدیک نیکی سے زیادہ بری کوئی چیز ہے اور نہ بدی سے زیادہ اچھی کوئی چیز۔ (غرض یہ لوگ محض باطل پرست اور دنیا کے بندے ہیں)۔

❁ خطبہ :۱۹ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

فِيْ ذَمِّ اخْتِلَافِ الْعُلَمَآءِ فِي الْفُتْيَا۔

تَرِدُ عَلٰٓى اَحَدِهِمُ الْقَضِيَّةُ فِيْ حُكْمٍ مِّنَ الْاَحْكَامِ فَيَحْكُمُ فِيْهَا بِرَاْيِهٖ، ثُمَّ تَرِدُ تِلْكَ الْقَضِيَّةُ بِعَيْنِهَا عَلٰى غَيْرِهٖ فَيَحْكُمُ فِيْهَا بِخِلَافِهٖ، ثُمَّ يَجْتَمِعُ الْقُضَاةُ بِذٰلِكَ عِنْدَ الْاِمَامِ الَّذِي اسْتَقْضَاهُمْ، فَيُصَوِّبُ اٰرَآءَهُمْ جَمِيْعًا، وَ اِلٰهُهُمْ وَاحِدٌ، وَ نَبِيُّهُمْ وَاحِدٌ، وَ كِتَابُهُمْ وَاحِدٌ.

خطبہ:۱۹(۱۸)

حضرت علیہ السلام کے کلام کا کچھ حصّہ۔[1]

فتووں میں جو اختلاف علما میں ہوتا ہے اس کی مذمّت میں

ان (مفتیوں) سے کسی شخص کے پاس کوئی مسئلہ کسی حکم (خدا) کے متعلق آتا ہے تو وہ اس میں اپنی رائے سے حکم دیتا ہے پھر بعینہا وہی مسئلہ اس کے غیر کے پاس آتا ہے تو اس (پہلے شخص) کے خلاف حکم دیتا ہے پھر جب یہ سب قاضی اپنے اس امام کے پاس جمع ہوتے ہیں جس نے انہیں قاضی مقرر کیا ہے تو وہ (امام) ان سب کے فتووں کو صحیح قرار دیتا ہے۔ (عجیب!!) حالانکہ ان سب کا خدا ایک، ان کا نبی ایک، ان کی کتاب (قرآن) ایک۔

(بقیہ صفحہ ماقبل) مطالب بتا کر کہتا ہے کہ کم سے کم ان مطالب پر غور کر لو اور دیکھو کہ حق سے یہ کس قدر قریب اور تمہارا مطلب کس قدر دور ہے تو فوراً اس قول سے اعراض کرتے اور اپنے سمجھے ہوئے یا اپنے پیشواؤں کے بتائے ہوئے مطلب پر اصرار کرتے ہیں بلکہ محکمات قرآن تک سے لوگ صرف اس وجہ سے مخالفت کرتے ہیں کہ ان کے مذہب کے صریح خلاف ہوتا ہے گویا ان لوگوں نے دین حق کی جستجو ہی نہیں کی بلکہ اپنے نفس کی عبادت کی۔

[1] اس خطبہ میں حضرتؑ علمائے اسلام کے فتووں میں اختلاف کرنے کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں اس کی شرح میں ابن ابی الحدید لکھتے ہیں:

اَلْمُرَادُ الرَّدُّ عَلٰى اَهْلِ الْاِجْتِهَادِ فِي الْاَحْكَامِ الشَّرْعِيَّةِ وَاِفْسَادُ قَوْلِ مَنْ قَالَ كُلُّ مُجْتَهِدٍ مُصِيْبٌ۔

یعنی اس خطبہ سے حضرتؑ کی مراد رد کرنا ہے ان لوگوں کی جو احکام شرعیہ میں اجتہاد کرتے ہیں اور فاسد قرار دینا ہے ان لوگوں کے قول کا جو کہتے ہیں کہ ہر مجتہد درست جواب دیتا ہے۔

لیکن اس سے مطلق اہل اجتہاد کی رد سمجھنے میں علامہ ممدوح سے غلطی ہوئی ہے کیونکہ مطلق اہل اجتہاد میں شیعہ (بقیہ صفحہ مابعد)

(بقیہ صفحہ ماقبل) بھی ہیں حالانکہ ان کی رد اس میں یقیناً مراد نہیں ہے بلکہ حضرتؑ ان لوگوں کی رد فرما رہے ہیں جو اپنی رائے اور قیاس سے فتویٰ دیتے ہیں۔ چنانچہ حضرتؑ خود تصریح سے فرما رہے ہیں کہ ''کسی شخص کے پاس کوئی مسئلہ کسی حکم خدا کے متعلق آتا ہے تو وہ اس میں اپنی رائے سے فتویٰ دیتا ہے''۔ اور شیعوں کے مذہب میں اپنی رائے یعنی قیاس سے فتویٰ دینا حرام ہے اور نہ کوئی مجتہد اپنی رائے یعنی قیاس سے فتویٰ دیتا ہے بلکہ شیعہ احکام خدا اور رسولؐ ہی سے جو صحیح حکم مستنبط ہوتا ہے اسی کو بیان کرتے ہیں اور وہ بھی اس وقت جب کوئی حکم صریح کسی چیز کا قرآن یا حدیث سے نہیں ملتا۔ رہا قیاس اور رائے پس اس سے مسلمانوں کے دوسرے فرقوں میں ہی فتوے دیے جاتے ہیں نہ شیعوں میں بلکہ شیعوں میں تو قیاس کی مذمت اور رائے کے تحریم کے متعلق اس کثرت سے حدیثیں وارد ہیں جن کا شمار کرنا تک دشوار ہے یہاں تک کہ امام ابوحنیفہ وغیرہ حضرات ائمہ طاہرینؑ کی خدمت میں کبھی آجاتے تھے تو حضرتؑ ان لوگوں کو بھی رائے اور قیاس پر عمل کرنے اور فتویٰ دینے سے نہایت شدت سے منع فرماتے تھے۔

شارح نے دوسری مراد یہ لکھی ہے کہ ''اس سے فاسد قرار دینا ہے ان لوگوں کے قول کو جو کہتے ہیں کہ ہر مجتہد درست جواب دیتا ہے''۔ پس یہ مسئلہ بھی اصول فقہ کا ہے جس میں علمائے اسلام میں بکثرت اختلاف ہوا ہے چنانچہ حضرات اہل سنت کے مجتہدین اور ائمہ اسی تصویب کے قائل ہیں یعنی ہر مجتہد اپنے اجتہاد کے مطابق جو فتویٰ دیتا ہے وہی دراصل حکم خدا ہوتا ہے۔ پس اگر ایک مجتہد نے کسی چیز کو حرام کہہ دیا تو خدا بھی اس کو حرام ہی کہے گا اور اگر دوسرے مجتہد نے اسی چیز کو حلال کہہ دیا تو خدا بھی اس کو حلال ہی کہے گا۔ غرض کسی چیز کے متعلق خاص حکم خدا کوئی نہیں ہوتا بلکہ مجتہد جو فتویٰ دیتا ہے وہی درحقیقت حکم خدا ہے۔ اور اس کا باطل ہونا ظاہر ہے کیونکہ اس سے اجتماع نقیضین اور اجتماع ضدین لازم آتا ہے کہ ایک ہی چیز کو خدا درحقیقت حرام بھی کہے اور حلال بھی، واجب بھی کہے اور غیر واجب بھی۔

برخلاف شیعوں کے کہ ان کے یہاں اجماع اور احادیث قطعیہ سے ثابت ہے کہ کسی مسئلہ میں حقیقی حکم اور واقعی مطلوبِ خدا ایک ہی امر ہے جو مجتہد کے فتویٰ دینے سے بدلتا نہیں اور نہ خدا کا کسی چیز کو حرام یا حلال یا واجب یا مباح قرار دینا مجتہد کے فتویٰ کا تابع ہے۔ بلکہ ہر امر کے متعلق کوئی نہ کوئی حکمِ معین خدا کے نزدیک ضرور ہے خواہ کوئی شخص اجتہاد کرے یا نہ کرے۔ پس اگر حکم خدا واضح طور پر نہ معلوم ہو تو مجتہد جامع الشرائط کو چاہیے کہ ادلہ اربعہ سے اس کو استنباط کرے جس میں اگر اس نے کوتاہی کی اور تمام کوشش صرف کرنے اور پورے طور پر غور و تامل کرنے کے قبل فتویٰ دے دیا تو گنہگار ہوگا اور اگر اپنے امکان بھر محنت و مشقت اور غور و تامل کرنے کے بعد فتویٰ دیا تو اگرچہ وہ فتویٰ حکم خدا کے خلاف ہو وہ مجتہد نہ گنہگار ہوگا نہ قابل الزام، کیونکہ خدا فرماتا ہے۔ ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ (سورۂ البقرہ، آیہ ۲۸۶) خدا کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ کی تکلیف نہیں دیتا اور اس مجتہد نے بھی صحیح حکم کے حاصل کرنے کے لیے جس قدر قوت تھی صرف کر دی، اب یہ اس کے ذہن اور علم کا قصور ہے جس سے وہ صحیح حکم کو نہیں دریافت کر سکا اور ظاہر ہے کہ یہ اس کے اختیار سے باہر امر تھا لیکن اس مجتہد کے غلط فتویٰ دینے سے اس جواب کو درست یا صحیح نہیں قرار دیا جائے گا۔ (جیسا کہ مجتہدین اہل سنت کا اعتقاد ہے کہ ہر مجتہد کا فتویٰ درست اور صحیح ہے) بلکہ صحیح جواب وہی رہے گا جو پہلے سے خدا کے یہاں معین ہے۔ (بقیہ صفحہ مابعد)

اَفَاَمَرَهُمُ اللّٰهُ تَعَالٰی بِالْاِخْتِلَافِ فَاَطَاعُوْهُ؟ اَمْ نَهَاهُمْ عَنْهُ فَعَصَوْهُ؟ اَمْ اَنْزَلَ اللّٰهُ دِیْنًا نَّاقِصًا فَاسْتَعَانَ بِهِمْ عَلٰی اِتْمَامِهٖ؟ اَمْ كَانُوْا شُرَكَآءَ لَهٗ فَلَهُمْ اَنْ یَّقُوْلُوْا وَ عَلَیْهِ اَنْ یَّرْضٰی؟ اَمْ اَنْزَلَ اللّٰهُ سُبْحَانَهٗ دِیْنًا تَامًّا فَقَصَّرَ الرَّسُوْلُ ﷺ عَنْ تَبْلِیْغِهٖ وَ اَدَآئِهٖ؟ وَاللّٰهُ سُبْحَانَهٗ یَقُوْلُ: ﴿مَا فَرَّطْنَا فِی الْكِتٰبِ مِنْ شَیْءٍ﴾، فِیْهِ تِبْیَانُ كُلِّ شَیْءٍ، وَ ذَكَرَ اَنَّ الْكِتَابَ یُصَدِّقُ بَعْضُهٗ بَعْضًا، وَ اَنَّهٗ لَا اخْتِلَافَ فِیْهِ، فَقَالَ سُبْحَانَهٗ: ﴿وَ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا كَثِیْرًا ۝﴾. وَ اِنَّ الْقُرْاٰنَ ظَاهِرُهٗ اَنِیْقٌ وَّ بَاطِنُهٗ عَمِیْقٌ۔[1]

(پھر فتووں میں اختلاف کی وجہ کیا؟) کیا خدائے برتر ہی نے ان کو اختلاف کا حکم دیا تھا جس کی انہوں نے اطاعت کی۔ یا اس نے ان کو اس سے منع کیا تھا جس کی انہوں نے نافرمانی کی۔ یا خدائے سبحانہ نے کوئی ناقص دین نازل کیا تھا جس کے پورا کرنے پر ان کی مدد چاہی۔ یا یہ لوگ خدا کے شریک ہیں جس سے ان کو اختیار ہے کہ (جو چاہیں) کہیں اور اس پر واجب ہے کہ (ان کی باتوں کو) مانا کرے۔ یا خدائے سبحانہ نے خود تو کامل دین نازل کیا تھا مگر رسول خدا ﷺ نے اس کے پہنچانے اور ادا کرنے میں کوتاہی کی؟ حالانکہ خدائے سبحانہ و تعالیٰ نے تو فرماتا ہے ''اس (قرآن) میں ہر امر کا بیان ہے'' اور بیان کیا ہے کہ اس کتاب کا بعض (حصّہ دوسرے) بعض (حصّہ) کی تصدیق کرتا ہے اور یہ کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے'' اور اگر (یہ قرآن) خدا کے سوا کسی کی طرف سے (آیا) ہوتا تو لوگ اس میں بہت کچھ اختلاف پاتے'' اور اس میں بھی شک نہیں کہ قرآن کا ظاہر بہت خوشنما اور باطن (اسی قدر) دقیق ہے (کہ نہ اس کے ہر

---

[1] یعنی قرآن کا ظاہری بیان نہایت خوشنما اور فصیح و بلیغ ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اس کا مطلب سمجھ لینا بھی آسان ہے بلکہ اس کے مطالب دقیق اور اس کا مقصود عمیق ہے جہاں تک ہر شخص نہیں پہنچ سکتا بلکہ وہی پہنچے گا جس میں اس کے مطالب سمجھنے کا ملکہ خاصہ پیدا ہو گیا ہو جس کو خدا یوں فرماتا ہے:

﴿وَ مَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ وَ الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ﴾ (سورۂ آل عمران، آیہ ۷)۔

کہ خدا اور ان لوگوں کے سوا جو علم میں بڑے پایہ پر فائز ہیں قرآن کا اصل مطلب کوئی نہیں سمجھ سکتا۔

دوسرے مقام پر فرماتا ہے:

﴿فَسْـَٔلُوْۤا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ (سورۂ النحل، آیہ ۴۳)

(بقیہ صفحہ مابعد)

لَا تَفْنٰى عَجَآئِبُهٗ، وَ لَا تَنْقَضِیْ غَرَآئِبُهٗ، وَ لَا تُكْشَفُ الظُّلُمٰتُ اِلَّا بِهٖ.

مطلب کو ہر شخص سمجھ سکتا ہے) اور نہ اس کے عجائب ختم ہوں گے اور نہ اس کے غرائب تمام ہوں گے اور نہ بغیر اس کے (گمراہی کی) تاریکیاں دور ہو سکتی ہیں۔

❁ خطبہ :۲۰ ❁

وَ مِنْ كَلَامٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

قَالَهٗ لِلْاَشْعَثِ بْنِ قَيْسٍ وَّ هُوَ عَلٰى مِنْبَرِ الْكُوْفَةِ يَخْطُبُ، فَمَضٰى فِيْ بَعْضِ كَلَامِهٖ شَیْءٌ اعْتَرَضَهُ الْاَشْعَثُ فَقَالَ: يَآ اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ! هٰذِهٖ عَلَيْكَ لَا لَكَ، فَخَفَضَ عَلَيْهِ السَّلَامُ اِلَيْهِ بَصَرَهٗ ثُمَّ قَالَ:

خطبہ:۲۰(۱۹)

حضرت علیہ السلام کے کلام کا کچھ حصّہ۔

حضرت علیہ السلام شہر کوفہ میں منبر پر خطبہ فرما رہے تھے جس پر اشعث بن قیس نے اعتراض کے طور پر کہا ''یا حضرت! یہ (جملہ) تو آپ کے خلاف (اور آپ کے حق میں مضر) ہے نہ موافق (اور نافع)'' تو حضرتؑ نے اس کی طرف تیز نظر سے دیکھا اور (یوں) ارشاد فرمایا۔[1]

(بقیہ صفحہ مابعد) اگر تم نہیں جانتے ہو تو صاحبان علم سے پوچھو۔

اس آیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص اگر حکم خدا اور قرآن کے مطالب سمجھنے کی قابلیّت رکھتا تو صرف اہل ذکر کی خصوصیت قرآن میں نہ ہوتی۔ اس مضمون کی بہت سی حدیثیں بھی ہیں۔

[1] علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں حضرت امیر المومنینؑ خوارج کا جھگڑا ختم ہونے کے بعد ایک مرتبہ کوفہ میں منبر پر خطبہ فرما رہے تھے اور حکمین یعنی عمر بن العاص و ابوموسی اشعری کے فیصلہ اور مکر و فریب کا ذکر کر رہے تھے۔ پس جب خوارج کے ذکر سے فارغ ہو گئے تو حاضرین سے ایک شخص کھڑا ہوا اور عرض کی ''یا حضرتؑ پہلے تو آپ نے حکمین مقرر کرنے سے ہم لوگوں کو روکا بعد ازاں اسی کا حکم دیا، اب ہم کو نہیں معلوم کہ اس میں کون امر مناسب اور بہتر تھا'' حضرتؑ نے اس پر کف افسوس ملا اور فرمایا ''جو شخص بات نہیں سنتا اور اپنے بہی خواہوں کی رائے نہیں مانتا اور بغیر اپنے نفع و نقصان کو سوچے اور سمجھے ہوئے کسی کام کو اختیار کرتا ہے اس کا یہی نتیجہ ہوتا ہے''۔

اس کلام سے حضرتؑ کا مقصود یہ تھا کہ یہ تم لوگوں کی سزا ہے جو حکمین مقرر کرنے کے قبل میں نے تم لوگوں کو منع کیا اور تم نے اسے نہ مانا بلکہ حکمین مقرر کرنے پر اڑے رہے پس بغیر غور و فکر کیے ہوئے اس کام کو تم لوگوں نے اختیار کیا لہٰذا اس کا نتیجہ بھگتو۔ لیکن اشعث حضرتؑ کے کلام کو سمجھ نہ سکا بلکہ خیال کیا کہ حضرتؑ اپنی غلطی کا اقرار کر رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ چونکہ میں بغیر غور و فکر کیے حکمین پر راضی ہو گیا لہٰذا اس کی سزا پا رہا ہوں۔ اور اشعث کی اس غلط فہمی کی وجہ یہ تھی کہ حضرتؑ کا یہ کلام مجمل تھا اور آپ صاف صاف اپنی قوم کی ملامت نہیں کر سکتے تھے کیونکہ اس امر کو سب جانتے ہیں کہ جب سردار کے ماتحت لوگ شر و فساد پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور اس سے ایسے امر کے طالب ہوتے ہیں جس میں اس کا ضرر ہوتا ہے تو سردار مجبوراً ان لوگوں کی رائے سے اتفاق کر لیتا ہے تا کہ ان کی (بقیہ صفحہ مابعد)

مَا يُدْرِيْكَ مَا عَلَيَّ مِمَّا لِيْ؟ عَلَيْكَ لَعْنَةُ اللهِ وَ لَعْنَةُ اللَّاعِنِيْنَ! حَآئِكُ ابْنُ حَآئِكٍ! مُنَافِقُ ابْنُ كَافِرٍ! وَاللهِ! لَقَدْ اَسَرَكَ الْكُفْرُ مَرَّةً وَّ الْاِسْلَامُ اُخْرٰى، فَمَا فَدَاكَ مِنْ وَّاحِدَةٍ مِّنْهُمَا

تجھے کیا معلوم کون سی بات میرے خلاف (اور مجھے مضر) ہے اور کون سی بات میرے موافق (اور مجھے نافع) ہے۔ ۱؎ تجھ پر تو خدا کی بھی لعنت ہے اور تمام لعنت کرنے والوں کی بھی لعنت۔ ۲؎ اے جولاہہ فرزندِ جولاہہ، ۳؎ اے منافق فرزندِ کافر۔ بخدا تجھ کو ایک مرتبہ کفر نے قید کیا اور دوبارہ اسلام نے۔ ۴؎ پس دونوں سے کسی ایک مرتبہ

(بقیہ صفحہ ماقبل) تسکین ہوجائے اور شر وفساد سے وہ لوگ باز رہیں نہ یہ کہ درحقیقت وہ ان لوگوں کی خواہش کو اچھا سمجھتا ہے۔

پس جب اس امر کے انجام دینے کے بعد برا نتیجہ دیکھ کر وہ لوگ نادم ہوتے اور پچھتاتے ہیں تو سردار مجمل طور پر صرف یہی کہہ دیتا ہے کہ جو شخص صلاح نیک کی مخالفت کرتا ہے اس کی یہی سزا ہوتی ہے۔ اس سے اس کی مراد اپنی قوم کی سرزنش ہوتی ہے جو اس کی رائے کے خلاف اصرار کرتی مصلحت کو نہیں سمجھتی اور دور اندیشی کو کام میں نہیں لاتی ہے۔ اسی طرح حضرت امیر المومنینؑ نے بھی پہلے تو امکان بھر لوگوں کو حکمین کے مقرر کرنے سے روکا لیکن نہ مانے تو مجبوراً راضی ہوگئے۔ اب ان لوگوں نے نتیجہ دیکھ لیا اور نادم ہوئے تو حضرتؑ پر اعتراض کیا کہ ''آخر آپ کیوں راضی ہوگئے تھے؟'' اسی کو حضرتؑ نے فرمایا کہ ''میں کہاں راضی ہوا تم لوگوں نے میری رائے کی مخالفت کی اب نتیجہ بھگتو کیونکہ جو شخص بے سمجھے بوجھے کام کرتا ہے اس کا یہی انجام ہوتا ہے'' جس کو اشعث سمجھا کہ حضرتؑ اپنے متعلق فرما رہے ہیں کہ میں نے بے سمجھے بوجھے آخر میں رضامندی ظاہر کی تھی۔

۱؎ یعنی میں نے جو پہلے تقرر حکمین سے مخالفت کی بعد ازاں اپنی قوم کا طوفان عظیم مٹانے کے لیے منظور کرلیا۔ اس کے نفع اور ضرر کو تو کیا جانے کیونکہ تو جاہل محض ہے اور اشعث چونکہ محض جاہل ہی نہیں تھا بلکہ اول درجہ کا منافق اور اسلام کا باطنی دشمن تھا اس سبب سے حضرتؑ نے اس کو اس سختی سے جواب دیا۔

۲؎ چنانچہ تاریخ طبری ایسی مستند تاریخ میں اشعث کے حال میں ہے:

وَ بَعَثَ بِهٖ اِلٰى اَبِيْ بَكْرٍ مَعَ السَّبِيِّ فَكَانَ مَعَهُمْ يَلْعَنُهُ الْمُسْلِمُوْنَ وَ يَلْعَنُهُ سَبَايَا قَوْمِهٖ۔

یعنی ابوبکر کے والی نے قیدیوں کے ساتھ اشعث کو بھی ابوبکر کے پاس بھیجا تھا پس وہ انہیں کے ساتھ تھا اس حالت سے کہ اس پر مسلمان لوگ بھی لعنت کرتے تھے اور اس کی قوم کے (کافر) قیدی بھی لعنت کرتے تھے۔ (تاریخ طبری جلد ۳ صفحہ ۲۷۵)

۳؎ اشعث اور اس کا باپ اپنے وطن میں بردیمانی بنتے تھے۔

۴؎ پورے واقعہ مذکورہ کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ منافق اشعث ابن قیس یمن کی قبیلہ کندہ سے تھا۔ اپنی عمر میں دو مرتبہ قید ہوا۔ ایک دفعہ حالت کفر زمانۂ جاہلیت میں جب اس کے باپ کو ایک شخص نے مار ڈالا تھا جس کا قصاص لینے کے لیے اشعث مع اپنے قبیلہ بنی کندہ کے نکلا لیکن وہ جماعت جو اس کے باپ کی قاتل تھی ان لوگوں پر غالب آئی اور اشعث کی طرف کے دو سرداروں کو قتل اور اشعث کو قید کرلیا۔ آخر اشعث نے تین ہزار اونٹ فدیہ میں دیا تو رہا ہوا۔ دوسری مرتبہ اسلام میں اسیر ہوا جس کا قصہ یہ ہے کہ جب (بقیہ صفحہ

(بقیہ صفحہ مابعد) آنحضرتؐ کا تسلط عرب پر قائم ہو گیا تو اشعث کے قبیلہ بنی کندہ کا ڈیپوٹیشن بھی آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سب لوگوں نے اسلام قبول کیا بعدازاں اپنے وطن واپس گئے تو آنحضرتؐ کے عاملِ حضرموت سے ان لوگوں سے کچھ اختلاف ہوا اور بنی کندہ کی زیادتی ثابت ہوئی۔ اس کے متعلق علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں:

وَ فِیْ هٰذِهِ الْوَاقِعَةِ كَانَ الْخَبَرُ الْمَشْهُوْرُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لِبَنِیْ وَلِیْعَةَ لَتَنْتَهُنَّ یَا بَنِیْ وَلِیْعَةَ اَوْ لَاَبْعَثَنَّ عَلَیْكُمْ رَجُلًا عَدِیْلَ نَفْسِیْ یَقْتُلُ مُقَاتِلَتَكُمْ وَ یَسْبِیْ ذَرَارِیَّكُمْ۔ قَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ فَمَا تَمَنَّیْتُ الْاِمَارَةَ اِلَّا یَوْمَئِذٍ وَ جَعَلْتُ اَنْصِبُ لَهٗ صَدْرِیْ رَجَاءَ اَنْ یَّقُوْلَ هُوَ هٰذَا فَاَخَذَ بِیَدِ عَلِیٍّ عَلَیْهِ السَّلَامُ وَ قَالَ وَهُوَ هٰذَا۔

یعنی اس واقعہ کے متعلق آنحضرتؐ کی وہ مشہور حدیث ہے جس میں آپؐ نے فرمایا ہے کہ اے بنی ولیعہ اپنی شرارت سے باز آؤ ورنہ میں تمہارے یہاں ایسے شخص کو بھیجوں گا جو بالکل میرا نظیر ہے، جو تمہارے لڑنے والوں کو قتل کر ڈالے گا اور تمہاری ذریت کو قید کر لے گا۔ عمر بن الخطاب کہتے ہیں کہ میں نے حکومت اور امارت کی تمنا نہیں کی مگر اسی روز۔ میری تمنا کی یہ حالت تھی کہ ایڑی پر کھڑا ہو کر اپنے سینہ کو بار بار اونچا کرتا تھا اس امید میں کہ شاید حضرت مجھے دیکھ کر کہیں کہ وہ شخص یہی ہے۔ لیکن آنحضرتؐ نے ایسا نہ کیا بلکہ علیؑ کا ہاتھ پکڑ کر کہا وہ شخص یہ ہے۔

پھر جب آنحضرتؐ کا انتقال ہو گیا تو یہ قبیلہ مرتد ہو گیا لہٰذا ابوبکر نے خلیفہ ہو کر زیاد کو حضرموت کا والی مقرر کیا اور وہاں والوں سے بیعت لینے کا حکم دیا تو وہاں کے سب لوگوں نے بیعت کی، سوائے انہیں بنی ولیعہ کے، جس پر اس قبیلہ اور مسلمانوں میں جنگ عظیم قائم ہوئی اور شدید خونریزی ہوئی۔ بعدازاں اشعث اور اس کے قبیلہ کے باقی ماندہ لوگ ایک قلعہ میں پناہگیر ہو گئے جس کا مسلمانوں نے محاصرہ کر لیا۔ اس محاصرہ کے زمانہ میں ایک شب اشعث تنہا زیاد کے پاس آیا اور کہا اگر تم مجھے بچانے کا پختہ وعدہ کرو تو میں قلعہ کھلوا دوں۔ چنانچہ زیاد نے وعدہ کیا جس پر اشعث نے اپنے قبیلہ والوں کو فریب دے کر قلعہ کھلوا دیا۔ زیاد نے قلعہ میں داخل ہو کر سب کو تہ تیغ کیا اور حسب وعدہ اشعث کو چھوڑ دیا لیکن قید کر کے اور زنجیروں میں جکڑ کر ابوبکر کے پاس لایا۔ ابوبکر نے اس کے قصور کو معاف کر دیا اور اپنی بہن ام فروہ بنت ابی قحافہ کا اس سے عقد کر دیا اور اس روز سے اشعث دشمنان اہل بیت کی جماعت میں داخل ہو گیا اور حقِ نفاق پورے طور پر ادا کرنے لگا۔

اس واقعہ کو لکھنے کے بعد علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں ''اشعث کے قید ہونے اور اپنی قوم کے ہلاک کرنے کی یہی وجہ میرے ذہن میں آتی ہے اور یہ وجہ اس وجہ سے زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے جسے سید رضی علیہ الرحمہ نے آخر خطبہ میں لکھا ہے کہ حضرت امیر المومنینؑ کا اشارہ اس جملہ سے اس کلام کی طرف ہے جو اشعث نے خالد بن ولید سے یمامہ میں کیا تھا جس میں اس نے اپنی قوم کو فریب دیا اور ان لوگوں کے ساتھ مکر کیا حتی کہ سب کو قتل کرا دیا۔ اور میرے اس خیال کی وجہ یہ ہے کہ میں نے کسی تاریخ میں یہ نہیں دیکھا کہ یمامہ میں خالد سے یہ یا اس قسم کا کوئی ذکر ہوا ہو کیونکہ کہاں کندہ اور کہاں یمامہ۔ کندہ یمن کے لوگ تھے اور یمامہ بنی حنیفہ کی جگہ تھی۔ پس میں نہیں کہہ سکتا کہ سید رضی رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہ کہاں سے نقل کیا ہے۔

مَالُكَ وَ لَا حَسَبُكَ. وَ اِنَّ امْرَاً دَلَّ عَلٰى قَوْمِهِ السَّيْفَ، وَ سَاقَ اِلَيْهِمُ الْحَتْفَ، لَحَرِيٌّ اَنْ يَّمْقُتَهُ الْاَقْرَبُ، وَ لَا يَاْمَنَهُ الْاَبْعَدُ۔

(قَالَ الرَّضِيُّ رَحِمَهُ اللّٰهُ) يُرِيْدُ عَلَيْهِ السَّلَامُ اَنَّهٗ اسِرَ فِي الْكُفْرِ مَرَّةً، وَ فِي الْاِسْلَامِ مَرَّةً. وَ اَمَّا قَوْلُهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ «دَلَّ عَلٰى قَوْمِهِ السَّيْفَ» فَاَرَادَ بِهٖ حَدِيْثًا كَانَ لِلْاَشْعَثِ مَعَ خَالِدِ بْنِ الْوَلِيْدِ بِالْيَمَامَةِ، غَرَّ فِيْهِ قَوْمَهٗ، وَ مَكَرَ بِهِمْ حَتّٰى اَوْقَعَ بِهِمْ خَالِدٌ، وَ كَانَ قَوْمُهٗ بَعْدَ ذٰلِكَ يُسَمُّوْنَهٗ «عُرْفَ النَّارِ»، وَ هُوَ اسْمٌ لِّلْغَادِرِ عِنْدَهُمْ.

بھی تو نہ تیرے مال ہی نے تجھے نجات دی[1] اور نہ تیرے حسب (ونسب) ہی نے۔ کیونکہ جس شخص نے تلوار کو اپنی قوم کی راہ دکھائی اور موت کو ان کی طرف کھینچ لایا اسی کا سزاوار ہے کہ (اعزاو) اقربا تو اس کو دشمن رکھیں اور بیگانے اس کے شر سے محفوظ رہیں۔

(جناب سید رضی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ) حضرت علیہ السّلام کا مقصود یہ ہے کہ یہ (اشعث) ایک دفعہ (زمانہ) کفر میں قید ہوا تھا اور دوسری مرتبہ (زمانہ) اسلام میں۔ رہا حضرت علیہ السّلام کا قول ''تلوار کو اپنی قوم کی راہ دکھائی''۔ تو اس سے آپ کا مقصود اشعث کی وہ گفتگو ہے جو خالد بن ولید سے یمامہ میں ہوئی تھی کہ اپنی قوم کو اس نے فریب دیا تھا اور ان کے ساتھ مکر کیا تھا جس پر خالد بن ولید نے ان لوگوں پر حملہ کر دیا تھا اور (اسی سبب سے) اس کی قوم اس واقعہ کے بعد اشعث کو عرف النار (آگ لگانے والے) کے نام سے پکارتی جوان کے یہاں غدر کرنے والے کا نام ہے۔

❁ خطبہ :۲۱ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

فَاِنَّكُمْ لَوْ عَايَنْتُمْ مَا قَدْ عَايَنَ مَنْ مَّاتَ مِنْكُمْ لَجَزِعْتُمْ وَ وَهِلْتُمْ وَ

خطبہ:۲۱ (۲۰)

حضرت علیہ السّلام کے ایک خطبہ کا کچھ حصہ۔

پس اگر تم لوگ اس (منظر) کا معائنہ کر لیتے جسے تم سے (پہلے) مرنے والوں نے دیکھا ہے تو یقیناً بے چین ہو جاتے اور کانپ اٹھتے اور (حق) کو سنتے اور مان لیتے۔

---

[1] اس سے یہ مقصود نہیں ہے کہ اشعث کی طرف سے فدیہ نہیں دیا گیا، کیونکہ پہلی دفعہ جب اشعث قید ہوا ہے تو اس نے اپنے فدیہ میں تین ہزار اونٹ دیے۔ بلکہ مقصود یہ ہے کہ تیرے مال اور تیری خاندانی عزت اور قوت نے تجھ کو نفع نہ پہنچایا اور قید ہونے سے تجھ کو بچا نہ سکی کیونکہ اگر تیرا مال اور خاندانی اقتدار تجھے قید ہونے سے بچا لیتا اس وقت البتہ ان چیزوں کا نفع ظاہر ہوتا۔

سَمِعْتُمْ وَ اَطَعْتُمْ، وَ لٰكِنْ مَّحْجُوْبٌ عَنْكُمْ مَا قَدْ عَايَنُوْا، وَ قَرِيْبٌ مَّا يُطْرَحُ الْحِجَابُ، وَ لَقَدْ بُصِّرْتُمْ اِنْ اَبْصَرْتُمْ، وَ اسْمِعْتُمْ اِنْ سَمِعْتُمْ، وَ هُدِيْتُمْ اِنِ اهْتَدَيْتُمْ.

بِحَقٍّ اَقُوْلُ لَكُمْ: لَقَدْ جَاهَرَتْكُمُ الْعِبَرُ وَ زُجِرْتُمْ بِمَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ، وَ مَا يُبَلِّغُ عَنِ اللّٰهِ بَعْدَ رُسُلِ السَّمَآءِ اِلَّا الْبَشَرُ.

لیکن (افسوس) انہوں نے جو دیکھا ہے وہ (ابھی) تم سے پردہ میں ہے اور عنقریب وہ پردہ (زندگی) تم سے اٹھا چاہتا ہے۔ (اس وقت سمجھو گے) اور یقیناً (اس دنیا میں بھی بہت کچھ) تم دکھائے گئے ہو، اگر (چاہتے تو) دیکھتے۔ اور (اچھی طرح) سنائے گئے ہو، اگر (ارادہ کرتے تو) سنتے۔ اور (کامل طور پر) ہدایت کیے گئے ہو اگر (خواہش ہوتی تو) ہدایت پاتے۔

اور میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ دنیا کی عبرتوں نے تم کو کھول کر (انجام کار) دکھا دیا ہے اور اس چیز سے تمہاری تنبیہ کر دی گئی ہے جس میں کافی تنبیہ ہے کیونکہ آسمانی قاصدوں (فرشتوں) کے بعد خدا کے احکام بجز انسان (پیغمبروں) کے کوئی نہیں پہنچا سکتا۔

❁ خطبہ: ۲۲ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

فَاِنَّ الْغَايَةَ اَمَامَكُمْ، وَ اِنَّ وَرَآءَكُمُ

خطبہ: ۲۲ (۲۱)

حضرت علیہ السلام کے ایک خطبہ کا کچھ حصہ۔

(غافلو!) انجام کار یقیناً تمہارے آگے ہے [1] اور قیامت تمہارے پیچھے ہے جو تمہیں ہنکائے لے چل رہی

---

[1] مکلفین کا انجام کار ثواب اور عقاب ہے لہٰذا ایک احتمال یہ ہے کہ حضرتؑ کی مراد آخرت کا عذاب و ثواب ہو۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ شاید انجام کار اور غایت سے مراد موت ہو اور اس کو ہم لوگوں کے آگے اس سبب سے فرمایا ہو کہ انسان دنیا کی زندگی بسر کرتا ہوا گویا موت کی طرف جا رہا ہے یا گویا جزا و سزا کی طرف جا رہا ہے لہٰذا موت اور جزا و سزا اس کے آگے ہیں یعنی اس کے سامنے ہیں۔ اس کے بعد فرمایا ''وَ اِنَّ وَرَآءَكُمُ السَّاعَةَ تَحْدُوْكُمْ'' یعنی ''قیامت تم لوگوں کو ہنکائے لے چل رہی ہے'' اور اس قیامت کو حضرتؑ نے ہم لوگوں کے پیچھے قرار دیا کیونکہ جب وہ آئے گی تو لوگوں کو میدان حساب و کتاب اور موقف جزا کی طرف ہنکا لے جائے گی۔ جیسا کہ چرواہا جانوروں کو ہنکاتا ہے۔ پس چونکہ قیامت میں یہ صفت ہے کہ ہم لوگوں کو ہنکا لے چلے گی لہٰذا وہ بمنزلہ اس شے کے ہے جو پیچھے سے انسان کی حفاظت کرتی آتی ہو اور پیچھے سے اس کو آگے کی طرف حرکت دیتی ہے۔

السَّاعَةَ تَحْدُوْكُمْ، تَخَفَّفُوْا تَلْحَقُوْا، فَاِنَّمَا يُنْتَظَرُ بِاَوَّلِكُمْ اٰخِرُكُمْ.

اَقُوْلُ: اِنَّ هٰذَا الْكَلَامَ لَوْ وُزِنَ بَعْدَ كَلَامِ اللّٰهِ سُبْحَانَهٗ، وَ بَعْدَ كَلَامِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بِكُلِّ كَلَامٍ لَّمَالَ بِهٖ رَاجِحًا وَ بَرَّزَ عَلَيْهِ سَابِقًا. فَاَمَّا قَوْلُهٗ علیہ السلام: »تَخَفَّفُوْا تَلْحَقُوْا«، فَمَا سُمِعَ كَلَامٌ اَقَلَّ مِنْهُ مَسْمُوْعًا وَ لَا اَكْثَرَ مَحْصُوْلًا، وَ مَآ اَبْعَدَ غَوْرَهَا مِنْ كَلِمَةٍ، وَ اَنْقَعَ نُطْفَتَهَا مِنْ حِكْمَةٍ، وَ قَدْ نَبَّهْنَا فِيْ كِتَابِ الْخَصَآئِصِ عَلٰى عِظَمِ قَدْرِهَا وَ شَرَفِ جَوْهَرِهَا.

ہے۔(پس بوجھ ہٹا کر) ہلکے پھلکے چلو کہ (اپنے مطلوب حقیقی سے) فوراً مل جاؤ[1] کیونکہ تمہارے اول کے لیے تمہارے آخر کا انتظار کیا جارہا ہے[2] (کہ دورۂ نسل انسانی ختم ہوجائے تو قیامت آئے)۔

(جناب سید رضی رحمہ اللہ نے فرمایا) ''میں کہتا ہوں کہ کلامِ خدا و کلامِ رسولؐ کے بعد (حضرت امیر المومنینؑ کا) یہ کلام اگر دنیا بھر کے کلام سے مقابلہ کیا جائے تو سب پر غالب رہے (اور سب سے اعلیٰ و افضل ثابت ہو) اور ہر ایک پر گوئے سبقت لے جائے اور خاص کر حضرتؑ کا کلام ''ہلکے پھلکے چلو کہ فوراً مل جاؤ'' تو ایسا ہے کہ سننے میں اس سے چھوٹا اور (سمجھنے اور) مطلب میں اس سے بڑا کوئی کلام سنا ہی نہیں گیا۔ (دیکھنا کیسا، اللہ اکبر) یہ کلمہ کس قدر غامض اور اس کا آب (جوہر) کس قدر (سیراب کرنے والا اور جہالت و گمراہی کی) پیاس بجھانے والا ہے جس کی عظمتِ قدر اور شرافتِ جوہر پر میں نے کتاب ''الخصائص'' میں بھی تنبیہ کی ہے۔

---

[1] اس جملہ کی اصل یہ ہے کہ کوئی شخص بغیر اسباب و بوجھ کے لادے ہوئے چلتا ہے تو ہلکا ہوتا ہے لہٰذا جو لوگ اس سے آگے رہتے ہیں ان سے جلد ملحق ہوجاتا ہے اور تاخیر نہیں ہوتی اور جو شخص اسباب و سامان کا بوجھ لاد کر چلتا ہے وہ بوجھ کے سبب سے دبا جاتا ہے جس کے سبب سے چلنے سے عاجز ہوتا ہے اور اگر چلتا بھی ہے تو نہایت تاخیر سے منزل مقصود تک پہنچتا ہے۔

[2] مقصود یہ ہے کہ جو لوگ اول زمانہ میں اور تم لوگوں سے پہلے مر چکے ہیں ان کے محشور ہونے اور حساب و کتاب کر کے جزا و سزا پانے کے لیے تم لوگوں کا انتظار کیا جارہا ہے کہ تم لوگ بھی دنیاوی زندگی ختم کر کے ان سے مل جاؤ تو قیامت آئے اور سب زندہ ہو کر قبر سے نکلیں اور ان کا حساب و کتاب کیا جائے۔ یا کلام اس فعل کے مثل ہے کہ کوئی بادشاہ جب لشکر والوں کو انعام و اکرام دینا چاہتا ہے تو انتظار کرتا ہے کہ جب سب جمع ہوجائیں تو ایک ہی دفعہ تقسیم کرے۔ علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں ''هٰذَا كَلَامٌ فَصِيْحٌ جِدًّا'' کہ ''حضرتؑ کا یہ کلام نہایت درجہ فصیح ہے''۔

❁ خطبہ :۲۳ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

اَلَا وَ اِنَّ الشَّيْطٰنَ قَدْ ذَمَرَ حِزْبَهٗ، وَ

خطبہ:۲۳(۲۲)

حضرت علیہ السلام کے ایک خطبہ کا کچھ حصہ

(جس میں اپنی شرکت قتل عثمان کی رد کی ہے) [1]

دیکھو شیطان نے اپنی جماعت کو آمادہ اور اپنے لشکر کو

---

[1] حضرتؑ اس خطبہ میں اس جماعت کی مذمت فرماتے ہیں جس نے حضرتؑ پر قتل عثمان کی شرکت کا اتہام قائم کیا تھا۔ مثل طلحہ وزبیر و عائشہ کے اور ان لوگوں کے اس دعوے کا بدیہی البطلان ہونا ثابت فرما کر آخر میں اپنی شجاعت اور راہِ خدا میں حق کی پابندی اور مخالفین کی مخالفت سے لاپرواہی ظاہر فرماتے ہیں اور یہ کہ حضرتؑ کو دین کے متعلق کسی امر میں نہ کسی قسم کا شک ہوا ہے اور نہ ہوسکتا ہے۔

علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں: ''حضرتؑ کا کلام اس خطبہ میں اصحاب جمل یعنی طلحہ وزبیر اور بی بی عائشہ کے متعلق ہے اور پورا خطبہ یہاں مذکور نہیں ہے بلکہ اصل خطبہ بہت بڑا ہے جس کے اکثر حصہ کو مؤرخ ابومخنف رحمہ اللہ نے بھی ذکر کیا ہے چنانچہ مؤرخ مذکور مسافر بن حبیب سے روایت کرتا ہے کہ اس نے کہا جب حضرت علی علیہ السلام طلحہ زبیر و عائشہ کو سمجھانے سے عاجز آ گئے اور حضرتؑ کے قاصد جوان لوگوں کے پاس گئے تھے حضرتؑ کی خدمت میں واپس آ گئے جن کے ذریعہ سے ان لوگوں نے حضرتؑ کو جنگ وجدال کی خبر دی تھی تو حضرتؑ نے خطبہ بیان فرمایا جس میں بعد حمد ونعت ارشاد فرمایا کہ

اے لوگو! میں نے حتی المقدور اس قوم غدار کا لحاظ کیا، ان کی فہمائش کی، ان کو شر وفساد سے باز رکھنا چاہا اور ان کے نکث بیعت پر توبیخ کی اور ان کی گمراہی سے ان کو مطلع کر دیا پھر بھی ان لوگوں کو حیا دامنگیر نہیں ہوئی بلکہ ہمارے پاس جنگ کا پیغام کہلا بھیجا ہے اور یہ کہلایا ہے کہ تمہارا نفس تم کو باطل امور کا آرزومند کر رہا ہے اور تم کو فریب دے رہا ہے۔ ان بدبختوں سے خدا سمجھے کہ میں بھی ایسا ہو گیا کہ جنگ سے ڈرایا جاؤں؟ اور جنگ کی مجھے دھمکی دی جائے عجیب؟ بہرکیف یہ لوگ جس قدر چاہیں گرج لیں اور جہاں تک ہو سکے چمک لیں کیونکہ مجھے تو یہ لوگ عرصہ دراز سے دیکھتے آ رہے ہیں اور میری بہادری اور میرے کشت وخون کو بھی اپنے آباؤ اجداد کے وقت سے اچھی طرح پہچان رہے ہیں۔ میں ہوں ابوالحسن! جس نے مشرکین کو مسمار کر کے رکھ دیا تھا اور ان کی جماعت کو تہ وبالا کر دیا تھا۔ وہ دل ابھی تک میرے سینہ میں ہے اور اب بھی جو مجھ سے دشمنی کر کے مقابلہ کرے گا اس سے اسی دل سے مقابلہ کروں گا علاوہ بریں خداوند عالم نے جو مجھ سے نصرت اور مدد کا وعدہ کیا تھا اس کا مجھے پورا یقین ہے جس میں شک عارض ہو ہی نہیں سکتا اور نہ میرے دین اور مذہب میں کسی قسم کا شبہ ہوسکتا ہے کیونکہ میں حق پر ہوں جو ایسا ہی یقینی ہے جیسا رسالت مآبؐ کا بمقابلۂ کفار ومشرکین حق پر ہونا یقینی تھا۔

لوگو! جو جہاد سے جان بچاتا ہے وہ بھی موت سے بچ نہیں سکتا اور جو جنگ سے بھاگ کھڑا ہوتا ہے وہ بھی موت کو روک نہیں سکتا۔ غرض موت سے نجات اور چھٹکارا تو ہو ہی نہیں سکتا۔ پس جو شخص بھی جہاد میں قتل ہونے سے بچ جائے گا ایڑیاں رگڑ کر مرے گا۔ پس بخدا مجھے تلوار کی ہزار ضرب آسان اور خوشگوار تر معلوم ہوتی ہے بستر پر بے اذیت مرجانے سے۔ بارالہا طلحہ نے میری بیعت توڑ دی اور اس کے قبل عثمان کے بھی پیچھے پڑ گیا تھا آخر قتل کر چھوڑا۔ پھر اس کا بہتان مجھ پر قائم کیا اور افترائے عظیم کو راہ دی۔ پس بارالہا اس کو تو نہ چھوڑنا۔ اور بارالہا زبیر نے میرے ساتھ قطع رحم کیا اور میری بیعت توڑ دی اور میرے دشمن کی پشت پناہی کی۔ پس (بقیہ صفحہ مابعد)

اسْتَجْلَبَ جَلَبَهٗ، لِيَعُوْدَ الْجَوْرُ اِلٰٓى اَوْطَانِهٖ، وَ يَرْجِعَ الْبَاطِلُ اِلٰى نِصَابِهٖ، وَاللّٰهِ مَآ اَنْكَرُوْا عَلَيَّ مُنْكَرًا، وَ لَا جَعَلُوْا بَيْنِيْ وَ بَيْنَهُمْ نَصِفًا. وَ اِنَّهُمْ لَيَطْلُبُوْنَ حَقًّا هُمْ تَرَكُوْهُ، وَ دَمًا هُمْ سَفَكُوْهُ، فَلَئِنْ كُنْتُ شَرِيْكَهُمْ فِيْهِ فَاِنَّ لَهُمْ لَنَصِيْبَهُمْ مِنْهُ، وَ لَئِنْ كَانُوْا وَلُوْهُ دُوْنِيْ، فَمَا التَّبِعَةُ اِلَّا عِنْدَهُمْ، وَ اِنَّ اَعْظَمَ حُجَّتِهِمْ لَعَلَيَّ

جمع کرلیا ہے تا کہ ظلم اپنے (پہلے) گھروں کی طرف لوٹ آئے اور باطل اپنے اصل کی طرف پلٹ آئے۔ بخدا ان لوگوں نے کسی برائی کو نہ چھوڑا جس کا اتہام مجھ پر نہ قائم کیا ہو[1] اور نہ میرے اور اپنے درمیان انصاف کو راہ دیا، بلکہ یہ لوگ (الٹے) مجھ سے اس حق کو طلب کرتے ہیں جسے خود ہی کھویا ہے اور اس خون کا قصاص (چاہتے ہیں) جسے خود ہی بہایا ہے۔[2] پس اگر اس (خون) میں میں ان کا شریک تھا تو ان کا بھی تو اس میں (بڑا) حصّہ ہے۔ (پھر یہ کون قصاص چاہنے والے) اور اگر ان لوگوں نے بغیر میری (رائے کے) اس (قتل عثمان) کو انجام دیا ہے تو پھر ان کے سوا کسی پر (اس کا) مظلمہ نہیں ہوسکتا۔[3] غرض ان کی سب

(بقیہ صفحہ مابعد) اب میرا عوض اس سے تو ہی لے لے جس طرح بھی تو مناسب سمجھتا ہو"۔ (علامہ مذکور نے اور بھی کئی خطبہ حضرتؑ کے اس جنگ جمل اور ناکثین بیعت کے متعلق ذکر کیے ہیں جو سب انشاءاللہ ضمیمہ میں آئیں گے)۔

[1] چونکہ طلحہ وزبیر اپنی دنیاوی خواہشوں میں حضرتؑ کی خلافت سے کامیاب نہیں ہوئے اور بی بی عائشہ کا قدیم بغض ونفاق علی علیہ السلام کی سرداری کو دیکھ نہ سکا لہٰذا ان لوگوں نے حضرتؑ کی مخالفت کی اور ہر بُرائی کو حضرتؑ کی طرف منسوب کیا۔ عثمان کے قتل کرانے کا اتہام بھی قائم کیا، ان کے خلاف لوگوں کو بہکانے کا بہتان بھی باندھا، اس سبب سے حضرتؑ فرماتے ہیں کہ ان لوگوں نے کسی برائی کو نہ چھوڑا جس سے مجھے متہم نہ کیا ہو۔

[2] یعنی عثمان کو تو خود ان لوگوں نے ہی قتل کیا اور اب اپنے اغراض فاسدہ کے حاصل کرنے کے لیے عثمان کی مظلومیت بیان کر کے لوگوں میں جوش پیدا کرتے ہیں اور جس خون کے مجرم خود ہیں اس کا الزام مجھ پر قائم کرتے ہیں تا کہ لوگ میرے مخالف ہو جائیں اور ان کی غرض حاصل ہو۔

[3] یعنی ان کے کہنے کے مطابق اگر (بفرض محال) میں بھی خونِ عثمان میں ان کا شریک تھا جب بھی یہ کون ان کا قصاص طلب کرنے والے؟ کیونکہ اس کے طالب تو عثمان کے اعزّا ہوں گے۔ یہ لوگ کس طرح اور کس حق سے طلب کرتے ہیں۔ عجب تماشہ ہے کہ جو مدعا علیہ ہے وہی مدعی بن گیا اور جو مجرم تھا وہ منصفی کا عہدہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اور اگر میں اس میں شریک نہیں تھا (جیسا کہ واقعہ ہے اور جس کا گواہ مسلمانوں بلکہ کفار عرب کا بچہ بچہ تک ہے) تو پھر پورا قصاص انہیں کو ادا کرنا چاہیے نہ کسی دوسرے کو۔ غرض ہر صورت سے یہ لوگ قاتل ہیں جن کو قصاص طلب کرنے کا کوئی حق نہیں۔

اَنْفُسِهِمْ، يَرْتَضِعُوْنَ اُمًّا قَدْ فَطَمَتْ، وَ يُحْيُوْنَ بِدْعَةً قَدْ اُمِيْتَتْ.

يَا خَيْبَةَ الدَّاعِيْ! مَنْ دَعَا وَ اِلَامَ اُجِيْبَ! وَ اِنِّيْ لَرَاضٍ بِحُجَّةِ اللّٰهِ عَلَيْهِمْ وَ عِلْمِهٖ فِيْهِمْ. فَاِنْ اَبَوْا اَعْطَيْتُهُمْ حَدَّ السَّيْفِ، وَ كَفٰى بِهٖ شَافِيًا مِّنَ الْبَاطِلِ،

سے بڑی دلیل خود انہی پر عائد ہوتی ہے۔ ۱؎ (اور اصلی بھید یہ ہے کہ) یہ لوگ اس ماں کا دودھ پینا چاہتے ہیں جو دودھ چھڑا چکی اور وہ بدعت زندہ کر رہے ہیں جو محو ہو چکی۔ ۲؎

ہائے افسوس ذرا اس کی نا امیدی دیکھو جو (مجھ سے جنگ کے لیے لوگوں کو) بلا رہا ہے یہ جن کو بُلاتا ہے کون ہیں۔ (ان کی حقیقت ہی کیا ہے) اور اس کی جو بات منظور کی گئی (یعنی مجھ سے جنگ اس کی) کیا (وقعت) ہے؟ ۳؎ اور میں تو خدا کی اس حجت پر راضی ہوں جو ان پر (قائم ہو چکی) ہے اور اس علم پر جو اسے ان کے متعلق ۴؎ حاصل ہے۔ پس اگر یہ لوگ (اپنی شرارت سے) باز نہ آئیں گے

۱؎ یعنی یہ لوگ مسلمانوں کو میرے خلاف یہ کہہ کر اُبھار رہے ہیں کہ چونکہ علیؑ نے عثمان کو قتل کرایا ہے لہٰذا ان کو خلافت سے معزول کر دو اور ان سے جنگ کرو، یہی ان کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ پس یہ حجت تو انہیں پر عائد ہوتی ہے کیونکہ ان کا قاتل عثمان ہونا بدیہی اور یقینی ہے لہٰذا مسلمانوں کو ان کے دعوے کے مطابق انہیں سے لڑنا چاہیے نہ کہ مجھ سے کہ میں تو بالکل علیحدہ رہا جس کو سب جانتے ہیں۔

۲؎ ''يَرْتَضِعُوْنَ اُمًّا الخ''۔ ''فَطْمٌ'' کہتے ہیں عورت کے بچہ سے دودھ چھڑا دینے کو اور یہ جملہ اس محل پر بولتے ہیں جہاں کوئی شخص ایسے امر کو حاصل کرنا چاہتا ہو جو فوت ہو چکا ہو اور اس کے اختیار میں باقی نہ رہا ہو جس طرح عورت دودھ چھڑانے کے بعد بچہ کو نہیں پلاتی۔ پس حضرتؑ کا مقصود یہ ہے کہ عثمان کے زمانہ میں بیت المال کا بے انداز مال جو طلحہ و زبیر وغیرہ کھائے جاتے تھے میرے خلیفہ ہونے سے وہ سب چھن گیا کیونکہ میں اس کو اصلی مستحقین تک پہنچاتا ہوں اور ان لوگوں کو محض حصہ رسدی ملتا ہے، لہٰذا یہ لوگ مجھ سے جنگ کر کے اور میرے معزول کرنے کے بعد اس طرح بیت المال کو کھانا چاہتے ہیں اور عثمان نے جس بدعت، خیانت اور غصب اموال و حقوق مسلمین کو قائم کیا تھا اس کو محو کر کے میں نے حکمِ خدا کے مطابق ان اموال کو تقسیم کرنا شروع کیا تو یہ لوگ اس محو شدہ بدعت کو پھر زندہ کرنا چاہتے ہیں۔

۳؎ مقصود طلحہ و زبیر و عائشہ اور ان کے ساتھ دینے والوں کی حقارت ہے۔ کہ ان لوگوں کی حقیقت کیا ہے اور سب مل کر کیا بنا لیں گے چنانچہ وہی ہوا کہ سب نے جنگ جمل میں شکست فاش کھائی اور حضرتؑ کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے۔

۴؎ حجت سے مراد خداوند عالم کا وہ حکم ہے جو بغاوت کرنے والوں کے متعلق کلام مجید میں یوں فرمایا ہے:

﴿فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ﴾

یعنی اگر مسلمانوں سے ایک فریق دوسرے سے بغاوت کرے تو تم اس سے لڑو یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع کرے۔ (سورۂ الحجرات، آیہ ۸۹)

لہٰذا مجھے خدا کی یہ حجت حاصل ہے یہ لوگ نہیں مانیں گے تو میں حکمِ خدا کے مطابق جہاد کروں گا، اس وقت ان کو سرکشی کا مزہ ملے گا۔

وَ نَاصِرًا لِّلْحَقِّ وَ مِنَ الْعَجَبِ بَعْثُهُمْ اِلَیَّ اَنْ اَبْرُزَ لِلطِّعَانِ! وَ اَنْ اَصْبِرَ لِلْجِلَادِ! هَبِلَتْهُمُ الْهَبُوْلُ. لَقَدْ كُنْتُ وَ مَآ اُهَدَّدُ بِالْحَرْبِ، وَ لَآ اُرَهَّبُ بِالضَّرْبِ، وَ اِنِّیْ لَعَلٰی یَقِیْنٍ مِّنْ رَّبِّیْ، وَ غَیْرِ شُبْهَةٍ مِّنْ دِیْنِیْ.

تو میں انہیں اپنی تلوار کی باڑھ پر رکھ لوں گا کہ وہی (ان کے مرض) باطل پرستی سے شفا دینے اور حق کی مدد کرنے کے لیے کافی ہے۔ اور ان کا میرے پاس یہ پیغام بھیجنا (بھی نہایت درجہ) عجیب ہے کہ میں (ان سے) جنگ کے لیے نکلوں اور کشت وخون پر آمادہ ہو جاؤں۔ ان کی مائیں انہیں کھو بیٹھیں۔ کیا میں بھی ایسا ہو گیا کہ کبھی جنگ سے دھمکایا اور (حرب وضرب) سے ڈرایا جاؤں؟ ہرگز نہیں [1] کیونکہ مجھے اپنے پروردگار پر کامل یقین ہے اور اپنے مذہب (کی حقیت) میں بھی مجھے ذرا برابر شبہ نہیں (پھر ان کی دھمکی مجھ پر کیا اثر کر سکتی ہے؟)۔ [2]

❁ خطبہ: ۲۴ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَیْهِ السَّلَامُ

اَمَّا بَعْدُ! فَاِنَّ الْاَمْرَ یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ كَقَطَرَاتِ الْمَطَرِ اِلٰی

خطبہ: ۲۴ (۲۳)

حضرت علیہ السلام کے ایک خطبہ کا کچھ حصّہ۔

امابعد (واضح ہو کہ رزق کے بارے میں خدا کا) حکم بارش کے قطروں کی طرح آسمان سے زمین پر ہر شخص کے پاس اس کی قسمت کے مطابق ہے۔ (کہ قسمت میں زیادہ

---

[1] علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں:

وَقَوْلُهٗ: لَقَدْ كُنْتُ وَ مَآ اُهَدَّدُ بِالْحَرْبِ مَعْنَاهُ مَا زِلْتُ لَا اُهَدَّدُ بِالْحَرْبِ وَالْوَاوُ زَائِدَةٌ وَ هٰذِهٖ كَلِمَةٌ فَصِیْحَةٌ كَثِیْرًا مَا تَسْتَعْمِلُهَا الْعَرَبُ وَ قَدْ وَرَدَ فِی الْقُرْآنِ الْعَزِیْزِ كَاَنَّ بِمَعْنٰی مَا زَالَ فِیْ قَوْلِهٖ ﴿ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَكِیْمًا ﴾ وَ نَحْوُ ذٰلِكَ مِنَ الْآیَةِ مَعْنٰی ذٰلِكَ لَمْ یَزُلِ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَكِیْمًا۔

یعنی حضرتؑ کے قول ''لَقَدْ كُنْتُ''، الخ کا معنی یہ ہے کہ شروع سے میں ایسا رہا کہ کوئی مجھ کو جنگ کی دھمکی نہیں دے سکتا، ''واؤ'' اس میں زائد ہے اور یہ ایک فصیح کلمہ ہے۔ عرب اس معنی میں کثرت سے استعمال کرتے ہیں اور قرآن مجید میں ''كَانَ'' بمعنی ''مَازَالَ'' وارد ہوا ہے چنانچہ ﴿كَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَكِیْمًا﴾ کے معنی یہ ہے کہ ''خدا ہمیشہ سے علیم و حکیم ہے۔''

[2] یعنی مجھے اپنے دین کے متعلق کوئی شبہ نہیں ہوا بلکہ یقین ہے کہ حق پر ہوں اور حقیقی اسلام کی اشاعت اور حفاظت کر رہا ہوں۔ لہٰذا مجھے اس کا بھی کامل یقین ہے کہ خدا میری طرف ہے اور میرا ساتھ نہیں چھوڑے گا۔

كُلِّ نَفْسٍ بِمَا قُسِمَ لَهَا مِنْ زِيَادَةٍ اَوْ نُقْصَانٍ، فَاِذَا رَاٰى اَحَدُكُمْ لِاَخِيْهِ غَفِيْرَةً فِيْ اَهْلٍ اَوْ مَالٍ اَوْ نَفْسٍ فَلَا تَكُوْنَنَّ لَهٗ فِتْنَةً، فَاِنَّ الْمَرْءَ الْمُسْلِمَ مَا لَمْ يَغْشَ دَنَآءَةً تَظْهَرُ فَيَخْشَعُ لَهَآ اِذَا ذُكِرَتْ، وَ تُغْرٰى بِهَا لِئَامُ النَّاسِ، كَانَ كَالْفَالِجِ الْيَاسِرِ الَّذِيْ يَنْتَظِرُ اَوَّلَ فَوْزَةٍ مِّنْ قِدَاحِهٖ تُوْجِبُ لَهُ الْمَغْنَمَ، وَ يُرْفَعُ بِهَا عَنْهُ الْمَغْرَمُ.

وَ كَذٰلِكَ الْمَرْءُ الْمُسْلِمُ الْبَرِيْٓءُ مِنَ الْخِيَانَةِ يَنْتَظِرُ مِنَ اللّٰهِ ﴿اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ﴾: اِمَّا دَاعِيَ اللّٰهِ فَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّهٗ، وَ اِمَّا رِزْقَ اللّٰهِ فَاِذَا هُوَ ذُوْ اَهْلٍ وَّ

ہے تو) زیادتی کے ساتھ اور (کم ہے تو) کمی کے ساتھ (غرض مختلف طور پر) نازل ہوتا ہے۔ تو جب تم میں سے کوئی شخص اپنے بھائی کی اولاد یا مال یا عزیزوں کی زیادتی دیکھے (تو یہ زیادتی) اس کے لیے فتنہ (حسد کی باعث) نہ ہو۔ کیونکہ مسلمان آدمی جب تک ایسی دنائت (حسد) نہ اختیار کرے گا جو (اگر) ظاہر ہو جائے تو اس کے ذکر کرتے وقت اس (حاسد) کو جھینپنا پڑے اور جس سے کمینہ لوگوں کو اس کی آبروریزی کا موقع ملے۔ اس وقت تک (وہ مسلمان آدمی) اس جیتنے والے قمار باز[1] کی طرح (کامیاب) رہے گا جو اپنے قمار بازی کے تیروں سے اس پہلی جیت کا انتظار کرتا ہے جس سے اس کو مالِ غنیمت حاصل اور اس کا خسارہ زائل ہو۔

اسی طرح خیانت سے بری مسلمان آدمی کو بھی خدا سے ان دو بھلائیوں سے کسی ایک کا انتظار (یقیناً) رہے گا۔ (اگر اس کی اجل آ گئی ہے تو) خدا کے (طرف) بلانے والے کا (جو ملک الموت ہے)، پس خدا کے یہاں جو نعمت ہے وہ اس کے لیے بہتر ہے اور (اگر زندگی باقی ہے تو) خدا کے رزق کا کہ اس وقت وہ صاحبِ اولاد و مال ہو جائے گا ایسی حالت میں کہ اس

---

[1] ''فَالِجٌ'' کے معنی کامیاب اور جیتنے والے کے ہیں اور ''یَاسِرٌ'' اس شخص کو کہتے ہیں جو تیروں سے جوا کھیلتا ہے اور عرب میں تیروں کے جوئے کا رواج بہت کثرت سے عرصہ دراز سے ہے۔ اس جملہ میں تقدیم و تاخیر ہے اصل تقدیر یوں تھی ''کَالْیَاسِرِ لْفَالِجِ'' اور یہ از باب تقدیم صفۃ بر موصوف سے ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے ﴿غَرَابِیْبُ سُوْدٌ﴾ (سورۂ فاطر، آیہ ۲۷)۔ اور حضرتؑ کے اس کلمہ کا حُسن یہ ہے کہ دونوں لفظ صفت ہیں اگرچہ ایک دوسرے پر مرتب ہے، پس مقصود یہ ہے کہ جو شخص ایسی دنائتِ حسد نہ اختیار کرے جو ظاہر ہو جائے تو اس کو نادم ہو کر شرمانا اور نظر نیچی کرنی پڑے اور جس کو کمینہ لوگ سن لیں تو اس حاسد کی مذمت اور پردہ دری کے درپے ہو کر اس کو فضیحت اور رسوا کرتے پھریں اس وقت تک وہ کامیاب قمار باز کے مثل ہوگا۔

مَالٍ، وَ مَعَهٗ دِيْنُهٗ وَ حَسَبُهٗ.

اِنَّ الْمَالَ وَ الْبَنِيْنَ حَرْثُ الدُّنْيَا، وَ الْعَمَلَ الصَّالِحَ حَرْثُ الْاٰخِرَةِ، وَ قَدْ يَجْمَعُهُمَا اللّٰهُ لِاَقْوَامٍ. فَاحْذَرُوْا مِنَ اللّٰهِ مَا

کا ایمان اور ذاتی شرف بھی اس کے ساتھ رہے گا۔[1]

غرض مال اور اولاد تو دنیا ہی کی کھیتی ہے اور آخرت کی کھیتی (صرف) نیک عمل ہے[2] اور خدا کبھی بعض قوموں کے لیے دونوں (دنیا اور آخرت کی نعمت) کو جمع بھی کر دیتا ہے۔ لہٰذا خدا نے جن چیزوں سے تم کو بچایا ہے ان سے بچو

---

[1] مقصود یہ ہے کہ قضا وقدر کے مطابق مال واولاد وغیرہ کا رزق آسمان سے اس طرح نازل ہوتا ہے جس طرح بارش کے قطرے گرتے ہیں کہ زمین کے ہر حصّہ پر بوندیں پہنچتی ہیں لیکن پراگندہ طور پر کہیں زیادہ ہوتی ہے کہیں کم۔ اسی طرح رزق ہر شخص کو پہنچتا رہتا ہے لیکن پراگندہ طور پر کہ اگر اس کی قسمت میں زیادہ لکھا گیا ہے تو زیادہ، کم لکھا گیا ہے تو کم۔ پھر حضرتؑ لوگوں کو دوسروں کی کثرت اولاد و مال وجاہ پر حسد کرنے سے منع کرنے کے لیے فرماتے ہیں کہ دوسروں کی کثرت اور فراوانی تم کو حاسد نہ کر دے کہ اس حسد سے تم فتنہ وفساد میں مبتلا ہو جاؤ گے اور تمہارے اعمال حسنہ ضائع ہو جائیں گے اور اگر حسد کی دنائت کو اختیار نہ کرو گے بلکہ صبر کرو گے اور تقدیر الٰہی پر راضی رہو گے تو خدا تم سے نہایت درجہ خوش ہوگا اور اس وقت تم اس قمار باز کے مثل ہو گے جو پہلے ہی کھیل میں جیت جاتا اور نفع حاصل کر لیتا ہے کہ یا تو اس کو نیا مال مل جاتا ہے یا جو مال اس کے پاس سے ضائع ہو چکا ہے وہ واپس آ جاتا ہے۔ اسی طرح تم کو بھی رضائے خدا پر راضی رہنے اور حسد نہ کرنے سے دو نیکیوں اور دو نعمتوں سے ایک ضرور حاصل ہوگی کہ اگر تمہاری وفات کا وقت قریب آ گیا ہے تو آخرت میں دو نعمتیں حاصل ہوں گی جس کی ادنیٰ نعمت تک بھی دنیا کی اعلیٰ سے اعلیٰ نعمت نہیں پہنچ سکتی اور اگر دنیاوی زندگی کا زمانہ ابھی باقی ہے تو یہاں کی دولت عزت وجاہ وجلال اور کثرت اولاد واعزا سب ہی حاصل ہوگی اور پہلے سے حسب ودین اور شرف فضل وکمال جو حاصل ہیں وہ علیحدہ ہیں۔ پس ہر قسم کی نعمت کے مالک رہو گے۔ غرض دونوں نعمتوں سے ایک ضرور ملے گی، یا دنیا کی نعمتیں یا آخرت کی کہ دونوں سے محروم نہیں ہو سکتے۔

[2] یہ اس آیہ مبارکہ سے ہے جو قرآن مجید میں ہے کہ:

﴿اَلْمَالُ وَ الْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ (سورہ الکھف، آیہ ۴۶)

کہ مال اور اولاد دنیاوی زندگی کی زینت ہیں''

دوسری آیت یہ ہے:

﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ﴾ (سورۂ الشوریٰ، آیہ ۲۰)

یعنی جو شخص آخرت کی زراعت چاہتا ہے خدا اس کی زراعت میں زیادتی عطا کرتا ہے اور جو شخص دنیا کی زراعت چاہتا ہے اس کو دنیا کی زراعت دیتا تو ہے لیکن اس کو پھر آخرت سے کوئی حصہ نہیں ملتا۔

حَذَّرَكُمْ مِّنْ نَّفْسِهٖ، وَ اخْشَوْهُ خَشْيَةً لَّيْسَتْ بِتَعْذِيْرٍ وَ اعْمَلُوْا فِيْ غَيْرِ رِيَآءٍ وَّ لَا سُمْعَةٍ، فَاِنَّهٗ مَنْ يَّعْمَلْ لِغَيْرِ اللّٰهِ يَكِلْهُ اللّٰهُ اِلٰى مَنْ عَمِلَ لَهٗ. نَسْئَلُ اللّٰهَ مَنَازِلَ الشُّهَدَآءِ، وَ مُعَايَشَةَ السُّعَدَآءِ، وَ مُرَافَقَةَ الْاَنْبِيَآءِ.

اَيُّهَا النَّاسُ! اِنَّهٗ لَا يَسْتَغْنِي الرَّجُلُ وَ اِنْ كَانَ ذَا مَالٍ عَنْ عَشِيْرَتِهٖ، وَ دِفَاعِهِمْ عَنْهُ بِاَيْدِيْهِمْ وَ اَلْسِنَتِهِمْ، وَ

اوراس سے ڈرتے رہو۔ایسا ڈرنا جس میں کوئی کمی اور تقصیر نہ ہو[1] اور بغیر (لوگوں کے) دکھانے اور سنانے (کی نیت) کے (صرف خدا کے لیے) عمل (عبادت) کرو کیونکہ جو شخص غیر خدا کے لیے عمل کرے گا اس کو خدا اسی کے سپرد کرے گا جس کے لیے وہ عمل کیا ہے۔(حالانکہ ہم لوگ خدا سے شہیدوں کے درجات اور نیک بختوں کی زندگی اور نبیوں کی رفاقت کے خواستگار ہیں۔(جو ریاکاری سے نہیں حاصل ہوسکتی)[2]

لوگو! کوئی شخص اگرچہ (کتنا ہی بڑا) مال دار ہو اپنے قوم وقبیلہ اور ان کے ہاتھ (پیر) اور زبانوں کی (اعانت) حفاظت ودفاع سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔(لہٰذا مال صرف کر کے ان کو قبضہ میں رکھنا چاہیے) کیونکہ وہی لوگ اس

---

[1] یعنی چاہیے کہ تم خدا سے اس طرح خوف رکھو اور ایسا شدید تقوی اختیار کرو جس سے زیادہ ممکن نہ ہو کہ خدا سے ڈرنے میں اپنی انتہائی کوشش اور تمام قوت صَرف کر دو اور جس میں کوئی کمی اور تقصیر نہ ہو کیونکہ خدا سے ڈرنا ایک عمل صالح ہے۔پس جو عمل اعلی درجہ کا نہ ہوگا اس کا ثواب اور اس کا درجہ بھی اعلی نہ ہوگا اور جس کو خدا کی کامل خشیت ہوگی اس کو دنیا وآخرت کی لاتعد ولاتحصٰی نعمتیں حاصل ہوں گی۔

[2] جب حضرتؑ دنائت حسد سے منع فرما چکے اور صبر کرنے اور قضا وقدرِ الٰہی پر راضی رہنے کا حکم دے چکے اور اس کے منافع کو بیان کر دیا تو اس کے بعد اعمال عبادت میں ریاکاری سے منع فرماتے ہیں اور دکھانے سنانے کی خرابیوں کو ارشاد کر رہے ہیں کیونکہ عمل عبادت وغیرہ میں ریاکاری کی بہت شدید مذمت اور سخت مذمت وارد ہوئی ہے کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ جو شخص لوگوں کے دکھانے سنانے کو عمل کرتا ہے وہ درحقیقت کوئی عمل اور عبادت نہیں ہے اس لیے کہ اس سے تقرب الی اللہ مقصود نہیں اور خوشنودی باری مطلوب نہیں بلکہ دوسروں کا خوش کرنا اور ان کی نظروں میں وقعت حاصل کرنا ہوتا ہے۔اسی مطلب کو حضرتؑ نے ایک دوسری حدیث میں یوں فرمایا ہے:

لَيْسَتِ الصَّلٰوةُ قِيَامَكَ وَ قُعُوْدَكَ اِنَّمَا الصَّلٰوةُ اِخْلَاصُكَ وَاِنْ تُرِيْدُ بِهِ اللّٰهَ وَحْدَهٗ۔

یعنی نماز حقیقت میں تمہارا اٹھنا بیٹھنا نہیں ہے بلکہ نماز تمہارا اخلاص ہے اور یہ کہ اس سے تمہاری غرض صرف قربت الی اللہ اور خوشنودی باری ہو نہ کچھ اور۔

هُمْ اَعْظَمُ النَّاسِ حِيْطَةً مِّنْ وَّرَآئِهٖ وَ اَلَمُّهُمْ لِشَعَثِهٖ، وَ اَعْطَفُهُمْ عَلَيْهِ عِنْدَ نَازِلَةٍ اِذَا نَزَلَتْ بِهٖ. وَ لِسَانُ الصِّدْقِ يَجْعَلُهُ اللّٰهُ لِلْمَرْءِ فِي النَّاسِ خَيْرٌ لَهٗ مِنَ الْمَالِ يُوَرِّثُهٗ غَيْرَهٗ.

[مِنْهَا]

اَلَا لَا يَعْدِلَنَّ اَحَدُكُمْ عَنِ الْقَرَابَةِ

کے پیچھے اس کی سب سے زیادہ ۱؎ حفاظت اور رعایت کرنے والے اور اس کی پریشانی کے سب سے بڑے دفع کرنے والے اور جب کوئی مصیبت نازل ہو تو اس پر سب سے زیادہ شفقت کرنے والے ہوتے ہیں۔ (علاوہ بریں انسان کا) وہ ذکرِ خیر ۲؎ جسے خدا لوگوں میں جاری رکھتا ہے اس کے اس مال سے کہیں بہتر ہے جسے وہ (شخص) دوسروں کے لیے چھوڑ جاتا ہے۔

[اور اسی خطبہ سے یہ بھی ہے]

خبردار ۳؎ تم میں سے کوئی شخص جب اپنے قرابت

۱؎ جناب ملا فتح اللہ کاشانی علیہ الرحمہ اس جملہ ''وَ هُمْ اَعْظَمُ النَّاسِ حِيْطَةً مِّنْ وَّرَآئِهٖ'' کے ترجمہ میں لکھتے ہیں جس کا ترجمہ اردو یہ ہے کہ ''یہ لوگ احتیاط کے اعتبار سے بزرگ ترین مردم ہیں'' اور بعض روایات میں کسرہ حا اور سکون یاء سے واقع ہے جس سے یہ معنی ہوا کہ وہ اعزّا و اقربا اس کے پیچھے حفاظت اور رعایت کے اعتبار سے بزرگ ترین مردم ہیں یعنی اس کے غیبت کے زمانہ میں یہی لوگ اس کے مال کے حافظ رہتے ہیں اور تمام ممکن احتیاط کے ساتھ اس کے نگہبان رہتے ہیں۔

۲؎ ''لِسَانُ الصِّدْقِ يَجْعَلُهٗ'' الخ کسی شخص کے لسان الصدق سے یہ مقصود ہے کہ لوگ اس کو اچھے نام سے یاد کریں اور اس کی مدح وثنا کریں۔ چنانچہ کلام مجید میں حضرت ابراہیمؑ کی دعا ہے:

﴿ وَ اجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴾ (سورہ الشعراء، آیہ ۸۴)

یعنی آئندہ آنے والی نسلوں میں میرا ذکرِ خیر جاری رکھ۔

۳؎ جب حضرتؑ جود وسخا اور اس سے انسان کو جو ذکرِ خیر اور مدح وثنا حاصل ہوتی ہے اس کے فضائل ومنافع بیان فرما چکے اور مالداروں کے اعزّا و اقربا کی اہمیت اور ان کے فوائد ذکر کر چکے تو اب بیان مذکور کی غرض وغایت بیان فرماتے ہیں کہ جب تم لوگوں کو معلوم ہو چکا کہ تم لوگوں کے اعزّا و اقربا تمہارے کن کن وقتوں میں کام آسکتے ہیں اور تم لوگوں کو ان سے کیسی کیسی مدد مل سکتی ہے اور یہ بھی تم لوگوں کو معلوم ہو چکا کہ اگر بخل کو راہ دے کر تم لوگ اپنا مال بچاؤ گے اور اعزا کی مدد نہ کرو گے تو وہ مال تمہارے کام نہیں آئے گا کیونکہ تمہارے مرنے کے بعد اس سے دوسروں کو نفع پہنچے گا۔ برخلاف اس کے اگر اپنے اعزا اور احباب میں صرف کرو گے یا خدا کی راہ میں خرچ کرو گے تو تمہارا نام روشن ہوگا اور تمہارے مرنے کے بعد بھی لوگ تمہارا ذکرِ خیر کرتے رہیں گے اور تمہاری خوبیوں اور احسانات کو یاد کر کے تم پر رحمتِ خدا کے نازل ہونے کی دعا کریں گے۔ لہٰذا اپنے مالوں کو اپنے اعزا کی حاجتوں میں خرچ کرو اور وہ لوگ فقر وفاقہ سے ہوں تو ان کو مصیبتوں سے نجات دو کیونکہ بہت حقیر رقم سے ان کا تو فاقہ ٹوٹ جائے گا اور ان کی احتیاج جاتی رہے گی اور (بقیہ صفحہ مابعد)

يَرٰى بِهَا الْخَصَاصَةَ اَنْ يَّسُدَّهَا بِالَّذِىْ لَا يَزِيْدُهٗ اِنْ اَمْسَكَهٗ وَ لَا يَنْقُصُهٗ اِنْ اَهْلَكَهٗ، وَ مَنْ يَّقْبِضْ يَدَهٗ عَنْ عَشِيْرَتِهٖ، فَاِنَّمَا تُقْبَضُ مِنْهُ عَنْهُمْ يَدٌ وَّاحِدَةٌ، وَ تُقْبَضُ مِنْهُمْ عَنْهُ اَيْدٍ كَثِيْرَةٌ، وَ مَنْ تَلِنْ حَاشِيَتُهٗ يَسْتَدِمْ مِنْ قَوْمِهِ الْمَوَدَّةَ.

مندوں کو فقر و فاقہ میں مبتلا دیکھے تو ان کو وہ (حقیر) مال خرچ کر کے فاقہ سے بچانے سے باز نہ رہے، جس کو اگر روک رکھے گا تو اس (کی دولت) کو زیادہ نہ کرے گا اور اگر ضائع کر دے گا تو اس کو کم نہ کرے گا (پھر کیوں نہ اپنے عزیزوں پر احسان کرے)۔ اور جو شخص اپنی قوم سے اپنا دستِ (کرم) روک لیتا ہے تو ان سے (اس کا) ایک ہی ہاتھ رکتا ہے لیکن (اس کے عوض) اس شخص سے ان لوگوں کے بہت سے ہاتھ رک جاتے ہیں۔ اور جس شخص کا پہلو نرم رہتا ہے (یعنی جو اپنے اعزّا پر احسان کرتا رہتا ہے) اس پر اس کی قوم ہمیشہ فدا رہتی ہے۔

(قَالَ الشَّرِيْفُ الرَّضِىُّ رَحِمَهُ اللّٰهُ) اَقُوْلُ: «الْغَفِيْرَةُ» هٰهُنَا الزِّيَادَةُ وَ الْكَثْرَةُ مِنْ قَوْلِهِمْ لِلْجَمْعِ الْكَثِيْرِ: اَلْجَمُّ الْغَفِيْرُ، وَ الْجَمَّآءُ الْغَفِيْرُ، وَ يُرْوٰى عَفْوَةٌ مِّنْ اَهْلٍ اَوْ مَالٍ، وَ الْعَفْوَةُ الْخِيَارُ مِنَ الشَّيْءِ، يُقَالُ: اَكَلْتُ عَفْوَةَ الطَّعَامِ اَىْ: خِيَارَهٗ.

(جناب سید رضی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ) میں کہتا ہوں کہ ''الْغَفِيْرَةُ'' (یہاں بمعنی) زیادتی اور کثرت ہے جو ان (اہل عرب) کے اس قول سے ماخوذ ہے جو بڑی جماعت کو کہتے ہیں ''اَلْجَمُّ الْغَفِيْرُ'' اور ''الْجَمَّآءُ الْغَفِيْرُ'' اور بعض راویوں نے (بجائے غَفِيْرَةٌ فِىْ اَهْلٍ اَوْ مَالٍ کے) عَفْوَةٌ مِنْ اَهْلٍ اَوْ مَالٍ بیان کیا ہے اور ''عَفْوَةٌ'' کسی چیز کے عمدہ اور پسندیدہ حصّہ کو کہتے ہیں۔ چنانچہ بولتے ہیں ''اَكَلْتُ عَفْوَةَ الطَّعَامِ'' یعنی میں نے پسندیدہ اور عمدہ کھانا کھایا۔

وَ مَآ اَحْسَنَ الْمَعْنَى الَّذِىْ اَرَادَهٗ عليه السلام

اور کیا اعلیٰ (لطیف اور حکمت میں ڈوبا ہوا) مضمون حضرت علیہ السلام نے اپنے اس قول ''جو شخص اپنا دستِ کرم اپنی

(بقیہ صفحہ مابعد) تمہاری دولت میں اس سے کوئی کمی نہ ہوگی کہ بڑی دولت کا جزوی حصّہ صرف ہونے سے معلوم بھی نہیں ہوتا کہ کس رقم سے یہ مقدار نکلی اور کہاں گئی۔ برخلاف اس شخص کے جس کے پاس وہ رقم پہنچتی ہے کہ صرف اس رقم سے اس کی جان بچ جاتی اور عزّت محفوظ رہ جاتی ہے۔

بِقَوْلِهٖ: »وَ مَنْ يَّقْبِضُ يَدَهٗ عَنْ عَشِيْرَتِهٖ« اِلٰى تَمَامِ الْكَلَامِ، فَاِنَّ الْمُمْسِكَ خَيْرَهٗ عَنْ عَشِيْرَتِهٖ اِنَّمَا يُمْسِكُ نَفْعَ يَدٍ وَّاحِدَةٍ فَاِذَا احْتَاجَ اِلٰى نُصْرَتِهِمْ وَ اضْطَرَّ اِلٰى مُرَافَدَتِهِمْ قَعَدُوْا عَنْ نَّصْرِهٖ، وَ تَثَاقَلُوْا عَنْ صَوْتِهٖ، فَمُنِعَ تَرَافُدَ الْاَيْدِى الْكَثِيْرَةِ وَ تَنَاهُضَ الْاَقْدَامِ الْجَمَّةِ.

قوم سے روک لیتا ہے'' تا آخر میں ادا فرمایا ہے۔ کیونکہ جو بخیل شخص اپنے قوم وقبیلہ سے اپنا نفع اور احسان روک رکھتا ہے وہ ان سے صرف ایک ہاتھ کا نفع روکتا ہے (کیونکہ وہ تنہا ہے) لیکن جب ان لوگوں کی مدد کا محتاج اور (ان کی خدمت اور) اعانت کے لیے مضطر ہوتا ہے تو وہ (قوم وقبیلہ کے لوگ) اس کی مدد کرنے سے باز رہتے اور اس کی آواز سے بہرے بن جاتے ہیں، پس وہ (اپنے کاموں میں) بہت سے ہاتھوں کی مدد کرنے اور (اپنی خدمت ونصرت) میں بہت سے قدموں کے اُٹھنے سے محروم رہ جاتا ہے۔

❁ خطبہ :۲۵ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

وَلَعَمْرِىْ مَا عَلَىَّ مِنْ قِتَالِ مَنْ خَالَفَ الْحَقَّ، وَ خَابَطَ الْغَىَّ مِنْ اِدْهَانٍ وَ لَآ اِيْهَانٍ، فَاتَّقُوا اللّٰهَ عِبَادَ اللّٰهِ، وَ فِرُّوْا اِلَى اللّٰهِ مِنَ اللّٰهِ

خطبہ:۲۵(۲۴)

حضرت علیہ السلام کے ایک خطبہ کا کچھ حصہ۔[1]

(میں) اپنی قسم (کھا کر کہتا ہوں کہ) جو لوگ حق کے مخالف اور گمراہی میں اچھی طرح مبتلا ہیں میں نے ان سے جہاد کرنے میں کسی قسم کی نرمی اور سستی نہیں کی (اور نہ کبھی کروں گا)۔[2] پس بندگانِ خدا! تم لوگ خدا سے ڈرو اور

---

[1] اس خطبہ میں حضرتؑ جہاد میں اپنے ثابت قدم رہنے کا اظہار فرماتے ہیں اور رَدّ فرماتے ہیں اس شخص کے قول کی جو حضرتؑ کے نرمی اور مداہنہ کا قائل ہے اور لوگوں کو خدا کی نافرمانی سے خوف دلاتے اطاعت کی ترغیب وتحریص فرماتے ہیں۔

[2] ''اِدْهَانٍ''، دل کے خلاف بات ظاہر کرنا، منافقت کی چال اختیار کرنا، جہاں سختی چاہیے وہاں ظاہری مصلحتوں کے موافق نرمی کرنا اور اپنے ذاتی منافع کا لحاظ کر کے حقیقی برتاؤ کے خلاف عمل کرنا۔ کلام مجید میں ہے ﴿ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ﴾ (سورۂ القلم، آیہ ۹) ''وہ لوگ چاہتے ہیں کہ اگر نرمی تم کرو تو وہ بھی نرم ہو جائیں''۔ اور ''اِيْهَانٌ''، سست کرنا، پس مقصود یہ ہے کہ میں امورِ دین میں مداہنہ اور چشم پوشی کیونکر کر سکتا ہوں اس لیے کہ جو لوگ حق کی مخالطت اور ضلالت و باطل کی مباشرت ومخالفت پر آمادہ بلکہ اس میں مبتلا ہیں ان سے جہاد کرنا واجب ہے، ویسا ہی واجب جیسے دوسرے واجبات جس کی تعمیل ضروری ہے اور جس کو ترک نہیں کیا جا سکتا۔

وَ امْضُوْا فِی الَّذِیْ نَهَجَهٗ لَكُمْ، وَ قُوْمُوْا بِمَا عَصَبَهٗ بِكُمْ، فَعَلِیٌّ ضَامِنٌ لِّفَلْجِكُمْ اٰجِلًا، اِنْ لَمْ تُمْنَحُوْهُ عَاجِلًا.

(غضب) خدا سے بھاگ کر (رحمت) خدا کی پناہ میں آجاؤ اور اس نے جو راہ تمہارے لیے کشادہ کر دی ہے اسی پر چلو اور جو امر تم پر لازم کر دیا ہے اس کی پابندی کرو کہ (ایسا کرنے سے) اگر تم کو فوری (دنیاوی) کامیابی نہ عطا ہوگی تو علیؑ تمہاری آئندہ (اُخروی (فلاح) کا ذمّہ دار ہے۔[1]

❁ خطبہ :۲۶ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَیْهِ السَّلَامُ

وَ قَدْ تَوَاتَرَتْ عَلَیْهِ الْاَخْبَارُ بِاِسْتِیْلَآءِ اَصْحَابِ مُعَاوِیَةَ عَلَى الْبِلَادِ وَ قَدِمَ عَلَیْهِ عَامِلَاهُ عَلَى الْیَمَنِ وَ هُمَا عُبَیْدُ اللّٰهِ بْنُ عَبَّاسٍ وَّ

خطبہ:۲۶(۲۵)

حضرت علیہ السلام کے ایک خطبہ کا کچھ حصّہ۔

جب حضرتؑ کو اپنے شہروں پر اصحاب معاویہ کے غالب آتے [2] جانے کی پے در پے خبریں پہنچیں [3] اور حضرتؑ کے دونوں حاکم یمن یعنی عبید اللہ بن عباس اور سعید بن نمران (معاویہ کے سردار فوج) بُسر بن ارطاۃ سے

---

[1] حضرتؑ نے تین شرطیں اپنے ذمہ داری کی فرمائی ہیں پہلی یہ کہ خدا سے ڈرو کہ بغیر خوفِ الٰہی انسان نہ کوئی نیک عمل کر سکتا ہے اور نہ کسی بد عمل سے بچ سکتا ہے، پس تقویٰ ہر امرِ عبادت کے لیے شرط ہے۔ دوسرے یہ کہ خدا کی نافرمانی اور اپنے نفس پرستی سے علیحدہ ہو کر خدا کی رحمت کی طرف آؤ کہ اس سے اپنے گزشتہ گناہوں سے توبہ کرو اور اس کی رحمت اور مغفرت کا سوال کرو کہ وہ غفار اور ارحم الراحمین ہے تم کو اپنی رحمت میں داخل کر لے گا۔ تیسرے یہ کہ جس چیز سے منع کیا ہے اس سے ہمیشہ پرہیز کرو کہ یہ تین صورتیں اختیار کر لو گے تو خدا کی رحمت دنیا ہی میں تم پر نازل ہونے لگے گی اور اگر دنیا میں تم کو کامیابی نہیں ہوئی تو آخرت میں ضرور ہوگی جس کے لیے میرا ذمہ ہے۔

[2] اس خطبہ کے متعلق علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں ''جنگ صفین سے فارغ ہونے اور قضیہ حکمین و خوارج کے ختم ہونے کے بعد حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے اس خطبہ کو ارشاد فرمایا اور یہ حضرتؑ کہ آخری خطبوں سے ہے۔

[3] بلاد عرب پر معاویہ کے لشکروں کے تسلط حاصل کرتے جانے کی وجہ مشہور ہے یعنی اس کی باطل پرستی اور حضرت امیر المومنینؑ کی حق پرستی۔ کیونکہ حضرتؑ انصاف اور احکامِ خدا سے ذرا بھی تجاوز نہیں کرتے تھے خواہ اس سے حضرتؑ کے ساتھی کتنا ہی ناراض ہوتے اور آپ کا جس قدر بھی نقصان ہوتا۔ اس کے بالکل برعکس معاویہ کی حالت تھی کہ مجسم حیلہ و مکر اور کید و فریب تھا۔ اپنے ترقی اور عروج کے لیے ہر برے سے برے امر کو واجب جانتا اور اپنی کامیابی کے لیے ہر ظلم کو روا رکھتا، جس ہونہار آدمی کو دیکھتا بکثرت مال دے کر اسے ملا لیتا تھا اور خاندان بنی ہاشم سے لوگوں کو مخالف کرنے کے لیے اپنے خزانوں کا منہ کھول رکھا تھا۔

سَعِيْدُ بْنُ نُمْرَانَ لَمَّا غَلَبَ عَلَيْهِمَا بُسْرُ بْنُ اَبِيْ اَرْطَاةَ، فَقَامَ عليه السلام عَلَى الْمِنْبَرِ ضَجِرًا

مغلوب ہو کر آپؑ کی خدمت میں بھاگ آئے۔[1] تو حضرتؑ اپنے لشکر کے جان چُرانے اور (ہر امر میں) آپؑ

---

[1] بُسر بن ارطاۃ کے حجاز اور یمن پر تسلط حاصل کرنے کی کیفیت علامہ ابن ابی الحدید وغیرہ نے بہت طویل لکھی ہے لہٰذا یہاں تاریخ کامل سے اس کا واقعہ درج کیا جاتا ہے۔ مؤرخ مذکور ۴۰ھ کے واقعات میں لکھتا ہے کہ ''حکمین کے فیصلہ سنانے کے بعد ۴۰ھ میں معاویہ نے بسر بن ارطاۃ کو حجاز کی طرف بھیجا۔ وہ مدینہ میں پہنچا تو حضرت علیؑ کے حاکم مدینہ ابوایوب انصاری وہاں سے بھاگ کر کوفہ حضرت علیؑ کے پاس چلے آئے۔ بسر مدینہ میں داخل ہو کر منبر پر گیا اور کہا ''اگر مجھے ممانعت نہ ہوتی تو آج میں کسی بالغ شخص کو بھی اس شہر میں زندہ نہ چھوڑتا۔ جس پر اہل مدینہ نے اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی پھر بھی بسر نے مدینہ کے بہت سے مکانات منہدم کرا دیے۔ وہاں سے مکہ آیا اور وہاں بھی لوگوں سے جبراً بیعت لی۔ وہاں سے یمن آیا جہاں حضرت علیؑ کی طرف سے عبید اللہ بن عباس حاکم تھے پس عبید اللہ، بُسر کی شقاوت اس کے ظلم اور سفا کی سے خوفزدہ ہو کر بھاگے اور کوفہ میں حضرت علیؑ کے پاس چلے آئے۔

بُسر وہاں پہنچا تو بہت سے لوگوں کو قتل کیا جن میں عبید اللہ بن عباس کے دو نہایت کمسن بچے بھی تھے باوجودیکہ یمن کی ہر عورت اور مرد سینہ پیٹتا رہا لیکن بُسر نے ان دونوں بچوں کو ذبح کر ڈالا۔ اس کی خبر حضرت علیؑ کو معلوم ہوئی تو ایک شخص جاریہ کو دو ہزار سواروں کے ساتھ بسر کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ جاریہ چلے تو نجران میں بسر کے لوگوں سے مٹھ بھیڑ ہوئی لیکن بسر بھاگ کھڑا ہوا جاریہ میں طرفداران بنی امیہ سے بہت سے لوگوں کو قتل کیا، پھر بسر کا تعاقب کیے ہوئے مکہ تک آئے وہاں معاویہ کے پیروؤں پر فتح حاصل کر کے ان سے حضرت علیؑ کی بیعت لی پھر مدینہ آئے۔ وہاں ابو ہریرہ معاویہ کی طرف سے نیا والی مقرر ہوا تھا وہ جاریہ کو دیکھ کر بھاگا۔ جاریہ نے وہاں والوں سے حضرت علیؑ کے لیے بیعت لی، پھر کوفہ میں واپس آئے کیونکہ بسر ایسا بھاگا کہ اس کا پتہ نہ لگا بسر کے فرزندان عبید اللہ بن عباس کو ذبح کرنے سے ان دونوں کی ماں پاگل ہوگئی اور ہمیشہ جلسوں میں ان دونوں کو ڈھونڈا کرتی تھی۔ جب حضرت امیر المومنینؑ کو بسر کے اس شقاوت کی خبر معلوم ہوئی تو بے حد بیتاب ہوئے اور بسر کے لیے بددعا کی اور فرمایا:

اَللّٰهُمَّ اسْلُبْهُ دِيْنَهٗ وَ عَقْلَهٗ، فَاَصَابَهٗ ذٰلِكَ، وَ فَقَدَ عَقْلُهٗ، فَكَانَ يَهْذِيْ بِالسَّيْفِ وَ يَطْلُبُهٗ، فَيُؤْتٰى بِسَيْفٍ مِّنْ خَشَبٍ، وَ يُجْعَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ زِقٌّ مَّنْفُوْخٌ، فَلَا يَزَالُ يَضْرِبُهٗ وَ لَمْ يَزَلْ كَذٰلِكَ حَتّٰى مَاتَ۔

یعنی فرمایا: بارالٰہا بسر کے دین اور عقل کو سلب کر لے، پس فوراً یہ دعا مقبول ہوئی کہ اس کی عقل زائل ہوگئی اور یہ حالت پہنچی کہ تلوار گھما تا رہتا اور اسی کو لوگوں سے طلب کرتا پس لوگ اس کو لکڑی کی ایک تلوار دے دیتے اور ہوا بھر کر ایک مشک اس کے سامنے رکھ دیتے، پس وہ آدمی سمجھ کر اسے مارا کرتا یہاں تک کہ اسی حالت میں مر گیا۔ (از تاریخ کامل مطبوعہ مصر ج ۳، ص ۱۵۳)

لیکن صاحب نصائح کافیہ نے لکھا ہے کہ بسر بن ارطاۃ نے فرزندان عبید اللہ بن عباس کو ماں کی گود میں ذبح کیا جس پر وہ عورت مجنوں ہوگئی۔ علامہ ابن ابی الحدید بسر کی صفت میں لکھتے ہیں:

وَكَانَ قَاسِيَ الْقَلْبِ فَظًّا سَفَّاكًا لِلدِّمَاءِ، لَا رَعْفَةَ عِنْدَهٗ وَلَا رَحِمَهٗ۔

یعنی بسر نہایت درجہ شقی القلب، ظالم اور بڑا خونخوار تھا، اس میں رحمت نام کو بھی نہیں تھی۔

بِتَثَاقُلِ اَصْحَابِهٖ عَنِ الْجِهَادِ وَ مُخَالَفَتِهِمْ لَهٗ فِي الرَّاْيِ، فَقَالَ:

کی رائے کی مخالفت کرنے سے تنگ دل ہوکر منبر پر تشریف لے گئے اور فرمایا:

مَا هِيَ اِلَّا الْكُوْفَةُ، اَقْبِضُهَا وَ اَبْسُطُهَا

(حقیقت یہ ہے کہ اب) کوفہ کے سوا کوئی (شہر میرے قبضہ میں) نہیں ہے۔ اسی کو میں (اچھی طرح) کھول اور بند کرسکتا ہوں (یعنی اسی پر میرا پورا اختیار ہے) (پس کوفہ!)

اِنْ لَّمْ تَكُوْنِيْ اِلَّآ اَنْتِ، تَهُبُّ اَعَاصِيْرُكِ،

اگر (واقعًا میرے قبضہ میں) تیرے سوا کوئی (شہر) نہ رہا (اور تیری بھی یہ حالت ہے کہ) تجھ میں (میری مخالفت کے) بگولے بلند ہوتے رہتے ہیں تو خدا تیرا بھی برا کرے۔ [1]

فَقَبَّحَكِ اللّٰهُ!.

[وَ تَمَثَّلَ بِقَوْلِ الشَّاعِرِ]

[پھر شاعر کا ایک شعر بطور مثل پڑھا جس کا ترجمہ یہ ہے]

لَعَمْرُ اَبِيْكَ الْخَيْرِ يَا عَمْرُو اِنَّنِيْ
عَلٰى وَضَرٍ مِّنْ ذَا الْاِنَآءِ قَلِيْلِ

عمرو! میں تیرے اچھے باپ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھے اس ظرف سے تھوڑی سی میل (کے سوا کوئی چیز نہیں) حاصل ہوئی۔ [2]

---

[1] یعنی میرے باقاعدہ قبضہ میں سوائے کوفہ کے کوئی شہر نہیں کیونکہ اسی میں میں ہوں دوسرے شہروں میں وہ لوگ ہیں جو جہاد سے جان چراتے اور میری رائے سے مخالفت کرتے ہیں، پس میرا اختیار صرف اسی میں ہے جس پر میں اس طرح تصرف کرسکتا ہوں جس طرح ہر شخص اپنے لباس پر تصرف کرتا ہے کہ جب چاہا اسے کھول دیا جب چاہا باندھ دیا۔ پھر کوفہ کی طرف خطاب کرکے فرمایا کہ ''کوفہ میرے قبضہ میں تیرے سوا کوئی شہر نہ رہا تو تیری بھی مجھے ضرورت نہیں کیونکہ گو تجھ پر مجھے پورا اختیار ہے لیکن کس کام کا کیونکہ تیرے رہنے والے میری بات تک نہیں مانتے، دشمن سے مقابلہ نہیں کرتے، آرام طلب اور نفس پرست ہیں''۔ حضرتؑ نے کوفہ کے لوگوں کی مخالفت اور پراگندگی کو بگولوں سے تشبیہ دی ہے کیونکہ جس طرح بگولا خاک اڑاتا اور زمین کو فاسد کرتا ہے اسی طرح کوفہ والوں کی مخالفت اور پراگندگی طوفان اُٹھا رہی تھی اور وہاں کے رہنے والوں کو اذیت اور ذلت کا سامان باہم پہنچا رہی تھی۔

[2] یعنی جس طرح برتن میں کھانے کے بعد روغن کی دہنیت رہ جاتی ہے جو نہ کسی کا پیٹ بھر سکتی ہے نہ کسی زبان کو اس سے مزہ مل سکتا ہے، اسی طرح میری اور کوفہ کی حالت ہے کہ اس سے بھی مجھے کوئی نفع نہیں کیونکہ اس کے باشندے نافرمان اور بزدل ہونے سے محض ناکارہ ہیں۔ پس اس شعر سے تشبیہ دینے کی وجہ کوفہ کی ذلت اور حقارت اور ان کا بے مصرف محض ہونا ہے۔ علامہ ابن ابی الحدید اپنے شیخ ابو عثمان الجاحظ سے ناقل ہیں کہ اس نے عراق والوں کے متعلق بیان کیا کہ

وَمَا زَالَ الْعِرَاقُ مَوْصُوفًا اَهْلَهٗ بِقِلَّةِ الطَّاعَةِ وَ بِالشِّقَاقِ عَلٰى اُوْلِي الرِّيَاسَةِ۔ یعنی کوفہ کی ہمیشہ یہی حالت رہی ہے کہ اس کے باشندے بہت کم مطیع ہوتے اور برابر اپنے سرداروں سے مخالفت کرتے رہتے تھے۔

(بقیہ صفحہ مابعد)

[ثُمَّ قَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ]

اُنْبِئْتُ بُسْرًا قَدِ اطَّلَعَ الْيَمَنَ وَ اِنِّیْ وَاللّٰهِ! لَاَظُنُّ اَنَّ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمَ سَيُدَالُوْنَ مِنْكُمْ بِاجْتِمَاعِهِمْ عَلٰى بَاطِلِهِمْ، وَ تَفَرُّقِكُمْ عَنْ حَقِّكُمْ، وَ بِمَعْصِيَتِكُمْ اِمَامَكُمْ فِی الْحَقِّ، وَ طَاعَتِهِمْ اِمَامَهُمْ فِی الْبَاطِلِ، وَ بِاَدَآئِهِمُ الْاَمَانَةَ اِلٰى صَاحِبِهِمْ وَ خِيَانَتِكُمْ، وَ بِصَلَاحِهِمْ فِیْ بِلَادِهِمْ وَ فَسَادِكُمْ، فَلَوِ ائْتَمَنْتُ اَحَدَكُمْ عَلٰى قَعْبٍ لَّخَشِيْتُ اَنْ يَّذْهَبَ بِعِلَاقَتِهٖ.

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ قَدْ مَلِلْتُهُمْ وَ مَلُّوْنِیْ، وَ سَئِمْتُهُمْ وَ سَئِمُوْنِیْ، فَاَبْدِلْنِیْ بِهِمْ خَيْرًا مِّنْهُمْ، وَ اَبْدِلْهُمْ بِیْ شَرًّا مِّنِّیْ، اَللّٰهُمَّ مِثْ

[پھر فرمایا]

مجھے خبر ملی ہے کہ بُسر یمن تک پہنچ گیا اور مجھے تو بخدا اندیشہ ہے کہ تمہاری تمام بقیہ دولت پر بھی یہ لوگ بہت جلد قابض ہوا چاہتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ لوگ اپنے باطل تک پر مجتمع (اور متفق) ہیں اور تم لوگ اپنے حق سے (بھی مختلف اور) متفرق ہو (یعنی ان لوگوں میں ہر امر میں اتفاق واتحاد اور تم لوگوں میں اختلاف وافتراق ہے) اور تم لوگ امر حق تک میں اپنے امام کی (یعنی میری) نافرمانی کرتے ہو اور وہ لوگ امر باطل میں بھی اپنے سردار (معاویہ) کی (پوری) اطاعت کرتے ہیں۔ اور (اسی طرح) وہ لوگ اپنے سردار کی امانت اس تک پہنچا دیتے ہیں اور تم لوگ خیانت کرتے ہو۔ اور وہ لوگ اپنے شہروں میں (امن و) صلاح قائم رکھتے ہیں اور تم لوگ فساد کرتے رہتے ہو۔ یہاں تک کہ اگر میں ایک لکڑی کا پیالہ بھی تم سے کسی کے پاس امانت رکھوں تو خوف ہے کہ وہ اسے (دستہ یا) ڈوری سمیت غائب کر دے۔

بارالہا میں تو اب ان سے عاجز آ گیا اور یہ مجھ سے عاجز آ گئے۔ اور میں ان سے اکتا گیا اور یہ مجھ سے اکتا گئے تو اب ان کے عوض ان سے اچھے لوگ مجھے اور میرے عوض مجھ سے بدتر (سردار) انہیں عطا فرما۔[1] اور بارالہا

(بقیہ صفحہ ماقبل) چنانچہ اس کے بعد اپنے دعوے کے شاہد میں حجاج بن یوسف ثقفی کے چند خطبے بھی نقل کیے ہیں جنہیں اس نے اپنی گورنری عراق کے زمانہ میں اہل عراق کی مذمت میں بیان کیا تھا۔

[1] علامہ فتح اللہ کاشانی لکھتے ہیں کہ حضرتؑ نے اپنے ساتھیوں کے حق میں یہ دعا اس سبب سے کی کہ آپ کو یقین ہو گیا تھا کہ اب اس قوم غدار و مکار کی اصلاح نہیں ہو سکتی جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کی ہدایت سے مایوس ہو کر یہ دعا کی تھی (بقیہ صفحہ مابعد)

قُلُوْبَهُمْ كَمَا يُمَاثُ الْمِلْحُ فِي الْمَآءِ. اَمَا وَاللّٰهِ! لَوَدِدْتُّ اَنَّ لِيْ بِكُمْ اَلْفَ فَارِسٍ مِّنْ بَنِيْ فِرَاسِ بْنِ غَنْمٍ:

ان کے دلوں کو اس طرح گھلا (کر مٹا) دے جس طرح پانی میں نمک گھل جاتا ہے۔[1] سنو بخدا مجھے یہ پسند ہے کہ تم سب کے عوض مجھے صرف ہزار سوار قبیلہ بنی فارس بن غنم کے مل جائیں۔[2]

هُنَالِكَ، لَوْ دَعَوْتَ، اَتَاكَ مِنْهُمْ فَوَارِسُ مِثْلُ اَرْمِيَةِ الْحَمِيْمِ۔

(ترجمہ شعر جسے حضرتؑ نے اس موقع پر بطور مثل پڑھا) اگر تو (ان کو) پکارے گا تو اس وقت تیرے پاس ان کے ایسے سوار آ پہنچیں گے جو موسم گرما کی طرح (تیز رفتار) ہیں۔

ثُمَّ نَزَلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ مِنَ الْمِنْبَرِ۔

اس قدر فرما کر حضرتؑ منبر سے اتر آئے۔

(قَالَ الشَّرِيْفُ الرَّضِيُّ رَحِمَهُ اللّٰهُ) اَقُوْلُ:

(جناب سید رضی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں) میں کہتا

(بقیہ صفحہ ماقبل) ﴿ وَ لَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا تَبَارًا﴾ (سورۂ نوح، آیہ ۲۸) ''کہ ''بار الٰہا! ان لوگوں کی بس تباہی کو زیادہ کرتا رہ''۔ اور علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں ''حضرتؑ کا مقصود واقعاً یہ نہیں ہے کہ ان میں بھی اچھائی ہے اور مجھے ایسے لوگ ان کے عوض دے جن میں ان سے زیادہ اچھائی ہو اور نہ یہ کہ مجھ میں بھی برائی ہے اور انہیں ایسا شخص میرے عوض دے جس میں مجھ سے زیادہ برائی ہو بلکہ مقصود صرف اچھائی اور برائی ہے۔ یعنی یہ لوگ برے ہیں ان کے عوض مجھے اچھے لوگوں کو دے اور میں اچھا ہوں لیکن یہ لوگ میری قدر نہیں کرتے پس میرے عوض ان کو برا اور شریر سردار دے۔

[1] یعنی ان کے دل کو اس طرح پگھلا دے جس طرح نمک پانی میں گھل جاتا ہے کہ پھر اس کا کچھ بھی اثر نظر نہیں آتا، اسی طرح ان کے دل کی قوت حساس بھی بالکل زائل ہو جائے جس کے بعد یہ لوگ مثل جمادات کے ہو جائیں گے کیونکہ جب دل ہی نہ رہے گا تو انسانیت کیا باقی رہ سکتی ہے۔ علامہ کاشانی اس پر لکھتے ہیں۔ مشہور ہے کہ جس وقت حضرتؑ نے یہ بددعا کی تھی اسی وقت حجاج بن یوسف اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا جو بڑا ہو کر اہل کوفہ پر حاکم مقرر ہوا اور اس قدر وہاں کے لوگوں پر ظلم وستم کیا کہ سب کے سب ہلاک ہو گئے اور کوفہ ایسا عظیم الشان شہر ویران ہو کر رہ گیا کہ آج تک پھر آباد نہ ہو سکا۔

[2] بنو فراس بن غنم بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر عرب کا ایک نہایت مشہور و معروف شجاع قبیلہ تھا جس میں ہر شخص نہایت دلیر ہوتا تھا۔ ان کی ادنی شجاعت کا ایک واقعہ یہ ہے کہ اس قبیلہ کا ایک شخص اپنے خاندان کی بہت سی عورتوں کو کسی جگہ لے جا رہا تھا کہ ایک بڑے قبیلہ نے اس پر حملہ کر دیا۔ اس نے عورتوں سے کہہ دیا کہ تم لوگ اپنی راہ چلی جاؤ اور تنہا مقابلہ کرتا رہا۔ آخر ایک شخص کا تیر اس کے سینہ پر لگا، اس نے فوراً اپنا نیزہ زمین میں گاڑ دیا اور اس پر ہاتھ ٹیک کر کھڑا ہو گیا۔ دشمن سمجھتے رہے کہ زندہ کھڑا ہے حالانکہ وہ مردہ تھا۔ آخر جب عورتیں اپنی منزلیں مقصود تک پہنچ گئیں اس کے بعد دشمنوں نے اس کو بے حس وحرکت دیکھ کر تعجب کیا اور اس کے گھوڑے کو تیر مارا جس کے گرنے سے وہ سوار بھی گرا۔ اس وقت ان لوگوں کو معلوم ہوا کہ مردہ تھا۔

''اَلْاَرْمِيَةُ'' جَمْعُ ''رَمِيٍّ'' وَ هُوَ السَّحَابُ، وَ الْحَمِيْمُ هٰهُنَا وَقْتُ الصَّيْفِ، وَ اِنَّمَا خَصَّ الشَّاعِرُ سَحَابَ الصَّيْفِ بِالذِّكْرِ لِاَنَّهٗ اَشَدُّ جُفُوْلًا وَّ اَسْرَعُ خُفُوْقًا، لِاَنَّهٗ لَا مَآءَ فِيْهِ، وَ اِنَّمَا يَكُوْنُ السَّحَابُ ثَقِيْلَ السَّيْرِ لِامْتِلَآئِهٖ بِالْمَآءِ، وَ ذٰلِكَ لَا يَكُوْنُ فِي الْاَكْثَرِ اِلَّا زَمَانَ الشِّتَآءِ، وَ اِنَّمَا اَرَادَ الشَّاعِرُ وَصْفَهُمْ بِالسُّرْعَةِ اِذَا دُعُوْا وَ الْاِغَاثَةِ اِذَا اسْتُغِيْثُوْا، وَ الدَّلِيْلُ عَلٰى ذٰلِكَ قَوْلُهٗ: ''هُنَالِكَ، لَوْ دَعَوْتَ، اَتَاكَ مِنْهُمْ۔

ہوں کہ ''ارمیہ'' جمع ہے لفظ رمی کی، جس کا معنی ابر ہے اور ''حمیم'' یہاں (بمعنی) موسم گرما ہے۔ اور شاعر نے خاص کر گرمی کے ابر کو اس سبب سے ذکر کیا کہ وہ نہایت تیز رفتار اور ہلکا ہونے سے بہت سریع السیر ہوتا ہے کیونکہ اس میں پانی تو ہوتا نہیں اس لیے کہ ابر وزنی اور سست رفتار اسی سبب سے ہوتا ہے کہ اس میں پانی بھرا ہوتا ہے اور سوائے موسم سرما کے عموماً یہ (یعنی ابر پانی سے بھرا ہوا) نہیں ہوتا۔ بہر کیف شاعر کا مقصود اس قوم کی اس وقت کی مستعدی اور سرعت بیان کرنا ہے۔ جب وہ (مدد کے لیے پکارے جاتے ہیں اور (ان کی) فریادرسی کی مدح کرنا ہے جب ان سے فریاد کی جاتی ہے اور اس پر دلیل شاعر کا پہلا مصرعہ ہے جس میں کہا ہے کہ ''(مخاطب!) اگر تو (ان کو) پکارے گا تو اس وقت تیرے پاس ان کے سوار آ پہنچیں گے''۔

❁ خطبہ :۲۷ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

اِنَّ اللّٰهَ بَعَثَ مُحَمَّدًا ﷺ نَذِيْرًا لِّلْعٰلَمِيْنَ، وَ اَمِيْنًا عَلَى التَّنْزِيْلِ، وَ اَنْتُمْ مَعْشَرَ الْعَرَبِ عَلٰى شَرِّ دِيْنٍ، وَ فِيْ شَرِّ دَارٍ، مُنِيْخُوْنَ بَيْنَ حِجَارَةٍ خُشْنٍ وَّ حَيَّاتٍ صُمٍّ،

خطبہ:۲۷(۲۶)

حضرت علیہ السلام کے ایک خطبہ کا کچھ حصّہ۔

خدا نے (حضرت) محمد (مصطفی) ﷺ کو (اپنے عذاب سے) سارے جہان کا ڈرانے والا اور (اپنے احکام کے) پہنچانے پر امین مقرر کر کے بھیجا تھا اس وقت جب اے گروہ عرب! تم لوگ بدترین دین پر اور بدترین گھر میں سخت پتھروں [1] اور مہلک سانپوں کے درمیان

[1] بدترین دین تو بت پرستی شرک وغیرہ ہے، بدترین مقام ملک حجاز ہے جو عرب کا ایک بڑا حصّہ ہے اور حجاز کا چٹیل میدان اور زمین عرب مشہور ہے کہ بے آب و گیا اور نہایت سخت اور پتھریلی ہے بلکہ اس کا اکثر حصّہ سخت پتھر ہے، علاوہ بریں اس میں بہت بڑے بڑے اور نہایت زہریلے اژدہے رہتے ہیں۔

تَشْرَبُوْنَ الْكَدِرَ، وَ تَأْكُلُوْنَ الْجَشِبَ، وَ تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ، وَتَقْطَعُوْنَ اَرْحَامَكُمْ، اَلْاَصْنَامُ فِيْكُمْ مَنْصُوْبَةٌ، وَ الْاٰثَامُ بِكُمْ مَعْصُوْبَةٌ.

(گھرے ہوئے) پڑے تھے۔[1] (اس کے علاوہ) میلا پانی پیتے اور بدمزہ ناگوار غذا کھاتے، [2] ساتھ ہی ایک دوسرے کا خون بہاتے اور قطع رحم کیا کرتے تھے۔[3] (پرستش کے لیے بکثرت) بت (تمہارے یہاں) نصب تھے اور گناہوں کا (پورا) بار تم سے جکڑا ہوا تھا۔[4]

[وَ مِنْهَا]

یہ جملے بھی اسی خطبہ کے ہیں (جب لوگوں نے خلافت غصب کر لی تو)

فَنَظَرْتُ فَاِذَا لَيْسَ لِيْ مُعِيْنٌ اِلَّآ اَهْلُ بَيْتِيْ، فَضَنِنْتُ بِهِمْ عَنِ الْمَوْتِ، وَ اَغْضَيْتُ عَلَى الْقَذٰى، وَ شَرِبْتُ عَلَى الشَّجَا، وَ صَبَرْتُ عَلٰٓى اَخْذِ الْكَظَمِ، وَ عَلٰٓى

میں نے نظر ڈالی۔ پس سوائے اہل بیت کے کسی کو بھی اپنا مددگار نہ پایا لہٰذا میں ان کو (جہاد میں) مرنے سے بچاتا رہا۔ اپنے خس وخاشاک پڑی ہوئی آنکھ کو (بغیر صاف کیے کھولتا اور) بند کرتا رہا۔ حلق میں پھنسی ہوئی ہڈی پر پانی پیتا رہا اور غصّہ کے فرو اور حنظل کے مزہ سے زیادہ تلخ

---

[1] ''حَيَّاتٍ صُمٍّ''۔ ''صُمٌّ'' جمع ہے اصم کی بمعنی بہرا۔ حضرتؑ نے حجاز کے زہریلے سانپوں کو بہرا اس سبب سے فرمایا کہ وہ سب اپنی قوت جسامت، سختی، شدت زہر اور کثرت خباثت کے سبب سے لوگوں کے جھڑکنے ڈانٹنے اور دھمکی دینے کی آواز سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوتے اور نہایت بے پرواہی سے حملہ کرتے ہیں۔ پس اس سبب سے لوگ ان سانپوں کو بہرا سانپ کہتے ہیں کہ وہ گویا لوگوں کی آواز سننے سے بہرے ہیں۔ پس یہاں مفہومی ترجمہ کیا گیا ہے یعنی مہلک سانپ۔

[2] بدمزہ اور ناگوار غذا مثل کچا پکا گوشت، جو کی بھوسی، خرموں کی گٹھلی کا آٹا، سو سمار جانور وغیرہ تھی۔ بلکہ بھوک کی حالت میں تو خون کو اونٹ کے پیشاب میں ملا کر اسے دھوپ میں خشک کر کے پیس کر اس کی روٹی وغیرہ پکاتے اور وہی کھاتے۔

[3] عرب کی خون ریزی اور قطع رحم کے واقعات سے ہر شخص واقف ہے کہ ایک اونٹ تک کے لیے چالیس اور ستّر برس تک جنگ قائم رہتی اور قبیلہ کے قبیلہ کا خون بہتا رہتا اور ہزاروں بلکہ لاکھوں آدمیوں کے ہلاکت تک نوبت پہنچ جاتی۔ اور قطع رحم کی حالت تھی کہ باپ بیٹے کو، بیٹا باپ کو، بھائی بھائی کو قتل کرتا یا اس سے جنگ کرتا۔ غرض ایام جاہلیت میں اس قسم کے ہزاروں عیوب تھے جن کے سبب سے وہاں کے رہنے والے بہائم سے بھی بدتر ہو رہے تھے۔

[4] یہ استعارہ ہے یعنی تم لوگ اس طرح گناہوں میں جکڑے تھے کہ معلوم ہوتا تھا دوسروں نے گناہوں کو تم میں اس طرح باندھ دیا ہے کہ تم لوگ ان سے نکل نہیں سکتے لیکن آنحضرتؐ کے مبعوث ہونے سے تم لوگ آدمی بن گئے، سیدھی راہ پر آ گئے، لذیذ غذائیں کھانے لگے، اچھے لباس پہننے لگے اور کل نعمت ہائے دنیا سے نفع حاصل کرنے لگے۔

اَمَرَّ مِنْ طَعْمِ الْعَلْقَمِ.

[وَ مِنْهَا]

وَلَمْ يُبَايِعْ حَتّٰى شَرَطَ اَنْ يُّؤْتِيَهُ عَلَى الْبَيْعَةِ ثَمَنًا، فَلَا ظَفِرَتْ يَدُ الْبَآئِعِ، وَ

(مصیبتوں کے برداشت کرنے) پر صبر کرتا رہا۔ [1]

[یہ جملے بھی اسی کے ہیں [2]]

اور (عمرو بن عاص نے معاویہ کی) بیعت اس وقت تک نہ کی جب تک یہ شرط نہ کر لی کہ وہ اسے بیعت کی قیمت دے گا۔ پس اس بیعت کرنے والے کا ہاتھ کامیاب نہ ہوا

---

[1] حضرتؑ ان جملوں میں غصب خلافت کی حالت اور اپنی تنہائی بے بسی کا ذکر فرماتے ہیں کہ جب لوگ دنیا پرستی پر اتر آئے اور خلافت کو غصب کر لیا تو میں نے دیکھا کہ سوائے اہل بیت رسالتمآبؐ کے کوئی بھی میرا طرفدار اور مددگار نہیں ہے، پس اگر ان کو لے کر جہاد کرتا تو ہزاروں سے یہ دو چار فرد کہاں تک جہاد کرتے، لہٰذا میں نے ان کو بچایا اور ان کو اپنی مدد میں دشمنوں کے مقابلہ پر بھیجنے میں بخل کیا حالانکہ اسلام کے مٹنے اور باطل کے رواج پانے سے میرے غصہ اور غضب کی وہ حالت ہو رہی تھی جو اس شخص کی ہوتی ہے جس کے آنکھ میں تنکے پڑ گئے ہوں کہ وہ اس کو بند نہیں کر سکتا۔ لیکن میں کیا کرتا؟ اپنی اس حالت کو برداشت کرتا رہا۔ یا میری حالت اس شخص کے مثل تھی جس کے گلے میں لقمہ یا ہڈی پھنس گئی ہو کہ جب تک وہ فرو نہ ہو جائے انسان کچھ کھا پی نہیں سکتا۔ لیکن میں اسی حالت پر اپنے امور کو انجام دیتا رہا۔ دین کے محو اور شریعت کے پامال ہونے سے مجھے جو غیظ و غضب اور حرکت قلب ہو رہی تھی اس کو بھی میں غیر معمولی کوشش کر کے فرو کرتا رہا اور ان مصائب کو برداشت کرتا رہا جن کا برداشت کرنا حنظل وغیرہ تلخ پھلوں کے کھانے سے بھی زیادہ ناگوار اور تلخ تھا۔

[2] ان جملوں میں حضرتؑ نے معاویہ کے عمرو عاص کو ملانے کی طرف اشارہ کیا ہے جس کا واقعہ یہ ہے کہ جنگ جمل کی خبر معاویہ کو معلوم ہوئی تو وہ اپنی تمنا تحصیل سلطنت سے مایوس ہو کر بہت پریشان ہوا، آخر خون عثمان کا قصاص لینے کا حیلہ ایجاد کر کے اہل شام کو حضرتؑ کے خلاف پر آمادہ کرنا شروع کیا لیکن اس میں کامیابی نظر نہیں آئی اور سمجھا کہ بغیر عمرو بن العاص ایسے مکار اور فریبی شخص کی مدد کے یہ بیڑا پار نہیں لگے گا۔ لہٰذا اس کو خط لکھ کر اپنی بیعت اور اعانت کی درخواست کی۔ عمرو بن عاص نے جواب لکھا کہ تو گمراہ اور منافق ہے کہیں تو علیؑ کا مقابل بھی ہو سکتا ہے؟ اس ہوس کو دل سے نکال ڈال۔ معاویہ نے جب دیکھا کہ عمرو عاص کسی طرح راضی نہیں ہوتا اور بغیر اس کے کام بنتا نظر نہیں آتا تو اسے لکھا کہ اگر تم ہمارا ساتھ دو تو میں کامیاب ہو کر تم کو مصر دے دوں گا۔ غرض بہت کچھ قیل و قال اور اصرار و انکار کے بعد عمرو عاص مصر کی طمع میں آ کر معاویہ کا طرفدار ہو گیا اور اس کی بیعت کر لی اور دین کو چند روزہ دنیا سے بیچ ڈالا۔ ان امور کو تفصیل سے ذکر کرنے کے بعد علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں:

وَ مَا زَالَ عَمْرُو بْنُ الْعَاصِ مُلْحِدًا مَا تَرَدَّدَ قَطُّ فِي الْإِلْحَادِ وَ الزَّنْدَقَةِ وَ كَانَ مُعَاوِيَةُ مِثْلَهُ وَ يَكْفِي مِنْ تَلَاعُبِهِمَا بِالْإِسْلَامِ حَدِيثُ السِّرَارِ الْمَرْوِيِّ۔

یعنی عمرو عاص ہمیشہ ملحد ہی رہا کہ اس کے ملحد اور زندیق ہونے میں کسی شخص کو شک اور تردد نہیں ہوا اور معاویہ کا بھی یہی حال تھا۔ چنانچہ ان دونوں نے جو اسلام کو کھیل بنا رکھا اس کے لیے حدیث اسرار ہی کافی ہے۔

خَزِيَتْ اَمَانَةُ الْمُبْتَاعِ! فَخُذُوْا لِلْحَرْبِ اُهْبَتَهَا، وَ اَعِدُّوْا لَهَا عُدَّتَهَا، فَقَدْ شَبَّ لَظَاهَا، وَ عَلَا سَنَاهَا، وَ اسْتَشْعِرُوا الصَّبْرَ، فَاِنَّهٗۤ اَدْعٰى اِلَى النَّصْرِ.

اور بیعت لینے والے (معاویہ) کا عہد و پیمان ذلیل وخوار ہو۔ پس (لوگو! اب تم بھی) جنگ کے ہتھیار سنبھال لو اور اس کا ساز وسامان مہیا کرلو کہ یقیناً اس (آتش جنگ) کے شعلے بھڑک اٹھے اور اس کی روشنی بلند ہوگئی [1] اور (ساتھ ہی ہر سختی پر) صبر کو اپنا (شیوہ) شعار قرار دو کہ یہی (فتح و) نصرت کی طرف سب سے بہتر بلانے والا (ذریعہ) ہے۔

❁ خطبہ :۲۸ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

خطبہ:۲۸(۲۷)

حضرت علیہ السلام کے ایک خطبہ کا کچھ حصّہ۔ [2]

---

[1] چونکہ پورا خطبہ مذکور نہیں ہوا لہٰذا نہیں معلوم ہوسکتا کہ یہ کلام کس موقع پر آیا۔ مگر یہ ضرور ہے کہ حضرتؑ نے معاویہ اور عمرو عاص کے باخود ہا سازش کو ان الفاظ میں ادا فرمایا ہے کہ عمرو عاص ایسا مکار اور دنیا پرست شخص معاویہ کے قبضہ میں یوں نہیں آیا بلکہ باخود ہا اس طرح کا معاملہ ہوا بہرکیف اب چونکہ اس نے معاویہ کی بیعت کرلی تو صلح وامن کی طرف سے مایوسی ہوگئی اور یقیناً جنگ چھڑے گی جس کے شعلے بلند ہوں گے اور جس کی روشنی نہایت تیز ہوگی۔

[2] اس خطبہ کی شرح میں علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں۔ یہ خطبہ بھی حضرتؑ کا نہایت مشہور ہے جس کو بہت سے لوگوں نے ذکر کیا ہے اور علامہ ابوالعباس المبرد نے بھی اپنی مشہور کتاب الکامل کی ابتدا میں اس کی روایت کی ہے لیکن اس روایت مندرجہ نہج البلاغہ سے بعض الفاظ کو کم کردیا ہے اور بعض کو زیادہ اور اس کا واقعہ یہ بیان کیا ہے کہ حضرت امیر المومنینؑ کو یہ خبر ملی کہ معاویہ کے کچھ سردار شہر انبار میں پہنچ گئے ہیں اور آپؑ کے عامل کو وہاں قتل کردیا ہے جس کا نام حسان بن حسان تھا۔ یہ خبر سن کر حضرتؑ کو بہت غصّہ اور رنج ہوا اور کوفہ سے اس حالت غیظ وغضب میں نکلے کہ آپ کی ردا کا دامن لٹکتا جاتا تھا یہاں تک کہ مقام نخیلہ تک پہنچ گئے۔ (یہ نخیلہ وہ مقام تھا جہاں لشکر جمع ہوا کرتا تھا) اشراف کوفہ بھی آپ کے پیچھے پیچھے چلے آئے۔ وہاں حضرتؑ ایک اونچے ٹیلہ پر چڑھ گئے اور خدا کی حمد وثنا اور آنحضرتؐ کی صلوٰۃ وسلام بجالا کر اس خطبہ کو ارشاد فرمایا ہے۔

اور بروایت مندرجہ شرح ابن میثم علیہ الرحمہ نخیلہ میں پہنچ کر اشراف واعیان کوفہ نے آپ سے اصرار کیا کہ مکان پر تشریف لے چلیں ہم لوگ اس لشکر کا تدارک کرلیتے ہیں مگر حضرتؑ یہی فرماتے رہے کہ نہ تم اپنے نفس کی حفاظت کرسکتے ہو نہ ہماری غرض پوری کرسکتے ہو۔ اس کے بعد سعید بن قیس ہمدانی کو آٹھ ہزار لشکر کے ساتھ برادر غامد کے تعاقب میں روانہ کیا مگر وہ نکل چکا تھا لہٰذا سعید یوں ہی واپس آئے۔ جب یہ لشکر واپس آیا تو اس وقت حضرتؑ کچھ علیل تھے جس سے کھڑے ہوکر خطبہ نہ فرماسکتے تھے، پس قلم ودوات منگا کر یہ خطبہ لکھا اور اپنے غلام سعد کو دیا کہ پڑھ کر سنادے۔ ان سب کے بعد حضرتؑ کے بعض جان نثار اصحاب اُٹھ کھڑے ہوئے اور عرض کی ''یا حضرتؑ آپ رنج نہ کریں جو حکم دیں ہم لوگ انجام دے دیں گے کیونکہ بخدا اگر ہم لوگوں کا کل مال اور جائیداد (بقیہ صفحہ مابعد)

اَمَّا بَعْدُ! فَاِنَّ الْجِهَادَ بَابٌ مِّنْ اَبْوَابِ الْجَنَّةِ، فَتَحَهُ اللّٰهُ لِخَاصَّةِ اَوْلِيَآئِهٖ، وَ هُوَ لِبَاسُ التَّقْوٰى، وَ دِرْعُ اللّٰهِ الْحَصِيْنَةُ، وَ جُنَّتُهُ الْوَثِيْقَةُ، فَمَنْ تَرَكَهٗ رَغْبَةً عَنْهُ اَلْبَسَهُ اللّٰهُ ثَوْبَ الذُّلِّ، وَ شَمْلَةَ الْبَلَآءِ، وَ دُيِّثَ بِالصَّغَارِ وَ الْقَمَآءِ، وَ ضُرِبَ عَلٰى قَلْبِهٖ بِالْاَسْدَادِ، وَ اُدِيْلَ

(حمد ونعت کے) بعد (واضح ہو کہ) جہاد بہشت کے دروازوں سے ایک دروازہ ہے جسے خدا نے اپنے خاص دوستوں کے لیے کھول رکھا ہے۔[1] اور وہ تقوی کا لباس،[2] خدا کی مضبوط زرہ اور اس کی محکم سپر ہے۔ پس جو اس (جہاد) کو ناپسند کر کے چھوڑے گا خدا اسے ذلّت کا لباس پہنائے گا۔ اور بلا اسے گھیر لے گی اور وہ ذلیل وحقیر کیا جائے گا اور اس کے دل پر بے عقلی[3] کے پردے ڈال دیے جائیں گے اور جہاد کو ضائع کرنے کے سبب سے

(بقیہ صفحہ ماقبل) آپ کی اطاعت میں خرچ اور تباہ ہو جائے اور ہم لوگوں کی کل اولاد اور اعزہ واقربا قتل ہو جائیں جب بھی ہم لوگوں کو افسوس نہ ہو''۔

پس حضرتؑ نے حکم دیا کہ لوگ سامان سفر درست کریں۔ بعد ازاں ایک شخص کو سردار مقرر کر کے اس فوج کو معاویہ کی طرف روانہ کیا لیکن یہ فوج ابھی دشمن تک پہنچی بھی نہ تھی کہ ابن ملجم ملعون نے آنحضرتؑ کو شہید کر دیا۔ (شرح ابن ابی الحدید، مطبوعہ مصر، ج۱، ص۱۴۶)

[1] یعنی جہاد بھی ایک سبب اور ذریعہ ہے بہشت میں داخل ہونے کا اور دروازہ ہائے جنت کا کسی کے لیے کھلنا جہاد پر بھی اسی طرح موقوف ہے جس طرح ایمان، نماز، روزہ وغیرہ پر۔ فرق اس قدر ہے کہ نماز، روزہ کرنے والے بہت ہیں کہ اس میں کوئی مشقت نہیں اور جہاد اس کا کام ہے جو حکم خدا کے مقابلہ میں اپنی جان کی پرواہ نہ کرے۔ اسی لیے حضرتؑ نے فرمایا کہ جہاد وہ باب جنت ہے جو خاص اولیاء کے لیے کھولا گیا ہے نہ ہر شخص کے لیے۔ یہی باعث تھا کہ لشکر جناب رسالت مآبؐ میں صحابہ کی تعداد تو ہزاروں کی ہوتی مگر مجاہد دو ہی ایک ہوتے۔

[2] ''لِبَاسُ التَّقْوٰى'' یہ لفظ کلام مجید کے اس آیہ سے ماخوذ ہے:

﴿ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَ رِيْشًا ؕ وَ لِبَاسُ التَّقْوٰى ﴾ (سورۂ اعراف، آیہ ۲۶)

یعنی ہم نے تمہارے لیے پوشاک نازل کی جو تمہارے ستر کو چھپاتی ہے اور زینت کے کپڑے اور پرہیزگاری کا لباس۔

[3] بعض نسخوں میں یہ عبارت اس طرح یعنی ''ضُرِبَ عَلٰى قَلْبِهٖ بِالْاَسْدَادِ'' ہے اور بعض نسخوں میں ''ضُرِبَ عَلٰى قَلْبِهٖ بِالْاَسْهَابِ'' ہے لیکن مطلب دونوں کا ایک ہی ہے یعنی زوال عقل، غفلت، بیہودہ پن۔ کیونکہ اسداد جمع ہے سد کی بمعنی پردہ۔ پس جب کسی کے قلب پر پردے پڑ جائیں گے تو عقل بھی اس سے مسلوب ہو جائے گی اور اسہاب کے اصل معنی بہت بولنا اور فضول بکنا ہے اور یہ بھی بے عقلی ہی کا نتیجہ ہے۔

الْحَقُّ مِنْهُ بِتَضْيِيْعِ الْجِهَادِ، وَ سِيْمَ الْخَسْفَ، وَ مُنِعَ النِّصْفَ.

اَلَا وَ اِنِّیْ قَدْ دَعَوْتُكُمْ اِلٰی قِتَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَيْلًا وَّ نَهَارًا، وَ سِرًّا وَّ اِعْلَانًا، وَ قُلْتُ لَكُمُ: اغْزُوْهُمْ قَبْلَ اَنْ يَّغْزُوْكُمْ، فَوَاللّٰهِ! مَا غُزِیَ قَوْمٌ قَطُّ فِیْ عُقْرِ دَارِهِمْ اِلَّا ذَلُّوْا، فَتَوَاكَلْتُمْ وَ تَخَاذَلْتُمْ حَتّٰی شُنَّتْ عَلَيْكُمُ الْغَارَاتُ، وَ مُلِكَتْ عَلَيْكُمُ الْاَوْطَانُ.

وَ هٰذَآ اَخُوْ غَامِدٍ قَدْ وَرَدَتْ خَيْلُهُ

حق اس سے پھیر لیا جائے گا۔[1] اور وہ فضیحتی میں سختی سے مبتلا کیا جائے گا اور عدل وانصاف سے محروم رکھا جائے گا۔

(اب اپنی حالت) دیکھو کہ میں تم لوگوں کو اس قوم (معاویہ) سے جہاد کرنے کی دعوت رات کو بھی دیتا رہا اور دن کو بھی، مخفی بھی اور ظاہر بھی۔ اور تم سے کہتا رہا کہ ان سے لڑو قبل اس کے کہ یہ تم پر چڑھ آئیں کیونکہ بخدا جس قوم پر بھی اس کے گھر میں گھس کر حملہ کیا گیا وہ ذلیل ہو کر رہی۔ مگر تم نے (میری ایک نہ سنی بلکہ) ایک دوسرے کے بھروسے پر چھوڑ دیا اور ایک دوسرے کی مدد سے باز رہے۔ آخر کار تم پر غارتیں ڈالی گئیں اور تمہارے گھروں پر قبضہ کر لیا گیا۔

(اب دیکھو کہ) اس غامدی[2] کے سوار شہر انبار میں

---

[1] یعنی بہ سبب اس کے کہ اس نے جہاد ترک کیا ہے، راہ حق اس سے چھپ جائے گی یا پھر جائے گی جیسا کہ خدا فرماتا ہے ﴿ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ ﴾ یعنی ''یہ ہم نے ان کی سرکشی کی سزا دی ہے''۔

[2] اخو غامد سفیان بن عوف ہے جو بنی غامد سے تھا اور بنی غامد یمن کے ازدشنوہ سے ایک قبیلہ تھا۔ اس سفیان بن عوف کو معاویہ نے عراق کے مختلف مقامات پر لوٹ مار کرنے کے لیے مقرر کیا تھا تا کہ اس طرح حضرت امیر المومنینؑ پریشان ہوں اور عراق کے رہنے والے معاویہ کے مکر وفریب سے خوفزدہ ہو کر اس کے طرفدار ہو جائیں۔ چنانچہ حضرات اہل سنت کا نہایت مشہور اور جلیل القدر مؤرخ ابن اثیر جزری اپنی تاریخ کامل مطبوعہ مصر، ج ۳، ص ۱۵۰) ۳۹ھ کے واقعات کا ذکر کرتا ہوا اس واقعہ کو پوری تفصیل سے یوں لکھتا ہے:

ثُمَّ دَخَلَتْ سَنَةُ تِسْعٍ وَثَلَاثِيْنَ ذِكْرُ سَرَايَا اَهْلِ الشَّامِ اِلٰی بِلَادِ اَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَفِیْ هٰذِهِ السَّنَةِ فَرَّقَ مُعَاوِيَةُ جُيُوْشَهٗ فِی الْعِرَاقِ فِیْ اَطْرَافِ عَلِیٍّ فَوَجَّهَ النُّعْمَانُ بْنُ بَشِيْرٍ فِیْ اَلْفِ رَجُلٍ اِلٰی عَيْنِ التَّمْرِ وَفِيْهَا مَالِكُ بْنُ كَعْبٍ مُسْلَحَةً لِعَلِیٍّ فِیْ اَلْفِ رَجُلٍ وَكَانَ مَالِكٌ قَدْ اَذِنَ لِاَصْحَابِهٖ فَاَتَوُا الْكُوْفَةَ وَلَمْ يَبْقَ مَعَهٗ اِلَّا مِائَةُ رَجُلٍ فَلَمَّا سَمِعَ بِالنُّعْمَانِ كَتَبَ اِلٰی اَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُخْبِرُهٗ وَيَسْتَمِدُّهٗ فَخَطَبَ عَلِیٌّ بِالنَّاسِ وَاَمَرَهُمْ بِالْخُرُوْجِ اِلَيْهِ فَتَثَاقَلُوْا وَوَافَقَ مَالِكُ النُّعْمَانَ وَجَعَلَ جِدَارَ الْقَرْيَةِ فِیْ ظُهُوْرِ اَصْحَابِهٖ وَكَتَبَ مَالِكٌ اِلٰی خَنَّفِ بْنِ سُلَيْمٍ يَسْتَعِيْنُهٗ وَهُوَ قَرِيْبٌ مِّنْهُ وَاقْتَتَلَ مَالِكٌ وَالنُّعْمَانُ اَشَدَّ قِتَالٍ فَوَجَّهَ مُخَنَّفٌ اِبْنَهٗ عَبْدَ الرَّحْمٰنِ فِیْ خَمْسِيْنَ رَجُلًا فَانْتَهَوْا اِلٰی مَالِكٍ وَقَدْ كَسَرُوْا جُفُوْنَ سُيُوْفِهِمْ وَاسْتَقْتَلُوْا فَلَمَّا رَآهُمْ

(بقیہ صفحہ بعد)

(بقیہ صفحہ ماقبل)

اَهْلُ الشَّامِ انْهَزَمُوْا عِنْدَ الْمَسَاءِ وَظَنُّوْا اَنَّ لَهُمْ مَدَدًا وَتَبِعَهُمْ مَالِكٌ فَقَتَلَ مِنْهُمْ ثَلَاثَةُ نَفَرٍ۔

یعنی ۳۹ھ میں معاویہ نے اپنے لشکروں کو (صرف جناب امیر المومنینؑ کو پریشان کرنے اور آپ کو اطمینان سے انتظام ملک اور ارشاد و ہدایت ناس میں مشغول نہ ہونے دینے اور آپ کی قوت کو پراگندہ اور کمزور کرنے کی غرض سے) ملک عراق کے مختلف مقامات پر روانہ کیا چنانچہ نعمان بن بشیر کو ایک ہزار فوج کے ساتھ (لیکن روضۃ الصفا میں دس ہزار تعداد لکھی ہے) مقام عین التمر پر بھیجا۔ جہاں جناب امیرؑ کی طرف سے مالک بن کعب ہزار سپاہیوں کے ساتھ رہتا تھا۔ لیکن اتفاق وقت سے اس وقت مالک بن کعب کی چھاؤنی میں سو آدمی موجود تھے کیونکہ نو سو سپاہی مالک سے اجازت لے کر کوفہ گئے ہوئے تھے۔ ان کی غیبت ہی میں نعمان بن بشیر وہاں پہنچ گیا۔ مالک کو نعمان کی چڑھائی کی خبر ہوئی تو جناب امیرؑ کو اس واقعہ سے مطلع کیا اور مدد طلب کی۔ پس حضرتؑ نے اہل کوفہ کو بلا کر خطبہ ارشاد فرمایا اور مالک کی مدد کو جانے کے لیے کہا۔ وہ لوگ ٹال مٹول کرنے لگے اور یہاں مالک نے معاویہ کے لشکر نعمان بن بشیر کے کئی ہزار سوار پر صرف اپنے سو سپاہیوں سے حملہ کر دیا۔ تدبیر یہ کی کہ شہر پناہ کو اپنی فوج کی پشت پر رکھا اور مخنف بن سلیم ایک شخص کو جو ان سے قریب ہی رہتا تھا خط لکھا کہ کچھ فوج مدد کے لیے بھیج دو اور معاویہ کی فوج سے خوب جم کر لڑنے لگا۔ مخنف کو خط ملا تو صرف پچاس آدمی اپنے فرزند عبدالرحمن کے ساتھ مالک کی مدد کے لیے بھیج دیے۔ چنانچہ ان پچاس آدمیوں نے یہاں پہنچتے ہی جو دیکھا کہ نہایت سخت لڑائی ہو رہی ہے، اپنی تلواروں کے نیام توڑ کر پھینک دیے اور جنگ میں شریک ہو گئے اور دونوں فوجیں مل کر اگرچہ صرف ڈیڑھ سو آدمیوں کی تھیں لیکن اس استقلال سے لڑیں کہ لشکر معاویہ (جو بروایتی) ایک ہزار اور بروایت دس ہزار سپاہیوں کا تھا) کے جی چھوٹ گئے اور یہ خیال کر کے کہ مالک کی مدد آ گئی ہے شام ہوتے ہوتے لشکر معاویہ بھاگ کھڑا ہوا۔ مالک نے بھاگتوں کا پیچھا کیا لیکن صرف تین ملے جن کو قتل کر ڈالا اور باقی نے شام کی راہ لی۔

وَوَجَّهَ مُعَاوِيَةُ فِيْ هٰذِهِ السَّنَةِ اَيْضًا سُفْيَانَ بْنَ عَوْفٍ فِيْ سِتَّةِ آلَافِ رَجُلٍ وَاَمَرَهٗ اَنْ يَّاْتِيَ هِيْتٌ فَيَقْطَعُهَا ثُمَّ يَاْتِي الْاَنْبَارَ وَالْمَدَائِنَ فَيُوْقِعُ بِاَهْلِهَا فَاَتٰى هِيْتَ فَلَمْ يَجِدْ بِهَا اَحَدًا ثُمَّ اَتَى الْاَنْبَارَ وَفِيْهَا مُسَلَّحَةٌ لِعَلِيٍّ تَكُوْنُ خَمْسَمِائَةِ رَجُلٍ وَقَدْ تَفَرَّقُوْا وَلَمْ يَبْقَ مِنْهُمْ اِلَّا مِائَتَا رَجُلٍ وَكَانَ سَبَبُ تَفَرُّقِهِمْ اَنَّهٗ كَانَ عَلَيْهِمْ كُمَيْلُ بْنُ زِيَادٍ فَبَلَغَهٗ اَنَّ قَوْمًا بِقَرْقِيسِيَا يُرِيْدُوْنَ الْغَارَةَ عَلٰى هِيْتٍ فَسَارَ اِلَيْهِمْ بِغَيْرِ اَمْرِ عَلِيٍّ فَاَتٰى اَصْحَابُ سُفْيَانَ وَكُمَيْلٌ غَائِبٌ عَنْهَا فَاَغْضَبَ ذٰلِكَ عَلِيًّا عَلٰى كُمَيْلٍ فَكَتَبَ اِلَيْهِ يُنْكِرُ ذٰلِكَ عَلَيْهِ وَطَمِعَ سُفْيَانُ فِيْ اَصْحَابِ عَلِيٍّ لِقِلَّتِهِمْ فَقَاتَلَهُمْ فَصَبَرَ اَصْحَابُ عَلِيٍّ ثُمَّ قُتِلَ صَاحِبُهُمْ وَهُوَ اَشْرَفُ بْنُ حَسَّانٍ الْبِكْرِيُّ وَثَلَاثُوْنَ رَجُلًا وَاحْتَمَلُوْا مَا فِي الْاَنْبَارِ مِنْ اَمْوَالِ اَهْلِهَا وَرَجَعُوْا اِلٰى مُعَاوِيَةَ وَبَلَغَ الْخَبَرُ عَلِيًّا فَاَرْسَلَ فِيْ طَلَبِهِمْ فَلَمْ يُدْرِكُوْا۔

اسی سال معاویہ نے سفیان بن عوف کو چھ ہزار نبرد آزماؤں کے ساتھ عراق کی طرف روانہ کیا اور حکم دیا کہ ہیت جائے، اس کو قطع کر کے انبار اور مدائن پہنچے اور وہاں کے لوگوں پر حملہ کرے۔ چنانچہ سفیان ہیت میں آیا تو یہاں کسی کو نہ پایا، وہاں سے انبار میں آیا، یہاں حضرت علی علیہ السلام کی چھاؤنی تھی جس میں عموماً پانچ سو سپاہی رہتے تھے لیکن اتفاق سے سفیان یہاں اس وقت پہنچا جب صرف دو سو سپاہی رہ گئے تھے اور بقیہ فوج وہاں سے متفرق ہو گئی تھی جس کی وجہ یہ ہوئی کہ ان کے سردار کمیل بن زیاد کو یہ خبر ملی تھی کہ قرقیسیا کے کچھ لوگ ہیت کو تاراج کرنا چاہتے ہیں وہ بغیر حضرت علی علیہ السلام کی

(بقیہ صفحہ مابعد)

الْاَنْبَارَ وَ قَدْ قَتَلَ حَسَّانَ بْنَ حَسَّانَ الْبَكْرِيَّ، وَ اَزَالَ خَيْلَكُمْ عَنْ مَّسَالِحِهَا وَ لَقَدْ بَلَغَنِيْٓ اَنَّ الرَّجُلَ مِنْهُمْ كَانَ يَدْخُلُ عَلَى الْمَرْاَةِ الْمُسْلِمَةِ، وَ الْاُخْرَى الْمُعَاهِدَةِ، فَيَنْتَزِعُ حِجْلَهَا وَ قُلْبَهَا وَقَلَآئِدَهَا وَ رِعَاثَهَا، ما تَمْتَنِعُ مِنْهُ اِلَّا بِالْاِسْتِرْجَاعِ وَ الْاِسْتِرْحَامِ، ثُمَّ انْصَرَفُوْا وَافِرِيْنَ مَا نَالَ رَجُلًا مِّنْهُمْ كَلْمٌ وَّ لَا اُرِيْقَ لَهُمْ دَمٌ، فَلَوْ اَنَّ امْرَاً مُّسْلِمًا مَّاتَ مِنْۢ بَعْدِ هٰذَآ اَسَفًا مَّا كَانَ بِهٖ مَلُوْمًا، بَلْ كَانَ بِهٖ عِنْدِيْ جَدِيْرًا. فَيَا عَجَبًا! عَجَبًا وَاللّٰهِ! يُمِيْتُ الْقَلْبَ وَ يَجْلِبُ الْهَمَّ مِنِ اجْتِمَاعِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ عَلٰى بَاطِلِهِمْ، وَ تَفَرُّقِكُمْ عَنْ حَقِّكُمْ! فَقُبْحًا لَّكُمْ وَ تَرَحًا حِيْنَ صِرْتُمْ غَرَضًا يُرْمٰى: يُغَارُ عَلَيْكُمْ وَ لَا تُغِيْرُوْنَ، وَ

داخل ہو گئے۔ (وہاں کے عامل) حسان بن حسان بکری کو قتل کر ڈالا اور تمہارے سواروں کو ان کے چھاونیوں سے نکال دیا اور مجھے تو یہ (تک) معلوم ہوا ہے کہ اس فوج کا کوئی مرد مسلمان عورت اور دوسری ذمی عورت کے یہاں گُھس پڑتا تھا اور ان (عورتوں کے) خلخال، کنگن، گردن بند، گوشوارے (وغیرہ زیورات) چھین لیتا تھا اور وہ (مسلمان یا ذمی) عورت ان سے سوائے فریاد اور رحم کی درخواست کرنے کے کسی طرح بچتی نہ تھی۔ غرض (یہ سب ظلم کر کے) وہ لوگ بالکل (بچ کر) پلٹ گئے کہ ان سے کسی ایک شخص کو بھی نہ زخم لگا اور نہ کسی کا خون بہا۔ اب اگر کوئی مرد مسلمان (اس واقعہ کے) رنج میں مر جائے تو قابل ملامت نہیں ہو سکتا بلکہ میرے خیال میں وہ اسی کا سزاوار ہوگا۔ پس یہ کیا ہی حیرت خیز اور تعجب انگیز حادثہ ہے۔ بخدا اس قوم (معاویہ) کا اپنے باطل (امور) پر (اس طرح) اتفاق و اتحاد سے رہنا اور تمہارا اپنے حق سے پراگندہ ہونا دل کو مردہ کرتا اور اندوہ و غم کو (سینہ میں) بھر دیتا ہے۔ پس تمہارا بُرا ہو اور تم حزن و غم میں مبتلا رہو کیونکہ تم تو (دُشمنوں کے) نشانہ بن گئے جس پر تیر پڑ رہے ہیں، تم پر غارت ڈالی جا رہی ہے اور تم جواب نہیں دیتے۔ تم پر حملہ

(بقیہ صفحہ ماقبل) اجازت کے فوج لے کر وہاں چلے گئے تھے۔ اب سفیان کا لشکر انبار میں پہنچا تو کمیل یہاں نہ تھے۔ میدان کو خالی اور حضرت علیؑ کی فوج کو انگلیوں پر شکار کرنے کے قابل پا کر سفیان کو طمع دامن گیر ہوئی اور ان بیچاروں پر حملہ کر دیا۔ پس طرف داران حضرت علی علیہ السلام گھر گئے اور آخر ان کا موجودہ سردار اشرف بن حسان بکری تیس آدمیوں کے ہمراہ مارا گیا اور لشکر معاویہ انبار کا تمام مال و دولت بار کر کے معاویہ کے پاس واپس آیا۔ حضرت امیر المومنینؑ کو یہ خبر معلوم ہوئی تو سفیان کے تعاقب میں ایک فوج بھیجی۔ غرض ایسے ہی مکر و فریب اور فتنہ و فساد کے ذریعہ سے معاویہ اپنی قوت بڑھاتا رہا۔

تُغْزَوْنَ وَ لَا تَغْزُوْنَ، وَ يُعْصَى اللّٰهُ وَ تَرْضَوْنَ!

فَاِذَآ اَمَرْتُكُمْ بِالسَّيْرِ اِلَيْهِم فِيْ اَيَّامِ الْحَرِّ قُلْتُمْ: هٰذِهٖ حَمَارَّةُ الْقَيْظِ اَمْهِلْنَا يُسَبَّخْ عَنَّا الْحَرُّ، وَ اِذَآ اَمَرْتُكُمْ بِالسَّيْرِ اِلَيْهِمْ فِي الشِّتَآءِ قُلْتُمْ: هٰذِهٖ صَبَارَّةُ الْقُرِّ اَمْهِلْنَا يَنْسَلِخْ عَنَّا الْبَرْدُ، كُلُّ هٰذَا فِرَارًا مِّنَ الْحَرِّ وَ الْقُرِّ، فَاِذَا كُنْتُمْ مِنَ الْحَرِّ وَ الْقُرِّ تَفِرُّوْنَ فَاَنْتُمْ وَاللّٰهِ! مِنَ السَّيْفِ اَفَرُّ!

يَآ اَشْبَاهَ الرِّجَالِ وَ لَا رِجَالَ! حُلُوْمُ الْاَطْفَالِ، وَ عُقُوْلُ رَبَّاتِ الْحِجَالِ، لَوَدِدْتُّ اَنِّيْ لَمْ اَرَكُمْ وَ لَمْ اَعْرِفْكُمْ مَعْرِفَةً ـ وَاللّٰهِ! ـ جَرَّتْ نَدَمًا، وَ اَعقَبَتْ سَدَمًا.

قَاتَلَكُمُ اللّٰهُ! لَقَدْ مَلَئْتُمْ قَلْبِيْ قَيْحًا، وَ شَحَنْتُمْ صَدْرِيْ غَيْظًا، وَ جَرَّعْتُمُوْنِيْ نُغَبَ التَّهْمَامِ اَنْفَاسًا، وَ اَفْسَدْتُّمْ عَلَيَّ رَاْيِيْ بِالْعِصْيَانِ وَ الْخِذْلَانِ، حَتّٰى لَقَدْ قَالَتْ قُرَيْشٌ: اِنَّ ابْنَ اَبِيْ طَالِبٍ رَجُلٌ شُجَاعٌ، وَ لٰكِنْ لَّا عِلْمَ لَهٗ بِالْحَرْبِ.

کیا جاتا ہے اور تم سے حملہ نہیں ہوتا۔ اور خدا کی نافرمانی ہو رہی ہے اور (تم) اس پر راضی ہو۔

چنانچہ (ان امور کے روکنے کو) جب میں تمہیں ان کی طرف گرمی میں جانے کو کہتا ہوں تو کہتے ہو، ابھی جھلستی گرمی ہے ہمیں اتنی مہلت دیجیے کہ گرمی کم ہو جائے اور جب جاڑے کے موسم میں کوچ کا حکم دیتا ہوں تو کہتے ہو، ابھی تو بڑی سخت سردی ہے ہمیں اتنی مہلت دیجیے کہ سردی کم ہو جائے۔ (لیکن حقیقت یہ ہے کہ) یہ سب گرمی اور سردی سے بھاگنے کے حیلے ہیں۔ خیر (مگر اتنا سمجھ لو کہ) جب تم لوگ گرمی اور سردی تک سے بھاگتے ہو تو بخدا تم لوگ تلوار سے تو سب سے زیادہ بھاگو گے۔

(لہٰذا) اے مردوں کی صورت، بچوں کی سمجھ اور عورتوں کے عقل والے نامردو! میں تو اس کو پسند کرتا تھا کہ نہ تم کو دیکھتا اور نہ پہچانتا، کیونکہ بخدا (تم لوگوں کے) اسی پہچاننے نے مجھے نادم کر رکھا اور حزن وغم میں آخر کار مبتلا کر دیا ہے۔

خدا تمہیں تباہ کرے، تم نے میرے دل کو (زخمی کر کے) پیپ سے بھر دیا ہے اور میرے سینہ کو غیظ وغضب سے پر کر دیا ہے اور مجھے ہر سانس پر رنج اور غم کے جرعے گھونٹ گھونٹ پلائے ہیں اور میری نافرمانی کر کے اور ساتھ چھوڑ کے میری تدبیروں کو خاک میں ملا رکھا ہے یہاں تک کہ قبیلۂ قریش یہ تک کہہ بیٹھا کہ (علی) ابن ابی طالب مرد شجاع (تو ضرور) ہیں مگر انہیں فن جنگ کا کچھ بھی علم نہیں ہے۔

لِلّٰهِ اَبُوْهُمْ! وَ هَلْ اَحَدٌ مِّنْهُمْ اَشَدُّ لَهَا مِرَاسًا، وَ اَقْدَمُ فِيْهَا مَقَامًا مِّنِّيْ؟! لَقَدْ نَهَضْتُ فِيْهَا وَ مَا بَلَغْتُ الْعِشْرِيْنَ، وَ هَا اَنَا ذَا قَدْ ذَرَّفْتُ عَلَى السِّتِّيْنَ! وَ لٰكِنْ لَّا رَاْيَ لِمَنْ لَّا يُطَاعُ!.

خدا ان کے آبا ؤ اجداد کا بھلا کرے، کیا ان میں مجھ سے زیادہ بھی کوئی اس (فن) کا تجربہ کار اور جنگ میں مجھ سے آگے رہنے والا (پہلے گزرا یا اب موجود) ہے؟ (اس لیے کہ) میں تو معرکہ ہائے جنگ میں اس وقت در آیا جب بیس سال کا بھی نہ تھا اور اب تو ساٹھ سال سے بھی بڑھ گیا ہوں لیکن (کیا کروں واقعًا) جس کی بات مانی نہیں جاتی اس کی (گویا) کوئی تدبیر ہی نہیں ہوتی۔ (کیونکہ حُسن تدبیر کا حال تو اس پر عمل کرنے سے کھلتا ہے)۔

❁ خطبہ :۲۹ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

اَمَّا بَعْدُ، فَاِنَّ الدُّنْيَا قَدْ اَدْبَرَتْ وَ اٰذَنَتْ بِوَدَاعٍ، وَ اِنَّ الْاٰخِرَةَ قَدْ اَقْبَلَتْ وَ اَشْرَفَتْ بِاطِّلَاعٍ، اَلَا وَ اِنَّ الْيَوْمَ الْمِضْمَارَ

خطبہ:۲۹(۲۸)

حضرت علیہ السلام کے ایک خطبہ کا کچھ حصّہ۔ ۱؎

(حمد و نعت کے) بعد (واضح ہو کہ) دنیا نے منہ موڑ لیا اور اپنے وداع کا اعلان کر چکی۔ اور یہ کہ آخرت متوجہ ہو گئی اور ظاہر ہونے کے قریب پہنچ گئی۔ (لہٰذا) خبردار ہو جاؤ کہ آج کا دن (دنیاوی زندگی) میدانِ ۲؎ (عمل) ہے اور کل

۱؎ اس خطبہ میں حضرتؑ دنیاوی زندگی کے زائل ہونے اور قیامت کے یقیناً آنے کا بیان فرما کر ارشاد فرماتے ہیں کہ جب ان اُمور کا یقین ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں تو تم لوگوں کو چاہیے کہ روزِ قیامت کے لیے نیک اعمال کا ذخیرہ مہیا کر لو کہ وہاں بھی ایک چیز کام آنے والی ہے۔ پس دنیا مثل اس میدان کے ہے جہاں گھوڑے دوڑائے جاتے اور دوڑنے کی ان کو مشق کرائی جاتی ہے تاکہ خوب تیز ہو کر وہ گھوڑ دوڑ میں جائیں اور دوسرے گھوڑوں سے آگے نکل جائیں یا کم از کم کامیابی حاصل کریں۔ اسی طرح دنیا ہم لوگوں کے لیے محنت اور جفاکشی کا میدان ہے جہاں ہم لوگوں کو آخرت کے لیے تیار ہونا ہے۔ پس جتنا ہی زہد و رع، عبادت، امتثالِ اوامرِ الٰہی کے انجام دینے میں ہم لوگ یہاں محنت و مشقت برداشت کریں گے اتنا ہی جلد قیامت میں جنت تک پہنچ جائیں گے اور ہم میں سے جو لوگ دنیا میں اعمال مذکورہ میں کوتاہی کریں گے وہ قیامت میں بھی پیچھے رہ کر جہنم میں پڑ جائیں گے۔

۲؎ ''مِضْمَارٌ'' اس میدان کو کہتے ہیں جس میں گھوڑوں کے رفتار کی مشق کرائی جاتی ہے جس کا طریقہ ہوتا ہے کہ نئے گھوڑے کو ایک روز تھوڑی غذا دی جاتی ہے اور تھوڑا دور دوڑایا جاتا ہے، دوسرے روز غذا میں بھی زیادتی کی جاتی ہے اور دوڑ میں بھی۔ اسی طرح ایک مدت تک غذا بڑھاتے جاتے ہیں اور دوڑ بھی زیادہ کرتے جاتے ہیں۔ اس مدت کے بعد اسی ترتیب سے غذا کم (بقیہ صفحہ مابعد)

وَ غَدًا السِّبَاقَ، وَ السَّبَقَةُ الْجَنَّةُ، وَ الْغَايَةُ النَّارُ، اَ فَلَا تَآئِبٌ مِّنْ خَطِيْٓئَتِهٖ قَبْلَ مَنِيَّتِهٖ؟ اَلَا عَامِلٌ لِّنَفْسِهٖ قَبْلَ يَوْمِ بُؤْسِهٖ؟ اَلَا وَ اِنَّكُمْ فِيْٓ اَيَّامِ اَمَلٍ مِّنْ وَّرَآئِهٖ اَجَلٌ، فَمَنْ عَمِلَ فِيْٓ اَيَّامِ اَمَلِهٖ قَبْلَ حُضُوْرِ اَجَلِهٖ فَقَدْ نَفَعَهٗ عَمَلُهٗ وَ لَمْ يَضُرُّهُ اَجَلُهٗ، وَمَنْ قَصَّرَ فِيْٓ اَيَّامِ اَمَلِهٖ

(بروز قیامت) آگے بڑھنا ہے اور سبقت تو بہشت ہے اور غایت جہنم ہے۔ ۱؎ پس کیا کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو اپنی موت کے قبل اپنے گناہ سے توبہ کرلے؟ اور کیا کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو اپنے روز آفت (قیامت) کے قبل اپنے لیے عمل کرلے؟ دیکھو یہ سمجھ رکھو کہ تم ایسے زمانہ امید میں ہو جس کے پیچھے موت کھڑی ہے۔ ۲؎ تو جو شخص موت پہنچنے کے قبل اپنے زمانہ امید میں عمل (خیر) کرلے گا اس کو وہ عمل نفع پہنچائے گا اور موت بھی کچھ نہ بگاڑ سکے گی۔ ۳؎ اور

(بقیہ صفحہ ماقبل) کرتے جاتے ہیں اور جہاں تک دوڑنے کی قوت پیدا ہوگئی تھی اس کو اسی طرح باقی رکھتے ہیں یہاں تک کہ پہلے روز جو نہایت کم غذا دی گئی تھی وہ غذا رہ جاتی ہے اور رفتار وہ جو سب سے زیادہ ہوگئی تھی۔ اسی وجہ سے گھوڑا پہلے تو موٹا ہوتا ہے کیونکہ اس کی خوراک میں برابر اضافہ کرتے ہیں لیکن جب اس کی خوراک کم کرنے لگتے ہیں اور رفتار اتنی ہی رکھتے ہیں جتنی زیادہ سے زیادہ خوراک کے وقت تھی تو آہستہ آہستہ لاغر ہوتا ہے یہاں تک کہ آخر میں بہت لاغر اور نہایت درجہ تیز رفتار ہوجاتا ہے۔ یہ تدبیر اکثر چالیس روز میں ختم کردی جاتی ہے۔ پس دراصل اسی زمانہ ریاضت کو مضمار کہتے ہیں۔ پھر اس میدان کو بھی مضمار کہنے لگے جس میں یہ ریاضت کرائی جاتی ہے۔ لہٰذا حضرتؑ کے کلام ''اَلَا وَ اِنَّ الْيَوْمَ الْمِضْمَارَ'' کے بھی دو ترجمہ ہیں ایک یہ کہ آج کا دن (دنیاوی زندگی) زمانۂ عمل ہے اور دوسرا وہ جو متن کے نیچے لکھا گیا ہے یعنی آج کا دن (دنیاوی زندگی) میدانِ عمل ہے۔ لیکن مقصود دونوں کا ایک ہی ہے کہ دنیا عمل کرنے کا مقام یا وقت ہے۔ یعنی دنیا میں عمل ہی کرنا چاہیے کہ اس کے بعد جو زمانہ آئے گا اس میں اپنے اپنے اعمال کے مطابق جنت کی طرف لپکتے ہوئے چلنے کی قوت حاصل رہے گی۔ جو یہاں ریاضت وعبادت میں زیادہ مشغول رہا ہوگا وہ وہاں بھی آگے بڑھ جائے گا اور جو جو یہاں کوتاہی کرے گا یا کرتا رہا ہوگا وہ وہاں بھی پیچھے رہ جائے گا''۔

۱؎ سبقت اور غایت کا ترجمہ علیحدہ نہیں کیا گیا بلکہ ان دونوں لفظوں کو یوں ہی رہنے دیا گیا کیونکہ دونوں کے فرق کے واضح کرنے کے لیے علیحدہ علیحدہ لفظ ملنا مشکل تھا اور تفصیلی فرق کو جناب سید رضی علیہ الرحمہ جامع کتاب نے اس خطبہ کے ذکر کے بعد بیان کیا ہے۔

۲؎ یعنی دنیا کی زندگی کے بعد بھی ایک زندگی آنے والی ہے جس کا یقین ہر شخص کو ہے اور جس میں کوئی شبہ نہیں ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ جو شخص اس زندگی میں جیسا عمل کرے گا ویسا ہی عوض اس کو آخرت میں خدا کی درگاہ سے حاصل ہوگا۔ پس دنیاوی زندگی امیدواری کی زندگی ہے کہ جو کام کرتا ہے کسی امید پر، جب موت آئے گی تو اس کے بعد اس امیدواری کا نتیجہ ظاہر ہوگا۔

۳؎ ان کل جملوں کا مطلب یہ ہے کہ ہر انسان کو اس امر کا یقین رکھنا چاہیے کہ دنیا کی زندگی چندروزہ ہے جس کے ختم ہونے کے بعد موت یقیناً پہنچ جانے والی ہے اور پھر قیامت بھی حتماً آئے گی جس میں ہر شخص کے اعمال خیر وشر کا حساب باقاعدہ لیا جائے گا اور اچھے کاموں کی جزا اور برے کاموں کی سزا علیٰ قدرِ مراتب دی جائے گی۔ پس دنیا کی رخصت اور قیامت کی آمد ہر شخص کو ہر آن (بقیہ صفحہ مابعد)

قَبْلَ حُضُوْرِ اَجَلِهٖ فَقَدْ خَسِرَ عَمَلُهٗ وَ ضَرَّهٗ اَجَلُهٗ.

جوشخص اپنے زمانۂ امید میں موت پہنچنے کے قبل تک (عمل خیر بجالانے میں) کوتاہی کرتا رہے گا اس کا (کل) عمل بھی ضائع ہوگا اور موت بھی نقصان پہنچائے گی۔ ۱؎

اَلَا فَاعْمَلُوْا فِی الرَّغْبَةِ كَمَا تَعْمَلُوْنَ فِی الرَّهْبَةِ. اَلَا وَ اِنِّیْ لَمْ اَرَ كَالْجَنَّةِ نَامَ

لہٰذا رغبت (اور اطمینان) میں (بھی اسی اہتمام سے) عمل (خیر) کرو جس طرح خوف (اور مصیبت) میں کرتے ہو۔ ۲؎ آگاہ ہو (عجیب بات ہے) کہ میں نے نہ

(بقیہ صفحہ ماقبل) پیش نظر رکھنی چاہیے کہ اگر ایسا کرے گا اور دنیاوی فریب میں مبتلا ہو کر آخرت سے غافل نہ ہو جائے گا تو اس چند روزہ زندگی میں قیامت کے عرصہ حساب و کتاب سے جلد گزر جانے کے اسباب مہیا کرنے کی کوشش کرتا رہے گا اور وہ یہی ہے کہ اپنے گزشتہ گناہوں سے توبہ و استغفار کر کے آئندہ اعمال صالحہ میں مشغول ہو اور جس قدر ممکن ہو مرضیات خداوند عالم کو حاصل کرے کہ ایسا شخص قیامت میں ان لوگوں سے کہیں زیادہ آگے نکل جائے گا جو نہ تو اپنے گناہوں سے یہاں توبہ کریں اور نہ اعمال صالحہ بجالائیں اور وہ توبہ و عمل خیر کرنے والا دنیا میں جب تک رہے گا اطمینان سے زندگی بسر کرے گا کہ موت آئے گی بھی تو اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے گی کیونکہ یہ تو پہلے ہی سے متنبہ اور تائب ہو کر اعمال خیر کا ذخیرہ جمع کر چکا ہے اب باقی ہی کیا رہا ہے جس کے انجام دینے کا موقع موت اس سے چھین لے گی۔

۱؎ یعنی جو شخص قیامت کے آنے کو پیش نظر نہ رکھے گا اور اعمال صالحہ کے ذخیرہ کی فکر سے غافل ہو کر دنیاوی امور میں مشغول رہے گا وہ اس امید میں رہے گا کہ ان لذتوں سے اچھی طرح مزہ حاصل کرنے اور مال و دولت، جاہ و حشمت سے پورے طور پر بہرہ مند ہونے کے بعد آخر وقت میں اپنے گناہوں سے توبہ بھی کر لوں گا اور اعمال صالحہ بجالا کر آخرت کا سامان بھی کر لوں گا۔ مگر موت کا وقت تو کسی کو معلوم نہیں اور نہ موت کسی کو کچھ موقع دیتی ہے پس ایسے شخص کا انجام یہ ہوگا کہ دفعتاً موت آ پہنچے گی پھر اس کو نہ توبہ، استغفار کرنے کا وقت ملے گا اور نہ اعمال خیر کے بجالانے کا۔ پس موت اس کا سخت نقصان کر دے گی کہ نفع حقیقی و دائمی کے حاصل کرنے کا موقع نہ دے گی اور اس نے جو کچھ عمل خیر کیا ہے وہ بھی ان گناہوں کے سبب سے زائل ہو جائے گا جو اس عمل خیر کے کھا جانے والے تھے کیونکہ ان گناہوں سے اس نے توبہ تو کی نہیں جو ان کا اثر باطل ہو۔ غرض یہ شخص موت پہنچنے کے وقت بالکل ششدر اور حیران ہو کر رہ جائے گا اور سخت ضرر میں مبتلا ہوگا جس کا اثر قیامت میں ظاہر ہوگا۔

۲؎ مقصود یہ ہے کہ اس میں شک نہیں جب کوئی شخص مصیبت یا آفت یا مرض یا فقر یا خوفِ ظالم وغیرہ کی اذیت میں مبتلا ہوتا ہے تو خداوند عالم کی درگاہ میں نہایت الحاح و زاری اور تضرع و بے قراری سے شب و روز دعا کرتا رہتا ہے۔ ہر وقت اسی کی یاد رکھتا اور اسی کی طرف متوجہ رہتا ہے اور نہایت اخلاص اور کامل آداب و شرائط سے اس کی یاد اور عبادت کرتا اور اس کے احکام کو بجالاتا اور اس کے نواہی سے بچتا ہے۔ لیکن جب وہ سختی و مصیبت کا زمانہ ختم ہو جاتا ہے تو نہ وہ عبادت رہتی ہے نہ وہ دعا، نہ وہ اطاعتِ اوامر اور نہ وہ اجتناب از نواہی بلکہ بالکل بے غرض بن جاتا ہے۔ (چنانچہ انسان کی اس حالت کی شکایت خدا نے قرآن مجید میں بھی متعدد مقامات پر (بقیہ صفحہ مابعد)

طَالِبُهَا، وَ لَا كَالنَّارِ نَامَ هَارِبُهَا، اَلَا وَ اِنَّهٗ مَنْ لَّا يَنْفَعُهُ الْحَقُّ يَضُرُّهُ الْبَاطِلُ، وَ مَنْ لَّا يَسْتَقِيْمُ بِهِ الْهُدٰى

بہشت ایسی (کوئی نعمت) دیکھی جس کے شائق (اس طرح) سور ہے ہیں اور نہ جہنم ایسا (عذاب) جس سے بچنے والے اس طرح خواب (غفلت) ۱؎ میں پڑے ہیں۔ سمجھ رکھو کہ جس کو حق سے نفع نہ حاصل ہوگا اس کو باطل سے نقصان ضرور پہنچے گا۔ ۲؎ اور جس کو ہدایت سیدھی راہ پر نہیں

(بقیہ صفحہ ماقبل) کی ہے جن سے ایک آیت یہ ہے:

﴿ وَ اِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖۤ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآىِٕمًا ۚ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَاۤ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ ﴾ (سورۂ یونس، آیہ ۱۲)

یعنی جب انسان کو کوئی نقصان یا مصیبت پہنچتی ہے تو لیٹ کر یا بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر غرض ہر حالت سے خدا سے دعائیں مانگنے لگتا ہے پھر جب خدا اس مصیبت کو اس سے دفع کر دیتا ہے تو اس طرح چلتا پھرتا نظر آتا ہے گویا خدا سے کوئی غرض ہی نہ تھی اور اس کو کسی مصیبت کے وقت پکارا ہی نہ تھا۔

پس یہ حالت نہایت درجہ خود غرضی اور احسان فراموشی کی ہے کیونکہ نمک حلال اور شکر گزار بندوں کی تو یہ شان ہے کہ خدا کی عبادت اور اطاعت ہر حالت میں ایک طرح کرتے ہیں خواہ راحت و آسائش میں ہوں، خواہ اذیت اور زحمت میں، خواہ ذلت اور عسرت میں ہوں، خواہ فقر اور مسکنت میں، ہر حالت میں عبادت خدا اور توجہ الی الرب کی مساوی صورت رہنی چاہیے نہ مختلف اور یہ کہ اس کی عبادت کسی غرض کے لیے نہ کرنی چاہیے بلکہ محض اس خیال سے کہ وہ ذات تبارک وتعالیٰ مستحق عبادت ہے۔

۱؎ یعنی ہر نعمت کی تو یہ حالت ہے کہ انسان اس کے حاصل کرنے کے لیے اپنی تمام کوشش صَرف کر دیتا ہے اور اسی طرح ہر آفت وسزا کی یہ حالت ہے کہ جس کو اس کا ضرر معلوم ہو جاتا ہے وہ اس سے بچنے کی تمام تدبیر اختیار کرتا ہے لیکن یہ صرف جنت اور جہنم ہی ایسی نعمت اور آفت یا عذاب ہے کہ نہ اس کے طالب اس کے حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور نہ اس سے بچنے والے اس سے محفوظ رہنے کی فکر کرتے ہیں۔ یعنی یہ نہایت عجیب امر ہے کہ لوگوں کو جنت کی لذتوں کا علم بھی ہے پھر بھی خواب غفلت میں پڑے ہیں، اس کے تحصیل کا سامان نہیں کرتے اور جہنم کی اذیتوں کا علم بھی ہے پھر بھی اطمینان کی نیند سو رہے ہیں اور اس سے بچنے کے اسباب مہیا نہیں کرتے۔ غرض تعجب اور حیرت جنت اور جہنم پر نہیں بلکہ انسان پر ہے جو ہر امر سے غافل ہیں اور قیامت کے منظر اور وہاں کے نتیجہ سے لاپرواہ ہیں۔ جس کا باعث یہی ہے کہ درحقیقت وہ اس سے بے خبر ہیں، صرف زبان سے اقرار کرتے ہیں اور شوق ونفرت کا اظہار۔

۲؎ علامہ ابن میثم علیہ الرحمہ اس جملہ کی شرح میں فرماتے ہیں کہ یہاں حضرتؑ کی مراد حق سے یہ ہے کہ انسان عقائد حقہ کے مطابق اعمال صالحہ کے بجالانے کی پابندی کر کے خدا کی جانب متوجہ ہو اور باطل سے مراد یہ ہے کہ خدا کی جانب سے روگردانی کر کے غیر کی طرف متوجہ ہو جو آخرت میں کوئی نفع نہیں پہنچا سکتا۔ پس اس بیان میں اس امر کی تنبیہ ہے کہ جو شخص حق کو نہ اختیار کرے گا یعنی خدا کے مرضیات کو نہ بجالائے گا وہ باطل کو اختیار کرے گا اور باطل یقیناً نقصان پہنچائے گا۔ جس کی توضیح یہ ہے کہ جو شخص (بقیہ صفحہ مابعد)

يَجُرُّ بِهِ الضَّلَالُ اِلَى الرَّدٰى، اَلَا وَ اِنَّكُمْ قَدْ اُمِرْتُمْ بِالظَّعْنِ، وَ دُلِلْتُمْ عَلَى الزَّادِ. وَ اِنَّ اَخْوَفَ مَآ اَخَافُ

لگائے گی اس کو گمراہی ہلاکت میں ضرور کھینچ لائے گی۔۱؎ (یہ بھی) جان لو کہ تم کو (دنیا سے) سفر کرنے کا حکم دیا جا چکا ہے۲؎ اور زاد راہ بھی بتا دی گئی ہے (لہٰذا سفر کا تہیہ کرو)۳؎ کیونکہ مجھے جتنی باتوں کا تمہارے نسبت خوف

(بقیہ صفحہ ماقبل) مرضیات خدا کو بجالائے گا اس کو خدا کی نعمتوں کا نفع بھی ضرور حاصل ہوگا۔ پس جو شخص اس کی نعمتوں کا نفع نہ حاصل کر سکے گا معلوم ہوگا کہ وہ مرضیات خدا کو بجانہ لایا اور مرضیات خدا کا بجانہ لانا ہی اس کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ باطل کا پیرو اور حق کا تارک ہے۔ کیونکہ انسان کے عقائد اور اعمال یا تو احکام خدا کے مطابق ہوں گے یا مخالف، اگر مطابق ہیں تو یہی حق ہے اور اگر مخالف ہیں تو یہی باطل ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اگر پہلا (حق) نہ ہوگا تو دوسرا (باطل) ضرور ہوگا۔ پس جب انسان باطل کا پیرو ٹھہرا تو باطل کا ضرر اور نقصان بھی یقیناً اُٹھائے گا کیونکہ یہ اس سے علیحدہ تو ہو نہیں سکتا۔ حکما نے اس کی تصریح کر دی ہے کہ نفس ناطقہ بے شغل نہیں رہ سکتا لہٰذا اگر حق پر ان کا نہ عمل ہوگا تو باطل پر ضرور ہوگا ورنہ تعطل نفس ناطقہ لازم آئے گا جو محال ہے لہٰذا اگر باطل کو اس نے اختیار کیا تو نقصان یقینی ہے۔

۱؎ یہاں ہدایت سے مراد علم اور ایمان کا نور اور ضلال سے مراد جہالت اور حکم خدا کی نافرمانی ہے۔ پس مطلب یہ ہے کہ جس شخص کے علم اور ایمان کا نور اس کو سیدھی راہ پر نہیں لگا دے گا اس کو گمراہی یقیناً ٹیڑھی راہ پر لگا دے گی کیونکہ یا تو سیدھی راہ ہے یا ٹیڑھی۔ پس جو سیدھی راہ پر لگ نہ سکا وہ ضرور ٹیڑھی ہی راہ پر لگے گا اور یہ بھی ثابت ہے کہ سیدھی راہ پر لگانے والا ایمان و علم اور اعمال صالحہ ہی ہیں اور ٹیڑھی راہ پر لگانے والا جہالت اور کفر و فسق و فجور۔

۲؎ اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ انسان کو دنیا کی زینت اور اس کی فریب دہ زندگی سے بچنے اور آخرت کے سامان میں مشغول رہنے کا حکم دیا گیا ہے جس کے متعلق حدیثوں سے کتب احادیث بھری ہوئی ہیں۔ خود کلام مجید میں بھی کئی موقع پر اس کا حکم ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے:

﴿فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ ؕ اِنِّيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ﴾ (سورۂ الذاریات، آیہ ۵۰)
یعنی تم لوگ دنیا سے خدا کی طرف بھاگو یقیناً میں تم کو کھلم کھلا ڈرانے والا ہوں۔

دوسرا ارشاد ہے:

﴿سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ﴾ (سورۂ الحدید، آیہ ۲۱)
یعنی تم لوگ اپنے پروردگار کی بخشش اور بہشت کی طرف لپک کے آگے بڑھ جاؤ جس کا عرض آسمان اور زمین کے عرض کے برابر ہے۔

۳؎ جیسا کہ کلام مجید میں ہے:

﴿وَ تَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى﴾ (سورۂ البقرہ، آیہ ۱۹۷)
یعنی توشہ آخرت حاصل کرو اور بہترین زاد تقویٰ ہے۔

عَلَيْكُمْ: اتِّبَاعُ الْهَوٰى وَ طُوْلُ الْاَمَلِ، تَزَوَّدُوْا فِي الدُّنْيَا مِنَ الدُّنْيَا مَا تَحْرُزُوْنَ بِهٖٓ اَنْفُسَكُمْ غَدًا.

(قَالَ الشَّرِيْفُ الرَّضِيُّ رَحِمَهُ اللّٰهُ) اَقُوْلُ: اِنَّهٗ لَوْ كَانَ كَلَامٌ يَّاْخُذُ بِالْاَعْنَاقِ اِلَى الزُّهْدِ فِي الدُّنْيَا، وَ يَضْطَرُّ اِلٰى عَمَلِ الْاٰخِرَةِ لَكَانَ هٰذَا الْكَلَامُ، وَ كَفٰى بِهٖ قَاطِعًا لِّعَلَآئِقِ الْاٰمَالِ، وَ قَادِحًا زِنَادَ الْاِتِّعَاظِ وَا لْاِزْدِجَارِ، وَ مِنْ اَعْجَبِهٖ قَوْلُهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ: «اَلَا وَ اِنَّ الْيَوْمَ الْمِضْمَارَ وَ غَدًا السِّبَاقَ، وَ السَّبَقَةُ الْجَنَّةُ، وَ الْغَايَةُ النَّارُ»، فَاِنَّ فِيْهِ مَعَ فَخَامَةِ اللَّفْظِ وَ عِظَمِ قَدْرِ الْمَعْنٰى وَ صَادِقِ التَّمْثِيْلِ وَ وَاقِعِ التَّشْبِيْهِ سِرًّا عَجِيْبًا، وَ مَعْنًى لَّطِيْفًا، وَ هُوَ قَوْلُهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ: «وَ السَّبَقَةُ الْجَنَّةُ وَ الْغَايَةُ النَّارُ»، فَخَالَفَ بَيْنَ اللَّفْظَيْنِ لِاخْتِلَافِ الْمَعْنَيَيْنِ الْمُفَسَّرَيْنِ، وَ لَمْ يَقُلْ: وَ السَّبَقَةُ النَّارُ، كَمَا قَالَ: «وَ السَّبَقَةُ الْجَنَّةُ»..

ہے ان میں سب سے زیادہ خوفناک امر تمہارا (اپنی نفسانی) خواہشوں کی پیروی اور (دنیا میں رہنے کی) دور و دراز تمنائیں کرنا ہے۔ (لہٰذا اس سے بچنے کے لیے) دنیا سے (عمل خیر کا) وہ سامانِ سفر حاصل کر لو جس سے کل (قیامت میں) اپنی جانوں کی حفاظت کر سکو۔

(جناب سید رضی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ) میرا اعتقاد ہے کہ اگر کوئی کلام ایسا ہو سکتا ہے جو (لوگوں کی) گردنیں پکڑ کر دنیا سے متنفر اور آخرت کے لیے بے چین کر دے تو وہ یہی کلام (حضرت امیر المومنینؑ) ہے اور (دنیاوی) آرزوؤں کے تعلقات کو قطع کرنے اور وعظ و نصیحت حاصل کرنے کے چقماق کو روشن کرنے کے لیے یہ (کلام) کافی (وافی) ہے اور اس سے بھی زیادہ حیرت خیز حضرت علیہ السلام کا یہ جملہ ہے۔ ''اَلَا وَ اِنَّ الْيَوْمَ الْمِضْمَارَ وَ غَدًا السِّبَاقَ، وَ السَّبَقَةُ الْجَنَّةُ، وَ الْغَايَةُ النَّارُ''۔ کیونکہ اس (جملہ) میں الفاظ کی عظمت (وشوکت)، معنیٰ کے جلالت قدر، مثال کی سچّی مناسبت اور تشبیہ کی کامل مطابقت کے علاوہ ایک عجیب (وغریب اور بے مثل و نظیر) نکتہ (اور نہایت ہی) لطیف معنیٰ ہے اور وہ حضرت علیہ السلام کا یہ جملہ ہے۔ ''وَ السَّبَقَةُ الْجَنَّةُ، وَ الْغَايَةُ النَّارُ''۔ کہ (باوصفی کے دونوں کا مقصود ایک ہے مگر) حضرتؑ نے دو مختلف لفظ رکھ کر اس (دقیق) فرق کو بتا دیا جو دونوں معنوں میں ہے۔ کیونکہ آپؑ نے جس طرح (بہشت کے متعلق) ''اَلسَّبَقَةُ الْجَنَّةُ'' فرمایا (جہنم کی نسبت) ''اَلسَّبَقَةُ النَّارُ'' نہیں فرمایا اس لیے کہ

لِاَنَّ الْاِسْتِبَاقَ اِنَّمَا يَكُوْنُ اِلٰى اَمْرٍ مَّحْبُوْبٍ وَّ غَرَضٍ مَّطْلُوْبٍ، وَ هٰذِهٖ صِفَةُ الْجَنَّةِ، وَ لَيْسَ هٰذَا الْمَعْنٰى مَوْجُوْدًا فِي النَّارِ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْهَا۔

فَلَمْ يَجُزْ اَنْ يَّقُوْلَ: وَ السَّبَقَةُ النَّارُ، بَلْ قَالَ: «وَ الْغَايَةُ النَّارُ»، لِاَنَّ الْغَايَةَ قَدْ يَنْتَهِيْ اِلَيْهَا مَنْ لَّا يَسُرُّهُ الْاِنْتِهَآءُ اِلَيْهَا وَ مَنْ يَّسُرُّهٗ ذٰلِكَ، فَصَلَحَ اَنْ يُّعَبَّرَ بِهَا عَنِ الْاَمْرَيْنِ مَعًا، فَهِيَ فِيْ هٰذَا الْمَوْضِعِ كَالْمَصِيْرِ وَ الْمَالِ، قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿قُلْ تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ﴾، وَ لَا يَجُوْزُ فِيْ هٰذَا الْمَوْضِعِ اَنْ يُّقَالَ: فَاِنَّ سَبْقَتَكُمْ بِسُكُوْنِ الْبَاءِ اِلَى النَّارِ، فَتَاَمَّلْ ذٰلِكَ، فَبَاطِنُهٗ عَجِيْبٌ، وَ غَوْرُهٗ بَعِيْدٌ لَّطِيْفٌ، وَ كَذٰلِكَ اَكْثَرُ كَلَامِهٖ عَلَيْهِ السَّلَامُ.

[وَ فِيْ بَعْضِ النُّسَخِ]

وَ قَدْ جَآءَ فِيْ رِوَايَةٍ اُخْرٰى: «وَ السُّبْقَةُ الْجَنَّةُ»، بِضَمِّ السِّيْنِ، وَ السُّبْقَةُ عِنْدَهُمُ اسْمٌ لِّمَا يُجْعَلُ لِلسَّابِقِ اِذَا سَبَقَ مِنْ مَّالٍ اَوْ عَرَضٍ، وَ

استباق (آگے بڑھنے کی کوشش کرنا) کسی پسندیدہ امر اور اچھی غرض کے لیے ہوتا ہے اور (ظاہر ہے کہ) یہ صفت بہشت ہی کی ہے (کہ لوگ ادھر بڑھنے کی کوشش کریں) جہنم کو یہ بات حاصل نہیں ہے۔ خدا ہم لوگوں کو اس سے پناہ میں رکھے۔

اسی وجہ سے "وَالسَّبَقَةُ النَّارُ" کہنا جائز نہ ہوا بلکہ فرمایا "وَالْغَايَةُ النَّارُ" کیونکہ غایت (انجام کار) تک ہر شخص پہنچتا ہے خواہ اس کو وہاں تک پہنچنا ناپسند ہو یا پسند ہو۔ لہٰذا اس (لفظ غایت) سے دونوں امروں (پسندیدگی اور ناگواری) کی تعبیر کی جاسکتی ہے۔ تو یہ (لفظ غایت) اس مقام پر مثل لفظ مصیر اور مآل کے ہے (جیسا کہ) خدا فرماتا ہے: ﴿قُلْ تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ﴾ "یعنی ان لوگوں سے کہہ دو کہ خیر دنیا کا مزہ چکھ لو آخر تو تم کو جہنم کی طرف جانا ہی ہے" کہ اس مقام پر بجائے "مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ" سَبْقَتُكُمْ اِلَى النَّارِ" (بسکون باء) کہنا صحیح نہیں ہے۔ بہرکیف اس (نکتہ) میں خوب غور کرو اس لیے کہ اس کی دقت نہایت حیرت افزا اور اس کی باریکی بہت ہی مشکل اور لطیف ہے اور حضرت علیہ السلام کا اکثر کلام ایسا ہی ہے۔

اور (نہج البلاغہ) کے بعض نسخوں میں ہے کہ:

ایک روایت میں "وَ السُّبْقَةُ الْجَنَّةُ" (وارد ہوگیا) ہے یعنی سبقہ کے سین کو ضمہ (پیش) ہے اور سبقہ عرب لوگوں کے یہاں مال یا متاع سے ہر اس چیز کا نام ہے جو (کسی کام) میں آگے نکل جانے والے کے لیے (بطور

الْمَعْنَيَانِ مُتَقَارِبَانِ، لِاَنَّ ذٰلِكَ لَا يَكُوْنُ جَزَآءً عَلٰى فِعْلِ الْاَمْرِ الْمَذْمُوْمِ، وَ اِنَّمَا يَكُوْنُ جَزَآءً عَلٰى فِعْلِ الْاَمْرِ الْمَحْمُوْدِ.

انعام) مقرر کی جاتی ہے۔ (مگر دونوں روایتوں میں چنداں فرق نہیں کیونکہ) دونوں کے معنی ملتے جلتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ (انعام بھی) کسی بُرے امر کے بدلے میں نہیں ہوتا بلکہ کسی اچھے ہی کام کے لیے مقرر کیا جاتا ہے۔

❁ خطبہ: ۳۰ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

اَيُّهَا النَّاسُ! الْمُجْتَمِعَةُ اَبْدَانُهُمْ، الْمُخْتَلِفَةُ اَهْوَآءُهُمْ، كَلَامُكُمْ يُوْهِي الصُّمَّ الصِّلَابَ، وَ فِعْلُكُمْ يُطْمِعُ

خطبہ: ۳۰ (۲۹)

حضرت علیہ السلام کے ایک خطبہ کا کچھ حصّہ۔

اے وہ [1] (ناہنجار) لوگو! جن کی (صورتیں اور) اعضاء تو ملے ہوئے (نظر آتے) ہیں (لیکن) خواہشیں سب کی مختلف (اور پراگندہ) ہیں۔ تمہارا کلام تو (ایسا بہادرانہ ہوتا ہے کہ) سخت پتھروں [2] کو بھی ٹکڑے کر

---

[1] اس خطبہ میں حضرتؑ کا مقصود اہل کوفہ وعراق کو اس امر پر تنبیہ کرنا ہے کہ ان میں ایسے اوصاف پائے جاتے ہیں جو دین میں مذموم قرار دیے گئے ہیں اور جو ان کی حسنِ سیرت اور خوبیِ طبیعت کی بوتک ظاہر نہیں کرتے۔ چنانچہ اس مقصود کو حضرتؑ نے ان لوگوں کے تین امروں کی طرف اشارہ کر کے ظاہر کیا ہے۔ اول ان کے حالات۔ دوسرے ان کی باتیں۔ تیسرے ان کے افعال۔ پس ان کی حالت تو یہ ہے کہ ظاہری جسم اکٹھا اور ملے ہوئے نظر آتے ہیں مگر ہر شخص کی خواہش اور ہر ایک کی رائے علیحدہ علیحدہ اور پراگندہ ہے جو اصلی سبب ان کے ضعف اور شکستگی کا ہے اور جس سے سب نے ایک دوسرے کو اس کی مصیبت میں گرفتار چھوڑ دیا ہے اور ان کے باتوں کی یہ حالت ہے کہ ان کے سننے سے سخت اور شقی دل تک سہم جاتے ہیں اور ان باتوں کے سننے والے سمجھتے ہیں کہ اس شخص کی بات ایسی دلیرانہ ہے تو کام کیا خونخوار ہوگا کیونکہ بغیر نہایت درجہ شجاعت اور ثبات قدم کے ایسا کلام کون کرے گا۔ لیکن وہ لوگ یہ نہیں جانتے کہ یہ لوگ صرف زبانی باتیں ہی جانتے ہیں وگرنہ سچ۔ چنانچہ ان کے کلام سے اس کا ثبوت مل جاتا ہے جس کی حالت یہ ہے کہ جب جنگ چھڑ جاتی ہے اور کام کا وقت اور زبانی دعووں کے وفا کرنے کا موقع پہنچ جاتا ہے تو ہر شخص جان چرانے لگتا ہے، ایک دوسرے پر ٹالتا ہے، نئے نئے حیلے تراشتا ہے اور مختلف صورتوں سے اپنے کو شرکت سے بچا لیتا ہے۔

[2] ''اَلصُّمَّ الصِّلَابَ'' کے متعلق علامہ ابن میثم علیہ الرحمہ اپنی شرح نہج البلاغہ میں تحریر فرماتے ہیں:

وَ اسْتَعَارَ لَفْظَيِ الصُّمَّ الصِّلَابَ مِنْ اَوْصَافِ الْحِجَارَةِ لِلْقُلُوْبِ الَّتِيْ تَضْعُفُ مِنْ سَمَاعِ كَلَامِهِمْ كَمَا شَبَّهَ الْقُرْاٰنُ الْكَرِيْمُ بِهَا: ﴿ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ﴾

یعنی حضرتؑ نے دونوں لفظوں ''الصُّمَّ الصِّلَابَ'' کو جو پتھر کے اوصاف سے ہیں ان دلوں کے لیے بطور استعارہ

(بقیہ صفحہ مابعد)

فِيْكُمُ الْاَعْدَآءَ! تَقُوْلُوْنَ فِي الْمَجَالِسِ: كَيْتَ وَ كَيْتَ، فَاِذَا جَآءَ الْقِتَالُ قُلْتُمْ: حِيْدِيْ حَيَادِ! مَا عَزَّتْ دَعْوَةُ مَنْ دَعَاكُمْ، وَ لَا اسْتَرَاحَ قَلْبُ مَنْ قَاسَاكُمْ، اَعَالِيْلُ بِاَضَالِيْلَ، سَئَلْتُمُوْنِي التَّطْوِيْلَ، دِفَاعَ ذِي الدَّيْنِ الْمَطُوْلِ، لَا يَمْنَعُ الضَّيْمَ الذَّلِيْلُ! وَلَا يُدْرَكُ الْحَقُّ اِلَّا بِالْجِدِّ!.

دے اور تمہارا کام ایسا (بزدلانہ) ہوتا ہے جس سے دشمن تمہاری طمع کریں (کہ ان کا مار لینا کیا چیز ہے)۔ مجمعوں میں تو کہتے ہو یہ کریں گے وہ کریں گے!!۱ اور جب جنگ (سر پر) پہنچ جاتی ہے تو کہنے لگتے ہو، الگ الگ!۲ (غرض) جس نے تمہیں بلایا اس کو (تمہارا بلانا راس نہ آیا (یا سہا نہیں) اور جو تمہارے رنج میں شریک ہوا اس کے دل کو آرام نصیب نہ ہوا کیونکہ تمہارے عذر ضلالت (کے حیلے) ہیں جس طرح قرض دار شخص حیلہ حوالہ کر کے ٹالتا ہے۔ (سچ ہے) ذلیل شخص ظلم کو روک نہیں سکتا اور حق بغیر مشقت کے مل نہیں سکتا۔

اَيَّ دَارٍ بَعْدَ دَارِكُمْ تَمْنَعُوْنَ؟ وَ مَعَ اَيِّ اِمَامٍ بَعْدِيْ تُقَاتِلُوْنَ؟ الْمَغْرُوْرُ ـ وَاللّٰهِ ـ

اب تم کس گھر کی حفاظت کرو گے جب اپنے گھر کو نہیں بچاتے اور میرے بعد کس امام کی معیت میں جہاد کرو گے؟۳ بخدا (غافل اور) دھوکا کھانے والا وہ شخص ہے جو

استعمال فرمایا ہے جو ان لوگوں کی باتوں سے نرم اور کمزور ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ خداوند عالم نے بھی سخت دلوں کو پتھر سے تشبیہ دی ہے کہ فرمایا ہے: ﴿ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ﴾ (سورۂ بقرہ، آیہ ۷۴) یعنی ''یہ دل مثل پتھر کے سخت ہیں یا اس سے بھی زیادہ کرخت''۔

۱ ''كَيْتَ كَيْتَ''، عربی زبان میں اصطلاح ہے بمعنی فلاں فلاں بات اور ''حیدی حیاد'' بھی ایک اصطلاح ہے جس کو جنگ سے بھاگنے والے یا اس سے ڈرنے والے استعمال کرتے ہیں یعنی اے جنگ مجھ سے علیحدہ رہ، مجھے جانے دے، مجھے بچا لے۔

۲ یعنی تمہاری باتوں سے تو آدمی کیا پتھر تک کمزور اور شکستہ ہو جاتا ہے لیکن جب دشمن تمہاری حرکات و سکنات کو دیکھتے ہیں تو سمجھ جاتے ہیں کہ ان کی باتیں محض باتیں ہی ہیں۔ اور ان کے ہاتھ، پیر، دل و دماغ سے کچھ ہونے والا نہیں ہے لہٰذا اب بجائے خوفزدہ ہونے کے ان کو تمہاری طمع دامنگیر ہوتی ہے کہ کسی طرح جلد ہم ان لوگوں تک پہنچ جائیں اور انہیں مار کر رکھ دیں۔

۳ بقول علامہ ابن ابی الحدید اس خطبہ کو حضرتؑ نے ضحاک بن قیس کے غارت کے متعلق ارشاد فرمایا ہے جس کا واقعہ یہ ہے کہ واقعہ حکمین کے بعد ۳۹ھ میں جب معاویہ کو معلوم ہوا کہ حضرت علیؑ شام کی طرف اس کی خبر لینے کو آ رہے ہیں تو نہایت درجہ خوفزدہ ہوا، شہر سے باہر نکل کر اپنے لوگوں کو جمع کیا اور حضرت علیؑ سے مقابلہ کرنے پر خطبہ دیا اور تدبیر جنگ کے متعلق دیر تک ہر شخص سے مشورہ کیا، جب کوئی صورت کامیابی کی نہ نکلی تو مکر و فریب کی راہیں اختیار کیں اور ضحاک بن قیس کو تین چار ہزار فوج کے ساتھ کوفہ (بقیہ صفحہ مابعد)

مَنْ غَرَرْتُمُوْهُ، وَ مَنْ فَازَ بِكُمْ فَقَدْ فَازَ ـ وَ اللّٰهِ ـ بِالسَّهْمِ الْاَخْيَبِ، وَمَنْ رَّمٰى بِكُمْ فَقَدْ رَمٰى بِاَفْوَقَ نَاصِلٍ.

اَصْبَحْتُ وَاللّٰهِ! لَآ اُصَدِّقُ قَوْلَكُمْ، وَ لَآ اَطْمَعُ فِيْ نَصْرِكُمْ، وَ لَآ اُوْعِدُ الْعَدُوَّ بِكُمْ. مَا بَالُكُمْ؟ مَا دَوَاؤُكُمْ؟ مَا طِبُّكُمْ؟ اَلْقَوْمُ رِجَالٌ اَمْثَالُكُمْ، اَ قَوْلًا بِغَيْرِ عِلْمٍ! وَ غَفْلَةً مِّنْ غَيْرِ وَرَعٍ! وَ طَمَعًا

تمہارے دھوکا میں آئے اور جو تمہارے ذریعہ سے کامیاب اس نے بخدا کامیابی میں وہ تیر پایا جس کا کوئی حصّہ ہی نہیں[1] اور جس نے تمہارے ذریعہ سے کسی کو تیر مارا اس نے ٹوٹا ہوا بے سرا تیر مارا جو شکار کو لگتا نہیں)

اب تو بخدا میں ایسی حالت میں ہو گیا کہ نہ تمہاری کسی بات کی تصدیق کر سکتا ہوں اور نہ تمہاری مدد کی امید رکھ سکتا ہوں اور نہ کسی دشمن کو تم سے ڈرا سکتا ہوں۔ آخر تمہارا کیا حال ہے؟ تمہاری کیا دوا ہے؟ اور تمہارا کیا علاج ہے؟ یہ لوگ (اہل شام بھی تو) تمہارے ہی ایسے مرد ہیں (پھر کیوں ان سے ڈرتے ہو جو نہیں لڑتے)۔ کیا بے جانی (بوجھی) بات (کہتے)، بے خوف کی غفلت (برتتے) اور

(بقیہ صفحہ مابعد) کے اطراف میں لوٹ مار کرنے کے لیے روانہ کیا اور اس سے کہا کہ اس طرف علیؑ کی جماعت ہے جس کو پاؤ لوٹ لو اور کوئی چھاؤنی یا فوج ملے تو اس پر بھی چھاپہ مارو اور جب صبح ہونے لگے تو وہاں سے چل دو، پھر دوسرے مقام پر شب کو چھاپہ مارو اور جب معلوم ہو کہ کوئی فوج تمہارے مقابلہ کے لیے بھیجی گئی ہے تو وہاں نہ ٹھہرنا ورنہ لڑ کر بھاگنا پڑے گا''۔

پس ضحاک لوٹ مار اور حضرت علیؑ کے کارندوں کو پریشان کرتا ثعلبیہ پہنچا جہاں حاجیوں کے ایک قافلہ کو لوٹ لیا۔ وہاں سے قطقطانہ تک آ پہنچا۔ جناب امیرؑ کو یہ خبر معلوم ہوئی تو لوگوں سے اس کے مقابلہ کے لیے کہا مگر سب جان چرانے لگے جس پر رنجیدہ ہو کر حضرتؑ نے یہ خطبہ ارشاد فرمایا کہ تم لوگ دیکھنے میں تو ایک اور متحد معلوم ہوتے ہو لیکن تمہارے دل و دماغ مفسد خیالات کے سبب سے پراگندہ ہیں۔ بعد ازاں حضرتؑ نے حجر بن عدی کو کچھ فوج کے ساتھ ضحاک کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ حجر کوچ کرتے ہوئے چلے گئے یہاں تک کہ مقام تدمر پر دونوں فوجوں میں مقابلہ ہوا اور تھوڑی ہی دیر میں معاویہ کا لشکر اپنے سردار ضحاک بن قیس کے ساتھ بھاگ کھڑا ہوا۔ اس جنگ میں ضحاک کے انیس اور حجر کے صرف دو آدمی مارے گئے۔ رات کو معاویہ کا لشکر اس خاموشی سے بھاگا کہ حجر بن عدی کو خبر نہ ہو سکی۔ جب صبح کو ڈھونڈنے لگے تو وہاں کسی کا بھی پتہ نہ تھا۔ (تاریخ کامل، مطبوعہ مصر، ج ۶، ص ۱۵۱، وشرح ابن ابی الحدید، مطبوعہ مصر، ج ۴، ص ۱۵۴ وغیرہ)

[1] عرب میں لوگ تیروں سے جُوا کھیلتے تھے جس میں ہر تیر کا مختلف حصّہ ہوتا تھا اور بعض تیر کا کوئی حصّہ نہیں رکھا جاتا۔ اسی کو حضرتؑ ''سہم اخیب'' فرماتے ہیں یعنی تم لوگ ایسے بے مصرف ہو کہ اگر تم سے کسی جنگ میں فتح بھی حاصل ہو تو بیکار، جس سے نہ فاتح کو کوئی نفع پہنچے نہ مخالف کو کوئی نقصان۔

فِیْ غَیْرِ حَقٍّ؟!.

بغیر استحقاق کے لالچ (کرتے ہو)۔ ۱؎



❁ خطبہ :۳۱ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

فِیْ مَعْنٰی قَتْلِ عُثْمَانَ

خطبہ:۳۱(۳۰)

حضرت علیہ السلام کے ایک خطبہ کا کچھ حصّہ

قتل عثمان (کا حکم دینے یا اس سے منع کرنے) کے بارے میں۔ ۲؎

۱؎ یعنی زبان سے تو لڑنے کا وعدہ کرتے ہو مگر دل میں جنگ کا ارادہ نہیں ہے تو جس بات کو دل سے نہیں چاہتے ہو اس کو کہتے ہو اور بغیر کسی معقول عذر کے جنگ سے غافل ہو رہے ہو۔ کیونکہ اگر کسی دینی یا دنیوی مصلحت کے سبب سے یہ غفلت کرتے تو خیر معذور ہوتے مگر تمہیں تو کوئی عذر نہیں ہے۔ دشمن پر غلبہ اور اس پر فضیلت حاصل کرنے کی طمع تو رکھتے ہو مگر بلا استحقاق کیونکہ یہ تو جب ہوتا کہ تم ان سے لڑتے، جہاد کرتے جس کی طرف قرآن مجید میں بھی اشارہ ہے:

﴿ وَّ یُحِبُّوْنَ اَنْ یُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ یَفْعَلُوْا ﴾ (سورۂ آل عمران، آیہ ۱۸۸)

یعنی جو کام نہیں کرتے اس کے بارے میں چاہتے ہو کہ تعریف کی جائے۔

۲؎ علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں:

هٰذَا الْكَلَامُ بِظَاهِرِهٖ يَقْتَضِیْ اَنَّهٗ مَا اَمَرَ بِقَتْلِهٖ وَلَا نَهٰی عَنْهُ فَيَكُوْنُ دَمُهٗ عِنْدَهٗ فِیْ حُكْمِ الْاُمُوْرِ الْمُبَاحَةِ الَّتِیْ لَا يُؤْمَرُ بِهَا وَلَا يُنْهٰی عَنْهَا۔

یعنی اس کلام کا مقتضی بظاہر یہ ہے کہ حضرت علیؑ نے نہ تو عثمان کے قتل کا حکم دیا نہ اس سے لوگوں کو منع کیا، لہٰذا عثمان کا خون کرنا حضرتؑ کے نزدیک ان مباح امور میں ہوگا جن کا نہ حکم دیا جاتا ہے اور نہ ان سے منع کیا جاتا ہے۔

یعنی شرعاً عثمان کے قتل کا نہ حکم دینا واجب تھا نہ اس سے منع کرنا ضروری تھا۔ مگر خود ابن ابی الحدید اس کو رد کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مراد اس نہی سے منع ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے ''اَمِیْرٌ نَهَبَ'' اموال رعایا سے نہی کرتے ہیں یعنی منع کرتے ہیں تو مراد اس سے یہ ہوئی حضرتؑ نے قتل عثمان سے منع نہیں کیا یعنی روکا نہیں کیونکہ حضرتؑ اس پر قادر نہ تھے اور جانتے تھے ہمارے روکے یہ امر رک نہیں سکتا، ورنہ تمامی تواریخ و سیر میں اس کی تصریح موجود ہے کہ حضرتؑ نے حتی الامکان لوگوں کو نہی کیا اور سمجھایا کہ یہ قتل مناسب نہیں ہے اس لیے حضرتؑ فرماتے ہیں۔ ''اَوْ نَهَيْتُ عَنْهُ لَكُنْتُ نَاصِرًا'' کہ اگر ہم روکتے تو ناصر و مددگار رہوتے، حالانکہ ایسا نہیں ہے نہ ہم نے حکم بقتل دیا کہ قاتل کہلائیں اور نہ اس طرح منع کیا کہ ہم ناصر کہلائیں۔ کیونکہ نہی المنکر کے لیے ضرورت اس کی ہے کہ ناہی کو تاثیر کی بھی امید ہو۔

اس کے بعد علامہ ممدوح نے تاریخ طبری سے ان وجوہ و اسباب کو تفصیل سے ذکر کیا ہے جن کے سبب سے لوگ عثمان کے دشمن ہو گئے اور آخر ان کو قتل کیا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ عثمان نے بہت سی بدعتیں حادث کیں جس کے سبب سے لوگ عثمان کے (بقیہ صفحہ مابعد)

لَوْ اَمَرْتُ بِهٖ لَكُنْتُ قَاتِلًا، اَوْ نَهَيْتُ عَنْهُ لَكُنْتُ نَاصِرًا، غَيْرَ اَنَّ مَنْ نَّصَرَهٗ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يَّقُوْلَ: خَذَلَهٗ مَنْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ، وَ مَنْ خَذَلَهٗ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يَّقُوْلَ: نَصَرَهٗ مَنْ هُوَ خَيْرٌ مِّنِّيْ. وَ اَنَا جَامِعٌ لَّكُمْ

اگر میں اس (قتل عثمان) کا حکم دیے ہوتا (جیسا کہ کچھ لوگوں کا خیال ہے) تو خود ہی قاتل ہوتا (حالانکہ ایسا نہیں ہے) اور اگر اس سے منع کیے ہوتا تو (ان کا) مددگار ہوتا (حالانکہ ایسا بھی نہیں ہے کیونکہ یہ تو جب ہوتا کہ مجھے کچھ اختیار ہوتا) البتہ جس نے ان کی مدد کی وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان کو اس نے چھوڑ دیا جس سے میں بہتر ہوں اور جس نے ان کو چھوڑ دیا وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نے ان کی مدد کی جو مجھ سے بہتر ہے۔[1] (تو ہم اور کل صحابہ اس بارے میں برابر

(بقیہ صفحہ مابعد) مخالف ہو گئے مثلاً بنی امیہ کے فاسقوں، جاہلوں اور بدمعاشیوں کو صوبجات کا والی بنا دیا مال غنیمت وخراج کو جو بیت المال کا تھا اپنے مخصوصین کو سب کا سب دے دیا کرتے۔ بیت المال میں اسراف کرتے، حکم بن عاص کو جسے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ سے ہمیشہ کے لیے جلاوطن کر دیا تھا مدینہ میں واپس بُلا کر رکھ لیا اور بیت المال سے ایک لاکھ درہم بھی دے دیا، اپنے داماد حارث بن حکم کے نام مدینہ کے فروخت مال کا دسواں حصہ مقرر کر دیا حالانکہ رسول خدا نے اسے مسلمانوں پر تصدق کر دیا تھا، اپنے دوسرے داماد مروان بن حکم کو افریقہ کا خمس دے دیا، عبداللہ بن مسعود اور ابوذر کا روزینہ بند کر دیا اور ابوذر کو جلاوطن کر دیا یہاں تک کہ انہوں نے ربذہ ہی میں انتقال کیا۔ عمار یاسر کو اس قدر مارا کہ بیچارے بے ہوش ہو گئے اور انہیں مرض فتق ہو گیا۔ اسی طرح اور بہت سے شر و فساد کے امور اپنے آخر خلافت میں کیے جس سے لوگ باغی ہو گئے اور آخر قتل کیا۔

[1] غرض یہ ہے کہ چونکہ حضرتؑ پر یہ الزام قائم کیا جاتا تھا کہ آپ نے عثمان کو اپنی نصرت سے محروم رکھا لہٰذا حضرتؑ نے فرمایا کہ اگر فرض کیا جائے ایسا ہی ہو تو کوئی حرج نہیں کیونکہ جس نے عثمان کو محروم کیا وہ افضل ہے اس سے جس نے نصرت کی کیونکہ ناصران عثمان سب فساق و فجار ہیں مثل مروان وغیرہ کے جن کا فسق و فجور تمام عالم پر ظاہر ہے، بخلاف اس کے خاذلان عثمان تمامی مہاجرین وانصار ہیں جن کی افضلیت تم سب کو مسلّم ہے تو اگر ہم خاذل ہی تسلیم کیے جائیں تو ان سے افضل ہوں گے جو ناصر تھے۔ اس لیے حضرتؑ نے جملہ ''مَنْ نَّصَرَهٗ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يَّقُوْلَ: خَذَلَهٗ مَنْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ'' کو مقدم کیا کیونکہ ناصران عثمان وہی تھے جن کا فسق و فجور مسلّم ہے پھر وہ کیوں کر دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہم ان سے افضل ہیں جنہوں نے محروم کیا۔ سعد بن ابی وقاص جو عشرہ مبشرہ سے ہیں عمرو عاص کو لکھتے ہیں:

وَ اَمْسَكْنَا نَحْنُ عَنْهُ وَلَوْ شِئْنَا لَدَفَعْنَا عَنْهُ وَلٰكِنَّ عُثْمَانَ غَيَّرَ وَ تَغَيَّرَ وَ اَحْسَنَ وَ اَسَاءَ فَاِنْ كُنَّا اَحْسَنَّا فَقَدْ اَحْسَنَّا وَ اِنْ كُنَّا اَسَأْنَا فَنَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ۔ (کتاب الامامۃ، ص ۸۱)

ہم لوگوں نے اپنی امداد و نصرت کو روک رکھا اور اگر چاہتے تو اس بلا کو عثمان سے دفع کرتے مگر خود عثمان نے، بہت کچھ شریعت کو بدل دیا اور خود بھی بدل گئے اور اچھا بھی کیا برا بھی کیا۔ تو اگر ہم نے اچھا کیا تو اچھا کیا اور اگر برا کیا تو خدا سے استغفار کرتے ہیں۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ قتل عثمان برضامندی تمام مہاجرین وانصار ہوا، پھر کون کہہ سکتا ہے کہ مروان وغیرہ ان سے افضل تھا۔

اَمْرَهٗ، اسْتَاْثَرَ فَاَسَآءَ الْاَثَرَةَ وَ جَزِعْتُمْ فَاَسَئْتُمُ الْجَزَعَ، وَ لِلّٰهِ حُكْمٌ وَّاقِعٌ فِي الْمُسْتَاْثِرِ وَ الْجَازِعِ.

ہوئے) اور میں تمہارے لیے ان کے امر کا جمع کرنے والا ہوں کہ انہوں نے نفس پروری اور خود رائی کی اور اس میں بہت زیادتی کی اور تم لوگوں نے بھی بے صبری کی تو نہایت بری طرح بے صبر ہوئے اب خدا (اس) نفس پروری کرنے والے اور (ان) بے صبروں میں جو حکم (چاہے) کرے۔[1]

❁ خطبہ: ۳۲ ❁

وَ مِنْ كَلَامٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

لَمَّا اَنْفَذَ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ عَبَّاسٍ اِلَى الزُّبَيْرِ قَبْلَ وُقُوْعِ الْحَرْبِ يَوْمَ الْجَمَلِ لِيَسْتَفِيْٓئَهٗ اِلٰى طَاعَتِهٖ قَالَ لَهٗ:

لَا تَلْقَيَنَّ طَلْحَةَ، فَاِنَّكَ اِنْ تَلْقَهٗ تَجِدْهُ كَالثَّوْرِ عَاقِصًا قَرْنَهٗ، يَرْكَبُ الصَّعْبَ وَ يَقُوْلُ: هُوَ الذَّلُوْلُ، وَ لٰكِنِ الْقَ الزُّبَيْرَ، فَاِنَّهٗ اَلْيَنُ

خطبہ: ۳۲ (۳۱)

حضرت علیہ السلام کے اس کلام کا کچھ حصّہ

جسے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو جنگ جمل واقع ہونے کے قبل زبیر کے پاس روانہ کرتے وقت فرمایا کہ وہ اس (زبیر) کو حضرتؑ کی اطاعت کی طرف واپس لائیں۔ آپؑ نے ان سے ارشاد کیا۔

(دیکھو!) طلحہ سے نہ ملنا کیونکہ اگر تم اس سے ملو گے تو اس کو مثل اس سانڈ کے پاؤ گے جو (کبر و نخوت سے) اپنے سینگ موڑے ہو۔ وہ سوار تو ہوتا ہے سخت سواری پر اور کہتا ہے کہ یہ تو نرم ہے۔ البتہ زبیر سے ملنا کیونکہ وہ (شخص) نرم طبیعت کا ہے اور اس سے کہنا کہ تمہارے

---

[1] یعنی عثمان نے خود رائی اور خود غرضی کو راہ دی اور اس میں نہایت مبالغہ اور شدت کی کہ آنکھ بند کر کے مال و حقوق مسلمین کو اپنے اعزا و اقربا میں تقسیم کرنا شروع کر دیا اور جاگیر و جائداد سب کی سب اپنے ہی لوگوں کے حوالہ کر دی اور خود رائی کی یہ حد ہو گئی کہ سوائے اپنے اور اپنے وزیر مروان کے کسی کی بات سنتے ہی نہ تھے حتی کہ جو بھی خواہ بطور مشورہ بھی کوئی بات کہتے تو اس کو اپنی دشمنی پر محمول کرتے اور تم مسلمانوں نے ان کی اس خود رائی اور خود غرضی پر بے صبری ظاہر کی اور اس کو اس قدر اہم کر دیا کہ عثمان کے قتل پر آمادہ ہو گئے یعنی نہ تو عثمان نے اپنی خود غرضیوں کو کم کیا اور نہ تم نے ان کی ان زیادتیوں پر صبر و تحمل سے کام لیا بلکہ ان کی سزا کی تجویز کی تو وہ بھی بالکل آخری کہ ان کو قتل ہی کر کے چھوڑا۔ پس اب خدا جو حکم بھی عثمان اور تم لوگوں کے متعلق دے یعنی خواہ ان سے اور تم لوگوں سے اس کا مواخذہ کرے خواہ معاف کر دے۔

عَرِيْكَةً، فَقُلْ لَّهٗ: يَقُوْلُ لَكَ ابْنُ خَالِكَ: عَرَفْتَنِيْ بِالْحِجَازِ وَ اَنْكَرْتَنِيْ بِالْعِرَاقِ، فَمَا عَدَا مِمَّا بَدَا۔

اَقُوْلُ: وَ هُوَ عَلَيْهِ السَّلَامُ اَوَّلُ مَنْ سُمِعَتْ مِنْهُ هٰذِهِ الْكَلِمَةُ، اَعْنِيْ: «فَمَا عَدَا مِمَّا بَدَا»

ماموزاد بھائی[1] تم سے کہتے ہیں ''حجاز میں تو تم نے مجھے (خلیفہ برحق) جانا اور عراق میں مجھ سے ناآشنا بن گئے! پس جو بات ظاہر ہو چکی اس سے کس چیز نے پھیر دیا؟''[2]

(قول سید رضی علیہ الرحمہ) میں عرض کرتا ہوں کہ حضرت (امیر المومنین علیہ السلام) پہلے بزرگ ہیں جن سے یہ کلم ''فَمَا عَدَا مِمَّا بَدَا'' سنا گیا ہے (کہ حضرتؑ سے قبل کسی کے کلام میں یہ مثل نہیں ہے)۔

❁ خطبہ: ۳۳ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

اَيُّهَا النَّاسُ! اِنَّا قَدْ اَصْبَحْنَا فِيْ دَهْرٍ عَنُوْدٍ، وَ زَمَنٍ كَنُوْدٍ، يُعَدُّ فِيْهِ الْمُحْسِنُ مُسِيْٓـًٔا، وَ يَزْدَادُ الظَّالِمُ فِيْهِ عُتُوًّا، لَا نَنْتَفِعُ بِمَا عَلِمْنَا، وَ لَا نَسْئَلُ عَمَّا جَهِلْنَا، وَ لَا نَتَخَوَّفُ قَارِعَةً حَتّٰى تَحُلَّ بِنَا.

خطبہ: ۳۳ (۳۲)

حضرت علیہ السلام کے ایک خطبہ کا کچھ حصّہ۔

لوگو! ہم ایک ایسے ظالم و جفا کار دہر اور سخت بے وفا وستم گار زمانہ میں داخل ہو گئے ہیں جس میں نیکوکار شخص بدکار سمجھا جاتا ہے اور ظالم (اپنے) جور وستم میں اور بڑھتا جاتا ہے۔ جس امر کا ہمیں علم ہے اس سے نفع نہیں اٹھاتے (حالانکہ علم کی یہی غرض ہے) اور جس چیز سے جاہل ہیں اس کو دریافت نہیں کرتے (حالانکہ ضرور جاننا چاہئے) اور جب تک کوئی مصیبت ہم پر آنہیں آپڑتی اس سے ڈرتے

---

[1] زبیر بن العوام جناب صفیہ بنت عبدالمطلب کے بیٹے تھے پس صفیہ جناب ابوطالب کی بہن اور جناب ابوطالب زبیر کے ماموں ہوئے، اسی سبب سے حضرت امیر المومنینؑ نے اپنے کو ان کا ماموں زاد بھائی فرمایا اور یہ عام قاعدہ عرب ہے کہ ایسے مواقع پر اظہار قرابت کراتے ہیں۔

[2] یعنی مدینہ میں تو تمہارے نزدیک میں قابل خلافت تھا چنانچہ تم نے خود اصرار کر کے میری بیعت کی۔ اب عراق یعنی بصرہ میں آ کر میرے مخالف اور میری بیعت سے علیحدہ ہو گئے، تو جو بیعت تم پہلے کر چکے ہو اس سے روگردانی کی کوئی وجہ ہونی چاہیے، اس کو بتاؤ کہ کیا ہے؟

فَالنَّاسُ عَلٰٓى اَرْبَعَةِ اَصْنَافٍ:

مِنْهُمْ مَنْ لَّا يَمْنَعُهُ الْفَسَادَ اِلَّا مَهَانَةُ نَفْسِهٖ، وَ كَلَالَةُ حَدِّهٖ وَ نَضِيْضُ وَفْرِهٖ،

وَ مِنْهُمُ الْمُصْلِتُ لِسَيْفِهٖ، وَ الْمُعْلِنُ بِشَرِّهٖ، وَ الْمُجْلِبُ بِخَيْلِهٖ وَ رَجْلِهٖ، قَدْ اَشْرَطَ نَفْسَهٗ وَ اَوْبَقَ دِيْنَهٗ لِحُطَامٍ يَنْتَهِزُهٗ اَوْ مِقْنَبٍ يَّقُوْدُهٗ، اَوْ مِنْبَرٍ يَفْرَعُهٗ وَ لَبِئْسَ الْمَتْجَرُ اَنْ تَرَى

نہیں۔ بہرحال (اس زمانہ کے) لوگ چار[1] قسم پر ہیں۔

بعض (یعنی پہلی قسم کے) وہ ہیں جن کو فساد سے صرف ان کے نفس کی پستی اور ساز وسامان کی خرابی اور مال ودولت کی کمی[2] روکے ہوئے ہے (کہ اسباب شر وفساد ہی ان کے پاس نہیں ورنہ کیا کچھ نہ کر ڈالتے)

اور بعض (یعنی دوسری قسم کے) وہ ہیں جو (ہر وقت) اپنی تلوار کھینچی رکھتے اور اپنے شر (وفساد) کو علانیہ کرتے اور اپنے سوار و پیادوں کو اکٹھا رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے نفس کو (ظلم کے لیے) آمادہ کر رکھا اور اپنے دین کو برباد کر ڈالا ہے۔ (یہ سب صرف) مال دنیا لوٹنے یا لشکر کشی کرنے یا منبر پر بلند ہونے کے لیے ہے۔[3] افسوس یہ کیا ہی بری

---

[1] واضح ہو کہ حضرتؑ نے یہاں طالب دنیا اور خواہان ریاست وحکومت کی چار قسمیں کی ہیں۔ جو ریاست وحکومت دنیا کی خواہش اور طمع تو بہت کچھ رکھتے ہیں مگر ان کو کوئی قوت اور عزت یا وقار اور سطوت نہیں حاصل ہے بلکہ حقیر و ذلیل ہیں، کوئی ان کا ساتھ نہیں دیتا اور نہ ان کی کوئی حقیقت سمجھتا ہے اور ساز وسامان بھی کچھ نہیں ہے جس کے ذریعہ سے حکومت حاصل ہو سکے اور مال بھی موجود نہیں ہے جس سے ساز وسامان کا بندوبست ہو سکے۔ غرض حکومت وریاست بغیر کسی سبب کے تو حاصل نہیں ہو سکتی اور ان لوگوں کے پاس کچھ بھی نہیں ہے اس سبب سے خاموش ہیں اور شر وفساد سے عاجز ہیں ورنہ ذرا بھی قدرت ہوتی تو نہ معلوم کیا کرتے۔

[2] ''کَلَالَہ'' کا اصل معنی کند ہو جانا، چاقو یا تلوار یا دوسرے اوزار کی باڑھ کا اور حدان چیزوں کی باڑھ کو کہتے ہیں، یہ تو لغوی معنی تھا یہاں مراد یہ ہے کہ ان کے پاس جو ساز وسامان ہے جس سے کوشش کر سکتے وہ بے مصرف ہے جس طرح اوزار کی باڑھ کند ہو جاتی ہے تو وہ بیکار ہو جاتے ہیں پس لفظ کلالہ حد سے حضرتؑ نے تشبیہ دے کر ایک خاص لطف اپنے کلام میں پیدا کر دیا۔

[3] یعنی دوسری قسم کے وہ لوگ ہیں جن کو شر وفساد کرنے کی قدرت حاصل ہے اور طلب حکومت وریاست کے اسباب میسر ہیں، لہٰذا وہ اس فکر میں دن رات مشغول رہتے ہیں اگرچہ انہیں اس کا کوئی حق نہیں ہے، وہ ہر وقت تلوار کھینچتے رہتے، اپنے شر وفساد کو ظاہر اور علانیہ کر کے لوگوں کو دھمکاتے اور اذیت پہنچاتے رہتے اور اپنے لشکر اور فوج کو جمع کیے رہتے ہیں تاکہ سلطنت اور ترفع حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہیں، لوگوں کا مال لوٹیں، فوج کشی کریں، لوگوں کے سردار بنیں اور منبروں پر جا کر امرا وخلفاء کی طرح وعظ اور خطبہ بیان کریں۔ پس ان لوگوں کی کیسی بربادی ہے کہ چند روزہ زندگی اور تھوڑے سے مال اور حکومت کے لیے اپنے دین اور آخرت کی دائمی زندگی کو تباہ کر رہے ہیں۔

الدُّنْيَا لِنَفْسِكَ ثَمَنًا، وَ مِمَّا لَكَ عِنْدَ اللّٰهِ عِوَضًا!

وَ مِنْهُمْ مَنْ يَّطْلُبُ الدُّنْيَا بِعَمَلِ الْاٰخِرَةِ، وَ لَا يَطْلُبُ الْاٰخِرَةَ بِعَمَلِ الدُّنْيَا، قَدْ طَامَنَ مِنْ شَخْصِهٖ، وَ قَارَبَ مِنْ خَطْوِهٖ، وَ شَمَّرَ مِنْ ثَوْبِهٖ، وَ زَخْرَفَ مِنْ نَّفْسِهٖ لِلْاَمَانَةِ، وَ اتَّخَذَ سِتْرَ اللّٰهِ ذَرِيْعَةً اِلَى الْمَعْصِيَةِ.

تجارت ہے کہ تو دنیا (ایسی حقیر و ذلیل چیز) کو اپنے نفس (ایسی شریف شے) کی قیمت اور خدا کے یہاں تیرے لیے جو اجر ہے اس کا عوض قرار دے۔

اور بعض [1] (یعنی تیسری قسم کے) وہ لوگ ہیں جو آخرت کے اعمال بجالا کر دنیا حاصل کرنی چاہتے ہیں اور دنیا میں عمل کر کے آخرت کے خواہاں نہیں ہوتے۔ انہوں نے اپنے بدن کو (نمائشی خشوع و خضوع سے) پست کر دیا ہے، (راہ چلنے میں) اپنے قدموں کو نزدیک نزدیک رکھا کیے (کہ تقدس ظاہر ہو)، اپنے لباس کو (عبادت خدا کی مستعدی ظاہر کرنے کے لیے) سمیٹے رکھتے، اپنے نفس کو امانت کے لیے آراستہ کیے رہتے اور خدا کے پردہ کو گناہ کا آڑ بنائے رہا کئے ہیں۔ [2]

---

[1] یہ تیسری قسم کے لوگوں کا بیان ہے۔ یہ وہ ہیں جو دینداری اور زہد و ورع، تقوی و عبادت کی وضع اختیار کر کے اور اپنے کو عارف باللہ، خدا رسیدہ اور تارک دنیا ظاہر کر کے غرض دینی مکر و فریب سے لوگوں کو اپنے جال میں پھنسانا چاہتے ہیں اور اس طرح ان کی سرداری اور امامت حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ کُل کام تو دین کا کرتے ہیں مگر خدا کے لیے نہیں بلکہ ریا اور سمعہ کے لیے تا کہ لوگ عزت اور احترام کر کے اپنا پیشوا اور مقتدا بنائیں۔ اکثر علمائے مخالفین اور خصوصاً صوفیوں کے پیر حضرات اسی قسم میں داخل ہیں جن کی قبروں کی آج تک پرستش ہوتی اور جناب سید المرسلینؐ سے زیادہ ان کی عظمت کی جاتی ہے یہاں تک کہ خدا کو معطل کر کے ہر قسم کی حاجت انہی سے طلب کی جاتی ہے بلکہ خدا کچھ نہیں جو ہیں وہی اولیا۔

[2] یہ سب اوصاف انہیں ریا کار مکاروں یعنی دنیا طلب علما اور پیروں کے ہیں جو اپنے بدن کو خشک کیے جاتے اور نمائشی خضوع و خشوع سے جھکے اور چُرمُر بنے رہتے ہیں۔ چلتے ہیں تو بہت آہستہ اور نہایت ہی چھوٹے چھوٹے قدم رکھ کر۔ اپنے کپڑوں کو ہر وقت سمیٹے رہتے ہیں تا کہ لوگ سمجھیں کسی وقت عبادت خدا اور ذکر الٰہی سے فرصت ہی نہیں ملتی حالانکہ چوں بہ خلوت می روند آں کار دیگر میکنند۔ لوگوں میں بڑے متقی اور امانت دار بنتے ہیں کہ سب سمجھیں ایک حبہ میں بھی خیانت نہ کریں گے حالانکہ موقع ملتا ہے تو سرقہ اور غصب و خیانت سے بھی باز نہیں آتے۔ غرض یہ حضرات دین داری اور راہ خدا کی وضع اختیار کر کے دنیا کی ریاست و امارت اور عیش و تنعم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ایک شخص کی حکایت مشہور ہیں کہ فکرِ معاش میں اس نے بہت سی تدبیریں کیں اور سب میں ناکام رہا، آخر عاجز ہو کر ایک سمت نکلا تو شیطان بصورت انسان مقدس آکر اس سے کہنے لگا کہ ایک تدبیر میں بھی بتاتا ہوں، دیکھو اس میں دنیا تم کو کیسی ملتی ہے۔ پوچھا وہ کیا؟ کہا ایک مذہب اور دین ایجاد کرو پھر دیکھو کس طرح لوگ تمہارے ساتھ ہوتے ہیں اور دنیا اقبال کرتی ہے۔ چنانچہ ایسا ہی اس نے کیا اور خوب کامیاب ہوا۔

وَمِنْهُمْ مَنْ اَقْعَدَهٗ عَنْ طَلَبِ الْمُلْكِ ضُؤْلَةُ نَفْسِهٖ وَ انْقِطَاعُ سَبَبِهٖ، فَقَصَرَتْهُ الْحَالُ عَلٰى حَالِهٖ، فَتَحَلّٰى بِاسْمِ الْقَنَاعَةِ، وَ تَزَيَّنَ بِلِبَاسِ اَهْلِ الزَّهَادَةِ، وَ لَيْسَ مِنْ ذٰلِكَ فِيْ مَرَاحٍ وَّ لَا مَغْدًى.

اور بعض (یعنی چوتھی قسم کے) وہ لوگ ہیں جن کو ملک گیری (کی تمنا) سے (صرف) ان کے نفس کے ضعف و حقارت اور ساز و سامان کے فقدان نے دور کر دیا ہے۔ پس ان کی (موجودہ) حالت نے ان کو اسی (سابق) حال پر روک رکھا ہے (کہ اس سے بڑھنے نہیں پاتے)۔ لہٰذا وہ صفتِ قناعت سے آراستہ اور زاہدوں کے لباس سے مزین[1] ہیں حالانکہ (درحقیقت) شام و صبح (سے کسی وقت) میں (بھی) ان کو ان (اوصاف) سے کوئی تعلق نہیں۔

وَ بَقِيَ رِجَالٌ غَضَّ اَبْصَارَهُمْ ذِكْرُ الْمَرْجِعِ، وَ اَرَاقَ دُمُوْعَهُمْ خَوْفُ

باقی رہے[2] وہ لوگ جن کی نگاہوں کو قیامت کی یاد نے پست کر دیا اور خوفِ محشر نے ان کے آنسوؤں کو بہا ڈالا

---

[1] چوتھی قسم کے وہ لوگ ہیں جو دنیاوی حکومت و ریاست تو ہر وقت چاہتے ہیں مگر ان کے پاس کوئی ذریعہ اور کسی قسم کا سامان ہی نہیں ہے۔ جس ذلت و خواری میں تھے اسی میں پڑے ہیں کہ کچھ ہاتھ پیر نہیں ہلا سکتے۔ پس عصمت بی بی از بے چادری کی طرح اپنی حالت کو قناعت سے تعبیر کرتے ہیں۔ یعنی لوگوں سے کہتے ہیں کہ ہم قناعت اختیار کیے ہوئے ہیں، ہمیں دنیاوی ترقی سے کوئی کام نہیں، جس حال میں خدا رکھے اسی پر راضی ہیں اور اہل زہد و تقوی کے لباس اور ان کی روش اختیار کر کے لوگوں کے ذہن میں یہ راسخ کرنا چاہتے ہیں کہ تم یہ نہ سمجھو کہ ہم دنیا میں مجبور ہیں اور بے بسی کے سبب سے لذات دنیا سے محروم ہیں بلکہ ہم نے خود دنیا کو ترک کر دیا ہے۔ غرض یہ لوگ اہل زہد کے لباس یعنی وضع سے آراستہ ہو رہے ہیں تا کہ لوگ سمجھیں ان بیچاروں کی یہ حالت فقر و عسرت اور خمول و ذلت زہد کے سبب سے ہے کہ انہوں نے دنیا کو ترک کر دیا اور ہر وقت آخرت کے سامان میں مشغول رہتے ہیں۔ حالانکہ اصل وجہ ان کی دنیاوی ترقی سے مجبوری اور تعزز و ترفع سے عاجزی و بے بسی ہے ورنہ دن و رات سے ایک منٹ کے لیے بھی تو ان کو واقعاً زہد اور قناعت اختیار کرنے کا خیال نہیں پیدا ہوتا۔

[2] یہ پانچویں قسم کے لوگ ہیں اور سابق چاروں قسم کے وہ تھے جن پر عوام کی نظر پڑتی اور لوگ انہیں کو کوئی چیز سمجھتے ہیں۔ پس حضرتؑ نے جو شروع میں فرمایا کہ لوگ چار قسم کے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ جو بادی النظر میں آدمی سمجھے جاتے اور لوگوں میں شمار ہوتے ہیں چار قسم کے ہیں۔ رہے یہ پانچویں قسم کے لوگ جو واقعاً دنیا کے تارک، آخرت کے خواہاں ہیں، دنیاوی خواہشوں سے اپنی نظر کو پھیر لیا ہے، آخرت کے خوف سے ڈرتے رہتے اور معاد کے فکر و تصور میں پڑے رہتے ہیں تو یہ وہ ہیں جن کا وجود تو دنیا میں سمجھا ہی نہیں جاتا اور نہ دنیا والے ان کو اپنے میں شمار کرتے ہیں، غرض یہ بیچارے لوگوں کی نظر میں کوئی حقیقت اور کوئی ہستی نہیں رکھتے لہٰذا حضرتؑ نے ان کو ان میں شمار نہ کیا اور علیحدہ ذکر کیا۔

الْمَحْشَرِ، فَهُمْ بَيْنَ شَرِيْدٍ نَّادٍّ، وَ خَآئِفٍ مَّقْمُوْعٍ، وَ سَاكِتٍ مَّكْعُوْمٍ، وَ دَاعٍ مُّخْلِصٍ، وَ ثَكْلَانَ مُوْجَعٍ، قَدْ اَخْمَلَتْهُمُ التَّقِيَّةُ وَ شَمِلَتْهُمُ الذِّلَّةُ، فَهُمْ فِيْ بَحْرٍ اُجَاجٍ، اَفْوَاهُهُمْ ضَامِزَةٌ، وَ قُلُوْبُهُمْ قَرِحَةٌ، وَ قَدْ وَعَظُوْا حَتّٰى مَلُّوْا وَ قُهِرُوْا حَتّٰى ذَلُّوْا، وَ قُتِلُوْا حَتّٰى قَلُّوْا.

ہے۔پس ان میں سے کوئی تو سب سے الگ اور کنارہ کش ہے۔کوئی خوفزدہ ذلیل وخوار ہے، کوئی خاموش لب بند ہے،کوئی اخلاص سے (امرحق کی طرف) بلانے والا اور کوئی محزون درد رسیدہ ہے۔خوف خدا نے ان لوگوں کو گوشۂ گمنامی میں ڈال رکھا ہے۔اور ذلت وخواری ان کو گھیرے ہوئے ہے۔ پس یہ (بیچارے) ایک کھاری سمندر میں پڑے ہوئے ہیں[1] کہ ان کے منہ بند اور دل زخمی ہورہے ہیں۔انہوں نے لوگوں کو اتنا وعظ و پند کیا کہ (ان کی ناشنوائی سے) تھک گئے[2] اور (مخالفت سے تم اس قدر) دبائے گئے کہ (بظاہر) ذلیل ہو گئے اور (اس قدر) قتل کیے گئے کہ (بہت) کم ہو گئے۔

فَلْتَكُنِ الدُّنْيَآ فِيْٓ اَعْيُنِكُمْ اَصْغَرَ مِنْ حُثَالَةِ الْقَرَظِ وَ قُرَاضَةِ الْجَلَمِ وَ

(غرض جب خاصان خدا کی یہ حالت ہے) تو چاہیے کہ دنیا تمہاری نظروں میں قرظ کے بھوسہ اور (بھیڑ بکری کے) مقراض سے ترشے ہوئے بالوں سے زیادہ حقیر[3]

---

[1] یعنی جس طرح سمندر کا پانی کھاری اور پینے والوں کو ناگوار ہوتا ہے اسی طرح یہ خاصانِ خدا دنیا میں رہتے تو ہیں مگر یہاں کی کوئی چیز ان کو مرغوب نہیں بلکہ سب سے متنفر رہتے اور ہر لذت دنیا سے بھاگتے ہیں۔

[2] یعنی ان حضرات نے دنیا والوں کو وعظ و پند کی تو لوگ ان کی باتوں سے اکتا گئے اور ان کی نصیحت سے متنفر ہو کر ان بیچاروں کو ملول اور رنجیدہ کر دیا کیونکہ ظاہر ہے واعظ دوسروں ہی کے نفع کی باتیں کہتے ہیں اب اس کو لوگ دل سے نہ سنیں گے یا کراہت ظاہر کریں گے تو کیسا کچھ رنج نہ ہوگا۔

[3] ''حُثَالَةٌ'' بھوسہ، کوڑا کرکٹ وغیرہ کو کہتے ہیں اور ''قَرَظٌ'' ایک درخت کا پتہ ہے جس سے چمڑوں کو دباغت دیتے ہیں۔ ''جَلَمٌ''، ایک خاص قسم کی چیز مقراض کے مثل ہوتی ہے جس سے بھیڑ بکری وغیرہ جانوروں کا بال کاٹا جاتا ہے اور قراضہ ان کٹے ہوئے بالوں کو کہتے ہیں جو جلم سے کٹ کر گرتے ہیں۔ چونکہ یہ چیزیں نہایت حقیر، بے مصرف اور پھینک دینے کے قابل ہوتی ہیں اس سبب سے حضرتؑ نے ان سے دنیا کو تشبیہ دی کہ جس طرح تم لوگ عیب ظاہری دیکھ کر ان اشیاء کو پھینک دیتے ہو اسی طرح باطنی بصیرت سے کام لو تا کہ دنیا تم کو ان چیزوں سے بھی زیادہ ذلیل اور حقیر معلوم ہو کہ پھر تم لوگ اس کو بھی اپنے سے دور رکھنے اور ہمہ تن آخرت کا سامان ہی کرنے میں منہمک رہو گے۔

اتَّعِظُوْا بِمَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ قَبْلَ اَنْ يَّتَّعِظَ بِكُمْ مَنْۢ بَعْدَكُمْ، وَ ارْفُضُوْهَا ذَمِيْمَةً، فَاِنَّهَا قَدْ رَفَضَتْ مَنْ كَانَ اَشْغَفَ بِهَا مِنْكُمْ.

ہو اور (چاہیے کہ) جو لوگ تم سے پہلے تھے ان (کی حالت) سے نصیحت حاصل کرو۔ قبل اس کے کہ تمہارے بعد والے تم (اور تمہاری) حالت سے سبق لیں۔ اور اس (دنیا) کو ذلیل (اور قابل نفرت) سمجھ کر چھوڑ دو کیونکہ اس (بے وفا) نے تو ان کا بھی ساتھ نہ دیا جو تم سے زیادہ اس پر فریفتہ تھے۔ (پھر تم کس دھوکے میں ہو؟)۔

(قَالَ الشَّرِيْفُ) اَقُوْلُ: هٰذِهِ الْخُطْبَةُ رُبَّمَا نَسَبَهَا مَنْ لَّا عِلْمَ لَهٗ اِلٰى مُعَاوِيَةَ، وَ هِيَ مِنْ كَلَامِ اَمِيْرِالْمُؤْمِنِيْنَ عَلَيْهِ السَّلَامُ الَّذِيْ لَا يُشَكُّ فِيْهِ وَ اَيْنَ الذَّهَبُ مِنَ الرَّغَامِ؟ وَ الْعَذْبُ مِنَ الْاُجَاجِ؟ وَ قَدْ دَلَّ عَلٰى ذٰلِكَ الدَّلِيْلُ الْخِرِّيْتُ، وَ نَقَدَهُ النَّاقِدُ الْبَصِيْرُ عَمْرُو بْنُ بَحْرٍ الْجَاحِظُ، فَاِنَّهٗ ذَكَرَ هٰذِهِ الْخُطْبَةَ فِيْ كِتَابِ «الْبَيَانِ وَ

(جناب سید رضی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں) میں کہتا ہوں کہ اس خطبہ کو بعض جاہلوں نے معاویہ کی طرف منسوب کر دیا ہے[1] حالانکہ یہ جناب امیر المومنین علیہ السلام کے ایسے (مشہور اور یقینی) کلام سے ہے جس میں کسی طرح کا شک ہی نہیں۔ پھر سونے کو مٹی سے اور آب شیریں و خوشگوار کو تلخ کھاری پانی سے کیا نسبت؟ (اس کے علاوہ) ادیب فرید محقق کامل اور علامہ متبحر عمرو بن بحر الجاحظ نے بھی یہی بتایا اور تنقید و تحقیق کر کے اسی (امر) کو اختیار کیا اور صحیح قرار دیا ہے۔ (کہ یہ جناب امیرؑ ہی کا کلام ہے نہ معاویہ وغیرہ کا) کیونکہ اس نے (اپنی مشہور) کتاب البیان والتبیین میں اس خطبہ کو ذکر کیا ہے۔ اور جس نے اس کو معاویہ کی طرف نسبت دی ہے اس کا نام بھی

---

[1] علامہ فتح اللہ کاشانی اپنی شرح میں لکھتے ہیں کہ ''اس شخص کے شبہ اور التباس کی وجہ یہ ہے کہ ایک دفعہ معاویہ نے اپنے ساتھیوں سے ایک ہوشیار شخص کو ملک شام سے شہر کوفہ میں اس غرض سے بھیجا کہ چھپ کر مسجد میں جائے اور حضرت امیر المومنینؑ جو خطبہ بیان فرمائے اس کو حفظ کر لے۔ حضرتؑ نے بروز جمعہ اس خطبہ کو ارشاد فرمایا اور اس جاسوس نے حفظ کر کے معاویہ کو آ کر سنا دیا جس کو اس نے اپنی جاہل رعایا کو سنا کر ان پر اپنے زہد و معرفت اور فصاحت و بلاغت کا اثر قائم کرنے کی کوشش کی۔ معاویہ دل سے جناب امیرؑ کو فصاحت و بلاغت میں بھی بے مثل و بے نظیر جانتا تھا، چنانچہ علامہ ابن ابی الحدید لکھتا ہے کہ جب محقن نے از راہ خوشامد معاویہ سے کہا کہ میں تیرے پاس ایسے شخص (علیؑ) کے یہاں سے آیا ہوں جس میں گویائی کم ہے، تو معاویہ نے کہا کمبخت کیا کہتا ہے؟ خدا کی قسم قریش کو فن فصاحت و بلاغت کی تعلیم علیؑ کے سوا کسی نے بھی نہ دی۔ آپ ہی نے تو اس کے اصول و ضوابط مقرر کیے، پھر وہ اعیی (کم گو) کیوں کر ہو سکتے ہیں۔

التَّبْيِيْنِ »، وَ ذَكَرَ مَنْ نَّسَبَهَا اِلٰى مُعَاوِيَةَ، ثُمَّ قَالَ: هِيَ بِكَلَامِ عَلِيٍّ عَلَيْهِ السَّلَامُ اَشْبَهُ، وَ بِمَذْهَبِهٖ فِيْ تَصْنِيْفِ النَّاسِ وَ بِالْاِخْبَارِ عَمَّا هُمْ عَلَيْهِ مِنَ الْقَهْرِ وَ الْاِذْلَالِ وَ مِنَ التَّقِيَّةِ وَ الْخَوْفِ اَلْيَقُ، قَالَ: وَ مَتٰى وَجَدْنَا مُعَاوِيَةَ فِيْ حَالٍ مِّنَ الْاَحْوَالِ يَسْلُكُ فِيْ كَلَامِهٖ مَسْلَكَ الزُّهَّادِ وَ مَذَاهِبَ الْعُبَّادِ؟!.

لکھا ہے۔[1] پھر (اپنی تحقیق یوں) بیان کرتا ہے کہ یہ (خطبہ) حضرت علی علیہ السلام کے کلام سے بہت ملتا ہوا اور لوگوں کی تقسیم کرنے میں حضرتؑ کا جو طریقہ اور جس حالتِ (مظلومیت و) مقہوریت، ذلت (وحقارت) اور خوف وتقیہ میں یہ لوگ بسر کرتے ہیں اس کے بیان کرنے میں جو انداز آپؑ کا تھا اس سے بہت مشابہ ہے۔ (پھر وہی جاحظ) کہتا ہے اور ہم نے معاویہ کو کسی حالت (اور زمانہ) میں کب ایسا پایا کہ وہ اپنے کلام میں زاہدوں کی روش اور عابدوں کا طریقہ اختیار کرتا ہو۔ (پھر اس مقدس کلام سے اس کو کیا تعلق؟)۔

---

[1] علامہ ابوعثمان عمرو بن الجاحظ بن بحر بن محبوب الکنانی البصری المتوفی ۲۵۵ھ ابتدائے عصر اسلام کا ایک نہایت متعصب ناصبی مگر بہت بڑا ادیب اور عالم علوم عربیہ ووقائع عرب تھا۔ اس کی بہت سی مصنفات ہیں جو ادب وبلاغت اور حالات عرب وغیرہ کی جواہر ہیں، من جملہ ان کے کتاب البیان والتبیین بھی ہے چنانچہ جو نسخہ بمقام مصر ۱۳۱۱ھ میں چھپا ہے اس کے جز اول صفحہ ۱۷۲ میں وہ لکھتا ہے۔

خُطْبَةٌ مِّنْ خُطَبِ مُعَاوِيَةَ بْنِ اَبِيْ سُفْيَانَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَارَوَاهَا شُعَيْبُ بْنُ صَفْوَانَ، وَزَادَ فِيْهَا الْيَقْطَرِيُّ وَغَيْرُهٗ، قَالُوْا: لَمَّا حَضَرَتْ مُعَاوِيَةَ الْوَفَاةُ قَالَ لِمَوْلًى لَهٗ: مَنْ بِالْبَابِ؟ قَالَ: نَفَرٌ مِنْ قُرَيْشٍ يَتَبَاشَرُوْنَ بِمَوْتِكَ. فَقَالَ: وَيْحَكَ، وَلِمَ؟ قَالَ: لَا اَدْرِيْ، قَالَ: فَوَاللّٰهِ مَا لَهُمْ بَعْدِيْ اِلَّا الَّذِيْ يَسُوْءُهُمْ. وَاَذِنَ لِلنَّاسِ فَدَخَلُوْا، فَحَمِدَ اللّٰهَ وَاَثْنٰى عَلَيْهِ وَاَوْجَزَ ثُمَّ قَالَ: ''يَا اَيُّهَا النَّاسُ، اِنَّا قَدْ اَصْبَحْنَا۔۔۔۔ رَفَضَتْ مَنْ كَانَ شَغَفَ بِهَا مِنْكُمْ. وَفِيْ هٰذِهِ الْخُطْبَةِ اَبْقَاكَ اللّٰهُ ضُرُوْبٌ مِّنَ الْعَجَبِ: مِنْهَا اَنَّ هٰذَا الْكَلَامَ لَا يُشْبِهُ السَّبَبَ الَّذِيْ مِنْ اَجْلِهٖ دَعَاهُمْ مُعَاوِيَةُ، وَمِنْهَا اَنَّ هٰذَا الْمَذْهَبَ فِيْ تَصْنِيْفِ النَّاسِ، وَفِي الْاَخْبَارِ عَنْهُمْ وَ عَمَّا هُمْ مِنَ الْقَهْرِ وَالْاِذْلَالِ، وَمِنَ التَّقِيَّةِ وَالْخَوْفِ اَشْبَهَ بِكَلَامِ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ وَبِمَعَانِيْهِ وَبِحَالِهٖ مِنْهُ بِحَالِ مُعَاوِيَةَ. وَمِنْهَا اَنَّا لَمْ نَجِدْ مُعَاوِيَةَ فِيْ حَالٍ مِّنَ الْحَالَاتِ يَسْلُكُ فِيْ كَلَامِهٖ مَسْلَكَ الزُّهَّادِ، وَلَا يَذْهَبُ مَذَاهِبَ الْعِبَادِ. وَاِنَّمَا نَكْتُبُ لَكُمْ وَنُخْبِرُ بِمَا سَمِعْنَاهُ، وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَصْحَابِ الْاَخْبَارِ، وَيَكْثُرُ مِنْهُمْ.

یعنی معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے خطبوں سے ایک یہ خطبہ ہے جس کی روایت شعیب بن صفوان نے کی ہے اور یقطری وغیرہ نے اس میں کچھ زیادتی بھی کی ہے۔ ان لوگوں کا بیان ہے کہ جب معاویہ کے مرنے کا وقت قریب آیا تو اس نے اپنے ایک غلام سے دریافت کیا کہ باہر دروازہ پر کون کون ہے؟ اس نے جواب دیا کہ'' قریش کی ایک جماعت موجود ہے جو آپ کے مرنے کی خوشی منا رہی ہے اور ایک دوسرے کو مبارکباد دیتا ہے''۔ معاویہ نے کہا ''افسوس! آخر اس کی وجہ؟'' غلام نے کہا'' یہ مجھے معلوم نہیں''۔ معاویہ نے کہا'' خدا کی قسم میرے بعد (میرے ایسا بھی کوئی خلیفہ

(بقیہ صفحہ آئندہ)

❁ خطبہ : ۳۴ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

عِنْدَ خُرُوْجِهٖ لِقِتَالِ اَهْلِ الْبَصْرَةِ

قَالَ عَبْدُ اللّٰهِ ابْنُ الْعَبَّاسِ: دَخَلْتُ عَلٰٓى اَمِيْرِ

خطبہ: ۳۴ (۳۳)

حضرت علیہ السلام کے اس خطبہ کا کچھ حصّہ

جب اہل بصرہ ۱؎ سے جہاد کرنے کے لیے آپؑ (مدینہ منورہ سے) روانہ ہوئے۔

عبداللہ بن عباس کہتے ہیں کہ میں (ایک روز) بمقام ذی قار ۲؎ (جو ملک عرب کے صوبہ عراق میں بصرہ کے

(بقیہ صفحہ ماقبل) وہ نہ پائیں گے) بلکہ وہ شخص ہوگا جو ان کو اذیت ہی دیتا رہے گا''۔ پھر ان لوگوں کو اندر آنے کی اجازت دی اور بعد حمد و نعت اس خطبہ کو بیان کیا (یہاں مصنف نے وہی خطبہ لکھا ہے جو متن میں مع ترجمہ درج ہو چکا۔ اس کے بعد جاحظ کہتا ہے کہ) اے مخاطب خدا تم کو سلامت رکھے اس خطبہ میں بہت سی باتیں سخت حیرت اور تعجب کی ہیں ایک تو یہ کہ معاویہ نے جس حالت مسرت و مبارکباد کو سن کر قریش کے لوگوں کو اپنے پاس بلایا تھا اس سے اس خطبہ کو کیا ربط ہے؟ کیونکہ وہ مقتضی ایسے کلام کی تھی جس سے قریش کی تنبیہ ہوتی اور معاویہ اپنے احسانوں کو جتا کر ان کو ممنون ہونے کی تاکید کرتا نہ کہ معارف و حقائق کا کلام بیان کرنے لگے۔ دوسری یہ کہ اس کلام کا جو انداز ہے جس میں لوگوں کی مختلف قسمیں کی ہیں اور دنیا والوں کے قہر و اذلال اور تقیہ و خوف کا ذکر کیا ہے یہ انداز تو علی کے کلام اور آپ ہی کے مضامین و خیالات اور آپ ہی کی حالت سے مشابہ ہے نہ معاویہ کی روش سے۔ تیسری بات یہ کہ ہم نے کبھی بھی معاویہ کو کسی حالت میں بھی زاہدوں کا مسلک اختیار کرتے اور عابدوں کی روش پر چلتے نہیں پایا۔ (پھر یہ کلام اس کے ذہن سے کیوں کر نکل سکتا ہے؟۔) رہا یہ کہ میں نے اس کے نام سے اس کو درج کیوں کیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میں تو جو کچھ جس سے سنتا ہوں اس کو اسی طرح درج کر دیتا ہوں واللہ اعلم۔

۱؎ آخر ذی الحجہ ۳۵ھ کو حضرت امیر المومنینؑ کی لوگوں نے بیعت کی۔ ۳۶ھ میں بی بی عائشہ اور طلحہ و زبیر نے بصرہ میں جا کر علَم بغاوت بلند کیا۔ اس کے فرو کرنے کو حضرت امیر المومنینؑ آخر ماہ ربیع الثانی ۳۶ھ میں بصرہ کی طرف روانہ ہوئے اور جمادی الاخری ۳۶ھ میں جنگ جمل واقع ہوئی۔ پس حضرتؑ مقام ذی قار میں غالباً جمادالاولی میں فروکش ہوئے۔

۲؎ معجزہ جناب امیرؑ: علامہ اہل سنت ابن ابی الحدید اس خطبہ کی شرح میں لکھتے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ جب ہم لوگ حضرت علی علیہ السلام کے ہمراہ مقام ذی قار میں فروکش ہوئے تو میں نے حضرتؑ سے عرض کی ''یا حضرتؑ میرے خیال میں کوفہ سے بہت کم آپ کے پاس آئیں گے''۔ آپ نے فرمایا ''خدا کی قسم میرے پاس وہاں سے چھ ہزار اور ۶۵ آدمی آئیں گے کہ اس تعداد سے ایک آدمی نہ زیادہ ہوگا نہ کم'' ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ یہ سن کر میرے دل میں ایک شدید شک پیدا ہوا کہ یہ مخصوص تعداد کیوں کر ہو سکتی ہے اور میں نے دل ہی میں حتمی ارادہ کیا کہ اگر وہ لوگ آئیں گے تو میں سب کو گنوں گا۔ ابن اسحاق نے اپنے چچا عبدالرحمن بن یسار سے حدیث بیان کی ہے کہ مقام ذی قار میں کوفہ سے حضرت علیؑ کے پاس واقعاً چھ ہزار ۶۵ ہی آدمی آئے۔ حضرت علیؑ نے (بقیہ صفحہ مابعد)

(بقیہ صفحہ ماقبل) وہاں اہل کوفہ کے انتظار میں پندرہ روز قیام فرمایا، یہاں تک کہ آپ نے گھوڑوں کے ہنہنانے اور خچروں کے بولنے کی آواز سنی اور جب وہ سب لوگ آ کر جمع ہو گئے تو حضرتؑ ان کو لے کر آگے بڑھے۔

ابن عباس کہتے ہیں کہ ''میں نے کہا خدا کی قسم میں ان سب کو گنوں گا اگر واقعاً اسی قدر ہوئے جس قدر حضرت علیؑ نے فرمایا ہے تو خیر ورنہ اور لوگوں کو بلا کر اس عدد کو پورا کروں گا کیونکہ لوگوں نے حضرتؑ کے اس کلام کو سُن لیا تھا کہ کوفہ سے پورے چھ ہزار ۶۵ آدمی آئیں گے (اب اگر واقعتاً اس قدر نہ ہوں گے تو لوگ حضرتؑ کو کاذب سمجھیں گے) لہٰذا میں ان سب کے سامنے آیا اور ان کو روک کر گننے لگا۔ تو خدا کی قسم حضرتؑ نے جو عدد بیان کیا تھا اس سے ایک آدمی بھی نہ زیادہ تھا نہ کم۔ یہ دیکھ کر میں بول اٹھا:

اَللّٰہُ اَکْبَرُ صَدَّقَ اللّٰہُ وَ رَسُوْلُہٗ۔

اللہ اور اس کے رسول نے صحیح فرمایا تھا۔

اس کے بعد ہم لوگ ذی قار سے روانہ ہو گئے۔

مگر تاریخ روضۃ الاحباب میں یہی مضمون کچھ اختلاف سے یوں درج ہے: عبداللہ بن عباس کہتے ہیں کہ ''میں حضرتؑ کے ہمراہ مقام ذی قار میں تھا کہ کوفہ اور علاقۂ کوفہ کا لشکر آنے لگا۔ حضرت امیر المومنینؑ نے ان کو دیکھ کر ارشاد فرمایا کہ آج ہماری کل فوج کی تعداد پوری بیس ہزار ہو جائے گی۔ مجھے حضرتؑ کے اس تعین سے شبہ رہا اور حضرتؑ میرے اس شک کو سمجھ گئے جس پر فرمایا کہ دو نیزے گاڑ دو جو شخص ہماری مدد کو آئے ان نیزوں کے درمیان سے ہو کر گزرے۔ اس کے بعد حکم دیا کہ جو لوگ آتے جائیں ان کو گنتے جاؤ۔ جب مغرب کا وقت قریب آیا تو واقعاً بیس ہزار فوج ہو گئی صرف ایک آدمی کم رہا۔ شمار کرنے والے نے عرض کی کہ ایک کم ہے۔ حضرتؑ نے جواب دیا کہ وہ بھی آیا جاتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ شخص بھی آیا جس کا نام اویس قرنی تھا۔ اس کے بعد حضرتؑ بصرہ کی طرف روانہ ہوئے۔ اہل کوفہ سے ایک شخص ہاشم بن عتبہ نے حضرتؑ کی خدمت میں آنے پر حسب ذیل اشعار کہے:

وَ سِرْنَا اِلٰی خَیْرِ الْبَرِّیَّۃِ کُلِّھَا عَلٰی عِلْمِنَا اَنَّا اِلَی اللّٰہِ نَرْجَعُ

نُوْقِرُہٗ فِیْ فَضْلِہٖ وَ نَجْلِہٖ وَ فِی اللّٰہِ مَا نَرْجُوْ وَ مَا نَتَوَقَّعُ

وَ نُخَصِّفُ اَخْفَافَ الْمَطِیِّ عَلَی الْوَجَا وَ فِی اللّٰہِ مَا نَرْجُوْا وَ فِی اللّٰہِ نُوْضَعُ

ذَھَبْنَا بِجَمْعٍ اٰثَرُوا الْحَقَّ وَ الْھُدٰی اِلٰی ذِیْ تَقِیٍّ فِیْ نَصْرِہٖ نَتَسَرَّعُ

نُکَافِحُ عَنْہُ وَ السُّیُوْفُ شَھِیْرَۃٌ تُصَافِحُ اَعْنَاقَ الرِّجَالِ فَتَقْطَعُ

یعنی (۱) ہم لوگ اس امام کی طرف چلے ہیں جو تمام مخلوقات خدا سے بہتر اور افضل ہے، یہ جان کر کہ ہم لوگ خدا کی بارگاہ میں لوٹ کر جائیں گے۔

(۲) ہم لوگ آپ کی تعظیم، آپ کے اور آپ کے صاحبزادہ کے شرف و بزرگی کے سبب سے کرتے ہیں، اور خدا ہی کی راہ میں درجات عالیہ اور نعمات اخرویہ کی امید اور توقع رکھتے ہیں۔

(۳) باوجودیکہ ہماری سواریوں کے سم گھس گئے ہیں پھر بھی ہم ان کو ٹانک کر جہاد کے لیے آئے ہیں، اور خدا ہی کی راہ میں ہم ثواب کے امیدوار ہیں اور تیز روی اختیار کرتے ہیں۔ (بقیہ صفحہ مابعد)

الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَيْهِ السَّلَامُ بِذِيْ قَارٍ وَّ هُوَ يَخْصِفُ نَعْلَهٗ، فَقَالَ لِيْ: مَا قِيْمَةُ هٰذِهِ النَّعْلِ؟ فَقُلْتُ: لَا قِيْمَةَ لَهَا! فَقَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ:

وَ اللّٰهِ! لَهِيَ اَحَبُّ اِلَيَّ مِنْ اِمْرَتِكُمْ، اِلَّآ اَنْ اُقِيْمَ حَقًّا، اَوْ اَدْفَعَ بَاطِلًا.

ثُمَّ خَرَجَ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَخَطَبَ النَّاسَ فَقَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ:

اِنَّ اللّٰهَ بَعَثَ مُحَمَّدًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ، وَ لَيْسَ اَحَدٌ مِّنَ الْعَرَبِ يَقْرَاُ كِتَابًا، وَ لَا يَدَّعِيْ نُبُوَّةً، فَسَاقَ النَّاسَ حَتّٰى بَوَّاَهُمْ مَحَلَّتَهُمْ، وَ بَلَّغَهُمْ مَنْجَاتَهُمْ، فَاسْتَقَامَتْ قَنَاتُهُمْ، وَ

قریب اور شہر واسط وکوفہ کے درمیان ایک جگہ ہے)۔ حضرت امیر مومنینؑ کی خدمت میں حاضر ہوا، (دیکھا) کہ آپؑ اپنی جوتی ٹانک رہے ہیں۔ (جب میں بیٹھا تو) آپؑ نے مجھ سے فرمایا کہ (اے ابن عباس! تمہارے خیال میں بھلا) اس جوتی کی کیا قیمت ہوگی؟ میں نے عرض کی اس کی قیمت (ہے کیا) کچھ بھی نہیں! تب حضرتؑ نے فرمایا:

بخدا یہ جوتی مجھے تم لوگوں کی حکومت وسلطنت سے زیادہ پیاری اور عزیز ہے۔ ہاں اگر (اس سے) میں کسی حق کو قائم یا کسی باطل کو دفع کرسکوں تو خیر۔

پھر آپؑ وہاں سے روانہ ہوئے اور لوگوں میں یہ خطبہ پڑھا:

(لوگو!) خدا نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس وقت مبعوث برسالت کیا جب عرب کا کوئی شخص بھی کسی کتاب (وغیرہ) کو پڑھ نہ سکتا تھا۔ اور نہ کوئی نبوت کا مدعی تھا۔ (غرض پڑھنے، لکھنے، نبوت وغیرہ کو جانتے ہی نہ تھے) تو حضرتؐ نے لوگوں کو ہنکا کر (یعنی ہدایت کر کے) ان کے ٹھکانے لگا دیا اور ان کی نجات [1] کی جگہ (جو دائرہ اسلام

(بقیہ صفحہ مابعد) (۴) ہم لوگ ایک ایسی جماعت کے ساتھ جس نے حق اور ہدایت کو اختیار کرلیا ہے اس بزرگ کی طرف چلے جو صاحب ورع وتقویٰ ہے اسی بزرگ کی نصرت کے لیے ہم لوگ جلدی کررہے ہیں۔

(۵) ہم لوگ حضرتؑ کی طرف سے دشمنان خدا کا مقابلہ کریں گے اس طرح کے ہماری تلواریں کھنچی ہوئی دشمنوں کے گلے ملیں گی اور ان کو سر سے جدا کر کے واپس آئیں گی۔

[1] یعنی اسلام کے قبل لوگ غریب، خانہ بردوش اور پراگندہ تھے کہ کوئی دین ومذہب نہ تھا جو ان کو درست کرتا اور اسلام ان کی اصلی جگہ تھی جو ان کے لیے باعثِ اطمینان وامن وامان ہوئی جس میں آکر لوگ خونریزی، قتل وغارت، لوٹ مار سے محفوظ ہوکر عیش وراحت کی زندگی بسر کرنے لگے۔ پس آنحضرتؐ نے ان لوگوں کو جو اپنی اصلی جگہ (اسلام) سے بہک کر مارے مارے پھرتے تھے اس جگہ پہنچا کر ٹھکانے لگا دیا اور پہلی زندگی سے یہ لوگ جہنم کے مستحق تھے حضرت نے ایمان کی راہ پر لگا کر ان کو نجات کے مقام میں پہنچا دیا۔

اطْمَأَنَّتْ صَفَاتُهُمْ.

ہے) پہنچا دیا۔ پس ان کی شان وشوکت درست اور ان کی حالت معاشرت قابل اطمینان ہوگئی۔ [1]

اَمَا وَاللّٰهِ! اِنْ كُنْتُ لَفِيْ سَاقَتِهَا حَتّٰى وَلَّتْ بِحَذَافِيْرِهَا. مَا ضَعُفْتُ وَ لَا جَبُنْتُ. وَ اِنَّ مَسِيْرِيْ هٰذَا لِمِثْلِهَا. فَلَاَبْقُرَنَّ الْبَاطِلَ حَتّٰى يَخْرُجَ الْحَقُّ مِنْ جَنْبِهٖ.

ہاں میں بھی بخدا اس (ضلالت و جہالت) کے ہنکانے (دفع کرنے) والوں میں تھا یہاں تک کہ وہ بالکل دفع ہوگئی [2] نہ کبھی میں عاجز ہوا اور نہ بزدلی دکھائی (بلکہ دوسرے صحابہ کے خلاف نہایت ثبات قدم سے کل خدمتوں کو انجام دیا) اور میرا سفر بھی اسی (زمانہ رسولؐ کی حالت کے) مثل (حق پر اور خدا کی راہ میں) ہے لہٰذا میں باطل کو ادھیڑ کر رکھ دوں گا تا کہ حق اس کے اندر سے نکل آئے۔

مَالِيْ وَ لِقُرَيْشٍ! وَاللّٰهِ! لَقَدْ قَاتَلْتُهُمْ

(آخر) قریش مجھ سے کیا چاہتے ہیں (اور مجھ کو کیا سمجھا

---

[1] ''قَنَاتٌ'' دراصل لکڑی کے نیزہ کو کہتے ہیں۔ یہاں مراد قوت اور شان وشوکت ہے۔ یعنی جس طرح ٹیڑھا نیزہ بیکار رہتا اور سیدھا ہو کر کام کا ہو جاتا ہے اسی طرح ان لوگوں کی حالت کج اور شان وشوکت مضمحل تھی اسلام نے اس کو درست اور محکم کر دیا۔ اور ''صَفَاةٌ'' سخت موٹے پتھر کو کہتے ہیں۔ یہاں مراد حالت معاشرت، ثبات قدم اور راحت کاملہ ہے اور مقصود یہ ہے کہ ان کی زندگی اب مامون، مطمئن اور خوف وخطر سے محفوظ ہوگئی۔

[2] اس جملہ ''اَمَا وَاللّٰهِ! اِنْ كُنْتُ لَفِيْ سَاقَتِهَا حَتّٰى وَلَّتْ بِحَذَافِيْرِهَا'' کے معنی ومقصود میں شارحین نے اختلاف کیا ہے۔ ملا فتح اللہ کاشانی علیہ الرحمہ فارسی ترجمہ یوں کرتے ہیں:

''بخدا سوگند بدرستی کہ بودم در میان مردمانے کہ رانندگان عساکر حقّہ بودند تا آنکہ پشت میداد ند جمیع لشکر خصم''۔

علامہ ابن میثم علیہ الرحمہ نے بھی یہی مطلب لکھا ہے۔ محمد عبدہ مصری لکھتے ہیں ''سَاقَتِهَا'' اور ''حَذَافِيْرِهَا'' کی ضمیریں اس حادثہ کی طرف پھرتی ہیں جو اس خطبہ سے سمجھ میں آتا ہے، یعنی آنحضرتؐ کی بعثت کی طرف جس سے خدا نے لوگوں پر انعام عظیم کیا کہ حضرت نے لوگوں کو ظلمت سے نکال کر نور اور ذلت سے عزت واقتدار میں پہنچا دیا۔

لیکن علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ ''دونوں ضمیریں زیادہ جاہلیت وضلالت کی طرف پھرتی ہیں جو گو تصریحاً مذکور نہیں ہے مگر مفہوماً موجود ہے اور جناب امیر علیہ السلام نے جاہلیت کی حالت کو یہاں یا کسی گرد آلود غبار اور آندھی سے تشبیہ دی ہے یا کسی لشکر سے جو جنگ وجدال کے لیے سامنے چلا آتا ہو، اس کے بعد فرمایا کہ میں نے اس غبار یا لشکر کو دفع کرنا شروع کیا جس سے وہ زائل ہو چلی اور میں برابر اس کے دفع کرنے میں مشغول رہا یہاں تک کہ وہ بالکل زائل ہوگئی اور اس کا کوئی اثر باقی نہ رہا''۔

كَافِرِيْنَ، وَ لَاُقَاتِلَنَّهُمْ مَفْتُوْنِيْنَ، وَ اِنِّيْ لَصَاحِبُهُمْ بِالْاَمْسِ، كَمَآ اَنَا صَاحِبُهُمُ الْيَوْمَ.

ہے کیونکہ) خدا کی قسم میں نے (جس طرح) ان سے اس وقت جہاد کیا جب وہ کافر تھے (اسی طرح) اب بھی لڑوں گا کہ وہ بہکے ہوئے ہیں۔ میں تو آج بھی ان کے ساتھ وہی (علیؑ) ہوں جو کل تھا (ابھی تک کوئی فرق نہیں ہوا ہے)۔

❁ خطبہ :۳۵ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

فِيْ اسْتِنْفَارِ النَّاسِ اِلٰى اَهْلِ الشَّامِ

خطبہ:۳۵(۳۴)

حضرت علیہ السلام کے ایک خطبہ کا کچھ حصّہ جسے (آپؑ نے) لوگوں کو اہلِ شام کی طرف (ان سے لڑنے کے لیے) چلنے پر آمادہ کرنے کی غرض سے فرمایا ہے۔[1]

---

[1] ۱۵ جمادی الاخریٰ ۳۶ھ کو جنگ جمل اور صفر ۳۷ھ میں جنگ صفین واقع ہوئی۔ ۱۳ صفر ۳۸ھ میں واقعہ تحکیم ہوا۔ رمضان المبارک ۳۷ھ میں حکمین نے فیصلہ سنایا۔ اور بروایت مورخ طبری و ابن اثیر و ابن خلدون اواخر ۳۸ھ میں اور بروایت مسعودی، صاحب حبیب السیر اوائل ۳۸ھ میں جنگ نہروان واقع ہوئی۔ حضرتؑ نے اس جنگ میں بھی فتحیاب ہو کر اور خوارج کا فیصلہ کر کے موصل کی راہ سے شام چلنے کا ارادہ کیا اور نہروان ہی میں یہ خطبہ ارشاد فرمایا۔ چنانچہ شرح ابن ابی الحدید جلد ا صفحہ ۱۷۶ اور کتاب الامامۃ والسیاسۃ ابن قتیبہ دینوری مطبوعہ مصر جلد ا صفحہ ۲۳۵ میں ہے کہ ''خوارج کے مرحلہ سے فارغ ہو کر جب نہروان سے روانہ ہونا چاہا تو کھڑے ہو کر حمد و ثنائے الٰہی بجالائی پھر فرمایا:

اَمَّا بَعْدُ، فَاِنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحْسَنَ بَلَاءَكُمْ، وَاَعَزَّ نَصْرَكُمْ، فَتَوَجَّهُوْا مِنْ فَوْرِكُمْ هٰذَا اِلٰى مُعَاوِيَةَ وَاَشْيَاعِهِ الْقَاسِطِيْنَ الَّذِيْنَ نَبَذُوْا كِتَابَ اللّٰهِ وَرَاءَ ظُهُوْرِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا، فَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖ اَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ.

لوگو خدا نے تمہاری آزمائش کا نتیجہ اچھا دیا اور تمہاری نصرت کو غلبہ دیا اب فوراً معاویہ اور اس کے ساتھیوں کی طرف چلے چلو جس نے کتابِ خدا کو پسِ پشت ڈال دیا ہے اور اس کو ہلکے داموں بیچ ڈالا پس کیا بری چیز انہوں نے اپنے نفسوں کے عوض خریدی ہے، کاش یہ لوگ جانتے بوجھتے۔

اس خطبہ پر حضرتؑ کے ساتھیوں نے جواب دیا کہہ یا امیر المومنین ہمارے تیر ختم ہو گئے، تلواریں کند ہو گئیں نیزے ٹوٹ گئے لہٰذا کوفہ واپس چلیے وہاں سے اچھی طرح تیار ہو کر پورے ساز و سامان سے اہلِ شام کی طرف چلیں گے۔ اس پر حضرتؑ نے پھر بہت سمجھایا اور پیشین گوئی کی کہ

﴿وَ لَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ﴾ گھر نہ لوٹو ورنہ سخت خسارہ میں رہو گے۔

اُفٍّ لَّكُمْ! لَقَدْ سَئِمْتُ عِتَابَكُمْ! ﴿اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ﴾ عِوَضًا؟ وَ بِالذُّلِّ مِنَ الْعِزِّ خَلَفًا؟ اِذَا دَعَوْتُكُمْ اِلٰى جِهَادِ عَدُوِّكُمْ دَارَتْ اَعْيُنُكُمْ، كَاَنَّكُمْ مِنَ الْمَوْتِ فِيْ غَمْرَةٍ، وَ مِنَ الذُّهُوْلِ فِيْ سَكْرَةٍ، يُرْتَجُ عَلَيْكُمْ حَوَارِيْ فَتَعْمَهُوْنَ، فَكَاَنَّ قُلُوْبَكُمْ مَاْلُوْسَةٌ، فَاَنْتُمْ لَا تَعْقِلُوْنَ. مَآ اَنْتُمْ لِيْ بِثِقَةٍ سَجِيْسَ اللَّيَالِيْ، وَ مَآ اَنْتُمْ بِرُكْنٍ يُّمَالُ بِكُمْ، وَ لَا زَوَافِرِ عِزٍّ يُّفْتَقَرُ اِلَيْكُمْ.

مَآ اَنْتُمْ اِلَّا كَاِبِلٍ ضَلَّ رُعَاتُهَا، فَكُلَّمَا جُمِعَتْ مِنْ جَانِبٍ انْتَشَرَتْ مِنْ اٰخَرَ، لَبِئْسَ ۔ لَعَمْرُ اللّٰهِ! سَعْرُ نَارِ الْحَرْبِ اَنْتُمْ، تُكَادُوْنَ وَ لَا تَكِيْدُوْنَ، وَ تُنْتَقَصُ اَطْرَافُكُمْ فَلَا تَمْتَعِضُوْنَ،

تم لوگوں پر سخت افسوس ہے! (اب تو) میں تم سب پر غصّہ کرتے کرتے تھک گیا۔ کیا تم لوگوں نے آخرت کے عوض دُنیاوی زندگی اور بجائے عزت کے ذلت کو پسند کرلیا ہے؟ جب میں تمہارے ہی دشمنوں سے جہاد کرنے کو تمہیں بلاتا ہوں تو تمہاری آنکھیں اس طرح گردش کرنے لگتی ہیں کہ گویا تم موت کی سختی میں مبتلا ہو گئے اور غفلت سے تمہارے حواس جاتے رہے۔ (چونکہ سننا نہیں چاہتے اس سبب سے) میری بات تم (یعنی تمہارے دماغ) تک پہنچنے نہیں پاتی لہٰذا سرگرداں ہورہے ہو۔ غرض تمہارے دل گویا بالکل باؤلے (ہورہے) ہیں جس سے تم (کچھ) سمجھتے ہی نہیں۔ (اب) نہ تو تم قیامت تک میرے قابل اعتماد رہے، نہ وہ رکن جس پر تکیہ کیا جائے، نہ عزت (وشرف و فتح وغلبہ) کی بنیاد جس کی طرف کوئی محتاج ہو۔

تمہاری مثال تو ان اونٹوں سی ہے جن کے چرواہے گم ہو گئے ہوں کہ جب وہ کسی ایک طرف سے بھی گھیرے جاتے ہیں تو دوسری جانب سے منتشر ہوجاتے ہیں۔ خدا کی قسم تم آتش جنگ کے (بہت ہی) برے ایندھن ہو۔ (اَیں!) لوگ تو تم سے کید ومکر کرتے ہیں اور تم لوگ اس کید کو دفع نہیں کرتے![1] تمہارے اطراف وجوانب

مگر وہ لوگ بار بار مختلف عذر کرتے رہے۔ آخر مجبور اور مایوس ہوکر حضرتؑ کوفہ واپس آئے اور کافی مہلت دینے کے بعد اس خطبہ کو فرمایا کہ ''اب تو میں تم پر غصّہ کرتے کرتے تھک گیا الخ''۔ مگر پھر بھی لوگ حیلہ حوالہ آج کل کرتے اور ہاتھ پاؤں پھیلاتے رہے۔ آخر حضرتؑ ۴۰ھ میں شہید ہو گئے اور وہی ہوا جو حضرتؑ نے نہروان میں پیشین گوئی کی تھی کہ اگر ابھی ہی تم لوگ شام نہ چلے بلکہ کوفہ کو لوٹ گئے تو خسارہ میں رہو گے۔ اس سے زیادہ تفصیل ضمیمہ میں آئے گی۔

[1] مکر اصل میں مخفی تدبیر کو کہتے ہیں اور یہاں وہ کید ومکر مراد نہیں ہے جو کفار ومنافقین وفاسقین کرتے ہیں بلکہ اس مکر (بقیہ صفحہ مابعد)

لَايُنَامُ عَنْكُمْ وَ اَنْتُمْ فِيْ غَفْلَةٍ سَاهُوْنَ، غُلِبَ وَاللّٰهِ الْمُتَخَاذِلُوْنَ. وَايْمُ اللّٰهِ! اِنِّيْ لَاَظُنُّ بِكُمْ اَنْ لَّوْ حَمِسَ الْوَغٰى، وَ اسْتَحَرَّ الْمَوْتُ، قَدِ انْفَرَجْتُمْ عَنِ ابْنِ اَبِيْ طَالِبٍ انْفِرَاجَ الرَّاْسِ.

وَاللّٰهِ! اِنَّ امْرَاً يُّمَكِّنُ عَدُوَّهٗ مِنْ نَّفْسِهٖ يَعْرُقُ لَحْمَهٗ، وَ يَهْشِمُ عَظْمَهٗ، وَ

گھٹتے جاتے ہیں[1] مگر تم کو (ذرّہ بھی) جوش نہیں آتا (دشمن کو) تمہاری فکر میں نیند تک نہیں آتی اور تم غفلت میں سب کو بھولے ہوئے ہو! بخدا جن لوگوں نے اپنوں کا ساتھ چھوڑا وہ مغلوب ہو کر رہے۔ اور خدا کی قسم میں تمہارے بارے میں بھی گمان کرتا ہوں کہ اگر (میدان) جنگ سخت اور (بازار) موت گرم ہو تو تم (مجھ علیؑ) ابن ابی طالب سے اس طرح الگ ہو جاؤ گے جس طرح سر (بدن سے) جدا ہو جاتا ہے۔

خُدا کی قسم! جو شخص اپنے دشمن کو اپنے اوپر اتنا قابو دے دے کہ وہ اس کا گوشت نوچے اور اس کی ہڈی توڑے اور اس کی کھال اُدھیڑے اس کی بے بسی بڑی

(بقیہ صفحہ مابعد) کے دفع کی تدبیر مقصود ہے جس کو خدا نے بھی کہا ہے:

﴿وَ مَكَرُوْا وَ مَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ﴾ (آل عمران، آیہ ۵۴)

اور رسول خداؐ بھی کرتے تھے۔ چنانچہ غزوۂ خندق میں ایک شخص نعیم بن مسعود نے آنحضرتؐ سے عرض کی کہ اجازت ہو تو ہم کفار میں پھوٹ ڈال دیں، حضرتؐ نے فرمایا کچھ مضائقہ نہیں ''فَاِنَّ الْحَرْبَ خَدْعَةٌ'' جنگ میں مکر و فریب جائز ہے۔ (تاریخ کامل، جلد ۲، ص ۶۹، تاریخ طبری، جلد ۳، ص ۵۰ وغیرہ)۔ ہاں معاویہ جو دفاع کے لیے نہیں بلکہ دنیا پرستی، فتنہ و فساد کے لیے مکر و فریب کرتا تھا مذموم وہ تھا۔ چنانچہ جناب امیرؑ اسی مکر و فریب کے دفع کے لیے اپنے لوگوں کو آمادہ کر رہے ہیں۔ معاویہ کے مکر و فریب کی داستان چونکہ بہت طویل ہے لہٰذا اس کے لیے ضمیمہ کا انتظار کرنا چاہیے۔

[1] جب جناب امیرؑ جنگ نہروان سے کوفہ واپس آئے اور معاویہ حضرتؑ کی طرف سے مطمئن ہو گیا تو مختلف شہروں میں اپنے مکار سرداروں کے ماتحت فوج کو قتل و غارت کے لیے روانہ کرنا شروع کیا۔ مثلاً ۳۸ھ میں عبداللہ بن حضرمی کو بصرہ پر، ۳۹ھ میں نعمان بن بشیر کو عین التمر پر، عوف کو ہیت و انبار پر، عبداللہ بن مسعود فزاری کو تیما پر، ضحاک بن قیس کو ثعلبیہ و قطقطانہ پر، معاویہ بن یزید کو مکہ پر، ۴۰ھ میں بسر بن ارطاۃ کو حجاز و یمن پر روانہ کیا۔ اسی طرح اور بہت سے امور ہیں جن سے کچھ پہلے مذکور ہوئے اور مابقی ضمیمہ میں بیان ہوں گے۔ ان تدابیر میں اگرچہ معاویہ کے لشکروں کو شکست پر شکست ہوتی جاتی تھی مگر حدود اسلامیہ میں بدامنی بڑھتی جاتی اور جناب امیرؑ کا دبدبہ و تسلط کمزور ہوتا جاتا تھا اور یہی معاویہ کا مقصود اصلی تھا۔ اسی کو حضرتؑ فرماتے ہیں کہ تمہاری سلطنت کے اطراف کم ہوتے جاتے ہیں مگر تم کو کوئی فکر نہیں ہوتی۔

يَفْرِیْ جِلْدَهٗ، لَعَظِيْمٌ عَجْزُهٗ، ضَعِيْفٌ مَّا ضُمَّتْ عَلَيْهِ جَوَانِحُ صَدْرِهٖ. اَنْتَ فَكُنْ ذَاكَ اِنْ شِئْتَ، فَاَمَّا اَنَا فَوَاللّٰهِ! دُوْنَ اَنْ اُعْطٰى ذٰلِكَ ضَرْبٌ بِالْمَشْرَفِيَّةِ تَطِيْرُ مِنْهُ فَرَاشُ الْهَامِ، وَ تَطِيْحُ السَّوَاعِدُ وَ الْاَقْدَامُ، وَ يَفْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ ذٰلِكَ مَا يَشَآءُ.

(ہی سخت) ہے۔(اور) وہ (دل) جس پر اس کے سینہ کی ہڈیاں لپٹی ہیں بڑا ہی بودا ہے۔ ۱؎ (خیر) اگر تم (یہی) چاہتے ہو تو ایسے ہی رہو ۲؎ مگر میں تو خدا کی قسم قبل اس کے کہ (دُشمن کو اپنے اوپر) ایسا (قابو) دوں، (یہ کروں گا کہ) مشرقی (تلواروں ۳؎) سے وہ (شدید) ضرب لگاؤں جس سے سروں کی کھوپڑیاں اڑنے اور ہاتھ پاؤں (کٹ کٹ کر) گرنے لگیں گے۔ اور اس کے بعد خدا جو چاہے گا کرے ہی گا۔

اَيُّهَا النَّاسُ! اِنَّ لِيْ عَلَيْكُمْ حَقًّا، وَ لَكُمْ عَلَيَّ حَقٌّ: فَاَمَّا حَقُّكُمْ عَلَيَّ: فَالنَّصِيْحَةُ

لوگو! میرا ایک حق تم پر ہے اور تمہارا ایک حق مجھ پر ہے۔ تمہارا حق تو مجھ پر یہ ہے کہ میں تمہاری نصیحت کروں اور تمہارے مال غنیمت کو پورا پورا تمہارے

۱؎ علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں (جلد ۱، ص ۱۰۰) کہ ''ایک خطبہ میں اہل کوفہ سے خطاب کرتے ہوئے حضرتؑ نے فرمایا۔ ہائے افسوس کیسے تعجب کی حالت ہے تمہاری اور شام والوں کی کہ اہلِ شام کا حاکم (معاویہ) تو خدا کی نافرمانی کرے اور وہ لوگ اس کی اطاعت کریں اور تمہارا حاکم (میں علی بن ابی طالبؑ) خدا کی اطاعت کرے اور تم لوگ اس کی مخالفت کرو۔ خدا کی قسم اے اہلِ کوفہ! اپنے دشمن سے جہاد کرنے پر آمادہ ہو جاؤ ورنہ یاد رکھو کہ جس (حکومت و سرداری) کے اہل تم ہو اس پر دوسری قوم (بنی امیہ اور اہل شام) مسلّط ہو جائے گی۔ پس وہ تم سب کو سخت دردناک عذاب میں مبتلا رکھے گی۔ تم لوگ تلوار کے قتل سے ڈر کر فرش کی موت چاہتے ہو حالانکہ فرش کی موت ہزار تلوار کے قتل سے زیادہ سخت ہوگی''۔

۲؎ ظاہر عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ عام خطاب ہے یعنی جس کو مذکورہ حالت پسند ہو وہ اسی کو اختیار کرے مگر مفتی ابن عبدہ لکھتے ہیں ص ۳ کہ یہ خطاب خاص کر اشعث بن قیس سے ہے جس نے حضرتؑ کے ان جملوں پر جو اہلِ کوفہ کی بزدلی اور پہلوتہی پر لعنت ملامت کر رہے تھے کہا کہ ''آپ نے بھی عثمان بن عفان کی روش کیوں نہ اختیار کی'' تو حضرت نے جواب دیا کہ ''عثمان کی روش تو اہلِ دین کو ذلیل کرنے والی تھی جس کی کوئی دلیل نہیں کیونکہ جو شخص اپنے دشمن کو اپنے نفس پر غلبہ دے وہ نہایت ضعیف الرائے اور مخبوط الحواس ہے پس اگر تو اس روش کو اختیار کرتا ہو تو ویسا ہی رہ میں تو ویسا نہیں ہو سکتا''۔ اس روایت کو لکھ کر ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ ممکن ہے یہ روایت بھی صحیح ہو اور پھر بھی حضرتؑ کا خطاب عام ہو۔

۳؎ مشرفیہ ملک عرب میں شام کے شہروں کے پاس کچھ گاؤں ہیں جن کا نام ہے مشارف الشام، وہاں کی تلواریں عمدہ اور بڑی مشہور ہوتی ہیں انہی تلواروں کو سیوف مشرفیہ کہتے ہیں۔

لَكُمْ، وَ تَوْفِيْرُ فَيْئِكُمْ عَلَيْكُمْ، وَ تَعْلِيْمُكُمْ كَيْلَا تَجْهَلُوْا، وَ تَأْدِيْبُكُمْ كَيْمَا تَعْلَمُوْا. وَ اَمَّا حَقِّيْ عَلَيْكُمْ فَالْوَفَآءُ بِالْبَيْعَةِ، وَ النَّصِيْحَةُ فِي الْمَشْهَدِ وَ الْمَغِيْبِ، وَ الْاِجَابَةُ حِيْنَ اَدْعُوْكُمْ، وَ الطَّاعَةُ حِيْنَ اٰمُرُكُمْ.

حوالہ کردوں۔[1] اور تمہیں تعلیم دے دوں تا کہ جاہل نہ رہو اور تمہیں ادب سکھا دوں تا کہ جان جاؤ۔ رہا میرا حق تم پر، تو یہ ہے کہ اپنی بیعت (کا عہد) پورا کرو اور حاضر و غائب خیر خواہی کرو اور جب میں تم کو بلاؤں تو حاضر ہو جاؤ اور جب (کوئی) حکم دوں تو مان لو۔

❁ خطبہ :۳۶ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ بَعْدَ التَّحْكِيْمِ

خطبہ:۳۶(۳۵)

حضرت علیہ السّلام کے ایک خطبہ کا کچھ حصّہ (جسے واقعہ) تحکیم کے بعد (فرمایا)[2]

---

[1] علامہ ابن ابی الحدید اس خطبہ کی شرح میں اس امر کی تحقیق کرتے ہوئے کہ یہ لوگ حضرت سے کیوں علیحدہ ہوتے جاتے اور پوری مستعدی سے ساتھ نہ دیتے تھے لکھتے ہیں کہ ''سب سے بڑی اور قوی وجہ جس سے اہل عرب حضرت امیر المومنین علیہ السلام کا ساتھ چھوڑتے جاتے تھے، مال کا معاملہ تھا۔ کیونکہ حضرت تقسیم مال غنیمت میں ہر شخص کو برابر رکھتے اور کسی شریف کو حقیر پر اور اعلیٰ کو ادنیٰ پر اور عرب کو عجم پر ترجیح نہیں دیتے تھے اور رئیسوں اور امیروں اور بڑے بڑے قبیلوں کے سرداروں سے خصوصیت اور احسان کا وہ برتاؤ نہ کرتے تھے جو دوسرے بادشاہ اور حکام ان لوگوں کو ملائے رکھنے کے لیے کرتے ہیں۔ غرض دنیاوی تدبیروں سے کوئی تدبیر بھی اپنا دبدبہ اور شوکت قائم کرنے کیلئے اختیار نہیں کرتے تھے (بلکہ جو انصاف اور شرع کا مقتضی تھا اسی پر قائم رہے) اور آپ کے بالکل خلاف معاویہ کی حالت تھی کہ دنیاوی تدابیر سے کوئی بھی اُٹھا نہ رکھی اور کمزور و بے اثر لوگوں کے حقوق مار مار کر سرداروں اور ذی اثر لوگوں کو مالا مال کر دیا اور اپنے سے ملا لیا تھا۔ جس سے اس کی قوت روز بروز بڑھتی گئی اور جمعیت زیادہ ہوتی رہی''۔ مگر میں کہتا ہوں کہ یہ حالت خاص معاویہ کی نہ تھی بلکہ خلفائے ثلاثہ اس کے موجد ہیں۔ چنانچہ حضرت عمر کا دیوان مقرر کرنا اس کا شاہد ہے حالانکہ وہ سب سے زیادہ عادل مشہور ہیں اور حضرت ابوبکر و عثمان کا تو ذکر ہی نہیں۔

[2] یہ حصّہ اس خطبہ کا ہے جسے حضرتؑ نے عمرو بن العاص کے ابوموسیٰؑ اشعری کو واقعہ تحکیم میں فریب دینے کے بعد اور جنگ نہروان واقع ہونے کے پہلے ارشاد فرمایا۔ چنانچہ واقعہ تحکیم کا مختصر حال یہ ہے کہ ملک شام میں معاویہ نے حضرت امیر المومنینؑ کے خلاف علَم بغاوت بلند کیا تو جنگ جمل کے بعد ۳۶ھ ماہ ذی الحجہ میں جناب امیرؑ کی فوجیں کوفہ سے اور معاویہ کی فوجیں شام سے مقام صفین میں جمع ہوئی مگر بخیال ماہ محرم الحرام لڑائی نہ شروع ہوئی۔ صفر ۳۷ھ میں جنگ چھڑ گئی اور عرصہ تک بہت شدت سے ہوتی رہی۔ آخر ایک روز حضرت امیر المومنینؑ نے فیصلہ کن جنگ کا ارادہ کر کے نہایت سخت حملہ کرایا۔ یہاں تک کہ شب بھر جنگ ہوتی رہی جو (بقیہ صفحہ مابعد)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَ اِنْ اَتَى الدَّهْرُ بِالْخَطْبِ الْفَادِحِ، وَ الْحَدَثِ الْجَلِيْلِ. وَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، لَيْسَ مَعَهٗٓ اِلٰهٌ غَيْرُهٗ، وَ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم.

ہر حال میں خدا کی حمد ہے اگر چہ زمانہ مشکل حالت اور بڑے حادثہ میں مبتلا کرے۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ خدائے یکتا کے سوا کوئی خدا نہیں ہے، نہ تو اس کا کوئی شریک ہے، نہ اس کے ساتھ کوئی اس کے علاوہ معبود ہے۔ اور اس کی (گواہی دیتا ہوں) کہ (حضرت) محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے (خاص) بندہ اور پیغمبر ہیں۔ خدا آپؐ پر اور آپؐ کی آل (پاک) پر رحمت نازل کرے۔

(بقیہ صفحہ مابعد) لیلۃ الہریر مشہور ہے۔ ایک طرف خود حضرتؑ اور دوسری طرف حضرتؑ کے مشہور سپہ سالار مالک اشتر میمنہ پر اور عبداللہ بن عباس میسرہ پر۔

آخر لشکر شام چیخ اُٹھا اور معاویہ کی پوری فوج بھاگنے پر تیار ہوگئی۔ معاویہ اور عمرو عاص دونوں یہ آفت دیکھ کر کہ اب پوری تباہی ہے مکر وفریب کی صورت سوچنے لگے اور یہ ترکیب کی کہ جتنے قرآن مجید اس لشکر میں تھے جن کی تعداد بعضوں نے پانچ سو لکھی ہے، ان سب کو نیزوں پر باندھ کر اور بہ آواز بلند کہلانا شروع کیا کہ ''ہمارے تمہارے درمیان یہ کلام اللہ ہے۔ اس کا واسطہ صلح کرلو''۔ معاویہ کی یہ چال کام کر گئی اور حضرت علیؑ کے لشکر میں تفرقہ پڑ گیا۔ سادہ لوح دیندار حافظوں اور قاریوں نے تلوار روک کر کہا کہ ہم کو قرآن کی طرف بلایا جاتا ہے کیوں کر قبول نہ کریں ہمیں قرآن مجید کو ضرور ماننا چاہیے۔ یہ رنگ دیکھ کر حضرتؑ نے ان سب سے فرمایا کہ ''اِنَّهَا كَلِمَةُ حَقٍّ يُرَادُ بِهَا بَاطِلٌ'' یعنی معاویہ والوں کی یہ بات کہ قرآن کا فیصلہ مان لیں صحیح تو ہے مگر اس سے ان کا مقصود باطل اور فساد پھیلانا ہے، کیونکہ ان کی یہ غرض ہرگز نہیں ہے کہ قرآن کے حکم کی طرف رجوع کریں ورنہ لڑتے ہی کیوں۔ وہ لوگ تو قرآن کا حکم پہلے ہی سے جانتے ہیں اور پھر بھی اس کی مخالفت کرتے ہیں، پس یہ صرف مکر وفریب اور اپنی شکست کو روکنے کی ایک چال ہے، تم لوگ چند منٹوں تک اور اپنے ہاتھ اور بازو مجھے عاریت دو کہ اب حق اپنی حد پر پہنچا چاہتا ہے اور دشمنوں کے بیخ وبُن سے اکھاڑ پھینکنے میں ذرا ہی سی کسر باقی ہے۔ چنانچہ معاویہ کا بیان ہے کہ ہم اس وقت اس فکر میں تھے کہ یا بیعت کریں یا شام کی طرف بھاگ جائیں۔

ادھر اپنے لشکر والوں کو حضرتؑ نے بہت کچھ سمجھایا اور ہر نشیب وفراز کو دکھایا۔ مگر ان لوگوں نے ایک بھی نہ مانی بلکہ کہا کہ اگر آپ جنگ کو موقوف نہ کرا دیں گے تو ہم لوگ اُلٹے آپ ہی کو معاویہ کے حوالہ کر دیں گے۔ مجبوراً حضرتؑ نے جنگ رکوا دی اور صلح کی بات چیت ہونے لگی حالانکہ شکار پھندے میں پھنس چکا تھا صرف ہاتھ سے پکڑ لینے کی دیر تھی کہ نادان دوستوں کی غلطی سے اس کو چھوڑ دینا پڑا۔ چنانچہ شام کے اور حضرت امیر المومنینؑ کے لشکر نے ایک ایک شخص کو اپنی طرف سے فیصلہ کرنے کے لیے حکم (پنچ) مقرر کیا اور ۱۳ صفر ۳۷ھ کو ایک وثیقہ لکھوا کر جنگ ختم کر دی گئی۔ اس پنچ مقرر کرنے کو تحکیم کہتے ہیں جس کا واقعہ بہت طولانی ہے اور تمامی تواریخ میں مندرج ہے اسی واقعہ سے معاویہ کی سلطنت قائم ہوئی اور تمام جہاں میں ظلم پھیلا۔

اَمَّا بَعْدُ! فَاِنَّ مَعْصِيَةَ النَّاصِحِ الشَّفِيْقِ الْعَالِمِ الْمُجَرِّبِ تُوْرِثُ الْحَسْرَةَ، وَتُعْقِبُ النَّدَامَةَ. وَقَدْ كُنْتُ اَمَرْتُكُمْ فِيْ هٰذِهِ الْحُكُوْمَةِ اَمْرِيْ، وَ نَخَلْتُ لَكُمْ مَخْزُوْنَ رَاْيِيْ، لَوْ كَانَ يُطَاعُ

اما بعد پس (واضح ہو کہ) مہربان (اور) عالم (و) تجربہ کار ناصح کی نافرمانی (آخرکار) حسرت پیدا کرتی اور پیچھے ندامت لاتی ہے۔ (دیکھو!) اس پنچایت کے بارے میں تم کو (اسی وقت) میں نے اپنا (مناسب) حکم دے دیا تھا اور نہایت خلوص سے اپنی قیمتی (اور قابلِ قدر) رائے تم پر ظاہر کر دی تھی۔[1] کاش قصیر کی رائے

[1] جب معاویہ کے مکر وفریب میں حضرتؑ کے لشکر والے آ گئے اور ہر فریق نے یہ طے کر لیا کہ دو پنچ مقرر کیے جائیں جو منصف ہو کر کتاب اللہ کے مطابق اس جنگ کا فیصلہ اور آئندہ کے امن کا انتظام کریں تو شام والوں نے اپنے اول درجہ کے مکار عمرو بن عاص کو اپنا حکم مقرر کیا اور اہل کوفہ نے اپنی طرف سے ابوموسیٰ اشعری کو تجویز کیا جو ابتدا سے مخالف جناب امیرؑ اور بے دین آدمی تھے۔ حضرت امیر المومنینؑ ابوموسیٰ اشعری پر راضی نہ ہوئے بلکہ اپنی طرف سے عبداللہ بن عباس کو پیش کیا۔ مگر لوگوں نے ان کو منظور نہ کیا۔ تو پھر حضرتؑ نے مالک اشتر کا نام لیا لیکن ان سے بھی لوگوں نے انکار کیا۔ غرض حضرتؑ کے لشکر والے کچھ ایسے بدل گئے کہ اس میں بھی حضرتؑ کی کوئی بات نہ سنی اور ابوموسیٰ ہی کے لیے اڑے رہے حالانکہ وہ ابتدا سے اس کے مخالف تھے اور حضرت عمر نے چند مرتبہ حکومت کوفہ سے ان کو معزول کیا تھا۔ آخر حضرتؑ نے مجبور ہو کر کہہ دیا کہ ''جب تم میری بات سنتے ہی نہیں تو پھر جو چاہو کرو''۔ چنانچہ ان سبھوں نے ابوموسیٰ اشعری ہی کو باوجود حضرتؑ کی اس شدید مخالفت کے اپنی طرف سے حکم مقرر کر دیا اور صلح نامہ لکھ کر طرفین سے دستخط ہو گئی اور سب اپنے اپنے گھر گئے۔

اور اسی سال ماہ رمضان میں دومۃ الجندل کے قریب مقام اذرح میں (جو کوفہ اور شام کے درمیان ایک جگہ ہے) دونوں پنچ جمع ہوئے آپس میں دیر تک صلاح ومشورہ ہوا اور آخر یہ رائے قرار پائی کہ حضرت علیؑ اور معاویہ دونوں کو معزول کر کے خلافت کو مسلمانوں کے مشورہ اور انتخاب پر چھوڑ دیا جائے کہ جس کو لوگ چاہیں خلیفہ مقرر کر لیں۔ یہ تجویز ابوموسیٰ اشعری کی تھی۔ عمرو عاص نے کہا مجھے بھی یہ رائے پسند ہے۔ تخلیہ میں یہ تجویز طے کر کے دونوں پنچ مجمع عام میں آئے جہاں چار سو آدمی حضرت علیؑ کی طرف سے اور چار سو معاویہ کی طرف سے حکمین کا فیصلہ سننے کے لیے موجود تھے۔ ان میں شام عراق حجاز مکہ اور مدینہ تمام ہی کے لوگ تھے صحابہ رسول بھی تھے۔

جب اس مجمع کو اپنی تجویز سنانے کا موقع آیا تو عمرو عاص چال چل گیا اور ابوموسیٰ اشعری سے کہا ''آپ میرے بزرگ ہیں پہلے آپ ہی تقریر کیجیے'' ابوموسیٰ اس کی تہ کو نہ پہنچے اور مجمع کی طرف خطاب کر کے کہا ''ہم دونوں کی یہ رائے ہوئی ہے کہ حضرت علیؑ اور معاویہ دونوں معزول کر دیے جائیں اور لوگ کسی تیسرے کو مقرر کریں''۔ یہ کہہ کر ابوموسیٰ بیٹھ گئے تو عمرو عاص کھڑا ہوا اور کہا ''بھائیو! ابو موسیٰ نے جو کچھ کہا وہ تم سب نے سُن لیا انہوں نے علی مرتضیٰ کو معزول کیا میں بھی ان کو معزول کرتا ہوں اور معاویہ کو مقرر کرتا ہوں کیونکہ وہ عثمان کے مقرر کیے ہوئے ہیں اور وہ اس خلافت کے سب سے زیادہ مستحق ہیں''۔ ابوموسیٰ اشعری نے یہ سنا تو عمرو عاص پر بگڑے کہ ''اے عمرو تو نے سخت فریب کیا اور گنہگار ہوا'' اس فیصلہ پر سب لوگ پراگندہ ہو گئے اور اگرچہ کسی نے اس کو تسلیم (بقیہ صفحہ مابعد)

لِقَصِيْرٍ اَمْرٌ! فَاَبَيْتُمْ عَلَيَّ اِبَآءَ الْمُخَالِفِيْنَ الْجُفَاةِ، وَ الْمُنَابِذِيْنَ الْعُصَاةِ، حَتّٰى ارْتَابَ النَّاصِحُ بِنُصْحِهٖ، وَ ضَنَّ الزَّنْدُ بِقَدْحِهٖ، فَكُنْتُ اَنَا وَ اِيَّاكُمْ

مانی گئی ہوتی [1] (مگر آہ) تم نے (ایک نہ سُنی اور) ظالم مخالفوں اور کھلم کھلا دشمنی کرنے والے نافرمانوں کے انکار کی طرح مجھ سے منہ موڑ لیا یہاں تک کہ خود نصیحت کرنے والے (یعنی مجھ) کو اپنی نصیحت پر شبہ [2] اور چقماق کو روشنی دینے میں بخل کرنا پڑا۔ [3] تو میں اور تم ویسے ہی

(بقیہ صفحہ مابعد) نہیں کیا مگر اسی وقت سے جناب امیرؑ کے ہر کام میں ضعف بڑھتا گیا اور معاویہ کی (قوت) اس کے مکر و فریب کے سبب سے زیادہ ہوتی گئی۔

اسی کو حضرتؑ فرماتے ہیں کہ جب معاویہ نے قرآن نیزہ پر بلند کرایا تو اس وقت بھی میں نے اپنی سچی اور مناسب رائے تم کو دی کہ یہ اس کا فریب ہے، اس دھوکے میں نہ آؤ تھوڑا اور صبر کرو کہ جنگ خود ہی فیصلہ کر دے مگر تم لوگ میرے قتل پر آمادہ ہو گئے پھر حکم کی تجویز میں بھی ابوموسیٰ اشعری کی سخت مخالفت کرتا رہا اور کہتا رہا کہ کسی دوسرے عقلمند شخص کو تجویز کرو مگر تم لوگوں نے یہ بھی نہ مانا حالانکہ اس کی مخالفت تم ابتدا سے دیکھ رہے تھے اور اسی کو مقرر کرا کے رہے۔ آخر میری رائے اور اپنی غلطی کا نتیجہ دیکھ لیا۔

[1] ''لَوْ كَانَ يُطَاعُ لِقَصِيْرٍ اَمْرٌ!''۔ عربی ضرب المثل ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ عرب کے ایک بادشاہ جزیمہ ابرش نے جزیرہ کے بادشاہ کو قتل کیا۔ اس بادشاہ کی ایک نہایت خوبصورت اور چالاک لڑکی تھی جس کا نام تھا زباء۔ اپنے باپ کے بعد جزیرہ کے تخت پر وہی بیٹھی اور ایک شخص کو جزیمہ ابرش کے پاس یہ پیغام لے کر بھیجا کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ جزیمہ نے اس کو منظور کر لیا مگر اس کا ایک عقل مند غلام تھا جس کا نام تھا قصیر اس نے جزیمہ کو اس ارادہ سے بہت منع کیا اور کہا کہ وہ فریب دے کر اپنے باپ کا عوض لینا چاہتی ہے۔ لیکن جزیمہ نے اس کی نصیحت قبول نہ کی اور زباء نے اپنی ہوشیاری سے جزیمہ کو اپنے یہاں بلایا اور اس کا شاندار استقبال کر کے اپنی تمام فوج کے حلقہ میں لے کر مکان میں اتارا اور بری طرح قتل کر ڈالا۔ اسی وقت سے یہ کلمہ زبان زد ہو گیا کہ ''لَوْ كَانَ يُطَاعُ لِقَصِيْرٍ اَمْرٌ!'' یعنی کاش جزیمہ اپنے غلام قصیر کی بات مان لیے ہوتا اور اس طرح قتل سے بچ گیا ہوتا۔ اسی ضرب المثل کو ذکر کر کے حضرتؑ فرماتے ہیں کہ کاش میری نصیحت تم نے مانی ہوتی اور تحکیم پر راضی نہ ہوئے ہوتے یا آخر میں بھی ابوموسیٰ اشعری کو ترک کر کے میری تجویز سے کسی کو مقرر کیے ہوتے تو اسلام کو یہ خراب دن نہ دیکھنے پڑتے۔

[2] یعنی تم سب کے سب اس طرح میری تجویز کے مخالف ہو کر اپنی ہی رائے پر اصرار کرتے رہے کہ آخر مجبور ہو کر مجھ کو اس طرح خاموش ہو جانا پڑا کہ دیکھنے والوں نے یہ سمجھا کہ علیؑ بھی اپنی سابق رائے سے پلٹ گئے اور ان لوگوں کی رائے مان لی اسی سبب سے خاموش ہو رہے حالانکہ یہ بات نہ تھی بلکہ میں نے تم سب کو سخت دھوکے میں مبتلا دیکھ کر اور اس خطرہ سے تم کو نکالنے کی کوشش کرنے میں ناکام رہ کر خاموشی اختیار کر لی تھی کہ جب تم مانتے ہی نہیں تو جو چاہو کرو خود ہی اس کا برا انجام دیکھو گے چنانچہ ویسا ہی ہوا۔

[3] عرب میں دو پتھر یا لوہے اور پتھر کو آپس میں ٹکرا کر آگ نکالتے ہیں اسی پتھر یا لوہے کو زند یعنی چقماق کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ نہ تو چقماق روشنی دینے میں بخل کرے گا نہ میں تمہاری ضلالت کو پسند کروں گا چونکہ تم نے میری بات سنی ہی نہیں اس سبب سے میں خاموش ہو رہا جس طرح چقماق کو کوئی استعمال نہ کرے تو اس سے آگ نہیں نکل سکتی۔

كَمَا قَالَ اَخُوْ هَوَازِنَ:

اَمَرْتُكُمُ اَمْرِیْ بِمُنْعَرِجِ اللِّوٰی
فَلَمْ تَسْتَبِیْنُوا النُّصْحَ اِلَّا ضُحَی الْغَدِ

ٹھہرے جیسا قبیلہ ہوازن کے شاعر نے کہا ہے:۱؎

''میں نے تو تم کو مقام لوائے کے موڑ پر اپنا (مناسب) حکم دے دیا تھا مگر تم نے اس نصیحت کی پروا نہ کی لیکن اس وقت کہ صبح ہو کر چاشت کا وقت آ گیا''۔

❁ خطبہ :۳۷ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِیْ تَخْوِيْفِ اَهْلِ النَّهَرَوَانِ

خطبہ:۳۷(۳۶)

(حضرت علیہ السّلام کے ایک خطبہ کا کچھ حصّہ) (جسے) (اہلِ نہروان کو ڈرانے کے لیے (فرمایا)۔۲؎

۱؎ یہ شعر درید بن الصمّہ کا ہے زمانۂ جاہلیت کا ایک شاعر قبیلہ بنی ہوازن سے تھا اور غزوہ حنین میں بحالت کفر مسلمانوں کے ہاتھ قتل ہوا۔ اس کا ایک بھائی تھا عبداللہ نام جو زمانۂ جاہلیت میں قبیلہ غطفان پر حملہ آور ہوا اور بکثرت مال غنیمت لے کر واپس آنے لگا تو مقام لوا کے موڑ یا نکڑ پر شب کو قیام کر کے مال غنیمت کو شرکا میں تقسیم کرنا چاہا۔ اسی درید نے اس کو وہاں ٹھہرنے سے منع کیا کہ مبادا قبیلہ غطفان کے لوگ لوٹ پڑیں اور تم پر حملہ کر دیں مگر عبداللہ نے اس کی بات نہ مانی شب کو قیام کر دیا۔ آخر وہی ہوا جس کا اندیشہ درید نے کیا تھا کہ صبح کو بنو غطفان آ گئے اور حملہ کر کے عبداللہ کو قتل کر ڈالا۔ اسی عبداللہ اپنے بھائی کا مرثیہ درید نے کہا جس کا ایک شعر یہ بھی ہے۔ اس شعر کو حضرت امیر المومنینؑ نے جس مناسبت سے ذکر فرمایا ہے وہ واضح ہے کہ تم لوگوں نے بھی پہلے میری بات نہ مانی اب اس کا نتیجہ دیکھتے ہو۔

۲؎ حکمین کے فیصلہ ظاہر کرتے وقت جب عمرو عاص نے مکر و فریب کیا تو ابو موسیٰ اشعری اور عمرو عاص میں سخت کلامی ہونے لگی اور پورا مجمع پراگندہ ہو گیا لیکن اس وقت سے مسلمان کئی فرقے ہو گئے جن میں ایک فرقہ خوارج بھی تھا جو کہتا تھا کہ ''لَا حُكْمَ اِلَّا لِلّٰهِ''، یعنی خدا کے سوا کسی کا حکم نہیں ہے علیؑ نے خطا کی'' ان میں سے بعض لوگ حضرتؑ کے پاس آئے اور کہا کہ ''تم نے خدا کا حکم چھوڑ کر دو پنچوں کے حکم کو اختیار کیا اس سے کافر ہو گئے اب توبہ کرو تو ہم تمہارا ساتھ دیں''۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ ''میں تو خود تم لوگوں کو منع کرتا رہا تم نہ مانے تو میں خاموش ہو رہا اور تم کسی طرح اطاعت نہ کرتے'' اس پر ان لوگوں نے کہا کہ ''تم تحکیم سے توبہ نہ کرو گے تو ہم لوگ تم کو قتل کریں گے'' اس گفتگو کے بعد وہ لوگ ''لَا حُكْمَ اِلَّا لِلّٰهِ'' پکارتے ہوئے نکلے اور ایک جگہ جمع ہو کر رائے و مشورہ کیا اور سب نے متفق ہو کر خروج کا ارادہ کیا عبداللہ بن وہب راہبی کو اپنا سردار قرار دے کر ۱۰ شوال ۳۷ھ کو اس کے ہاتھ پر بیعت کی اور خفیہ طور پر مقام حروراء سے نکل کر مقام نہروان میں جو واسط اور بغداد کے درمیان بغداد سے ۱۴ میل پر ہے آ کر ٹھہرے۔ اور بڑے ظلم و تعدی بلکہ سفاکی اور درندگی کے حرکات کرنے لگے چنانچہ حضرت امیر المومنینؑ فوج لے کر نہروان کو روانہ ہوئے اور قریب پہنچ کر قیام فرمایا۔ پہلے خوارج کو بہت کچھ سمجھایا وعظ و نصیحت کی مگر وہ لوگ اڑے رہے کہ تم کافر ہو گئے اپنے کفر کا اقرار کر کے توبہ کرو تو ہم باز آئیں۔ آخر حضرتؑ نے ان کا مقابلہ کیا اور شکست فاش دی کہ دس ہزار تھے وہ سب مارے گئے صرف دس آدمی بچے۔ انہیں لوگوں سے قبل از جنگ بطور وعظ و نصیحت حضرتؑ نے یہ خطبہ ارشاد فرمایا ہے۔

فَاَنَا نَذِيْرٌ لَّكُمْ اَنْ تُصْبِحُوْا صَرْعٰى بِاَثْنَآءِ هٰذَا النَّهَرِ، وَ بِاَهْضَامِ هٰذَا الْغَآئِطِ، عَلٰى غَيْرِ بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ، وَ لَا سُلْطَانٍ مُّبِيْنٍ مَّعَكُمْ، قَدْ طَوَّحَتْ بِكُمُ الدَّارُ، وَ احْتَبَلَكُمُ الْمِقْدَارُ، وَ قَدْ كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ هٰذِهِ الْحُكُوْمَةِ فَاَبَيْتُمْ عَلَيَّ اِبَآءَ الْمُخَالِفِيْنَ الْمُنَابِذِيْنَ، حَتّٰى صَرَفْتُ رَاْيِيْ اِلٰى هَوَاكُمْ، وَ اَنْتُمْ مَعَاشِرُ اَخِفَّآءُ الْهَامِ، سُفَهَآءُ الْاَحْلَامِ، وَ لَمْ اٰتِ ـ لَآ اَبَا لَكُمْ ـ بُجْرًا، وَ لَآ اَرَدْتُّ لَكُمْ ضُرًّا.

(دیکھو) میں تم کو ڈرائے دیتا ہوں (ایسا نہ ہو) کہ تم سب اس نہر کے درمیان اور اس گڑھے کے ہموار حصوں میں ہلاک ہو جاؤ، ایسی حالت میں کہ تمہارے پروردگار کی کوئی حجت اور واضح دلیل تمہارے ساتھ نہ ہو۔ اس دار (دنیا) نے یقیناً تم کو اکھاڑ پھینکا اور تقدیر نے تم کو پھندے میں پھنسا لیا حالانکہ میں نے (کس شدت سے) تم کو اس پنچایت سے روکا تھا مگر تم نے کھلم کھلا مخالفت (اور) دشمنی کرنے والوں کے انکار کی طرح میری اطاعت سے منہ موڑ لیا یہاں تک کہ (مجبوراً) مجھ کو بھی اپنی رائے تمہاری خواہش کی طرف پھیرنی پڑی۔[1] غرض تم ایسی جماعت ہو جس کے دماغ تو چھوٹے اور عقلیں ناقص ہیں۔ بدبختو! میں نے تو تمہارے ساتھ کوئی بھی بُرائی نہیں کی اور نہ (کبھی) تم کو کوئی نقصان پہنچانا چاہا۔

❁ خطبہ :۳۸ ❁

وَ مِنْ كَلَامٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ يَجْرِيْ مَجْرَى الْخُطْبَةِ۔

خطبہ:۳۸(۳۷)

حضرت علیہ السّلام کے ایک کلام کا کچھ حصّہ[1] جو بمنزلہ خطبہ کے ہے۔

---

[1] یعنی معاویہ کے قرآن بلند کرنے پر میں نے تم کو کس قدر سمجھایا کہ یہ سب کید و مکر ہے مگر تم نے نہ مانا تو مجبوراً جو تم نے کہا وہ میں نے کیا نہ یہ کہ اس کو میں نے اپنے اختیار اور ارادہ سے کیا ہو۔ اسی کو حضرتؑ فرماتے حَتّٰى صَرَفْتُ رَاْيِيْ اِلٰى هَوَاكُمْ۔

[2] علامہ ابن ابی الحدید (اور دوسرے شارحین بھی) لکھتے ہیں کہ اس کلام میں چار فصلیں ہیں جو ایک دوسرے سے ملتی جلتی نہیں بلکہ ایک فصل میں حضرتؑ کا دوسرا مقصود ہے اور دوسرے میں دوسرا۔ جس کی حقیقت یہ ہے کہ واقعہ نہروان کے بعد حضرت امیر المومنینؑ نے ایک طویل کلام کیا ہے جس میں حضرتؑ نے رسول خداؐ کی وفات سے اس وقت تک کے اپنے واقعات اور سوانح کو مجمل طور پر بیان کیا۔ جناب سید رضی علیہ الرحمہ نے اسے طولانی کلام سے مختلف جملوں کو ایک جگہ جمع کر دیا۔ مگر حقیر مترجم کا خیال ہے کہ یہ کلام مسلسل بھی کہا جا سکتا ہے اور غیر مسلسل بھی جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

فَقُمْتُ بِالْاَمْرِ حِيْنَ فَشِلُوْا، وَ تَطَلَّعْتُ حِيْنَ تَقَبَّعُوْا، وَ نَطَقْتُ حِيْنَ تَعْتَعُوْا، وَمَضَيْتُ بِنُوْرِ اللّٰهِ حِيْنَ وَقَفُوْا، وَ كُنْتُ اَخْفَضَهُمْ صَوْتًا، وَ اَعْلَاهُمْ فَوْتًا، فَطِرْتُ بِعِنَانِهَا، وَ اسْتَبْدَدْتُّ بِرِهَانِهَا، كَالْجَبَلِ لَا تُحَرِّكُهُ الْقَوَاصِفُ، وَ لَا تُزِيْلُهُ الْعَوَاصِفُ، لَمْ يَكُنْ لِّاَحَدٍ فِيَّ مَهْمَزٌ، وَ لَا لِقَآئِلٍ فِيَّ مَغْمَزٌ.

اَلذَّلِيْلُ عِنْدِيْ عَزِيْزٌ حَتّٰٓى اٰخُذَ الْحَقَّ لَهٗ، وَ الْقَوِيُّ عِنْدِيْ ضَعِيْفٌ حَتّٰٓى اٰخُذَ الْحَقَّ مِنْهُ، رَضِيْنَا عَنِ اللّٰهِ

پس میں اس امر (حق کہنے اور بُرائیوں کے ٹوکنے) پر اس وقت آمادہ ہوا جب (اوروں نے) نامردی دکھائی اور اس وقت نکل کھڑا ہوا جب (دوسرے صحابہ) گھونگھٹ کھا گئے اور اس وقت بولا جب (وہ لوگ) گونگے بنے رہے اور خدا کے نور کے ذریعہ اس وقت بڑھ گیا جب (سب کے سب) رکے رہے اور (گو) میری آواز ان سب سے بڑی دھیمی تھی (کیونکہ چیختے تو کمزور ہی ہیں) مگر آگے نکلنے میں میں ہی سب سے بڑھا رہا۔ تو میں اس (فضیلت امر بالمعروف ونہی عن المنکر) کی مہار کو لے اُڑا اور اس کی بازی کو مار لیا۔[1] مثل اس پہاڑ کے جس کو تند ہوائیں ہلا نہیں سکتیں اور نہ اس کو آندھیاں ڈگمگا سکتی ہیں۔ نہ تو مجھ پر (کسی طرح) کسی کو حرف گیری کا موقع حاصل ہو سکا اور نہ کسی کہنے والے کو مجھ میں کوئی عیب مل سکا۔

ذلیل شخص میرے نزدیک عزیز ہے جب تک کہ میں اس کے لیے (اس کا) حق لے لوں اور قوی میرے نزدیک کمزور ہے یہاں تک کہ میں اس سے دوسرے کا حق چھین لوں۔[2] ہم خدا سے اس کی قضا (وقدر) پر راضی ہیں اور

---

[1] یہاں تک اس کلام کی پہلی فصل ہے جس میں حضرتؑ اپنے ان واقعات امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو ذکر کرتے ہیں جو خلیفہ ثالث حضرت عثمان کے زمانۂ فتنہ وفساد و بے امنی و بے دینی میں گزرے کہ ان حضرت کی زیادتیوں، خاندان پرستیوں اور مخالف اسلام امور کو دوسرے صحابہ و مسلمین دیکھتے رہے اور کسی کے سر پر جوں بھی نہ رینگی۔ صرف میں ہی تھا جو ایک طرف عثمان کو ان کی غلطیوں سے باز آنے کو کہتا اور دوسری طرف ان کے مخالفین اور دشمنوں کو سمجھاتا اور لطائف الحیل سے ٹالتا رہتا تھا۔ مگر علامہ ابن میثم علیہ الرحمہ اس کلام کو زمانۂ عثمان سے مخصوص نہیں جانتے بلکہ فرماتے ہیں کہ حضرتؑ اس کو اپنے عام مفاخرت میں فرماتے ہیں جو اشارہ ہے عہد رسول اللہؐ کی طرف۔

[2] یہاں تک اس کلام کی دوسری فصل تمام ہوئی جس میں حضرتؑ فرماتے ہیں کہ خلیفہ ثالث عثمان کے بعد جب لوگوں نے خلیفہ تسلیم کیا تو میں شریعت اسلام کی پابندی میں مثل اس پہاڑ کے سخت اور مستقل تھا جس کو لاکھ آندھیاں آئیں ہلا نہیں سکتیں۔ یعنی لوگ خواہ کتنی ہی میری مخالفت کریں اور فتنہ وفساد پھیلائیں میں متاثر ہو کر خلاف حق اور منافی دین کسی امر کو اختیار نہیں کر سکتا اور چونکہ (بقیہ صفحہ مابعد)

قَضَآئَهٗ، وَ سَلَّمْنَا لِلّٰهِ اَمْرَهٗ. اَتَرَانِیْٓ اَکْذِبُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم؟ وَاللّٰهِ! لَاَنَآ اَوَّلُ مَنْ صَدَّقَهٗ فَلَآ اَکُوْنُ اَوَّلَ مَنْ کَذَبَ عَلَیْهِ. فَنَظَرْتُ فِیْٓ اَمْرِیْ، فَاِذَا طَاعَتِیْ قَدْ سَبَقَتْ بَیْعَتِیْ، وَ اِذَا الْمِیْثَاقُ فِیْ عُنُقِیْ لِغَیْرِیْ.

خدا کی (رضا) کے لیے اس کے (ہر) حکم کو مان لیا ہے۔ (پھر) کیا تمہارا میرے متعلق یہ خیال ہے کہ میں (حضرت) رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جھوٹ بولوں گا؟ حالانکہ خدا کی قسم میں ہی تو حضرتؐ پر سب سے پہلے ایمان لایا۔ تو کیا میں ہی حضرتؐ پر افتراء کرنے کی ابتدا کروں گا۔ [1] پس میں نے اپنے امر میں غور وفکر کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ مجھ پر (حکم خدا و رسولؐ کی) اطاعت کرنا اپنے (لیے) بیعت (لینے) سے پہلے (واجب ہو چکا ہے) اور میری گردن میں دوسرے کا عہد و پیمان پڑا ہوا ہے۔ [2]

(بقیہ صفحہ مابعد) میرا کوئی فعل ذاتی غرض اور نفسانی خواہش سے نہیں ہوتا بلکہ جو حکم خدا اور رسول کے مطابق ہے وہی کرتا ہوں۔ چونکہ خدا نے مجھے ہر گناہ سے معصوم رکھا ہے لہٰذا کسی شخص کو مجھ پر حرف گیری کا موقع نہیں مل سکتا۔ اس کے بعد حضرتؑ اپنی وہ صفت ذکر فرماتے ہیں جو انبیا و اولیاء ہی کے لیے مخصوص ہے اور دنیا پرستوں کے حق میں مضر ہے کہ حضرتؑ اپنی حکومت اور ریاست مستحکم کرنے کے لیے دنیاوی پالیسی اور حیلہ و تدبیر کو نہیں اختیار کرتے کہ ذی اثر اور قوی لوگوں کو اپنے قبضہ میں رکھیں اور کمزور و بے اثر لوگوں کو ان کے حال میں چھوڑ دیں ان کی رعایت سے کوئی نفع دنیاوی نہیں ہوتا۔ بلکہ حضرتؑ کے نزدیک کمزور ہی شخص قابل عزت ہے۔ یعنی حضرتؑ کو برابر اسی کی فکر رہتی ہے کہ کسی طرح یہ اپنا حق پائے اور ذی اثر صاحب اقتدار شخص کو اس کے ظلم و عدوان سے حضرتؑ بہت ذلیل اور قابل سزا سمجھتے ہیں اور اس سے دوسرے کا حق چھین کر صاحب حق کے حوالہ کر دیتے ہیں۔

[1] یہاں تک تیسری فصل ہے جس کی شرح میں علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں:

حضرتؑ نے یہ کلام اس وقت فرمایا جب اپنے لشکر والوں کے سامنے علم غیب اور آئندہ کے واقعات جنگ وغیرہ جو حضرتؐ کو رسول خداؐ سے معلوم ہوئے تھے ذکر فرماتے وقت بعضوں کو دیکھا کہ حضرتؑ کی اس پیشین گوئی وغیرہ پر شبہ کرتے ہیں اور یہ تہمت رکھتے ہیں کہ حضرت رسول خداؐ نے آپؑ کو ان اُمور کی خبر نہیں دی بلکہ آپؑ اپنے دل سے کہتے ہیں اور آنحضرتؐ کا نام غلط لیتے ہیں۔

اس کے بعد علامہ نے نہایت معتبر آدمیوں اور کہاوتوں سے جناب امیرؑ کے بہت سے واقعات علم غیب اور آئندہ حالات کی پیشین گوئیوں کے نقل کئے ہیں جو حقیقت میں بہت کم ہیں اور خدا نے چاہا تو ضمیمہ میں اس کی مکمل بحث ہوگی۔

[2] یہاں تک چوتھی یعنی آخری فصل ہے جس کی شرح میں ابن ابی الحدید لکھتے ہیں:

اَیْ وُجُوْبُ طَاعَةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ عَلَیَّ وَوُجُوْبُ اِمْتِثَالِیْ اَمْرَهٗ سَابِقٌ عَلٰی بَیْعَتِیْ لِلْقَوْمِ، (بقیہ صفحہ مابعد)

فَلَا سَبِيْلَ اِلَى الْاِمْتِنَاعِ مِنَ الْبَيْعَةِ لِاَنَّهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ اَمَرَنِيْ بِهَا وَاِذَا اَخَذَ الْمِيْثَاقَ فِيْ عُنُقِيْ غَيْرِيْ

اَیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اَخَذَ عَلَى الْمِيثَاقِ بِتَرْكِ الشِّقَاقِ وَالْمُنَازَعَةِ. فَلَمْ يَحِلَّ لِيْ اَنْ اَتَعَدّٰى اَمْرَهٗ اَوْ اُخَالِفَ نَهْيَهٗ۔

اور مفتی مصر علامہ ابن عبدہ اپنی شرح صفحہ ۵۶ میں لکھتے ہیں:

قَوْلُهٗ: فَنَظَرْتُ الخ هٰذِهِ الْجُمْلَةُ قِطْعَةٌ مِّنْ كَلَامٍ لَهٗ فِيْ حَالِ نَفْسِهٖ بَعْدَ وَفَاتِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بَيَّنَ فِيْهِ اَنَّهٗ مَامُوْرٌ بِالرِّفْقِ فِيْ طَلَبِ حَقِّهٖ فَاَطَاعَ الْاَمْرَ فِيْ بَيْعَةِ اَبِيْ بَكْرٍ وَ عُمَرَ وَ عُثْمَانَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ فَبَايَعَهُمْ اِمْتِثَالًا لِمَا اَمَرَهُ النَّبِيُّ بِهٖ مِنَ الرِّفْقِ وَ اِيْفَاءً بِمَا اَخَذَ عَلَيْهِ مِنَ الْمِيْثَاقِ فِيْ ذٰلِكَ.

ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرتؑ نے اپنی حالت خلافت ابوبکر کے وقت کی بیان فرمائی ہے کہ چونکہ رسول اللہؐ نے مجھ سے عہد لے لیا تھا کہ قوم باطل کی طرف جائے تو تم علانیہ مخالفت نہ کرنا بلکہ اپنا حق بطور رفق و مداراۃ طلب کرنا تا کہ اسلام میں کوئی فتنہ وفساد نہ ہو اس سبب سے میں نے اس وقت سکوت کیا اور جہاد نہ کر سکا۔ آنحضرتؐ کے اس عہد بلکہ وقت وفات جناب امیرؑ سے وصیت کرنے کے متعلق اس قدر احادیث وارد ہیں جن کو دیکھ کر کسی طرح شبہ نہیں ہوسکتا کہ حضرتؑ کا سکوت اسی وجہ سے تھا۔ چنانچہ مدارج النبوۃ جلد ۲ صفحہ ۵۱۱ میں ہے:

بعد ازاں فرمود برادر من علی را بیارید، علی بماید و بر بالین آنحضرتؐ بنشست و سر مبارکش را بر زانوے خویش نہاد و آں سرور فرمود: اے علی فلاں یہودی پیش من چندیں مبلغ دارد کہ از وے برایے تجہیز لشکر اسامہ بقرض گرفتہ بودم زنہار کہ حق او را از ذمہ من ادا کنی، و فرمود: اے علی تو اول کسی خواہی بود کہ در لب حوض کوثر بمن برسی و بعد از من مکروہات بتو خواہد رسید باید کہ دل تنگ نشوی و صبر کنی، و چوں بہ بینی کہ مردم دنیا اختیار کنند باید کہ تو آخرت را اختیار کنی۔

جس سے حکم صبر آنحضرتؐ کو ظاہر ہے اور خود صحیح بخاری میں ہے صفحہ ۱۳۹ جلد ۴ مطبوعہ مصر۔

حُذَيْفَةُ بْنُ الْيَمَانِ يَقُوْلُ: كَانَ النَّاسُ يَسْاَلُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْخَيْرِ، وَكُنْتُ اَسْاَلُهٗ عَنِ الشَّرِّ، مَخَافَةً اَنْ يُدْرِكَنِيْ، فَقُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، اِنَّا كُنَّا فِيْ جَاهِلِيَّةٍ اَشَرٍّ، فَجَاءَنَا اللّٰهُ بِهٰذَا الْخَيْرِ، فَهَلْ بَعْدَ هٰذَا الْخَيْرِ مِنْ شَرٍّ؟ قَالَ: (نَعَمْ). قُلْتُ: وَهَلْ بَعْدَ ذٰلِكَ الشَّرِّ مِنْ خَيْرٍ؟ قَالَ: نَعَمْ، وَفِيْهِ دُخَنٌ. قُلْتُ: وَمَا دُخَنُهٗ؟ قَالَ: قَوْمٌ يَهْدُوْنَ بِغَيْرِ هَدْيِيْ، تَعْرِفُ مِنْهُمْ وَتُنْكِرُ۔

جس سے معلوم ہوا کہ آنحضرتؐ نے صرف جناب امیرؑ ہی کو ان واقعات سے نہیں خبر دی تھی جن میں آپؑ کو صبر و تحمل کا حکم تھا بلکہ آپؐ نے مخصوص صحابہ اور رازدار کو بھی بتایا تھا کہ میرے جانے کے بعد پھر شر کا دورہ ہوگا اور اس کے بعد خیر کا دورہ ہوگا اس میں فسادات ہوں گے جس سے بجز دورہ خلافت جناب امیرؑ دوسرا مراد نہیں ہوسکتا۔

❁ خطبہ :۳۹ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

وَ اِنَّمَا سُمِّيَتِ الشُّبْهَةُ شُبْهَةً لِاَنَّهَا تُشْبِهُ الْحَقَّ. فَاَمَّا اَوْلِيَآءُ اللّٰهِ فَضِيَآئُهُمْ فِيْهَا الْيَقِيْنُ، وَدَلِيْلُهُمْ سَمْتُ الْهُدٰى، وَ اَمَّا اَعْدَآءُ اللّٰهِ فَدُعَآئُهُمْ فِيْهَا الضَّلَالُ، وَ دَلِيْلُهُمُ الْعَمٰى، فَمَا يَنْجُوْ مِنَ الْمَوْتِ مَنْ خَافَهٗ، وَ لَا يُعْطَى الْبَقَآءَ مَنْ اَحَبَّهٗ.

خطبہ:۳۹(۳۸)

حضرت علیہ السّلام کے ایک خطبہ سے (کچھ حصّہ شبہ کی تحقیق میں)۔[1]

اور شبہ کا نام شبہ اس وجہ سے رکھا گیا کہ شبہ یہ (امر) حق کو مشتبہ کر دیتا ہے۔ تو جو خدا کے دوست ہیں ان کا یقین اس (شبہ) میں ان کو ضیا بخش اور طریق ہدایت ان کا رہنما ہوتا ہے اور جو خدا کے دشمن ہیں ان کی دعا اس میں گمراہی اور ان کا رہنما نابینائی ہوتا ہے تو جو شخص موت سے ڈرا وہ اس سے بچنے کا نہیں اور جس نے (دنیا میں) ہمیشہ رہنا پسند کیا وہ اس (ہمیشہ رہنے) کو پانے کا نہیں۔

❁ خطبہ :۴۰ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

خطبہ:۴۰(۳۹)

حضرت علیہ السّلام کے ایک خطبہ سے کچھ حصّہ (جہاد سے پہلوتہی کرنے والوں کی بُرائی[2]) میں۔

---

[1] اس خطبہ میں بھی دو فصلیں ہیں ایک ''وَ اِنَّمَا سُمِّيَتِ الشُّبْهَةُ'' سے جس میں فرماتے ہیں کہ شبہ کے حل کرنے میں اولیاء خدا یقین اور ہدایت سے کام لیتے ہیں اور اپنے نور ایمان سے حق کو پا لیتے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں بھی ہے کہ ﴿ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ بِاَيْمَانِهِمْ ﴾ (سورۂ حدید، آیہ ۱۲) یعنی ''ان کا نور ان کے آگے آگے اور داہنی طرف چل رہا ہوگا'' اور خدا کے دشمن وہ صورت اختیار کرتے ہیں جس میں گمراہی اور جہالت ہو۔ چنانچہ قرآن مجید میں بھی ہے:

﴿ وَ مَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴾ (سورۂ رعد، آیہ ۱۴)

یعنی کافروں کی دعا گمراہی میں ہی ہوتی ہے۔

دوسری فصل ''فَمَا يَنْجُوْ'' سے آخر تک ہے۔

[2] ۳۹ھ میں معاویہ نے نعمان بن بشیر کو دو ہزار فوج کے ساتھ مقام عین التمر پر غارت کے لیے بھیجا وہاں جناب امیرؑ کی جانب سے مالک بن کعب ایک ہزار آدمیوں کے ساتھ رہتا تھا مگر اس وقت صرف سو آدمی تھے بقیہ سب کوفہ گئے ہوئے تھے۔ نعمان کی خبر سن کر مالک نے جناب امیرؑ کو مطلع کیا حضرتؑ نے اہل کوفہ کو جمع کر کے خطبہ دیا اور مالک کی مدد پر جانے کو ابھارا مگر کوئی نہ گیا۔ پھر حضرتؑ نے اعیان و سرداران کوفہ کے یہاں پیغام بھیجا اس سے بھی کامیابی نہ ہوئی تو رنجیدہ ہو کر یہ خطبہ ارشاد فرمایا۔ وہاں مالک (بقیہ صفحہ مابعد)

مُنِيْتُ بِمَنْ لَّا يُطِيْعُ اِذَا اَمَرْتُ، وَ لَا يُجِيْبُ اِذَا دَعَوْتُ، لَآ اَبَا لَكُمْ! مَا تَنْتَظِرُوْنَ بِنَصْرِكُمْ رَبَّكُمْ؟ اَمَا دِيْنٌ يَجْمَعُكُمْ؟ وَ لَا حَمِيَّةَ تُحْمِشُكُمْ؟ اَقُوْمُ فِيْكُمْ مُسْتَصْرِخًا، وَ اُنَادِيْكُمْ مُتَغَوِّثًا، فَلَا تَسْمَعُوْنَ لِيْ قَوْلًا، وَ لَا تُطِيْعُوْنَ لِيْ اَمْرًا، حَتّٰى تَكَشَّفَ الْاُمُوْرُ عَنْ عَوَاقِبِ الْمَسَآئَةِ، فَمَا يُدْرَكُ بِكُمْ ثَارٌ، وَ لَا يُبْلَغُ بِكُمْ مَرَامٌ، دَعَوْتُكُمْ اِلٰى نَصْرِ اِخْوَانِكُمْ فَجَرْجَرْتُمْ جَرْجَرَةَ الْجَمَلِ الْاَسَرِّ،۲ وَ تَثَاقَلْتُمْ تَثَاقُلَ النِّضْوِ الْاَدْبَرِ، ثُمَّ خَرَجَ اِلَيَّ مِنْكُمْ جُنَيْدٌ مُتَذَآئِبٌ ضَعِيْفٌ، ﴿كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَ هُمْ يَنْظُرُوْنَ﴾.

(قَالَ الرَّضِيُّ رَحِمَهُ اللّٰهُ) اَقُوْلُ: قَوْلُهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ: «مُتَذَآئِبٌ» اَيْ مُضْطَرِبٌ، مِنْ

میں تو ان میں مبتلا ہوں جن کو کوئی حکم دیتا ہوں تو مانتے نہیں اور جب بلاتا ہوں تو سنتے اور آتے نہیں۔ کم بختو! اپنے پروردگار (کے دین) کی مدد کرنے میں کس چیز کا انتظار کر رہے ہو؟ کہا (تمہارا) کوئی دین نہیں ہے جو تم کو اکٹھا کرے؟ اور (تم میں) کچھ بھی حمیت نہیں ہے جو تمہیں ابھارے؟ میں تم میں کھڑا ہوا چیخ رہا ہوں اور فریادی بن کر تم کو پکار رہا ہوں مگر تم نہ میری کوئی بات سنتے ہو اور نہ میرا کوئی حکم مانتے ہو یہاں تک کہ آخر ان امور کے بُرے نتیجے ظاہر ہو جاتے (اور تم کو بھگتنا پڑتے) ہیں۔ عرض تمہارے ذریعہ سے نہ تو (کسی سے) انتقام لیا جا سکتا ہے اور نہ تم سے کوئی مطلب حاصل ہو سکتا ہے۔ میں نے تمہارے بھائیوں کی مدد کے لیے تم کو بُلایا تو تم اس اونٹ کی طرح چرچرانے لگے جس کا سینہ گھائل ہو[1] اور اس کمزور زخمی پشت والے اونٹ کی طرح بیٹھنے لگے جو بوجھ اٹھانے سے مرا جاتا ہو۔ پھر تم سے ایک چھوٹا سا حقیر لشکر میرے پاس آیا جو ایسا کمزور ہے کہ گویا ان کو (زبردستی) موت کی طرف ڈھکیلا جاتا ہے اور وہ (موت کو آنکھوں) دیکھ رہے ہیں۔

(قول جناب سید رضی علیہ الرحمہ) حضرت علیہ السّلام کا لفظ ''مُتَذَآئِبٌ'' بمعنی مضطرب (پریشان اور لرزاں)

(بقیہ صفحہ مابعد) انہیں سو آدمیوں کے ساتھ نعمان کے دو ہزار سپاہیوں سے پوری بہادری سے لڑنے لگا عین شدت کارزار میں مالک کی کمک کو ایک جگہ سے پچاس آدمی اور آ گئے غرض یہ ڈیڑھ سو اس استقلال سے لڑے کہ اہل شام کے (جو دو ہزار تھے) جی چھوٹ گئے اور شام ہوتے ہوتے بھاگ کھڑے ہوئے۔ (شرح ابن ابی الحدید، جلد ۱، ص ۲۱۴، تاریخ طبری، جلد ۶، ص ۷۷ وغیرہ)

[1] اونٹ کے ناف پاس زخم ہوتا ہے تو اس اونٹ کو ''اَسَرّ'' کہتے ہیں اس کی درد اور اذیت سے جو کراہنے کی آواز اونٹ کے حلق سے نکلتی ہے اس کو ''جَرْجَرَۃٌ'' کہتے ہیں جس کا ترجمہ چرچرانا کیا گیا جو لفظاً اور معناً اس کے مشابہ ہیں۔

قَوْلِهِمْ: تَذَائَبَتِ الرِّيْحُ اَيِ اضْطَرَبَ هُبُوْبُهَا، وَ مِنْهُ سُمِّيَ الذِّئْبُ ذِئْبًا، لِاضْطِرَابِ مِشْيَتِهٖ.

ہے جو ان (اہل عرب) کے اس محاورے سے ماخوذ ہے ''تَذَاءَبَتِ الرِّيْحُ'' یعنی پریشان اور پراگندہ ہوا چلی اور اسی سے بھیڑیے کو بھی ذئب کہتے ہیں کہ اس کی رفتار میں لچک ہوتی ہے۔

❁ خطبہ :۴۱ ❁

وَ مِنْ كَلَامٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِي الْخَوَارِجِ لَمَّا سَمِعَ قَوْلَهُمْ: «لَا حُكْمَ اِلَّا لِلّٰهِ»، قَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ:

كَلِمَةُ حَقٍّ يُّرَادُ بِهَا بَاطِلٌ! نَعَمْ اِنَّهٗ لَاحُكْمَ اِلَّا لِلّٰهِ، وَلٰكِنَّ هٰٓؤُلَآءِ يَقُوْلُوْنَ:

خطبہ:۴۱ (۴۰)

حضرت علیہ السّلام کے ایک کلام سے (کچھ حصّہ) خوارج کے بارے میں جب ان کا یہ قول سنا کہ ''لَا حُكْمَ اِلَّا لِلّٰهِ'' (خدا کے سوا کسی کا حکم نہیں) تو حضرت علیہ السّلام نے فرمایا:

(یہ) کلمہ تو حق ہے (مگر) اس سے ان کا مقصود باطل ہے۔[1] ہاں یقیناً خدا کے سوا کسی کا حکم نہیں (ہوسکتا) مگر یہ

---

[1] واضح ہو کہ احکام کی دو قسمیں ہیں ایک شریعی دوسری تکوینی۔ خوارج کا مطلب یہ تھا کہ جب اصحاب معاویہ نے قرآن کو پیش کیا تو آپ نے آدمیوں کی پنچایت کیوں قبول کی۔ حضرتؑ نے ان کے اس دعویٰ کی تصدیق فرمائی کہ ''لَا حُكْمَ اِلَّا لِلّٰهِ'' تو بہ حیثیت تکوینی حق ہے کہ قضا وقدر پر اور کوئی قادر نہیں ''يَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَاءُ وَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ''۔ مگر خوارج کا تو یہ مطلب ہے کہ بجز خدا کوئی حکم نہیں دے سکتا جو غلط ہے کیونکہ ہدایت عقل شاہد ہے کہ آدمیوں کا حاکم آدمی ہی ہوتا ہے اس لیے کہ اکثر احکام فروعیہ وہ ہیں جو منصوص نہیں ہیں بلکہ اجتہاد وغیرہ سے مستنبط ہوتے ہیں پھر بھی وہ احکام خدا ہی ہیں پس ان احکام کا استنباط کرنا بھی تو آدمی ہی کا کام ہے غرض حضرتؑ نے ان کے اس عام فریب دہ کلمہ کی تشریح فرمادی کہ ''لَا حُكْمَ اِلَّا لِلّٰهِ'' فی نفسہ تو صحیح ہے مگر ان کا جو یہ مقصود ہے کہ کسی شخص کو حکومت نہیں ہے یہ باطل ہے کیونکہ حکم خدا کا علم تو آدمی ہی کے ذریعہ سے ہوسکتا ہے جس کا نام نبی ہے، وہی احکام خدا کو پہنچاتا ہے اور اسی سے معلوم ہوسکتا ہے کہ خدا کا مقصود کیا ہے۔ اس کے بعد امام اور پھر علماء ہیں جو قواعد مقررہ سے حکم خدا کو دریافت کرتے ہیں۔

تاریخ کامل جلد ۳، صفحہ ۱۳۱ میں ہے:

فَقَالَ اِنَّا لَسْنَا حَكَّمْنَا الرِّجَالَ، وَاِنَّمَا حَكَّمْنَا الْقُرْآنَ، وَهٰذَا الْقُرْاٰنُ اِنَّمَا هُوَ خَطٌّ مَّسْطُوْرٌ بَيْنَ الدَّفَّتَيْنِ، لَا يَنْطِقُ، وَاِنَّمَ يَتَكَلَّمُ بِهِ الرِّجَالُ۔

یعنی جناب امیرؑ نے خوارج سے فرمایا کہ ہم نے آدمیوں کو تو حکم نہیں مقرر کیا ہے بلکہ قرآن کو حکم بنایا ہے اور قرآن تو خط مسطور ہے جو دو دفتیوں کے درمیان ہے، خود تو بولتا نہیں ہے بلکہ آدمی بولتے ہیں۔ (بقیہ صفحہ مابعد)

لَاۤ اِمْرَةَ اِلَّا لِلّٰهِ، وَ اِنَّهٗ لَا بُدَّ لِلنَّاسِ مِنْ اَمِيْرٍ بَرٍّ اَوْ فَاجِرٍ، يَعْمَلُ فِيْۤ اِمْرَتِهِ الْمُؤْمِنُ، وَ يَسْتَمْتِعُ فِيْهَا الْكَافِرُ، وَ يُبَلِّغُ اللّٰهُ فِيْهَا الْاَجَلَ، وَ يُجْمَعُ بِهِ الْفَيْءُ، وَ يُقَاتَلُ بِهِ

سب تو کہتے ہیں کہ خدا کے سوا کسی کی حکومت نہیں ہوسکتی! حالانکہ یقیناً آدمیوں کو بغیر کسی اچھے یا بُرے حاکم کے چارہ نہیں ہے۔[1] جس کی حکومت میں مومن (اپنا) کام کرے اور کافر اس میں نفع اٹھائے۔[2] اور خدا اس میں (لوگوں کی) اجل پہنچائے اور اس کے سبب سے مال غنیمت جمع کیا

(بقیہ صفحہ مابعد) اسی کو حضرتؑ فرماتے ہیں کہ حکم تو خدا ہی کے لیے ہے مگر اس کا علم تو آدمیوں کے ذریعہ سے ہوسکتا ہے کیونکہ قرآن تو خط مسطور ہے اس کا مطلب سمجھانے والا انسان ہے پھر تم کیوں اس سے انکار کرتے ہو جس کو حضرتؑ پھر یوں فرماتے ہیں:

اَنْشَدَكُمُ اللّٰهُ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّهُمْ حَيْثُ رَفَعُوا الْمُصَاحِفَ، فَقُلْتُمْ: نُجِيْبُهُمْ، قُلْتُ لَكُمْ: اِنِّيْ اَعْلَمُ بِالْقَوْمِ مِنْكُمْ، اِنَّهُمْ لَيْسُوْا بِاَصْحَابِ دِيْنٍ وَ ذَكَرَ مَا كَانَ قَالَهٗ لَهُمْ ثُمَّ قَالَ لَهُمْ قَدِ اشْتَرَطْتُ عَلَى الْحَكَمَيْنِ اَنْ يُحْيِيَا مَا اَحْيَا الْقُرْاٰنُ وَ يُمِيْتَا مَا اَمَاتَ الْقُرْآنُ، فَاِنْ حَكَمَا بِحُكْمِ الْقُرْاٰنِ فَلَيْسَ لَنَا اَنْ نُخَالِفَ، وَاِنْ اَبَيَا فَنَحْنُ عَنْ حُكْمِهِمَا بَرَاءٌ۔

یعنی جب اصحاب معاویہ نے قرآن بلند کیا تو کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ میں ان کے حالات سے بخوبی واقف ہوں یہ اصحاب دین نہیں ہے جو کر رہے ہیں سب مکر و فریب ہے مگر تم نہ مانے۔ آخر میں نے یہ شرط کی کہ حکمین پر لازم ہے کہ مطابق قرآن فیصلہ کریں جس کو قرآن زندہ کرے اس کو زندہ کریں اور جس کو قرآن باطل کرے یہ بھی باطل کریں۔ پس حکمین اگر مطابق قرآن فیصلہ کریں گے تو ہم مخالفت نہ کریں گے اور اگر برعکس کریں تو ہم اس سے بری ہیں۔

اور ازالۃ الخفا مقصود دویم ص ۲۷۶ میں ہے۔

و این کلمہ اشارت است بآنکہ اہل شام مصحف برداشتند کہ درمیان ما و شما این قرآن است و حضرت مرتضیٰ علیہ السلام فرمود کہ ایں قرآن صامت است و من قرآن ناطقم۔

[1] یعنی دنیا کا انتظام اور امن و امان بغیر کسی حاکم کے درست نہیں رہ سکتا، نہ مظلوم اپنا حق پا سکتا ہے، نہ زبردست اپنے فتنہ و فساد سے باز رہے گا، نہ راستے محفوظ رہیں گے، نہ دشمن سے نجات مل سکتی ہے۔ ہاں اگر کوئی بادشاہ یا حاکم ہوگا تو اس سے عامہ ناس کو یہ کل فوائد حاصل ہو سکتے ہیں خواہ وہ بادشاہ نیکوکار ہو یا بدکار۔

[2] یعنی حاکم خواہ نیکوکار ہو خواہ بدکار اس کی حکومت میں مومن اپنے کاموں کو انجام دینے میں آزاد ہے۔ نماز پڑھے روزہ رکھے خیرات دے وغیرہ۔ حضرتؑ مومن کے لیے ''يَعْمَلُ'' فرمایا اور کافر کے لیے ''يَتَمَتَّعُ'' جس میں یہ نکتہ ہے کہ عام حاکم یا بادشاہ سے مومن کو صرف عام نفع حاصل ہوگا یعنی وہ اپنے امور کو آزادی سے انجام دے سکے گا کہ کوئی مزاحم نہ ہوگا برخلاف کافر کے کہ وہ فاجر بادشاہ سے مختلف منافع حاصل کرے گا ''اس کو حکومت ملے گی'' وہ مال غنیمت سے زیادہ حصہ پائے گا، اس کے نااہل اعزہ و اقربا بڑی دولت اور جاگیریں حاصل کریں گے وغیرہ فوائد۔

الْعَدُوُّ، وَ تَأْمَنُ بِهِ السُّبُلُ، وَ يُؤْخَذُ بِهِ لِلضَّعِيْفِ مِنَ الْقَوِيِّ، حَتّٰى يَسْتَرِيْحَ بَرٌّ، وَ يُسْتَرَاحَ مِنْ فَاجِرٍ.

جائے اور اس کے ہمراہ دشمن سے جنگ ہو سکے اور اس کے ذریعہ رشتے محفوظ رہیں اور (اس کے ذریعہ سے) کمزور کا حق زبردست سے لیا جائے۔ یہاں تک کہ نیکوکار کو آرام ملے اور بدکار (کی شرارت سے) امن حاصل ہو۔

وَ فِيْ رِوَايَةٍ اُخْرٰى: اَنَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ لَمَّا سَمِعَ تَحْكِيْمَهُمْ قَالَ:

اور ایک دوسری روایت بھی ہے کہ حضرت علیہ السّلام نے جب ان کا وہ قول "لَا حُكْمَ اِلَّا لِلّٰهِ" سنا تو فرمایا:

حُكْمَ اللّٰهِ اَنْتَظِرُ فِيْكُمْ.

میں تمہارے بارے میں حکم خدا کا منتظر ہوں۔

اَمَّا الْاِمْرَةُ الْبَرَّةُ فَيَعْمَلُ فِيْهَا التَّقِيُّ، وَ اَمَّا الْاِمْرَةُ الْفَاجِرَةُ فَيَتَمَتَّعُ فِيْهَا الشَّقِيُّ، اِلٰى اَنْ تَنْقَطِعَ مُدَّتُهٗ، وَ تُدْرِكَهٗ مَنِيَّتُهٗ.

وَ قَالَ: اور یہ بھی فرمایا کہ جو حکومت اچھی ہوتی ہے اس میں پرہیزگار اپنا عمل بجالاتا ہے اور جو حکومت بری ہوتی ہے اس سے (بدکار اور) شقی نفع اٹھاتا ہے یہاں تک کہ اس کا زمانہ پورا ہو جائے اور اس کی موت آ پہنچے۔

❁ خطبہ: ۴۲ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

خطبہ: ۴۲ (۴۱)

حضرت علیہ السلام کے ایک خطبہ سے کچھ حصّہ

اِنَّ الْوَفَآءَ تَوْاَمُ الصِّدْقِ، وَ لَآ اَعْلَمُ جُنَّةً اَوْقٰى مِنْهُ، وَ لَا يَغْدِرُ مَنْ عَلِمَ كَيْفَ الْمَرْجِعُ، وَ لَقَدْ اَصْبَحْنَا فِيْ زَمَانٍ قَدِ اتَّخَذَ اَكْثَرُ اَهْلِهِ الْغَدْرَ كَيْسًا، وَ نَسَبَهُمْ اَهْلُ الْجَهْلِ فِيْهِ اِلٰى حُسْنِ الْحِيْلَةِ. مَا لَهُمْ! قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ! قَدْ

(وفاداری کے بیان میں)۔ یقیناً وفاداری سچائی کا توأم (جوڑ) ہے اور میں جہاں تک جانتا ہوں کوئی سپر اس سے بڑھ کر بچانے والی نہیں۔ تو جو شخص قیامت کی کیفیت سے واقف ہے وہ غداری (بے وفائی) نہیں کر سکتا۔ ہاں ہم البتہ ایسے زمانہ میں داخل ہوئے ہیں جس کے اکثر لوگوں نے بے وفائی کو چالاکی سمجھ لیا ہے اور جاہلوں نے ان (غداروں) کی اس (بے وفائی) کو حُسنِ تدبیر کی نسبت دے رکھی ہے۔[1]

---

[1] علامہ ابن ابی الحدید اس پر لکھتے ہیں کہ "جس طرح لوگ عمرو بن العاص اور مغیرہ بن شعبہ کو بڑا عقلمند اور با تدبیر کہتے تھے اور جاہل حضرات ان کے اور ان کے امثال کے افعال کو حسن تدبیر اور دور اندیشی کی طرف نسبت دیتے تھے۔

يَرَى الْحُوَّلُ الْقُلَّبُ وَجْهَ الْحِيلَةِ وَ دُوْنَهٗ مَانِعٌ مِّنْ اَمْرِ اللّٰهِ وَ نَهْيِهٖ، فَيَدَعُهَا رَاْيَ عَيْنٍ بَعْدَ الْقُدْرَةِ عَلَيْهَا، وَ يَنْتَهِزُ فُرْصَتَهَا مَنْ لَّا حَرِيْجَةَ لَهٗ فِي الدِّيْنِ.

خدا ان سے سمجھے! (اچھی طرح) انہیں ہو کیا گیا ہے؟ حالانکہ بڑا ہوشیار تجربہ کار شخص بھی حیلہ کی صورتیں سمجھتا ہے مگر اس (حیلہ) کے سامنے خدا کے حکم اور نہی کی ایک روک (بھی) ہوتی ہے جو اس کو اختیار نہیں کرنے دیتی۔ بس وہ باوجود اس پر (پوری) قدرت رکھنے کے آنکھوں سے دیکھ کر اس کو چھوڑ دیتا ہے۔[1] اور اس کے اختیار کر لینے کو وہ شخص غنیمت سمجھتا ہے جسے دین کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔

❁ خطبہ: ۴۳ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

اَيُّهَا النَّاسُ! اِنَّ اَخْوَفَ مَآ اَخَافُ عَلَيْكُمْ اثْنَانِ: اتِّبَاعُ الْهَوٰى، وَ طُوْلُ الْاَمَلِ، فَاَمَّا اتِّبَاعُ الْهَوٰى فَيَصُدُّ عَنِ الْحَقِّ، وَ اَمَّا طُوْلُ الْاَمَلِ فَيُنْسِي الْاٰخِرَةَ.

اَلَا وَ اِنَّ الدُّنْيَا قَدْ وَلَّتْ حَذَّآءَ، فَلَمْ يَبْقَ مِنْهَا اِلَّا صُبَابَةٌ كَصُبَابَةِ الْاِنَآءِ

خطبہ: ۴۳ (۴۲)

حضرت علی علیہ السلام کے ایک خطبہ سے (کچھ حصہ)۔

لوگو! مجھے تمہارے متعلق سب سے زیادہ جس کا خوف ہے وہ دو (چیزیں) ہیں۔ (ایک تو) خواہشِ (دنیا) کی پیروی اور (دوسرے) دُور و دراز امیدیں۔ پس خواہشِ (دنیا) کی پیروی تو حق سے پھیر دیتی ہے[2] اور دُور و دراز امیدیں اخرت کو بھلا دیتی ہیں۔

اور سمجھ لو کہ دُنیا نے بڑی تیزی سے مُنہ پھیر لیا تو اب اس سے کچھ بھی نہ رہا مگر مانند اس برتن کی تری کے جس (کے پانی) انڈیلنے والے نے (اچھی طرح) گرا دیا ہو

---

[1] اس پر علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ ''حضرت امیر المومنینؑ بھی ایسے ہی تھے اور حضرتؑ باوجودیکہ دنیاوی کامیابی اور غلبہ کی کل تدابیر اور صورتوں کو سب سے اچھا سمجھتے تھے مگر اسی دین کے احترام حق و شرع کی پابندی اور خدا کے خوف سے ان طریقوں سے نفرت کرتے تھے چنانچہ مقام صفین میں پہلے معاویہ والوں نے نہر پر قبضہ کر لیا تو جناب امیرؑ کے لشکر پر پانی بند کر دیا مگر جب حضرت کے لشکر نے اس نہر کو چھین لیا اور معاویہ والوں پر پانی بند کرنا چاہا تو حضرتؑ نے منع کر دیا اور دشمن کو اسی طرح پانی پینے دیا جس طرح خود سیراب ہوتے تھے اور یہ صفت حضرتؑ کی اولاد اور نسل میں بھی باقی رہی۔

[2] چنانچہ بنو امیہ اور خصوصاً معاویہ کی یہی حالت تھی اور اسی سے انہوں نے دنیا میں وہ کامیابی حاصل کر لی جس سے دین اسلام مضمحل، حق محو اور باطل شائع ہو گیا۔

اصْطَبَّهَا صَابُّهَا. اَلَا وَ اِنَّ الْاٰخِرَةَ قَدْ اَقْبَلَتْ، وَ لِكُلٍّ مِّنْهُمَا بَنُوْنَ، فَكُوْنُوْا مِنْ اَبْنَآءِ الْاٰخِرَةِ، وَ لَا تَكُوْنُوْا مِنْ اَبْنَآءِ الدُّنْيَا، فَاِنَّ كُلَّ وَلَدٍ سَيُلْحَقُ بِاُمِّهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ، وَ اِنَّ الْيَوْمَ عَمَلٌ وَّ لَا حِسَابَ، وَ غَدًا حِسَابٌ وَّ لَا عَمَلَ.

(کہ ایسے برتن کے تری ہی کیا؟)[1] اور (یہ بھی) جان لو کہ قیامت آ پہنچی اور ان دونوں (دنیا و آخرت) سے ہر ایک کے کچھ فرزند ہیں تو تم دنیا کے فرزند نہ بننا بلکہ آخرت کے فرزند بنو کیونکہ قیامت کے روز ہر لڑکا اپنی ماں ہی سے ملایا جائے گا (تو ایسا نہ ہو کہ تم اپنی ماں سے نہ مل سکو)[2] اور آج (دنیا میں صرف) عمل (کا دن) ہے نہ حساب (کا) اور کل (بروز قیامت صرف) حساب ہوگا نہ عمل۔

---

[1] ''صُبَابَةٌ''، اس تری کو کہتے ہیں جو برتن میں اس سے پانی نکل جانے کے بعد رہ جاتی ہے۔ حضرت امیر المومنینؑ اپنی فصاحت و بلاغت کے ایک ایک لفظ بلکہ نقطہ پر متحیر کر دیتے ہیں۔ دنیا کے ظاہری اور فنا ہو جانے والی لذتوں کی تشبیہ برتن کی تری سے جیسی مطابق اور صحیح ہے ایسی شاید ہی کسی اور نے عربی کیا کسی زبان میں بھی دی ہو۔

[2] یعنی جو دنیا کی اولاد ہونا چاہتے ہیں ان کو دنیا اپنے سے ملائے گی اور جن لذات و نعمات دنیا کے حاصل کرنے کی کوشش کریں گے وہ ان کو حاصل ہوں گی لیکن آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہ ہوگا کیونکہ انہوں نے تو آخرت کو اپنی ماں قرار ہی نہیں دیا پھر وہ کیوں ان کو اپنی کوئی نعمت دینے لگی۔ ہاں جو دنیا کو اپنی ماں نہیں سمجھتے بلکہ دشمن سمجھتے ہیں اور آخرت کو اپنی ماں قرار دیتے ہیں ان کو دنیا تو کچھ نہ دے گی جس سے یہاں پر برابر مصیبت اور تنگدستی ہی میں مبتلا رہیں گے لیکن چند دنوں کے بعد اپنی ماں (آخرت) سے ملیں گے تو وہ ہر قسم کی نعمت سے ان کو مالا مال کر دے گی اور وہ کچھ دے ڈالے گی جو یہاں کے بڑے سے بڑے شہنشاہ کو بھی خواب و خیال تک میں نہ ملا ہوگا۔ جیسا کہ خدا کے بکثرت کلام سے بھی تائید ہوتی ہے مثلاً:

﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۱۸﴾ وَ مَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَ سَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿۱۹﴾ كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَ هٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ؕ وَ مَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ﴿۲۰﴾ انْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ وَ لَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّ اَكْبَرُ تَفْضِيْلًا ﴿۲۱﴾﴾

یعنی جو شخص دنیا کا طالب ہو تو ہم جسے چاہتے ہیں جتنا چاہتے ہیں اسے اسی دنیا میں سردست اس کو دے دیتے ہیں مگر پھر آخر کار ہم نے اس کے لیے دوزخ ٹھہرا رکھی ہے جس میں وہ برے حالوں مردود ہو کر داخل ہوگا اور جو شخص طالب آخرت ہو اور آخرت کے لیے جیسی کوشش چاہیے ویسی کوشش بھی کرے اور ایمان بھی رکھتا ہو تو یہی لوگ ہیں جن کی محنت خدا کے ہاں مقبول ہوگی۔ ہر ایک کو ہم تیرے پروردگار کی بخشش سے مدد دیتے ہیں اور تیرے مالک کی بخشش کسی پر بند نہیں ہے۔ دیکھو ہم نے دنیا میں بعض لوگوں کو بعض پر کیسے برتری دی ہے لیکن یقیناً آخرت کے درجے کہیں بڑھ کر ہیں اور ویسی ہی اس دن کی برتری بھی کہیں بڑھ کر ہے۔ (سورۂ بنی اسرائیل، رکوع ۲، آیہ ۱۸ تا ۲۱)

(قَالَ الشَّرِيْفُ) اَقُوْلُ: اَلْحَذَّآءُ: السَّرِيْعَةُ، وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّرْوِيْهِ »جَذَّاءَ« بِالْجِيْمِ وَ الذَّالِ، اَيِ انْقَطَعَ دَرُّهَا وَ خَيْرُهَا.

(قول جناب سید رضی علیہ الرحمہ) میں عرض کرتا ہوں کہ ''اَلْحَذَّاءُ'' کے معنی تیز رفتار ہے اور کچھ لوگ اس کو جیم اور ذال سے ''جَذَّاءُ'' روایت کرتے ہیں (یعنی اس دنیا کا نفع اور خوبی زائل ہوگئی)۔

❁ خطبہ: ۴۴ ❁

وَ مِنْ كَلَامٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

وَ قَدْ اَشَارَ عَلَيْهِ اَصْحَابُهٗ بِالِاسْتِعْدَادِ لِحَرْبِ اَهْلِ الشَّامِ بَعْدَ اِرْسَالِهٖ جَرِيْرَ بْنَ عَبْدِ اللّٰهِ الْبَجَلِيِّ اِلٰى مُعَاوِيَةَ:

خطبہ: ۴۴ (۴۳)

حضرت علیہ السلام کے ایک کلام کا کچھ حصّہ۔

حضرتؑ (اپنے قاصد) جریر بن عبداللہ بجلی کو معاویہ کے یہاں روانہ کر چکے تو (اس کی واپسی سے پہلے) آپؑ کے اصحاب نے آپؑ کو اہل شام سے جنگ کی تیاری کرنے کا مشورہ دیا (اس پر آپؑ نے فرمایا)[1]

---

[1] جمادی الاخری ۳۶ھ میں جناب امیرؑ جنگ جمل سے فارغ ہوئے تو معاویہ کو ایک خط کوفہ سے لکھا جو آپ کا ایک عامل جریر بن عبداللہ البجلی اپنے اصرار سے معاویہ کے پاس لے گیا۔ یہ خط نہج البلاغہ جلد دوم اصل ہی میں موجود ہے اس سبب سے یہاں درج نہیں کیا جاتا خلاصہ یہ تھا کہ اے معاویہ سب مہاجر و انصار نے میری بیعت کر لی ہے تم بھی کر لو۔ معاویہ نے خط پڑھ کر دبا لیا اور جواب میں حیلہ و حوالہ کر کے وقت گزارتا رہا۔ اس اثنا میں اہل شام کو اچھی طرح برانگیختہ کر کے قصاص لینے کے بہانہ سے جناب امیرؑ کا دشمن بنا دیا۔ غرض معاویہ نے جریر کو اتنی مدت تک روک کر جنگ کا سامان اچھی طرح کر لیا اور جریر معاویہ کا جواب لے کر واپس آیا تو حضرتؑ کو اہل شام کی تیاری معلوم ہوئی اور آپ نے شوال ۳۶ھ میں شام کا قصد کیا۔ علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ جب حضرت علیؑ کا خط معاویہ نے پڑھا اور اہل شام نے معاویہ سے عہد و پیمان کیا کہ تم عثمان کا خون لینے کے لیے علیؑ سے لڑو ہم سب ساتھ ہیں۔ اس روز شب کو معاویہ بہت کرب و اضطراب میں رہا اور باوجود اس قدر سامان کے بھی حضرت علی کے خوف سے رات بھر کروٹیں بدلتا اور یہ اشعار پڑھتا رہا:

تَطَاوَلَ لَيْلِيْ وَاعْتَرَتْنِيْ وَسَاوِسِيْ ... لَآتٍ اَتٰى بِالتُّرَّهَاتِ البَسَابِسِ
اَتَانِيْ جَرِيْرٌ وَالْحَوَادِثُ جَمَّةٌ ... بِتِلْكَ الَّتِيْ فِيْهَا اجْتِدَاءُ المَعَاطِسِ
اُكَابِدُهٗ وَالسَّيْفُ بَيْنِيْ وَبَيْنَهٗ ... وَلَسْتُ لِاَثْوَابَ الدَّنِيَّ بِلَابِسِ
اِنَّ الشَّامَ اَعْطَتْ طَاعَةً يَمِيْنَةً ... تَوَاصَفَهَا اَشْيَاخُهَا فِي المَجَالِسِ
فَاِنْ يَّفْعَلُوْا اَصْدَمَ عَلِيًّا بِجَبْهَةٍ ... يَعُثُّ عَلَيْهِ كُلُّ رَطْبٍ وَيَابِسِ (بقیہ صفحہ مابعد)

اِنَّ اسْتِعْدَادِیْ لِحَرْبِ اَهْلِ الشَّامِ وَ جَرِیْرٌ عِنْدَهُمْ، اِغْلَاقٌ لِّلشَّامِ، وَ صَرْفٌ لِّاَهْلِهٖ عَنْ خَیْرٍ اِنْ اَرَادُوْهُ، وَ لٰکِنْ قَدْ وَقَّتُّ لِجَرِیْرٍ وَّقْتًا لَّا یُقِیْمُ بَعْدَهٗ اِلَّا مَخْدُوْعًا اَوْ عَاصِیًا، وَ الرَّاْیُ عِنْدِیْ مَعَ الْاَنَاۃِ، فَاَرْوِدُوْا، وَ لَآ اَکْرَهُ لَکُمُ الْاِعْدَادَ.

شام والوں سے لڑنے کے لیے میرا آمادہ ہو جانا درصورتیکہ (ابھی میرا قاصد) جریر وہیں ہے شام پر (گویا حجت کا دروازہ) بند کر دینا اور اگر وہاں کے لوگ طالب خیر ہوں بھی تو اس سے ان کو پھیر دینا ہوگا۔ لیکن میں نے جریر کے لیے ایک میعاد مقرر کر دی ہے جس کے بعد وہ وہاں ٹھہر نہیں سکتا مگر (دو ہی صورت سے یا معاویہ کے) فریب میں آ کر یا (میری) نافرمانی کر کے۔ بہرکیف (سردست) میری رائے نرمی (اور توقف) کی ہے تو تم لوگ بھی نرمی ہی کو راہ دو (اور جریر کا انتظار کرو)۔ ہاں تمہارے (جنگ کی) تیاری کو میں ناپسند نہیں کرتا۔

وَ لَقَدْ ضَرَبْتُ اَنْفَ هٰذَا الْاَمْرِ وَ عَیْنَهٗ، وَ قَلَّبْتُ ظَهْرَهٗ وَ بَطْنَهٗ، فَلَمْ اَرَ لِیْ اِلَّا الْقِتَالَ

اور یقیناً میں نے اس امر (یعنی جنگ شام) کی اچھائی برائی کو خوب غور کر لیا[1] اور اس کے ظاہر و باطن الٹ پلٹ کر دیکھ لیا ہے تو مجھے (اہل شام سے) لڑنے ورنہ

(بقیہ صفحہ مابعد) یعنی میری رات طولانی ہوگئی اور میرا خوف و اضطراب اور وسوسہ بڑھتے جاتے ہیں کیونکہ میرے پاس ایک قاصد بری باتیں لے کر آیا۔ یوں تو مصائب بہت ہیں لیکن جریر جو مصیبت لے کر آیا ہے یہ ہم لوگوں کی ناکیں کاٹ ڈالے گی۔ اچھا میں اس سے مکر و فریب کروں گا اور میرے ان کے درمیان تلوار ہے کیونکہ میں ذلیل شخص کے لباس نہیں پہن سکتا۔ شام نے مجھ سے قسم کھا کر اطاعت کا اقرار کیا ہے جس کو شیوخ وارکان شام نے اپنے جلسوں میں بیان کیا ہے۔ پس اگر انہوں نے ایسا ہی کیا تو میں ایسے گھوڑوں سے علیؑ کا مقابلہ کروں گا جس پر ہر رطب و یابس لاغر ہو جاتے ہیں۔ اور مجھے اس دولت وحشمت کی توقع ہے جو کسی پانے والے کو مل سکے اور میں ملک عراق سے مایوس نہیں ہوں۔

[1] اصل عبارت ''وَ لَقَدْ ضَرَبْتُ اَنْفَ هٰذَا الْاَمْرِ وَ عَیْنَهٗ'' کا ترجمہ یہ ہے ''میں نے اس کام کے ناک اور آنکھ کو مارا'' مگر یہ ایک ضرب المثل ہے جسے عرب اس وقت استعمال کرتے ہیں جب کسی کام میں خوب تامل اور غور و فکر کر لیا ہو اور اس کے اچھے برے کو پہچان لیا ہو اور ناک آنکھ کی تخصیص اس لیے ہے کہ انسان کے چہرہ پر یہی دونوں چیزیں زیادہ نمایاں ہوتی ہیں اور انسان کے چہرہ ہی کو دیکھ کر آپ اس میں غور و تامل کرتا ہے لہٰذا ہر چیز کے متعلق ناک اور آنکھ استعمال کر کے بولنے لگے۔ ضَرَبْتُ اَنْفَ هٰذَا الْاَمْرِ وَ عَیْنَهٗ۔

اَوِالْكُفْرَ بِمَا جَآءَ مُحَمَّدٌ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم. اِنَّهٗ قَدْ كَانَ عَلَى النَّاسِ وَالٍ اَحْدَثَ اَحْدَاثًا، وَ اَوْجَدَ

کافر ہو جانے [1] کے علاوہ کوئی صورت نظر نہیں آئی۔ اصل یہ ہے کہ لوگوں پر ایک ایسا حاکم تھا جس نے بہت سی بدعتیں حادث کیں [2] اور لوگوں کو قیل وقال (اور طعن وتشنیع) کا

---

[1] قاعدہ ہے کہ جب کوئی نئی بات ہوتی ہے تو اس میں اختلاف ہوتا ہے۔ ابھی تک تو اہل اسلام اس کے عادی تھے کہ کفار سے لڑتے اور اب یہ وقت آیا کہ باخود ہا مسلمانوں میں جنگ ہو کیونکہ چھبیس برس تک تو اس حکمت عملی سے جناب امیرؑ کو خلافت سے محروم رکھا اب جو حضرت خلیفہ ہوئے تو پہلے عائشہ کھڑی ہوئیں جن سے بصرہ میں جنگ ہوئی جس کا نام جنگ جمل ہے۔ اس کے بعد معاویہ کھڑا ہوا جو اسی دن کے لیے حاکم شام بنایا گیا تھا۔ غرض جنگ جمل میں تو یہ سب مشکلیں اس وجہ سے نہیں آئیں کہ طلحہ وزبیر نے کھلم کھلا بیعت کی تھی لہٰذا وہ ظاہر بظاہر باغی تھے جن کا قتل ہر مذہب وملت میں واجب ہے، مگر معاویہ نے ابھی تک بیعت نہیں کی جس سے وہ ظاہر طور پر باغی قرار پائے اس لیے حضرت کو ضروری ہوا کہ اس جنگ کی وجہ کو صاف کر دیں کہ یہ جنگ ایسی ضروری ہے کہ اگر جنگ نہیں کرتے ہیں تو کھلم کھلا کافر ہو جاتے ہیں کیونکہ اسلام صرف ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' کہنے کا نام نہیں ہے بلکہ جَمِيْعُ مَا جَاءَ بِهٖ مُحَمَّدٌ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اقرار ضروری ہے

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ﴾

یعنی تم سب سے بہتر امت ہو جو لوگوں کی رہنمائی کے لیے پیدا ہوئی کہ تم اچھے کام کرنے کو کہتے اور برے کاموں سے منع کرتے اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

[2] یہ اشارہ ہے خلیفہ ثالث عثمان کی طرف جن پر مسلمانوں کے بہت سے اعتراض تھے اور انہیں حرکتوں سے یہ قتل کیے گئے۔ علامہ ابن ابی الحدید نے تفصیل سے ان احداث کو ذکر کیا ہے مثلاً:

(۱) دنیائے اسلام کے مختلف مقامات پر اپنے ایسے ناقابل رشتہ داروں کو حکومت دے دی جن میں ذرہ بھی اس کی صلاحیت نہ تھی بلکہ وہ خود انتہا درجہ کے فسق وفجور میں مبتلا رہتے تھے۔

(۲) اپنے چچا حکم بن عاص کو جسے رسول خداؐ نے مدینہ سے نکلوا دیا تھا اور ابوبکر وعمر بھی اس کو واپس بلانے کی جرأت نہ کر سکے مدینہ میں واپس بلا لیا اور بیت المال سے اسے ایک لاکھ درہم دے دیے اور اس کے عزیزوں کو بھی بکثرت مال اور جاگیریں عطا کیں۔

(۳) جو مال عام مسلمانوں کا تھا اسے خاص اپنے رشتہ وقرابت والوں کو دے کر ان کو مالا مال کر دیا۔

(۴) مسلمانوں کے چراگاہ کو روک لیا حالانکہ رسول خداؐ نے ہر مسلمان کو پانی اور چارہ میں برابر اختیار دے دیا تھا۔

(۵) عثمان نے بیت المال صدقہ سے ان لوگوں کو دیا جو جہاد کرتے تھے حالانکہ ان کا حق اس میں نہیں ہے بلکہ ان کا حصہ مال غنیمت وفیئ میں ہے۔ اور صدقہ کے مستحق اور لوگ ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں بتفصیل مذکور ہے۔

(۶) عبداللہ بن مسعود بڑے مقدس صحابی تھے جن کو حضرتؐ اکثر اپنا نائب مقرر کر کے کہیں سفر میں تشریف لے جاتے اور قرآن کی تعلیم کے لیے حضرتؐ نے ان کے بارے میں خاص حکم دیا تھا، ان کو اس قدر مارا کہ ان کی پسلی کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں (بقیہ صفحہ مابعد)

لِلنَّاسَ مَقَالًا، فَقَالُوْا، ثُمَّ نَقَمُوْا فَغَيَّرُوْا.

موقع دے دیا، جنہوں نے خوب طعنہ زنی کی پھر ناراض ہو کر (اس کی حالت) متغیّر کر دی۔

❁ خطبہ :۴۵ ❁

وَ مِنْ كَلَامٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

لَمَّا هَرَبَ مَصْقَلَةُ بْنُ هُبَيْرَةَ الشَّيْبَانِيُّ اِلٰى مُعَاوِيَةَ وَ كَانَ قَدِ ابْتَاعَ سَبْيَ بَنِيْ نَاجِيَةَ مِنْ عَامِلِ اَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَ اَعْتَقَهُمْ، فَلَمَّا طَالَبَهٗ بِالْمَالِ خَاسَ بِهٖ وَ هَرَبَ اِلَى الشَّامِ:

قَبَّحَ اللّٰهُ مَصْقَلَةَ! فَعَلَ فِعْلَ السَّادَةِ، وَ فَرَّ فِرَارَ الْعَبِيْدِ! فَمَآ اَنْطَقَ مَادِحَهٗ حَتّٰٓى

خطبہ:۴۵ (۴۴)

حضرت علیہ السلام کے ایک کلام کا کچھ حصّہ۔

جب مصقلہ بن ہبیرہ شیبانی نے حضرت امیر المومنینؑ کے عامل سے بنو ناجیہ کے قیدیوں کو خرید کر آزاد کر دیا اور حضرتؑ نے وہ مال (یعنی قیدیوں کی قیمت) طلب کیا تو بد عہدی کر کے معاویہ کے یہاں شام بھاگ گیا (اس پر حضرتؑ نے فرمایا):

خدا بُرا کرے مصقلہ کا کہ اس نے کام تو کیا سرداروں کا سا (کہ قیدی خرید کر آزاد کر دیے) مگر بھاگ کھڑا ہوا غلاموں کی طرح۔[1] پس ابھی تو اس نے اپنی مدح کرنے

(بقیہ صفحہ ماقبل) جس کی یہ وجہ ہوئی کہ عثمان نے سب قرآنوں کو جلوا کر چاہا کہ اس قرآن کو رائج کریں جس کو خود زید بن ثابت سے لکھوایا تھا۔ ابن مسعود اس کے مخالف تھے اور وہ چاہتے تھے کہ وہی قرآن رائج رہے جس کو رسول اللہؐ نے لکھوایا تھا۔ دوسری وجہ یہ ہوئی کہ حضرت ابوذر کے جنازہ میں یہ شریک ہوئے حالانکہ عثمان نے حضرت ابوذر کو مدینہ سے نکلوایا تھا۔ (ص ۲۳۷، شرح ابن ابی الحدید)

(۷) قرآن کے جتنے نسخے پہلے سے رائج تھے ان سب کو جلوا دیا حالانکہ حضرتؐ کی حدیث ''نَزَلَ الْقُرْاٰنُ عَلٰى سَبْعَةِ اَحْرُفٍ كُلُّهَا شَافٍ كَافٍ''۔ موجود ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا اور زید بن ثابت جن سے عثمان نے قرآن لکھوایا وہ امر دین میں متہم تھے۔

(۸) عمار بن یاسر محترم صحابی رسولؐ کو اتنا مارا کہ ان کو مرض فتق ہو گیا۔

(۹) جناب ابوذر کو مدینہ سے ربذہ کی طرف جلاوطن کر دیا۔

(۱۰) حدود خدا کو ترک کیا مثلاً حضرت عمر کے فرزند عبید اللہ نے ہرمزان کو قتل کر دیا تو اس کا قصاص نہ لیا حالانکہ جناب امیرؑ اور اکثر صحابہ اس کے خواہاں تھے مگر ایک نہ سنی وغیرہ الزامات۔

[1] اس کا اصل قصّہ یوں ہے کہ قبیلہ بنو ناجیہ کا ایک شخص خریت بن راشد ناجی حضرت امیر المومنینؑ کے اصحاب سے تھا جو صفین میں بھی آپ کے ساتھ رہا لیکن جب قصہ تحکیم پیدا ہوا تو اس نے حضرتؑ کا ساتھ چھوڑ کر خوارج کا مذہب اختیار کر لیا اور اپنے (بقیہ صفحہ مابعد)

اَسْكَتَهٗ، وَ لَا صَدَّقَ وَاصِفَهٗ حَتّٰى بَكَّتَهٗ، وَ لَو اَقَامَ لَاَخَذْنَا مَيْسُوْرَهٗ، وَ انْتَظَرْنَا بِمَالِهٖ وُفُوْرَهٗ.

والے کو بولنے بھی نہ دیا تھا کہ اسے چُپ کر دیا اور اپنی تعریف کرنے والے کی تصدیق بھی نہ کی تھی کہ اس کو بگاڑ دیا (اور اس کی زبان بند کر دی) حالانکہ اگر وہ رہتا تو ہم وہی لیتے جو آسانی سے دے سکتا اور اس کی دولت بڑھنے کا انتظار کرتے۔[1]

❁ خطبہ :۴۶ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ غَيْرَ مَقْنُوْطٍ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ، وَ

خطبہ:۴۶(۴۵)

حضرت علیہ السلام کے ایک خطبہ کا کچھ حصّہ۔

ہر طرح کی حمد وثنا خدا ہی کے لیے ہے جس کی رحمت

(بقیہ صفحہ مابعد) ساتھیوں کو ہمراہ لے کر مدائن کا رخ کیا اور لوگوں کو حضرتؑ کے خلاف ابھارنے لگا۔ حضرتؑ نے معقل بن قیس ریاحی کے ہمراہ اپنا دو ہزار کا لشکر بھیجا کہ اسے سمجھائیں اور نہ مانے تو لڑیں۔ اس نے خریت اور اس کے اکثر ساتھیوں کو قتل کیا اور بقیہ مردوں اور عورتوں اور بچوں کو قید کر کے جناب امیرؑ کی طرف لے چلا۔ وہ سب تعداد میں پانچ سو تھے جو پہلے نصرانی تھے اور بعد اسلام مرتد ہو گئے۔ راہ میں مصقلہ بن ہبیرۃ الشیبانی ملا جو حضرتؑ کی طرف سے مقام اردشیر خرہ کا عامل تھا اس نے ان قیدیوں کی گریہ وزاری سن کر معقل سے پانچ لاکھ درہم پر کل کو خرید لیا اور آزاد کر دیا۔ جب قیمت مانگی گئی تو حیلہ حوالہ کرنے لگا۔

آخر جناب امیر نے اس کے یہاں اپنا آدمی بھیجا اور اس پر مسلط کیا کہ وہ مسلمانوں کا مال ہے جس طرح ہو مصقلہ سے وصول کر کے لائے۔ اس نے بہزار دشواری دو لاکھ درہم تو کوفہ میں حاضر ہو کر ادا کیے اور مابقی معاف کرانے کی کوشش کی اور کہا کہ عثمان تو ہر سال خراج آذربایجان سے ایک لاکھ درہم اشعث بن قیس کو بخشتے تھے اور ہم اس سے شرف میں زیادہ ہیں۔ حضرتؑ نے فرمایا وہ میرا مال ہوتا تو نام بھی نہ لیتا لیکن وہ تو مسلمانوں کا مال ہے جسے چھوڑ نہیں سکتا تجھے ادا کرنا ہوگا۔ تب اس نے کہا دس روز کی مہلت دیجیے کہ سامان کروں۔ حضرتؑ نے منظور فرما لیا تو وہ وہاں سے بھاگ کر معاویہ کے پاس چلا گیا جس نے بڑے احترام سے جگہ دی اور مقرب دربار کر لیا۔

[1] یعنی مصقلہ نے غلاموں کو خرید کر آزاد کیا تو بہت اچھا کام کیا لیکن قیمت کے خوف سے بھاگ کیوں گیا پس ابھی اس کے پہلے فعل کی مدح بھی نہ ہونے پائی تھی کہ بھاگ جانے سے لوگ خاموش کے خاموش ہی رہے حالانکہ اگر وہ ٹھہرتا اور بہ اقساط اس رقم کو ادا کرتا جاتا تو میں قبول کر لیتا اور اس کا مال ایک ہی دفعہ لے کر اس کو فقیر نہیں کر دیتا بلکہ اس کو موقع دیتا کہ اپنی دولت بھی بڑھاتا جائے اور مسلمانوں کی یہ رقم بھی اپنی گنجائش کے مطابق ادا کرتا جائے۔ مصقلہ خود بھی اس حرکت پر نادم ہوا اور ایک قصیدہ لکھا جس کا ایک شعر یہ ہے:

فَارَقْتُ خَيْرَ النَّاسِ بَعْدَ مُحَمَّدٍ لِمَالٍ قَلِيْلٍ لَا مَحَالَةَ ذَاهِبٌ

لَامَخْلُوٌّ مِّنْ نِّعْمَتِهٖ، وَ لَا مَأْيُوْسٍ مِّنْ مَّغْفِرَتِهٖ، وَ لَا مُسْتَنْكَفٍ عَنْ عِبَادَتِهٖ، الَّذِیْ لَا تَبْرَحُ مِنْهُ رَحْمَةٌ، وَ لَا تُفْقَدُ لَهُ نِعْمَةٌ.

سے کوئی نا اُمید نہیں، جس کی نعمت سے کوئی خالی نہیں۔ جس کی بخشش سے کوئی مایوس نہیں اور جس کی عبادت سے کسی کو ننگ وعار نہیں ہے، ایسا (خدا) جس کی رحمت کسی وقت زائل اور جس کی نعمت کبھی مفقود (یعنی کم اور علیحدہ) نہیں ہوتی۔[1]

وَ الدُّنْیَا دَارٌ مُّنِیَ لَهَا الْفَنَآءُ، وَ لِاَهْلِهَا مِنْهَا الْجَلَآءُ، وَ هِیَ حُلْوَةٌ خَضِرَةٌ، وَ قَدْ عَجِلَتْ لِلطَّالِبِ، وَ الْتَبَسَتْ بِقَلْبِ النَّاظِرِ، فَارْتَحِلُوْا مِنْهَا بِاَحْسَنِ مَا بِحَضْرَتِكُمْ مِنَ الزَّادِ، وَ لَا تَسْئَلُوْا فِیْهَا فَوْقَ الْكَفَافِ، وَ لَا تَطْلُبُوْا مِنْهَا اَكْثَرَ مِنَ الْبَلَاغِ.

اور یہ دنیا وہ گھر ہے جس کو فنا اور جس کے باشندوں کو جلا وطن ہو جانا مقدر ہو چکا ہے اور (چونکہ مزہ میں) یہ شیریں (اور دیکھنے میں) سرسبز (وشاداب) ہے اور اپنے چاہنے والوں کے پاس جلد پہنچتی اور (اپنی طرف) نظر کرنے والے کے دل سے چمٹ جاتی ہے (جو سب دھوکہ اور فریب ہے)۔ لہٰذا تمہارے پاس (اعمال صالحہ کا) جو بہترین توشہ ہو اسے لے کر یہاں سے چل دو اور اس (دنیا) سے ضرورت سے بڑھ کر نہ مانگو اور خرچ راہ سے زیادہ کے خواہاں نہ ہو۔

---

[1] علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ اس خطبہ میں دو فصلیں ہیں پہلی ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' سے ''لَا تُفْقَدُ لَهٗ نِعْمَةٌ'' تک اور دوسری ''وَ الدُّنْیَا دَارٌ'' سے آخر تک اور دونوں ایک دوسرے سے چنداں مرتبط نہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ جناب سید رضی علیہ الرحمہ حضرتؑ کا مسلسل کلام دریافت کرنے پر قادر نہیں ہوتے بلکہ جو جملہ یا ٹکڑا بھی حضرتؑ کے کلام کا پاتے ہیں درج کر دیتے ہیں کیونکہ ان کی غرض صرف جناب امیرؑ کی فصاحت دکھانا ہے نہ اور کچھ۔ اس لیے کہ اگر پورے خطبوں کو وہ جمع کرتے تو اس کتاب سے وہ چند ان کل خطبوں کا مجموعہ تیار ہوتا۔ ان دونوں فصلوں میں پہلی تو خدا کی حمد وثنا کے متعلق ہے جو علم بیان کے ایک بڑے باب پر مشتمل ہے جس کو موازنہ کہتے ہیں۔ اور دوسری فصل میں لوگوں کو دنیا میں مشغول ہونے سے ڈرایا اور قناعت اختیار کرنے کا حکم دیا ہے اور یہ بھی کہ دنیا میں ضرورت کے مطابق جو ملے اس پر راضی رہنا چاہیے اور اس سے زیادہ کی خواہش ہی نہ کرنا چاہیے۔

❁ خطبہ :۴۷ ❁

وَ مِنْ كَلَامٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

عِنْدَ عَزْمِهٖ عَلَى الْمَسِيْرِ اِلَى الشَّامِ

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ وَّعْثَآءِ السَّفَرِ، وَ كَاٰبَةِ الْمُنْقَلَبِ، وَ سُوْٓءِ الْمَنْظَرِ فِي الْاَهْلِ وَ

خطبہ:۴۷(۴۶)

حضرت علیہ السلام کے ایک کلام کا کچھ حصّہ

(جسے) سفر شام کا ارادہ کرتے وقت (فرمایا)۔[1]

اے اللہ میں سفر کرنے کے تعب اور اذیت، واپسی کی زحمت ومشقت اور (وطن لوٹ کر) اہل وعیال اور مال (و اسباب) کی بری حالت دیکھنے سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔

---

[1] علامہ ابن ابی الحدید اس کلام کی شرح میں لکھتے ہیں کہ یہ وہ دعا ہے جو حضرت امیر المومنینؑ نے کوفہ سے شام کی طرف معاویہ سے جہاد کرنے کے لیے روانہ ہوتے وقت خدا سے مانگی تھی کہ جب اپنے مکان سے باہر تشریف لائے اور اپنی سواری کے رکاب میں پاؤں رکھ چکے تو فرمایا، بسم اللہ (میں خدا کا نام لے کر سوار ہوتا ہوں) اور جب اپنے گھوڑے کی پشت پر جم کر بیٹھ چکے تو فرمایا:

﴿ سُبْحٰنَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَ مَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ ﴿۱۳﴾ وَ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ﴿۱۴﴾ ﴾ (سورۂ زخرف، آیہ ۱۳۔۱۴)

یعنی پاک ہے وہ (ذات) جس نے ان چیزوں کو ہمارے بس میں کر دیا ہے اور ہم تو (ایسے طاقتور) نہ تھے کہ ان کو اپنے قابو میں کر لیتے اور بے شک ہم کو اپنے پروردگار کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

اس آیۃ کے بعد فرمایا: اَللّٰهُمَّ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ وَّعْثَآءِ السَّفَرِ، تا آخر فصل۔

اس کے بعد علامہ ممدوح نے آپ کے سفر کی مفصل حالت درج کی ہے کہ فلاں مقام پر پہنچ کر نماز صبح پڑھی، فلاں مقام پر نماز ظہر، یہاں تک کہ ایک مقام پر نماز عصر کے لیے اترے تو آفتاب غروب ہو گیا۔ ''فَدَعَا اللهَ فَرَجَعَتِ الشَّمْسُ كَمِقْدَارِهَا مِنْ صَلَاةِ الْعَصْرِ''۔ یعنی ''حضرت علیؑ نے خدا سے دعا کی تو آفتاب پلٹ آیا اور حضرتؑ کے نماز عصر پڑھنے تک ٹھہرا رہا''۔ (جلد اول مطبوعہ مصر صفحہ ۲۷۷) وہاں سے روانہ ہوئے تو کربلا میں اترے اور نماز پڑھ کر وہاں کی مٹی اٹھائی اور سونگھ کر فرمایا:

وَاهًا لَكِ يَا تُرْبَةُ! لَيُحْشَرَنَّ مِنْكِ قَوْمٌ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ بِغَيْرِ حِسَابٍ۔

یعنی اے خاک کربلا! تیرا کیا کہنا۔ تجھ سے تو وہ جماعت قیامت میں اُٹھے گی جو بے حساب بہشت میں داخل ہو گی!!

پھر فرمایا۔ ''هٰهُنَا هٰهُنَا'' یہیں یہیں۔ کسی نے پوچھا یا حضرتؑ آپ کیا فرماتے ہیں؟ تو فرمایا:

ثِقْلُ اٰلِ مُحَمَّدٍ (صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَ اٰلِهٖ وَ سَلَّمَ) يَنْزِلُ هٰهُنَا. فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّنْكُمْ، وَ وَيْلٌ لَّكُمْ مِّنْهُمْ! تَقْتُلُوْنَهُمْ، يُدْخِلُكُمُ اللهُ لِقَتْلِهِمِ النَّارَ۔

یعنی، خاندان محمد کی ایک جماعت یہاں اُترے گی پس افسوس ہے ان کے لیے تم سے اور وائے ہے تمہارے لیے، ان سے تم لوگ ان کو قتل کرو گے اور ان کے قتل کرنے کی وجہ سے خدا تم لوگوں کو جہنم میں ڈال دے گا۔

پھر اپنے ہاتھ سے ایک جگہ اشارہ کر کے فرمایا: وَهٰهُنَا مَوْضِعُ رِحَالِهِمْ، مَنَاخُ رِكَابِهِمْ''۔ دوسری طرف اشارہ کر کے فرمایا: ''هٰهُنَا مُهْرَاقُ دِمَائِهِمْ'' پھر وہاں سے روانہ ہو گئے۔

الْمَالِ. اَللّٰهُمَّ اَنْتَ الصَّاحِبُ فِي السَّفَرِ، وَ اَنْتَ الْخَلِيْفَةُ فِي الْاَهْلِ، وَ لَا يَجْمَعُهُمَا غَيْرُكَ، لِاَنَّ الْمُسْتَخْلَفَ لَا يَكُوْنُ مُسْتَصْحَبًا، وَ الْمُسْتَصْحَبُ لَا يَكُوْنُ مُسْتَخْلَفًا.

اے خدا سفر میں تو ہی (میرا) ساتھی (اور نگہبان) ہے اور (میرے) اہل وعیال (کی حفاظت) کے لیے بھی تو ہی میری جگہ ہے اور یہ دونوں (صفتیں) کسی میں تیرے سوا پائی ہی نہیں جاسکتیں اس لیے کہ جو کسی کی جگہ رہے وہ اس کے ساتھ نہیں ہوسکتا اور جو ساتھ ہو وہ اس کی جگہ نہیں رہ سکتا۔[1]

❁ خطبہ :۴۸ ❁

وَ مِنْ كَلَامٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِيْ ذِكْرِ الْكُوْفَةِ

كَاَنِّيْ بِكِ يَا كُوْفَةُ! تُمَدِّيْنَ مَدَّ الْاَدِيْمِ الْعُكَاظِيِّ، تُعْرَكِيْنَ بِالنَّوَازِلِ، وَتُرْكَبِيْنَ بِالزَّلَازِلِ، وَ اِنِّيْ لَاَعْلَمُ اَنَّهٗ مَا اَرَادَ بِكِ جَبَّارٌ سُوْٓءًا اِلَّا ابْتَلَاهُ اللّٰهُ بِشَاغِلٍ، اَوْ رَمَاهُ بِقَاتِلٍ!

خطبہ:۴۸ (۴۷)

حضرت علیہ السلام کے ایک کلام کا کچھ حصّہ شہر کوفہ (کی آئندہ حالت) کے بیان میں۔

اے کوفہ! گویا میری نظروں میں (تیری وہ حالت پھر رہی ہے کہ) تو عکاظی چمڑے کی طرح کھینچا، حوادث و آفات سے رگڑا اور (فتنہ وفساد کے) زلزلوں پر چڑھایا جا رہا ہے۔ اور میں (یہ بھی) جانتا ہوں کہ جو ظالم جبار تجھ سے کسی قسم کی برائی کا ارادہ کرے گا اسے خدا (یا) کسی آفت میں پھنسائے گا[2] یا اسے کسی قاتل کے سپرد کردے گا (جو اسے مار ڈالے گا)۔

---

[1] اس پر جناب سید رضی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں وَابْتِدَاءُ هٰذَا الْكَلَامِ مَرْوِيٌّ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ، وَ قَدْ قَفَّاهُ اَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ علیہ السلام بِاَبْلَغِ كَلَامٍ وَّ تَمَّمَهٗ بِاَحْسَنِ تَمَامٍ مِنْ قَوْلِهٖ: ''وَ لَا يَجْمَعُهُمَا غَيْرُكَ'' اِلٰى اٰخِرِ الْفَصْلِ.

یعنی اس کلام کے شروع کا حصہ حضرت رسول خداؐ سے روایت کیا گیا ہے اسی میں حضرت امیر المومنینؑ نے (اپنا) بلیغ ترین جملہ ''وَ لَا يَجْمَعُهُمَا غَيْرُكَ'' تا آخر فصل جوڑ دیا۔

[2] جناب مولانا فتح اللہ کاشانی علیہ الرحمہ اس کی شرح میں لکھتے ہیں ''ایک روایت میں وارد ہوا ہے کہ اسلام میں جو فتنہ وفسادات واقع ہوئے ان سے اکثر کی ابتدا کوفہ ہی سے ناشی ہوئی، چنانچہ کوفہ کے ظالمین سے ایک زیاد بے بنیاد ملعون تھا جس کو معاویہ نے جھوٹی گواہی دلوا کر ابوسفیان کا بیٹا اور اپنا بھائی بنا لیا۔ وہ معاویہ کے حکم پر لوگوں کو مسجد کوفہ میں جمع کرتا اور حضرت امیر المومنینؑ پر (بقیہ صفحہ مابعد)

❁ خطبہ :۴۹ ❁

وَ مِنْ كَلَامٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

عِنْدَ الْمَسِيْرِ اِلَى الشَّامِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ كُلَّمَا وَقَبَ لَيْلٌ وَ غَسَقَ، وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ كُلَّمَا لَاحَ نَجْمٌ وَّ خَفَقَ، وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ غَيْرَ مَفْقُوْدِ الْاِنْعَامِ، وَ لَا مُكَافَإِ الْاِفْضَالِ.

اَمَّا بَعْدُ! فَقَدْ بَعَثْتُ مُقَدِّمَتِيْ، وَ اَمَرْتُهُمْ بِلُزُوْمِ هٰذَا الْمِلْطَاطِ، حَتّٰى يَاْتِيَهُمْ اَمْرِيْ، وَ قَدْ اَرَدْتُّ اَنْ اَقْطَعَ هٰذِهِ النُّطْفَةَ اِلٰى

خطبہ:۴۹(۴۸)

حضرت علیہ السلام کے ایک کلام کا کچھ حصّہ

جسے شام کی طرف سفر کرتے وقت (فرمایا)۔[1]

(دنیا میں) جب تک رات آتی اور تاریک ہوتی رہے اور جب تک کوئی ستارہ نکلتا اور ڈوبتا رہے (یعنی ہمیشہ) سب تعریفیں خدا ہی کو سزاوار ہیں۔ غرض ہر قسم کی حمد وثنا خدا ہی کے لیے مناسب ہے جس کی نہ تو نعمتیں کبھی موقوف ہوتی ہیں اور نہ جس کے فضل وکرم کا کوئی بدلہ ہوسکتا ہے۔

اس کے بعد معلوم ہو کہ میں نے اپنے مقدمۃ الجیش (یعنی لشکر کے اگلے حصّہ) کو روانہ کر دیا ہے[2] اور ان کو حکم دیا ہے کہ (دریائے فرات کے) اس کنارہ پر جمے رہیں جب تک انہیں میرا (دوسرا) حکم (نہ) پہنچے۔ اور خود میرا ارادہ یہ

(بقیہ صفحہ مابعد) سب وشتم کراتا۔ ایک روز اسی طرح لوگ اس عمل قبیح میں مشغول تھے کہ ناگاہ اس کا خدمت گار دوڑا ہوا آیا اور کہا کہ امیر یعنی زیاد پر ابھی فالج گر گیا چنانچہ وہ اسی روز اس مرض سے ہلاک ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا عبید اللہ بن زیاد حاکم کوفہ ہوا اور امام حسینؑ کو قتل کرایا آخر اس کو بھی جذام ہو گیا پھر حجاج بن یوسف ثقفی کا دور آیا اس کے پیٹ میں سانپ اور بچھو پیدا ہونے لگے جو اس کی موت کا سبب ہوا۔ پھر عمر بن ہبیرہ اور اس کے فرزند یوسف کا زمانہ آیا یہ دونوں بھی مرض برص میں مبتلا ہو کر اپنی جگہ پہنچے۔ پھر خالد قشیری ہوا اس کو بھی لوگوں نے خوب مارا اور قید کر دیا یہاں تک کہ بھوک سے ہلاک ہو گیا۔

[1] ۲۵ شوال ۳۶ھ کو صفین کے قصد سے حضرت امیر المومنینؑ کوفہ سے باہر تشریف لائے تو مقام نخیلہ میں یہ خطبہ فرمایا لیکن علامہ ابن ابی الحدید نے ۲۵ شوال ۳۷ھ تاریخ روانگی لکھی ہے۔

[2] حضرتؑ نے زیاد بن النضر اور شریح بن ہانی کو بارہ ہزار فوج کا سردار کر کے مقدمۃ الجیش کے طور پر آگے روانہ کیا اور ان کو حکم دیا کہ دریائے فرات کے کنارہ کنارہ اسی طرف چلیں وہ اسی طرح گئے یہاں تک کہ مقام عانات میں پہنچ گئے۔ وہاں ان کو معلوم ہوا کہ حضرت علیؑ دریا پار ہو کر جزیرہ کی راہ سے تشریف لے گئے ہیں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ معاویہ اپنے لشکر لیے ہوئے شام سے حضرتؑ کے مقابلہ کو روانہ ہو گیا ہے۔ دونوں سرداروں نے رائے کی کہ یہ تو مناسب نہیں کہ ہمارے اور جناب امیرؑ کے درمیان دریا حائل رہے چنانچہ پلٹ کر مقام ہیت میں آئے اور دریا عبور کر کے حضرت علی علیہ السلام سے مل گئے آپؑ نے ان کی اس تدبیر کو پسند کیا اور پھر اپنے آگے معاویہ کے مقابلہ میں روانہ کر دیا۔ (بقیہ صفحہ مابعد)

(بقیہ صفحہ ماقبل) اسی سفر میں حضرتؑ کو وہ مشہور معجزہ ہوا جس کو اُردو، فارسی، عربی، انگریزی مؤرخین بھی تسلیم کرتے ہیں کہ جب حضرتؑ کوفہ سے دور نکل گئے اور حدود جزیرہ میں پہنچے تو پانی ختم ہو گیا اور فوج شدت سے پیاسی ہوئی اور باوجود اچھی طرح تلاش کرنے کے پانی نہ ملا۔ ناگاہ دور سے جنگل میں کسی راہب کا ایک صومعہ نظر آیا وہاں حضرتؑ تشریف لائے اور اس راہب سے پانی طلب کیا۔ اس نے کہا یہاں کہیں ممکن نہیں۔ حضرتؑ نے وہیں ایک جگہ نشان دیکھ کر کھدوایا جس سے ایک پتھر نمودار ہوا جس کو فوج کے بکثرت لوگوں نے زور کر کے ہٹانا چاہا لیکن ناکام رہے۔ تب حضرتؑ نے خود ہی تن وتنہا اس پتھر کو اُٹھا کر دور پھینک دیا جہاں سے ایک چشمہ نکلا اور پوری فوج سیراب ہوئی اور پھر قوت الٰہی سے پتھر اٹھا کر اسی جگہ رکھ دیا۔ وہ راہب یہ کرامت دیکھ کر مسلمان ہو گیا اور دیر سے ایک صحیفہ نکالا جو اصحاب حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کا لکھا ہوا تھا اور اس میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حالت اور حضرت امیر المومنینؑ کے آپؐ کے خلیفہ برحق ہونے اور اس مقام پر آ کر چشمہ ظاہر کرنے کی پیشین گوئی درج تھی۔ حضرتؑ نے وہ صحیفہ دیکھ کر فرمایا:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ اَکُنْ عِنْدَهٗ مَنْسِیًّا. اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ ذَکَرَنِیْ عِنْدَهٗ فِیْ کُتُبِ الْاَبْرَارِ۔

خدا کا شکر ہے جس نے مجھے بھلایا نہیں خدا کا شکر ہے جس نے مجھے اپنے نیک بندوں کی کتابوں میں ذکر کیا۔

وہاں سے روانہ ہوئے تو راہب بھی ساتھ ہو لیا اور جنگ صفین میں شہید ہوا۔ یہ واقعہ تاریخ روضۃ الصفا، حبیب السیر، تاریخ اعثم کوفی اور شواہد النبوۃ ملا جامی وغیرہ کتب میں مذکور ہے۔ مسٹر واشنگٹن ایروِنگ نامی نے بھی جو ایک مشہور ومعروف یورپین مؤرخ ہیں جس نے لائف آف محمدؐ (بزبان انگریزی) اور چند اور مشہور کتابیں بھی لکھی ہیں، اپنی انگریزی تاریخ سکسرز آف محمد مطبوعہ لندن صفحہ ۱۸۰۔۱۸۱ میں لکھا ہے اور علامہ ابن ابی الحدید نے شرح نہج البلاغہ مطبوعہ مصر جلد اول صفحہ ۲۸۸۔۲۸۹ میں اس واقعہ کی تفصیل اور اس صحیفہ کی پوری نقل اس طرح ذکر کی ہے:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ اَلَّذِیْ قَضٰی فِیْمَا قَضٰی وَ سَطَرَ فِیْمَا کَتَبَ اَنَّهٗ بَاعِثٌ فِی الْاُمِّیِّیْنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یُعَلِّمُهُمُ الْکِتَابَ وَ الْحِکْمَةَ وَ یَدُلُّهُمْ عَلٰی سَبِیْلِ اللّٰهِ لَا فَظٌّ وَ لَا غَلِیْظٌ وَ لَا صَخَّابٌ فِی الْاَسْوَاقِ وَ لَا یَجْزِیْ بِالسَّیِّئَةِ السَّیِّئَةَ بَلْ یَعْفُوْ وَ یَصْفَحُ اُمَّتُهُ الْحَمَّادُوْنَ الَّذِیْنَ یَحْمَدُوْنَ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ نَشْرٍ وَ فِیْ کُلِّ صُعُوْدٍ وَ هُبُوْطٍ تَذِلُّ اَلْسِنَتُهُمْ بِالتَّکْبِیْرِ وَ التَّهْلِیْلِ وَ التَّسْبِیْحِ وَ یَنْصُرُهُ اللّٰهُ عَلٰی مَنْ نَاوَاهُ فَاِذَا تَوَفَّاهُ اللّٰهُ اِخْتَلَفَتْ اُمَّتُهٗ مِنْ بَعْدِهٖ ثُمَّ اجْتَمَعَتْ فَلَبِثَتْ مَا شَاءَ اللّٰهُ ثُمَّ اخْتَلَفَتْ فَیَمُرُّ رَجُلٌ مِّنْ اُمَّتِهٖ بِشَاطِئِ هٰذَا الْفُرَاتِ یَاْمُرُ بِالْمَعْرُوْفِ وَ یَنْهٰی عَنِ الْمُنْکَرِ وَ یَقْضِیْ بِالْحَقِّ وَلَا یُرَکِّسُ الْحُکْمَ۔ اَلدُّنْیَا اَهْوَنُ عَلَیْهِ مِنَ الرَّمَادِ فِیْ یَوْمٍ عَصَفَتْ بِهِ الرِّیْحُ وَالْمَوْتُ اَهْوَنُ عَلَیْهِ مِنْ شُرْبِ الْمَاءِ عَلَی الظَّمْاٰنِ یَخَافُ اللّٰهَ فِی السِّرِّ وَ یَنْصَحُ لَهٗ فِی الْعَلَانِیَةِ لَا یَخَافُ فِی اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ فَمَنْ اَدْرَکَ ذٰلِكَ النَّبِیَّ مِنْ اَهْلِ هٰذِهِ الْبِلَادِ فَاٰمَنَ بِهٖ کَانَ ثَوَابُهٗ رِضْوَانِیْ وَ الْجَنَّةُ وَ مَنْ اَدْرَکَ ذٰلِكَ الْعَبْدَ الصَّالِحَ فَلْیَنْصُرْهُ فَاِنَّ الْقَتْلَ مَعَهٗ شَهَادَةٌ۔

یعنی بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ خدا نے جو حکم دینا تھا دے دیا اور جو مقدر کر دیا اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ ''وہ اُمیوں سے ایک پیغمبر بھیجے گا جو ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے گا اور خدا کی راہ دکھائے گا، وہ پیغمبر بدخو، بدزبان، سخت دل اور

شِرْذِمَةٍ مِّنْكُمْ، مُوْطِنِيْنَ اَكْنَافَ دِجْلَةَ، فَانْهِضَهُمْ مَّعَكُمْ اِلٰى عَدُوِّكُمْ، وَ اَجْعَلَهُمْ مِنْ اَمْدَادِ الْقُوَّةِ لَكُمْ.

ہے کہ اس نہر (فرات) کو پار کر کے تم لوگوں کی اس جماعت سے ملوں جو (جا کر) دجلہ کے کنارہ کنارہ آباد ہوگئی ہے۔ پس ان کو ابھار کر تم لوگوں کے ساتھ تمہارے دشمن کی طرف بھیج دوں اور انہیں تمہاری امدادی قوت سے قرار دوں۔ [1]

بازاروں میں شور وغل کرنے والا نہ ہوگا اور بدی کا بدلہ بدی سے نہ دے گا بلکہ عفو ودرگزر سے کام لے گا، اس کی امت کے لوگ ہر سختی ونرمی میں خدا کی حمد ہی کرتے رہیں گے اور ان کی زبانیں اس کی تکبیر وتہلیل وتسبیح سے گھستی رہیں گی۔ خدا اس پیغمبر کو اس کے دشمنوں پر غلبہ دے گا پھر اس کا انتقال ہوجائے گا تو اس کی امت میں اختلاف واقع ہوگا، پھر وہ اکٹھے ہو کر کچھ دن بسر کریں گے اور پھر اختلاف پیدا ہوگا۔ اس وقت اس امت سے ایک بزرگ دریائے فرات کے اس کنارے سے گزرے گا جو لوگوں کو اچھے کاموں کی ہدایت اور برے کاموں سے منع کرتا ہوگا، صحیح فیصلہ دے گا اور حکم کو نہ الٹے گا۔ دنیا اس کی نظروں میں خاک اور خاکستر سے بھی زیادہ حقیر ہوگی اور موت اس کے لیے پیاس کی حالت میں پانی پینے سے بھی زیادہ آسان ہوگی۔ وہ باطن میں خدا سے ڈرنے والا اور ظاہر میں اس کے لیے نصیحت کرنے والا ہوگا اور خدا کے بارے میں کسی کی پرواہ نہ کرے گا، نہ کسی کی ملامت سے ڈرے گا تو ان اطراف کے رہنے والوں سے جو اس نبی پر ایمان لائے گا، اس کا ثواب میری رضوان اور جنت ہوگی اور جو اس دوسرے بزرگ عبد صالح کی زیارت سے مشرف ہو اس کو اس کی مدد کرنی چاہیے کیونکہ اس کے ساتھ قتل ہونا شہادت ہے۔

حضرتؑ جب وہاں سے روانہ ہوئے تو اپنے لشکر والوں سے کہا کوئی ہے جو اس چشمہ تک جائے اور اس کا پتہ لگائے؟ کچھ لوگ روانہ ہوئے مگر کسی کو پھر اس چشمہ کا پتہ نہ لگا۔ دیر کے راہب نے کہا یہ دیر اسی چشمہ کے لیے بنایا گیا ہے کیونکہ اس چشمہ کا ظاہر کرنے والا نبی ہوگا یا وصی نبی۔

[1] حضرتؑ کوفہ سے روانہ ہو کر مقام بہرسیر میں پہنچے، پھر مدائن جہاں بارہ سو آدمی آپ کے لشکر میں شامل ہوئے وہاں سے انبار تشریف لائے لوگوں نے باہر آ کر استقبال کیا اور گھوڑوں سے اُتر کر پیادہ دوڑنے لگے۔ کچھ عربی گھوڑے بھی ساتھ لائے تھے۔ حضرتؑ نے پوچھا یہ گھوڑے کیسے ہیں؟ اور مجھے دیکھ کر پیادہ کیوں دوڑنے لگے؟ انہوں نے عرض کی، ہم اپنے سرداروں کی تعظیم میں پیادہ دوڑتے ہیں اور یہ گھوڑے آپ کے لیے بطور ہدیہ لائے ہیں اور اس کے علاوہ اہل لشکر کے لیے کھانا اور سواریوں کے لیے چارہ گھاس بھی بکثرت لائے ہیں۔ آپ نے فرمایا پیادہ چلنے سے تم بے فائدہ اپنے کو تعب اور مشقت میں مبتلا کرتے ہو۔ ایسی تعظیم لغو ہے آئندہ سے یہ طریقہ ترک کر دو اور گھوڑوں کو دینا ہی چاہتے ہو تو مفت نہ لوں گا بلکہ اس شرط سے کہ ان کی قیمت تمہارے خراج میں محسوب کر دوں اور لشکر کا کھانا اور جانوروں کا چارہ بھی میں بغیر قیمت نہیں لینا چاہتا کیونکہ تمہارے مال کو بے عوض کھانا میں پسند نہیں کرتا۔ ان لوگوں نے عرض کی کیا ہم لوگ آپ سے ان ہدایا کی قیمت لیں؟ فرمایا نہیں لوگے تو ہم کوئی چیز قبول بھی نہیں کرتے بلکہ جو اپنے پاس موجود ہے اسی کو کافی سمجھتے ہیں۔ انہوں نے عرض کیا ہم سے بہت سے عربوں سے تعارف ورسم وراہ ہے تو کیا آپ ہدیہ وتحفہ لینے یا دینے کو منع کرتے ہیں؟ حضرتؑ نے فرمایا عرب تو کل تمہارے موالی ہیں اور کسی مسلمان کو جائز نہیں کہ تمہارا ہدیہ قبول کرے۔ غرض ان (بقیہ صفحہ مابعد)

(بقیہ صفحہ ماقبل) لوگوں نے لاکھ اصرار کیا، حضرتؑ نے کوئی چیز قبول نہ کی۔

وہاں سے روانہ ہو کر اسی صحرا میں پہنچے جہاں پانی کا معجزہ ہوا جو پہلے مذکور ہوا۔ وہاں سے آپ جزیرہ پر پہنچے۔ یہاں آپ نے یزید بن قیس ارحبی کو اجازت دی کہ اس قوم کا کھانا کھاؤ اور پانی پیو کیونکہ یہ تمہاری قوم سے ہیں۔ وہاں سے رقہ پہنچے یہاں کے لوگ سب عثمانی تھے۔ حضرتؑ کے آنے پر دروازہ شہر بند کر دیا۔ یہاں بعض اصحاب کی رائے ہوئی کہ ایک خط اور معاویہ کو لکھا جائے کیونکہ اس پر اور بھی اتمام حجت ہو جائے گا۔ حضرتؑ نے یہ رائے پسند کر کے ایک خط معاویہ کو لکھا جس میں اس کو بہت سمجھایا اور خدا سے ڈرا کر مسلمانوں کی خونریزی سے بچنے کی تاکید کی۔

یہ خط بہت طولانی ہے جو شرح ابن ابی الحدید کے صفحہ ۲۹۰ میں درج ہے، اس کا آخری فقرہ یہ ہے:

اَلَا وَ اِنِّیْ اَدْعُوْکُمْ اِلٰی کِتَابِ اللّٰہِ وَ سُنَّۃِ نَبِیِّہٖ وَ حَقْنِ دِمَاءِ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ۔

کہ ہم کتاب خدا اور سنت نبی کی طرف تم کو دعوت دیتے ہیں اور یہ کہ امّتِ محمدیہ میں خونریزی نہ ہو۔

مگر معاویہ پر کیا اثر ہوتا اس نے جواب میں صرف یہ شعر لکھ کر بھیج دیا:

لَیْسَ بَیْنِیْ وَ بَیْنَ قَیْسٍ عِتَابٌ غَیْرُ طَعْنِ الْکِلَا وَ ضَرْبِ الرِّقَابِ۔

یعنی میرے اور قیس کے درمیان سوائے شمشیر زنی اور نیزہ بازی کے کوئی اختلاف نہیں۔

یہ جواب دیکھ کر حضرتؑ نے افسوس کیا اور یہ آیۃ تلاوت فرمائی:

﴿ اِنَّکَ لَا تَھْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ ﴾ (سورۂ قصص، آیہ ۵۶)

کہ تم جسے چاہتے ہو اسے ہدایت نہیں کر سکتے۔

غرض حضرتؑ نے مایوس ہو کر روانہ ہونا چاہا اور اہل رقہ سے کہا کہ ہمارے لیے پل لگا دو تا کہ ہم دریا عبور کر جائیں۔ وہ سب کے سب طرفداران معاویہ سے تھے انہوں نے وہ کشتیاں جن سے پل باندھتے تھے پہلے ہی وہاں سے علیحدہ کر دیں تھیں۔ حضرتؑ کے حکم پر کہا کہ ہمارے پاس پل کا سامان نہیں ہے تو حضرتؑ وہاں سے روانہ ہوئے اور چاہا کہ مقام منبج سے عبور کریں اور حضرتؑ نے مالک اشتر کو رقہ میں چھوڑ دیا۔ انہوں نے رقہ والوں سے کہا: خدا کی قسم اگر تم یہاں پُل باندھ کر حضرت امیر المومنینؑ کو پار نہ اتارو گے تو تم ہو گے اور میری تلوار، مردوں کو تو قتل کر دوں گا، اس شہر کو خاک میں ملا دوں گا اور کل مال اسباب لوٹ لوں گا۔ یہ سن کر ان سب نے مشورہ کیا کہ اشتر اپنی قسم پوری کر کے رہیں گے، پس حضرتؑ کو واپس بلایا اور پُل تیار کر دیا جس پر سے حضرتؑ اس پار اتر گئے اور شام کی طرف روانہ ہوئے۔ ادھر سے زیاد بن نضر اور شریح بن ہانی جو مقدمۃ الجیش کے طور پر روانہ ہوئے تھے دریا پار ہو کر آئے اور قریہ قرقیسا میں حضرتؑ سے مل گئے۔ جیسا کہ پہلے مذکور ہوا حضرتؑ نے پھر ان کو آگے روانہ کر دیا۔

شام سے معاویہ کا عظیم الشان لشکر ابوالاعور اسلمی کی ماتحتی میں آ رہا تھا۔ مقام سور الروم پر لشکر معاویہ اور لشکر جناب امیرؑ میں (جو صرف بارہ ہزار زیاد بن نضر اور شریح بن ہانی کی ماتحتی میں تھا) مقابلہ ہوا۔ ان لوگوں نے جناب امیرؑ کو خبر دی۔ حضرتؑ نے مالک اشتر کو تین ہزار سپاہیوں کے ہمراہ ان کی مدد کو بھیجا اور تاکید فرمائی کہ ''ہرگز اپنی طرف سے جنگ میں ابتدا نہ کرنا تاوقتیکہ اُدھر سے پیش قدمی نہ ہو، ان کو بار بار سمجھاؤ اور اچھی طرح نصیحت کرو اور ان کی عداوت تم کو ان سے جلد لڑنے پر آمادہ نہ کرے۔ اچھی طرح (بقیہ صفحہ مابعد)

(قَالَ الشَّرِيْفُ)اَقُوْلُ: يَعْنِيْ عَلَيْهِ السَّلَامُ بِـ «الْبِلْطَاطِ» هٰهُنَا السَّمْتَ الَّذِيْ اَمَرَهُمْ بِلُزُوْمِهٖ وَ هُوَ شَاطِئُ الْفُرَاتِ، وَ يُقَالُ ذٰلِكَ اَيْضًا لِشَاطِئِ الْبَحْرِ، وَ اَصْلُهٗ مَا اسْتَوٰى مِنَ الْاَرْضِ، وَ يَعْنِيْ بِـ «النُّطْفَةِ» مَآءَ الْفُرَاتِ ، وَ هُوَ مِنْ غَرِيْبِ الْعِبَارَاتِ وَ عَجِيْبِهَا.

(جناب سید رضی علیہ رحمہ کہتے ہیں کہ) (اس خطبہ میں) لفظ «الْبِلْطَاطِ» سے حضرتؑ کی مراد وہ سمت ہے جہاں آپؑ نے اس لشکر کو ٹھہرے رہنے کا حکم دیا تھا جو نہر فرات کا کنارہ تھا اور یہ (لفظ ملطاط) دریا کے کنارہ کو کہتے ہیں اگرچہ اصل میں وہ زمین ہے جو ہموار اور بلند ہو۔ اور حضرتؑ کی مراد «النُّطْفَةِ» سے نہر فرات ہے جو نہایت ہی مناسب لفظ ہے اور عجیب وغریب عبارت ہے۔

❁ خطبہ :۵۰ ❁

وَ مِنْ كَلَامٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ بَطَنَ خَفِيَّاتِ الْاُمُوْرِ، وَ دَلَّتْ عَلَيْهِ اَعْلَامُ الظُّهُوْرِ، وَ امْتَنَعَ عَلٰى عَيْنِ الْبَصِيْرِ، فَلَا عَيْنُ مَنْ لَّمْ يَرَهٗ تُنْكِرُهٗ، وَ لَا قَلْبُ مَنْ

خطبہ:۵۰(۴۹)

حضرت علیہ السلام کے ایک کلام کا کچھ حصّہ۔

سب تعریفیں خدا ہی کو سزاوار ہیں جو پوشیدہ امروں سے واقف ہے اور جس (کے وجود) کو واضح اور نمایاں دلیلیں (کافی طور پر) ثابت کر رہی ہیں اور جس کا (اس) آنکھ سے دکھائی دینا محال ہے۔ مگر جس شخص نے آنکھ سے نہیں دیکھا وہ اس کا انکار نہیں کر سکتا اور جس کے دل نے

(بقیہ صفحہ ماقبل) اتمام حجت کر کے دیکھو اگر کوئی نتیجہ نہ نکلے تو مجبوراً ان کے واروں کا جواب دو۔ اور لڑائی چھڑ ہی جائے تو میمنہ پر زیاد کو اور میسرہ پر شریح کو رکھنا اور خود قلب لشکر میں رہنا۔ تم نہ دشمن سے اس قدر نزدیک ہونا کہ معلوم ہو تم کو جنگ پسند ہے اور نہ اتنے دور کہ لوگ سمجھیں جنگ سے ڈرتے ہیں''۔ اس کے بعد پھر حضرتؑ نے حریث بن جمہان جعفی کے ذریعہ سے اسی مضمون کا ایک خط لکھا کہ دیکھو ہرگز پیش قدمی نہ کرنا۔

غرض مالک اشتر سب سُن کر روانہ ہوئے اور لشکر معاویہ کو بہت سمجھایا، کچھ دیر تک دونوں لشکر تھمے رہے مگر شام ہوتے ہوتے ابوالاعور نے حملہ کر ہی دیا۔ انہوں نے بھی جنگ شروع کر دی دن بھر اور رات بھر جنگ ہوتی رہی۔ دوسرے روز صبح ہوتے ہوتے شامیوں کے قدم اکھڑ گئے۔ ابوالاعور بھاگا۔ ہر چند مالک اشتر نے ایک قاصد خاص اسی غرض سے بھیجا کہ ابولاعور آ کر مقابل ہو مگر اس نے انکار کیا۔ غرض ابوالاعور بھاگا ہوا جا رہا تھا، ادھر سے معاویہ آتا تھا، راہ میں ملاقات ہوئی تو ساتھ ہو لیا اور مقام صفین پر ایک لاکھ تیس ہزار فوج کے ساتھ آ کر اترا اور پہلے ہی فرات پر پہنچ کر پانی کا گھاٹ روک لیا اور رقہ سے جناب امیرؑ بھی نوے ہزار فوج کے ساتھ ۲۲ ذی الحجہ ۳۶ھ کو صفین میں پہنچ گئے اور معاویہ کے مقابلہ میں نزول اجلال فرمایا۔

اَثْبَتَهٗ يُبْصِرُهٗ.

سَبَقَ فِي الْعُلُوِّ فَلَا شَيْءَ اَعْلٰى مِنْهُ، وَ قَرُبَ فِي الدُّنُوِّ فَلَا شَيْءَ اَقْرَبُ مِنْهُ، فَلَا اسْتِعْلَآؤُهٗ بَاعَدَهٗ عَنْ شَيْءٍ مِّنْ خَلْقِهٖ، وَ لَا قُرْبُهٗ سَاوَاهُمْ فِي الْمَكَانِ بِهٖ، لَمْ يُطْلِعِ الْعُقُوْلَ عَلٰى تَحْدِيْدِ صِفَتِهٖ، وَلَمْ يَحْجُبْهَا عَنْ وَّاجِبِ مَعْرِفَتِهٖ، فَهُوَ الَّذِيْ تَشْهَدُ لَهٗ اَعْلَامُ الْوُجُوْدِ، عَلٰٓى اِقْرَارِ قَلْبِ ذِي الْجُحُوْدِ، تَعَالَى اللّٰهُ عَمَّا يَقُوْلُ الْمُشَبِّهُوْنَ بِهٖ وَ الْجَاحِدُوْنَ لَهٗ

اس کو مان لیا ہے وہ آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا۔[1]

وہ بلندی میں (سب سے) بڑھا ہوا ہے کہ کوئی چیز اس سے بلند تر نہیں۔ اور نزدیکی میں (بھی) سب سے قریب ہے کہ کوئی چیز اس سے نزدیک تر نہیں۔ تو نہ اس کی بلندی نے اس کو مخلوقات سے کسی چیز سے دور کیا اور نہ اس کی نزدیکی نے ان (مخلوقات) کو مکان (اور جگہ) میں اس کے برابر کیا۔[2] اس نے عقلوں کو نہ تو اپنی کنہ حقیقت پر مطلع ہونے دیا اور نہ اپنی واجبی معرفت سے محروم رکھا۔[3] غرض وہی ایسی ذات ہے جس کے وجود کی علامتیں اس (کے موجود ہونے) کی گواہی دے رہی ہیں کافروں کے دلی اقرار پر (اگرچہ وہ زبان سے نہ کہیں)۔[4] غرض خدا بہت برتر ہے اس سے جو تشبیہ دینے والے اور اس کا انکار کرنے

---

[1] بعض روایات میں ''وَ امْتَنَعَ عَلٰى عَيْنِ الْبَصِيْرِ'' کے بعد یوں وارد ہے ''فَلَا قَلْبٌ مَنْ لَّمْ يَرَهٗ يُنْكِرُهٗ، وَ لَا عَيْنٌ مَنْ اَثْبَتَهٗ يُبْصِرُهٗ''۔ یعنی ''جس شخص نے اس کو دیکھا نہیں اس کا دل اس کے وجود سے انکار نہیں کرسکتا اور جس نے اس کا وجود مان لیا اس کی آنکھ اس کو دیکھ نہیں سکتی''۔ شارحین لکھتے ہیں کہ یہ روایت کتاب کی عبارت سے بہتر اور زیادہ مناسب ہے۔

[2] اس کی رفعت اور قربت یعنی بلندی اور نزدیکی جگہ اور مقام کے اعتبار سے نہیں ہے کہ بلند ہونے سے کسی چیز سے دور ہو جائے اور نزدیک ہونے سے اس چیز کے برابر ہو جائے بلکہ اس کی رفعت اس کی ذات کمال اور اجلال کے سبب سے اور نزدیکی اس کے علم، ارادہ، احاطہ اور عنایت کی حیثیت سے ہے۔ غرض اس کی ذات ہر چیز سے بلند تر اور اس کا علم و ارادہ اور فضل و کرم ہر چیز سے نزدیک تر ہے۔

[3] یعنی خدا نے انسانی عقل کو نہ تو اتنی قوت دی کہ وہ خدا کی حقیقی صفت اور کیفیت کو پہچان لے اور نہ اتنا مجبور کیا کہ اس کو کچھ بھی نہ جان سکے بلکہ اوسط درجہ میں رکھا جس سے وہ اتنا سمجھ لے کہ خدا ہے ضرور جو عالم کو پیدا کرتا اور اس میں تغیر دیتا رہتا ہے اور خدا کی اسی قدر معرفت واجب ہے جو عقلوں کو ادنی غور و تامل سے حاصل ہو جاتی ہے۔

[4] یعنی نیچری اور دہریہ بھی گو زبان سے خدا کا انکار کرتے ہیں لیکن دل سے خدا کا وجود تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کیونکہ وہ زبانی انکار ان خیالات اور توہمات کا نتیجہ ہوتا ہے جو اس کی فطرت کے خلاف ہے۔ اگر وہ اپنی فطرت کے مطابق خدا کے کارخانوں اور عالم کی نیرنگیوں کو دیکھے اور ان میں غور کرے تو اس کا دل کبھی انکار نہیں کرسکتا۔

عُلُوًّا كَبِيْرًا!.

والے کہتے ہیں۔[1]



❁ خطبہ :۵۱ ❁

وَ مِنْ كَلَامٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

اِنَّمَا بَدْءُ وُقُوْعِ الْفِتَنِ اَهْوَآءٌ تُتَّبَعُ، وَ اَحْكَامٌ تُبْتَدَعُ، يُخَالَفُ فِيْهَا كِتَابُ اللّٰهِ، وَ يَتَوَلّٰى عَلَيْهَا رِجَالٌ رِّجَالًا، عَلٰى غَيْرِ دِيْنِ اللّٰهِ، فَلَوْ اَنَّ الْبَاطِلَ خَلَصَ مِنْ مِّزَاجِ الْحَقِّ لَمْ يَخْفَ عَلَى الْمُرْتَادِيْنَ، وَ لَوْ اَنَّ الْحَقَّ خَلَصَ مِنْ لَّبْسِ الْبَاطِلِ لَانْقَطَعَتْ عَنْهُ اَلْسُنُ الْمُعَانِدِيْنَ، وَ لٰكِنْ يُّؤْخَذُ مِنْ هٰذَا ضِغْثٌ، وَ مِنْ هٰذَا ضِغْثٌ، فَيُمْزَجَانِ! فَهُنَالِكَ يَسْتَوْلِي الشَّيْطٰنُ عَلٰى

خطبہ:۵۱(۵۰)

حضرت علیہ السلام کے ایک کلام کا کچھ حصّہ۔

فتنہ (وفساد) کی ابتدا ان نفسانی خواہشوں سے ہوتی ہے جن کی پیروی کی جاتی ہے اور ان نئے نئے احکام سے جو ایجاد کیے جاتے ہیں۔ جن میں کتاب خدا (اور حدیث رسولؐ) کی مخالفت کی جاتی ہے۔ اور ان (احکام کے پھیلانے) پر کچھ لوگ دوسروں کو دین خدا کے خلاف (اپنا) دوست اور مددگار بنا لیتے ہیں۔ پس اگر باطل حق میں ملنے سے بچا رہے تو طالبان (حق) پر پوشیدہ نہ ہو (اور یہ لوگ اس سے ہمیشہ محفوظ رہیں) اور اگر حق باطل سے خالص (یعنی علیحدہ) ہو رہے تو اس سے (مخالفین و) معاندین کی زبانیں بند رہیں۔ مگر (حالت تو یہ ہے کہ) ایک حصہ اس (باطل) سے اور ایک حصہ اس (حق) سے لے لیا جاتا ہے اور دونوں ملائے جاتے ہیں۔[2] پس اسی

---

[1] علامہ ابن ابی الحدید نے یہاں بعض مسلمان فرقوں کے عجیب وغریب عقائد تشبیہ خدا کے متعلق ذکر کیے ہیں جن کی تفصیل انشاءاللہ ضمیمہ میں آئے گی۔

[2] اس خطبہ میں جناب امیر المومنینؑ کا مطلب یہ ہے کہ اگر خواہشوں کو نہ دخل دیا جائے تو کوئی فساد نہ ہو۔ جو کچھ ہوتا ہے وہ اپنی خواہشوں کی پیروی سے اور دوسری جو بوجہ عصبیت وقوی ہمدردی اس کے طرف دار بن جاتے ہیں اس وجہ سے فساد ہوتا ہے۔ اگر محض حق کی پیروی کی جائے تو کوئی فساد نہ ہو۔ مثال کے طور پر سمجھو کہ رویت باری تعالٰی کے بارے میں اختلاف ہے اگر محض خدا کے فرمان پر خیال کیا جاتا تو کوئی فساد نہ ہوتا۔ مگر اپنی عقل سے یہ کلیہ بنایا کہ خدا موجود ہے (جو حق ہے) اور جو موجود ہے وہ دیکھا جا سکتا ہے (حق و باطل سے مرکب ہے) اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ خدا دیکھا جا سکتا ہے حالانکہ ایک ہی مقدمہ صحیح ہے دوسرا غلط ہے۔ اسی حق و باطل کی ترکیب سے نتیجہ غلط نکلا۔ اب وہ مقدمہ لو کہ دونوں غلط ہوں اس طرح کہ باطنیہ کہتے ہیں خدا نہ معدوم ہے نہ موجود اور جو (بقیہ صفحہ

اَوْلِيَآئِهٖ، وَ يَنْجُوْ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِنَ اللّٰهِ الْحُسْنٰى.

موقع پر شیطان اپنے مریدوں پر غالب آجاتا ہے اور (اس کے تسلط سے صرف) وہی لوگ بچتے ہیں جن پر پہلے سے خدا کی عنایت رہتی ہے۔

❁ خطبہ: ۵۲ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

خطبہ: ۵۲ (۵۱)

حضرت علیہ السلام کے ایک خطبہ کا کچھ حصّہ

لَمَّا غَلَبَ اَصْحَابُ مُعَاوِيَةَ اَصْحَابَهٗ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ عَلٰى شَرِيْعَةِ الْفُرَاتِ بِصِفِّيْنَ وَ مَنَعُوْهُمْ مِنَ الْمَآءِ:

جب (مقام صفین میں) معاویہ کے لشکر نے جناب امیر علیہ السلام کی فوج سے پہلے پہنچ کر نہر فرات کے گھاٹ پر قبضہ کرلیا اور ان کو پانی سے روک دیا (تو حضرتؑ نے فرمایا)

قَدِ اسْتَطْعَمُوْكُمُ الْقِتَالَ، فَاَقِرُّوْا عَلٰى مَذَلَّةٍ، وَ تَاْخِيْرِ مَحَلَّةٍ، اَوْ رَوُّوا السُّيُوْفَ مِنَ الدِّمَآءِ تَرْوَوْا مِنَ الْمَاءِ، فَالْمَوْتُ فِيْ حَيَاتِكُمْ مَقْهُوْرِيْنَ، وَ الْحَيٰوةُ فِيْ مَوْتِكُمْ قَاهِرِيْنَ. اَلَا وَ اِنَّ مُعَاوِيَةَ قَادَ لُمَّةً مِّنَ

(معاویہ والوں نے) تم سے جہاد کا کھانا مانگا تو یا اپنی (اس) ذلت وخواری اور پست درجہ میں پڑے رہو یا اپنی تلواروں کو (ان دشمنوں کے) خون سے سیراب کردو جس سے تم خود پانی پی سکو۔ غرض (اچھی طرح سمجھ لو کہ) مغلوب ومقہور ہوکر زندہ رہنے میں تو تمہاری عین موت ہے [1] اور غالب ہوکر مرجانے ہی میں تمہاری واقعی زندگی ہے (پس

(بقیہ صفحہ ماقبل) نہ معدوم ہونہ موجود وہ حی وقادر ہوسکتا ہے لہٰذا خدا حی وقادر ہوسکتا ہے۔ مگر چونکہ دونوں مقدمہ غلط ہے لہٰذا کوئی اس کو پسند نہیں کرتا۔ رہی وہ مثال کہ دونوں حق ہو تو مثلاً ''العالم متغیر وکل متغیر ممکن'' تو اس کا نتیجہ ''العالم ممکن'' بدیہی ہے۔ غرض اسی کو حضرتؑ اس خطبہ میں ظاہر فرماتے ہیں کہ اگر حق وباطل میں امتزاج نہ ہو اور دونوں اپنے حال پر رہیں تو کوئی خرابی نہ ہو۔ مگر ادھر مقدمات میں خرابی ہوتی ہے اُدھر شیطان اپنا کام کرتا ہے کیونکہ اس کے ظاہر کرنے والے وہ ہوتے ہیں جن کی ظاہری حالت فریب دیتی ہے تو اب یہ خیال ہوتا ہے کہ ایسے مقدس لوگ کیوں کر ایسا کرسکتے ہیں لہٰذا یہی حق ہے۔ اسی خیال سے یہود ونصاریٰ بھی گمراہ ہوئے اور بعض اہل اسلام بھی۔

[1] حضرتؑ کے جملہ ''فَالْمَوْتُ فِيْ حَيَاتِكُمْ مَقْهُوْرِيْنَ'' کا مضمون لے کر ابونصر بن نباتہ نے یہ شعر کہا ہے۔ هُوَ الْحُسَيْنُ الَّذِيْ رَاَى الْمَوْتَ فِي الْعِزِّ حَيَاةً وَالْعَيْشَ فِي الذُّلِّ قَتْلًا''۔ یعنی ''حضرت امام حسین علیہ السلام وہ تھے جنہوں نے عزت کے ساتھ مرجانے میں اپنی زندگی اور ذلت کے ساتھ زندہ رہنے ہی میں اپنا قتل اور ہلاک ہونا دیکھا کیونکہ حضرتؑ نے بوقت شہادت (بقیہ صفحہ مابعد)

الْغُوَاةِ، وَ عَمَسَ عَلَيْهِمُ الْخَبَرَ، حَتّٰى جَعَلُوْا نُحُوْرَهُمُ اَغْرَاضَ الْمَنِيَّةِ.

جاؤ مگر مغلوب نہ ہو)۔ دیکھو معاویہ گمراہوں کا ایک جھنڈا اکٹھا کرلایا اور ان سے حقیقت حال کو چھپا رکھا ہے [1] جس سے ان سب نے اپنی گردنوں کو موت کا نشانہ بنا دیا ہے۔

❁ خطبہ: ۵۳ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

خطبہ: ۵۳ (۵۲)

حضرت علیہ السلام کے ایک خطبہ کا کچھ حصّہ۔ [2]

(بقیہ صفحہ ماقبل) فرمادیا تھا ''ہم غلاموں کی سی زندگی نہیں کرسکتے'' چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ بعد شہادت امام حسین بیعت یزید اسی طرح لی جاتی کہ اقرار کرو تم یزید کے غلام ہو اور جتنے صحابہ حضرتؑ کے بعد زندہ رہے وہ انواع عقوبت میں مبتلا ہوئے۔ صحابہ کی گردنوں پر غلامی کا نشان دیا جاتا، عبداللہ بن عمر سب سے زیادہ باوقار تھے کیونکہ خلیفہ دوم کے فرزند اکبر تھے اور معاویہ و یزید کے طرف دار مگر یہ بھی اس طرح مارے گئے کہ عصاء مسموم کے ذریعہ سے زخمی کیے گئے اور ذلت کی موت مرے۔ ملاحظہ ہو الآل والاصحاب حصہ دوم۔

[1] یعنی معاویہ نے شام والوں سے عثمان کے قتل کی اصلی حالت کو پوشیدہ رکھا ہے اور ان کے ذہن نشین یہ غلط امر کردیا ہے کہ علیؑ نے عثمان کو قتل کرایا جس سے شامی میرے دشمن ہو رہے ہیں اور مجھ سے لڑنے کے لیے اپنے کو موت کا نشانہ بنائے ہوئے ہیں۔

[2] جناب سید رضی علیہ الرحمہ نے اس خطبہ کے متعلق لکھا ہے:

وَ قَدْ تَقَدَّمَ مُخْتَارُهَا بِرِوَايَةٍ وَ نَذْكُرُ مَا نَذْكُرُهٗ هٰهُنَا بِرِوَايَةٍ اُخْرٰى لِتَغَايُرِ الرِّوَايَتَيْنِ۔

یعنی ایک روایت کے مطابق اس خطبہ کا انتخاب پہلے ذکر کیا جاچکا ہے لیکن چونکہ ایک دوسری روایت سے بھی یہ خطبہ ملا اور دونوں روایتوں میں کچھ تغیر اور اختلاف بھی ہے لہٰذا اسے بھی ہم یہاں درج کردیتے ہیں۔

تو غالباً یہ اشارہ خطبہ نمبر ۴۳ کی طرف ہے جو اس سے صرف دس خطبہ قبل لکھا گیا ہے کیونکہ ان دونوں کے مضامین اور کچھ الفاظ بہت ملتے ہوئے ہیں۔ جناب علامہ ابن میثم علیہ الرحمہ نے اس خطبہ کی شرح میں لکھا ہے کہ اس خطبہ کے مضامین کا مدار تین امروں کے بیان پر ہے۔

(اول) دنیا اور دنیا کی لذتوں سے نفرت دلانا، اس کی محبت کے نتیجہ سے خوف زدہ کرنا، اس کی امیدوں اور تمناؤں میں مبتلا ہونے سے منع کرنا اور آخر کار اس سے بالکل قطع تعلق کرکے اور طلاق بائن دے کر ہر وقت سفر آخرت کے سامان میں لگے رہنے کا حکم دینا۔ یعنی ان کل امور کو حضرتؑ نے ابتدائے خطبہ سے ''وَ لَا يَطُوْلَنَّ عَلَيْكُمُ الْاَمَدُ'' تک میں بیان کیا ہے۔

(دوم) خداوند عالم کے درگاہ سے جو عظیم ثواب ملے گا جس کی طرف لوگوں کو متوجہ رہنا چاہیے اور اس کی نافرمانی کرنے سے اس کا عذاب بھی جو سخت سے سخت ہوگا جس سے ہر شخص کو ہر وقت خوفزدہ اور بچے رہنا چاہیے ان دونوں امروں کی طرف حضرتؑ نے ''فَوَاللّٰهِ! لَوْ حَنَنْتُمْ'' سے ''وَ اَخَافُ عَلَيْكُمْ مِنْ عِقَابِهٖ'' تک میں تنبیہ کی ہے۔

(سوم) ''وَاللّٰهِ! لَوِ انْمَاثَتْ'' سے آخر فصل تک میں حضرتؑ نے یہ بیان فرمادیا ہے کہ انسان خواہ کتنی ہی (بقیہ صفحہ مابعد)

اَلَا وَ اِنَّ الدُّنْيَا قَدْ تَصَرَّمَتْ، وَ اٰذَنَتْ بِوَدَاعٍ، وَ تَنَكَّرَ مَعْرُوْفُهَا، وَ اَدْبَرَتْ حَذَّآءَ، فَهِيَ تَحْفِزُ بِالْفَنَآءِ سُكَّانَهَا، وَ تَحْدُوْ بِالْمَوْتِ جِيْرَانَهَا، وَ قَدْ اَمَرَّ مِنْهَا مَا كَانَ حُلْوًا، وَ كَدِرَ مِنْهَا مَا كَانَ صَفْوًا، فَلَمْ يَبْقَ مِنْهَا اِلَّا سَمَلَةٌ كَسَمَلَةِ الْاِدَاوَةِ، اَوْ جُرْعَةٌ كَجُرْعَةِ الْمَقْلَةِ، لَوْ تَمَزَّزَهَا الصَّدْيَانُ لَمْ يَنْقَعْ، فَاَزْمِعُوْا عِبَادَ اللّٰهِ الرَّحِيْلَ عَنْ هٰذِهِ الدَّارِ الْمَقْدُوْرِ عَلٰٓى اَهْلِهَا الزَّوَالُ،

(لوگو!) خوب سمجھ لو کہ دنیا یقیناً فنا ہونے (کے قریب) پہنچ گئی اور (اپنے) خاتمہ کا اعلان کر دیا اور اس کی (ظاہری) خوبیاں مٹ گئیں، اور یہ تیزی سے پھر گئی۔ پس یہ اپنے رہنے والوں کو فنا سے (عدم کی طرف) ڈھکیل رہی ہے اور اپنے ہمسائیوں کو موت سے (آخرت کی جانب) ہنکا رہی ہے اور حالت یہ ہے کہ اس کی جو جو چیزیں شیریں تھیں وہ کڑوی ہو گئیں اور جو چیز صاف تھی وہ میلی اور گدلی ہو گئی تھی تو اب اس دنیا سے (کچھ بھی) نہ بچا سوا (تھوڑی سی) تلچھٹ کے مانند اس تلچھٹ کے جو لوٹے (وغیرہ کی تہ) میں رہ جاتی ہے یا ایک گھونٹ (پانی) کے مثل اس گھونٹ کے جو مقلہ سے ملتا ہے۔[1] جس کو اگر پیاسا چُوسے (بھی) تو سیراب نہ ہو۔ پس اے بندگانِ خدا اس دار (فانی) سے کوچ کا مصمم ارادہ کر لو جس کے رہنے

(بقیہ صفحہ مابعد) محنت ومشقت برداشت کر کے عبادات اور اعمال خیر بجالائے اور دنیا میں ہمیشہ ہمیشہ رہنے کے لیے چھوڑ دیا جائے اور وہ کسی وقت بھی کوئی دقیقہ زحمت واذیت برداشت کرنے کا اُٹھا نہ رکھے پھر بھی خدا کی نعمتوں کا واقعی شکر اور صحیح طور پر عوض ادا نہیں ہوسکتا کیونکہ اور تمام نعمتوں سے قطع نظر کر کے صرف ایک ایک سانس کو دیکھا جائے کہ ایک دفعہ میں خدا کی دو دو نعمتیں ہوتی ہیں، ایک سانس کے ذریعے ہوا کے باہر نکالنے میں دوسری نئی ہوا کے اندر لینے میں کہ اگر خدا کا فضل نہ ہو تو ہر ایک میں انسان کی ہلاکت کا سامان موجود ہے۔ پس جب ایک ایک سانس لینے میں خدا کی دو دو نعمتیں ہیں اور معلوم ہے کہ ہر ایک سانس میں کوئی شخص خدا کا ایک شکر بھی ادا نہیں کر سکتا تو پھر اس کے تمام نعمات کے شکریہ سے کیونکر عہدہ برآ ہوگا۔ اسی کو شیخ سعدی نے یوں ادا کیا ہے:

هر نفسی کی می آید ممد حیات است

[1] عرب میں قبیلہ سفر کرتے ہیں اور راہ میں پانی کم رہ جاتا ہے تو برتن میں چھوٹے پتھر کے ٹکڑے ڈال کر اسی کے مطابق آپس میں پانی تقسیم کرتے ہیں تاکہ ہر شخص کو تھوڑا تھوڑا پانی مساوی حیثیت سے مل جائے اور وہ ہلاکت سے محفوظ رہے۔ اسی پتھر کو مَقْلَہ کہتے ہیں۔ تو حضرتؑ کا مقصود یہ ہے کہ جس طرح صرف جان بچنے کے لیے وہ تھوڑا سا پانی ملتا ہے جو پتھر کے چوسنے سے حاصل ہوتا ہے اور اس سے پیاس کی اذیت موقوف نہیں ہوتی اسی طرح دنیا کی کل لذتوں کو حقیر، بے حقیقت، بے نفع سمجھنا چاہیے کہ خواہ انسان ان کو کتنا ہی حاصل کرے درحقیقت ان سے کوئی واقعی نفع نہیں مل سکتا۔

وَ لَا يَغْلِبَنَّكُمْ فِيْهَا الْاَمَلُ، وَ لَا يَطُوْلَنَّ عَلَيْكُمُ الْاَمَدُ.

فَوَاللّٰهِ! لَوْ حَنَنْتُمْ حَنِيْنَ الْوُلَّهِ الْعِجَالِ، وَ دَعَوْتُمْ بِهَدِيْلِ الْحَمَامِ، وَ جَاَرْتُمْ جُؤَارَ مُتَبَتِّلِي الرُّهْبَانِ، وَ خَرَجْتُمْ اِلَى اللّٰهِ مِنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَوْلَادِ، الْتِمَاسَ الْقُرْبَةِ اِلَيْهِ فِي ارْتِفَاعِ دَرَجَةٍ عِنْدَهٗ، اَوْ غُفْرَانِ سَيِّئَةٍ اَحْصَتْهَا كُتُبُهٗ، وَ حَفِظَتْهَا رُسُلُهٗ، لَكَانَ قَلِيْلًا فِيْمَآ اَرْجُوْ لَكُمْ مِنْ ثَوَابِهٖ، وَ اَخَافُ عَلَيْكُمْ مِنْ عِقَابِهٖ.

وَاللّٰهِ! لَوِ انْمَاثَتْ قُلُوْبُكُمُ انْمِيَاثًا، وَ سَالَتْ عُيُوْنُكُمْ مِنْ رَّغْبَةٍ اِلَيْهِ وَ رَهْبَةٍ مِّنْهُ دَمًا، ثُمَّ عُمِّرْتُمْ فِي الدُّنْيَا، مَا الدُّنْيَا بَاقِيَةٌ، مَا جَزَتْ اَعْمَالُكُمْ ـ وَ لَوْ لَمْ تُبْقُوْا شَيْئًا مِّنْ جُهْدِكُمْ ـ اَنْعُمَهٗ عَلَيْكُمُ الْعِظَامَ، وَ هُدَاهُ اِيَّاكُمْ لِلْاِيْمَانِ.

والوں کے لیے زوال مقدر ہو چکا ہے۔ اور ایسا نہ ہو کہ اس (دنیا) کی اُمید (اور تمنا) تم پر غالب آجائے اور اس (قلیل) زمانہ (زندگی) کو تم اپنے لیے زیادہ سمجھ لو!

کیونکہ خدا کی قسم اگر تم ان بدحواس اونٹنیوں کے بلبلانے کی طرح تڑپو جن کا بچہ ان سے جُدا ہو گیا ہو اور کبوتروں کے غوں غوں کی طرح (رُو رُو کر خدا کو) پکارو اور گوشہ نشین راہبوں کے تضرع وزاری کی طرح گڑگڑاؤ اور (اپنے) مال و اولاد سے علیحدہ ہو کر خدا کی طرف تقرب حاصل کرنے کے لیے نکل پڑو تا کہ اس کی درگاہ میں تمہارا کوئی درجہ بلند ہو یا کوئی ایسا گناہ بخش دیا جائے جس کو کاتبانِ اعمال نے لکھ لیا ہے اور فرشتوں نے محفوظ کر لیا ہے تو یہ تمام باتیں بہت کم ہوں گی بمقابلہ خدا کے اس ثواب کے جس کی مجھے تمہارے لیے امید ہے اور (بمقابلہ) اس عذاب خدا کے جس کا مجھے تمہارے بارے میں خوف ہے۔

بخدا اگر اس کے ثواب کی امید اور عذاب کے خوف سے تمہارے دل اچھی طرح گُھل جائیں اور تمہاری آنکھوں سے (بجائے اشک کے) خون جاری ہو جائے پھر تم رہتی دنیا تک یہاں چھوڑ دیے جاؤ جب بھی تمہارے اعمال اس کی ان بڑی بڑی نعمتوں کا جو تم کو دی ہیں اور اس (احسان) کا کہ تمہیں راہِ ہدایت دکھائی ہے کوئی عوض نہیں ادا کر سکتے خواہ تم اپنی کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھو۔

[وَ مِنْهَا] (مفتی صاحب خطبہ ۵۳)

فِيْ ذِكْرِ يَوْمِ النَّحْرِ

وَ مِنْ كَمَالِ الْاُضْحِيَّةِ اسْتِشْرَافُ اُذُنِهَا، وَ سَلَامَةُ عَيْنِهَا، فَاِذَا سَلِمَتِ الْاُذُنُ وَ الْعَيْنُ سَلِمَتِ الْاُضْحِيَّةُ وَ تَمَّتْ، وَ لَوْ كَانَتْ عَضْبَآءَ الْقَرْنِ تَجُرُّ رِجْلَهَا اِلَى الْمَنْسَكِ.

(قَالَ الشَّرِيْفُ): وَ قَالَ الرَّضِيُّ: وَ الْمَنْسَكُ هٰهُنَا الْمَذْبَحُ.

(مفتی صاحب خطبہ ۵۳) [حضرتؑ کے کلام کا ایک جملہ]

قربانی کے روز کے بیان میں۔ [1]

اور جانور قربانی کے کمال (اوصاف) سے اس کے کان کا دیکھ لینا [2] اور اس کی آنکھ کا درست ہونا (بھی) ہے کہ اگر کان اور آنکھ صحیح ہوں گے تو قربانی کا وہ جانور بھی درست اور با شرائط ہوگا اگرچہ اس کا سینگ ٹوٹا (اور اس کے پاؤں میں لنگ) ہو (جس سے) وہ اپنا پاؤں کھینچتا ہوا مقام ذبح تک پہنچے (کہ اس کا کوئی مضائقہ نہیں۔

(قول جناب سید رضی علیہ الرحمہ) اس خطبہ میں لفظ منسک سے مُراد مقام ذبح ہے۔

---

[1] قربانی کے متعلق اس امر کے لحاظ رکھنے کا حکم ہے کہ قربانی کے جانور میں ایسا کوئی عیب یا خرابی نہ ہو جس سے اس کی قیمت کم ہو بلکہ عمدہ قسم اور زیادہ قیمت کا جانور ہونا چاہیے۔ پس چونکہ کان کا کٹا ہونا یا آنکھ میں کانے وغیرہ قسم کا عیب ہونا یا لاغری وغیرہ جانور کا ایسا نقص ہے جس سے اس کی قیمت دوسرے صحیح جانوروں سے کم ہو جاتی ہے اس وجہ سے حضرتؑ نے ان اوصاف کی تصریح فرما کر کہا کہ ان امور سے قربانی کا جانور محفوظ ہوگا تو اس کی قربانی اعلیٰ درجہ کی ہوگی۔ ہاں ایک جملہ اس میں قابل غور ہے کہ فرمایا: ''وَ لَوْ كَانَتْ عَضْبَآءَ الْقَرْنِ تَجُرُّ رِجْلَهَا اِلَى الْمَنْسَكِ''، یعنی ''اگرچہ اس کا سینگ ٹوٹا ہو اور لنگڑا کر مقام ذبح تک جائے''۔ حالانکہ قربانی کے جانور میں کوئی عیب نہ ہونا چاہیے، تو حضرتؑ کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس جانور کے سینگ کا ظاہری حصہ ٹوٹا ہو اور خفیف لنگ پاؤں میں ہو تو اس کا کوئی مضائقہ نہیں۔ چنانچہ احادیث اور کتب فقہیہ میں قربانی کے جانور کی صفات میں بہ تصریح یہ مرقوم ہے کہ

اَنْ يَّكُوْنَ تَامًّا فَلَا تَجْزِى الْعَوْرَاءُ وَلَا الْعَرْجَاءُ الْبَيِّنُ عَرْجُهَا اِلَّا الَّتِي انْكَسَرَ قَرْنُهَا الدَّاخِلُ وَهُوَ الْاَبْيَضُ الَّذِيْ وَسَطَ الْخَارِجِ اَمَّا الْخَارِجُ فَلَا عِبْرَةَ بِهٖ۔

یعنی قربانی کے جانور کو صحیح، تندرست، بے عیب ہونا چاہیے۔ پس کانا نہ ہو اور لنگڑا نہ ہو، ایسا لنگڑا جس کا لنگڑا پن واضح اور صاف ہو (پس اگر خفیف لنگڑا پن ہو تو اس کا مضائقہ نہیں ہے) کہ اس کے اندر کا سینگ جو خارجی سینگ کے وسط میں ہوتا ہے ٹوٹا نہ ہو۔ رہا خارج کا سینگ تو اس کا لحاظ شرط نہیں ہے خواہ ٹوٹا ہو خواہ نہ ہو۔ (شرائع جواہر الکلام وغیرہ)

[2] لفظ ''اِسْتِشْرَافٌ'' کے معنی غور سے کسی چیز کو دیکھنا ہے اور بلندی بھی ہے۔ یہاں بھی دونوں معنوں کا احتمال ہے، دیکھ لینے میں یہ کہ کان کٹا نہ ہو اور بلندی سے بھی یہی کہ کٹا نہ ہوگا تو بلند اور سیدھا ہوگا۔

❁ خطبہ : ۵۴ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

فَتَدَاكُّوْا عَلَيَّ تَدَاكَّ الْاِبِلِ الْهِيْمِ يَوْمَ وِرْدِهَا، قَدْ اَرْسَلَهَا رَاعِيْهَا، وَ خُلِعَتْ مَثَانِيْهَا، حَتّٰى ظَنَنْتُ اَنَّهُمْ قَاتِلِيَّ، اَوْ بَعْضَهُمْ قَاتِلُ بَعْضٍ لَّدَيَّ، وَ قَدْ قَلَّبْتُ هٰذَا الْاَمْرَ بَطْنَهٗ وَ ظَهْرَهٗ، فَمَا وَجَدْتُّنِيْ يَسَعُنِيْۤ اِلَّاۤ قِتَالُهُمْ اَوِ الْجُحُوْدُ بِمَا جَآءَ بِهٖ مُحَمَّدٌ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، فَكَانَتْ مُعَالَجَةُ الْقِتَالِ

خطبہ (۵۴)

حضرت علیہ السلام کے ایک خطبہ کا کچھ حصّہ۔

پس مجھ پر یہ لوگ اس طرح ٹوٹ پڑے جس طرح پیاسے اونٹ جن کو چرواہے نے چھوڑ دیا ہو اور ان (کے پاؤں) کی بندھنیں [۱] کھول دی گئی ہوں، پانی پینے کے روز ایک دوسرے پر گر پڑتے ہیں جس سے مجھے گمان ہوا کہ کہیں یہ مجھے ہلاک نہ کر دیں یا میرے سامنے ایک دوسرے کو نہ مار ڈالیں (باوجود اس کے اب یہ مجھ سے باغی ہو گئے)۔ پس میں نے اس امر (یعنی ان سے جہاد کرنے) میں خوب غور و فکر کی (اور اس کے نفع و نقصان کو اچھی طرح سوچا) تو اپنے لیے اس کے سوائے کوئی چارہ کار نہیں دیکھا کہ ان سے لڑوں یا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لائے ہوئے (دین اسلام) سے منکر ہو جاؤں۔ [۲] تو ان سے لڑنے ہی

---

[۱] ''مَثَانِیْ'' جمع ہے مثناۃ کی جو اس رسّی یا ڈوری کو کہتے ہیں جس سے جانوروں کے دو دو پاؤں ملا کر باندھ دیتے ہیں تا کہ وہ چرتا بھی رہے اور کہیں بھاگنے بھی نہ پائے اور جب وہ اچھی طرح پیاسے ہو جاتے ہیں تو چرواہے ان کا پاؤں کھول کر چھوڑ دیتے ہیں اور وہ سب کوشش کرتے ہیں کہ پہلے خود ہی پانی پر پہنچ جائیں، اس وقت ایک جانور کے دوسرے پر ٹوٹنے اور گرے پڑنے کی جو حالت ہوتی ہے وہ ہجوم کرنے کی شدید ترین کیفیت ہوتی ہے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں کہ عثمان کے بعد میری بیعت کرنے کے لیے تو عامہ مسلمین کو ایسی خواہش ہوئی کہ ہر شخص سب سے پہلے ہی بیعت کر لینے کے لیے ٹوٹا پڑتا تھا، جس سے مجھے خوف ہوا کہ یا میں ہی اس میں پس کر رہ جاؤں گا یا ان لوگوں ہی سے کچھ لوگ ہلاک ہو جائیں گے۔ لیکن پھر کئی آدمیوں نے بغاوت پر کمر باندھ لی اور میرے مخالف ہو گئے۔

[۲] علامہ ابن ابی الحدید معتزلی نے اس خطبہ کی شرح میں لکھا ہے کہ ''جب امام کو اعوان و انصار مل جائیں تو اس پر واجب ہے کہ باغیوں سے جہاد کرے اور اگر اس میں وہ پہلو تہی کرے گا تو امر واجب کا تارک ہوگا جس پر عقاب کا ہونا ضروری ہے اور اگر کوئی پوچھے کہ حضرتؑ ان باغیوں سے جہاد ترک کر دیتے تو حضرت رسول خداؐ کی رسالت سے انکار کیوں کر ہوتا؟ تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ جو شخص بغاوت کو پھیلنے دے اور باغیوں سے لڑ کر ان کو دبائے نہیں اس کا نتیجہ یہی ہوگا کہ اسلام کمزور ہوتا جائے اور وہ اس کو پسند کرے، لہٰذا وہ خدا اور رسول کا مخالف ہوا''۔ چنانچہ حضرتؑ نے اس انکار کی وجہ کی طرف خود ہی آخر کلام میں اشارہ فرمایا ہے کہ دنیا میں بھی باغیوں سے لڑنا کچھ مصیبتوں اور پریشانیوں کا باعث ہوتا ہے لیکن ان کو اسی طرح چھوڑ دینے سے خدا غضبناک (بقیہ صفحہ مابعد)

اَهْوَنَ عَلَيَّ مِنْ مُّعَالَجَةِ الْعِقَابِ، وَ مَوْتَاتُ الدُّنْيَا اَهْوَنَ عَلَيَّ مِنْ مَّوْتَاتِ الْاٰخِرَةِ.

کی تدبیر مجھے آسان اور (آخرت کے) عذاب کی تدبیر سے بہتر معلوم ہوئی اور میرے نزدیک دنیا کی مصیبتیں آخرت کی (دائمی) عقوبتوں سے ہلکی ثابت ہوئیں۔

❁ خطبہ :۵۵ ❁

وَ مِنْ كَلَامٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

وَ قَدِ اسْتَبْطَاَ اَصْحَابُهٗ اِذْنَهٗ لَهُمْ فِي الْقِتَالِ بِصِفِّيْنَ:

خطبہ(۵۵)

حضرت علیہ السلام کے کلام کا کچھ حصّہ۔

جب مقام صفین میں آپؑ کے اصحاب کو (لشکر معاویہ سے) جنگ کرنے کی اجازت ملنے میں دیر ہوئی (اور ان لوگوں نے اعتراض کیا تو فرمایا) [1]

(بقیہ صفحہ ماقبل) ہوتا ہے اور آخرت میں سخت عذاب کرے گا جس کی اذیت دنیا کی مصیبتوں اور پریشانیوں سے کہیں زیادہ ہوگی اس لیے کہ آخرت کا عذاب دائمی ہوتا ہے۔

[1] علامہ ابن ابی الحدید اس خطبہ کی شرح میں لکھتے ہیں کہ معاویہ نے صفین میں پہلے پہنچ کر فرات پر قبضہ کرلیا اور حضرت امیر المومنینؑ کے لشکر کو پانی پینے سے روک دیا۔ جب حضرتؑ کے لشکر نے لڑ کر اس کو چھین لیا تو اپنی رحم دلی سے معاویہ والوں کو بھی اس سے پانی لینے دیا اور کسی قسم کا عوض نہ لینا چاہا اور پھر اس امید میں کہ کسی طرح اہل شام سمجھیں اور اپنی گمراہی کو پہچان کر توبہ کرلیں۔ عرصہ تک خاموش ٹھہرے رہے کہ نہ خود کوئی پیغام جنگ معاویہ کے یہاں بھیجتے تھے اور نہ معاویہ کے یہاں سے آپ کے پاس پیغام آتا تھا۔ جب اسی طرح کئی روز گزرے اور حضرتؑ کے ساتھ والے اہل عراق اس تاخیر سے گھبرانے لگے تو حضرتؑ کی خدمت میں عرض کی کہ یا امیر المومنینؑ ہم سب وطن میں اپنے اہل وعیال کو چھوڑ کر آئے ہیں اور ہمیں ان کے امور کی فکر پریشان کیے ہوئے ہے، پس آپ اجازت دیں کہ ان سے جنگ شروع کریں کیونکہ لوگ کہتے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ لوگ خاموش ہو گئے تو حضرتؑ نے دریافت کیا کہ لوگ کیا کہتے ہیں؟ تو ایک شخص بولا کہ بعض لوگ گمان کرتے ہیں کہ ''اِنَّكَ تَكْرَهُ كَرَاهِيَةَ الْمَوْتِ؟''۔ یعنی ''آپ موت کے خوف سے جنگ کرنے سے ڈرتے ہیں'' اور بعض لوگ گمان کرتے ہیں کہ آپ اس شک میں پڑے ہوئے ہیں کہ اہل شام سے جنگ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ تو حضرتؑ نے فرمایا میں کبھی بھی جنگ سے ڈرا ہوں؟ عجیب! جب میں بچہ اور کمسن تھا تب تو میں کفار ومخالفین خدا سے جنگ کرنے کا عاشق تھا اور کل عمر ختم ہو چکی میں بوڑھا ہو گیا اور مرنے کے قریب پہنچا تو اس سے ڈروں گا؟ اور یہ جو کہا کہ مجھے اہل شام سے جنگ کرنے کے بارے میں شک ہے تو اگر مجھے ان کے بارے میں شک ہو تو اہل بصر (یعنی جنگ جمل والوں) کے بارے میں بھی شک ہونا چاہیے تھا۔ خدا کی قسم میں نے اس امر کے ظاہر اور باطن کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا تو مجھے ان سے جنگ کرنے یا خدا اور رسولؐ کی نافرمانی کرنے کے سوا کوئی راہ نظر نہیں آئی لیکن میں صرف اس خیال سے اس کو وقت دیے جا رہا ہوں کہ شاید یہ غور وفکر کر کے سمجھیں اور یہ سب یا ان کے کچھ لوگ توبہ کر کے سیدھا راستہ اختیار کرلیں کیونکہ (بقیہ صفحہ مابعد)

اَمَّا قَوْلُكُمْ: اَكُلُّ ذٰلِكَ كَرَاهِيَةَ الْمَوْتِ؟ فَوَاللّٰهِ! مَآ اُبَالِيْ دَخَلْتُ اِلَى الْمَوْتِ اَوْ خَرَجَ الْمَوْتُ اِلَيَّ.

تمہارا یہ کہنا کہ کیا یہ سب (جنگ میں تاخیر) موت کی ناگواری سے ہے؟ (غلط ہے) کیونکہ خدا کی قسم مجھے (ذرّہ برابر بھی اس کی) پروانہیں ہے کہ میں موت (کے منہ) میں چلا گیا یا موت ہی مجھ پر آ پڑے۔

وَ اَمَّا قَوْلُكُمْ: شَكًّا فِيْ اَهْلِ الشَّامِ! فَوَاللّٰهِ! مَا دَفَعْتُ الْحَرْبَ يَوْمًا اِلَّا وَ اَنَا اَطْمَعُ اَنْ تَلْحَقَ بِيْ طَآئِفَةٌ فَتَهْتَدِيَ بِيْ، وَ تَعْشُوَ اِلٰى ضَوْئِيْ، وَ ذٰلِكَ اَحَبُّ اِلَيَّ مِنْ اَنْ اَقْتُلَهَا عَلٰى ضَلَالِهَا، وَ اِنْ كَانَتْ تَبُوْٓءُ بِاٰثَامِهَا.

اور تمہارا یہ قول (بھی خیال خام ہے) کہ (مجھے) اہل شام (سے جنگ کرنے) میں شک ہے کیونکہ بخدا میں نے کسی روز بھی جنگ کو نہ ٹالا مگر اس امید میں کہ (شاید ان کی) کوئی جماعت مجھ سے آ کر مل جائے اور میری وجہ سے ہدایت پالے اور میری روشنی سے فیض یاب ہو۔ اور یہ مجھے اس سے زیادہ محبوب ہے کہ اس (گروہ) کو اسی گمراہی (کی حالت) میں قتل کردوں اگرچہ وہ (اس حالت میں قتل ہوں گے تو) اپنے ہی گناہوں کو سمیٹ کر جائیں گے۔[1]

❁ خطبہ :۵۶ ❁

وَ مِنْ كَلَامٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

خطبہ (۵۶)

حضرت علیہ السلام کے ایک کلام کا کچھ حصّہ۔[2]

(بقیہ صفحہ ماقبل)

فَاِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ اٰلِهٖ وَسَلَّمَ قَالَ لِيْ يَوْمَ خَيْبَرٍ لِاَنْ يَّهْدِيَ اللّٰهُ بِكَ رَجُلًا وَاحِدًا خَيْرٌ لَّكَ مِمَّا طَلَعَتْ عَلَيْهِ الشَّمْسُ۔

یعنی مجھ سے حضرت رسول خداؐ نے جنگ خیبر میں فرمایا تھا کہ اے علی اگر تمہارے ذریعہ سے ایک شخص کی بھی ہدایت ہو جائے تو وہ تمہارے لیے ہر اس چیز سے بہتر ہے جس پر آفتاب کی روشنی پڑتی ہے۔

(یعنی تمام عالم سے) لہٰذا اس غرض سے تاخیر کر رہا ہوں کہ شاید کوئی ہدایت پائے اور راہ حق پر آ جائے۔

[1] یعنی اگر میں ان لوگوں سے جنگ شروع کردوں اور ان کو قتل کروں تو وہ اسی کے مستحق ہیں کیونکہ میں نے کوئی امر ایسا نہیں کیا جس سے ان کو میری مخالفت جائز ہو۔ پس اگر وہ قتل ہوں گے تو اپنے ہی گناہوں یعنی مجھ سے مخالفت اور بغاوت کے عقاب کا بوجھ لے کر اس دنیا سے جائیں گے۔

[2] علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ

هٰذَا الْكَلَامُ قَالَهٗ اَمِيْرُالْمُؤْمِنِيْنَ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِيْ قِصَّةِ ابْنِ الْحَضْرَمِيِّ حَيْثُ قَدِمَ الْبَصْرَةَ مِنْ قِبَلِ مُعَاوِيَةَ وَ (بقیہ صفحہ مابعد)

(بقیہ صفحہ ماقبل)

اسْتَنْهَضَ اَمِيْرُالْمُؤْمِنِيْنَ عَلَيْهِ السَّلَامُ اَصْحَابَهٗ اِلَى الْبَصْرَةِ فَتَقَاعَدُوْا۔

یعنی اس کلام کو حضرت امیر المومنینؑ نے ابن الحضرمی کے قصہ کے متعلق ارشاد فرمایا تھا۔ جب وہ معاویہ کے پاس سے بصرہ میں آیا اور جناب امیر المومنینؑ نے اپنے اصحاب کو بصرہ کی طرف کوچ کرنے کی ترغیب دی مگر وہ سب پہلو تہی کرتے رہے۔

یہ واقعہ ۳۸ھ کا ہے جب محمد بن ابی بکر کے مارے جانے اور مصر پر عمرو بن عاص کا قبضہ ہو جانے کے بعد معاویہ نے عبداللہ بن حضرمی کو بصرہ کی طرف اس امید میں بھیجا کہ علیؑ جنگ جمل میں بصرہ والوں کو قتل کر چکے ہیں، ان کی اولاد و اعزا ہماری طرف آجائیں گے۔ اس وقت عبداللہ بن عباس جو بصرہ کے گورنر تھے محمد بن ابی بکر کی تعزیت کے لیے کوفہ حضرت امیر المومنینؑ کے پاس گئے ہوئے تھے اور آپ کا نائب بصرہ میں زیاد بن عبید تھا (یہ وہی زیاد ہے جس کو معاویہ نے بعد شہادت امیر المومنینؑ اپنے باپ کا لڑکا بنا کر اپنی طرف کر لیا اور اس سے شیعوں پر بے حد مظالم کرائے اور جو بعد میں زیاد بن ابی سفیان اور زیاد بن ابیہ کے نام سے ذکر کیا جاتا ہے۔ اس وقت تک اس کو زیاد بن عبید کہتے تھے۔ ابن ابی الحدید جلد اول صفحہ ۳۵۱) بصرہ میں عبداللہ بن حضرمی دفعۃً آ پہنچا۔ یہاں کے اکثر آدمی جو طرفدار ان عثمان سے تھے اس سے آملے۔ عبداللہ نے ان کو معاویہ کا خط سنایا جس میں قصاصِ عثمان لینے کی تحریک اور بالعوض جاگیرات کے دو چند کرنے کا وعدہ تھا۔ بصرہ کے اور لوگ بھی عبداللہ کے ورغلانے سے زیاد کے ساتھ سرکشی کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ زیاد مقابلہ نہ کر سکا اور عبداللہ حضرمی نے بصرہ پر قبضہ کر لیا۔ جناب امیرؑ کو یہ خبر پہنچی تو کوفہ میں بنی تمیم کو بصرہ جانے پر ابھارا، مگر کسی نے منظور نہ کیا پس آپ نے ان کو خطبہ دیا اور فرمایا:

لَيْسَ مِنَ الْعَجَبِ اَنْ يَّنْصُرَنِيْ الْاَزْدُ وَتَخْذُلَنِيْ مُضَرُ. وَاَعْجَبُ مِنْ ذٰلِكَ تَقَاعُدُ تَمِيْمِ الْكُوْفَةِ بِيْ، وَخِلَافُ تَمِيْمِ الْبَصْرَةِ عَلَيَّ. وَاَنْ اَسْتَنْجِدَ بِطَائِفَةٍ مِّنْهَا مَا تُشْخِصُ اِلٰى اَخْوَانِهَا فَيَدْعُوْهُمْ اِلَى الرَّشَادِ، فَاِنْ اَجَابَتْ وَاِلَّا فَالْمُنَابَذَةُ وَالْحَرْبُ. فَكَاَنِّيْ اُخَاطِبُ صُمًّا بُكْمًا لَا يَفْقَهُوْنَ حِوَارًا، وَلَا يُجِيْبُوْنَ نِدَاءً، كُلُّ هٰذَا جُبْنًا عَنِ الْبَأْسِ وَحُبًّا لِلْحَيٰوةِ. لَقَدْ كُنَّا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم الخ۔

یعنی کیا یہ امر تعجب خیز نہیں ہے کہ قبیلہ ازد کے لوگ تو میری مدد کریں اور قبیلہ مضر کے لوگ میرا ساتھ چھوڑ دیں اور اس سے زیادہ حیرت انگیز یہ ہے کہ کوفہ کے بنی تمیم تو میرے ساتھ پہلو تہی کرتے ہیں اور بصرہ کے بنی تمیم میرے مخالف ہو رہے ہیں اور اگر میں ان لوگوں سے کسی جماعت کو بلا کر کہتا ہوں کہ اپنے (دینی) بھائیوں کی طرف جا کر ان کی ہدایت کریں اور صحیح راستہ بتائیں جسے وہ مانیں تو خیر اور نہ مانیں تو بدرجہ مجبوری جنگ کریں۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ میں گویا گونگے بہرے سے خطاب کرتا ہوں جو نہ تو کوئی بات سمجھتے ہیں اور نہ کسی آواز کا جواب دیتے ہیں۔ ان سب کا باعث جہاد سے بزدلی اور چند روزہ زندگی کی محبت ہے۔ (ان کی لڑنے میں یہ کیفیت ہو رہی ہے اور اس کے قبل ہم لوگوں کی یہ حالت تھی کہ) البتہ ہم حضرت رسول خداؐ کے ساتھ اپنے (کافر) بزرگوں، لڑکوں، بھائیوں اور چچاؤں کو قتل کرتے رہے الخ۔

علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ ''ان حضرات کا خدا کی راہ میں اپنے اعزا و اقربا کو قتل کرنا بہت کثرت سے ہوا (بقیہ صفحہ مابعد)

وَ لَقَدْ كُنَّا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، نَقْتُلُ اٰبَآئَنَا وَ اَبْنَآئَنَا وَ اِخْوَانَنَا وَ اَعْمَامَنَا، مَا يَزِيْدُنَا ذٰلِكَ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّ تَسْلِيْمًا، وَ مُضِيًّا عَلَى اللَّقَمِ، وَ صَبْرًا عَلٰى مَضَضِ الْاَلَمِ، وَ جِدًّا فِيْ جِهَادِ الْعَدُوِّ، وَ لَقَدْ كَانَ الرَّجُلُ مِنَّا وَ الْاٰخَرُ مِنْ عَدُوِّنَا يَتَصَاوَلَانِ تَصَاوُلَ الْفَحْلَيْنِ، يَتَخَالَسَانِ اَنْفُسَهُمَا: اَيُّهُمَا يَسْقِيْ صَاحِبَهٗ كَاْسَ الْمَنُوْنِ، فَمَرَّةً لَّنَا مِنْ عَدُوِّنَا، وَ مَرَّةً لِّعَدُوِّنَا مِنَّا، فَلَمَّا رَاَى اللّٰهُ صِدْقَنَا اَنْزَلَ بِعَدُوِّنَا الْكَبْتَ، وَ اَنْزَلَ عَلَيْنَا النَّصْرَ، حَتّٰى اسْتَقَرَّ الْاِسْلَامُ مُلْقِيًا جِرَانَهٗ وَ مُتَبَوِّئًا اَوْطَانَهٗ، وَ

اور البتہ ہم حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ اپنے (کافر) بزرگوں، لڑکوں، بھائیوں اور چچاؤں کو قتل کرتے رہے ہیں جو ہمارے ایمان، تسلیم و (رضا)، راہِ راست پر چلے چلنے، شدت (واذیت) الم پر صبر کرتے رہنے اور دشمن سے لڑنے میں جدوجہد کرتے رہنے کو (اور بھی) بڑھاتا رہا اور (اس وقت ہم میں اور کافروں میں ایسی شدید عداوت تھی کہ) کوئی شخص ہم میں سے اور کوئی ہمارے دشمن سے ایک دوسرے پر اس طرح حملہ کرتے تھے جس طرح دو (غضبناک) نر جانور ایک دوسرے پر حملہ کرتے ہیں۔ ہر ایک دوسرے کی جان نکال لینا چاہتا تھا کہ (دیکھیں) دونوں (لڑنے والوں) سے کون (شخص) اپنے مدمقابل کو موت کا جام پلا دیتا ہے۔ تو کبھی ہمیں اپنے دشمن پر اور کبھی ہمارے دشمن کو ہم پر (غلبہ) ہوتا رہا۔ پھر جب خدا نے ہمارے صدق (نیت) کو دیکھ لیا تو ہمارے دشمن پر (شکست کی) ذلت اور ہم پر (اپنی فتح و) نصرت نازل فرمائی یہاں تک اسلام (دنیا میں) اپنا سینہ ٹیک کر اور اپنے گھروں (یعنی مومنین کے دلوں) میں جم کر مستحکم ہو گیا

(بقیہ صفحہ مابعد) ہے۔ چنانچہ حضرت علیؑ نے جنگ بدر و اُحد میں بنی عبد مناف اور بنی عبدالدار کے جم غفیر کو قتل کیا جو یا حضرتؑ کے اپنے اعزا (خاندان عبد مناف) سے تھے۔ یا آپ کے بنی اعمام (یعنی خاندان عبدالدار) سے۔ اور جناب حمزہ بن عبدالمطلب نے جنگ بدر میں شیبہ بن ربیعہ کو قتل کیا جو ان کا ابن عام تھا کیونکہ دونوں عبد مناف کی نسل سے تھے اور اسی طرح بہت سی مثالیں ہیں جو تاریخ و سیرت کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ رہا حضرتؑ کا اور حضرتؑ کے دشمن سے کسی ایک کا دوسرے کی ہلاکت میں کوشش کرنا تو اس کے واقعات بھی بکثرت ہیں۔ چنانچہ حضرت امیر المومنینؑ نے ولید بن عتبہ، طلحہ بن ابی طلحہ اور عمرو بن عبدود ایسے نامی بہادروں سے مقابلہ کیا اور ایسے ہمسروں کو قتل کیا اور ان کے علاوہ بھی بہت سے دلیران عرب سے لڑے اور انہیں ہلاک کیا۔ چنانچہ غزوات کی کتابیں ان مضامین سے بھری پڑی ہیں''۔ شرح نہج البلاغہ مطبوعہ ایران جلد اول صفحہ ۱۹۵)

لَعَمْرِیْ! لَوْ کُنَّا نَاْتِیْ مَآ اَتَیْتُمْ، مَا قَامَ لِلدِّیْنِ عَمُوْدٌ، وَ لَا اخْضَرَّ لِلْاِیْمَانِ عُوْدٌ. وَ اَیْمُ اللّٰهِ لَتَحْتَلِبُنَّهَا دَمًا، وَ لَتُتْبِعُنَّهَا نَدَمًا!.

اور میری زندگی کی قسم اگر ہم (بھی) اسی طرح (سُستی اور بزدلی سے اسلام میں) داخل ہوتے جس طرح تم آئے ہوتو نہ دین (اسلام) کا کوئی پایہ کھڑا ہوتا اور نہ ایمان کی کوئی شاخ سرسبز وشاداب ہوسکتی۔ اور خدا کی قسم تم لوگ (اپنی موجودہ روش سے) ان (سب) کا خون ہی دوہ لیتے اور پھر ان کے پیچھے ندامت اُٹھاتے رہتے۔[1]

❁ خطبہ :۵۷ ❁

وَ مِنْ کَلَامٍ لَّهٗ عَلَیْهِ السَّلَامُ لِاَصْحَابِهٖ:

اَمَا اِنَّهٗ سَیَظْهَرُ عَلَیْکُمْ بَعْدِیْ رَجُلٌ رَّحْبُ الْبُلْعُوْمِ، مُنْدَحِقُ الْبَطْنِ، یَاْکُلُ مَا یَجِدُ، وَ یَطْلُبُ مَا لَا یَجِدُ، فَاقْتُلُوْهُ، لَنْ تَقْتُلُوْهُ! اَلَا وَ اِنَّهٗ سَیَاْمُرُکُمْ بِسَبِّیْ وَ الْبَرَآئَةِ

خطبہ (۵۷)

حضرت علیہ السلام کے ایک خطبہ کا کچھ حصّہ۔ (جسے) اپنے اصحاب سے (فرمایا)

دیکھو یہ یقین امر ہے کہ میرے بعد جلد ہی تم پر بہت کشادہ حلقوم اور خوب نکلی ہوئی توند والا شخص (یعنی معاویہ) فتحیاب ہوجائے گا۔ وہ جو چیز پاتا ہے کھا جاتا ہے اور جو نہیں پاتا ہے اسے بھی مانگتا رہتا ہے۔[2] تو تم سب اسے قتل کر ڈالنا اگرچہ (مجھے یہ بھی یقین ہے کہ) تم اسے کبھی قتل نہ کر سکو گے۔ دیکھو وہ عنقریب تم کو مجھے گالی دینے[3] اور مجھ

---

[1] حضرتؑ کے اس خطبہ پر اعین بن صعبعہ کچھ فوج لے کر بصرہ گئے اور ابن الحضرمی کو شکست دے دی تھی مگر شب کو دس خارجیوں نے دھوکے سے انہیں قتل کر دیا۔ پھر حضرتؑ نے جاریۃ بن قدامہ کو بھیجا انہوں نے بصرہ پہنچ کر معاویہ کے سردار اور لشکر کو شکست فاش دی اور سب کو تباہ و برباد کر دیا۔ (شرح ابن ابی الحدید جلد اول صفحہ ۱۹۹)

[2] معاویہ کا بے حد کھانا متواترات سے ہے۔ خود رسول اللہؐ نے جب کئی مرتبہ اس کو بلایا اور وہ کھانے ہی میں مشغول رہا تو فرمایا ''اَللّٰهُمَّ لَا تَشْبَعْ بَطْنَهٗ'' یعنی ''اے خدا اس کا پیٹ کبھی نہ بھرنا''۔ (تفصیل ضمیمہ میں آئے گی)

[3] معاویہ بلکہ عمرو بن عبدالعزیز تک تمام بنی امیہ کا جناب امیرؑ پر لعنت کرتے رہنا مشہور تاریخی واقعہ ہے۔ تاریخ کامل جلد ۳ صفحہ ۱۳۳ میں ہے:

اِنَّ مُعَاوِیَةَ کَانَ اِذَا قَنَتَ سَبَّ عَلِیًّا وَابْنَ عَبَّاسٍ وَالْحَسَنَ وَالْحُسَیْنَ وَاَشْتَرَ۔

یعنی معاویہ ہر قنوت کے بعد حضرت علیؑ و ابن عباس امام حسنؑ و امام حسینؑ کو گالی دیتا۔

(بقیہ صفحہ مابعد)

مِنِّیْ، فَاَمَّا السَّبُّ فَسُبُّوْنِیْ، فَاِنَّهٗ لِیْ زَكَاةٌ، وَ لَكُمْ نَجَاةٌ، وَ اَمَّا الْبَرَآئَةُ فَلَا تَتَبَرَّاُوْا مِنِّیْ، فَاِنِّیْ وُلِدْتُّ عَلَى الْفِطْرَةِ، وَ سَبَقْتُ

سے تبرا کرنے کا حکم دے گا۔[1] خیر گالی تو (تقیہ کر کے) مجھے دے لینا کہ یہ میرے لیے زکوۃ (پاکیزگی) اور تمہارے لیے نجات (کی باعث) ہوگی۔ رہا تبرا تو (خبردار) مجھ سے برائت (یعنی بیزاری) کبھی نہ چاہنا۔[2] اس لیے کہ میں (تمہارا ایسا امام ہوں کہ) فطرت (اسلام ہی) پر پیدا ہوا۔[3] اور اظہار ایمان نیز

(بقیہ صفحہ ماقبل) اور تحفہ اثنا عشریہ صفحہ ۱۴۸ و صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۲۷۸ و جامع ترمذی صفحہ ۶۱۷ وغیرہ میں ہے کہ معاویہ خطبۂ جمعہ میں جناب امیرؑ پر لعنت کرتا تھا اور یہ بدعت خلافت عمر بن عبدالعزیز تک جاری رہی (تفصیل ضمیمہ میں آئے گی)۔

[1] معاویہ لوگوں سے اس کی بیعت بھی لیتا تھا کہ وہ لوگ حضرت علیؑ سے بری ہیں۔ عقد فرید جلد اول صفحہ ۱۹ میں ہے:

قَعَدَ مُعَاوِيَةُ بِالْكُوفَةِ يُبَايِعُ النَّاسَ عَلَى الْبَرَاءَةِ مِنْ عَلِيٍّ۔

کہ معاویہ کوفہ میں بیٹھ کر حضرت علیؑ سے برائت کرنے پر لوگوں کی بیعت لیتا تھا۔

بلکہ حد ہوگئی کہ آخر میں معاویہ نے فرمان جاری کیا کہ جس شخص کی نسبت معلوم ہو جائے کہ وہ شیعہ علیؑ ہے اس کا نام دیوان سے کاٹ دو اور وظیفہ بند کر دو۔ اگر کوئی شخص کسی پر تہمت بھی لگائے کہ یہ شیعہ ہے تو اس پر عذاب کرو، اس کا گھر گرا دو۔ یہاں تک کہ بنی امیہ نے معاویہ سے کہا: اے امیر تم اپنی آرزوؤں پر فائز ہو چکے اب اس شخص (جناب امیرؑ) سے باز آتے تو اچھا تھا، معاویہ نے کہا ''لَا وَاللّٰہ'' جب تک اس طریقہ پر بچے بڑے اور بڑے بوڑھے نہ ہو جائیں کہ پھر کوئی فضیلت علیؑ کا ذکر کرنے والا باقی نہ رہے۔ (نصائح کافیہ، ص ۷۰)

[2] بظاہر یہ تعجب خیز معلوم ہوتا ہے کہ حضرتؑ نے مومنین کو سَبّ کرنے کی تو اجازت دی مگر برائت چاہنے سے منع کیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ سَبّ کرنا یعنی گالی دینا زبان سے ہوتا ہے اور برائت چاہنا دل سے متعلق ہے تو حالت تقیہ میں زبان سے کسی بات کو کہہ دینا جائز ہے مگر دل سے اس کا ماننا جائز نہیں۔ پس حضرتؑ کا مطلب یہ ہے کہ جب تم کو معاویہ مجبور کرے تو زبان سے مجھے بُرا کہہ لینا کہ اس سے تم ہلاکت اور مصائب سے بچ جاؤ گے مگر دل سے میری ولایت کا اعتقاد نہ نکالنا کیونکہ بغیر اس کے کوئی شخص مومن نہیں رہ سکتا اور یہ جو فرمایا ''فَاِنَّهٗ لِیْ زَكَاةٌ'' کہ تقیہ سے تمہارا مجھے سَبّ کرنا میری زکوۃ ہوگا تو یہ اس لیے کہ حدیث میں آیا ہے:

ذِكْرُ الْمُؤْمِنِ بِسُوْءٍ هُوَ زَكٰوةٌ لَهٗ وَ ذَمُّهٗ بِمَا لَيْسَ فِيْهِ زِيَادَةٌ فِيْ حِسَابِهٖ۔

یعنی کسی مومن کے واقعی عیب ذکر کرنے سے اس کی پاکیزگی ہو جاتی ہے اور جو عیب اس میں نہ ہو اس کا اتہام لگانے سے اس کی بزرگی اور درجہ میں زیادتی ہو جاتی ہے۔

[3] ''وُلِدْتُّ عَلَى الْفِطْرَةِ'' سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرتؑ کے والدین یعنی جناب ابوطالب اور فاطمہ بنت اسد دین اسلام پر ابتدا سے تھے اور حضرتؑ نے پیدا ہو کر ایماندار ہی ماں کی گود پائی اور ایماندار ہی باپ کا چہرہ دیکھا۔

اِلَی الْاِیْمَانِ وَ الْھِجْرَۃِ. ہجرت کرنے میں (سب پر) سبقت (بھی) کی ہے۔[1]

❁ خطبہ :۵۸ ❁

وَ مِنْ کَلَامٍ لَّہٗ عَلَیْہِ السَّلَامُ

کَلَّمَ بِہِ الْخَوَارِجَ۔

اَصَابَکُمْ حَاصِبٌ، وَ لَا بَقِیَ مِنْکُمْ اٰبِرٌ، اَبَعْدَ اِیْمَانِیْ بِاللّٰہِ وَ جِھَادِیْ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اَشْھَدُ عَلٰی نَفْسِیْ بِالْکُفْرِ! لَقَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّ مَآ اَنَا مِنَ الْمُھْتَدِیْنَ! فَاُوْبُوْا شَرَّ مَاٰبٍ، وَ ارْجِعُوْا عَلٰٓی اَثَرِ الْاَعْقَابِ. اَمَا اِنَّکُمْ سَتَلْقَوْنَ بَعْدِیْ ذُلًّا شَامِلًا، وَ سَیْفًا قَاطِعًا، وَ اَثَرَۃً

خطبہ (۵۸)

حضرت علیہ السلام کے ایک کلام کا کچھ حصّہ۔

جسے خوارج سے (گفتگو کرتے وقت) فرمایا:

تم پر پتھراؤ کرنے والی آندھی کی مصیبت پڑے[2] اور تم میں سے کوئی کارساز باقی نہ رہے۔ کیا میں خدا پر ایمان لانے اور (حضرت) رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ (اتنے) جہاد کرنے کے بعد (اب) اپنے نفس پر کافر ہو جانے کی گواہی دینے لگوں؟'' پھر تو میں یقیناً گمراہ ہوں اور ہدایت پانے والوں سے نہ ہوں''۔ تو (اے کمبختو! اپنی) بدترین بازگشت کی طرف لوٹ جاؤ اور پچھلے پاؤں کے نشان پر پلٹ جاؤ (اور) یاد رکھنا کہ تم سب میرے بعد بہت جلد ہر طرح کی دائمی ذلّت، شمشیر بُرّاں (کی مار) اور جابرانہ حکومت کی (اس مصیبت و) سختی میں مبتلا ہو گے جسے

---

[1] حضرتؑ کا سب سے پہلے اسلام لانا بھی متواترات سے ہے۔ علامہ ابن عبدالبر استیعاب میں لکھتے ہیں:

''اِنَّ عَلِیَّ ابْنَ اَبِیْ طَالِبٍ اَوَّلُ مَنْ اَسْلَمَ۔

کہ حضرت علیؑ سب سے پہلے اسلام لائے۔

اور مشہور و معتمد علیہ مؤرخ علامہ ابن اسحاق لکھتا ہے کہ

اَوَّلُ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَ بِمُحَمَّدٍ رَّسُوْلِ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عَلِیُّ ابْنُ اَبِیْ طَالِبٍ۔

کہ یعنی سب سے پہلے خدا اور محمد رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جو ایمان لایا وہ علی ابن ابی طالبؑ ہیں۔ (تفصیل ضمیمہ میں آئے گی)۔

[2] اس کلام ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرتؑ ان خوارج کے بے وجہ گمراہ ہونے سے کس درجہ متأثر تھے اور ان سے لڑنا پسند نہیں کرتے تھے۔ متعدد آدمیوں کو بھیج کر سمجھایا، خود وہاں پہنچ کر ان کو دھمکایا، ان کی رائے کی غلطی ظاہر کی اور جب تک خارجیوں نے ابتدا نہیں کی حضرتؑ نے لڑائی نہیں کی۔

يَتَّخِذُهَا الظَّالِمُوْنَ فِيْكُمْ سُنَّةً.

ظالمین تمہارے حق میں (مستقل) دستور بنالیں گے۔[1]

قَوْلُهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ: ''وَ لَا بَقِيَ مِنْكُمْ اِبِرٌ'' يُرْوٰى بِالْبَآءِ وَ الرَّآءِ مِنْ قَوْلِهِمْ: رَجُلٌ ''اِبِرٌ'' لِلَّذِيْ يَأْبِرُ النَّخْلَ اَيْ يُصْلِحُهٗ. وَ يُرْوٰى ''اِثِرٌ'' وَ هُوَ الَّذِيْ يَأْثِرُ الْحَدِيْثَ اَيْ يَرْوِيْهِ وَ يَحْكِيْهِ وَ هُوَ اَصَحُّ الْوُجُوْهِ عِنْدِيْ، كَاَنَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالَ:

(جناب سید رضی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں) حضرت علیہ السلام کا قول ''وَ لَا بَقِيَ مِنْكُمْ اِبِرٌ'' (ایک طرح) بؔ اور رؔ سے روایت کیا جاتا ہے جو ان (عربوں) کے اس قول سے ماخوذ ہے جو درختِ خرما کے جوڑ لگانے یعنی اس کے درست کرنے والے کے لیے بولتے ہیں اور (دوسری طرح) اِثِرٌ (ثؔ ورؔ سے) بھی روایت کیا جاتا ہے اور یہ وہ شخص ہے جو حدیث نقل کرتا یعنی اسے روایت اور ذکر کرتا ہے

---

[1] علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں ''فرقہ خوارج کے لوگ وہ ہیں جو واقعہ تحکیم سے پہلے جنگ جمل وصفین وغیرہ میں حضرت امیر المومنینؑ کے ساتھ تھے۔ جب معاویہ کا فریب جنگ صفین میں کارگر ہو گیا تو یہ لوگ گمراہ ہو گئے۔ حضرتؑ کا یہ کلام انہیں سے ہے اور انہیں کی آئندہ حالت کو اس میں ذکر کیا ہے اور جیسا کہ حضرتؑ نے فرمایا ہے ایسا ہی واقعہ بھی ہوا ہے۔ کیونکہ حضرت امیر المومنینؑ کی شہادت کے بعد خدا نے خوارج پر دائمی ذلت اور سیف برا اور بادشاہوں کا ظلم وجور مسلّط کر دیا جس سے ان کی حالت برابر مضمحل اور سست ہوتی رہی یہاں تک کہ خدا نے ان کو بالکل تباہ اور ان کے جمہور کو فنا کر دیا۔ خصوصاً حجاج بن یوسف ثقفی، مہلب بن ابی صفرہ اور اس کی اولاد وغیرہ تو ان کے لیے زہر قاتل ثابت ہوئے''۔ اس کے بعد علامہ ابن ابی الحدید نے خوارج کی مفصل تاریخ ذکر کی ہے کہ کس زمانے میں کس کس طرح وہ مٹائے گئے۔ (جلد اول صفحہ ۲۱۴)

غرض امیر المومنین نے جس قوم یا ملک یا شخص کے متعلق جو پیشین گوئی فرمادی ویسی ہی واقع ہوئی۔ ان خوارج کے متعلق جناب رسالت مآبؐ نے بھی بعض حدیثیں ارشاد فرمائی ہیں۔ چنانچہ ابن مردویہ نے اپنی ''مناقب'' میں اور اخطب خوارزم نے اپنی ''مناقب'' میں باسانید مختلفہ اور نیز سبط ابن الجوزی نے اپنی کتاب ''تذکرہ خواص الامہ'' میں اور نیز جامعین صحاح ستہ نے یہ لکھا ہے کہ جب مسروق جنگ نہروان سے بہ ہمرائی علی مرتضیٰ مدینہ واپس آیا اور عائشہ سے دریافت کیا کہ آپ نے آنحضرتؐ سے خوارج کے متعلق کچھ سنا ہے تو کہا:

اِنِّيْ سَمِعْتُ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّهُمْ اَشْرَارُ اُمَّتِيْ يَقْتُلُهُمْ اَخْيَارُ اُمَّتِيْ۔

یعنی میں نے حضرت رسول خداؐ سے سنا کہ فرماتے تھے خوارج میری امت کے بدترین لوگ ہیں جنہیں میری امت کے بہترین لوگ قتل کریں گے۔

(چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جناب امیرؑ نے ان کو قتل کیا) اور جناب عائشہ نے رسول خداؐ کو یہ فرماتے سنا کہ خدا نے مجھ سے عہد کیا کہ جو شخص علیؑ پر خروج کرے گا وہ کافر اور جہنمی ہے، عائشہ کہتی ہیں کہ میں اس حدیث کو بروز جنگ جمل بھول گئی تھی بصرہ میں یاد آئی تو اب خدا سے توبہ کرتی ہوں۔ (مودۃ القربیٰ السید علی الہمدانی)

''لَابَقِیَ مِنْکُمْ مُخْبِرٌ'' وَ یُرْوٰی ''اٰبِزٌ'' بِالزَّایِ الْمُعْجَمَةِ وَ هُوَ الْوَاثِبُ، وَ الْهَالِكُ اَیْضًا یُقَالُ لَهٗ ''اٰبِزٌ''.

اور یہی میرے نزدیک صحیح ترین صورت ہے۔ گویا حضرت علیہ السلام نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی خبر دینے والا باقی نہ رہے اور (تیسری طرح) اٰبِزٌ زائے منقوطہ سے (بھی) روایت کیا جاتا ہے جس کے معنی کودنے والا ہے اور ہلاک ہونے والے کو بھی ''اٰبِزٌ'' کہتے ہیں۔

خطبہ :۵۹

قَالَ عَلَیْهِ السَّلَامُ لَمَّا عَزَمَ عَلٰی حَرْبِ الْخَوَارِجِ وَ قِیْلَ لَهٗ: اِنَّهُمْ قَدْ عَبَرُوْا جِسْرَ النَّهْرَوَانِ:

خطبہ (۵۹)

حضرتؑ نے فرمایا:

جب حضرت علیہ السلام نے خارجیوں سے لڑنے کا ارادہ کیا۔[1] اور آپؑ سے (یہ خبر) ذکر کی گئی کہ خوارج نہروان کا پُل پار ہو گئے تو

---

[1] علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں ''جناب امیرؑ کی خوارج کے متعلق یہ پیشین گوئی ان پیشین گوئیوں سے ہے جو حد تواتر کے قریب پہنچ گئی ہیں کیونکہ یہ بہت مشہور ہے اور تمام لوگ اس کو ذکر کرتے آئے ہیں اور یہ حضرتؑ کے ایسے معجزات اور ان اخبار غیب سے ہے جن میں ذرا بھی اجمال یا شبہ نہیں ہے کیونکہ حضرتؑ نے تو اس میں ہلاک ہونے والے اور بچنے والوں کی تعداد بھی معین کر دی ہے اور خاتمہ جنگ کے بعد یہی تعداد درست نکلی نہ ایک کی کمی ہوئی نہ زیادتی اور یہ وہ علم غیب ہے جو حضرتؑ کو رسول خداؐ سے حاصل ہوا اور جناب رسول خداؐ کو خداوند عالم سے اور انسانی قوت ایسے علوم کے جاننے سے عاجز ہے اور حضرتؑ کو ان علوم غیبیہ میں وہ درجہ حاصل ہوا جو اور کسی کو نہیں ملا اور انہیں معجزات اور غیب کی باتوں سے لوگ حضرتؑ کے بارے میں غلو کرنے لگے۔ یہاں تک کہ بعض لوگوں نے خیال کیا کہ خداوند عالم حضرت علیؑ میں حلول کر گیا ہے جیسا کہ نصاریٰ حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں اعتقاد کرتے ہیں۔

چنانچہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اس کو فرمایا تھا کہ '' یَهْلِكُ فِیْكَ رَجُلَانِ مُحِبٌّ غَالٍ وَ مُبْغِضٌ قَالٍ'' اے علیؑ تمہارے بارے میں دو جماعتیں ہلاک ہو جائیں گی ایک وہ جو غلو کر کے تم کو خدا کہنے لگے گی دوسری وہ جو تم کو دشمن رکھے گی۔ دوسرے موقع پر فرمایا:

وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ، لَوْلَا اَنِّیْ اَشْفَقُ اَنْ یَقُوْلَ طَوَائِفُ مِنْ اُمَّتِیْ فِیْكَ مَا قَالَتِ النَّصَارٰی فِی ابْنِ مَرْیَمَ، لَقُلْتُ الْیَوْمَ فِیْكَ مَقَالًا لَا یَمُرُّ بِمَلَاٍ مِّنَ النَّاسِ اِلَّا اَخَذُوْا التُّرَابَ مِنْ تَحْتِ قَدَمَیْكَ لِلْبَرَكَةِ۔

قسم اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ میری امت کے لوگ تمہارے

(بقیہ صفحہ مابعد)

مَصَارِعُهُمْ دُوْنَ النُّطْفَةِ، وَاللّٰهِ! لَا يُفْلِتُ مِنْهُمْ عَشَرَةٌ، وَ لَا يَهْلِكُ مِنْكُمْ عَشَرَةٌ.

(قَالَ الشَّرِيْفُ) يَعْنِيْ بِالنُّطْفَةِ مَآءَ النَّهْرِ، وَ هِيَ اَفْصَحُ كِنَايَةٍ عَنِ الْمَآءِ وَ اِنْ كَانَ كَثِيْرًا جَمًّا۔

ان (خارجیوں) کے ہلاک ہونے کی جگہیں تو دریا کے اسی پار ہیں (جہاں سے) خدا کی قسم ان کے دس آدمی بھی (بچ کر) جانے نہیں پائیں گے اور تم لوگوں سے تو دس ہلاک بھی نہ ہوں گے۔

(جناب سید رضی علیہ رحمہ نے فرمایا کہ) حضرتؑ نے نطفہ سے دریا کا پانی مراد لیا ہے اور یہ فصیح ترین کنایہ ہے اگرچہ وہ (دریا کا پانی) بہت اور کثرت سے ہوتا ہے۔

(بقیہ صفحہ نمبر) بارے میں بھی وہی اعتقاد کرنے لگیں گے جو نصاریٰ کا اعتقاد (حضرت عیسیٰؑ) ابن مریم کے بارے میں ہے تو اے علیؑ میں آج تمہارے متعلق وہ فضیلت بیان کر دیتا جس کی وجہ سے لوگوں کی یہ حالت ہوتی کہ تم جس طرف سے گزرتے وہاں والے تمہارے قدموں کے نیچے کی خاک اُٹھاتے پھرتے۔

اور حضرت علیؑ نے فرمایا ہے کہ میرے بارے میں دو جماعتیں ہلاک ہوں گی ایک وہ جو میری محبت میں غلو کرے گی اور مجھ میں وہ اوصاف بیان کرے گی جو درحقیقت مجھ میں نہیں ہیں اور دوسری وہ جو میری دشمن اور مجھے گھٹانے والی ہوگی اور مجھ پر ان امور کا اتہام قائم کرے گی جن سے میری ذات بالکل بَری ہے۔ ابوالعباس کہتا ہے کہ یہی مطلب ہے اس حدیث نبوی کا کہ اے علی تم میں حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام کی مثل ہے کہ نصاریٰ نے ان کو دوست رکھا تو ان کے درجہ سے بہت بڑھا دیا اور یہود نے دشمن رکھا تو آپ کی مادر گرامی پر بھی اتہام قائم کر دیا۔ ابوالعباس کہتا ہے کہ حضرت علیؑ اس قوم کی طرف سے گزرتے تھے جو آپ کی محبت میں حد سے گزر گئی تھی اور ان پر شیطان غالب آ گیا تھا یہاں تک کہ ان لوگوں نے خدا کا انکار کر لیا اور رسول خداؐ جو اعتقادات لائے ان سے مُنہ موڑ لیا اور حضرت علیؑ کو اپنا رب اور خدا ماننے لگے اور حضرتؑ سے کہنے لگے کہ آپ ہی ہمارے خالق اور رازق ہیں پس پہلے تو حضرتؑ نے حتی الوسع ان سے توبہ کرانے کی کوشش کی اور سخت سزا کی دھمکی دی مگر وہ اپنے اسی اعتقاد پر جمے رہے تو حضرتؑ نے واقعاً انہیں سزا دی تا کہ یہ اعتقاد پھیلنے نہ پائے اور دوسروں کو عبرت حاصل ہو۔

قَالُوْا اَيْضًا اِنَّ بَكْرِيًّا وَ شِيْعِيًّا تَجَادَلَا وَ احْتَكَمَا اِلٰى بَعْضِ اَهْلِ الذِّمَّةِ مِمَّنْ لَا هَوٰى لَهٗ مَعَ اَحَدِ الرَّجُلَيْنِ فِي التَّفْضِيْلِ فَاَنْشَدَهُمَا۔ كَمْ بَيْنَ مَنْ شَكَّ فِيْ عَقِيْدَتِهٖ وَ بَيْنَ مَنْ قِيْلَ اِنَّهُ اللّٰهُ۔

یعنی ایک سُنّی اور ایک شیعہ میں مناظرہ ہوا اور دونوں نے ایک ذمی کافر کو فیصلہ کے لیے حکم مقرر کیا جس کو کسی فریق سے کوئی تعلق نہیں تھا اور اس سے پوچھا کہ حضرت علیؑ افضل تھے یا خلفہ ثلاثہ؟ تو اس نے کہا جن لوگوں کے ایمان ہی میں شک ہو کہ وہ مومن بھی تھے یا نہیں ان کا مقابلہ ایسے بزرگوار سے کیوں کر ہو سکتا ہے جس کے ایمان کا کیا ذکر ہے، لوگ تو اسے خدا ماننے لگے۔ (ابن ابی الحدید جلد اول صفحہ ۲۴۰)

وَ لَمَّا قُتِلَ الْخَوَارِجُ فَقِيْلَ لَهٗ: يَآاَمِيْرَالْمُؤْمِنِيْنَ! هَلَكَ الْقَوْمُ بِاَجْمَعِهِمْ، فَقَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ:

كَلَّا وَاللّٰهِ! اِنَّهُمْ نُطَفٌ فِيْ اَصْلَابِ الرِّجَالِ وَ قَرَارَاتِ النِّسَآءِ، كُلَّمَا نَجَمَ مِنْهُمْ قَرْنٌ قُطِعَ حَتّٰى يَكُوْنَ اٰخِرُهُمْ لُصُوْصًا سَلَّابِيْنَ.

وَ قَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِيْهِمْ:

لَا تَقْتُلُوا الْخَوَارِجَ بَعْدِيْ، فَلَيْسَ مَنْ طَلَبَ الْحَقَّ فَاَخْطَاَهُ كَمَنْ طَلَبَ الْبَاطِلَ فَاَدْرَكَهٗ. يَعْنِيْ مُعَاوِيَةَ وَ اَصْحَابَهٗ.

اور جب خوارج قتل ہو گئے تو حضرتؑ سے ذکر کیا گیا کہ اے امیر المومنین اب تو یہ قوم سرے سے ہلاک ہوگئی۔

اس پر حضرت علیہ السلام نے فرمایا:

ہرگز نہیں (بلکہ) خدا کی قسم ابھی تو وہ مَردوں کی پُشتوں اور عورتوں کے رحموں میں (بصورت) نطفے موجود ہیں کہ جب ان کا کوئی سینگ نکلے گا کاٹ دیا جائے گا[1] (یعنی جو سردار اُبھرے گا قتل کر دیا جائے گا) یہاں تک کہ ان کا آخر (کا طبقہ) چور ڈاکو ہو جائے گا۔

[اور حضرت علیہ السلام نے فرمایا]

میرے بعد تم لوگ (معاویہ کی طرف سے) خارجی فرقہ کو قتل نہ کرنا کیونکہ جس نے حق کو چاہا مگر اس (کے پانے) میں غلطی کی (یعنی فرقہ خوارج) اس شخص ایسا نہیں ہے جس نے باطل ہی کو چاہا تو اسے پا لیا (حضرتؑ کی مراد اس سے معاویہ اور اس کے اصحاب ہیں)۔[2]

---

[1] علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں: ''حضرتؑ کے قول ''كُلَّمَا نَجَمَ مِنْهُمْ قَرْنٌ ۔ میں ایک لطیف استعارہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ان خوارج سے جب کوئی جماعت ظاہر ہوگی ہلاک کر دی جائے گی جس کو حضرتؑ نے بکرے کے سینگ سے تشبیہ دی جو نکلتی ہے تو کاٹ دی جاتی ہے۔ اور حضرتؑ کا یہ ارشاد حرف بحرف صحیح ہوتا رہا کیونکہ جنگ نہروان میں وہ سب کے سب ہلاک نہیں ہوئے بلکہ وہ سلسلہ قائم ہو گیا جسے وہ لوگ بھی قائم رکھیں گے جو ابھی پیدا نہیں ہوئے اور ایسا ہی ہوا اور حضرتؑ کی دوسری پیشین گوئی بھی پوری ہوئی کہ اس جماعت کے آخری لوگ چور اور ڈاکو ہوں گے۔ چنانچہ خوارج کی دعوت سست اور کمزور ہوگئی اور اس کے لوگ فنا ہو گئے اور ان کی حالت اس درجہ تباہ ہوئی کہ ان کے بعد کی نسل سے راستوں میں لوٹ مار کرنے والے پیدا ہوئے جو علانیہ ملک میں فسق و فجور اور شر وفساد کرتے پھرتے تھے''۔ اس کے بعد علامہ نے بکثرت خوارج کے حالات اس کی شہادت میں پیش کیے ہیں۔

[2] مقصود حضرتؑ کا یہ ہے کہ خوارج کو ایک شبہ پیدا ہو گیا جس سے وہ لوگ گمراہ ہو گئے اور درحقیقت ان کی غرض حق اور مذہب صحیح کی تلاش ہی ہے یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے کو دل میں تو گمراہ اور اعتقاد باطل پر سمجھتے ہوں اور کسی دنیوی غرض کے لیے حضرتؑ سے جہاد کرتے ہوں۔ تو وہ فی الجملہ دین سے تمسک کرتے ہیں اور اس کی حمایت مقصود ہوتی ہے اگرچہ اس کے صحیح سمجھنے میں وہ خطا (بقیہ صفحہ مابعد)

❁ خطبہ :۶۰ ❁

وَ مِنْ كَلَامٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

لَمَّا خُوِّفَ مِنَ الْغِيْلَةِ۔

خطبہ(۶۰)

حضرت علیہ السلام کے ایک کلام کا کچھ حصّہ

(جسے) اس وقت (فرمایا) جب آپؑ کو غفلت میں قتل کیے جانے سے ڈرایا گیا۔[1]

(بقیہ صفحہ ماقبل) کرتے ہیں۔ اس کے برعکس معاویہ کی حالت ہے کہ وہ حضرت علیؑ سے طلب حق کے لیے نہیں لڑتا ہے اور اپنے اعتقاد کو دل میں صحیح نہیں سمجھتا ہے بلکہ اپنے کو گمراہی پر یقین کر کے صرف دنیا کی بادشاہت حاصل کرنے کے لیے مخالفت کرتا ہے۔ پس معاویہ کو نہ کوئی شبہ ہے نہ غلط فہمی، بلکہ جان بوجھ کر دین اسلام کے خلاف کام کرتا ہے۔ چنانچہ اس کی حالتیں اس امر کو اچھی طرح واضح کرتی ہیں۔ غرض نہ وہ ارباب دین سے تھا نہ اس سے کوئی مذہبی خوبی ظاہر ہوئی بلکہ دنیا حاصل کرنے اور اپنی سلطنت کو مضبوط کرنے کے لیے مال خدا کو ان کاموں میں خرچ کرتا رہتا تھا جن کے بارے میں اسے یقین تھا کہ حرام اور غضب خدا کی باعث ہیں۔ پس اس کے یہ حالات اس کو باعلان بتاتے ہیں کہ وہ سیدھے راستے سے عمداً علیحدہ ہو گیا تھا اور باطل پر جان بوجھ کر جما ہوا تھا تو ایسی حالت میں مسلمانوں کو جائز نہیں کہ اس سے لڑنے میں سکوت کریں اور اس کی طرف سے خوارج کے ساتھ جنگ کریں۔ اگرچہ خوارج بھی گمراہ ہیں مگر وہ معاویہ سے یقیناً بہتر ہیں کہ جو بات ان کے خیال میں بُری ہوتی ہے اس سے تو لوگوں کو منع کرتے اور ظالم حاکموں پر خروج کرنا واجب سمجھتے ہیں برخلاف معاویہ کے کہ جس کو امام برحق سمجھتا ہے اسی پر بادشاہت حاصل کرنے کے لیے خروج کرتا ہے اور ذرا برابر دینی پہلو کو پیچھے نظر نہیں رکھتا۔ (ابن ابی الحدید جلد اول صفحہ ۲۵۰)

[1] یعنی حضرتؑ کی شہادت سے پہلے لوگوں کو ابن ملجم کا ارادہ معلوم ہو گیا اور اسے گرفتار کر کے لائے اور چاہا کہ حضرتؑ کی رضامل جائے تو اسے قتل کر دیں۔ حضرتؑ نے فرمایا اسے چھوڑ دو کہ جب تک کوئی شخص جرم کر نہیں لیتا اس وقت تک اس کی سزا نہیں کی جا سکتی۔ اللہ اکبر باوجودیکہ حضرتؑ کو یقین تھا کہ وہ آپؑ کو شہید کرے گا مگر کس درجہ یہ حضرتؑ احکام خدا کے پابند اور انصاف کے سرپرست تھے کہ اپنی شہادت منظور کر لی مگر بغیر وقوع جرم اس کی سزا نہیں ہونے دی۔ اور سپر سے حضرتؑ کی مراد اجل یعنی موت کا وقت معین ہے اور حضرتؑ کا یہ خیال قرآن مجید کے بالکل مطابق ہے جس میں ارشاد ہے:

﴿وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا﴾

یعنی کوئی شخص بغیر خدا کی اجازت کے مر نہیں سکتا اور اس اجازت کا وقت لکھا ہوا ہے۔

﴿فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ﴾

یعنی جب لوگوں کی موت آجاتی ہے تو نہ آگے ہوتی ہے اور نہ پیچھے۔

﴿تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَ هُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ﴾

یعنی اس کی روح ہمارے فرشتوں نے نکالی جو حکم خدا کی تعمیل میں کوتاہی نہیں کرتے۔

اور بھی بہت سی آیات ہیں اور اسی مضمون کو ان شعروں میں بھی ادا کیا ہے جو جناب امیر علیہ السلام کی طرف منسوب ہیں کہ

(بقیہ صفحہ مابعد)

وَ اِنَّ عَلَیَّ مِنَ اللّٰہِ جُنَّۃً حَصِیْنَۃً فَاِذَا جَآءَ یَوْمِیْ انْفَرَجَتْ عَنِّیْ وَ اَسْلَمَتْنِیْ، فَحِیْنَئِذٍ لَّا یَطِیْشُ السَّھْمُ وَ لَا یَبْرَاُ الْکَلْمُ.

(ابھی تو) مجھ پر یقیناً خدا کی طرف سے ایک حفاظت کرنے والی سپر (موجود) ہے پھر جب میرا (آخری) دن آجائے گا تو وہ (سپر خود ہی) مجھ سے علیحدہ ہوجائے گی اور مجھے (موت کے) سپرد کردے گی پس اس وقت نہ تو (موت کا) تیر خطا کرے گا اور نہ زخم اچھا ہو سکے گا۔

خطبہ :۶۱

خطبہ (۶۱)

وَ مِنْ خُطْبَۃٍ لَّہٗ عَلَیْہِ السَّلَامُ

حضرت علیہ السلام کے ایک خطبہ کا کچھ حصّہ۔ ۱؎

(بقیہ صفحہ ماقبل)

مِنْ اَیِّ یَوْمَیَّ مِنَ الْمَوْتِ اَفِرُّ — اَ یَوْمَ لَمْ یُقَدَّرْ اَمْ یَوْمَ قُدِّرَ

فَیَوْمٌ لَمْ یُقَدَّرْ لَا اَذْھَبُہٗ — وَ یَوْمٌ قَدْ قُدِّرَ لَا یَنْفَعَنِیَ الْحَذَرُ

یعنی میں اپنی موت کے کس دن سے فرار کروں اس دن سے جو معین نہیں ہوا یا اس سے جو معین ہو چکا ہے۔ جو دن معین نہیں ہوا ہے مجھے اس سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی اور جو دن (میری موت کا) معین ہو چکا ہے اس سے خواہ کتنا ہی ڈروں مجھے کوئی نفع نہیں ہونے کا ہے کیونکہ وہ اپنے وقت پر آکر رہے گا اور کسی کے ٹالے نہ ٹل سکتا ہے اور نہ کسی کے ڈرنے سے رک سکتا ہے۔

۱؎ حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے اس خطبہ میں لوگوں کو دنیا پر فریفتہ ہونے سے ڈرایا ہے اور دنیا کی متعدد صفتوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اوّل یہ کہ دنیا بہت خطرناک جگہ ہے اور یہیں تک یہ سب جھگڑے ہیں کہ اعمال کا موقع پھر آخرت میں نہیں مل سکتا بلکہ دنیا ہی کے اعمال کا نتیجہ آخرت میں ملے گا جس کے بارے میں فرمایا ہے کہ ''اَلدُّنْیَا مَزْرَعَۃُ الْاٰخِرَۃِ''۔ یعنی ''دنیا وہ جگہ ہے جہاں آخرت کے لیے کھیتی کی جاتی ہے''۔ تو جو شخص دنیا کی زندگی کے برے نتیجہ سے محفوظ رہنے کی خواہش رکھتا ہے اسے چاہیے کہ احکام خدا کے مطابق یہاں کے ایام بسر کرے اور اپنے نفس کی پیروی کر کے عذاب آخرت نہ خریدے کہ جب دنیا کی زندگی ختم ہوجائے گی پھر عمل کرنے اور زاد آخرت مہیّا کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔ دوسرے یہ جو فرمایا کہ ''جو چیز اس دنیا کی ہے'' الخ تو مطلب یہ ہے کہ ہم جو کام دنیا میں دنیا کی شہرت یا نام آوری وغیرہ حاصل ہونے کے لیے کریں گے اس سے آخرت کی نجات نہیں ہوگی مثلاً ہم دکھانے کے لیے نماز کثرت سے پڑھیں، روزے خوب رکھیں، شہرت کے لیے حج و زیارت کریں تو یہ کام آخرت میں کوئی نفع نہیں پہنچا سکتے۔ تیسرے آزمائش کے لیے مبتلا ہونے کو جو فرمایا تو مثل اس کے ہے جو خدا نے قرآن مجید میں فرمایا ہے۔ ﴿ وَ نَبْلُوْکُمْ بِالشَّرِّ وَ الْخَیْرِ فِتْنَۃً ﴾ یعنی ''لوگو! ہم تم کو بری اور بھلی حالتوں میں رکھ کر آزماتے ہیں'' (پارہ ۱۷ رکوع ۳) چوتھے دنیا کے تشبیہ سایہ سے نہایت مناسب ہے کہ جس طرح ابر آکر سایہ ڈالتا اور فوراً اس کے ہٹ جانے سے سایہ بھی زائل ہوجاتا ہے اسی طرح دنیا (بقیہ صفحہ مابعد)

اَلَا وَ اِنَّ الدُّنْيَا دَارٌ لَّا يُسْلَمُ مِنْهَا اِلَّا فِيْهَا، وَ لَا يُنْجٰى بِشَیْءٍ كَانَ لَهَا. اُبْتُلِيَ النَّاسُ بِهَا فِتْنَةً، فَمَآ اَخَذُوْهُ مِنْهَا لَهَا اُخْرِجُوْا مِنْهُ وَ حُوسِبُوْا عَلَيْهِ، وَ مَآ اَخَذُوْهُ مِنْهَا لِغَيْرِهَا قَدِمُوْا عَلَيْهِ وَ اَقَامُوْا فِيْهِ. فَاِنَّهَا عِنْدَ ذَوِی الْعُقُوْلِ كَفَیْءِ الظِّلِّ، بَيْنَا تَرَاهُ سَابِغًا حَتّٰى قَلَصَ، وَ زَآئِدًا حَتّٰى نَقَصَ.

(لوگو!) سمجھ رکھو دنیا وہ گھر ہے جس سے سلامتی نہیں ہوسکتی مگر اسی میں اور جو چیز اس (دنیا) کی ہے اس (کے ذریعہ) سے تو کوئی بچ نہیں سکتا۔ لوگ اس (دنیا) میں آزمائش کے لیے مبتلا کیے گئے ہیں تو اس سے جس چیز کو اسی میں (عیش و آرام کرنے) کے لیے حاصل کیا ہے اس سے (درحقیقت ہمیشہ کے لیے) علیحدہ کر دیے گئے اور (سمجھ لو کہ) ان سے اس پر حساب (بھی) کر لیا گیا۔ اور جس چیز کو اس سے اس کے غیر (یعنی آخرت) کے لیے حاصل کیا ہے اس کے پاس (گویا ابھی ہی) پہنچ گئے اور اس پر مقیم ہو گئے۔ اور یقیناً یہ (دنیا تو) عقلمندوں کے نزدیک سایہ کی رفتار ایسی ہے جسے تم ابھی پھیلا ہوا دیکھ رہے تھے کہ (دفعتہً) سمٹ گیا اور (ابھی) زیادہ تھا کہ کم ہو گیا۔

❁ خطبہ : ۶۲ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

خطبہ (۶۲)

حضرت علیہ السلام کے ایک خطبہ کا کچھ حصّہ۔ [1]

(بقیہ صفحہ ماقبل) کی لذتیں ہیں کہ ادھر ایک خوشی حاصل ہوئی اور فوراً ہی کسی بڑے غم نے واقع ہو کر اس کو زائل کر دیا۔ اسی مضمون کو شاعر نے یوں ادا کیا ہے:

اَلَا اِنَّمَا الدُّنْيَا كَظِلِّ غَمَامَةٍ اَظَلَّتْ ثُمَّ حَفَّتْ فَوَلَّتْ۔

یعنی دنیا تو مثل ابر کے چھاؤں کے ہے جس نے ابھی آسمان پر آ کر اپنا سایہ پھیلا دیا اور پھر فوراً ہی وہ چلا گیا تو غائب ہو گیا۔

[1] علامہ ابن ابی الحدید معتزلی نے اس خطبہ کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے:

وَ هٰذَا الْكَلَامُ مِنْ مَوَاعِظِ اَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ الْبَالِغَةِ۔

یعنی یہ کلام حضرت امیر المومنینؑ کے ان مواعظ سے ہے جو بہت عمدہ اور نہایت موثر و فصیح ہیں۔

اس کے بعد ممدوح نے اپنے مذہب کے ایک بڑے امام حسن بصری کا خطبہ بھی نقل کیا ہے جو اسی مضمون میں ہے اور آخر میں اس خطبہ کے متعلق یہ رائے لکھی ہے۔ (بقیہ صفحہ مابعد)

وَ اتَّقُوا اللّٰهَ عِبَادَ اللّٰهِ، وَ بَادِرُوْا اٰجَالَكُمْ بِاَعْمَالِكُمْ، وَ ابْتَاعُوْا مَا يَبْقٰى لَكُمْ بِمَا يَزُوْلُ عَنْكُمْ، وَ تَرَحَّلُوْا فَقَدْ جُدَّ بِكُمْ، وَ اسْتَعِدُّوْا لِلْمَوْتِ فَقَدْ اَظَلَّكُمْ، وَ كُوْنُوْا قَوْمًا صِيْحَ بِهِمْ فَانْتَبَهُوْا، وَ عَلِمُوْا اَنَّ الدُّنْيَا لَيْسَتْ لَهُمْ بِدَارٍ فَاسْتَبْدَلُوْا، فَاِنَّ اللّٰهَ سُبْحَانَهٗ لَمْ يَخْلُقْكُمْ عَبَثًا، وَ لَمْ يَتْرُكْكُمْ سُدًى، وَ

پس اے بندگانِ خدا! اللہ سے ڈرتے رہو اور اپنے اعمال (خیر) کے ذریعہ سے اپنی موت کے آگے نکل جاؤ اور جو چیز تم سے زائل ہو جائے گی (یعنی دنیا) اس سے اس چیز کو خرید لو جو تمہارے لیے باقی رہے گی (یعنی اخرت کو) اور (دنیا سے) سفر (کی تیاری) کر لو کیونکہ (بحکم خدا) تمہارے کوچ میں جلدی کی گئی ہے اور موت کے لیے آمادہ ہو جاؤ اس لیے کہ وہ یقیناً تمہارے سر پر آ گئی ہے اور وہ قوم ہو جاؤ جسے (ہوشیار کرنے کی غرض سے) پکارا گیا تو (فوراً) بیدار ہو گئی اور (خوب) سمجھ رکھو کہ دنیا (کچھ) تمہارے لیے گھر نہیں (بنائی گئی) ہے (جس میں ہمیشہ رہنے کا خیال کرو) تو (اعمال خیر کر کے اس دنیا سے آخرت کو) بدل لو۔[1] کیونکہ خدا نے تمہیں عبث نہیں پیدا کیا ہے

(بقیہ صفحہ ماقبل)

وَ هٰذَا الْكَلَامُ حَسَنٌ وَ مَوْعِظَةٌ بَالِغَةٌ اِلَّا اَنَّهٗ فِي الْجَزَالَةِ وَالْفَصَاحَةِ دُوْنَ اَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَيْهِ السَّلَامُ بِطَبَقَاتٍ۔

یعنی (حسن بصری کا) یہ کلام بھی خوب اور عمدہ نصیحت ہے، لیکن یہ سنجیدگی اور متانت وفصاحت میں حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے کلام سے منزلوں دُور اور بمدارج پست ہے۔

[1] یعنی دنیا کے لذتیں زائل ہو جانے والی ہیں تو ان کو قیمت سمجھ کر دے دو اور آخرت کی باقی رہنے والی نعمتوں کو خرید لو اور معلوم ہے کہ دنیا کی لذتیں اسی وقت چھوڑی جا سکتی ہیں جب انسان دنیا میں زہد، ورع، تقویٰ وغیرہ اوصاف اختیار کرے گا کہ انہیں صفات کے ذریعہ سے آخرت کے بلند درجات حاصل ہوتے ہیں۔ غرض آخرت کی راحت اور نعمت اسی کو ملے گی جو دنیا میں راحت اور لذت سے رہنا پسند نہ کرے کیونکہ دنیا کی راحت اور لذت بغیر احکام خدا کی مخالفت کیے شاذ و نادر ہی حاصل ہو سکتی ہے اور جس نے احکام خدا کی مخالفت کی وہ آخرت میں کہاں حصہ پا سکتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ احکام خدا کی پابندی کر کے اگر دنیا میں عیش کیا جائے تو آخرت کا درجہ کیوں کم ہوگا مگر وہ اس پر غور نہیں کرتے کہ بغیر احکام خدا کی مخالفت کیے دنیا میں عیش کرنا ممکن بھی ہے؟ اسی کو تو کسی شاعر نے کہا ہے:

ہم خدا خواہی و ہم دنیائے دوں این خیال است و محال است و جنوں

مَا بَيْنَ اَحَدِكُمْ وَ بَيْنَ الْجَنَّةِ اَوِ النَّارِ اِلَّا الْمَوْتُ اَنْ يَّنْزِلَ بِهٖ.

اور تمہیں یوں ہی نہیں چھوڑ رکھا ہے اور تم میں سے کسی شخص اور بہشت یا دوزخ کے درمیان موت کے سوا کوئی چیز نہیں ہے جو اس پر آ پڑے۔

وَ اِنَّ غَايَةً تَنْقُصُهَا اللَّحْظَةُ، وَ تَهْدِمُهَا السَّاعَةُ، لَجَدِيْرَةٌ بِقِصَرِ الْمُدَّةِ، وَ اِنَّ غَآئِبًا يَّحْدُوْهُ الْجَدِيْدَانِ: اللَّيْلُ وَ النَّهَارُ، لَحَرِيٌّ بِسُرْعَةِ الْاَوْبَةِ، وَ اِنَّ قَادِمًا يَّقْدَمُ بِالْفَوْزِ اَوِ الشِّقْوَةِ لَمُسْتَحِقٌّ لِاَفْضَلِ الْعُدَّةِ، فَتَزَوَّدُوْا فِي الدُّنْيَا مِنَ الدُّنْيَا، مَا تُحْرِزُوْنَ بِهٖ اَنْفُسَكُمْ غَدًا. فَاتَّقُوا

اور یقیناً (دنیا اور آخرت کے درمیان کی) وہ مسافت [1] (یعنی انسان کی عمر) جس کو (زمانہ کا) ہر لحظہ کم کرتا جاتا ہے اور جسے ہر ساعت ختم کر رہی ہے اسی کی مستحق ہے کہ اس کی مدت کم ہوتی جائے اور یقیناً وہ غائب (یعنی موت) جسے دونوں نئے (آتے رہنے والے یعنی) رات اور دن [2] (ہمارے پاس) ہنکائے لا رہے ہیں۔ (ہم تک) جلد ہی پہنچ جانے کے قابل ہے اور وہ آنے والی چیز جو کامیابی یا بدبختی کو لا رہی ہے (یعنی موت) یقیناً (اعمال خیر کے) بہترین ساز و سامان کی مستحق ہے۔ [3] تو جس چیز سے اپنے نفسوں کو کل (قیامت میں) بچاؤ گے اس کا سامان

---

[1] حضرتؑ نے اس جگہ غایت سے مراد انسان کی اجل معلوم اور وقت معین کو لیا ہے جو ہر شخص کے لیے معین ہے اور اس کے تھوڑی ہونے کی وجہ دو امروں کو قرار دیا ہے۔ ایک زمانے کے ہر لحظہ کا اسے کم کرتے رہنا جو ظاہر ہے کہ جس قدر زمانہ گزرتا جاتا ہے اسی قدر انسان کی عمر کم ہوتی جاتی ہے۔ دوسرے زمانے کی ہر ساعت کا اس (غایت یعنی اجل معین) کو توڑتے رہنا کہ جس طرح دیوار پر ضرب لگاتے رہنے سے وہ دیوار آہستہ آہستہ منہدم ہوتی جاتی ہے اسی طرح زمانہ کی ہر ساعت انسان کی عمر کو توڑتی جاتی ہے جس سے اس کی قوت کم اور اجل قریب ہوتی جاتی ہے۔

[2] عربی زبان میں دن اور رات کو جدیدان (دو نئے) اس وجہ سے کہتے ہیں کہ ایک کے بعد دوسرا پے در پے آتا رہتا ہے۔ پس جب دن ختم ہونے پر رات آئی تو وہ نئی ہے کیونکہ دن میں نہیں تھی اور جب رات کے بعد دن آیا تو وہ بھی نیا ہے اس لیے کہ رات میں نہیں تھا۔

[3] یہ اشارہ ہے انسان کی طرف جب وہ دنیا سے انتقال کرنے کے بعد اپنے پروردگار کی درگاہ میں پہنچتا ہے کیونکہ اس وقت وہ یا اپنے اچھے اعمال کی وجہ سے کامیابی کا سامان لے کر آتا ہے یا بُرے اعمال کے سبب سے ناکامی کا ذخیرہ لاتا ہے۔ تو جس شخص کو یہ علم ہے (اور ہر شخص کو ہے بشرطیکہ غور کرے) اس پر عقلاً فرض ہے کہ دنیا میں وہی اعمال بجالائے جن کی وجہ سے خدا کے یہاں کامیابی کا بلکہ بہترین سامان لے کر جائے۔

عَبْدٌ رَبَّهٗ، وَ نَصَحَ نَفْسَهٗ، وَ قَدَّمَ تَوْبَتَهٗ، وَ غَلَبَ شَهْوَتَهٗ، فَاِنَّ اَجَلَهٗ مَسْتُوْرٌ عَنْهُ، وَ اَمَلَهٗ خَادِعٌ لَّهٗ، وَ الشَّيْطٰنُ مُوَكَّلٌ بِهٖ، يُزَيِّنُ لَهُ الْمَعْصِيَةَ لِيَرْكَبَهَا، وَ يُمَنِّيْهِ التَّوْبَةَ لِيُسَوِّفَهَا، حَتّٰى تَهْجُمَ مَنِيَّتُهٗ عَلَيْهِ اَغْفَلَ مَا يَكُوْنُ عَلَيْهَا.

فَيَا لَهَا حَسْرَةً عَلٰى ذِيْ غَفْلَةٍ اَنْ يَّكُوْنَ عُمُرُهٗ عَلَيْهِ حُجَّةً، وَ اَنْ تُؤَدِّيَهُ اَيَّامُهٗ اِلَى الشِّقْوَةِ! نَسْئَلُ اللّٰهَ سُبْحَانَهٗ اَنْ يَّجْعَلَنَا وَ

دنیا ہی میں (اسی) دنیا سے کرلو۔[1] اس لیے کہ وہی بندہ اپنے پروردگار (کے مواخذہ) سے بچا جس نے اپنے نفس کی نصیحت (واصلاح) کی اور اپنی توبہ کو مقدم رکھا اور اپنی خواہش (نفسانی) پر غالب آیا کیونکہ یقیناً اس کی موت (کا وقت) اس سے مخفی ہے اور اس کی موت اسے فریب دے رہی ہے اور شیطان اس پر مسلط ہے جو گناہ کو اس لیے آراستہ کرتا رہتا ہے تاکہ یہ اس کا ارتکاب کرے اور اس کو توبہ کا آرزومند کرتا رہتا ہے کہ (ابھی نہ کرے بلکہ) آئندہ کرلینے کا متمنی رہے یہاں تک کہ اس کی موت اس پر شدید ترین غفلت کی حالت میں آپڑے۔[2]

(غرض) کس قدر (افسوس اور) حیرت ہے ہر غافل پر اس امر کی کہ اس کی عمر ہی اس کے خلاف حجت ہوجائے گی اور یہ کہ اس (کی زندگی) کے دن ہی اسے بدبختی تک پہنچائیں گے۔[3] (تو) ہم خدائے سبحانہ سے سوال کرتے

---

[1] اس کا بھی وہی مطلب ہے جو سابقاً بیان کیا گیا کہ جس طرح ہوشیار اور تجربہ کار آدمی کسی سفر میں جاتا ہے اور سفر کے ضرورت کی چیزیں مکان ہی سے اپنے ساتھ رکھ لیتا ہے اسی طرح ہر شخص کو اپنے سفر آخرت کا سامان اسی دنیا میں کرلینا چاہیے اور وہ نیک اور اطاعت گزار زندگی بسر کرنا اور اعمال صالحہ کا بجالانا ہے کہ انہیں امور سے انسان اپنے نفس کو عذاب آخرت سے بچا سکتا ہے۔

[2] انسان کی موت کا وقت تو پوشیدہ رہنا واضح ہے کہ جو شخص ڈیڑھ سو برس بھی زندہ رہتا ہے یہ نہیں جانتا کہ اس کی موت کب آئے گی اور اس کی اُمیدوں کا فریب دینا بھی واضح ہے کہ ہر شخص کو یہی امید ہے کل رہیں گے اور فلاں کام انجام دیں گے اور پرسوں زندہ رہیں گے اس امر کو طے کریں گے۔ غرض امید زندگی ختم ہی نہیں ہوتی۔ ایسی حالت میں شیطان کو بھی بہکانے کا پورا موقع ملتا ہے، وہ سکھاتا ہے اس وقت فلاں عورت سے زنا کرلو کہ ایسا اچھا موقع پھر نہیں ملے گا، مرتے وقت توبہ کرلینا۔ یا فلاں بھائی کی جائیداد غصب کرلو اس سے تمہاری آمدنی میں معقول اضافہ ہوجائے گا۔ تمہاری تنگدستی زائل ہوجائے گی اور تم آرام کی زندگی بسر کرسکو گے یا فلاں ذریعہ سے سود کی رقم لے لو کہ اس سے تمہارا مال بڑھ جائے گا اور تمہارے بہت سے کام نکلیں گے۔

[3] یعنی ہر غافل شخص پر کس درجہ افسوس ہے کہ وہ اپنی عمر کو شیطان کی پیروی میں صَرف کررہا ہے اور یہ نہیں سمجھتا کہ اس کی یہی عمر بروز قیامت اس کے خلاف گواہی دے گی کہ اس نے فلاں دن یہ حرام کام کیا۔ اس روز یہ ناجائز حرکت کی۔ اس زمانے (بقیہ صفحہ مابعد)

اِيَّاكُمْ مِمَّنْ لَّا تُبْطِرُهُ نِعْمَةٌ، وَ لَا تُقَصِّرُ بِهٖ عَنْ طَاعَةِ رَبِّهٖ غَايَةٌ، وَ لَا تَحُلُّ بِهٖ بَعْدَ الْمَوْتِ نَدَامَةٌ وَّ لَا كَآبَةٌ.

ہیں کہ ہمیں اور تمہیں ان میں رکھے جنہیں کوئی نعمت اترانہیں دیتی ہے اور جن کو کوئی غرض ان کے پروردگار کی فرمانبرداری سے باز نہیں رکھتی ہے اور جن کو موت کے بعد کسی قسم کی ندامت یا رنج حاصل نہیں ہوتا۔ ۱؎

❁ خطبہ : ۶۳ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

خطبہ (۶۳)

حضرت علیہ السلام کے ایک خطبہ کا کچھ حصّہ۔ ۲؎

(بقیہ صفحہ ماقبل) میں ان امور میں مشغول رہا۔ غرض اس کی عمر ہی اس کی دشمن بن کر پردہ دری کرے گی اور جہنم میں پہنچائے گی۔

۱؎ پند و نصیحت کرنے کے بعد حضرت مومنینؑ کے لیے خدا سے دُعا بھی فرماتے ہیں کہ اے خدا تو ہمیں عذاب آخرت سے بچنے کی توفیق دے اور ہمیں ان لوگوں سے نہ قرار دے جو دنیا کی نعمت پر فریفتہ ہو کر بہک جاتے اور شیطان کی پیروی کرنے لگتے ہیں اور نہ ان لوگوں سے قرار دے جنہیں دنیا میں ایسی غرض ہوتی ہے جو انہیں خدا کی اطاعت سے باز رکھتی ہے اور نہ ان لوگوں سے قرار دے جنہیں مرنے کے بعد ندامت، افسوس اور رنج و اندوہ کا مقابلہ کرنا ہوگا بلکہ ہم لوگ ان کے ساتھ ہوں جو آخرت میں بہت کامیاب ہوں گے اور نہایت بلند درجہ حاصل کریں گے۔

۲؎ اگر اس خطبہ جلیلہ میں تدبر سے کام لیا جائے تو واضح ہو کہ اسلامی فرقوں سے صرف شیعوں کا مذہب حق ہے اور دوسرے مسلمانوں کا مذہب باطل ہے کیونکہ اس میں صفات خداوند عالم کی طرف اشارہ کر کے حضرتؑ نے ثابت فرمایا ہے کہ خدا کی صفات عین ذات ہیں جیسا کہ شیعوں کا عقیدہ ہے نہ زائد بر ذات جیسا کہ حضرات اہل سنت کا اعتقاد ہے۔

چنانچہ علامہ ابن ابی الحدید معتزلی بھی اس کلام کی شرح میں اس اشارہ کو ذکر کرتے ہیں، لکھتے ہیں:

يُؤَيِّدُ بِهٰذَا الْكَلَامِ اَنَّهٗ تَعَالٰى لَا يَجُوْزُ اَنْ يُّكَوْنَ مَوْرِدًا لِلصِّفَاتِ الْمُتَعَاقِبَةِ عَلٰى مَا يَذْهَبُ اِلَيْهِ قَوْمٌ مِّنْ اَهْلِ التَّوْحِيْدِ۔

یعنی اس کلام سے حضرتؑ کی مراد یہ ہے کہ خداوند عالم پے در پے وارد ہونے والی صفتوں کا مورد نہیں ہو سکتا جیسا کہ مسلمانوں کے بعض فرقوں کا اعتقاد ہے۔

پس حضرات اہل سنت اور فرقہ شیعہ کے عقائد کی کتابیں دیکھنے سے بسہولت معلوم ہو جائے گا کہ کس فرقہ کا اعتقاد صفات خداوند عالم کے متعلق کیا ہے۔ عقائد میں حضرات اہل سنت کی ایک نہایت مشہور اور مقبول کتاب ''عقائد نسفی'' ہے جس کی شرح علامہ تفتازانی نے بھی کی ہے اس کتاب مطبوعہ مصر کے صفحہ ۷۵ میں مصنف عقائد یعنی علامہ نسفی لکھتے ہیں:

''وَلَهٗ صِفَاتٌ اَزَلِيَّةٌ قَائِمَةٌ بِذَاتِهٖ'' یعنی ''خدا کے لیے بہت سی صفتیں بھی ہیں جو ازلی (ہمیشہ رہنے والی) ہیں اور خدا کی ذات میں قائم ہیں''۔ (بقیہ صفحہ مابعد)

(بقیہ صفحہ ماقبل) اس عبارت کی شرح میں علامہ تفتازانی اس کتاب کے صفحہ ۷۶ میں لکھتے ہیں۔

وَ مَعْلُومٌ اَنَّ كُلًّا مِّنْ ذٰلِكَ يَدُلُّ عَلٰى مَعْنًى زَائِدٍ عَلٰى مَفْهُومِ الْوَاجِبِ وَ لَيْسَ الْكُلُّ اَلْفَاظًا مُتَرَادِفَةً وَ اَنَّ صِدْقَ الْمُشْتَقِّ عَلَى الشَّيْءِ يَقْتَضِيْ ثُبُوْتَ مَاخَذِ الِاشْتِقَاقِ لَهٗ فَثَبَتَ لَهٗ صِفَةُ الْعِلْمِ وَالْقُدْرَةِ وَالْحَيٰوةِ وَ غَيْرُ ذٰلِكَ.

یعنی یہ بات معلوم ہے کہ خدا کے ہر صفت یہ واضح کرتی ہے کہ وہ مفہوم واجب سے زائد ہے (یعنی خدا کی صفتیں عین ذات نہیں ہیں بلکہ زائد برذات ہیں) اور کل صفتیں مترادف الفاظ نہیں ہیں اور یہ کہ کسی جز پر مشتق کا صادق آنا اس کو مقتضی ہوتا ہے کہ اشتقاق کا ماخذ بھی اس چیز کے لیے ثابت ہو۔ تو خدا کے لیے علم اور قدرت اور حیات وغیرہ کی صفتیں ثابت ہوگئیں۔

پھر ''قَائِمَةٌ بِذَاتِهٖ'' کی شرح میں لکھتے ہیں:

''ضَرُوْرَةٌ اِنَّهٗ لَا مَعْنٰى لِصِفَةِ الشَّيْءِ اِلَّا مَا يَقُوْمُ بِهٖ'' یعنی ''خدا کی صفتیں اس کی ذات میں قائم اس وجہ سے ہیں کہ یہ بدیہی بات ہے کہ کسی چیز کی صفت ہونے کا اس کے علاوہ اور کوئی معنی ہی نہیں ہے کہ وہ بات اس چیز میں قائم ہو''۔

رہے شیعوں کے عقائد تو علامہ حلی علیہ الرحمہ کی کتاب کشف الحق ونہج الصدق کے باب توحید کی آٹھویں بحث سے واضح ہوگا جو یہ ہے چونکہ عبارت طویل ہے اس وجہ سے صرف ترجمہ لکھا جاتا ہے آٹھویں بحث یہ کہ قدیم صرف خدا ہے اور قدیم ہونے میں کوئی چیز بھی اس کی شریک نہیں ہے۔ عقلی اور نقلی دونوں دلیلیں اس پر متفق ہیں کہ صرف خدا کی ذات قدیم ہے اور یہ کہ ازل میں اس کے سوا کوئی نہ تھا کیونکہ اس کے سوا ہر چیز ممکن ہے اور ہر ممکن حادث ہوتا ہے اور خدا نے بھی فرمایا ہے کہ ﴿ هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ ﴾ کہ ''وہی اول اور وہی آخر ہے'' مگر اشاعرہ (یعنی اہل سنت) نے خدا کے ساتھ آٹھ معنی کو بھی قدیم مانا ہے کہ وہی معانی خدا کی صفتوں کی علتیں ہیں۔ مثل قدرت، علم اور حیات وغیرہ کے۔ اور اس اعتقاد سے انہیں بہت سی محال باتوں کا اعتقاد کرنا پڑتا ہے مثلاً خدا کے علاوہ بھی کچھ چیزوں کو قدیم ماننا پڑتا ہے چنانچہ امام فخر الدین رازی نے کہا ہے کہ عیسائی اس وجہ سے کافر ہوگئے کہ انہوں نے تین کو قدیم مانا ہے اور ہمارے ہم مذہب اشاعرہ نو کو قدیم مانتے ہیں۔

اسی مطلب کو حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے نہج البلاغہ کے شروع میں یوں واضح کیا ہے:

وَ كَمَالُ الْاِخْلَاصِ لَهٗ نَفْيُ الصِّفَاتِ عَنْهُ. لِشَهَادَةِ كُلِّ صِفَةٍ اَنَّهَا غَيْرُ الْمَوْصُوْفِ، وَ شَهَادَةِ كُلِّ مَوْصُوْفٍ اَنَّهٗ غَيْرُ الصِّفَةِ. فَمَنْ وَّصَفَ اللّٰهَ سُبْحَانَهٗ فَقَدْ قَرَنَهٗ، وَ مَنْ قَرَنَهٗ فَقَدْ ثَنَّاهُ، وَ مَنْ ثَنَّاهُ فَقَدْ جَزَّاَهٗ، وَ مَنْ جَزَّاَهٗ فَقَدْ جَهِلَهٗ۔

یعنی اخلاص اسی کا کامل ہوسکتا ہے جس نے خدا کی صفت زائدہ پر ذات کا انکار کیا ورنہ اس نے خدا کا ہمسر مانا اور جس نے اس کا ہمسر مانا اس نے اس کا ثانی ٹھہرایا اور جس نے ثانی ٹھہرایا اس نے اس کا تجزیہ کیا اور جس نے تجزیہ کیا وہ اس سے جاہل رہا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَسْبِقْ لَهٗ حَالٌ حَالًا، فَیَكُوْنَ اَوَّلًا قَبْلَ اَنْ یَّكُوْنَ اٰخِرًا، وَ یَكُوْنَ ظَاهِرًا قَبْلَ اَنْ یَّكُوْنَ بَاطِنًا.

جمیع حمد ونعت اسی خدا کے لیے مخصوص ہے جس پر ایک حالت سے پہلے کوئی حالت نہیں گزری ہے جس سے وہ آخر ہونے سے قبل اوّل سمجھا جائے اور باطن ہونے سے پہلے ظاہر ہو۔

كُلُّ مُسَمًّى بِالْوَحْدَةِ غَیْرُهٗ قَلِیْلٌ، وَ كُلُّ عَزِیْزٍ غَیْرُهٗ ذَلِیْلٌ، وَ كُلُّ قَوِیٍّ غَیْرُهٗ ضَعِیْفٌ، وَ كُلُّ مَالِكٍ غَیْرُهٗ مَمْلُوْكٌ، وَ كُلُّ عَالِمٍ غَیْرُهٗ مُتَعَلِّمٌ، وَ كُلُّ قَادِرٍ غَیْرُهٗ یَقْدِرُ وَ یَعْجِزُ، وَ كُلُّ سَمِیْعٍ غَیْرُهٗ یَصَمُّ عَنْ لَّطِیْفِ الْاَصْوَاتِ، وَ یُصِمُّهٗ كَبِیْرُهَا، وَ یَذْهَبُ عَنْهُ مَا بَعُدَ مِنْهَا، وَ كُلُّ بَصِیْرٍ غَیْرُهٗ یَعْمٰى عَنْ خَفِیِّ الْاَلْوَانِ وَ لَطِیْفِ الْاَجْسَامِ، وَ كُلُّ ظَاهِرٍ غَیْرُهٗ غَیْرُ بَاطِنٍ، وَ كُلُّ بَاطِنٍ غَیْرُهٗ غَیْرُ ظَاهِرٍ.

اس کے سوا جو چیز یکتائی کے ساتھ موسوم ہوئی وہ قلیل ہے اور اس کے سوا ہر عزیز ذلیل ہے اور اس کے سوا ہر مضبوط کمزور ہے اور اس کے سوا ہر مالک (درحقیقت) مملوک (یعنی دوسرے کی ملکیت کا) ہے اور اس کے سوا ہر عالم طالب العلم ہے اور اس کے سوا ہر قدرت رکھنے والا (بعض چیزوں کی تو) قدرت رکھتا ہے اور (بہت سی چیزوں سے) عاجز رہتا ہے اور اس کے سوا ہر سُننے والا ہلکی آوازوں سے بہرا ہوتا ہے اور بڑی آواز اسے بہرا کر دیتی ہے اور جو چیز اس سے دور ہوتی ہے وہ اس سے زائل ہو جاتی ہے اور اس کے سوا ہر دیکھنے والا پوشیدہ رنگوں اور چھوٹے جسموں (کے دیکھنے) سے اندھا ہوتا ہے اور اس کے سوا ہر ظاہر (ظاہر ہی ہے اس میں) باطن (ہونے کی صفت) نہیں ہے اور اس کے سوا ہر باطن (باطن ہی ہے اس میں) ظاہر (ہونے کی صفت) نہیں ہے۔

لَمْ یَخْلُقْ مَا خَلَقَهٗ لِتَشْدِیْدِ سُلْطَانٍ، وَ لَا تَخَوُّفٍ مِنْ عَوَاقِبِ زَمَانٍ، وَ لَا اسْتِعَانَةٍ عَلٰى نِدٍّ مُّثَاوِرٍ، وَ لَا شَرِیْكٍ مُّكَاثِرٍ، وَ لَا ضِدٍّ مُّنَافِرٍ، وَ لٰكِنْ خَلَآئِقُ

اس نے جس چیز کو بھی پیدا کیا اسے (کسی قوت و) تسلط کے مضبوط کرنے کی غرض سے نہیں پیدا کیا ہے اور نہ زمانہ کے انجاموں سے ڈرنے کی وجہ سے اور نہ کسی حملہ کرنے والے مقابل اور نہ کثرت والے شریک اور نہ منافرت کرنے والے ضد کے مقابلہ میں مدد حاصل کرنے

مَرْبُوْبُوْنَ، وَ عِبَادٌ دَاخِرُوْنَ، لَمْ يَحْلُلْ فِي الْاَشْيَآءِ فَيُقَالَ: هُوَ فِيْهَا كَآئِنٌ، وَ لَمْ يَنْأَ عَنْهَا فَيُقَالَ: هُوَ مِنْهَا بَآئِنٌ.

کے لیے بلکہ سب کے سب اسی کے پروردہ مخلوق اور ذلیل بندے ہیں۔[1] اس نے چیزوں میں حلول نہیں کیا ہے تا کہ کہا جائے وہ انہی میں ہے اور ان سے الگ (بھی) نہیں ہے تا کہ کہا جائے وہ ان سے دور ہے۔[2]

---

[1] مقصود یہ ہے کہ خدا نے جو عالم کو پیدا کیا تو ان اغراض کے لیے نہیں جو یہاں ذکر کیے گئے۔ بلکہ صرف مخلوقات پر احسان کرنے اور انہیں اپنی نعمتوں سے متمتع کرنے کے لیے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ خدا نے حیوانات کو زندگی بخشی تو یہ ان کے لیے بڑی نعمت ہے کیونکہ نعمت کی حقیقت ان میں موجود ہے اس لیے کہ نعمت کی تعریف یہ ہے کہ کسی کو صرف اس کے ساتھ بھلائی کرنے کی نیت سے کوئی منفعت پہنچائی جائے تو حیوانات کے جسم کا زندہ موجود ہونا ایسی منفعت ہے جو ان کو بھلائی کرنے کی غرض سے پہنچائی گئی ہے کہ اس حالت میں خوشی حاصل کریں۔ لذیذ چیزوں کا مزہ اٹھائیں۔ آرام دہ چیزوں سے راحت پائیں۔ اسی مطلب کو حضرتؑ نے دو لفظوں میں ادا فرما دیا کہ اس کی مخلوقات اس لیے پیدا کی گئی ہے کہ خدا ان کی پرورش کرے انہیں دنیا کی لذتیں دے اور نعمتوں سے سرفراز کرے ''وَ عِبَادُهٗ آخَرُوْنَ''۔ یعنی یہ بندے حقیر و ذلیل تھے انہیں عزت دینے اور محترم کرنے کے لیے پیدا کیا۔

یہاں اگر یہ شبہ پیدا ہو کہ خدا نے دنیا میں حیوان اور غیر حیوان سب کو پیدا کیا ہے اور حضرتؑ نے اپنے کلام میں صرف حیوانوں کی پیدائش کی وجہ ذکر کی ہے حالانکہ مخلوق صرف حیوان ہی میں منحصر نہیں ہیں بلکہ غیر حیوان بھی ہیں تو غیر حیوان مثلاً لکڑی، پتھر، مادنیات، پانی، مٹی وغیرہ کے پیدا کرنے کی وجہ نہیں ذکر کی تو اس کا دفع کرنا آسان ہے کہ ان کل چیزوں کو خدا نے حیوانوں ہی کے آرام اور عیش کے لیے پیدا کیا ہے کہ اگر یہ چیزیں نہ پیدا ہوتیں تو حیوانات اور خصوصاً انسان جو اشرف مخلوقات ہے دنیا میں آرام اور خوشی کے ساتھ کیوں کر بسر کرتے، دنیا کی لذتوں کا مزہ کس طرح پاتے، زینت اور آرائش کی صورتیں کیوں کر پوری ہوتیں۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ خدا نے دنیا میں جو چیز پیدا کی ہے وہ کسی اچھی غرض ہی سے نہ بیکار۔

[2] حضرتؑ کے اس قول سے بھی مذہب شیعہ کی حقیت ثابت ہوئی جو کہتا ہے کہ خدا کسی کے ساتھ متحد نہیں ہوتا اور وہ کسی شے میں حلول نہیں کر سکتا۔ اس کے ساتھ فرقہ اہل سنت کے ایک بڑے عظیم الشان گروہ یعنی صوفیوں کے اعتقاد کا باطل ہونا بھی واضح ہوا جو اعتقاد رکھتے ہیں کہ خداوند عالم عارفین (پیروں) کے جسموں کے ساتھ متحد (یعنی مل کر ایک) ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض لوگ اس میں حد سے گزر گئے اور یہ بھی کہنے لگے کہ ''خدائے تعالیٰ ہی نفس وجود ہے اور دنیا میں جو چیز موجود ہے وہ خدا ہی خدا ہے''۔

علامہ ابن ابی الحدید معتزلی بھی ان صوفیوں کی طرف اشارہ کر گئے ہیں۔ چنانچہ اس عبارت کی شرح میں لکھتے ہیں:

''كَالَّذِيْنَ قَالُوْا بِحُلُوْلِهٖ فِيْ اَشْخَاصٍ يَعْتَقِدُوْنَ فِيْهَا اِظْهَارَهٗ كَالْحَلَاجِيَّةِ''۔

یعنی مثل ان لوگوں کے جن کا اعتقاد ہے کہ خدا ان لوگوں میں حلول کیے ہوئے ہے جن میں خدا کے ظاہر ہونے کا اعتقاد وہ لوگ رکھتے ہیں مثل فرقہ حلاجیہ کے۔

(یعنی ان صوفیوں کے جو اپنے پیر و مرشد حسین بن منصور حلاج کے پیرو ہیں) مگر ان لوگوں کا شمار مسلمانوں میں نہیں ہو سکتا۔

(بقیہ صفحہ آئندہ)

لَمْ يَؤُدْهُ خَلْقُ مَا ابْتَدَاَ، وَ لَا تَدْبِيْرُ مَا ذَرَاَ، وَ لَا وَقَفَ بِهٖ عَجْزٌ عَمَّا خَلَقَ، وَ لَا وَلَجَتْ عَلَيْهِ شُبْهَةٌ فِيْمَا قَضٰى وَ قَدَّرَ، بَلْ

اس نے جس چیز کی ایجاد کی اس کی پیدائش نے اسے تھکا نہیں دیا ہے اور جس چیز کو اس نے پیدا کیا ہے اس کی تدبیر نے اسے بے بس نہیں کر دیا ہے اور جس چیز کو اس نے خلق کر دیا اس سے کوئی عاجزی اس کو لاحق نہیں ہوئی اور

(بقیہ صفحہ ماقبل) چنانچہ علامہ ابن ابی الحدید کی عبارت بھی یہی بیان کرتی ہے جیسا کہ وہ لکھتے ہیں:

وَالْمُسْلِمُوْنَ كُلُّهُمْ مُتَّفِقُوْنَ عَلٰى اَنَّهٗ تَعَالٰى يَسْتَحِيْلُ اَنْ يَّحُلَّ فِيْ شَيْءٍ اِلَّا مَنِ اعْتَزٰى اِلَى الْاِسْلَامِ... كَاَ الْحُلَاجِيَّةِ۔

یعنی مسلمان سب کے سب اس اعتقاد میں متفق ہیں کہ خدا کا کسی چیز میں حلول کرنا محال ہے۔ سوا ان لوگوں کے جو (درحقیقت مسلمان تو نہیں ہیں لیکن) اپنے کو خواہ مخواہ مسلمان مشہور کرتے ہیں جیسے فرقہ حلاجیہ۔

آخر میں جو حضرت امیر المومنینؑ نے فرمایا کہ ''اَلْمَاْمُوْلُ مَعَ النِّقَمِ، الْمَرْهُوْبُ مَعَ النِّعَمِ''۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جب خدا ہمیں ہمارے گناہوں کی سزا دے یا سختیوں میں مبتلا کرے جب بھی اس سے رحم اور کرم کی امید رہتی ہے کیونکہ وہ غفور، کریم اور ارحم الراحمین ہے اور جب وہ نعمتیں دے جب بھی اس کی جلالت اور جباریت سے بندوں کو خوفزدہ ہی رہنا چاہیے یہی شان ایمان ہے کہ خدا سے امید بھی رہے اور خوف بھی کیا جائے۔

علامہ ابن ابی الحدید اس جملہ کی شرح میں لکھتے ہیں:

وَ اَمَّا قَوْلُهٗ: اَلْمَاْمُوْلُ مَعَ النِّقَمِ، الْمَرْهُوْبُ مَعَ النِّعَمِ، فَمَعْنٰى لَطِيْفٌ وَ اِلَيْهِ وَقَعَتِ الْاِشَارَةُ بِقَوْلِهٖ تَعَالٰى۔

﴿اَوَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰٓى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًى وَّهُمْ يَلْعَبُوْنَ﴾ (سورۂ اعراف، آیہ ۹۸)

وَ قَوْلُهٗ سُبْحَانَهٗ ﴿سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ (سورۂ القلم، آیہ ۴۴)

وَ قَوْلُهٗ تَعَالٰى ﴿فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝﴾ (سورۂ الانشراح، آیہ ۵-۶)

وَ قَوْلُهٗ سُبْحَانَهٗ ﴿فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّ يَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ۝۱۹﴾ (سورۂ النساء، آیہ ۱۹)

یعنی حضرت امیر المومنینؑ کا یہ قول کہ انتقاموں کے ساتھ بھی اس سے رحمت کی امید کی جاتی ہے اور نعمتوں کے ساتھ بھی اس سے ڈرا جاتا ہے۔ تو یہ نہایت لطیف نکتہ ہے اور خداوند عالم نے بھی قرآن مجید میں اس مضمون کی طرف اشارہ کیا ہے فرماتا ہے کہ ''کیا (ان) بستیوں والوں کو اس امر سے اطمینان ہو گیا ہے کہ شب کو یا چاشت کے وقت ان پر خدا کا عذاب نازل نہ ہو جائے گا اور وہ اپنے لہو ولعب ہی میں مشغول رہیں گے'' پھر فرمایا ''ہم انہیں آہستہ آہستہ کھینچیں گے اس طرح کہ انہیں خبر بھی نہ ہوگی'' پھر فرمایا ہو سکتا ہے کہ ''تم کسی چیز کو ناپسند کرو مگر خدا اسی میں تمہارے لیے بہت سی بھلائیاں مہیّا کر دے۔

قَضَآءٌ مُّتْقَنٌ، وَ عِلْمٌ مُّحْكَمٌ، وَ اَمْرٌ مُّبْرَمٌ. اَلْمَأْمُوْلُ مَعَ النِّقَمِ، اَلْمَرْهُوْبُ مَعَ النِّعَمِ.

جس میں اس نے جو حکم اور تقدیر جاری کی اس میں کوئی شبہ اس کو پیدا نہیں ہوا بلکہ (اس کا حکم) قضاء مبرم اور علم محکم اور امر قطعی ہے۔ (اور وہ ایسا ارحم الراحمین ہے کہ) انتقاموں کے ساتھ بھی اس سے اُمید (رحمت) کی جاتی ہے اور (وہ ایسا جبار وقہار ہے کہ) نعمتوں کے ساتھ بھی اس سے ڈرا جاتا ہے۔

❁ خطبہ: ۶۴ ❁

وَ مِنْ كَلَامٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

كَانَ يَقُوْلُهٗ لِاَصْحَابِهٖ فِيْ بَعْضِ اَيَّامِ صِفِّيْنَ:

مَعَاشِرَ الْمُسْلِمِيْنَ! اسْتَشْعِرُوا الْخَشْيَةَ، وَ تَجَلْبَبُوا السَّكِيْنَةَ، وَ عَضُّوْا عَلَى النَّوَاجِذِ، فَاِنَّهٗۤ اَنْبٰى لِلسُّيُوْفِ عَنِ الْهَامِ.

وَ اَكْمِلُوا اللَّاْمَةَ، وَ قَلْقِلُوا السُّيُوْفَ فِيْۤ اَغْمَادِهَا قَبْلَ سَلِّهَا. وَ الْحَظُوا الْخَزْرَ، وَ اطْعُنُوا الشَّزْرَ، وَ نَافِحُوْا بِالظُّبَا، وَ صِلُوا السُّيُوْفَ بِالْخُطَا. وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ بِعَيْنِ اللّٰهِ، وَ مَعَ ابْنِ عَمِّ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم.

فَعَاوِدُوا الْكَرَّ، وَ اسْتَحْيُوْا مِنَ الْفَرِّ، فَاِنَّهٗ عَارٌ فِي الْاَعْقَابِ، وَ نَارٌ يَّوْمَ

خطبہ (۶۴)

حضرت علیہ السلام کے ایک کلام کا کچھ حصّہ

جسے اپنے اصحاب سے جنگ صِفّین کے بعض دنوں میں ارشاد فرماتے تھے۔

گروہِ مسلمین! خوف (خدا) کو (مثل لباس کے) پہن لو اور سکینہ (ووقار) کو (مثل چادر کے) اُوڑھ لو اور دانتوں کو خوب جمائے رہو کہ یہ (تدبیر) تلواروں کو سروں سے زیادہ دور کرنے والی ہے۔

اور (ناقص) زرہ کو کامل کر لو اور تلواروں کو کھینچنے سے پہلے ان کی نیاموں میں ہلا کر (جھنکار) لو اور کنکھیوں سے (دشمن کو بہ غضب) دیکھتے رہو اور دائیں بائیں سے نیزہ بازی کیے جاؤ اور (انہیں) تلواروں کی باڑ پر دھر لو اور تلواروں کو (دشمن تک اپنے) قدموں سے ملا دو اور اس کا یقین رکھو کہ تم خدا کی نظر کے سامنے اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچازاد بھائی کے ساتھ ہو۔

تو بار بار حملہ کرو اور بھاگنے سے شرماؤ کہ یہ (عیب) تمہاری اولاد میں ننگ رہے گا اور بروز قیامت

الْحِسَابِ، وَ طِيْبُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمْ نَفْسًا، وَ امْشُوْا اِلَى الْمَوْتِ مَشْيًا سُجُحًا، وَ عَلَيْكُمْ بِهٰذَا السَّوَادِ الْاَعْظَمِ، وَ الرِّوَاقِ الْمُطَنَّبِ، فَاضْرِبُوْا ثَبَجَهٗ، فَاِنَّ الشَّيْطٰنَ كَامِنٌ فِيْ كِسْرِهٖ، قَدْ قَدَّمَ لِلْوَثْبَةِ يَدًا، وَ اَخَّرَ لِلنُّكُوْصِ رِجْلًا فَصَمْدًا صَمْدًا! حَتّٰى يَنْجَلِيَ لَكُمْ عَمُوْدُ الْحَقِّ، ﴿وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ وَ اللّٰهُ مَعَكُمْ وَ لَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ﴾.

(تمہارے) جہنم (میں جانے کا سبب) قرار پائے گا اور اپنی جانوں کو (راہ خدا میں) نکلنے پر خوشی سے آمادہ کرو اور موت کی طرف نرم رفتاری سے بڑھے چلو اور تم پر لازم ہے کہ (لشکر شام کے) اس سیاہ دل کے دل اور طنابوں والے قبہ (یعنی خیمہ معاویہ) کو تاک لو پھر اس کے درمیان تلوار کا وار کرو کیونکہ شیطان اس کی آڑ میں چھپا ہوا ہے (جس نے) اچھلنے کے لیے ایک ہاتھ کو آگے اور (جلد) پلٹ جانے کے لیے ایک پاؤں کو پیچھے کر رکھا ہے۔ تو بڑھو! بڑھو!! یہاں تک تمہارے لیے حق کا نور ظاہر ہو جائے اور (یقیناً) تم ہی غالب ہو اور خدا تمہارے ہی ساتھ ہے اور وہ تمہارے اعمال کی جزا میں کمی نہیں کرے گا۔[1]

---

[1] اس خطبہ کی شرح میں علامہ ابن ابی الحدید معتزلی تحریر فرماتے ہیں ''اکثر روایات میں ہے کہ حضرت امیر المومنینؑ نے اسے جنگ صفین کی لیلۃ الہریر میں ارشاد فرمایا ہے۔ مگر نصر بن مزاحم کی روایت میں ہے کہ جنگ صفین کی ابتدا ہی میں فرمایا تھا جو ماہ صفر ۳۷ھ میں ہوئی تھی۔ نصر بیان کرتا ہے کہ جنگ شروع ہونے سے پہلے حضرتؑ بار بار مسلمانوں کے حق میں دعا فرماتے تھے اور تمام تر خدا ہی کی طرف متوجہ تھے اور لشکر کی صفوں کے سامنے کھڑے ہو کر خدائے تعالیٰ سے یوں عرض کرتے تھے۔ اے ہمارے خدا، اے اس سقف بلند و محفوظ (یعنی آسمان) اور اس نظام مقرر پر قائم فضا کے پروردگار، جس کو تو نے روشنی اور تاریکی کا منبع اور چاند سورج اور ستاروں کا جولانگاہ قرار دیا ہے اور جس میں تو نے اس گروہ ملائک کو جگہ دی ہے جو تیری عبادت سے کبھی نہیں تھکتے۔ اے اس زمین کے پروردگار جس کو تو نے انسانوں اور رینگنے والے جانوروں اور چوپایوں کے ٹھہرنے کی جگہ قرار دی ہے۔ تیری اس مخلوق کا جو نظر آتی ہے اور اس کا جو نظر نہیں آتی شمار بھی نہیں ہو سکتا۔ اے ان کشتیوں کے پروردگار جو دریاؤں میں چل پھر کر لوگوں کو نفع پہنچاتی ہیں۔ اے ان بادلوں کے پروردگار جو مابین زمین و آسمان تیرے زیر حکم ہیں۔ اے اس دریائے منبع آب باراں کے پروردگار جو اس عالَم کے گرد محیط ہے۔ اے ان پابرجا پہاڑوں کے پروردگار جو زمین کو دبائے ہوئے ہیں اور تیری مخلوق کے لیے مامن اور محل انتفاع ہیں۔ اگر تو اپنے فضل سے ہم کو ہمارے دشمن پر فتح دے تو اپنی رحمت سے ہمیں سرکشی اختیار کرنے سے بچانا اور حق پر قائم رہنے کی توفیق دینا اور اگر بہ اقتضائے مصلحت ہمارے دشمنوں کا ہم پر غلبہ دے تو مجھ کو درجہ شہادت عطا فرمانا اور جو میرے اصحاب باقی رہ جائیں ان کو فتنہ میں پڑ جانے سے بچانا (یہ دعا تاریخ طبری جلد ۶ صفحہ ۸ وغیرہ میں بھی مذکور ہے)۔

❁ خطبہ :٦٥ ❁

وَ مِنْ كَلَامٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

فِيْ مَعْنَى الْاَنْصَارِ:

قَالُوْا: لَمَّا انْتَهَتْ اِلٰى اَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ عليه السلام اَنْبَآءُ السَّقِيْفَةِ بَعْدَ وَفَاةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلى الله عليه وآله وسلم، قَالَ عليه السلام: مَا قَالَتِ الْاَنْصَارُ؟ قَالُوْا: قَالَتْ: مِنَّآ اَمِيْرٌ وَ مِنْكُمْ اَمِيْرٌ. قَالَ عليه السلام: فَهَلَّا احْتَجَجْتُمْ عَلَيْهِمْ: بِاَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلى الله عليه وآله وسلم وَصّٰى بِاَنْ يُّحْسَنَ اِلٰى مُحْسِنِهِمْ وَ يُتَجَاوَزَ عَنْ مُّسِيْٓئِهِمْ؟ قَالُوْا: وَ مَا فِيْ هٰذَا مِنَ الْحُجَّةِ عَلَيْهِمْ؟

خطبہ(٦٥)

حضرت علیہ السلام کے ایک کلام کا کچھ حصّہ۔

انصار (جناب رسالت مآب صلعم) کے مقصود (اور غرض) کے متعلق

لوگوں نے بیان کیا ہے کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد جب حضرت امیر المومنین علیہ السلام تک (واقعات) سقیفہ (بنی ساعدہ) کی خبریں پہنچیں تو (حضرت علیہ السلام) نے فرمایا (اس موقع پر) انصار نے کیا کہا؟ لوگوں نے عرض کی کہ انہوں نے کہا ایک حاکم ہم میں سے ہو اور ایک تم (مہاجرین) سے تو (حضرت) علیہ السلام نے فرمایا پھر تم لوگوں نے ان (انصار) کو یوں کیوں نہ قائل کیا کہ (حضرت) رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو وصیت فرمائی ہے کہ ان (انصار) کے نیکوکار کے ساتھ بھلائی اور ان کے بدکار سے درگزر کی جائے۔[1] لوگوں نے عرض کی اس میں

---

[1] علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ اس کلام میں حضرتؑ نے انصار کے متعلق جس وصیت رسول خداؐ کا ذکر کیا ہے وہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں مذکور ہے کہ حضرتؐ حالت مرض میں منبر پر تشریف لے گئے اور فرمایا۔

اُوْصِيْكُمْ بِالْاَنْصَارِ فَاِنَّهُمْ كَرِشِيْ وَ عَيْبَتِيْ وَ قَدْ قَضَوْا الَّذِيْ عَلَيْهِمْ وَ بَقِيَ الَّذِيْ لَهُمْ فَاقْبَلُوْا مِنْ مُحْسِنِهِمْ وَ تَجَاوَزُوْا عَنْ مُسِيْئِهِمْ.

یعنی انصار کے بارے میں تم سے میں وصیت کرتا ہوں کیونکہ وہ میرے مخصوصین اور مخلصین ہیں، جو ان کا فرض تھا وہ ادا کر چکے اور جو ان کا حق ہم پر ہے وہ باقی ہے تو ان کے نیکوں کاروں کی باتیں قبول کرنا اور ان کے بدکاروں سے درگزر کرنا۔

پس حضرت امیر المومنینؑ کا مطلب یہ ہے کہ اگر جناب رسالت مآبؐ انصار کا حق بھی خلافت میں سمجھتے تو انصار کے حق میں بھلائی کرنے کی وصیت مہاجرین سے نہ فرماتے بلکہ انصار ہی سے فرماتے۔ مگر علامہ ابن اثیر جزری کی تاریخ کامل سے معلوم ہوتا ہے کہ انصار نے درحقیقت خود خلیفہ بننے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ چاہتے تھے کہ حضرت علی علیہ السلام ہی آنحضرتؐ کے خلیفہ اول مقرر کیے جائیں۔

چنانچہ ممدوح لکھتے ہیں:

فَبَايَعَهٗ عُمَرُ وَ بَايَعَهُ النَّاسُ وَ قَالَتِ الْاَنْصَارُ اَوْ بَعْضُ الْاَنْصَارِ لَا نُبَايِعُ اِلَّا عَلِيًّا''۔

(بقیہ صفحہ بعد)

فَقَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ: لَوْ كَانَتِ الْاِمَارَةُ فِيْهِمْ لَمْ تَكُنِ الْوَصِيَّةُ بِهِمْ. ثُمَّ قَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ: فَمَاذَا قَالَتْ قُرَيْشٌ؟ قَالُوْا: احْتَجَّتْ بِاَنَّهَا شَجَرَةُ الرَّسُوْلِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ. فَقَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ: احْتَجُّوْا بِالشَّجَرَةِ وَ اَضَاعُوا الثَّمَرَةَ.

ان کے قائل ہونے کی کیا بات ہے؟ تو (حضرت) علیہ السلام نے فرمایا اگر (مسلمانوں پر) حکومت کرنے کا حق ان (انصار) کو بھی ہوتا تو (آنحضرت صلعم کی) وصیت ان کے متعلق نہیں ہوتی۔ اس کے بعد فرمایا پھر قریش (یعنی مہاجرین) نے کیا کہا؟ لوگوں نے عرض کی کہ انہوں نے یہ دلیل پیش کی کہ وہی (مہاجرین حضرت) رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درخت ہیں تو (حضرت) علیہ السلام نے فرمایا (کیا خوب!) انہوں نے درخت سے تو دلیل پیش کی اور (اس درخت کے) پھل کو ضائع کر دیا۔[1]

(بقیہ صفحہ ماقبل) یعنی حضرت عمر اور دوسرے مسلمانوں نے حضرت ابوبکر کے ہاتھ پر بیعت کی مگر کل انصار یا بعض انصار نے کہا کہ ہم سوا حضرت علیؑ کے اور کسی کی بیعت نہیں کریں گے۔

(اس مضمون کو بہت زیادہ تفصیل سے جناب علامہ حلی علیہ الرحمہ اور جناب شہید ثالث قاضی نور اللہ شوستری علیہ الرحمہ نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے اور دونوں عبارتوں کا اردو ترجمہ احقاق الحق جلد رابع مطبوعہ کجھوہ ضلع سارن میں شائع ہو چکا ہے)۔

[1] یعنی اگر قریش اس وجہ سے زیادہ مستحق خلافت ہیں کہ وہ آنحضرتؐ کے درخت (مخصوص) ہیں تو آنحضرتؐ کے اہل بیت قریش سے بھی زیادہ خلافت کا حق رکھتے ہیں کیونکہ ان کی خصوصیت کہیں زیادہ بڑھی ہوئی ہے اس درجہ کہ یہ گویا آنحضرتؐ کے پھل ہیں اور پھل کا حق درخت سے زیادہ ہوتا ہے۔

اور تاریخ طبری مطبوعہ مصر جلد ۳ صفحہ ۲۰۹ میں ہے کہ جس وقت انصار نے کہا ''فَمِنَّا اَمِيْرٌ وَ مِنْهُمْ اَمِيْرٌ'' یعنی مسلمانوں کا ایک حاکم ہم انصار سے مقرر ہو اور ایک حاکم ان مہاجرین سے۔

فَقَالَ عُمَرُ: هَيْهَاتَ لَا يَجْتَمِعُ اثْنَانِ فِيْ قَرْنٍ! وَاللّٰهُ لَا تَرْضَى الْعَرَبُ اَنْ يُّؤَمِّرُوْكُمْ وَنَبِيُّهَا مِنْ غَيْرِكُمْ، وَلَكِنَّ الْعَرَبَ لَا تَمْتَنِعُ اَنْ تُوَلِّيَ اَمْرَهَا مَنْ كَانَتِ النُّبُوَّةَ فِيهِمْ وَلَّ اُمُوْرَهُمْ مِنْهُمْ، وَلَنَا بِذٰلِكَ عَلٰى مَنْ اَبٰى مِنَ الْعَرَبِ الْحُجَّةَ الظَّاهِرَةَ وَالسُّلْطَانَ الْمُبِيْنَ، مَنْ ذَا يُنَازِعُنَا سُلْطَانَ مُحَمَّدٍ وَاِمَارَتَهٗ، وَنَحْنُ اَوْلِيَاءُهٗ وَعَشِيْرَتُهٗ اِلَّا مُدِلٌّ بِبَاطِلٍ، اَوْ مُتَجَانِفٌ لِاِثْمٍ، اَوْ مُتَوَرِّطٌ فِيْ هَلَكَةٍ!۔

(بقیہ صفحہ مابعد) یعنی انصار کا وہ قول سن کر حضرت عمر کھڑے ہو گئے اور فرمایا ہرگز ہرگز نہیں ایک حکومت میں دو شخص جمع نہیں ہو سکتے خدا کی قسم عرب کے باشندے کبھی اس پر راضی نہیں ہوں گے کہ تم انصار کو وہ اپنا حاکم بنائیں حالانکہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تم

میں سے نہیں تھے بلکہ ہم مہاجرین سے تھے۔ ہاں عرب اس کو ناپسند نہیں کریں گے کہ خلافت بھی انہیں لوگوں میں رہے جن میں نبوت تھی اور جو پہلے بھی ان کے حاکم اور سردار تھے تو عرب سے جو شخص اس اصول کا انکار کرے گا اس پر ہمیں ظاہری غلبہ اور سلطان مبین حاصل ہے۔ آنحضرتؐ کی خلافت کے بارے میں ہم سے کون شخص نزاع کر سکتا ہے حالانکہ ہم حضرتؐ کے اولیا اور ان کے خاندان والے ہیں اور ایسا کرنے والا اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہی جو باطل سے دلیل لانے والا، گناہ کی طرف میل کرنے والا یا ہلاکت میں گرنے والا ہو۔

پس حضرت عمر نے انصار پر جو دلیل قائم کی ہے کہ ہم مہاجرین چونکہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اولیا اور ان کے خاندان والے ہیں اور ہم میں ہی نبوت رہی ہے تو یہی دلیل حضرت امیر المومنینؑ اور امام حسنؑ و حسینؑ کے لیے زیادہ قوی ہو جاتی ہے کہ مہاجرین سے بھی جس خاندان (یعنی بنی ہاشم) میں نبوت رہی ہے اسی میں خلافت بھی ہونی چاہیے کیونکہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاص بنی ہاشم ہی سے تھے نہ کسی اور قبیلہ سے۔

اور علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ اسی طرح حضرت عباس نے خلیفہ اول صاحب سے کہا تھا کہ آپ نے یہ جو کہا کہ ''ہم آنحضرتؐ کے درخت ہیں'' تو درحقیقت آپ لوگ اس شجرۂ نبوت کے ہمسایہ ہیں اور اس کی شاخیں ہم (بنی ہاشم) ہیں، انہیں حضرت عباس نے یہ شعر بھی کہے۔

مَا كُنْتُ اَحْسِبُ اَنَّ الْاَمْرَ مُنْصَرِفٌ عَنْ هَاشِمٍ ثُمَّ عَنْهُمْ عَنْ اَبِيْ حَسَنٍ
عَنْ اَوَّلِ النَّاسِ اِيْمَانًا وَسَابِقَةً اَعْلَمِ النَّاسِ بِالْقُرْاٰنِ وَالسُّنَنِ
وَاٰخِرُ النَّاسِ عَهْدًا بِالنَّبِيِّ وَمَنْ جِبْرِيْلَ عَوْنٌ لَهٗ فِي الْغُسْلِ وَالْكَفَنِ
مَنْ فِيْهِ مَا فِيهِمْ لَا يَمْتَرُوْنَ بِهٖ وَلَيْسَ فِي الْقَوْمِ مَا فِيْهِ مِنَ الْحُسْنِ

جن کا ترجمہ یہ ہے:

نہ دانم خلافت چرا منصرف شد۔ زہاشم و آنگاہ از ابوالحسن۔ نہ اولیس مقبل قبلہ بود۔ نہ او بود عالم بفرض و سنن۔ نہ اقرب بعہد نبی بود و بود۔ معیں جبرئیلش بغسل و کفن۔ نہ او مجمع حسن اوصاف گشت۔ زقدر علی و زخلق حسن۔

یعنی یہ وہم و گمان بھی نہ تھا کہ بنی ہاشم خصوصاً حضرت علیؑ سے خلافت نکل جائے گی جو سب سے پہلے ایمان لائے اور سب سے زیادہ قرآن و احادیث کے عالم ہیں اور سب کے آخر تک حضرت رسول خداؐ کی خدمت میں رہے اور آنحضرتؐ کو غسل و کفن دینے میں جبریلؑ نے ان کی مدد کی۔ جو فضائل ان میں ہیں وہ کسی میں نہیں ہیں اور دوسروں میں ایسی کوئی فضیلت نہیں ہے جو حضرت علیؑ میں نہ ہو۔ (تاریخ ابوالفدا مطبوعہ مصر جلد اول)

عیسائی مؤرخین نے بھی بہت حیرت ظاہر کی ہے کہ حضرت علیؑ کے رہتے ہوئے مسلمانوں نے دوسروں کو کیونکر خلیفہ بنا لیا۔ جن میں مسٹر ڈیون پورٹ، ایرونگ، مصنفین انسائیکو پیڈیا، سڈیو مؤرخ فرانس، گبن وغیرہ بڑے پایہ کے محقق اور مؤرخ گزرے ہیں۔

❁ خطبہ :٦٦ ❁

وَ مِنْ كَلَامٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

لَمَّا قَلَّدَ مُحَمَّدَ بْنَ اَبِيْ بَكْرٍ مِّصْرَ فَمُلِكَتْ عَلَيْهِ وَ قُتِلَ:

وَ قَدْ اَرَدْتُّ تَوْلِيَةَ مِصْرَ هَاشِمَ بْنَ عُتْبَةَ، وَ لَوْ وَلَّيْتُهٗ اِيَّاهَا لَمَا خَلّٰى لَهُمُ الْعَرْصَةَ، وَ لَاَ اَنْهَزَهُمُ الْفُرْصَةَ، بِلَا ذَمٍّ لِّمُحَمَّدِ بْنِ اَبِيْ بَكْرٍ، فَلَقَدْ كَانَ اِلَيَّ حَبِيْبًا، وَ كَانَ لِيْ رَبِيْبًا.

خطبہ(٦٦)

حضرت علیہ السلام کے ایک کلام کا کچھ حصّہ۔

جب ملک مصر کو محمد بن ابی بکر (رضی اللہ عنہ) کے حوالہ کیا اور وہ مصر پہنچنے کے بعد قتل کر دیے گئے (تو حضرتؑ نے فرمایا)

اور میں نے تو چاہا تھا کہ مصر کا حاکم ہاشم بن عتبہ کو مقرر کروں اور اگر میں اس کو وہاں کا حاکم بنائے ہوتا تو وہ ان (دشمنوں) کے لیے میدان (جنگ) کو چھوڑتا اور نہ انہیں فرصت کا موقع دیتا۔ (میرا یہ کلام) بغیر محمد (بن ابی بکر) کی مذمت کے ہے کیونکہ وہ تو یقیناً مجھے (بہت) پیارا اور میرا پالا ہوا تھا۔[1]

---

[1] اس کا واقعہ یہ ہے کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے محمد بن ابی بکر کو (جو اسماء کے بطن سے حضرت ابوبکر کے صاحبزادے تھے اور خلیفہ اول کے انتقال پر حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے اسماء سے عقد کر لیا تو یہ محمد بھی اپنی ماں کے ساتھ حضرتؑ کے پاس رہے، اس طرح محمد، جناب امیر علیہ السلام کے پروردہ اور بوجہ اطاعت کرنے کے حضرتؑ کے پیارے تھے) مصر کا حاکم مقرر کیا تو معاویہ نے اپنی تدبیریں کر کے اہل مصر کو محمد بن ابی بکر کی مخالفت پر آمادہ کر دیا۔ صفر ۳۸ھ میں محمد بن ابی بکر کی ان لوگوں سے جنگ ہوئی اور محمد مغلوب ہو کر ایک خرابہ کی طرف بھاگے۔ معاویہ بن خدیج نے ان کو پکڑ کر پیاسا ہی ایک مرے ہوئے گدھے کے پیٹ میں رکھ کر زندہ جلا دیا۔ (تاریخ خمیس و مروج الذہب وغیرہ)

اسی کو حضرتؑ فرماتے ہیں کہ اگر میں ہاشم بن عتبہ کو مقرر کئے ہوتا تو وہ میدان جنگ سے بھاگ کر دشمنوں کو قبضہ کر لینے کا موقع نہیں دیتا۔ پھر یہ بھی فرما دیا کہ اس سے محمد کی مذمت بیان کرنا مقصود نہیں ہے کیونکہ وہ میرا پیارا اور میرے گود کا پالا تھا۔ چنانچہ جب محمد کے اس ذلت اور درندگی سے قتل کیے جانے کی خبر جناب امیرؑ کو پہنچی تو آپ کو کمال صدمہ ہوا اور بروایت تاریخ الخمیس فرمایا کہ وہ میرا ربیب تھا مگر میں تو اس کو بیٹا ہی سمجھتا تھا اور عبداللہ بن عباس کو اس واقعہ کی اطلاع دی جو حاکم بصرہ تھے۔ عبداللہ اپنے نائب کو چھوڑ کر جناب امیرؑ کی تسلی کے لیے کوفہ میں آئے اور اپنے دل میں ٹھان لیا کہ اب حضرتؑ کی خدمت سے جدا نہ ہوں گے اور جب حضرت عائشہ کو اپنے بھائی محمد کے اس طرح مارے جانے کی خبر پہنچی تو بہت روئیں پیٹیں اور معمول کر لیا کہ ہر نماز کے بعد معاویہ اور عمرو عاص کے لیے بددعا کرتی تھیں۔ (تاریخ طبری جلد ٦ صفحہ ٦٠ و کامل وغیرہ)۔

❁ خطبہ :٦٧ ❁

وَ مِنْ كَلَامٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

فِيْ ذَمِّ اَصْحَابِهٖ:

كَمْ اُدَارِيْكُمْ كَمَا تُدَارَى الْبِكَارُ الْعَمِدَةُ، وَ الثِّيَابُ الْمُتَدَاعِيَةُ! كُلَّمَا حِيْصَتْ مِنْ جَانِبٍ تَهَتَّكَتْ مِنْ اٰخَرَ، كُلَّمَا اَطَلَّ عَلَيْكُمْ مَنْسِرٌ مِّنْ مَّنَاسِرِ اَهْلِ الشَّامِ اَغْلَقَ كُلُّ رَجُلٍ مِّنْكُمْ بَابَهٗ، وَ انْجَحَرَ انْجِحَارَ الضَّبَّةِ فِيْ جُحْرِهَا، وَ الضَّبُعِ فِيْ وِجَارِهَا.

الذَّلِيْلُ وَاللّٰهِ! مَنْ نَّصَرْتُمُوْهُ! وَ مَنْ رُّمِيَ بِكُمْ فَقَدْ رُمِيَ بِاَفْوَقَ نَاصِلٍ. وَ اِنَّكُمْ ـ وَاللّٰهِ ـ لَكَثِيْرٌ فِي الْبَاحَاتِ، قَلِيْلٌ تَحْتَ الرَّايَاتِ، وَ اِنِّيْ لَعَالِمٌ بِمَا يُصْلِحُكُمْ، وَ يُقِيْمُ اَوَدَكُمْ، وَ لٰكِنِّيْ لَآ اَرٰى اِصْلَاحَكُمْ بِاِفْسَادِ نَفْسِيْ.

خطبہ (٦٧)

حضرت علیہ السلام کے ایک کلام کا کچھ حصّہ۔

اپنے ساتھیوں کی مذمت میں۔

میں کہاں تک تمہاری خاطر و مدارت کیے جاؤں جس طرح زخمی پشت کے جوان اونٹوں اور پُرانے کپڑوں کی دیکھ بھال کی جاتی ہے جو کسی ایک طرف سے سیا جاتا ہے تو دوسری جانب سے کُھلتا جاتا ہے۔ کیا جب بھی تم پر اہل شام کے لشکروں سے کوئی لشکر آ پہنچے گا تو تم میں کا ہر شخص اپنا دروازہ بند کر لے گا اور جس طرح سوسمار اپنے سوراخ میں اور بجّو اپنے بھٹ میں گھس جاتا ہے (تم میں کا ہر شخص اپنے گھر میں) چھپ رہے گا۔

خدا کی قسم جس کی تم نے مدد کی وہ (بہت) ذلیل ہے اور جس نے تم سے تیر اندازی کی اس نے (گویا) پیکان ٹوٹے ہوئے تیر پھینکے۔ خدا کی قسم یقیناً تم (مکان کے) صحنوں میں تو بہت زیادہ (مگر جنگ کے) جھنڈوں تلے بہت کم ہوتے ہو اور یقیناً میں اس (تدبیر) کو جانتا ہوں جو تمہاری اصلاح کر سکتی ہے اور تمہاری کجی کو مٹا دے گی مگر بخدا میری یہ رائے نہیں ہو سکتی کہ اپنے نفس کو خراب کر کے تمہیں درست کروں۔ [1]

---

[1] علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ حضرت علیؑ کا مقصود اس سے یہ ہے کہ ''سیاست میں تمہاری اصلاح کی تدبیر تلوار ہے کہ جو میرے حکم کی مخالفت کرے اس کو قتل کر دوں، تو حضرتؑ نے بہت سچ فرمایا کیونکہ اکثر لوگوں کی یہی حالت ہوتی ہے کہ بغیر سزا کے کوئی بات نہیں سنتے۔ چنانچہ حجاج نے اس لشکر کے ساتھ جو مہلب کے ہمراہ جانے سے پہلوتہی کر رہا تھا یہی کیا کہ ندا کر دی جو شخص مہلب کے ساتھ نہیں جائے گا اس کا خون حلال ہوگا اس کے بعد عمرو بن صابی وغیرہ کو قتل کر دیا، یہ دیکھتے ہی سب کے سب مہلب کے پاس دوڑتے ہوئے پہنچے مگر جس طرح دنیادار اپنی سلطنت کی سیاست اور حکومت کا تسلط قائم کرنے کے لیے مسلمانوں کی خونریزی جائز رکھتے ہیں اس طرح حضرت علیؑ تو نہیں کر سکتے تھے کیونکہ اس تدبیر سے گو آپ کی سلطنت مستحکم ہو جاتی مگر دینی اعتبار سے تو یہ فعل اچھا نہیں ہوتا۔ (شرح ابن ابی الحدید مطبوعہ ایران جلد ا ص ٣٤)

اَضْرَعَ اللّٰهُ خُدُوْدَكُمْ، وَ اَتْعَسَ جُدُوْدَكُمْ! لَا تَعْرِفُوْنَ الْحَقَّ كَمَعْرِفَتِكُمُ الْبَاطِلَ، وَ لَا تُبْطِلُوْنَ الْبَاطِلَ كَاِبْطَالِكُمُ الْحَقَّ!.

خدا تمہارے چہروں کو خوار کرے اور تمہارے (عزت و دولت کے) حصول کو ضائع کرے، تم جیسا باطل کا اعتقاد رکھتے ہو ویسا حق کا اعتقاد نہیں رکھتے اور جس طرح حق کو مٹاتے ہو اس طرح باطل کو نہیں توڑتے۔[1]

❁ خطبہ :۶۸ ❁

قَالَ عَلَيْهِ السَّلَام

فِي سُحْرَةِ الْيَوْمِ الَّذِي ضُرِبَ فِيهِ

مَلَكَتْنِي عَيْنِي وَ اَنَا جَالِسٌ، فَسَنَحَ لِي رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! مَاذَا لَقِيْتُ مِنْ اُمَّتِكَ مِنَ الْاَوَدِ وَ اللَّدَدِ؟ فَقَالَ: ''اُدْعُ عَلَيْهِمْ'' فَقُلْتُ: اَبْدَلَنِي اللّٰهُ

خطبہ(۶۸)

حضرت فرما چکے تھے کہ

جس روز حضرتؑ پر ضرب (شہادت) لگائی گئی اس کی صبح کو میں بیٹھا ہوا تھا کہ میری آنکھ جھپک گئی تو مجھ پر (حالت خواب میں) حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ظاہر ہوئے تو میں نے عرض کی اے (حضرت) رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں نے (آپؐ کے بعد) آپؐ کی امت سے کیسی (شدید) مخالفت اور عداوت دیکھی ہے تو حضرتؐ نے فرمایا (اے علی) ان لوگوں پر بد دعا کرو تو میں نے دعا

---

[1] اس خطبہ میں حضرتؑ اپنے لشکر والوں کی بزدلی اور سستی کی شکایت فرماتے ہیں کہ یہ لوگ حق کے لیے اپنا فرض انجام نہیں دیتے اور جان کے خوف سے جہاد پر آمادہ نہیں ہوتے اور تمہیں جس قدر اعتقاد باطل پر ہے اس قدر حق پر نہیں اور جتنی نفرت حق سے ہے اتنی باطل سے نہیں اسی وجہ سے یہ ضعف ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ اس خطبہ کی شرح کرتے ہوئے علامہ ابن ابی الحدید نے بہت سے بزدلوں کی حکایات بھی لکھی ہیں جن سے ایک یہ بھی ہے کہ ابن قتیبہ نے کتاب عیون الاخبار میں لکھا ہے کہ ایک روز عمرو عاص نے معاویہ کو ہنستے ہوئے دیکھا تو کہا خدا حضور کو ہمیشہ ہنستا رکھے اس وقت آپ کے ہنسنے کا کیا سبب ہے؟ معاویہ نے کہا مجھے جنگ صفین میں تمہارا حضرت علیؑ سے لڑنے کو جانا اور ان کا تمہیں قتل کرنے کے لیے تلوار اٹھانا اور تمہارا جھٹ اپنی شرمگاہ کو کھول دینا یاد پڑا، جس پر حضرت علیؑ نے اپنا منہ پھیر لیا اور تمہیں بھاگنے کا موقع مل گیا۔ اس پر عمرو عاص نے کہا حضور میں تو آپ کے بغل میں تھا جب حضرت علیؑ نے آپ کو ہی بلایا تھا کہ آؤ میں اور تم لڑ کر فیصلہ کر لیں تو آپ کی آنکھیں پتھرانے لگیں آپ کا چہرہ بگڑ گیا اور سانس پھولنے لگی اس خوف سے کہ حضرت علیؑ سے لڑنا پڑا تو جان نہیں بچے گی، پس اگر ہنسنا ہو تو اپنا واقعہ بھی یاد کیجیے ورنہ اس قصہ ہی کو جانے دیجیے۔ (شرح ابن ابی الحدید جلد ۱ صفحہ ۳۰۵)

بِهِمْ خَيْرًا مِّنْهُمْ، وَ اَبْدَلَهُمْ بِيْ شَرًّا لَّهُمْ مِنِّيْ.

(قَالَ السَّيِّدُ الرَّضِيُّ عَلَيْهِ الرَّحْمَةُ) يَعْنِيْ عَلَيْهِ السَّلَامُ "بِالْاَوَدِ": الْاِعْوِجَاجَ، وَ "بِاللَّدَدِ": الْخِصَامَ. وَهٰذَا مِنْ اَفْصَحِ الْكَلَامِ.

کی کہ خدا ان کے عوض ان سے بہتر لوگوں کو مجھے مراحمت فرمائے اور میرے عوض مجھ سے بدتر (حاکم) انہیں دے۔

(جناب) سید رضی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ حضرت علیہ السلام کا مقصود "اَوَدَ" سے کجی (اور مخالفت) اور "لَدَدَ" سے دشمنی (اور عداوت) ہے اور یہ فصیح ترین کلام سے ہے۔

❁ خطبہ: ۶۹ ❁

وَ مِنْ كَلَامٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِيْ ذَمِّ اَهْلِ الْعِرَاقِ:

اَمَّا بَعْدُ، يَآ اَهْلَ الْعِرَاقِ! فَاِنَّمَا اَنْتُمْ كَالْمَرْاَةِ الْحَامِلِ، حَمَلَتْ فَلَمَّا اَتَمَّتْ اَمْلَصَتْ، وَ مَاتَ قَيِّمُهَا، وَ طَالَ تَاَيُّمُهَا، وَ وَرِثَهَا اَبْعَدُهَا.

اَمَا وَاللّٰهِ! مَآ اَتَيْتُكُمُ اخْتِيَارًا، وَ لٰكِنْ

خطبہ (۶۹)

حضرت علیہ السلام کے کلام کا کچھ حصّہ۔

عراق والوں کی مذمت میں۔

بعد حمد و نعت (یہ ہے کہ) اے عراق والو! تم کچھ نہیں ہو مگر مثل اس حاملہ عورت کے جو (پہلے حاملہ ہو جائے) پھر جب (مدت حمل کو) تمام کر لے تو (خود ہی اپنے بچہ کو) مُردہ گرا دے اور اس کا سردار (شوہر بھی) مر جائے اور اس کے رنڈاپے کا زمانہ طولانی ہو اور (اس کے مرنے پر) اس کا دور ترین (رشتہ دار) اس کی میراث [1] لے جائے۔

---

[1] جب جنگ صفّین میں حضرتؑ کا لشکر قریب فتح تھا اور تمام آثار ظفر و نصرت ظاہر ہو گئے تھے تو معاویہ نے مضطرب ہو کر عمرو عاص سے کہا کہ اگر مصر کی حکومت مطلوب ہے تو اب جلد کوئی حیلہ نجات سوچو ورنہ ہم لوگ تباہ ہوا چاہتے ہیں۔ عمرو عاص نے اپنے لشکر والوں سے کہا کہ "اَيُّهَا النَّاسُ"، جس کے پاس قرآن ہو وہ اس کو اپنے نیزے پر بلند کرے یہ سنتے ہی اہل لشکر نے کثرت سے قرآن مجید نیزوں پر بلند کر کے ندا کی کہ ہمارے تمہارے درمیان خدا کی یہ کتاب ہے۔ جب لشکر عراق نے اس طرح قرآن کو نیزوں پر دیکھا تو لڑنے سے رک گیا اور حضرت علیؑ سے اصرار کیا کہ ان کی درخواست قبول کرنا چاہیے۔ حضرتؑ نے فرمایا یہ تو ان لوگوں کا فریب ہے، یہ بالکل احکام قرآن کے پابند نہیں ہیں اور اس وقت صرف تمہاری فتح روکنے کی یہ تدبیر کی ہے مگر یہ لوگ (جو عراق ہی والے تھے) حضرتؑ کی اس فہمائش سے کچھ متاثر نہیں ہوئے بلکہ بگڑ گئے، کہنے لگے کہ آپ جنگ کی موقوفی کا حکم نہ دیں گے تو ہم خود آپ سے جنگ شروع کر دیں گے۔ مجبوراً حضرتؑ نے جنگ کے ختم کرنے کا حکم دیا۔ اس پر آپ کے سردار لشکر مالک اشتر نے کہلا بھیجا کہ اب فتح میں کیا دیر رہ گئی ہے ہمیں آپ کیوں روکتے ہیں؟ حضرتؑ نے جواب دیا کہ ہمارا لشکر (عراق والے) اس فریب میں (بقیہ صفحہ مابعد)

جِئْتُ اِلَيْكُمْ سَوْقًا، وَ لَقَدْ بَلَغَنِيْ اَنَّكُمْ تَقُوْلُوْنَ: عَلِيٌّ يَّكْذِبُ، قَاتَلَكُمُ اللّٰهُ! فَعَلٰى مَنْ اَكْذِبُ؟ اَعَلَى اللّٰهِ؟ فَاَنَا اَوَّلُ مَنْ اٰمَنَ

(یہ بھی) سُن رکھو کہ خدا کی قسم میں تمہارے پاس خوشی سے نہیں آیا بلکہ تم تک (مجبوراً اور تقدیر کی) کشش سے پہنچا ہوں۔ ۱؎ لیکن مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم کہتے ہو علیؑ جھوٹ بولتے ہیں۔ ۲؎ خدا تمہیں ہلاک کرے تو (بتاؤ) میں کس

(بقیہ صفحہ مابعد) آ گیا اور کسی طرح نہیں مانتا ہے۔ (تاریخ طبری جلد ۶ صفحہ ۲۷۰)

اسی حالت کو حضرتؑ نے اس خطبہ میں بیان فرمایا ہے کہ اے عراق والو تم بالکل اس عورت ایسے ہو جو حمل کے تمام مصیبتیں برداشت کرنے کے بعد قریب وضع حمل بچہ کو گرا دے کہ جب پوری طرح جہاد کر کے فتح کے قریب پہنچ گئے تو عمر عاص کے فریب میں آ گئے اور لڑائی روک دی اور اس طرح حاصل کی ہوئی فتح کو ضائع و برباد کر دیا۔ اب اسی عورت کی طرح تم بے والی و وارث بھی ہو گئے اور جس طرح اس عورت کی میراث اغیار لے جائیں گے اسی طرح تم نے اپنی حکومت اور سلطنت جسے اپنے قوت بازو سے حاصل کر لیا تھا اپنے غیروں (یعنی اہل شام) کے حوالہ کر دیا۔

۱؎ حضرتؑ فرماتے ہیں کہ اے عراق والو میں تمہارے یہاں بصرہ میں مدینہ منورہ سے اپنی خوشی سے اور تم کو دوسرے لوگوں سے بہتر سمجھ کر نہیں آیا بلکہ صرف اس مجبوری سے آیا کہ حضرت عائشہ اور طلحہ و زبیر نے میرے خلاف جنگ جمل اسی بصرہ میں چھیڑ دی تھی پس اگر جنگ جمل نہ ہوتی تو میں کبھی تمہارے یہاں آنا پسند نہیں کرتا۔

۲؎ اس جملہ کی شرح میں علامہ ابن ابی الحدید جلد ۱ ص ۳۰۹ میں اور مفتی محمد عبدہ نہج البلاغہ مطبوعہ بیروت ص ۷۳ میں لکھتے ہیں کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام اکثر غیب کی خبریں اور آئندہ ہونے والے واقعات کی پیشین گوئیاں مسلمانوں سے بیان فرمایا کرتے تھے جن کی اطلاع آپ کو حضرت رسول خداؐ اپنے مخصوص تعلیم سے دے گئے تھے، تو حضرت علیؑ کے ساتھیوں میں جو لوگ منافق تھے وہ کہہ دیتے تھے کہ علیؑ جھوٹ کہتے ہیں، جیسا کہ اسی طرح حضرت رسول خداؐ بھی جب کوئی خبر غائب بیان فرماتے تھے تو آپ کے اصحاب میں جو منافق حضرات تھے وہ حضرت رسول خداؐ کے بارے میں بھی کہہ دیتے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جھوٹے ہیں۔ (معاذ اللہ) اور صاحب کتاب ''الغارات'' نے روایت کی ہے کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے ایک مرتبہ خطبہ دیا اور فرمایا خدا کی قسم اگر میں چاہوں تو صبح سے شام تک تم سے غیب ہی کی خبریں بیان کروں اور ان میں ایک خبر بھی غلط نہیں ہوگی پھر تم میرے پاس سے اٹھ کر جاؤ گے تو (ان عجیب و غریب خبروں کو سن کر) اپنی جگہ کہنے لگو گے علیؑ نے جھوٹ کہا ہے، پھر حضرت علیؑ نے فرمایا کہ بھائیو! ہم لوگوں کا امر بہت دشوار اور مشکل ہے جس کا تحمل کوئی نہیں کر سکتا سوا ملک مقرب یا نبی مرسل کے یا اس بندے کے جس کے دل کا امتحان خدا نے کر لیا ہے۔

اس کے بعد علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں:

وَ اِذَا تَاَمَّلْتَ اَحْوَالَهٗ فِيْ خِلَافَتِهٖ كُلِّهَا وَجَدْتَّهَا هِيَ مُخْتَصَرَةٌ مِّنْ اَحْوَالِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فِيْ حَيَاتِهٖ كَاَنَّهَا نُسْخَةٌ مُّنْتَسَخَةٌ مِّنْهَا فِيْ حَرْبِهٖ وَ سِلْمِهٖ وَ سِيْرَتِهٖ وَ اَخْلَاقِهٖ وَ كَثْرَةِ شِكَايَتِهٖ مِنَ الْمُنَافِقِيْنَ مِنْ اَصْحَابِهٖ وَ الْمُخَالِفِيْنَ لِاَمْرِهٖ وَ اِذَا اَرَدْتَ اَنْ تَعْلَمَ ذٰلِكَ عِلْمًا وَاضِحًا فَاقْرَاْ سُوْرَةَ بَرَاءَةٍ فَفِيْهَا الْجَمُّ الْغَفِيْرُ مِنَ

(بقیہ صفحہ مابعد)

بِهٖ! اَمْ عَلٰی نَبِیِّهٖ؟

فَاَنَا اَوَّلُ مَنْ صَدَّقَهٗ! كَلَّا وَ اللّٰهِ! وَ لٰكِنَّهَا لَهْجَةٌ غِبْتُمْ عَنْهَا، وَ لَمْ تَكُوْنُوْا مِنْ اَهْلِهَا، وَيْلُمِّهٖ، كَيْلًا بِغَيْرِ ثَمَنٍ! لَوْ كَانَ لَهٗ وِعَآءٌ، ﴿وَ لَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ﴾.

پر جھوٹ بولوں گا؟ کیا خدا پر؟ حالانکہ میں سب سے پہلے اس پر ایمان لایا یا اس کے رسول پر؟

حالانکہ میں ہی نے سب سے پہلے ان (حضرتؐ) کی تصدیق کی ہے۔ ہرگز نہیں خدا کی قسم (یہ سب کچھ بھی نہیں ہے) بلکہ (میری) یہ (باتیں) حضرت (رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا) وہ لہجہ (اور کلام) ہے جس سے تم غائب رہے اور تم کبھی اس کے اہل نہیں ہوئے۔[1] واہ وا واہ! (میں تو حکمت و معرفت کے) پیمانے (بھر بھر کر) بغیر قیمت کے تقسیم کر رہا ہوں کاش اس (کے جمع کرنے) کے لیے کوئی ظرف ہوتا اور البتہ تم اس کی تحقیق بعد کو جان لو گے۔[2]

الْمَعْنَى الَّذِیْ اَشَرْنَا اِلَیْهِ.

یعنی جب تم حضرت علیؑ کی اس حالت کو اچھی طرح غور کرو گے جو آپ کے تمام زمانہ خلافت میں تھی تو حضرتؑ کی پوری زندگی کو حضرت رسول خداؐ کی زندگی کی پوری تصویر پاؤ گے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جنگ میں، صلح میں، سیرت میں، اخلاق میں، منافقوں کی کثرت شکایات اور مخالفین کی عداوتوں میں، غرض ہر امر میں حضرت علیؑ کی زندگی گویا حضرت رسول خداؐ کی زندگی کی ہو بہو نقل ہے کہ ذرہ برابر علیؑ کے حالات خلافت حضرت رسول خداؐ کے واقعات رسالت سے مغایر نہیں ہیں۔ اگر تم میرے اس دعوی کو واضح طریقہ سے سمجھنا چاہتے ہو تو سورۂ برائت کی تلاوت کرو کہ جس مضمون کا اشارہ میں نے کیا ہے اس کا جم غفیر تمہیں اس سورہ میں ملے گا۔

[1] علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ حضرتؑ کے قول ''لٰكِنَّهَا لَهْجَةٌ غِبْتُمْ عَنْهَا'' کا مطلب غالباً یہ ہے کہ یہ حضرت رسول خداؐ کا لہجہ (کلام اور بیان) ہے جس کو میں نے اپنے کان سے سنا اور تم سب اس وقت حضرتؐ کی خدمت سے غائب تھے اس وجہ سے تمہیں اس کے سننے کا موقع نہیں ملا۔

[2] یعنی میں تم لوگوں کو علم و حکمت کے پیمانے بھر بھر کر دے رہا ہوں اور اس کی کوئی قیمت بھی نہیں چاہتا کاش ان خزانہائے علم و حکمت کے حاصل کرنے والے ملتے جو ان کو محفوظ رکھتے۔ پھر آخر میں غیب کی خبر دے رہے ہیں کہ ابھی تم کو ان خبروں کی وقعت نہیں ہے مگر بعد میں تم کو ان تمام بیانات کی تصدیق ہو جائے گی۔ اس کے بعد علامہ ابن ابی الحدید نے حضرتؑ کے متعدد خطبے نقل کیے (بقیہ صفحہ مابعد)

❁ خطبہ :۷۰ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

عَلَّمَ فِيْهَا النَّاسَ الصَّلَاةَ عَلَى النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم:

اَللّٰهُمَّ دَاحِيَ الْمَدْحُوَّاتِ، وَ دَاعِمَ الْمَسْمُوْكَاتِ، وَ جَابِلَ الْقُلُوْبِ عَلٰى فِطْرَتِهَا: شَقِيِّهَا وَ سَعِيْدِهَا، اجْعَلْ شَرَآئِفَ صَلَوَاتِكَ، وَ نَوَامِيَ بَرَكَاتِكَ، عَلٰى مُحَمَّدٍ عَبْدِكَ وَ رَسُوْلِكَ، الْخَاتِمِ لِمَا سَبَقَ، وَ الْفَاتِحِ لِمَا انْغَلَقَ، وَ الْمُعْلِنِ الْحَقَّ بِالْحَقِّ، وَ الدَّافِعِ جَيْشَاتِ الْاَبَاطِيْلِ، وَ الدَّامِغِ صَوْلَاتِ

خطبہ(۷۰)

حضرت علیہ السلام کے کلام کا کچھ حصّہ

جس میں لوگوں کو (حضرت) پیغمبر (خدا) صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود بھیجنے کا طریقہ سکھایا ہے۔

اے (ان) بچھی ہوئی چیزوں (یعنی زمین) کے بچھانے والے اور (ان) بلند کی ہوئی چیزوں (یعنی آسمانوں) کے قائم رکھنے اور ان کی حفاظت کرنے والے اور دلوں کو ان کے برے کو بھی اور اچھے کو بھی ان کی فطرت پر پیدا کرنے والے خدا! اپنے شریف ترین درودوں اور بڑھنے والی برکتوں کو اپنے (مخصوص) بندے اور اپنے (برگزیدہ) رسول (حضرت) محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل فرما جو ختم کرنے والے ہیں اس (سلسلۂ نبوت) کے جو گزر گیا۱ اور کھولنے والے ہیں اس (باب ہدایت) کے جو بند (ہو گیا) تھا۔۲ اور ظاہر کرنے والے ہیں حق کو حق ہی سے اور دفع کرنے والے ہیں باطل چیزوں کے جوش اور غلبوں کو اور توڑنے والے

(بقیہ صفحہ مابعد) ہیں جن میں حضرتؑ نے غیب کی خبریں دیں ہیں اور آنے والے واقعات کی پیشین گوئی کی ہے اور گو اس وقت لوگوں نے ان امور کو تعجب سے سنا مگر حضرتؑ کے زمانہ نے ہر خبر کی پوری تصدیق کی اور ہر پیشین گوئی اسی طرح پوری ہوئی جس طرح حضرتؑ نے ذکر کیا تھا۔(اس کی تفصیل انشاء اللہ اس شرح کے ضمیمہ میں بھی آئے گی)

۱؎ مفتی محمد عبدہ اس کی شرح میں لکھتے ہیں ''وَالْخَاتِمِ لِمَا سَبَقَ ''اَیْ لِمَا تَقَدَّمَ مِنَ النُّبُوَّاتِ''، یعنی حضرتؐ کے قبل جو نبوتیں تھیں ان کو آپ نے ختم کر دیا۔اور علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں۔''اَلْخَاتِمِ لِمَا سَبَقَ'' مِنَ الْمِلَلِ''، یعنی حضرتؐ کے قبل جو مذاہب تھے ان کو آپ نے ختم کر دیا۔

۲؎ یعنی حضرتؐ جس زمانہ میں مبعوث ہوئے اس وقت لوگوں کے دلوں کو ضلالت اور جہالت کے قفلوں نے مقفل کر دیے تھے اور راہِ ہدایت ان لوگوں سے مخفی ہو گئی تھی تو حضرتؐ ہی نے اپنی نبوت کے معجزوں سے ان کو کھول دیا اور راہِ حق واضح کر دی۔

الْاَضَالِيْلِ۔

كَمَا حُمِّلَ فَاضْطَلَعَ قَآئِمًا بِاَمْرِكَ، مُسْتَوْفِزًا فِيْ مَرْضَاتِكَ، غَيْرَ نَاكِلٍ عَنْ قُدُمٍ، وَ لَا وَاهٍ فِيْ عَزْمٍ، وَاعِيًا لِّوَحْيِكَ، حَافِظًا لِّعَهْدِكَ، مَاضِيًا عَلٰى نَفَاذِ اَمْرِكَ حَتّٰٓى اَوْرٰى قَبَسَ الْقَابِسِ، وَ اَضَآءَ الطَّرِيْقَ لِلْخَابِطِ، وَ هُدِيَتْ بِهِ الْقُلُوْبُ بَعْدَ خَوْضَاتِ الْفِتَنِ وَ الْاٰثَامِ، وَ اَقَامَ مُوْضِحَاتِ الْاَعْلَامِ وَ نَيِّرَاتِ الْاَحْكَامِ، فَهُوَ اَمِيْنُكَ الْمَاْمُوْنُ، وَ خَازِنُ عِلْمِكَ

ہیں گمراہیوں کے حملوں کو۔[1]

(حضرتؐ پر امر نبوت) چونکہ بار کیا گیا لہٰذا آپؐ نے اسے مضبوطی سے اٹھالیا[2] اس شان سے کہ تیرے حکم پر کھڑے رہنے والے تیری خوشنودیوں (کے حاصل کرنے) میں بہت جلدی کرنے والے تھے۔[3] نہ آگے بڑھنے سے رُکنے والے اور نہ کسی عزم میں سستی کرنے والے، (بلکہ) تیرے وحی کو یاد رکھنے والے، تیرے عہد کی حفاظت کرنے والے، (اور) تیرے حکم کو استقلال اور ثابت قدمی سے جاری رکھنے والے تھے۔ یہاں تک کہ نور (ہدایت) کو اس کے چاہنے والوں کے لیے روشن اور (سیدھی) راہ کو بھٹکنے والوں کے لیے واضح کر دیا۔[4] اور ان (حضرتؐ) سے دلوں کی ہدایت ہوگئی بعد اس کے کہ وہ

---

[1] یعنی حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کفر اور باطل کے زور اور شوکت کو اپنے حجّت اور برہان کی چمک اور غلبہ سے مٹا دیتے اور اسے دنیا میں ٹھہرنے نہیں دیتے تھے کیونکہ آپ کے ادلّہ و براہین کی قوت ایسی واضح تھی جس کو دیکھ کر لوگ اپنے باطل پرستی اور راہِ ضلالت پر باقی نہیں رہتے تھے۔

[2] اصل ترجمہ یہ تھا کہ جس طرح آپ پر امر نبوت بار کیا گیا اسی طرح آپ نے اسے مضبوطی سے اٹھالیا۔ مگر علامہ ابن ابی الحدید اس کا ف کو تعلیل یعنی سبب کا قرار دے کر اس کا معنی اَیْ لِاَجْلِ اَنَّہٗ یَحْمِلُ لکھتے ہیں کہ اس وجہ سے حضرتؐ نے اسے مضبوطی سے اٹھایا کہ آپ پر اس کا بوجھ بار کیا گیا تھا۔

[3] یعنی خدا کی خوشنودی حاصل کرنے میں حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سستی کرنے والے اور اپنی جان کو بچانے والے نہیں تھے بلکہ رضائے خدا میں تو آپ اپنے نفس کو برانگیختہ کرتے، شدید مشقتوں میں ڈال دیا کرتے تھے۔

[4] حضرتؑ کے عربی جملہ ''حَتّٰٓى اَوْرٰى قَبَسَ الْقَابِسِ'' کا اردو ترجمہ مشکل سے ہو سکا ''اَوْرٰى'' کے معنی چنگاری نکالی اور ''قَبَسَ'' کے معنی آگ کی چنگاری یا اس کا شعلہ اور ''قَابِسٌ'' معنی وہ شخص جو آگ کے شعلہ کا طالب ہو کہتے ہیں کہ ''قَبَسْتُ مِنْهُ نَارًا'' یعنی میں نے اس سے آگ لی ''وَ اقْتَبَسَنِيْ نَارًا'' یعنی ''اس نے مجھے آگ دی'' اور یہاں حضرتؑ کی مراد قبس سے نورِ ہدایت ہے اور قابس سے مقصود نورِ ہدایت کا طلب کرنے والا، تو مطلب یہ ہوا کہ آنحضرتؐ کے مبعوث ہونے پر جو لوگ نور ہدایت کے خواہاں تھے ان کے لیے حضرتؐ نے اس نور ہدایت کو روشن کر دیا اور یہ کل الفاظ استعارات اور مجازات ہیں۔

الْمَخْزُوْنِ، وَ شَهِيْدُكَ يَوْمَ الدِّيْنِ، وَ بَعِيْثُكَ بِالْحَقِّ، وَ رَسُوْلُكَ اِلَى الْخَلْقِ الْمَأْمُوْنُ، وَ خَازِنُ عِلْمِكَ الْمَخْزُوْنِ، وَ شَهِيْدُكَ يَوْمَ الدِّيْنِ، وَ بَعِيْثُكَ بِالْحَقِّ، وَ رَسُوْلُكَ اِلَى الْخَلْقِ.

(دل گمراہی کے) فتنوں اور گناہوں میں (بار بار) ڈوبتے رہے تھے۔[1] (حضرتؐ نے) واضح کرنے والی نشانیاں اور روشنی دینے والے احکام جاری کر دیے تو (اے خدا) وہ (حضرتؐ) تیرے[2] قابل اطمینان امانت دار اور تیرے مخفی (خزانہائے) علم کے خزانچی اور بروز قیامت تیرے گواہ ہیں۔[3] اور تیرے رسول برحق اور خلق کی طرف تیرے پیغمبر تھے۔

اَللّٰهُمَّ افْسَحْ لَهٗ مَفْسَحًا فِيْ ظِلِّكَ، وَ اجْزِهٖ مُضَاعَفَاتِ الْخَيْرِ مِنْ فَضْلِكَ.

تو اے خدا اپنے سایۂ (رحمت) میں ان (حضرتؐ) کے لیے ایک فراخ جگہ کشادہ فرما اور اپنے فضل سے ان (حضرتؐ) کو درجات خیر (یا بڑھنے والی خوبی) کی جزا دے۔

اَللّٰهُمَّ اَعْلِ عَلٰى بِنَآءِ الْبَانِيْنَ بِنَآئَهٗ، وَ اَكْرِمْ لَدَيْكَ مَنْزِلَتَهٗ، وَ اَتْمِمْ لَهٗ نُوْرَهٗ، وَ

اے خدا ان (حضرتؐ) کی بنا (ہدایت) کو کل بانیان (ہدایت) کی بنا سے بلند کر۔[4] اور اپنے یہاں ان (حضرتؐ) کے منزلت کو معزز رکھ اور ان (حضرتؐ) کے

---

[1] یعنی جب ملک عرب والوں کے دل جہالت اور ضلالت کے فتنوں میں ڈوبے ہوئے تھے اس وقت حضرتؐ نے ان لوگوں کے دلوں کی راہ راست کی طرف ہدایت کر دی۔

[2] ''فَهُوَ اَمِيْنُكَ الْمَأْمُوْنُ'' کا مطلب یہ ہے کہ خداوند عالم جو وحی حضرتؐ پر نازل کرتا تھا آپ اسے کمال امانت سے لوگوں تک پہنچاتے تھے اور لفظ مامون حضرتؐ کے القاب سے ہے۔

[3] ''شَهِيْدُكَ يَوْمَ الدِّيْنِ''، یعنی ''بروز قیامت خدا کے شاہد (گواہ) رہیں گے'' جیسا کہ قرآن مجید میں خدا نے فرمایا ہے۔﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا﴾ (سورۂ النساء، آیہ ۴۱) یعنی ''اس وقت کیسا ہوگا جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لائیں گے اور اے (میرے حبیب محمد مصطفیٰؐ) تم کو ہم ان لوگوں پر گواہ کھڑا کریں گے''۔

[4] یعنی حضرت رسول خداؐ کی منزلت کو دار آخرت میں بلند ترین منزلوں سے قرار دے۔ یہ مطلب ابن ابی الحدید معتزلی نے بیان کیا ہے مگر مفتی محمد عبدہ مصری لکھتے ہیں کہ حضرت امیر المومنینؑ کا مقصود یہ ہے کہ جناب رسالتمآبؐ نے اپنے پروردگار کے حکم سے شریعت عادلہ اور ہدی فاضل کو جو مضبوط اور مستحکم کر دیا جس کی طرف گمراہانِ راہِ حق پناہ لیتے ہیں اور جس کی طرف بھٹکنے والے رجوع کرتے ہیں اس شریعت کے متعلق حضرت علی علیہ السلام دعا کرتے ہیں کہ اے خدا حضرت رسول خداؐ کی اس شریعت (اسلام) کو کل دوسری شریعتوں سے بلند اور اشرف قرار دے اور حضرتؐ کی ہدایت وارشاد کی شان کو ہر دوسرے ہادی کی ہدایت وارشاد سے رفیع وعالی کر دے۔

اجْزِهِ مِنِ ابْتِعَاثِكَ لَهُ مَقْبُوْلَ الشَّهَادَةِ، مَرْضِيَّ الْمَقَالَةِ، ذَا مَنْطِقٍ عَدْلٍ، وَ خُطَّةِ فَصْلٍ.

لیے ان کے نور (ارشاد و ہدایت) کو تمام کر دے۔ ۱؎ اور تو نے جوان (حضرتؐ) کو اس طرح مبعوث ۲؎ کیا کہ (آپؐ کی) گواہی مقبول (آپؐ کی) بات پسندیدہ تھی۔ (اور وہ حضرتؐ) انصاف کا کلام کرنے والے اور فیصلہ کُن امر رکھنے والے تھے (تو اس کی) ان (حضرتؐ) کو جزا دے۔

اَللّٰهُمَّ اجْمَعْ بَيْنَنَا وَ بَيْنَهُ فِيْ بَرْدِ الْعَيْشِ، وَ قَرَارِ النِّعْمَةِ، وَ مُنَى الشَّهَوَاتِ، وَ اَهْوَآءِ اللَّذَّاتِ. وَ رَخَآءِ الدَّعَةِ وَ مُنْتَهَى الطُّمَأْنِيْنَةِ، وَ تُحَفِ الْكَرَامَةِ.

اے خدا آرام کی زندگی اور قائم رہنے والی نعمت اور خواہش ہائے نفس کی آرزوں اور لذتوں کی تمناؤں اور راحت کے عیش اور اطمینان کی منتہٰی اور کرامت کے تحفوں میں مجھے اور ان (حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اکٹھا فرما۔ ۳؎

۱؎ نور تمام کرنے سے مطلب یہ ہے کہ حضرتؐ کے دین کی تائید کرنا کہ وہ تمام اہل زمین پر پھیل جائے اور دنیا کے کل مذہبوں پر وہ غالب آجائے۔

۲؎ ''مَقْبُوْلَ الشَّهَادَةِ'' کا مطلب یہ ہے کہ حضرتؐ اپنی امت یا غیر امت پر خدا کے جس امر کی شہادت دیتے تھے سننے والے اس کی تصدیق کرتے اور اس کو قبول کر لیتے تھے کیونکہ کبھی آپ کو غلط کہتے پایا ہی نہیں۔

۳؎ اس خطبہ کی شرح تمام کرنے کے بعد علامہ ابن ابی الحدید معتزلی نے یہ بحث چھیڑی ہے کہ آنحضرتؐ اور آپؐ کی اولاد پر درود بھیجنا واجب ہے یا نہیں اور اس کے کیا احکام ہیں اس کے متعلق اختلافات ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وَ اَوْجَبَهَا الشَّافِعِيُّ وَ اَصْحَابُهُ وَ اخْتَلَفَ اَصْحَابُهُ فِيْ وُجُوْبِ الصَّلٰوةِ عَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ فَالْاَكْثَرُوْنَ عَلٰى اَنَّهَا وَاجِبَةٌ وَ اَنَّهَا شَرْطٌ فِيْ صِحَةِ الصَّلٰوةِ۔

یعنی نماز میں درود بھیجنے کو امام شافعی اور ان کے اصحاب نے واجب قرار دیا ہے، البتہ ان کے اصحاب نے اس میں اختلاف کیا ہے کہ نماز میں آل محمد پر درود بھیجنا واجب ہے یا نہیں۔ تو اکثر علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ واجب ہے بلکہ آل محمد علیہم السلام پر نماز میں درود بھیجنا نماز کے قبول ہونے کی شرط ہے۔

اور امام شافعی صاحب کے اشعار اس مضمون کے مشہور ہیں جو تمام کتب اہل سنت میں موجود ہیں کہ وہ فرماتے ہیں:

يَا اٰلَ بَيْتِ رَسُوْلِ اللّٰهِ حُبُّكُمْ ۔۔۔ فَرْضٌ مِّنَ اللّٰهِ فِي الْقُرْاٰنِ اَنْزَلَهُ

كَفَاكُمْ مِنْ عَظِيْمِ الْقَدْرِ اَنَّكُمْ ۔۔۔ مَنْ لَمْ يُصَلِّ عَلَيْكُمْ لَا صَلَاةَ لَهُ

یعنی اے اہل بیت رسولؐ تمہاری محبت خدا کی طرف سے واجب کی گئی ہے جس کا حکم خدا نے قرآن مجید میں نازل کیا ہے

(بقیہ صفحہ آئندہ)

❁ خطبہ :۷۱ ❁

وَ مِنْ كَلَامٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

قَالَهٗ لِمَرْوَانَ بْنِ الْحَكَمِ بِالْبَصْرَةِ:

قَالُوْا: اُخِذَ مَرْوَانُ بْنُ الْحَكَمِ اَسِيْرًا يَّوْمَ الْجَمَلِ، فَاسْتَشْفَعَ الْحَسَنَ وَ الْحُسَيْنَ عَلَيْهِمَا السَّلَامُ اِلٰى اَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَيْهِ السَّلَامُ

خطبہ(۷۱)

اور حضرت علیہ السلام کے ایک کلام کا کچھ حصّہ۔

جسے بمقام بصرہ مروان بن الحکم کے بارے میں (ارشاد) فرمایا:[1]

لوگوں نے بیان کیا ہے کہ جنگ جمل میں مروان بن الحکم گرفتار ہو کر قید کیا گیا یہ دیکھ کر (جناب) حسن و حسین علیہما السلام نے (حضرت) امیر المومنین علیہ السلام سے (اس کی) سفارش کرنی چاہی تو دونوں (صاحبزادوں) نے حضرتؑ سے اس کے متعلق گفتگو کی۔ پس حضرتؑ نے اسے رہا کر

تتمہ صفحہ گذشتہ: تم لوگوں کے جلیل القدر ہونے کے لیے یہی امر کافی ہے کہ جو شخص نماز میں تم پر درود نہ بھیجے گا اس کی نماز ہی نہ ہوگی۔ (صواعق محرقہ وارجح المطالب وغیرہ)

اور صواعق محرقہ باب ۱۱ فصل اول صفحہ ۱۲۸ میں منجملہ آیات منزلہ در شان اہل بیتؑ تیسرا آیہ یہ لکھا ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا﴾ (سورۂ احزاب، آیہ ۵۶)

اس کے بعد لکھا ہے کہ کعب بن عجرہ سے یہ صحیح روایت مروی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو ہم نے عرض کی، اے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ تو ہمیں معلوم ہے کہ آپ پر سلام کس طرح کرنا چاہیے مگر یہ فرمائیں کہ ہم آپ پر درود کیونکر بھیجیں؟ تو حضرتؐ نے فرمایا: اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِ مُحَمَّدٍ۔

اور اسی کتاب کے صفحہ ۱۲۹ میں ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا:

لَا تُصَلُّوْا عَلَيَّ الصَّلَاةَ الْبَتْرَاءَ، فَقَالُوْا: وَمَا الصَّلَاةُ الْبَتْرَاءُ؟ قَالَ: تَقُوْلُوْنَ: اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ، وَتُمْسِكُوْنَ، قُوْلُوْا: اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِ مُحَمَّدٍ۔

یعنی فرمایا کہ مجھ پر دم بریدہ درود نہ بھیجو لوگوں نے پوچھا دم بریدہ درود کون ہے؟ حضرتؐ نے فرمایا کہ مجھ پر درود بھیج کر خاموش رہ جاؤ۔ تو ایسا نہ کرو بلکہ یوں کہو کہ اے خدا اپنا درود نازل کر حضرت رسول خداؐ پر اور حضرتؐ کی آلؑ پر بھی۔

[1] علامہ ابن ابی الحدید اس خطبہ کی شرح میں لکھتے ہیں کہ اس روایت میں ایک جملہ اور زیادہ بیان کیا گیا ہے جس کو اس کتاب نہج البلاغہ کے جمع کرنے والے (یعنی سید رضی علیہ الرحمہ) نے ذکر نہیں کیا ہے اور وہ برائی حضرتؑ کا یہ قول ہے:

يَحْمِلُ رَايَةَ ضَلَالَةٍ بَعْدَ مَا يَشِيْبُ صُدْغَاهُ وَ اِنَّ لَهٗ اِمْرَةً. اِلٰى اٰخِرِ الْكَلَامِ۔

یعنی حضرتؑ نے اپنے قول ''اِنَّ لَهٗ اِمْرَةً'' کے قبل فرمایا تھا کہ مروان گمراہی کا جھنڈا بلند کرے گا اس وقت جب کہ اس کے سر کے دونوں کنارے سفید ہو جائیں گے۔

فَكَلَّمَاهُ فِيْهِ فَخَلّٰى سَبِيْلَهٗ: فَقَالَا لَهٗ يُبَايِعُكَ يَآ اَمِيْرَالْمُؤْمِنِيْنَ، فَقَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ:

اَ وَ لَمْ يُبَايِعْنِيْ بَعْدَ قَتْلِ عُثْمَانَ؟ لَا حَاجَةَ لِيْ فِيْ بَيْعَتِهٖ! اِنَّهَا كَفٌّ يَّهُوْدِيَّةٌ، لَوْ بَايَعَنِيْ بِكَفِّهٖ لَغَدَرَ بِسَبَّتِهٖ. اَمَا اِنَّ لَهٗ اِمْرَةً كَلَعْقَةِ الْكَلْبِ اَنْفَهٗ، وَ هُوَ اَبُو الْاَكْبُشِ الْاَرْبَعَةِ، وَ سَتَلْقَى الْاُمَّةُ مِنْهُ وَ مِنْ وَّلَدِهٖ يَوْمًا اَحْمَرَ!.

دیا۔ پھر دونوں (صاحبزادوں) نے حضرتؑ سے عرض کی، اے امیر المومنینؑ یہ آپؑ کی بیعت کرتا ہے تو (حضرت علیہ السلام) نے جواب دیا:

کیا قتل عثمان کے بعد (بھی) اس نے میری بیعت نہیں کی تھی؟ (جسے بعد کو توڑ دیا تو) مجھے اس کی بیعت کی کوئی ضرورت نہیں ہے اس کی بیعت تو (مکار) یہودی ہاتھ ہے[1] اگر یہ اپنے ہاتھ سے میری بیعت کرے گا تو اپنے پیچھے سے (فوراً ہی) بے وفائی بھی کر جائے گا۔ سن رکھو جس طرح کتا اپنی ناک چاٹ لیتا ہے اسی طرح اس کو بھی (مسلمانوں پر چند روزہ) حکومت حاصل ہو جائے گی[2] اور وہ چار (جبار و قہار) حکمرانوں کا باپ ہوگا[3] اور بہت جلد امت (اسلام) اس سے اور اس کے لڑکوں سے خونی دن پر ڈالی جائے گی۔

---

[1] یہودی ہاتھ ہونے سے یہ مقصود ہے کہ مکر و فریب اور عذر و بے وفائی کرنے والا ہاتھ ہے جیسا یہودی کرتے ہیں کیونکہ ان کے اکثر افعال عذر و فریب ہی ہوتے ہیں۔

[2] اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ مروان کی حکومت بہت کم رہے گی چنانچہ وہ یزید بن معاویہ کے مرنے پر عبداللہ بن زبیر کے مقابلہ میں (جو حجاز میں حکومت کر رہے تھے) شام میں حکومت کرنے لگا مگر صرف نو مہینہ یہ مزہ چکھنے پایا تھا کہ پیغام اَجل آ گیا۔

[3] اس چار کی تعیین میں شارحین نے اختلاف کیا ہے کہ کیا مراد ہے۔ کیونکہ اگر حقیقی فرزند لیے جائیں تو ان سے مراد عبدالملک اور عبدالعزیز اور بشر اور محمد ہوں گے، ان میں صرف عبدالملک مسلمانوں کا بادشاہ ہوا باقی لڑکے بادشاہ تو نہیں ہوئے مگر مختلف مقامات کے حاکم ہو گئے تھے۔ اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ حضرتؑ نے عبدالملک بن مروان کے چار بیٹوں کو مراد لیا ہو جو خلفائے بنی امیہ میں بڑے زبردست خلیفہ ہوئے ہیں۔ یعنی ولید و سلمان و یزید و ہشام۔ بہر صورت حضرتؑ کی یہ پیشین گوئی حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی اور مسلمانوں کی بڑی بڑی خونریزیاں ان لوگوں کی حکومت میں ہوئیں۔

(جس کی تفصیل انشاء اللہ ضمیمہ میں آئے گی)

❁ خطبہ :۷۲ ❁

وَ مِنْ كَلَامٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

لَمَّا عَزَمُوْا عَلٰى بَيْعَةِ عُثْمَانَ:

لَقَدْ عَلِمْتُمْ اَنِّیْۤ اَحَقُّ النَّاسِ بِهَا مِنْ غَيْرِیْ، وَ وَاللّٰهِ! لَاُسْلِمَنَّ مَا سَلِمَتْ اُمُوْرُ الْمُسْلِمِيْنَ، وَ لَمْ يَكُنْ فِيْهَا جَوْرٌ اِلَّا عَلَیَّ خَاصَّةً، اِلْتِمَاسًا لِاَجْرِ ذٰلِكَ وَ فَضْلِهٖ، وَ زُهْدًا فِيْمَا تَنَافَسْتُمُوْهُ مِنْ زُخْرُفِهٖ وَ زِبْرِجِهٖ.

خطبہ(۷۲)

حضرت علیہ السلام کے ایک کلام کا کچھ حصّہ۔

(اس وقت) جب لوگوں نے حضرت عثمان کی بیعت کا ارادہ کیا۔

البتہ تم جانتے ہو کہ میں اپنے غیر سے اس (خلافت) کا زیادہ حقدار ہوں، مگر خدا کی قسم جب تک مسلمانوں کے امور درست رہیں گے اور اس میں خاص میری ذات کے سوا کوئی ظلم و جور (کسی پر) نہیں ہوگا اس وقت تک میں بھی (اپنے اس حق کو) چھوڑے رہوں گا تا کہ میں اس (صبر) کا اجر اور فضل حاصل کروں اور تم لوگوں نے اس کی (ظاہری) زیب و زینت میں جو نفسانیت برتی ہے اس سے الگ رہوں۔

❁ خطبہ :۷۳ ❁

وَ مِنْ كَلَامٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

لَمَّا بَلَغَهُ اتِّهَامُ بَنِیْۤ اُمَيَّةَ لَهٗ بِالْمُشَارَكَةِ فِیْ دَمِ عُثْمَانَ:

اَوَ لَمْ يَنْهَ بَنِیْۤ اُمَيَّةَ عِلْمُهَا بِیْ عَنْ قَرْفِیْ؟ اَوَ مَا وَزَعَ الْجُهَّالَ سَابِقَتِیْ عَنْ تُهَمَتِیْ؟! وَ لَمَا وَعَظَهُمُ اللّٰهُ بِهٖۤ

خطبہ(۷۳)

حضرت علیہ السلام کے ایک کلام کا کچھ حصّہ۔

جب حضرتؑ تک بنی امیہ کا یہ اتہام پہنچا کہ وہ آپؑ کو حضرت عثمان کے خون میں شریک قرار دیتے ہیں (تو فرمایا):

کیا بنی امیہ کو جو علم میرے حالات کا ہے اس نے انہیں مجھ پر (یہ) عیب لگانے سے باز نہیں رکھا اور میری (دینی) منزلت نے (ان) جاہلوں کو مجھ پر افترا کرنے سے منع نہیں کیا؟[1] (تو خیر) یقیناً وہ (کلام) جس سے خدا نے ان کی

[1] تمام اسلامی تاریخیں اس پر متفق ہیں کہ حضرت علیؑ کی ذرہ برابر شرکت قتل حضرت عثمان میں نہیں ہے بلکہ آپ نے انہیں ہر طرح سمجھایا اور ان کی مدد کی۔ علامہ ابن عبد ربہ نے ''العقد الفرید'' میں لکھا ہے کہ کسی نے سعد بن ابی وقاص سے پوچھا کہ (بقیہ صفحہ مابعد)

اَبْلَغُ مِنْ لِّسَانِیْ.

اَنَا حَجِیْجُ الْمَارِقِیْنَ، وَ خَصِیْمُ الْمُرْتَابِیْنَ، وَ عَلٰی کِتَابِ اللّٰہِ تُعْرَضُ الْاَمْثَالُ، وَ بِمَا فِی الصُّدُوْرِ تُجَازَی الْعِبَادُ!.

نصیحت کی ہے میری زبان سے بلیغ تر ہے۔[1]

(ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ) میں دین سے خارج ہو جانے والوں کے ساتھ مجادلہ کرنے والا اور شک کرنے والوں کا دشمن ہوں اور (اصول تو یہ ہے کہ) خدا کی کتاب پر مثالیں پیش کی جاتی ہیں[2] اور جو (عقاید یا خیالات) سینوں میں ہیں انہیں پر بندوں کو جزا دی جائے گی۔

(بقیہ صفحہ ماقبل) حضرت عثمان کو کس نے قتل کیا؟ سعد نے کہا اس تلوار نے قتل کیا جو حضرت عائشہ نے کھینچی تھی اور طلحہ نے تیز کی تھی اور تاریخ طبری جلد ۵ صفحہ ۱۷۲ میں ہے کہ قتل حضرت عثمان کے بعد حضرت علیؑ خلیفہ ہوئے تو اس وقت حضرت عائشہ حج کرنے گئی تھیں واپسی میں یہ واقعات سنے تو مکہ کو لوٹ گئیں اور کہا واللہ میں ان کی ان کے خون کا بدلہ لوں گی۔ ابن اُمّ کلاب نے کہا کیوں؟ سب سے پہلے آپ ہی نے تو لوگوں کو حضرت عثمان کے قتل کرنے پر آمادہ کیا ہے اور فرماتی تھیں:

اُقْتُلُوْا نَعْثَلًا فَقَدْ کَفَرَ

کہ اس نعثل یہودی کو قتل کرو یہ کافر ہو گیا ہے۔

حضرت عائشہ نے کہا بے شک میں نے کہا تھا اور لوگوں نے بھی کہا تھا مگر میرا قول اخیر قول اوّل سے بہتر ہے۔ ابن ام کلاب نے کہا آپ نے ان کے قتل کرنے کا حکم دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ کافر ہو گیا ہے تو ہم نے ان کے قتل کرنے کا حکم دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ کافر ہو گیا ہے، تو ہم نے ان کے قتل کرنے میں آپ کی اطاعت کی، ہمارے نزدیک تو قاتل وہ ہے جس نے قتل کرنے کا حکم دیا۔

[1] جیسے خدا نے فرمایا:

﴿اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ﴾ (سورۂ الحجرات، آیہ ۱۲) یقیناً بعض گمان گناہ ہے۔

﴿لَا یَغْتَبْ بَّعْضُکُمْ بَعْضًا ؕ اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا﴾ (سورۂ الحجرات، آیہ ۱۲)

ایک شخص دوسرے کی غیبت نہ کرے تم میں کوئی اس کو پسند کرتا ہے کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھالے۔

﴿وَ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ بِغَیْرِ مَا اکْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِیْنًا﴾ (سورۂ الاحزاب، آیہ ۵۸)

جو لوگ مومنین اور مومنات کو ایسے امور کا الزام قائم کر کے اذیت پہنچاتے ہیں جن امور کو انہوں نے کیا نہیں ہے وہ بہت بڑا گناہ اور بہتان اٹھاتے ہیں۔

[2] مفتی محمد عبدہ مصری اس جملہ کی شرح میں لکھتے ہیں کہ امثال سے مراد متشابہات اعمال وحوادث ہیں جو قرآن پر پیش کیے جاتے ہیں جو اس کے موافق ہوں گے وہ حق مشروع ہیں اور جو اس کے مخالف ہوں گے وہ باطل ممنوع ہیں اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ (بقیہ صفحہ مابعد)

❁ خطبہ :۷۴ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

رَحِمَ اللّٰهُ امْرَاً سَمِعَ حُكْمًا فَوَعٰى، وَ دُعِيَ اِلٰى رَشَادٍ فَدَنَا، وَ اَخَذَ بِحُجْزَةِ هَادٍ فَنَجَا، رَاقَبَ رَبَّهٗ، وَ خَافَ ذَنْۢبَهٗ، قَدَّمَ خَالِصًا، وَ عَمِلَ صَالِحًا، اكْتَسَبَ مَذْخُوْرًا، وَ اجْتَنَبَ مَحْذُوْرًا، رَمٰى غَرَضًا، وَ اَحْرَزَ عِوَضًا، كَابَرَ هَوَاهُ، وَ كَذَّبَ مُنَاهُ، جَعَلَ الصَّبْرَ مَطِيَّةَ نَجَاتِهٖ، وَ التَّقْوٰى عُدَّةَ وَفَاتِهٖ، رَكِبَ الطَّرِيْقَةَ الْغَرَّآءَ، وَ لَزِمَ الْمَحَجَّةَ الْبَيْضَآءَ، اغْتَنَمَ الْمَهَلَ، وَ بَادَرَ الْاَجَلَ، وَ تَزَوَّدَ مِنَ الْعَمَلِ.

خطبہ(۷۴)

حضرت علیہ السلام کے ایک خطبہ کا کچھ حصّہ

خدا اس شخص پر رحم فرمائے جو کوئی حکم سُنے تو یاد کر لے اور حق کی طرف بُلایا جائے تو (اس کے) نزدیک ہو جائے اور کسی رہبر کی کمر تھامے تو نجات پا جائے۔(وہ ہر وقت) اپنے پروردگار کا لحاظ اور خوف رکھے اور (برابر) اپنے گناہ سے ڈرتا رہے، (عمل) خالص کو آگے بھیجتا اور نیک کام کو انجام دیتا رہے، ذخیرۂ (آخرت یعنی ثواب) کو حاصل کرے اور ڈرائی ہوئی باتوں سے بچے۔ نشانہ ہی پر تیر لگائے (یعنی حق ہی کا پیرو رہے) اور (اپنے اعمال خیر کا) عوض جمع کرے، اپنی خواہش پر غالب رہے اور اپنے آرزوؤں کی تکذیب کرے، صبر کو اپنی نجات کی سواری اور تقویٰ کو اپنی موت (یعنی سفر آخرت) کا سامان قرار دے، مسلک حق (ہی) پر چلے اور (سیدھی نیز) روشن (ہی) راہ کا پابند رہے، (اعمال خیر کے لیے زندگی کی) مہلتوں کو غنیمت سمجھے اور (اپنے) اجل کی طرف تیزی سے بڑھتا رہے اور (اچھے) کام سے زادراہ (آخرت) حاصل کرے۔

❁ خطبہ :۷۵ ❁

وَ مِنْ كَلَامٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

اِنَّ بَنِيْۤ اُمَيَّةَ لَيُفَوَّقُوْنَنِيْ تُرَاثَ

خطبہ(۷۵)

حضرت علیہ السلام کے ایک کلام کا کچھ حصّہ۔

یقیناً بنی امیہ میراث (حضرت) محمد (مصطفی) صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

(بقیہ صفحہ ماقبل) اپنے کل اعمال میں کتاب خدا ہی کی پابندی کرتے رہے لہٰذا کسی مخالف کو اس کی گنجائش ہی نہیں ہو سکتی کہ وہ حضرتؑ پر کسی امر کا طعن یا اعتراض کرے۔

مُحَمَّدٍ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تَفْوِيْقًا، وَاللّٰهِ! لَئِنْ بَقِيْتُ لَهُمْ لَاَنْفُضَنَّهُمْ نَفْضَ اللَّحَّامِ الْوِذَامَ التَّرِبَةَ!.

قَالَ السَّيِّدُ الرَّضِيُّ رَحِمَهُ اللّٰهُ وَ يُرْوٰى: ''اَلتُّرَابُ الْوَذَمَةُ''، وَ هُوَ عَلَى الْقَلْبِ.

قَوْلُهٗ عليه السلام: ''لَيُفَوِّقُوْنَنِيْ'' اَیْ: يُعْطُوْنَنِيْ مِنَ الْمَالِ قَلِيْلًا قَلِيْلًا كَفُوَاقِ النَّاقَةِ، وَ هُوَ الْحَلْبَةُ الْوَاحِدَةُ مِنْ لَّبَنِهَا.

''وَالْوِذَامُ'': جَمْعُ وَذَمَةٍ، وَ هِيَ: الْجُزَّةُ مِنَ الْكَرِشِ اَوِ الْكَبِدِ تَقَعُ فِي التُّرَابِ فَتُنْفَضُ.

سے مجھے تھوڑا تھوڑا دیتے ہیں۔[1] خدا کی قسم اگر میں ان کے لیے زندہ رہا تو انہیں اس طرح جھاڑوں گا جیسے قصاب خاک آلودہ اوجھڑی کو جھاڑتا ہے۔

(جناب سید رضی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ ایک روایت میں ''اَلتُّرَابُ الْوَذَمَةُ'' ہے جو بطور عکس ہے۔

(اس خطبہ میں) حضرتؑ کے قول ''لَيُفَوِّقُوْنَنِيْ'' کا مطلب یہ ہے کہ وہ مجھے (میرے حصہ کے) مال سے تھوڑا تھوڑا دیتے ہیں۔ جیسے اونٹنی کا فواق اور وہ اس کے دودھ کا ایک بار دُوھا جانا ہے۔

اور ''وذام'' جمع ہے وذمہ کی جو اوجھڑی یا جگر کا ٹکڑا ہوتا ہے (اور) زمین پر گرتا ہے تو جھاڑ دیا جاتا ہے)

❁ خطبہ :۷۶ ❁

وَمِنْ كَلِمَاتٍ كَانَ يَدْعُوْ عليه السلام بِهَا۔

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ مَآ اَنْتَ اَعْلَمُ بِهٖ مِنِّيْ، فَاِنْ عُدْتُّ فَعُدْ

خطبہ (۷۶)

اور (یہ چند کلمے) ان کلمات سے (ہیں) جن کے ساتھ حضرت علیہ السلام دعا مانگا کرتے تھے۔

اے خدا! میرے اس (گناہ) کو بخش دے جس کو تو مجھ سے زیادہ جانتا ہے[2] پھر اگر میں (اس گناہ کو) دوبارہ

---

[1] علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ حرب بن حبیش کہتا ہے کہ حضرت عثمان کے زمانہ میں سعید ابن عاص کوفہ کا حاکم تھا اس نے مجھے کچھ ہدیہ اور تحفوں کے ساتھ مدینہ بھیجا انہیں میں کچھ ہدیہ حضرت علیؑ کے پاس بھی روانہ کیا اور حضرتؑ کو لکھا کہ میں نے سوا خلیفہ عثمان کے اور کسی کے پاس اس سے زیادہ ہدیے نہیں بھیجے جس قدر آپ کے پاس روانہ کرتا ہوں۔ جب حضرتؑ نے یہ خط پڑھا تو یہ خطبہ ارشاد فرمایا۔

[2] علمائے شیعہ وسنی کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرات اہل بیت ہر گناہ سے معصوم تھے چنانچہ جلیل القدر علامہ اہل سنت مولوی عبید اللہ صاحب امرتسری ''ارجح المطالب'' مطبوعہ لاہور صفحہ ۴۰۲ میں لکھتے ہیں: (بقیہ صفحہ مابعد)

(بقیہ صفحہ ماقبل)

''ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میں اور علی اور حسن اور حسین اور نو شخص اولاد حسین میں سے معصوم ہیں''۔(المودات)

اور خدا نے قرآن مجید میں بھی ان حضرات کی عصمت کی طرف اس آیہ میں اشارہ کیا ہے:

﴿اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ﴾ (سورۂ النسا، آیہ ۵۹)

اور تفاسیر اہل سنت سے ثابت ہے کہ اولی الامر سے مراد حضرات اہل بیت طاہرین ہیں اور وہ معصوم ہیں۔

چنانچہ تفسیر کبیر جلد ۳ صفحہ ۲۵۰ میں فخر الدین رازی لکھتے ہیں:

اِنَّ اللّٰهَ اَمَرَ بِطَاعَةِ اُولِی الْاَمْرِ عَلٰی سَبِیْلِ الْجَزْمِ فِیْ هٰذِهِ الْاٰیَةِ وَ مَنْ اَمَرَ اللّٰهُ بِطَاعَتِهٖ عَلٰی سَبِیْلِ الْجَزْمِ وَالْقَطْعِ لَا بُدَّ اَنْ یَّكُوْنَ مَعْصُوْمًا عَنِ الْخَطَاْ۔

یعنی خدا نے اس آیہ میں اولی الامر کی اطاعت واجب کی ہے تو واجب ہے کہ وہ معصوم ہوں۔

اور علامہ مولوی محمد معین صاحب لاہوری کتاب ''دراسات اللبیب'' مطبوعہ صفحہ ۲۰۸ میں لکھتے ہیں:

''جب کہ ہر طرح صحت حدیث ثقلین کی اور اس کے متعلقات کی لفظ اور معنی اور دلالت سے تحقیق ہو چکی اور آیۂ تطہیر کو اس کے ساتھ ملایا مع تفسیر جس پر اور احادیث صحیحہ دال ہیں تو پھر جس شخص کو کچھ بھی انصاف ہوگا وہ یقین کرے گا کہ ائمہ اثنا عشر اور جناب سیدہؑ سب کے سب معصوم ہیں بلا کسی قسم کے شک وریب کے اور خاص حضرت علیؑ کی عصمت کی دلیلیں بھی موجود ہیں۔ چنانچہ ''ارجح المطالب'' مطبوعہ لاہور صفحہ ۱۹۲ میں ''جناب امیر علیہ السلام کی طہارت'' اور ''جناب امیر علیہ السلام کی عصمت'' کی سرخی لکھ کر حضرتؑ کی عصمت کے متعلق متعدد حدیثیں نقل کی ہیں۔ پس باوجود اس کے کہ حضرتؑ معصوم تھے پھر بھی اس دعا میں خدا سے اپنے گناہوں کی بخشش طلب کر رہے ہیں جس طرح حضرت رسول خداؐ بھی معصوم تھے مگر خدا سے برابر اپنے گناہوں کی مغفرت چاہتے تھے۔ تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حضرت علیؑ یا حضرت رسول خداؐ معاذ اللہ کوئی گناہ کرتے تھے۔ حاشا وکلا ایسا نہیں تھا بلکہ یہ حضرات ہر حالت میں اپنے کو خدا کا گنہگار بندہ سمجھتے تھے اور اپنے کسی فعل کو اس قابل نہیں خیال کرتے تھے جس سے مغفرت کا یقین کر لیں۔

حضرت رسول خداؐ سے بڑھ کر خدا کی معرفت کس کو ہو سکتی ہے پھر بھی حضرتؐ یہی فرماتے تھے کہ

مَا عَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ

اے خدا جیسا تجھے پہچاننا چاہیے ویسا میں نے نہیں پہچانا۔

خدا نے حضرت رسول خداؐ کو جنت میں داخل کرنے کا حتمی وعدہ کیا تھا بلکہ آپ کی شفاعت سے دوسروں کو بخش دے گا مگر آپ پر خدا کا خوف اس درجہ غالب تھا کہ حد سے زیادہ عبادتِ خدا میں مشغول رہتے تھے جس پر خدا نے قرآن مجید میں فرمایا:

﴿طٰهٰ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓی﴾ (سورۂ طٰہٰ، آیہ ۲)

غرض یہ حضرات معصوم تو تھے مگر اپنے کو ہر حال میں خدا کا گنہگار بندہ ہی سمجھتے تھے اور اسی وجہ سے اس قسم کی دعائیں مانگتے تھے جو ان کے کمال، خوفِ خدا اور اعترافِ عبودیت کی دلیل ہے جس طرح بیٹے کا فرض ہے کہ خواہ وہ کیسا ہی عالم اور (بقیہ صفحہ مابعد)

عَلَيَّ بِالْمَغْفِرَةِ.

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ مَا وَاَيْتُ مِنْ نَّفْسِيْ، وَ لَمْ تَجِدْ لَهٗ وَفَآءً عِنْدِيْ.

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ مَا تَقَرَّبْتُ بِهٖ اِلَيْكَ بِلِسَانِيْ، ثُمَّ خَالَفَهٗ قَلْبِيْ.

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ رَمَزَاتِ الْاَلْحَاظِ، وَ سَقَطَاتِ الْاَلْفَاظِ، وَ شَهَوَاتِ الْجَنَانِ، وَ هَفَوَاتِ اللِّسَانِ.

کروں تو تو بھی مجھے دوبارہ بخش دے۔

اے خدا! جس امر کا وعدہ میں نے اپنے نفس سے کیا تھا مگر تو نے مجھے اس (وعدہ) کو وفا کرتے نہ پایا اسے بھی بخش دے۔

اے خدا! میں نے اپنی زبان سے جس چیز (یعنی جس کلام) کے ساتھ تیری نزدیکی چاہی پھر میرے دل نے اس کی مخالفت کی اسے (بھی) بخش دے۔

اے خدا! (میری) کنکھیوں کے اشارے اور بیہودہ باتوں اور دل کی شہوتوں اور زبان کی لغزشوں کو (بھی) بخش دے۔

❁ خطبہ :۷۷ ❁

وَ مِنْ كَلَامٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالَهٗ لِبَعْضِ اَصْحَابِهٖ۔

لَمَّا عَزَمَ عَلَى الْمَسِيْرِ اِلَى الْخَوَارِجِ فَقَالَ لَهٗ يَآ اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ! اِنِّيْ سِرْتَ فِيْ هٰذَا الْوَقْتِ خَشِيْتُ اَنْ لَّا تَظْفَرَ بِمُرَادِكَ مِنْ طَرِيْقِ عِلْمِ النُّجُوْمِ، فَقَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ:

خطبہ (۷۷)

حضرت علیہ السلام کے کلام کا کچھ حصّہ۔

جسے اپنے بعض اصحاب سے ارشاد فرمایا:

جب (حضرتؑ نے) خارجیوں کی طرف (جہاد کے لیے) جانے کا پختہ ارادہ کیا تو (کسی صحابی نے) علم نجوم کے قاعدہ سے آپؑ کی خدمت میں عرض کی کہ اے امیر المومنینؑ اگر آپؑ اس وقت سفر کریں گے تو میں ڈرتا ہوں کہ اپنی مراد میں کامیاب نہ ہوسکیں گے۔ تو (یہ سن کر حضرت) علیہ السلام نے (ان سے) کہا: [1]

(بقیہ صفحہ ماقبل) معزز ہوجائے مگر اپنے باپ کی ہمیشہ تعظیم ہی کرے۔ اسی طرح ہر بندے کا فرض ہے کہ اگرچہ وہ نبی یا امام ہوجائے اور درجہ عصمت پر پہنچ جائے پھر بھی اپنے کو اپنے خالق کا گنہگار ہی کہے اور سمجھے۔

[1] علم نجوم کے غلط اور باطل ہونے میں احادیث جناب رسالت مآبؐ کا اتفاق ہے خواہ وہ حدیثیں حضرات اہل سنت کے یہاں مروی ہوں خواہ شیعوں کے یہاں۔ چنانچہ آنحضرتؐ کی متفق حدیث ہے: (بقیہ صفحہ مابعد)

اَ تَزْعَمُ اَنَّكَ تَهْدِیْٓ اِلَی السَّاعَةِ الَّتِیْ مَنْ سَارَ فِیْهَا صُرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءُ؟ وَ تُخَوِّفُ مِنَ السَّاعَةِ الَّتِیْ مَنْ سَارَ فِیْهَا حَاقَ بِهِ الضُّرُّ؟ فَمَنْ صَدَّقَ بِهٰذَا فَقَدْ كَذَّبَ

کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ تم اس ساعت کو بتا سکتے ہو جس میں کوئی شخص سفر کرے تو اس سے بُرائی دفعہ کر دی جائے گی اور اس ساعت سے ڈراتے ہو جس میں کوئی شخص سفر کرے تو اسے نقصان پہنچے گا؟ پھر جو شخص (تمہارے) اس (قول) کو سچا سمجھے اسے یقیناً قرآن مجید کو جھوٹا ماننا پڑے گا[1] اور وہ (اپنے مطلوب و) محبوب کے پانے اور

ترجمہ صحیفہ: كَذَبَ الْمُنَجِّمُوْنَ وَ رَبِّ الْكَعْبَةِ۔
یعنی خانہ کعبہ کے پروردگار کی قسم منجم سب جھوٹے ہیں۔

کیونکہ وہ علم غیب کی خبریں دیتے ہیں اور غیب کی خبریں خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا اور مشاہدہ بھی یہی بتاتا ہے۔ چنانچہ دن رات کس کثرت سے نجومیوں کی پیشین گوئیاں نکلتی رہتی ہیں اور کس شد و مد سے ان کے حتمی اور یقینی ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے مگر ان میں کتنی سچی ثابت ہوتی ہے؟ پس حقیقت یہ ہے کہ جو امور اصول و قواعد حسابات وغیرہ سے متعلق ہیں علم نجوم کے وہ احکام تو کچھ صحیح ثابت ہوتے ہیں اور جو امور غیب کی خبروں کے متعلق ہوتے ہیں وہ کبھی بھی درست نہیں ثابت ہوتے تو اس شخص نے بھی علم نجوم سے غیب کی خبر دی تھی کہ اے حضرتؑ آپ اس وقت سفر کریں گے تو کامیاب نہیں ہوں گے لہٰذا حضرتؑ نے اس خطبہ سے اس کے خیال کی رد کر دی اور اسی وقت خود بھی سفر کر کے اور اپنے اصحاب کو بھی روانہ کرا کے حضرتؑ نے عملی حیثیت سے ثابت کر دیا کہ دیکھو تمہارے علم نجوم کے قواعد سے تو یہ سفر منحوس تھا مگر میں کامیاب ہی ہوا کہ جنگ نہروان میں جو بروایت طبری و ابن اثیر و ابن خلدون اواخر ۳۷ھ میں اور بروایت مسعودی و صاحب حبیب السیر، اوائل ۳۸ھ میں ہوئی، فتح پائی۔

[1] اس لیے کہ خداوند عالم نے قرآن مجید کی متعدد آیات میں اس امر کی تصریح فرما دی ہے کہ علم غیب اور اس کی خبریں خدا کے سوا کسی کو معلوم نہیں ہو سکتیں اور نجومی دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ غیب کی خبریں جانتے ہیں اور حکم لگاتے ہیں تو وہ قرآن کو جھٹلاتے ہیں۔ چنانچہ ایک مقام پر فرمایا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَ یُنَزِّلُ الْغَیْثَ ۚ وَ یَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَامِ ؕ وَ مَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ؕ وَ مَا تَدْرِیْ نَفْسٌۢ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ﴾ (سورۂ لقمان، آیہ ۳۴)
یعنی اللہ ہی کو قیامت کا علم ہے وہی بارش نازل کرتا ہے اور ماں کے رحم میں جو ہوتا ہے اس کو بھی وہی جانتا ہے اور کوئی شخص اس کو نہیں جانتا کہ وہ کل کام کون کرے گا اور کوئی شخص یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ کس زمین پر مرے گا۔

پھر دوسرے مقام پر فرماتا ہے:

﴿قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ (سورۂ النمل، آیہ ۶۵)
یعنی اے رسول ان لوگوں سے کہہ دو کہ جو مخلوقِ خدا آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں ان میں سے کوئی بھی غیب

(بقیہ صفحہ آئندہ)

الْقُرْاٰنَ، وَ اسْتَغْنٰى عَنِ الْاِسْتِعَانَةِ بِاللّٰهِ فِيْ نَيْلِ الْمَحْبُوْبِ وَ دَفْعِ الْمَكْرُوْهِ، وَ يَنْبَغِيْ فِيْ قَوْلِكَ لِلْعَامِلِ بِاَمْرِكَ اَنْ يُّوْلِيَكَ الْحَمْدَ دُوْنَ رَبِّهٖ، لِاَنَّكَ ـ بِزَعْمِكَ ـ اَنْتَ هَدَيْتَهٗۤ اِلَى السَّاعَةِ الَّتِيْ نَالَ فِيْهَا النَّفْعَ، وَ اَمِنَ الضَّرَّ.

مکروہ کے دفع کرنے میں خدا کی مدد حاصل کرنے سے بے پروا ہو جائے گا اور تمہاری اس بات سے مناسب یہ ہے کہ تمہارے مشورے پر عمل کرنے والا اپنے پروردگار کے عوض تم ہی کو مستحق حمد سمجھے کیونکہ تم ہی نے اپنے زعم (فاسد) کے مطابق اسے اس ساعت کی طرف ہدایت کی ہے جس میں (سفر کرنے سے) اس نے نفع پایا اور نقصان سے محفوظ رہا۔

ثُمَّ اَقْبَلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ عَلَى النَّاسِ فَقَالَ:

[پھر (حضرت) علیہ السلام (اپنے) لشکر کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا]

اَيُّهَا النَّاسُ! اِيَّاكُمْ وَ تَعَلُّمَ النُّجُوْمِ، اِلَّا مَا يُهْتَدٰى بِهٖ فِيْ بَرٍّ اَوْ بَحْرٍ، فَاِنَّهَا

لوگو! خبردار علم نجوم کبھی نہ سیکھنا مگر اس قدر جس سے خشکی یا سمندر (کے سفر) میں راستہ دریافت کیا جائے[1] کیونکہ یہ

(بقیہ صفحہ ماقبل) کو نہیں جانتا صرف خدا ہی جانتا ہے۔

دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿وَ عِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَاۤ اِلَّا هُوَ﴾ (سورۂ الانعام، آیہ ۵۹)

یعنی علم غیب کی کنجیاں خدا ہی کے پاس ہیں جن کو ان کے سوا کوئی نہیں جان سکتا۔

یہاں اگر کوئی اعتراض کرے کہ جناب رسالت مآبؐ اپنے علم نبوت سے اور حضرات ائمہ طاہرینؑ اپنے علم امامت سے بہت سی غیب کی خبریں دیا کرتے تھے حالانکہ آیات مذکورہ سے معلوم ہوا کہ خدا کے سوا غیب کوئی نہیں جانتا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ جناب رسالت مآبؐ اور حضرات ائمہ طاہرینؑ کو غیب کی خبریں خدا کی تعلیم سے معلوم ہوتی تھیں۔ یعنی خدا ہی ان حضرات کو قبل از وقت ان خبروں پر مطلع کر دیتا تھا لہٰذا ان حضرات کے علم پر علم نجوم کا قیاس نہیں ہو سکتا جو حرکات فلکیہ کے قواعد و اصول سے استنباط کیا جاتا ہے۔

[1] یعنی اس قدر علم نجوم کا حاصل کرنا جائز ہے جس سے سفر میں راہ کا پتہ حاصل کیا جائے کیونکہ عرب اور ایسے ہی دوسرے مقامات میں جہاں سڑک اور راستہ وغیرہ بنا ہوا نہیں ہوتا ایک مقام سے دوسرے مقام پر جانے میں ستاروں سے بہت کچھ مدد لی جاتی ہے اور دریائی سفر میں تو اس علم سے بہت کامیابی ہوتی ہے اسی وجہ سے خدا نے قرآن مجید میں بھی اس قدر علم نجوم حاصل کرنے کی اجازت اشارہ کے طور پر دی ہے چنانچہ فرمایا ہے:

﴿هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ﴾ (سورۂ الانعام، آیہ ۹۷)

یعنی اسی خداوند عالم نے تم لوگوں کے آرام اور سہولت کے لیے آسمان میں ستاروں کو رکھا تا کہ تم ان سے خشکی اور

(بقیہ صفحہ مابعد)

تَدْعُوْ اِلَى الْكَهَانَةِ، وَ الْمُنَجِّمُ كَالْكَاهِنِ، وَ الْكَاهِنُ كَالسَّاحِرِ، وَ السَّاحِرُ كَالْكَافِرِ! وَ الْكَافِرُ فِي النَّارِ! سِيْرُوْا عَلَى اسْمِ اللّٰهِ تَعَالٰى وَ عَوْنِهٖ۔

(علم نجوم انسان کو) کہانت پر آمادہ کرتا ہے۔ (یہ بھی سمجھ لو کہ) منجم مثل کاہن کے ہے اور کاہن مثل جادوگر کے ہے[1] اور جادوگر مثل کافر کے ہے اور کافروں (کی جگہ) جہنم میں (قرار دی گئی ہے)۔ (غرض) خدائے برتر کے نام اور اسی کی مدد (کے بھروسا) پر (اسی وقت) روانہ ہو۔

خطبہ :۷۸

وَ مِنْ كَلَامٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ بَعْدَ فِرَاغِهٖ مِنْ حَرْبِ الْجَمَلِ فِيْ

خطبہ (۷۸)

حضرت علیہ السلام کے ایک کلام کا کچھ حصّہ۔ جسے جنگ جمل سے فارغ ہونے کے بعد عورتوں کی

بحری سفر کی تاریکیوں میں راستہ دریافت کرلیا کرو۔

پھر دوسرے مقام پر ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَ الْحِسَابَ﴾ (سورۂ یونس، آیہ ۵)

یعنی تاکہ تم لوگ سالوں کا عدد اور حساب جان سکو۔

تو حضرت امیر المومنینؑ کا مقصود یہ ہے کہ علم نجوم کی وہ قسم جسے علم ہیئت کہتے ہیں تم لوگوں کو سیکھنا چاہیے کہ اس سے آفتاب و مہتاب کے حرکات اور قمر در عقرب وغیرہ کا حساب معلوم ہوتا ہے جن کی ضرورت بری اور بحری سفر میں ہوتی ہے اور وہ قسم نہ حاصل کرنا جو علم تنجیم کے نام سے مشہور ہے جو اس اعتقاد پر مبنی ہے کہ ستاروں میں بھی روحانی تاثیرات ہیں اور ان روحانی تاثیرات کا عالم عنقری پر باطنی غلبہ اور معنوی تسلط ہے۔ اور جس علم کے متعلق بعض لوگوں کا یہ فاسد گمان ہے کہ جو شخص علم نجوم میں مہارت پیدا کر کے ان ستاروں کے ارواح سے خصوصیت اور تعلق پیدا کر لیتا ہے اور اپنی ریاضت سے ان کے احکام سمجھنے کی استعداد حاصل کر لیتا ہے اس پر زمانہ موجودہ اور زمانہ آئندہ کے حالات اور واقعات و حوادثات کا علم نمایاں ہو جاتا ہے جس سے وہ علم غیب پر مطلع ہو جاتا ہے۔

[1] کاہن اور منجم میں فرق یہ ہے کہ منجم وہ شخص ہے جو آسمان اور ستاروں کے اصول و قوانین اور ان کی حرکات کے اوضاع و قواعد کے واسطہ سے ہونے والے واقعات پر حکم لگائے اور کاہن وہ شخص ہے جو جنّات کو تسخیر کر کے یا ان کی مصاحبت میں رہنے کا دعویٰ کر کے اپنی قوت نفسانیہ سے علم غیب کا دعویٰ کرنے اور اس قسم کی خبریں بیان کرے۔ پس حضرت امیر المومنین علیہ السلام کا یہ قول اس امر کی قطعی دلیل ہے کہ جو لوگ علم نجوم، علم رمل وغیرہ کی صحت کا اعتقاد رکھتے ہیں وہ باطل پر ہیں اور یہ دلیل واضح اس امر کی ہے کہ یہ علوم صحیح نہیں ہیں اور اسی وجہ سے اصول شرعیہ و عقلیہ کے منافی بھی ہیں جس سے حضرتؑ کو یہ اہتمام کرنا پڑا کہ فرمایا منجم مثل کاہن کے ہے اور کاہن مثل جادوگر کے اور ساحر مثل کافر کے، نتیجہ یہ نکلا کہ منجم اور کاہن سب ہی کافر کے حکم میں ہیں۔

ذَمِّ النِّسَآءِ: مذمت میں (فرمایا:) [1]

[1] اگرچہ یہ خطبہ مطلقاً عورتوں کی مذمت میں ہے لیکن علامہ ابن ابی الحدید کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرتؑ کے اس خطبہ کو ارشاد فرمانے کا منشا حضرت عائشہ کی ذات تھی چنانچہ علامہ ممدوح اس خطبہ کی شرح میں لکھتے ہیں کہ جس شخص نے بھی احادیث اور تاریخ میں کوئی کتاب لکھی ہے اس نے بیان کیا ہے کہ حضرت عائشہ ہی سب سے زیادہ حضرت عثمان کی مخالف ہو رہی تھیں یہاں تک کہ آپ نے جناب رسالت مآبؐ کے کپڑوں سے ایک کپڑا نکال کر اپنے گھر میں لٹکا دیا تھا اور جو لوگ آپ کے پاس آتے تھے انہیں وہ کپڑا دکھا کر فرماتی تھیں کہ دیکھو ابھی حضرت رسول خداؐ کا یہ کپڑا پرانا نہیں ہوا مگر عثمان نے حضرتؐ کی سنت کو پرانی کر دیا۔ لوگوں کا یہ بھی بیان ہے کہ سب سے پہلے حضرت عائشہ ہی نے حضرت عثمان کا خطاب نعثل مقرر کیا تھا جس کا لغوی معنی وہ شخص ہے جس کے بدن اور داڑھی میں بال زیادہ ہوں اور فرمایا کرتی تھیں:

اُقْتُلُوا نَعْثَلًا قَتَلَ اللّٰهُ نَعْثَلًا۔

یعنی اس نعثل کو قتل کر ڈالو خدا اسے قتل کرے۔

لغت کی کتابوں میں ہے ''اَلنَّعْثَلُ الشَّیْخُ الْاَحْمَقُ ''یعنی نعثل شیخ احمق کو کہتے ہیں۔ نیز نعثل مصر میں ایک لانبی داڑھی کے یہودی کا نام تھا چونکہ حضرت عثمان کی داڑھی بھی ویسی ہی تھی اس سبب سے صحابہ اور خصوصاً حضرت عائشہ غصہ میں حضرت عثمان کو نعثل کہتی تھیں۔ دیکھیے روضۃ الصفا، حبیب السیر، مجمع بہار الانوار، نہایہ ابن اثیر، تاریخ خمیس وغیرہ۔ صاحب تاج العروس نے لکھا ہے کہ خاص مدینہ میں بھی ایک یہودی نعثل نام دراز ریش تھا اسی کی مشابہت سے حضرت عائشہ حضرت عثمان کو نعثل فرمایا کرتی تھیں۔)

پھر علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ

جب حضرت عثمان قتل ہوئے تو حضرت عائشہ مکہ معظّمہ میں تھیں یہ خبر سن کر بہت خوش ہوئیں۔ انہیں یقین تھا کہ اب طلحہ خلیفہ ہوں گے۔ پس نہایت جوش و مسرت میں مکہ سے روانہ ہوئیں اور طلحہ کو دعا دیتی جاتی تھیں کہ تمہارے خلیفہ ہونے سے مجھے کیسی فرحت ہو رہی ہے۔ راستہ میں ایک شخص سے معلوم ہوا کہ حضرت علیؑ خلیفہ ہو گئے تو اب حالت بدل گئی فرمانے لگیں:

لَوَدِدْتُ اَنَّ السَّمَاءَ انْطَبَقَتْ عَلَی الْاَرْضِ اِنْ تَمَّ هٰذَا۔

کہ اگر ایسا ہوا تو خدا کرتا آسمان پھٹ کر زمین پر گر پڑتا۔

پھر واویلا کرتی ہوئیں مکہ معظّمہ کو لوٹ چلیں اس شخص نے کہا اے ام المومنین آپ کی حالت کیوں ہو رہی ہے خدا کی قسم میں تو دنیا میں حضرت علیؑ سے بہتر افضل اور اس خلافت کے لیے مستحق تر کسی کو نہیں پاتا اور کل حالات و فضائل و مناقب میں ان کا مثل و نظیر کوئی بھی معلوم نہیں ہوتا تو آپ ان کی خلافت کو کیوں ناپسند کرتی ہیں؟ مگر حضرت عائشہ نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا اور تیز تیز مکہ معظّمہ کی طرف چلیں۔ پہلے تو عثمان کی خبر سن کر کہتی تھیں کہ خدا اسے دور کرے خوب ہوا مارا گیا، مگر علی کی خلافت سن کر فرمانے لگیں کہ آہ لوگوں نے عثمان کو مظلوم قتل کر دیا، بڑا اندھیر ہو گیا۔ اس شخص نے کہا ابھی تو آپ کہتیں تھیں کہ خدا اسے دور کرے خوب ہوا کہ مارا گیا اور اب یہ فرماتی ہیں تو فرمایا ہاں کہتی تو تھی مگر اب جوان کی حالت میں غور کی تو سمجھتی ہوں کہ عثمان نے اپنے گناہوں سے توبہ کر لی تھی لہٰذا مظلوم اور بے بس قتل کیے گئے۔

مَعَاشِرَ النَّاسِ! اِنَّ النِّسَآءَ نَوَاقِصُ الْاِیْمَانِ، نَوَاقِصُ الْحُظُوْظِ، نَوَاقِصُ الْعُقُوْلِ: فَاَمَّا نُقْصَانُ اِیْمَانِهِنَّ فَقُعُوْدُهُنَّ عَنِ الصَّلٰوةِ وَ الصِّیَامِ فِیْ اَیَّامِ حَیْضِهِنَّ، وَ اَمَّا نُقْصَانُ عُقُوْلِهِنَّ فَشَهَادَةُ امْرَاَتَیْنِ مِنْهُنَّ كَشَهَادَةِ الرَّجُلِ الْوَاحِدِ، وَ اَمَّا نُقْصَانُ حُظُوْظِهِنَّ فَمَوَارِیْثُهُنَّ عَلَى الْاَنْصَافِ مِنْ مَّوَارِیْثِ الرِّجَالِ.

لوگو! یقیناً عورتیں (بمقابلہ مردوں کے) کم ایمان کم، حصّے اور کم عقل والی ہوتی ہیں۔

چنانچہ ان کے ایمان کی کمی (کی دلیل) تو ان کا اپنے حیض (کے زمانہ) میں نماز اور روزوں سے (الگ) بیٹھ رہنا ہے اور رہی ان کے عقلوں کی کمی تو (اس کی دلیل) ان سے دو عورتوں کی گواہی کا ایک مرد کی گواہی کے برابر ہونا ہے اور رہی ان کے حصّوں کی کمی تو (اس کا ثبوت) ان کی میراثوں کا مردوں کی میراثوں سے نصف (کے اصول) پر (مقرر) ہونا ہے۔[1]

---

[1] اس خطبہ میں حضرتؑ نے عورتوں کے مَردوں سے کم مرتبہ ہونے کی تین وجہیں ذکر کی ہیں اور تینوں وجوہ عقل اور مذہب اسلام کے مطابق ہی ہیں۔

پہلی صفت کم ایمان کا ہونا تو اس کی وجہ سے ظاہر ہے کہ جس قدر انسان کی معرفت اور علم میں زیادتی ہوگی اسی قدر اس کا ایمان کامل اور یقین محکم ہوگا اور عورتوں کا اپنی فطری وجوہ اور قدرتی اسباب سے مردوں کے مقابلہ میں کم علم ہونا یا علم و معرفت کی تحصیل میں مردوں سے پیچھے رہنا محتاج دلیل نہیں ہے۔ پس جب وہ مردوں کے برابر علم حاصل نہیں کرتیں یا کر نہیں سکتیں تو ان کا ایمان اور یقین بھی مردوں کے برابر نہیں ہوتا۔ مثال کے لیے مشنری عورتوں یا لیڈی ڈاکٹروں کی کامیابیاں جو انہیں عورتوں کے اپنے مذہب سے علیحدہ کر دینے میں حاصل ہوتی ہیں اور مشنری مردوں کا ان کے مقابلہ میں اکثر ناکامیاب رہنا یا برائے نام کامیاب ہونا روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔ پس یہ قوت ایمان کی کمزوری ہی تو ہے جس سے عورتیں جلد دوسروں کے اثر میں آجاتی ہیں اور اپنا مذہب ترک کر دیتی ہیں اور حضرتؑ نے ان کے زمانہ حیض میں نماز، روزے سے الگ رہنے کو جو ذکر کیا تو یہ بر سبیل تسلی ہے کہ عورتوں کا مردوں سے ایمان و یقین میں کم ہونا تو ایسا واضح ہے جس کے ثبوت کی ضرورت نہیں ہے بلکہ وہ اعمال و عبادات میں بھی مردوں سے کم ہیں اور ان کے برابر نہیں ہو سکتیں کیونکہ مرد ہمیشہ نماز و روزہ وغیرہ عبادات بجالا سکتے ہیں مگر عورتوں کو حیض کے زمانہ میں تو انہیں ان چیزوں کے چھوڑ دینے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں ہے۔

ان کا دوسرا عیب عقل میں مردوں سے کم ہونا ہے تو یہ بھی واضح ہے کہ کسی ملک اور کسی زمانہ میں عقل میں عورتیں مردوں کے برابر نہیں ہوتیں اور جس قدر عقلی خدمات مردوں سے ہوئی عورتیں نہ کر سکیں اور اس وقت بھی باوجود یکہ نئی روشنی کے دعوے کرنے والے ملکوں میں عورتیں تعلیم اور صنعت و حرفت میں بڑی کوشش کر رہی ہیں پھر بھی وہ مردوں کی نصف حالت کو بھی نہیں پہنچیں اور اسی وجہ سے کسی سلطنت میں بھی انہیں حکومت و سیاست و مدنیت کے حقوق مردوں کے برابر حاصل نہیں ہوتے جس کو حضرت (بقیہ صفحہ مابعد)

فَاتَّقُوْا شِرَارَ النِّسَآءِ، وَ كُوْنُوْا مِنْ خِيَارِهِنَّ عَلٰى حَذَرٍ، وَ لَا تُطِيْعُوْهُنَّ فِي الْمُنْكَرِ.

تو تم سب بری عورتوں سے (برابر) بچتے رہنا اور اچھی عورتوں سے (بھی خوب) ہوشیار رہنا اور نیک کام تک میں ان کی اطاعت نہ کرنا تاکہ (پھر وہ اس سے ترقی کر کے) برے کام میں (بھی تمہیں اپنا مطیع بنانے کی) طمع نہ کریں۔[1]

خطبہ :۷۹

خطبہ (۷۹)

وَ مِنْ كَلَامٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

حضرت علیہ السلام کے ایک کلام کا کچھ حصّہ

اَيُّهَا النَّاسُ! الزَّهَادَةُ قِصَرُ الْاَمَلِ، وَ

لوگو! (دنیا کی) امید کو کم کرنا اور نعمتوں پر (خدا کا)

(بقیہ صفحہ مابعد) امیر المومنینؑ نے ایک مختصر جملہ میں بیان فرمادیا کہ جس کام میں دو مردوں کی گواہی ضروری ہوتی ہے اس میں صرف عورتیں گواہی دیں تو چار عورتوں کی شہادت ضروری ہے جو مطابق عقل بھی ہے اور موافق مذہب اسلام بھی۔

عورتوں کا تیسرا عیب ان کے حصوں کا ناقص ہونا ہے چنانچہ میراث میں اگر بھائی کو دو حصہ ملے گا تو بہن کو ایک ہی دیا جائے گا اور تحقیق کی جائے اور اعداد و شمار سے پتہ لگایا جائے تو ثابت ہوگا کہ اسی اصول پر دنیا کے کل مردوں اور عورتوں کی حالت ہے کہ مردوں کی دولت مالداری اور اقتدار کے مقابلہ میں عورتوں کے تمول دولت وغیرہ کا معیار نصف ہی قرار پائے گا۔ غرض دنیا کی عام حالت کا خیال کیجیے یا مذہب اسلام کے احکام و اصول کا لحاظ کیا جائے ہر طرح یہی ثابت ہوگا کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے ارشاد کے مطابق عورتیں مردوں کے مقابلہ میں کم ایمان، کم عقل اور کم حصوں والی ہی اترتی ہیں۔ جیسا کہ خداوند عالم نے قرآن مجید میں فرمایا ہے:

﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ﴾ (سورۂ النساء، آیہ ۳۴)

یعنی مرد ہر طرح عورتوں پر غالب ہی رہیں گے۔

[1] یہ مقصود نہیں ہے کہ عورتیں اچھے کام کی رائے دیں تو اس کام کو چھوڑ دیا جائے اور ان کی رائے کی مخالفت کی جائے کیونکہ ایسا تو کوئی معمولی عقل کا آدمی بھی نہیں کہہ سکتا بلکہ ''حضرتؑ کا مقصود یہ ہے کہ اچھے کام کو یہ سمجھ کر یا یہ ظاہر کر کے نہ کرو کہ عورتوں نے اس کے کرنے کی رائے دی ہے اور نہ ان عورتوں کو یہ سمجھنے دو کہ ان کے کہنے ہی سے تم نے وہ اچھے کام کیے ہیں بلکہ ہر کام میں خود غور و فکر کرو اگر اچھا ہو تو اپنی رائے سے یا دوسرے مردوں کے مشورہ سے کرو اور برا ہو تو ترک کر دو۔ عورتوں کے کہنے سے نہ تو کسی کام کو اچھا سمجھو یا کرو اور نہ ان کے برا کہنے سے کسی کام کو ترک کرو کیونکہ اگر تم اچھے کاموں میں ان کی اطاعت کرو گے تو ان کی عادت خراب ہو جائے گی اور وہ پھر کوشش کریں گی کہ برے کاموں میں بھی تم ان کی اطاعت کرو۔

الشُّكْرُ عِنْدَ النِّعَمِ، وَ التَّوَرُّعُ عِنْدَ الْمَحَارِمِ، فَاِنْ عَزَبَ ذٰلِكَ عَنْكُمْ فَلَا يَغْلِبِ الْحَرَامُ صَبْرَكُمْ، وَ لَا تَنْسَوْا عِنْدَ النِّعَمِ شُكْرَكُمْ، فَقَدْ اَعْذَرَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ بِحُجَجٍ مُّسْفِرَةٍ ظَاهِرَةٍ، وَ كُتُبٍ بَارِزَةِ الْعُذْرِ وَاضِحَةٍ.

شکر بجالانا اور حرام کاموں یا چیزوں (کا موقع ملنے) پر (ان سے) بچنا (ہی حقیقی) زہد ہے۔ پھر اگر یہ (اوصاف) تم سے دور رہیں تو (کم از کم اتنا ہو کہ امر) حرام تمہارے صبر پر غالب نہ آجائے اور تم نعمتوں پر اپنا (فریضۂ) شکر نہ بھولو کیونکہ خدا نے بیّن صاف دلیلوں اور روشن حجت والی واضح کتابوں سے تمہارا عذر زائل کر دیا ہے۔

❁ خطبہ :۸۰ ❁

وَ مِنْ كَلَامٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِي صِفَةِ الدُّنْيَا:

مَآ اَصِفُ مِنْ دَارٍ اَوَّلُهَا عَنَآءٌ! وَ اٰخِرُهَا فَنَآءٌ! فِيْ حَلَالِهَا حِسَابٌ، وَ فِيْ حَرَامِهَا عِقَابٌ. مَنِ اسْتَغْنٰى فِيْهَا فُتِنَ، وَ مَنِ افْتَقَرَ فِيْهَا حَزِنَ، وَ مَنْ سَاعَاهَا فَاتَتْهُ، وَ مَنْ قَعَدَ عَنْهَا وَاتَتْهُ، وَ مَنْ اَبْصَرَ بِهَا بَصَّرَتْهُ، وَ مَنْ اَبْصَرَ اِلَيْهَآ اَعْمَتْهُ.

(قَالَ السَّيِّدُ الرَّضِيُّ عَلَيْهِ الرَّحْمَةُ) اَقُوْلُ: وَ اِذَا تَاَمَّلَ الْمُتَاَمِّلُ قَوْلَهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ: ''وَ مَنْ

خطبہ (۸۰)

حضرت علیہ السلام کے ایک کلام کا کچھ حصّہ۔

دنیا کے بیان میں۔

میں اس (فنا ہو جانے والے) گھر کی حالت کیا بیان کروں جس کا اوّل رنج اور جس کا آخر فنا ہے۔ جس کے حلال میں (تو) حساب (کا خوف) اور جس کے حرام میں عذاب (کی مصیبت رکھی ہوئی) ہے۔ جو اس میں غنی ہونا چاہے وہ بلاؤں اور فتنوں کا نشانہ بنے اور جو اس میں محتاج ہو وہ حزن و الم میں گرفتار رہے اور جو اس کی کوشش میں جان لڑائے اس سے دور رہے اور جو اس سے (غافل ہو کر) بیٹھ رہے اس کے موافق ہو جائے اور جو شخص اس سے دیکھے اسے بینا کر دے اور جو اس کی طرف دیکھے اسے اندھا کر دے۔

جناب سید رضی علیہ الرحمہ نے فرمایا کہ جب غور و فکر کرنے والا حضرت علیہ السلام کے (آخری) جملہ ''وَ مَنْ

اَبْصَرَ بِهَا بَصَّرَتْهُ'' وَجَدَ تَحْتَهٗ مِنَ الْمَعْنَى الْعَجِيْبِ، وَ الْغَرَضِ الْبَعِيْدِ، مَا لَا تُبْلَغُ غَايَتُهٗ وَ لَا يُدْرَكُ غَوْرُهٗ، وَ لَا سِيَّمَا اِذَا قُرِنَ اِلَيْهِ قَوْلُهٗ: ''وَ مَنْ اَبْصَرَ اِلَيْهَا اَعْمَتْهُ''، فَاِنَّهٗ يَجِدُ الْفَرْقَ بَيْنَ ''اَبْصَرَ بِهَا'' وَ ''اَبْصَرَ اِلَيْهَا'' وَاضِحًا نَّيِّرًا وَ عَجِيْبًا بَاهِرًا!.

اَبْصَرَ بِهَا بَصَّرَتْهُ ''کوخوب تامل سے دیکھے گا تو اس کے اندر عجیب (وغریب) معنیٰ اور گہرے نکتہ سے وہ (مضمون) پائے گا جس کی حدتک پہنچنا ناممکن ہےاور جس کی تہہ مل نہیں سکتی خصوصًا جب اس کے ساتھ حضرتؑ کے (دوسرے) جملہ:''وَ مَنْ اَبْصَرَ اِلَيْهَا اَعْمَتْهُ''کو بھی ملالے کہ(اس طرح) وہ''اَبْصَرَ بِهَا'' اور ''اَبْصَرَ اِلَيْهَا''میں (ایک) روشن وتاباں اور عجیب مبہوت کر دینے والا فرق پائے گا۔[1]

---

[1] واقعاً حضرتؑ کے صرف یہی دو جملے معرفت کے خزانے، حقائق کے ذخیرے اور بصیرت وہدایت کے دفتر بے پایاں ہیں جن کی شرح میں سینکڑوں صفحے بھی لکھے جائیں تو کم ہے اور جن کی خوبی اور معنویت کو بیان کرنے کے لیے متعدد کتابیں بھی تصنیف کی جائیں تو شاید کم ہوں۔ دنیا کی مذمت کرنے، اس کے مصائب وآلام کی تصویر کھینچنے اور اس کی دولت ولذت کو دھوکہ اور فریب ثابت کرنے میں بکثرت حضرات نے مختلف کتابیں لکھیں، خطبے بیان کیے، تقریریں کیں مگر دنیا کی حقیقت اور ماہیت کی جیسی سچی تصویر حضرت علیہ السلام نے ان دو جملوں میں کھینچی ہے مشکل سے کسی کے کلام میں ملے گی اور پھر ادبیت کی بھی حد کر دی ہے کہ صرف ایک حرف کے بدل دینے سے دونوں جملوں کے معنی میں انقلاب پیدا کر دیا۔ میرا خیال ہے کہ دنیا کے کسی فصیح اور ادیب یا منشی اور فاضل نے اپنے کسی کلام میں ایسا اعجاز نما کمال شاید نہ دکھایا ہو جو اس باب مدینۃ العلوم نے ان جملوں میں واضح کیا ہے۔

فرماتے ہیں کہ جو شخص دنیا سے دنیا کو دیکھے اسے وہ بینا اور نور والا کر دیتی ہے۔ یعنی دنیا کو سمجھنے، اس کی حقیقت معلوم کرنے اور اس کی کنہ تک پہنچنے کے لیے اگر کوئی شخص دنیا ہی کو ذریعہ قرار دے تو وہ بینا ہو جائے گا کیونکہ دنیا میں جو بڑے ذی اقتدار بادشاہ گزر گئے ہیں جن کا بڑے حصہ پر اقتدار قائم تھا، جن کی حکومت کا سکہ ہر قلب پر موجود تھا، جن کے دولت کی کوئی حد نہیں تھی، جن کے نام سے دنیا کی بڑی بڑی قومیں ڈرتی تھیں، جن کے خوف سے بڑے بہادر دل کا زہرہ آب ہوتا تھا، آج وہ اس طرح مٹے ہوئے ہیں کہ ان کا نام لینے والا کوئی نہیں، ان کی قبروں تک کا نشان نہیں، ان کی اولاد کا پتہ نہیں ان کے آثار باقی نہیں بلکہ صرف کتاب کے صفحوں میں ان کے اقبال وکامیابی کے کارنامے آج عبرت کے ساتھ سامنے آتے اور بتاتے ہیں کہ جو شخص دنیا میں ترقی یا عزت حاصل (بقیہ صفحہ مابعد)

❁ خطبہ :۸۱ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

وَ تُسَمّٰى بِالْغَرَّاءِ وَ هِيَ مِنَ الْخُطَبِ الْعَجِيْبَةِ:

خطبہ(۸۱)

حضرت علیہ السلام کے ایک خطبہ کا کچھ حصّہ۔

جو خطبہ ''غراء'' کے نام سے مشہور ہے اور یہ (دنیا کے) عجیب وغریب (اور بے مثل ونظیر) خطبوں سے ہے۔[۱]

(بقیہ صفحہ ماقبل) کرنا چاہتا ہے اسے ان لوگوں کو دیکھ لینا چاہیے جو پہلے گزر گئے ہیں۔ لہٰذا ہر شخص ان لوگوں کے حالات سے متاثر ہو کر دنیا سے نفرت کرنے لگے گا اور اس عالَم کو حاصل کرنے کی کوشش کرے گا جہاں کی کامیابی کبھی فانی نہیں، جہاں کی نعمت کبھی ختم ہونے والے نہیں، جہاں کی راحت پائیدار اور جہاں کا اقتدار استوار ہے۔ اور اس طرح اسے دنیا میں بہت بڑی بصیرت حاصل ہو جائے گی اور وہ بینا ہو جائے گا کہ دنیا کی اصلی تصویر کو ہر وقت دیکھتا رہے گا۔

پھر اس جملہ میں حضرتؑ بہت خفیف تغیر کر کے یعنی حرف ''با'' کو نکال کر حرف ''الیٰ'' رکھ دیتے ہیں اور کلام میں انقلاب پیدا ہو جاتا ہے یعنی جو شخص دنیا کی طرف دیکھے اسے اندھا کر دے۔ کسی کی طرف دیکھنا اسی وقت بولتے ہیں جب اس کو محبت یا لالچ یا پسندیدگی سے انسان دیکھے۔ جیسے اولاد کی طرف دیکھنا، مال کی طرف دیکھنا، جائیداد کی طرف دیکھنا، تو جو شخص دنیا کی طرف دیکھے یعنی اس کی محبت یا خواہش سے یا طمع کے خیال سے وہ اس کی ہر چمکیلی چیز کو اپنے لیے بہتر اور اس کی ہر ظاہری اور خوشنما خوشی کو قابل تحصیل سمجھے گا اور اسے حاصل کرنے کی کوشش کرے گا اس طرح وہ دنیا پر فریفتہ ہو کر اس پر جان دینا چاہے گا اور اس کی پرستش پر آمادہ ہو جائے گا جو بالکل اندھا ہو جانا ہے کہ پھر اس کے انجام کی طرف سے آنکھ بند ہو جائے گی اور وہ ہلاکت کے گڑھے میں گر جائے گا۔

[۱] علامہ ابن ابی الحدید معتزلی اس خطبہ کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس کلام کو حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے فن بدیع کے بہترین اور کامل ترین اصول پر ذکر فرمایا ہے چنانچہ پہلے لفظ ''عَلَا'' لائے اور اس کے بعد ''دَنَا'' کو استعمال کیا جو لفظ اور معنی دونوں اعتبار سے مقابلہ ہے، اسی طرح پہلے لفظ ''حَوْلٌ'' استعمال فرمایا پھر لفظ ''طَوْلٌ'' جو دونوں مقابلہ کے ہیں۔ اگر کوئی شخص کہے ''دَنَا'' اور ''عَلَا'' تو لفظ اور معنی دونوں اعتبار سے ایک دوسرے کے مقابل ہیں اس میں کوئی شک نہیں مگر ''حَوْلٌ'' اور ''طَوْلٌ'' میں تو صرف لفظی سجع اور موازنہ ہے معنی کے اعتبار سے کوئی مقابلہ نہیں معلوم ہوتا کیونکہ حول کا معنی ہے قوت اور طول کا معنی ہے بخشش اور یہ دونوں ایک دوسرے کے ضد نہیں ہیں، جس طرح ''عَلَا'' (بلند ہوا) اور ''دَنَا'' (پست ہوا) میں معنی کے اعتبار سے بھی مقابلہ ہے کیونکہ حول کا معنی قوت ہے جو خدا کی سطوت اور قہر وغلبہ کی طرف اشارہ کرتا ہے اور سطوت وقہر کا مقتضاء انتقام بھی ہے تو حول اس کے انتقام کا منشا بھی ہوا۔ اور طول کے معنی افضال واحسان اور جود وعطا ہے جو قہر وجباریت اور انتقام کا تقیض ہے اسی طرح صنعت بدیع سے یہ بھی ہے کہ مانح کے بعد اسی کے وزن کا لفظ کاشف اور غنیمت کے بعد اس کے وزن کا لفظ عظیمۃ لائے جو لفظ کے اعتبار سے بھی ایک دوسرے کے مقابل اور معنی کے اعتبار سے بھی ایک دوسرے کے ضد ہیں، اسی طرح لفظ فضل اور ازل میں مقابلہ ہے، پھر عواطف کے مقابلہ میں سوابغ اور نعمہ کے مقابلہ میں ''کَرِمَہٗ'' لائے۔

لیکن ان سب سے زیادہ لطیف یہ ہے جو اس فن کے بڑے علماء اور اساتذہ بھی نہیں استعمال کر سکتے کہ حضرتؑ (بقیہ صفحہ مابعد)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ عَلَا بِحَوْلِهٖ، وَ دَنَا بِطَوْلِهٖ، مَانِحِ كُلِّ غَنِیْمَةٍ وَّ فَضْلٍ، وَ كَاشِفِ كُلِّ عَظِیْمَةٍ وَ اَزْلٍ. اَحْمَدُهٗ عَلٰی عَوَاطِفِ

ہر قسم کی حمد (وثنا) اسی خدا کے لیے ہے جو اپنی قوت سے (سب سے بلند) اور اپنے جود وعطا سے (سب کے) نزدیک ہے۔ جو ہر نفع اور بزرگی کا بخشنے والا اور ہر بڑی مصیبت وسختی کا زائل کرنے والا ہے [1] اس کے احساناتِ

(بقیہ صفحہ ماقبل) نے اپنے لفظ ''اَسْتَهْدِیْهِ'' کے ساتھ ''قَرِیْبًا هَادِیًا'' کو رکھا جس میں یہ صنعت پیدا کی ہے کہ جو ذات تم سے قریب ہوگی وہ تمہاری ہدایت زیادہ خوبی سے کر سکے گی بہ نسبت اس ذات کے جو تم سے دور ہو۔ تو خدا ہم سے بہت قریب ہے لہٰذا اسی سے ہدایت چاہتے ہیں تا کہ ہمیں کامل ہدایت ہو اور حضرتؑ نے اپنے بعد کے لفظ ''اَسْتَعِیْنُهٗ'' کے ساتھ ''قَرِیْبًا هَادِیًا'' کو نہیں رکھا بلکہ اس کے لیے ''قَاهِرًا قَادِرًا'' کو لائے کیونکہ جو ذات ہر قسم کی قدرت رکھتی ہو اور ہر طرح غالب رہے وہی اس قابل ہوتی ہے کہ اس سے مدد چاہی اور اعانت حاصل کی جائے۔ پھر حضرتؑ نے اس صفت قادر قاہر کو بعد کے لفظ کے ''اَتَوَكَّلُ'' ساتھ نہیں رکھا بلکہ اس کے ساتھ ''كَافِیًا نَاصِرًا'' استعمال فرمایا کیونکہ جو ذات کفایت کرنے والی اور ناصر ومددگار ہو وہ اس کی زیادہ مستحق ہے کہ اس پر بھروسہ اور توکل کیا جائے۔ غرض حضرتؑ نے خدا کی جو صفت ذکر کی اور اس کے بعد جس امر کو بیان کیا دونوں میں معنی کے اعتبار سے پوری مطابقت رکھی ہے اور جس چیز کا جوڑ جس کے ساتھ تھا اسی کے ساتھ رکھ کر کمال فن بدیع کا نمونہ دکھا دیا۔ یہ سب لکھ کر علامہ ممدوح لکھتے ہیں:

وَهٰذِهِ اللَّطَائِفُ وَالدَّقَائِقُ مِنْ مُعْجِزَاتِهٖ عَلَیْهِ السَّلَامُ الَّتِیْ فَاتَ بِهَا الْبُلَغَاءُ وَاَخْرَسَ الْفُصَحَاءُ۔

یعنی یہ نکتے، یہ باریکیاں، یہ غوامض اور یہ اسرار حضرت علی علیہ السلام کے ان معجزات سے ہیں جن کے حاصل کرنے سے بڑے بڑے بلغاء عاجز رہ گئے اور جن کے مقابلہ میں بڑے فصحاء گونگے ہو گئے۔

[1] علامہ ابن میثم علیہ الرحمہ لکھتے ہیں کہ خدا کا ہر بڑی مصیبت وسختی کا زائل کرنے والا ہونا اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ خداوند عالم کی طرف سے ہر نعمت یا جودی ہے مثل صحت، مال، عقل، علم، اولاد وغیرہ حاصل ہونے کے خواہ وہ نعمت عدمی ہے مثل سختی، مصیبت، پریشانی کے زائل اور دفع کرنے کے چنانچہ اس مضمون کو خدا نے بھی قرآن مجید میں بطور امثال کے ذکر فرمایا ہے۔ ارشاد ہے:

﴿وَ مَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَیْهِ تَجْـَٔرُوْنَ﴾ (سورۂ النحل، آیہ ۵۳)

یعنی تمہیں جو نعمت ملتی ہے وہ خدا ہی کی طرف سے ہے پھر جب تم کسی مصیبت میں گرفتار ہوتے ہو تو اسی سے گڑگڑاتے ہو اور وہ اس مشکل کو تم سے دور کر دیتا ہے۔

پھر فرمایا:

﴿اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَ یَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَ یَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ﴾ (سورۂ النمل، آیہ ۶۲)

یعنی وہ کون ذات ہے جو مضطر اور مصیبت زدہ کی سنتا ہے جب وہ اسے پکارتا ہے اور اس سے تکلیف کو زائل کر دیتا ہے اور تمہیں زمین کا مالک کر دیتا ہے۔

كَرَمِهٖ، وَ سَوَابِغِ نِعَمِهٖ، وَ اُوْمِنُ بِهٖ اَوَّلًا بَادِيًا، وَ اَسْتَهْدِيْهِ قَرِيْبًا هَادِيًا، وَ اَسْتَعِيْنُهٗ قَاهِرًا قَادِرًا ، وَ اَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ كَافِيًا نَاصِرًا. وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهٗ لِاِنْفَاذِ اَمْرِهٖ، وَ اِنْهَآءِ عُذْرِهٖ وَ تَقْدِيْمِ نُذُرِهٖ.

کرم اور اس کی تمام و کمال نعمتوں پر میں اس کی حمد کرتا ہوں اور اسی پر میں ایمان رکھتا ہوں کہ وہ (ہر چیز کا) مبدء (اور سب سے) ظاہر ہے اور اسی سے ہدایت چاہتا ہوں کہ وہ قریب (اور) ہادی ہے اور اسی سے مدد چاہتا ہوں کہ وہ قاہر قادر ہے اور اسی پر توکل کرتا ہوں کہ وہ کافی مددگار ہے اور میں اقرار کرتا ہوں کہ (حضرت) محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے (مخصوص) بندے اور (برگزیدہ) پیغمبر ہیں۔ حضرتؐ کو اس نے اپنا امر (دین) جاری کرنے اور اپنی حجت پہنچانے اور اپنی تہدید و تخویف مقدم کر دینے کے لیے بھیجا۔

اُوْصِيْكُمْ عِبَادَ اللّٰهِ بِتَقْوَى اللّٰهِ الَّذِيْ ضَرَبَ لَكُمُ الْاَمْثَالَ، وَ وَقَّتَ لَكُمُ الْاٰجَالَ، وَ اَلْبَسَكُمُ الرِّيَاشَ، وَ اَرْفَغَ لَكُمُ الْمَعَاشَ، وَ اَحَاطَ بِكُمُ الْاِحْصَآءَ، وَ اَرْصَدَ لَكُمُ الْجَزَآءَ، وَ اٰثَرَكُمْ بِالنِّعَمِ السَّوَابِغِ، وَ الرِّفَدِ الرَّوَافِغِ، وَ اَنْذَرَكُمْ بِالْحُجَجِ الْبَوَالِغِ، فَاَحْصَاكُمْ عَدَدًا، وَ وَظَّفَ لَكُمْ مُدَدًا، فِيْ قَرَارِ خِبْرَةٍ، وَ دَارِ عِبْرَةٍ، اَنْتُمْ مُّخْتَبَرُوْنَ فِيْهَا، وَ مُحَاسَبُوْنَ عَلَيْهَا.

(تو) بندگانِ خدا! میں تمہیں خدا سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں جس نے تمہارے (سمجھانے کے) لیے مثالیں بیان کر دیں اور تمہاری موت کا زمانہ معین کر دیا اور تمہیں (نفیس) لباس پہنایا اور تمہارے (ذریعۂ) معاش کو وسیع کیا اور (تمہارے اعمال کو) شمار کر کے تمہیں گھیر رکھا اور تمہارے لیے جزا کو مہیّا کر دیا اور تمہیں پوری نعمتوں اور کامل بخششوں سے ممتاز کر لیا اور تمہیں انتہائی حجتوں سے ڈرا دیا۔ پھر عدد کے لحاظ سے تمہارا شمار کر لیا اور آزمائش کی جگہ اور عبرت کے گھر میں تمہارے لیے مدتوں (اور عمر کی اوقات) کو معین کر دیا ہے، جس (گھر) میں تم اچھی طرح جانچے جاؤ گے اور جس پر تمہارا حساب لیا جائے گا۔

فَاِنَّ الدُّنْيَا رَنِقٌ مَّشْرَبُهَا، رَدِغٌ مَّشْرَعُهَا، يُوْنِقُ مَنْظَرُهَا، وَ يُوْبِقُ مَخْبَرُهَا، غُرُوْرٌ حَآئِلٌ، وَ ضَوْءٌ اٰفِلٌ، وَ ظِلٌّ زَآئِلٌ، وَ

کیونکہ دنیا کا چشمہ (بہت) میلا (اور) اس کا گھاٹ (نہایت) گدلا ہے۔ اس کا (ظاہری) منظر بھلا معلوم ہوتا اور اس کی (حقیقی) آزمائش ہلاک کرتی ہے۔ (غرض یہ دنیا) مٹ جانے والا دھوکا اور غائب ہو جانے والی روشنی اور

سِنَادٌ مَّآئِلٌ، حَتّٰٓى اِذَا اَنِسَ نَافِرُهَا، وَ اطْمَاَنَّ نَاكِرُهَا، قَمَصَتْ بِاَرْجُلِهَا، وَ قَنَصَتْ بِاَحْبُلِهَا، وَ اَقْصَدَتْ بِاَسْهُمِهَا، وَ اَعْلَقَتِ الْمَرْءَ اَوْهَاقَ الْمَنِيَّةِ قَآئِدَةً لَّهٗٓ اِلٰى ضَنْكِ الْمَضْجَعِ، وَ وَحْشَةِ الْمَرْجِعِ، وَ مُعَايَنَةِ الْمَحَلِّ، وَ ثَوَابِ الْعَمَلِ، وَ كَذٰلِكَ الْخَلَفُ يَعْقُبُ السَّلَفَ، لَا تُقْلِعُ الْمَنِيَّةُ اخْتِرَامًا، وَ لَايَرْعَوِى الْبَاقُوْنَ اجْتِرَامًا، يَحْتَذُوْنَ مِثَالًا، وَ يَمْضُوْنَ اَرْسَالًا، اِلٰى غَايَةِ الْاِنْتِهَآءِ، وَ صَيُّوْرِ الْفَنَآءِ.

حَتّٰٓى اِذَا تَصَرَّمَتِ الْاُمُوْرُ، وَ تَقَضَّتِ الدُّهُوْرُ، وَ اَزِفَ النُّشُوْرُ، اَخْرَجَهُمْ مِنْ ضَرَآئِحِ الْقُبُوْرِ، وَ اَوْكَارِ الطُّيُوْرِ، وَ اَوْجِرَةِ السِّبَاعِ، وَ مَطَارِحِ الْمَهَالِكِ، سِرَاعًا اِلٰٓى اَمْرِهٖ،

زائل ہو جانے والا سایہ اور گر جانے والا ستون ہے، یہاں تک کہ جب اس سے نفرت کرنے والا بہل جاتا اور اس سے گھبرانے والا مطمئن ہو جاتا ہے (تو) اپنے پاؤں سے پٹک دیتی اور اپنے جالوں میں پھنسا لیتی اور اپنے تیروں سے ہلاک کر دیتی اور انسان (کی گردن) میں موت کی رسیاں باندھ دیتی ہے، (اور اس طرح) اس کو کھینچ کر قبر کی تنگی (آخری) منزل کی وحشت اور (دائمی) قیام گاہ کے دیکھنے اور عمل کے جزا تک پہنچا دیتی ہے اور اسی طرح بعد والے اگلوں کے پیچھے آتے (اور گزرتے) رہتے ہیں (کیونکہ) موت مٹانے سے رکتی نہیں اور باقی (یعنی دنیا میں) رہنے والے لوگ گناہ کرنے سے باز نہیں آتے۔ (بلکہ) خاتمہ کی سرحد اور فنا کے انجام کی طرف گزشتہ لوگوں کے قدم بقدم چلتے چلتے اور جھنڈ کے جھنڈ گزرتے جاتے ہیں۔

یہاں تک کہ جب تمام امور منقطع ہو جائیں گے اور زمانے ختم ہو جائیں گے اور (وقت) حشر ونشر قریب آجائے گا تو (خدا) ان سب کو قبروں کے گوشوں اور پرندوں کے آشیانوں اور درندوں کے رہنے کی جگہوں اور ہلاک ہونے کے مقامات سے (اس طرح) نکالے گا کہ وہ گروہ گروہ [1] خاموش کھڑے ہوئے، صفیں باندھے اس

---

[1] اس خطبہ کی شرح میں علامہ ابن میثم علیہ الرحمہ تحریر فرماتے ہیں کہ کل انبیاء اور رسولوں کا بیان اس پر متفق ہے کہ انسان مرنے کے بعد دوبارہ اُٹھایا جائے گا اور اپنے اعمال کی جزا یا سزا پائے گا اور یہ معاد روحانی ہی نہیں ہوگا بلکہ جسمانی ہوگا جیسا کہ خدا نے قرآن مجید میں بھی فرمادیا ہے کہ

﴿يَوْمَ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ سِرَاعًا كَاَنَّهُمْ اِلٰى نُصُبٍ يُّوْفِضُوْنَ خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ ذٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِىْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ﴾ (سورۃ المعارج، آیہ ۴۳۔۴۴)

(بقیہ صفحہ آئندہ)

مُهْطِعِيْنَ اِلٰى مَعَادِهٖ، رَعِيْلًا صُمُوْتًا، قِيَامًا صُفُوْفًا، يَنْفُذُهُمُ الْبَصَرُ، وَ يُسْمِعُهُمُ

(خدا) کے حکم کی طرف تیزی سے روانہ ہوں گے اور اس کے (مقرر کیے ہوئے) معاد کی طرف رخ کیے چلے جائیں گے۔[1] (خدا کی) نظر ان میں گڑی ہوگی اور (اس کا)

ترجمہ: یعنی اس دن کو یاد کرو جب انسان اپنی قبروں سے نکل پڑیں گے اس طرح کہ دوڑتے ہوئے جائیں گے گویا وہ کسی نشانی پر دوڑتے جاتے ہیں ان کی آنکھیں جھکی ہوئی ہوں گی اور ان پر ذلت چڑھی آتی ہوگی یہی وہ دن ہوگا جس کا ان لوگوں سے وعدہ کیا جاتا تھا۔

اسی طرح اور آیتیں ہیں اور تمام مسلمانوں کا اسی پر اتفاق ہے کہ معاد جسمانی ہوگا۔

رہے علمائے حکمت و فلسفہ تو ان کا دعویٰ یہ ہے کہ جسمانی معاد نہیں ہوگا بلکہ صرف روحانی ہوگا کیونکہ جو چیز مٹ جائے گی اس کا پھر اسی طرح لوٹ آنا محال ہے اس لیے کہ اس کے جو اسباب اس وقت تھے مثلاً وقت اور دورہ فلکیہ وغیرہ ان سب کا لوٹ آنا محال ہے اور بعض حکمائے اسلام نے کہا ہے کہ اس چیز کا مثل پلٹنا جائز ہے اور بعضوں نے معاد جسمانی اور عذاب و ثواب روحانی کے ساتھ عذاب و ثواب جسمانی کے ثابت کرنے میں ظاہری شریعت کی تقلید کر لی ہے اور مشہور اور جلیل القدر حکیم و فلسفی شیخ الرئیس ابوعلی سینا نے اپنی کتاب ''شفا'' میں لکھا ہے کہ

> ''اس امر کا جاننا ضروری ہے کہ معاد (قیامت) کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو شرع سے ثابت ہے جس کا اثبات شریعت اور حضرت رسالت مآبؐ کی حدیثوں سے ہوتا ہے اور وہ جسمانی معاد ہے یعنی انسان نے دنیا میں جو اچھے برے کام کیے ہیں ان کا ثواب یا عذاب انہیں بدنوں کو دیا جائے گا تو جو شریعت ہمارے سید و مولا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لائے ہیں اس نے انسان کے مرنے کے بعد اس کے بدن کے آرام سے رہنے یا اذیت میں مبتلا رہنے کو واضح طریقہ سے بیان کر دیا ہے ہماری بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ معاد کی دوسری قسم روحانی ہے یعنی دنیا کے اعمال کے عوض میں صرف روح کا خوشی یا رنج سے رہنا''۔

اور اس خطبہ میں حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام نے اس مضمون کو صاف طریقہ سے بیان کر دیا ہے کہ معاد جسمانی ہوگی نہ صرف روحانی (اس کے متعلق تفصیل ضمیمہ میں آئے گی)۔

[1] علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ مسلمان جسمانی معاد کو جو ذکر کرتے ہیں تو یہ صحیح کیوں کر ہو سکتا ہے اور حضرتؑ نے جو فرمایا ہے کہ پرندوں کے آشیانوں اور درندوں کے مقامات سے انسان کے بدن جمع کیے جائیں گے تو اس کی کیا صورت ہوگی کسی انسان کو کوئی درندہ کھا جاتا ہے اور پھر اس درندہ کو دوسرا آدمی کھا لیتا ہے اور پھر اس آدمی کے مرنے پر اس کے گوشت کو پرندے کھا جاتے ہیں پھر اس پرندہ کو دوسرا آدمی کھاتا ہے تو جو چیز کھائی جاتی ہے وہ کھانے والے کے بدن کی اجزاء اصلیہ ہو جاتی ہے پھر اگر انسان اور جانور سب زندہ کیے جائیں گے تو یہ اجزاء جو ایک بدن سے دوسرے بدن میں پہنچتے گئے ہیں کس کے بدن سے اُٹھائے جائیں گے صرف انسان کے بدن سے یا صرف درندہ کے بدن سے یا دونوں کے بدن سے؟ اگر پہلی صورت ہو تو (بقیہ صفحہ مابعد)

الدَّاعِیْ، عَلَیْهِمْ لَبُوْسُ الْاِسْتِكَانَةِ، وَ ضَرَعُ الْاِسْتِسْلَامِ وَ الذِّلَّةِ، قَدْ ضَلَّتِ الْحِیَلُ، وَ انْقَطَعَ الْاَمَلُ، وَ هَوَتِ الْاَفْئِدَةُ كَاظِمَةً، وَ خَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ مُهَیْنِمَةً، وَ اَلْجَمَ الْعَرَقُ، وَ عَظُمَ الشَّفَقُ، وَ اُرْعِدَتِ الْاَسْمَاعُ لِزَبْرَةِ الدَّاعِیْ اِلٰی فَصْلِ الْخِطَابِ، وَ مُقَایَضَةِ الْجَزَآءِ، وَ نَكَالِ الْعِقَابِ، وَ نَوَالِ الثَّوَابِ.

پکارنے والا انہیں (اپنی آواز) سنا تا ہوگا۔(اس روز) ان پر مسکینی کا لباس اور اطاعت وذلت کی فروتنی (کا پردہ) پڑا ہوگا۔کل تدبیریں کھوگئی ہوں گی اور (تمام) امید ختم ہوگئی ہوں گی اور دل گھٹ گھٹ کر گرے پڑتے ہوں گے اور آوازیں پست (دھیمی) ہوکر لرزتی ہوں گی اور (ان کے منہ پر) پسینہ کی لگام لگی ہوگی اور خوف عظیم الشان ہوگیا ہوگا اور فیصلہ کرنے والی حکومت اور معاملہ جزا وسزا اور مصیبت عذاب اور بخشش ثواب کی طرف بلانے والے (فرشتہ) کی جھڑکی (اور خشن آواز) سے کانوں میں گرج پیدا ہورہی ہوگی۔[1]

(بقیہ صفحہ ماقبل) واجب ہوگا کہ درندہ زندہ نہ کیے جائیں اور اگر دوسری صورت ہوگی تو واجب ہوگا کہ انسان زندہ نہ کیا جائے اور تیسری صورت محال ہے کیونکہ ایک ہی اجزاء دو جگہوں میں نہیں رہ سکتے۔

تو اس اعتراض کا یہ جواب دیا جائے گا کہ ہر انسان اور ہر حیوان کے بدن میں اصلی اجزاء بھی ہوتے ہیں اور زائد اجزاء بھی، پس ممکن ہے کہ جب کوئی حیوان کسی انسان کا جسم کھائے تو اس انسان کے زائد اجزاء تو اس حیوان کے جسم کے اجزاء ہو جائیں اور اصلی اجزاء اس حیوان کا جزو نہ بنیں بلکہ استحالہ اور تغیر سے خدا ان کی حفاظت کرے تو حشر ممکن ہوگا کہ اصلی اجزا دوبارہ زندہ کیے جائیں اور انہیں ثواب یا عذاب دے دیا جائے۔رہے زائد اجزاء تو ان کے دوسرے انسان یا حیوان کا جزو بدن ہوجانے سے کوئی خرابی نہیں لازم آتی اس لیے کہ ان کا حشر ضروری نہیں ہے کیونکہ وہ مکلف کے اصلی اجزاء نہیں ہیں، لہٰذا یہ اعتراض دفع ہو جائے گا مگر جو حضرات معاد جسمانی کا انکار کرتے اور صرف معاد روحانی کے قائل ہیں وہ اس اعتراض کا یہ جواب نہیں دے سکتے کیونکہ وہ تو کہتے ہیں کہ جب قیامت آئے گی تو ہر روح کے لیے پہلے بدن کے سوا نئے بدن پیدا کیے جائیں گے تا کہ روح ان کے ذریعہ سے عذاب یا ثواب حاصل کرے اس لیے کہ ان کا یہ خیال ہے کہ بدن روح کے لیے مثل آلہ کے ہوں گے۔

[1] یعنی خداوند عالم بروز قیامت بندوں کے حساب وکتاب لینے کی جو حکومت قائم کرے گا اور ان کا فیصلہ کرنے کے لیے جو انتظام کرے گا اس کی طرف ایک فرشتہ لوگوں کو پکارے گا کہ وہاں حاضر ہوں اور اپنے اعمال کا حساب دے کر اس کی جزا یا سزا پائیں، تو وہ فرشتہ اس زور سے ندا دے گا کہ سننے والوں کے کانوں میں گرج پیدا ہو جائے گی جس طرح بجلی کی کڑک اور بادلوں کے گرجنے سے انسان کا کان بلکہ دل تک ہل جاتا ہے۔تو حضرتؑ نے اس جملہ میں مخصوصا کانوں کو اس وجہ سے ذکر فرمایا کہ پکارنے والے کی کرخت آواز کا پہلا اثر انہیں پر ہوگا اور فیصلہ کرنے والے خطاب سے مراد وہ فیصلہ ہے جو خدا بندوں کے اعمال خیر وشر کا کرے گا۔

عِبَادٌ مَّخْلُوْقُوْنَ اقْتِدَارًا، وَ مَرْبُوْبُوْنَ اقْتِسَارًا، وَ مَقْبُوْضُوْنَ احْتِضَارًا، وَ مُضَمَّنُوْنَ اَجْدَاثًا، وَ كَآئِنُوْنَ رُفَاتًا، وَ مَبْعُوْثُوْنَ اَفْرَادًا، وَ مَدِيْنُوْنَ جَزَآءً، وَ مُمَيَّزُوْنَ حِسَابًا قَدْ اُمْهِلُوْا فِيْ

یہ وہ بندے ہیں[1] جو (قوت اور اقتدار سے پیدا کیے گئے اور غلبہ وقہر سے (خدا کے) غلام بنائے گئے تھے ،جو حالت احتضار[2] میں قبض (روح) کیے گئے اور (مرنے پر اپنی) قبروں میں سپرد کر دیے گئے اور پھر ریزہ ریزہ ہڈیاں ہو گئے اور (قیامت آنے پر اپنی قبروں سے) تنہا اٹھائے گئے[3] اور (اپنے) اعمال کی جزا دیے گئے اور

---

[1] یہاں سے حضرتؑ بندوں کے ان اوصاف اور حالات پر متنبہ کرنا چاہتے ہیں جو ان اغراض ومقاصد خداوند عالم کے خلاف ہیں جن کے لیے اس نے ان لوگوں کو پیدا کیا ہے اور جن سے علیحدہ ہو کر یا منہ موڑ کر یہ دنیا میں حیران و پریشان ہو گئے حالانکہ وہ ہر روز دنیا سے کوچ کرنے والوں کو دیکھتے اور ان کے انجام کی خبر پاتے رہتے ہیں اور ان کے نتیجہ سے ان کی عبرت ونصیحت کے لیے کافی سبق حاصل ہوتے رہتے ہیں۔

[2] حالت احتضار سے مراد موت کا وقت ہے کیونکہ اس وقت خدا کے فرشتے مرنے والے شخص کے پاس آتے ہیں اس وقت عربی میں بولتے ہیں کہ وہ اس وقت محتضر ہے یعنی فرشتہ ملک الموت اس کے پاس حاضر ہو گیا ہے۔ عرب کہتے تھے:

لَبَنٌ مُحْتَضَرٌ اَیْ فَاسِدٌ ذُوْ اٰفَۃٍ۔

یعنی یہ دودھ محتضر ہے۔

جس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ وہ دودھ خراب اور بدمزہ ہو گیا کیونکہ ان کا اعتقاد تھا کہ جب جن آ کر دودھ کو کھا جاتے ہیں تو وہ خراب ہو جاتا ہے کہتے ہیں کہ

اَلَّبَنُ مُحْتَضَرٌ فَغَطِّ اِنَاءَكَ۔

یعنی دودھ پر جنات آ جاتے ہیں تو تم دودھ کے برتن کو ڈھاک کر رکھا کرو۔

[3] جس طرح خدا نے قرآن مجید میں بھی فرمایا ہے:

﴿وَ كُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا﴾ (سورۂ مریم، آیہ ۹۵)

یعنی سب کے سب بروز قیامت خدا کے پاس تنہا تنہا آئیں گے۔

نیز فرمایا ہے:

﴿وَ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ تَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ﴾ (سورۂ الانعام، آیہ ۹۴)

یعنی اس روز (قیامت میں) تم ہمارے پاس ایک ایک کر کے آؤ گے جیسا ہم نے تمہیں ایک ایک ہی کر کے پیدا کیا ہے اور جو ہم نے تمہیں دیا ہے اسے اپنی پشت کے پیچھے چھوڑ دو گے۔

طَلَبِ الْمَخْرَجِ، وَ هُدُوْا سَبِيْلَ الْمَنْهَجِ، وَ عُمِّرُوْا مَهَلَ الْمُسْتَعْتِبِ، وَ كُشِفَتْ عَنْهُمْ سُدَفُ الرِّيَبِ، وَ خُلُّوْا لِمِضْمَارِ الْجِيَادِ، وَ رَوِيَّةِ الْاِرْتِيَادِ، وَ اَنَاةِ الْمُقْتَبِسِ الْمُرْتَادِ، فِيْ مُدَّةِ الْاَجَلِ، وَ مُضْطَرَبِ الْمَهَلِ.

حساب کے لیے الگ الگ کر دیے گئے۔ انہیں اپنے نکلنے کی راہ ڈھونڈنے کے لیے مہلت دی گئی تھی اور راہ راست دکھا دیے گئے تھے اور (خدا کو) راضی کر لینے کی مہلت (ومدت) تک زندہ رہنے دیے گئے تھے[1] اور شک وشبہ کی تاریکیاں ان سے زائل کر دی گئی تھیں اور اجل کی مدت نیز محلّ مہلت کی بے قراری میں میدان عمل کی جدوجہد اور غذائے روحانی) ڈھونڈنے کی فکر اور نورِ (الٰہی) تلاش کرنے کے انتظار کی غرض سے چھوڑ دیے گئے تھے۔[2]

---

[1] ''وَ عُمِّرُوْا مَهَلَ الْمُسْتَعْتِبِ''۔ مستعتب کا معنی ہے عتاب زائل ہونے کی کوشش کرنے والا اور یہ وہی کرے گا جو خوش کرنا چاہے تو مستعتب کا معنی خوش اور راضی کرنے والا ہوا۔ اس جملہ میں حضرتؑ نے خدا کو راضی کر لینے کی مہلت کا ذکر اس وجہ سے کیا کہ جب ایک شخص کسی دوسرے کو خوش اور راضی کرنا چاہتا ہے تو اس میں کچھ وقت صَرف ہوتا ہے، کچھ تاخیر ہوتی ہے اور جس کو خوش کرنا مقصود ہوتا ہے اسے مہلت دی جاتی ہے کہ اس شخص کے اعمال یا برتاؤ یا خیالات سے متاثر ہو کر وہ اپنا رنج بھنولے اور اس سے راضی ہو جائے نہ یہ کہ صرف زبان سے کہہ دے کہ میں تم سے راضی ہو گیا، اس کہنے کا اعتبار نہیں اور نہ اس کو ثبات ہے۔ تو حضرتؑ کا مقصود یہ ہوا کہ خدا نے بندوں کو اتنی مدت کی زندگی مرحمت فرما دی ہے کہ اس میں ان سے جو گناہ اور خدا کی نافرمانیاں ہوئی ہیں ان سے توبہ کر کے اور اعمال خیر وعبادات بجالا کر خدا کو اپنے سے واقعاً خوش اور راضی کر لیں اور یہ بھی خدا کی انتہائے رحمت ہے کہ بندوں کو خوش کرنے کا موقع تنگ اور وقت کم نہیں دیا بلکہ بہت وسیع مہلت مرحمت فرمائی۔

[2] یعنی میدان عمل و دنیا میں بندے چھوڑ دیے گئے ہیں اور خدا نے انہیں اختیار دے رکھا ہے کہ جو اعمال خیر چاہیں بجالائیں اور اپنے نفس کی ریاضت کر کے روحانی مدارج پر پہنچیں، جس طرح گھوڑوں کو میدان میں دوڑاتے ہیں تاکہ اس کا بدن پتلا اور اس کی قوت رفتار زیادہ ہو جائے اور جس طرح انسان میدان میں غذا یا پانی کی تلاش میں پھرتا ہے، اسی طرح خدا نے بندوں کو موقع دیا ہے کہ دنیا میں اعمال خیر بجالا کر اپنی روحانی غذا حاصل کریں اور آخرت میں باطمینان بسر کرنے کا سامان کر لیں اور جس طرح کوئی شخص ہاتھ میں چراغ لے کر کھوئی ہوئی چیز کو ڈھونڈتا ہے اسی طرح بندوں کو خدا نے آزادی دے دی ہے کہ نورِ الٰہی ڈھونڈنے اور صراط مستقیم حاصل کرنے کی کوشش کر لیں اور مقتبس اس طالب العلم کو بھی کہتے ہیں جو کسی علم کو حاصل کرنا چاہے تو خواہ نور الٰہی کی تلاش ہو یا صراط مستقیم کی جستجو یا علوم ومعارف کی تحصیل وتکمیل ہر کام میں اس کی کامیابی کا انتظار ضروری ہوگا اور اس کے حصول کے لیے کچھ زمانہ دینا پڑے گا۔ لہٰذا حضرتؑ نے اس کی بھی مثل بیان فرما دی کیونکہ جلدی کرنے میں ناکامیابی کا اندیشہ ہے جس طرح ہاتھ میں چراغ لے کر ڈھونڈنے والا آہستہ آہستہ تلاش کرے گا تو وہ چیز مل جائے گی اور دوڑ کر چلے گا تو چراغ بھی گل ہو جائے گا اور وہ چیز بھی نہیں ملے گی۔

فَيَالَهَا اَمْثَالًا صَآئِبَةً، وَ مَوَاعِظَ شَافِيَةً، لَوْ صَادَفَتْ قُلُوْبًا زَاكِيَةً، وَ اَسْمَاعًا وَّاعِيَةً، وَ اَرَآءً عَازِمَةً، وَ اَلْبَابًا حَازِمَةً!.

فَاتَّقُوا اللّٰهَ تَقِيَّةَ مَنْ سَمِعَ فَخَشَعَ، وَ اقْتَرَفَ فَاعْتَرَفَ، وَ وَجِلَ فَعَمِلَ، وَ حَاذَرَ

پس یہ (پند و نصیحت کی باتیں) کس درجہ مناسب مثالیں اور شفا بخشنے والے موعظے ہیں۔ کاش یہ (اسی طرح) پاکیزہ دلوں، محفوظ رکھنے والے کانوں، پختہ رایوں اور تیز عقلوں کو بھی پاتے۔

تو (بندگانِ خدا) تم (بھی خدا سے) اسی شخص کی طرح ڈرو جو (نصیحت کی باتیں) سنے تو فروتنی کرنے لگے اور جرم کرے تو (اس کا) اقرار کر لے [1] اور ڈرے تو

---

[1] حضرت امیر المومنینؑ نے اپنے ان جملوں میں ہم کو بلکہ کل بندگان کو حکم فرمایا ہے کہ اپنے خالق خداوند عالم سے اس طرح ڈریں جس طرح وہ شخص ڈرتا ہے:

(۱) جو کوئی نصیحت سنے تو اس کے دل میں خشیت اور خشوع پیدا ہو جائے اور وہ تواضع و فروتنی اختیار کر لے یعنی اس کے دل میں اس امر کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہو کہ کوئی موعظہ سنے تو اس سے خدا کے لیے خشوع کرنے لگے۔

(۲) جو گناہ کرے تو اقرار کر لے یعنی گناہ کر کے اس سے انکار نہ کرے اور اس فعل کو اچھا نہ سمجھے بلکہ اس فعل کو بُرا سمجھے اور خدا کی طرف رجوع کرے کہ مجھ سے یہ گناہ سرزد ہو گیا آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔

(۳) جو خوف کرے تو عمل کرے یعنی اپنے پروردگار سے ڈرے تو یہ ڈرنا اس کو بے چین کر دے اور وہ اس سے پریشان ہو کر اعمال صالحہ کی طرف متوجہ ہو جائے تا کہ ان کے ذریعہ سے نجات پائے۔

(۴) جو اپنے پروردگار کے عذاب سے حذر کرے تو اس کی طاعت و فرمانبرداری کی طرف سبقت کرے اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی پوری کوشش کرے۔

(۵) جو اس امر کا یقین رکھے کہ موت اسے ضرور آئے گی تو اپنے عمل کو نیک کرے اور اس میں خلوص پیدا کرے۔

(۶) جو عبرت دلایا جائے اور پند و نصیحت کیا جائے تو عبرت حاصل کر لے یعنی اس عبرت کو وہ شخص زینہ بنا لے تا کہ اس سے اس کا ذہن اس چیز کے علم حاصل کرنے تک پہنچ جائے جو اس کے لیے سزاوار اور مناسب ہے۔

(۷) جو خدا کے غیظ و غضب سے ڈرایا جائے اور اس کے عذاب دردناک سے متاثر کیا جائے تو باز رہے یعنی خدا کی معصیت کرنا ترک کر دے۔

(۸) جو خدا کے پیغام کو قبول کرے تو اس کی طرف انابت کر لے یعنی ادھر متوجہ ہو جائے اور اس کو خوش کر دے اور اس کے حکم کو انجام دینے لگے۔

(۹) جو اپنی فکر اور عقل میں مراجعت کرے یعنی اچھی طرح سمجھے اور عقل سے کام لے تو توبہ کر لے یعنی اس سے اپنے شیطان کے مقابلہ میں مدد حاصل کرے اور اپنے اس نفس کو جو برے کاموں کا حکم دینے والا ہے مغلوب رکھے جس سے

(بقیہ صفحہ مابعد)

فَبَادَرَ، وَ اَیْقَنَ فَاَحْسَنَ، وَ عُبِّرَ فَاعْتَبَرَ، وَ حُذِّرَ فَازْدَجَرَ، وَ اَجَابَ فَاَنَابَ، وَ رَجَعَ فَتَابَ، وَ اقْتَدٰی فَاحْتَذٰی، وَ اُرِیَ فَرَاٰی، فَاَسْرَعَ طَالِبًا، وَ نَجَا هَارِبًا، فَاَفَادَ ذَخِیْرَةً، وَ اَطَابَ سَرِیْرَةً، وَ عَمَّرَ مَعَادًا، وَ اسْتَظْهَرَ زَادًا لِّیَوْمِ رَحِیْلِهٖ وَ وَجْهِ سَبِیْلِهٖ، وَ حَالِ حَاجَتِهٖ، وَ مَوْطِنِ فَاقَتِهٖ، وَ قَدَّمَ اَمَامَهٗ

عمل (خیر) بجالائے اور (عذاب سے) خوف کرے تو (اطاعت خدا کی طرف) سبقت کرے اور (اپنی موت کا) یقین کرے تو اچھے کام انجام دے اور عبرت دلایا جائے تو عبرت حاصل کرلے اور ڈرایا جائے تو ڈر جائے اور جھڑکا جائے تو اس جھڑکنے سے متاثر ہو جائے اور (خدا کی بات) مانے تو (ادھر) رجوع کرے اور (اپنی عقل وفہم) میں مراجعہ کرے تو توبہ کرلے اور (پیشوایان دین کی) اقتدا کرے تو (واقعاً ان کے) قدم بہ قدم چلے اور (راہِ حق) دکھایا جائے تو پہچان لے پھر (اس کی) طلب میں دوڑے اور (گناہوں سے) بھاگ کر نجات پائے۔ پس اپنے انتقال کے دن اور اپنی راہ کی طرف اور اپنی حاجت کے حال اور اپنے فاقہ کی جگہ کے لیے توشہ (آخرت) سے ذخیرہ حاصل کرلے اور اپنے باطن کو پاکیزہ کرلے اور اپنے معاد کو آباد کرلے [1] اور توشۂ (آخرت) کو اپنی پشت پر رکھ لے [2] اور (اس توشہ کو) اپنے (ہمیشہ) رہنے کی جگہ

(بقیہ صفحہ گذشتہ) وہ اس کی پیروی سے باز رہے۔

(۱۰) جو انبیاء واولیاء خداوند عالم اور ائمہ طاہرین علیہم الصلوۃ والسلام کی اقتدا اور پیروی کرے تو صرف زبانی ہی دعویٰ نہ کرے اور نام ہی کے لیے ان کا شیعہ اور مطیع نہ بنے بلکہ واقعاً اور اعمال وافعال میں ان کے قدم بقدم چلے۔

[1] یعنی خدا کی راہ پر چلنے اور اس کی اطاعت وفرمانبرداری کرنے سے اپنی معاد کے لیے ذخیرہ اور خزانہ حاصل کرلے اور اپنے دل اور نفس وروح غرض کل باطن کو دنیا کی نجاستوں اور یہاں کی آلایشوں اور گندگیوں سے پاک وپاکیزہ کرلے اور جن کمالات وفضائل سے آخرت کے درجات رفیعہ حاصل ہوں گے ان سب کو اپنی ذات میں پیدا کرلے۔

[2] یعنی دنیا سے جس روز انتقال کرے گا اس روز اس کو اس بڑے اور عظیم الشان سفر آخرت کے لیے کسی توشہ کی بھی ضرورت یقیناً ہوگی تو اپنے اس سفر اور اس دن کی ضروریات اور اس کے فقر وفاقہ کے لیے اس کو بہت کچھ زاد راہ مطلوب ہوگا جو اعمال خیر اور اعمال وسعادات ہی ہیں تو ان کا سامان آج ہی سے کرنا چاہیے اور کسی عمل خیر کو یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ بس اس قدر کافی ہے بلکہ ہمیشہ اس سے ترقی ہی کرتے رہنے کی کوشش کرنی چاہیے کیونکہ کمالات اور مراتب عالیہ کا جو درجہ بھی انسان کو حاصل ہوگا وہ اس سے بھی (بقیہ صفحہ مابعد)

لِدَارِ مُقَامِهٖ.

کے واسطے آگے بھیج دے۔ ۱؎

فَاتَّقُوا اللّٰهَ عِبَادَ اللّٰهِ! جِهَةَ مَا خَلَقَكُمْ لَهٗ، وَ احْذَرُوْا مِنْهُ كُنْهَ مَا حَذَّرَكُمْ مِنْ نَّفْسِهٖ، وَ اسْتَحِقُّوْا مِنْهُ مَآ اَعَدَّ لَكُمْ بِالتَّنَجُّزِ لِصِدْقِ مِيْعَادِهٖ، وَ الْحَذَرِ مِنْ هَوْلِ مَعَادِهٖ.

تو بندگانِ خدا! اس نے جس غرض کے لیے تم کو پیدا کیا ہے اس سبب سے اس سے ڈرو ۲؎ اور اس نے جس قدر تمہیں اپنی ذات سے خوف دلایا ہے اسی حد تک اس سے خوف کرو ۳؎ اور اس کے وعدے کی سچائی کو جلد پورا کر کے اور اس کی قیامت کے ہول سے ڈر کر اس (اخروی بے حدو حساب نعمت و ثواب) کے مستحق ہو جاؤ جسے اس نے تمہارے لیے مہیّا کیا ہے۔ ۴؎

[مِنْهَا]

اسی (خطبہ) سے (یہ بھی ہے)

(بقیہ صفحہ ماقبل) بلند تر مرتبہ اور اعلیٰ کمال کا زینہ ہی ہوگا کہ اس سے وہ حاصل ہو سکے گا اور اگر اس کو یہ شخص حاصل نہیں کرے گا تو آخرت میں اس سے کمتر کی ضرورت اس کو پیش آئے گی جہاں اس کو اس تک پہنچنے کی کوئی راہ نہیں مل سکے گی کیونکہ کسی مرتبہ کمال کا حاصل کر لینا تو صرف دنیا کی زندگی تک موقوف ہے آنکھ بند ہو جانے کے بعد پھر کوشش اور عمل یا جدوجہد کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گا اور جو کچھ سامان دنیا میں کر چکا ہے بس اسی سے کام لینا ہوگا۔

۱؎ یعنی دنیا سے انتقال کرتے وقت جس راہ میں اس کو چلنا ہوگا اور جس گھر تک پہنچنا ہوگا جس کا نام قیامت اور دار آخرت ہے اس کے لیے اس توشہ کو مرنے سے پہلے ہی بھیج دے کیونکہ مرنے کے بعد پھر وہ کوئی توشہ نہ حاصل کر سکتا ہے نہ بھیج سکتا ہے لہٰذا جو کچھ کرنا ہو وہ آگے ہی کر لے۔

۲؎ یعنی خدا نے جس غرض کے لیے تم کو پیدا کیا ہے اس غرض اور مقصود کا اعتبار اور لحاظ کر کے خدا سے ڈرتے رہو اور چونکہ وہ غرض جس کے لیے خدا نے بندوں کو پیدا کیا ہے اس کی معرفت حاصل کرنا اس کو اس کے واقعی اوصاف کے ساتھ پہچاننا اور اس کی عبادت کرنا ہے تو مقصود یہ ہوگا کہ اسی جہت اور اعتبار کے لحاظ سے خدا کا خوف کرو نہ لوگوں کے دکھانے اور منانے کے لیے۔

۳؎ یعنی خدا نے اپنی ذات سے تمہیں جس جس طرح ڈرایا ہے اسی طرح اس کا خوف کرو اور یہ خوف اسی طرح حاصل ہوگا کہ خدا نے جن چیزوں سے ڈرایا ہے ان کی حقیقت سے بحث کی جائے اور اس کے تصور کرنے میں خدا کی راہ پر چلنے والوں کے درجے متفاوت ہیں۔

۴؎ جیسا کہ خداوند عالم نے فرمادیا ہے:

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ﴾ (سورۂ التوبۃ، آیہ ۷۲)

یعنی جو ایمان لاتے اور نیک کام کرتے ہیں ان کے لیے خدا نے جنتوں کا وعدہ کیا ہے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔

جَعَلَ لَكُمُ اَسْمَاعًا لِّتَعِيَ مَا عَنَاهَا، وَ اَبْصَارًا لِّتَجْلُوَ عَنْ عَشَاهَا، وَ اَشْلَآءً جَامِعَةً لِّاَعْضَآئِهَا، مُلَآئِمَةً لِاَحْنَآئِهَا فِيْ تَرْكِيْبِ صُوَرِهَا، وَ مُدَدِ عُمُرِهَا، بِاَبْدَانٍ قَآئِمَةٍ بِاَرْفَاقِهَا، وَ قُلُوْبٍ رَآئِدَةٍ لِّاَرْزَاقِهَا، فِيْ مُجَلِّلَاتِ نِعَمِهٖ، وَ مُوْجِبَاتِ مِنَنِهٖ، وَ حَوَاجِزِ عَافِيَتِهٖ.

اس (خدا) نے تمہیں کان دیے تا کہ وہ حفاظت کریں ان چیزوں کی جو ان کے لیے اہم ہوں اور آنکھیں (عطا کیں) تا کہ ان کی تاریکی اور نابینائی زائل ہو جائے [1] اور ایسے (ظاہری) بدنوں کو پیدا کیا جو اپنی صورتوں کی ترکیب اور اپنی مدتہائے عمر میں اپنے (اندرونی) اعضاء کے جامع [2] اور اپنے اطراف و جوانب کے مناسب ہیں ایسے جسموں کے ساتھ جو اپنے منافع کے ساتھ قائم ہیں اور ایسے دلوں کے ہمراہ جو اس (خدا) کی بزرگ نعمتوں اور اس کے احسانات کے اسباب اور اس کی عافیت کے پردوں میں اپنے رزق کے طالب ہیں۔

وَ قَدَّرَ لَكُمُ اَعْمَارًا سَتَرَهَا عَنْكُمْ، وَ خَلَّفَ لَكُمْ عِبَرًا مِّنْ اٰثَارِ الْمَاضِيْنَ قَبْلَكُمْ، مِنْ مُّسْتَمْتَعِ خَلَاقِهِمْ، وَ مُسْتَفْسَحِ

اور اس (خدا) نے تمہارے لیے ایسی عمریں معین کیں جن کو تم سے پوشیدہ رکھا اور تم سے پہلے جو لوگ گزر گئے ہیں ان کی نشانیوں سے یعنی ان کے اپنے وافر حصوں سے نفع اٹھانے کی جگہ (جو دنیا ہے) اور ان کی حیات کی مدت سے تمہارے لیے عبرت کے آثار چھوڑ رکھے ہیں۔

---

[1] ''اَبْصَارًا لِّتَجْلُوَ عَنْ عَشَاهَا'' کا ترجمہ کسی طرح درست نہیں ہوتا ''عَشَا'' کا اصلی معنی یہ ہے کہ انسان کی آنکھیں چندھی ہو جائیں اور دن کو دیکھ سکیں تو راتوں کو نہ دیکھ سکیں۔ ''عَنْ'' زائد ہے تو اب صرف یہ رہا ''لِتَجْلُوَ عَشَا'' یعنی وہ اپنے چندھے پن کو زائل کر دیں اور دن رات کو برابر دیکھیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہاں تجلوں کا مفعول حذف کر دیا گیا ہو اور معنی یہ ہو ''لِتَجْلُوَ الْاَذٰی بَعْدَ عَشَاهَا'' یعنی وہ آنکھیں نابینائی کے بعد اپنی اذیت کو دفع کر دیں بہر کیف مقصود یہ ہے کہ خدا نے انسان کو آنکھیں مرحمت فرمائی تا کہ انسان ان آنکھوں سے دنیا کی چیزوں کو دیکھے اور بے آنکھ رہنے میں جس اذیت اور پریشانی کا سامنا ہوتا اس سے محفوظ رہے۔

[2] یعنی خدا نے انسان میں ایسے اعضاء پیدا کیے جو ان کو جمع اور اکٹھا کریں اگر یہاں یہ شبہ ہو کہ اس جملہ کا کیا معنی کہ ایسے اعضاء پیدا کیے جو اپنے اعضاء کو اکٹھا کریں کیونکہ کوئی چیز خود اپنے کو کیوں کر جمع اور اکٹھا کر سکتی ہے تو اس کا جواب دیا جائے گا کہ حضرتؑ کا مقصود یہاں لفظ ''اَشْلَآءً'' سے وہ اعضاء ہیں جو ظاہری ہیں جیسے اوپر کا سینہ، چمڑا اوپر کی ہڈی وغیرہ اور لفظ اعضاء سے بدن کے وہ حصے مراد ہے جو باطنی ہوں جیسے دل، جگر، دماغ وغیرہ اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ انسان کے ظاہری اعضاء اندرونی اور باطنی حصّوں کو جمع کیے اور سمیٹے ہوئے ہیں بلکہ ان کی حفاظت بھی کرتے ہیں۔

خَنَاقِهِمُ. اَرْهَقَتْهُمُ الْمَنَايَا دُوْنَ الْاٰمَالِ، وَ شَذَّبَهُمْ عَنْهَا تَخَرُّمُ الْاٰجَالِ. لَمْ يَمْهَدُوْا فِيْ سَلَامَةِ الْاَبْدَانِ، وَ لَمْ يَعْتَبِرُوْا فِيْ اُنُفِ الْاَوَانِ.

فَهَلْ يَنْتَظِرُ اَهْلُ بَضَاضَةِ الشَّبَابِ اِلَّا حَوَانِيَ الْهَرَمِ؟ وَ اَهْلُ غَضَارَةِ الصِّحَّةِ اِلَّا نَوَازِلَ السَّقَمِ؟ وَ اَهْلُ مُدَّةِ الْبَقَآءِ اِلَّا اٰوِنَةَ

انہیں (اپنی) آرزوؤں (تک پہنچنے) سے پہلے ہی موت نے دھر پکڑا ۱؎ اور ان کی اجل کی قطع و برید نے ان (آرزوؤں) سے انہیں متفرق کر دیا، انہوں نے (اپنے) صحتِ بدن کی حالت میں (کوئی سامانِ آخرت) مہیّا نہیں کیا اور (اپنی) ابتدائے عمر میں (کسی طرح) عبرت حاصل نہیں کی۔ ۲؎

تو کیا تروتازہ جوانی والے بڑھاپے کی جھکا دینے والی حالتوں اور عمدہ خوشگوار صحت والے سخت بیماریوں کے حملوں اور مدت بقاء والے فناء (و نیستی) کے اوقات کے سوا بھی کسی چیز کے انتظار میں ہیں؟ ۳؎ باوجودیکہ جدائی کا

۱؎ اب حضرتؑ ان لوگوں کے حالات بیان کر رہے ہیں جو ہم سے پہلے دنیا میں عرصہ تک رہے ہیں یہاں کی لذتوں کا مزہ اٹھایا ہے، یہاں کی مسرّتوں میں بسر کی ہے اور اب وہ قبروں کے اندر پڑے ہوئے ہیں تو وہ جس دھوکے اور فریب میں مبتلا تھے اور موت نے انہیں اپنی آرزوؤں تک پہنچنے سے قبل جو دنیا سے اُٹھا لیا اور انہیں پراگندہ و متفرق کر دیا، اس کی پوری اور سبق آموز تصویر کھینچنے کے بعد حضرتؑ بندگانِ خدا کو ان کے حالات پر متنبہ کرتے ہیں کہ تمہارا بھی بہت جلد یہی حال ہونے والا ہے، لہٰذا اگر خدا و رسولؐ کے ارشادات سے تمہارا دل اثر نہیں لیتا تو ان گزشتہ حضرات کے انجام سے عبرت حاصل کرو اور دنیا کی امید کم کرو اور موت کے لیے آمادہ و مستعد رہو اور اعمال خیر بجالاتے رہو۔

۲؎ یہ بھی دنیا کے موجود بندوں کی تنبیہ اور نصیحت کے لیے حضرتؑ ارشاد فرماتے ہیں کہ تم سے قبل جو لوگ دنیا میں تھے ان کے بدن جب صحیح و سالم تھے، ان میں قوت اور توانائی موجود تھی، انہیں جد و جہد کرنے اور اعمال خیر بجالانے کا موقع حاصل تھا اس وقت ان لوگوں نے اپنا کوئی سامان نہیں کیا تو آج ان سامانوں کے محتاج ہو رہے ہیں، اسی طرح اگر تم بھی اپنی ابتدائے عمر اور اعضاء و جوارح کی صحت و سلامتی کی حالت میں اپنی اصلاح معاد نہ کرو گے، دنیا کے دھوکے اور فریب کو نہ سمجھو گے اور خدا سے تقویٰ اختیار کر کے اور اعمال صالحہ بجالا کر آخرت کی کامیابی اور عذاب جہنم سے نجات کے لیے مستعد نہ ہو گے تو جس طرح موت نے تمہارے اگلوں کو نہیں چھوڑا تم بھی یہاں بچ نہیں سکتے اور پھر تم کو بھی آخرت کا سامنا ہوگا اور ان اعمال صالحہ کے تم بھی اسی طرح محتاج ہو گے جس طرح تم سے پہلے گزرنے والے محتاج ہوئے تو ابھی موقع باقی ہے جلدی کرو اور یہاں آخرت کے لیے کھیتی کر لو تا کہ بعد کو تمہیں بھی ندامت نہ اٹھانی پڑے۔

۳؎ یہاں سے حضرتؑ بندوں سے سوال کرتے ہیں کہ تم جانتے ہو جوانان عالم اپنی جوانی کے بعد بڑھاپے کی کمزوری اور کمر سے جھک جانے کے سوا کسی حالت کو پائیں گے اور جو صحیح و تندرست نظر آتے ہیں انہیں آخر میں بیماریوں اور صحت کی خرابی کے علاوہ کسی چیز کا سامنا کرنا ہوگا اور جو لوگ دنیا میں زندوں میں شمار کیے جاتے ہیں کیا وہ فنا۔۔۔۔۔ (کتاب میں الفاظ واضح نہیں۔)

الْفَنَآءِ؟ مَعَ قُرْبِ الزِّيَالِ، وَ اُزُوْفِ الْاِنْتِقَالِ، وَ عَلَزِ الْقَلَقِ، وَ اَلَمِ الْمَضَضِ، وَ غُصَصِ الْجَرَضِ، وَ تَلَفُّتِ الْاِسْتِغَاثَةِ بِنُصْرَةِ الْحَفَدَةِ وَ الْاَقْرِبَآءِ، وَ الْاَعِزَّةِ وَ الْقُرَنَآءِ! فَهَلْ دَفَعَتِ الْاَقَارِبُ، اَوْ نَفَعَتِ النَّوَاحِبُ؟

وَ قَدْ غُوْدِرَ فِيْ مَحَلَّةِ الْاَمْوَاتِ رَهِيْنًا، وَ فِيْ ضِيْقِ الْمَضْجَعِ وَحِيْدًا، قَدْ هَتَكَتِ الْهَوَامُّ جِلْدَتَهٗ، وَ اَبْلَتِ النَّوَاهِكُ جِدَّتَهٗ، وَ عَفَتِ الْعَوَاصِفُ اٰثَارَهٗ، وَ مَحَا

زمانہ قریب اور انتقال کی گھڑی نزدیک اور قلق کی شدت اور مصیبت کی اذیت اور درد کا رنج اور حلق میں اٹکنے کی تکلیفوں [1] اور اولاد و اقربہ اور اعزہ و احباب و رفقا سے مدد کی فریاد کرنے کے لیے متوجہ ہونے کا (وقت آ پہنچا) ہے۔ [2] تو (خوب غور کر کے بتاؤ) کیا قرابت مندوں نے (اپنے عزیز کی موت یا کسی مصیبت کو) دفع کیا؟ یا نوحہ کرنے والیوں نے اسے کچھ نفع پہنچایا؟

بلکہ وہ مُردوں کی جگہ پھنس کر اور قبر کی تنگی میں یکہ و تنہا چھوڑ دیا گیا ہے کہ کیڑے مکوڑوں نے اس کی کھال ادھیڑ دی اور ناتواں کر دینے والی حالتوں [3] نے اس کی تروتازگی کہنہ کر دی اور تیز و تند آندھیوں نے اس کے نشانوں کو مٹا دیا اور حادثوں نے اس کے آثار محو کر دیے [4] اور (اس

---

[1] مولوی وحید الزمان صاحب حیدر آبادی انوار اللغۃ میں لکھتے ہیں:

''عَلَزٌ''، معنی درد ناک ہونا، بے قرار ہونا ''هَلْ يَنْتَظِرُ اَهْلُ بَضَاضَةِ الشَّبَابِ اِلَّا عَلَزَ الْقَلَقِ''۔ کیا جن لوگوں کے رنگ جوانی سے چمک رہے ہیں وہ درد اور بے قراری کا انتظار کر رہے ہیں ''مَضَضٌ''، معنی، رنج والم۔ ''غُصَصٌ''، جمع ہے غُصّہ کے جس کا معنی حلق میں اٹکاؤ، رکاوٹ اور تیہے کو بھی کہتے ہیں اسی طرح رنج اور غم کو بھی کہتے ہیں۔ ''جَرَضٌ''، معنی غصّہ اور غم کے ساتھ مشکل سے تھوک نکلنا، جان کا حلق تک آجانا اور اچھو ہونا۔ ''غُصَصِ الْجَرَضِ''، معنی درد کا رنج اور حلق میں اٹکنے کی تکلیفیں۔

[2] فرماتے ہیں کہ مرنے والے پر جب موت کا وقت آتا ہے تو وہ فریاد کرتا، کراہتا اور چیختا ہوا اپنے اہل و عیال کی طرف امید میں متوجہ ہوتا ہے کہ وہ ہماری مدد کریں گے مگر ان بیچاروں کی کیا قدرت ہے جو اس سے اس مصیبت کو دفع کر سکیں۔

[3] ''اَلنَّوَاهِكُ''، جمع ''نَاهِكَةٌ'' کی۔ ''النَّوَاهِكُ'' کا معنی خوب سزا دینا، ناتواں کر دینا اور فنا کرنا ہے۔ تو ''نواہک''، معنی خوب ناتواں کر دینے والی حالتیں ہیں اور ''جِدَّتَ''، معنی تروتازگی یعنی جب موت کا وقت قریب پہنچتا ہے تو انسان کی لاغر اور ناتواں کر دینے والی حالتیں اس کے جسم کی تمام بہار کو زائل کر دیتی اور اس کی تروتازگی کو کہنہ کر کے مٹا دیتی ہیں۔

[4] علامہ ابن میثم علیہ الرحمہ ان جملوں کی شرح کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں: جاننا چاہیے کہ اس مقام پر حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے جو ''فَهَلْ يَنْتَظِرُ''، فرما کر انتظار کا ذکر کیا ہے تو اس سے حقیقی انتظار مراد نہیں ہے بلکہ یہ مقصود ہے کہ چونکہ وہ شخص جو کسی چیز کا انتظار کرتا رہتا ہے یا کسی شی کے ترقب اور امید میں مشغول رہتا ہے درحقیقت اپنے ان حالات میں ان امور کو ترک (بقیہ صفحہ مابعد)

الْحَدَثَانُ مَعَالِمَهُ، وَ صَارَتِ الْاَجْسَادُ شَحِبَةً بَعْدَ بَضَّتِهَا، وَ الْعِظَامُ نَخِرَةً بَعْدَ قُوَّتِهَا، وَ الْاَرْوَاحُ مُرْتَهَنَةً بِثِقَلِ اَعْبَآئِهَا، مُوْقِنَةً بِغَيْبِ اَنبَآئِهَا، لَا تُسْتَزَادُ مِنْ صَالِحِ عَمَلِهَا، وَ لَا تُسْتَعْتَبُ مِنْ سَيِّئِ زَلَلِهَا!.

کے) بدنوں کا رنگ ان کے آب وتاب کے بعد بدل گیا[1] اور (اس کی) ہڈیاں اپنی قوت کے کے بعد بوسیدہ ہوگئیں اور (اس کی) روحیں اپنے بوجھوں کے بار میں الجھ گئیں[2] (اس طرح) کہ اپنے غیب کی خبروں (یعنی قیامت کے انجام) کا یقیں کرلیا ہے۔ (تو اب) ان کے اچھے اعمال زیادہ نہیں کیے جاسکتے ہیں اور ان کے برے کاموں سے توبہ نہیں کی جاسکتی ہے۔[3]

(بقیہ صفحہ ماقبل) کر دیتا ہے جو اسے اس وقت کرنا چاہیں مثلاً یہ کہ وہ جہاں جائے گا وہاں کا سامان کرنا یا جو امر پیش آنے والا ہے اس کے تہیہ میں مشغول ہونا۔ اس وجہ سے حضرتؑ نے اس کے اس ترک کرنے یا غافل ہونے کو انتظار سے تشبیہ دی اور اس کے لیے لفظ انتظار بطور استعارہ لائے۔ پھر مرنے والے شخص کو سکرات موت کے وقت جن سختیوں اور اذیتوں کا سامنا کرنا ہوتا ہے ان کو ایسے اوصاف سے کنایہ کیا جو اس شخص کو اس وقت عارض ہوتی ہیں۔ مثلاً لرزہ، دھڑکن، رنج وغم، خوف وغیرہ۔ پھر اس پر تنبیہ فرمائی کہ موت پہنچتے وقت جو یہ تکلیفیں پیش آتی ہیں ان کو نہ تو کوئی عزیز قریب دفع کرسکتا ہے نہ دوست واحباب۔

[1] ''شحوب'' اور ''شحوبت'' معنی رنگ بدل جانا ہے لاغری یا بھوک یا بیماری یا سفر کی وجہ سے۔

[2] یہ اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ انسان کے نفوس اور روحیں انسان کے برے اعمال اور گناہوں کے بوجھ سے لدی ہوئی رہتی ہیں کیونکہ بدن تو روحوں کے نکلنے کے بعد بے کار ہو گئے۔ اب وہ کنکر پتھر کی طرح بے بس چیزیں ہو گئے۔ ہاں روح چونکہ ادراک رکھتی ہے اور ان گناہوں کی برائی کو محسوس کرتی ہے اس وجہ سے وہ ان بوجھو میں گرفتار اور ان باروں میں الجھی ہوئی رہتی ہے۔ اور روحوں کو غیب کی خبروں کا یقین کیے ہوئے اس وجہ سے فرمایا کہ روح کو معلوم رہتا ہے کہ انسان کے مرنے کے بعد اس کا کیا انجام ہوگا۔ آیا بہشت میں جائے گا یا دوزخ میں، اگر بہشت میں جائے گا تو اس کی امید میں روح خوش ہوتی رہے گی اور اگر دوزخ میں جائے گا تو اس کے تصور میں روح پریشان اور خائف وترساں رہتی ہے۔

[3] یعنی کسی شخص کے مرنے کے بعد اس کی روح چاہے کہ اعمال صالحہ میں جو کمی واقع ہوئی ہے اس کو پورا کرے یا جن گناہوں سے اس نے توبہ نہیں کی تھی ان سے اب توبہ کر لے تو یہ بھی اب نہیں ہوسکتا کیونکہ ان باتوں کا موقع صرف دنیا میں تھا جس کو ''مَزْرَعَةُ الْاٰخِرَةِ'' کہا گیا ہے۔ آخرت تو صرف اعمال کا نتیجہ حاصل کرنے کی جگہ ہے۔ اس مضمون کو خداوند عالم نے بھی قرآن مجید میں فرمایا ہے۔ مثلاً سورہ حم سجدہ رکوع ۳ میں ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَاِنْ يَّسْتَعْتِبُوْا فَمَا هُمْ مِّنَ الْمُعْتَبِيْنَ﴾ (سورۂ فصلت، آیہ ۲۴)

یعنی اگر وہ توبہ کرنا چاہیں تو اب وہ ان لوگوں سے نہیں رہے جن کی توبہ قبول کی جائے۔

(بقیہ صفحہ مابعد)

اَوَ لَسْتُمْ اَبْنَآءَ الْقَوْمِ وَ الْاٰبَآءَ، وَ اِخْوَانَهُمْ وَالْاَقْرِبَآءَ؟ تَحْتَذُوْنَ اَمْثِلَتَهُمْ، وَ تَرْكَبُوْنَ قِدَّتَهُمْ، وَ تَطَؤُوْنَ جَادَّتَهُمْ؟! فَالْقُلُوْبُ قَاسِيَةٌ عَنْ حَظِّهَا، لَاهِيَةٌ عَنْ رُشْدِهَا، سَالِكَةٌ فِيْ غَيْرِ مِضْمَارِهَا! كَاَنَّ الْمَعْنِيَّ سِوَاهَا، وَ كَاَنَّ الرُّشْدَ فِيْ اِحْرَازِ دُنْيَاهَا.

(پھر) کیا تم اسی (دنیا سے جانے والی) قوم کی اولاد اور باپ دادا اور بھائی بند اعزہ واقربہ نہیں ہو؟ [1] انہی کی مثالوں کی پیروی کرتے اور انہی کے طریقہ پر چلتے ہو اور انہی کی راہ کو روندتے ہو تو (تمہارے) دل (ودماغ) اپنا حصّہ حاصل کرنے سے سخت، اپنی بھلائی چاہنے سے غافل ہیں اور اپنے میدان کے غیر میں چل رہے ہیں [2] گویا مقصود اس کے سوا کچھ ہے اور (شاید ان کے خیال میں ان کی) بھلائی اپنی دنیا ہی کے حاصل کرنے میں ہے۔ [3]

(بقیہ صفحہ ماقبل) اور یہ اسی وجہ سے کہ وہاں نہ عمل کا کوئی ذریعہ ہے نہ وہاں سے پلٹ کر دنیا میں آنا ممکن ہے اور نہ یہ اس کے اختیار میں ہے کہ جن گناہوں کا طوق اس کے گلے میں پڑ گیا ہے اس کو اتار پھینکے۔ جیسا کہ خداوند عالم سورۂ مومنون پارہ ۱۸، رکوع ۶ میں ارشاد فرماتا ہے:

﴿حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ۝ لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ۭ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا ۭ وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝﴾ (سورۂ المومنون، آیہ ۹۹۔۱۰۰)

یعنی یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کو موت آئے گی تو وہ عرض کرے گا کہ اے میرے پروردگار اب مجھے لوٹا دے تاکہ جو کچھ میں چھوڑ آیا ہوں اس میں کچھ نیکی کروں اس وقت کہا جائے گا کہ ایسا نہیں ہوسکتا، یہ تو ایک مہمل بات ہے جو یہ کہہ رہا ہے اور ان کے آگے اس دن تک کے لیے جس دن وہ مبعوث کیے جائیں گے عالم برزخ موجود ہے۔

[1] یعنی تم لوگ جو دنیا میں موجود رہتے ہو مرنے والے کے یا فرزند ہوگے یا اس کے باپ دادا اور (اس طرح کہ تمہارا بیٹا یا پوتا مرا ہو) یا دوست واحباب یا اعزہ واقربا۔

[2] یعنی دلوں میں اتنی سختی پیدا ہوگئی کہ وہ اب اپنے نفع کے حصے حاصل کر لینے سے محروم ہو رہے ہیں اور اپنی ہدایت کی راہیں دیکھنے سے غافل ہو گئے ہیں اور جو راستہ اور طریقہ ان کے چلنے کا تھا ان سے الگ ہو کر بے راہ چلنے لگے ہیں۔ ''مضمار'' کا معنی ہے میدان جس سے مقصود یہاں شریعت اور مذہب ہے۔ یعنی احکام خداوند عالم کے بجالانے اور منہیات باری تعالیٰ سے بچتے رہنے میں انہیں جس طرز عمل کو اختیار کرنا ضروری تھا اس کے خلاف طریقہ کو اختیار کر لیا ہے۔

[3] یعنی ان لوگوں نے جس روش کو اختیار کر رکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تکلیفات شرعیہ اور وہ احکام جن کے متعلق ڈرانا اور خوشخبری دینا وارد ہوا ہے وہ ان کے علاوہ کچھ ہیں۔ اور باوجودیکہ بھلائی اور آخرت کی ترقی واقبال اسی میں ہے کہ انسان دنیا میں زیادہ دل نہ

وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ مَجَازَكُمْ عَلَى الصِّرَاطِ وَ مَزَالِقِ دَحْضِهٖ، وَ اَهَاوِيْلِ زَلَلِهٖ، وَ تَارَاتِ اَهْوَالِهٖ.

اور خوب سمجھ رکھو کہ تمہیں (پل) صراط اور اس کے پھسلنے کے گڑھوں اور اس کی لغزشوں کے خوفوں اور اس کے پے در پے ہولوں پر سے گزرنا ہوگا۔[1]

فَاتَّقُوا اللّٰهَ تَقِيَّةَ ذِیْ لُبٍّ شَغَلَ التَّفَكُّرُ قَلْبَهٗ، وَ اَنْصَبَ الْخَوْفُ بَدَنَهٗ، وَ اَسْهَرَ التَّهَجُّدُ غِرَارَ نَوْمِهٖ، وَ اَظْمَاَ الرَّجَآءُ هَوَاجِرَ يَوْمِهٖ، وَ ظَلَفَ الزُّهْدُ شَهَوَاتِهٖ، وَ اَوْجَفَ الذِّكْرُ بِلِسَانِهٖ، وَ قَدَّمَ الْخَوْفَ لِاَمَانِهٖ، وَ تَنَكَّبَ الْمَخَالِجَ

تو اے بندگانِ خدا! تم خدا سے اس عاقل کی طرح ڈرو جس کے قلب کو (انجام آخرت کی) فکر نے الجھا رکھا ہو اور جس کے بدن کو خوف (قیامت) نے رنج میں ڈال رکھا ہو اور جس کی تھوڑی سی نیند کو نماز شب نے بیداری سے بدل دیا ہو اور جس کے دن کی گرمیوں کو امید (ثواب) نے پیاسا کر دیا ہو[2] اور جس کی شہوتوں کو زہد نے روک دیا ہو اور جس کی زبان پر (خدا کا) ذکر جاری رہتا ہو اور جس نے

(بقیہ صفحہ مابعد) دنیا کے حاصل کرنے میں ہے، جب ہی تو اس کے حاصل کرنے میں جان دیتے اور جائز و ناجائز یا حلال و حرام کا کچھ بھی خیال نہیں کرتے ہیں۔

[1] یعنی تم لوگ پل صراط پر سے گزرو گے جس کے نیچے پھسلنے کے گڑھے ہیں۔ ''مَزَالِقَه'' کا معنی پھسلوان مقام اور ''دَحْضٌ''، معنی دھسنا یعنی پل صراط کے نیچے ایسے گڑھے ہیں جن کے اندر انسان پھسل کر گر جائے گا تو ان گڑھوں میں دھنستا جائے گا۔ علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ ہمارے علماء کا قول یہ ہے کہ پل صراط جس کا ذکر کلام مجید میں ہے وہ راستہ ہے جس سے بہشت والے بہشت میں اور جہنم والے جہنم میں پہنچ جائیں گے اور وہ اس طرح کہ بہشت والوں کا گزر جہنم کے دروازہ پر سے ہوگا تو جو شخص جہنم کا مستحق قرار پائے گا وہ اس میں گر جائے گا اور جو بہشت کا مستحق ہوگا وہ اس پر سے گزر جائے گا کہ آگے جا کر بہشت میں داخل ہو جائے گا۔

چنانچہ خداوند عالم نے کلام مجید سورۂ مریم رکوع ۵ میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَ اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا﴾ (سورۂ مریم، آیہ ۷۱)

یعنی ایسا تم سے ایک بھی نہیں ہے جو جہنم کے کنارے نہ پہنچے۔

تو اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ اس سے قریب اور نزدیک ہر شخص ہوگا جو بہشت میں جائے گا اور اس پر سے گزر جائے گا اور جو اس میں داخل کیا جائے گا وہ اس میں گر جائے گا، انتہیٰ۔

[2] یعنی وہ راتوں کو نماز شب کا پابند ہو اور دنوں کو کثرت سے روزے رکھ کر پیاس کی اذیت برداشت کرتا ہو۔

عَنْ وَّضَحِ السَّبِيْلِ، وَ سَلَكَ اَقْصَدَ الْمَسَالِكَ اِلَى النَّهْجِ الْمَطْلُوْبِ، وَ لَمْ تَفْتِلْهُ فَاتِلَاتُ الْغُرُوْرِ، وَ لَمْ تَعْمَ عَلَيْهِ مُشْتَبِهَاتُ الْاُمُوْرِ، ظَافِرًا بِفَرْحَةِ الْبُشْرٰى، وَ رَاحَةِ النُّعْلٰى، فِيْ اَنْعَمِ نَوْمِهٖ، وَ اٰمَنِ يَوْمِهٖ. قَدْ عَبَرَ مَعْبَرَ الْعَاجِلَةِ حَمِيْدًا، وَ قَدَّمَ زَادَ الْاٰجِلَةِ سَعِيْدًا، وَ بَادَرَ مِنْ وَّجَلٍ، وَ اَكْمَشَ فِيْ مَهَلٍ، وَ رَغِبَ فِيْ طَلَبٍ، وَ ذَهَبَ عَنْ

اپنے بچاؤ کے لیے) (خدا کے) ڈر کو آگے کر رکھا ہو[1] اور جو راہیں صاف رستہ سے موڑنے والی ہوتی ہیں ان سے وہ الگ ہو گیا ہو اور وہ اپنی منزل مقصود کی طرف نہایت میانہ روی کی راہ چلا ہو اور جسے دھوکے فریب کی پیچیدگیوں نے موڑ نہ دیا ہو[2] اور گجلک باتیں اس پر پوشیدہ نہ ہو گئی ہوں درحالیکہ وہ شخص اپنی بہترین نیند اور نہایت اطمینان کے دن میں مژدہ (نجات) کی خوشی اور نعمت (جنت) کے آرام پر فائز ہو گیا ہو[3] وہ گزرگاہ عجلت (یعنی دنیا کی پل) کو نیک نامی سے عبور کر گیا ہو[4] اور اس نے توشۂ آخرت کو سعادت مندی کے ساتھ آگے بھیج دیا ہو اور (خدا کے) خوف سے (اعمال خیر کے بجالانے میں) سبقت[5] اور مہلتوں میں مستعدی اور طلب (آخرت) میں رغبت کی ہو

---

[1] یعنی اگر وہ خدا سے ڈرتا رہے گا اور کسی کام کا ارادہ کرنے سے پہلے اس کے متعلق خدا کے حکم اور اس کی سزا و جزا کو سمجھ لے گا تو آخرت کے عذاب اور جہنم کی سزا سے امن میں رہے گا۔ اسی وجہ سے فرمایا کہ اپنی امان کے لیے خوف خدا کو مقدم کر رکھا ہو کہ جب اس اصول پر کام کیا جائے گا تو ہر طرح نجات ہی نجات اور محض کامیابی ہی ہو گی۔

[2] یعنی دنیا کی چمک دمک اور یہاں کی لذتوں کے دھوکے اور فریب نے اسے بہکا کر آخرت سے غافل نہ کر دیا ہو اور جنت کی سیدھی راہ سے جہنم کے رستہ کی طرف موڑ کر نہ لگا دیا ہو۔

[3] یعنی اس مژدہ کی خوشی میں جو بروز قیامت حکم خدا سے فرشتے پہنچائیں گے جیسا کہ خدا نے سورۂ حدید رکوع ۲ میں فرمایا ہے:

﴿بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ﴾

یعنی ان سے فرشتے اس روز کہیں گے کہ آج تمہاری خوشخبری ہے یعنی وہ جنتیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں تم ان میں ہمیشہ رہو گے یہی تو بڑی کامیابی ہے۔ (سورۂ الحدید، آیہ ۱۲)

[4] دنیا کو ''مَعْبَرَ الْعَاجِلَةِ'' یعنی گزرگاہ عجلت اس وجہ سے کہا کہ دنیا وہ راہ ہے جس سے گزر کر انسان آخرت میں پہنچتا ہے تو آخرت دائمی مقام اور دنیا عجلت کا گھر ہے۔

[5] یعنی قیامت کے خوفناک منظروں کا سامنا کرنے سے خوف زدہ ہو کر وہ اعمال خیر کے بجالانے کی طرف سبقت اور مبادرت کرتا ہو تاکہ وہاں کی کوئی سختی اس کو نہ پہنچے اور وہاں کے کسی عذاب کا سامنا اس کو نہ کرنا پڑے۔

هَرَبٍ، وَ رَاقَبَ فِيْ يَوْمِهٖ غَدَهٗ، وَرُبَّمَا نَظَرَ قُدُمًا اَمَامَهٗ.

اور (دنیا سے) بھاگ کر نکل گیا[1] اور اپنے آج کے دن کل کا لحاظ رکھا ہو اور بسا اوقات اپنے آگے (یعنی اپنے اعمال کی طرف) نظر کی ہو۔[2]

فَكَفٰى بِالْجَنَّةِ ثَوَابًا وَّ نَوَالًا، وَ كَفٰى بِالنَّارِ عِقَابًا وَّ وَبَالًا! وَ كَفٰى بِاللّٰهِ مُنْتَقِمًا وَّ نَصِيْرًا! وَ كَفٰى بِالْكِتَابِ حَجِيْجًا وَّ خَصِيْمًا!.

تو بہشت اس کے ثواب اور عطا کے لیے اور دوزخ سزا اور وبال کے لیے اور خدا انتقام اور مدد کے لیے اور قرآن مجید دشمنی اور عداوت کے لیے کس قدر کافی ہے۔[3]

---

[1] ''بَادَرَ مِنْ وَّجَلٍ، وَ اَكْمَشَ فِيْ مَهَلٍ'' کا معنی یہ ہے کہ اس نے ڈر کے وقت جلدی کی اور آگے بڑھ گیا اور مہلت کے وقت مستعدی دکھلائی (تیار رہا) یعنی دنیا کی زندگی میں غفلت اور لاپرواہی نہیں برتی بلکہ خدا سے خوف اور آخرت کا سامان کرتا رہا اور آخرت کی طلب میں رغبت کرتا رہا اور دنیا سے بھاگ کر آخرت کی طرف چلتا رہا۔

[2] یعنی جن اعمال کو پہلے وہ کر چکا ہے اور آخرت کا جو سامان قبل میں روانہ کر چکا ہے اس کی طرف نظر رکھتا ہے کہ دیکھوں کون اعمال اچھے ہوتے اور بہشت میں پہنچاتے ہیں اور کون اعمال برے ثابت ہوتے اور مجھے جہنم کا مستحق ٹھہراتے ہیں۔

[3] یعنی بہشت میں اس کثرت سے نعمتیں، لذتیں اور اسباب عیش وعشرت ہیں کہ اس کے مقابلہ میں کوئی دوسری چیز نہیں ہوسکتی لہٰذا اچھے اعمال کی جزا کے لیے وہ کافی ہے اور جہنم میں اس کثرت سے اذیت، تکلیف، رنج وغم اور مصیبت واندوہ کا سامان ہے کہ اس کے مقابلہ میں کوئی دوسری شے نہیں ہوسکتی تو برے اعمال کی سزا اور عقوبت کے لیے وہ کافی ہے۔ اور خداوند عالم جس نے سب کو پیدا کیا اور سب کے اچھے برے اعمال سے ذرہ برابر تک واقف ہے اس سے بہتر نہ شریروں سے کوئی انتقام لے سکتا ہے نہ اچھوں کی کوئی مدد کرسکتا ہے لہٰذا خدا انتقام لینے کے لیے بھی کافی ہے اور مدد کرنے کے لیے بھی بس ہے۔ اسی طرح کلام مجید بھی بروز قیامت گواہی دے گا کہ کن لوگوں نے اس کے احکام پر عمل کیا اور کس نے اس کے اوامر ونواہی کی مخالفت کی اور کن لوگوں نے بالکل چھوڑ دیا تو وہ بھی اپنے مخالفین کی خصومت اور عداوت کے لیے کافی ہے اور جس کی شکایت وہ کرے گا اس کی خیریت نہیں ہے۔

چنانچہ وسائل الشیعہ جلد ۱ صفحہ ۳۲۷ میں ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا تین چیزیں بروز قیامت خدا عزوجل سے مسلمانوں کی شکایت کریں گی:

اوّل وہ مسجد جو بیکار پڑی رہتی ہو اور لوگوں نے اسے چھوڑ رکھا ہو کہ نہ اس میں نماز پڑھتے ہوں نہ اس کو آباد رکھتے ہوں۔

دوسرے وہ عالم جو جاہلوں کے درمیان ہو اور وہ لوگ اس سے نہ علوم حاصل کرتے اور نہ مسائل پوچھتے ہوں۔

تیسرا کلام مجید جو الماری میں یا طاق پر رکھا رہتا ہو اور وہ لوگ نہ اس کی تلاوت کرتے ہوں نہ اس کے احکام پر عمل کرتے ہوں۔

اور جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا ہے کہ بروز قیامت تین چیزیں خدا کی درگاہ میں فریاد کرتی ہوئی آئیں گی: ایک قرآن مجید، دوسرے مسجد، تیسرے عترتِ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ قرآن مجید تو کہے گا کہ اے خدا ان مسلمانوں نے مجھے جلایا (بقیہ صفحہ مابعد)

اُوْصِيْكُمْ بِتَقْوَى اللهِ الَّذِيْٓ اَعْذَرَ بِمَآ اَنْذَرَ، وَ احْتَجَّ بِمَا نَهَجَ، وَ حَذَّرَكُمْ عَدُوًّا نَّفَذَ فِي الصُّدُوْرِ خَفِيًّا، وَ نَفَثَ فِي الْاٰذَانِ نَجِيًّا، فَاَضَلَّ وَ اَرْدٰى، وَ وَعَدَ فَمَنّٰى، وَ زَيَّنَ سَيِّئَاتِ الْجَرَآئِمِ، وَ هَوَّنَ مُوْبِقَاتِ الْعَظَآئِمِ، حَتّٰٓى اِذَا اسْتَدْرَجَ قَرِيْنَتَهٗ، وَ اسْتَغْلَقَ رَهِيْنَتَهٗ، اَنْكَرَ مَا زَيَّنَ، وَ اسْتَعْظَمَ مَا هَوَّنَ، وَ حَذَّرَ مَآ اَمَّنَ.

[وَ مِنْهَا: فِيْ صِفَةِ خَلْقِ الْاِنْسَانِ]

(بھائیو!) میں تمہیں اس خدا سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں جس نے تمہیں ڈرا کر عذر رفع کر دیا اور اس چیز سے حجت قائم کر دی جو روشن اور واضح ہے اور اس دشمن (شیطان) سے خوفزدہ کر دیا ہے جو سینوں میں چھپ کر گھس گیا ہے اور جس نے راز دار بن کر کانوں میں (بری باتیں) پھونک دی ہیں تو (اس طرح) اس نے (لوگوں کو) گمراہ اور ہلاک کر دیا اور وعدہ کر کے آرزومند کر دیا اور گناہوں کی برائیوں کو خوبصورت کر دکھایا اور بڑے ہلاک کرنے والے جرموں کو آسان بنا دیا ہے یہاں تک کہ جب اس نے اپنے چیلے (نفس انسانی) کو آہستہ آہستہ کھینچ لیا اور اپنے گرفتار کو (اپنے پاس) بند کر لیا تو اس چیز سے اجنبی بن گیا جس کو خود آراستہ کیا تھا اور اس چیز کو بڑی سمجھا دیا جس کو خود ہلکی کیا تھا اور اس چیز سے ڈرایا جس سے خود امن دیا تھا۔

اور اسی خطبہ کا ایک حصّہ انسان کی پیدائش کے بیان میں ہے۔[1]

(بقیہ صفحہ ماقبل) اور پارہ پارہ کیا اور مسجد شکایت کرے گی کہ اے خدا ان لوگوں نے مجھے بیکار چھوڑ رکھا اور میری نگرانی و آبادی کے حقوق ضائع کر دیے، اور اہل بیتؑ شکایت کریں گے کہ اے خدا مسلمانوں نے ہم لوگوں کو قتل کیا، آوارہ وطن کیا، قید کر کے مختلف شہروں، بیابانوں، جنگلوں، گلیوں، کوچوں میں پھرایا۔ اور یہ تینوں چیزیں خدا کی درگاہ میں اپنا انتقام چاہنے کے لیے اصرار کریں گی تو خدا فرمائے گا، یہ شکایتیں مجھے ان لوگوں سے ہیں اور یہ سب ذلتیں انہوں نے میری کیں اور میں ان سب سے عوض لوں گا۔

[1] اس فصل کا مدار انسان کی حالت پر ہے جس میں حضرتؑ نے اس کے کل احوال ابتدائے ولادت سے انتہا تک بیان فرمایا ہے کہ پہلے وہ کس قدر حقیر، ذلیل اور ناقص تھا اور خدا نے کس طرح اس کو آہستہ آہستہ نطفہ سے علقہ، پھر علقہ سے جنیں، پھر جنیں سے شیر خوار بچہ، پھر بچہ سے لڑکا، پھر جوان بنایا، باوجود اس کثرت سے نعماتِ خدا اور تفضلاتِ الٰہی کے انسان اپنے کو بھول جاتا، اپنے خالق کی مرضی کے خلاف مرتکب ہوتا اور شیطان کی پیروی کرنے لگتا ہے حالانکہ تھوڑی ہی مدت کے بعد وہ موت کے پنجا میں گرفتار ہو کر قبر کا لقمہ ہو جائے گا مگر کسی طرح متنبہ نہیں ہوتا اور اپنی سرکشی سے باز نہیں آتا ہے۔

اَمْ هٰذَا الَّذِیْۤ اَنْشَاْتَهٗ فِیْ ظُلُمٰتِ الْاَرْحَامِ، وَ شُغُفِ الْاَسْتَارِ، نُطْفَةً دِهَاقًا، وَ عَلَقَةً مُّحَاقًا، وَ جَنِیْنًا وَّ رَاضِعًا، وَ وَلِیْدًا وَّ یَافِعًا. ثُمَّ مَنَحْتَهٗ قَلْبًا حَافِظًا، وَ لِسَانًا لَّافِظًا، وَ بَصَرًا لَّاحِظًا، لِیَفْهَمَ مُعْتَبِرًا، وَ یُقَصِّرَ مُزْدَجِرًا.

کیا یہی (انسان) ہے جس کو (خدا نے) رحموں کی تاریکیوں اور پردوں کی جھلیوں میں پیدا کیا، جو اچھلتا ہوا نطفہ اور مٹا ہوا علقہ اور پھر جنین، پھر شیر خوار، پھر بچہ، پھر بالغ لڑکا بنا۔ نیز (خدا نے پیدا کرنے کے علاوہ) اس کو یاد رکھنے والا دل (و دماغ) اور بولنے والی زبان اور دیکھنے والی آنکھ مرحمت فرمائی تا کہ وہ عبرت حاصل کر کے سمجھے اور منزجر ہوتا ہوا گناہوں سے باز رہے۔

حَتّٰۤی اِذَا قَامَ اعْتِدَالُهٗ، وَ اسْتَوٰی مِثَالُهٗ، نَفَرَ مُسْتَكْبِرًا، وَ خَبَطَ سَادِرًا، مَاتِحًا فِیْ غَرْبِ هَوَاهُ، كَادِحًا سَعْیًا لِّدُنْیَاهُ، فِیْ لَذَّاتِ طَرَبِهٖ، وَ بَدَوَاتِ اَرَبِهٖ، لَا یَحْتَسِبُ رَزِیَّةً، وَ لَا یَخْشَعُ تَقِیَّةً، فَمَاتَ فِیْ فِتْنَتِهٖ غَرِیْرًا، وَ عَاشَ فِیْ هَفْوَتِهٖ

یہاں تک کہ جب اس کے اعضاء کا اعتدال قائم ہو گیا اور اس کا ڈھانچہ درست ہو گیا تو اپنے ہوا و ہوس کے بڑے ڈول میں پانی کھینچتا ہوا [1] اور اپنی خوشی کی لذتوں اور اپنی آرزوؤں کی ابتداؤں [2] میں اپنی دنیا کے لیے محنت شاقہ اور کدو کاوش کرتا ہوا متکبر بن کر سرکش ہو گیا اور بے باک ہو کر بہک گیا۔ اب وہ کسی مصیبت کا گمان ہی نہیں کرتا اور کسی خوفناک امر سے ڈرتا ہی نہیں ہے۔ [3]

---

[1] یعنی جس طرح دنیا میں انسان اپنی پیاس کے وقت بڑے شوق سے ڈول سے پانی کھینچتا ہے تا کہ اس سے اپنی تشنگی کو بجھائے اور اپنے جگر کو ٹھنڈا کرے اسی طرح نافرمان بندے احکام خدا کی مخالفت اور اپنی شہوت کی تکمیل میں ہر شیطانی حرکت پر کشادہ دلی سے آمادہ ہو جاتے اور پورے انہماک سے اس میں گھس جاتے ہیں۔ غرض اپنی ہوا و ہوس نفسانی اور دنیا پرستی کے جوش میں وہ خدا کے احکام، رسولؐ کی اطاعت، آخرت کے سامان کا ذرہ برابر خیال نہیں کرتے بلکہ وہی کرتے ہیں جس کو اپنے لیے باعث راحت اور سبب عافیت و ذریعہ لذت پاتے ہیں جس سے ان کا دل خوش ہوتا ہے، جس سے ان کی تن پروری ہوتی ہے اور جس سے دنیا کا مزہ ملتا ہے۔

[2] ''بَدَوَاتٌ''، جمع ہے بَدَاءَۃٌ کی اور اس کا معنی ابتدا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ اس کے خیال میں جو بات پیدا ہوتی ہے اور جس امر پر اس کی رائے ظاہر ہوتی ہے اور رغایب دنیا سے جس امر کی طرف توجہ ہو جاتی ہے اس کے کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے اور اس کا ذرہ برابر بھی خیال نہیں کرتا کہ وہ جس مذہب کا تابع اور جس شریعت کا پابند ہے اس کے کچھ احکام ان کاموں کے متعلق ہیں یا نہیں، اگر ہیں تو اس کا فعل ان کے مطابق ہو رہا ہے یا مخالف۔

[3] یعنی جب دل میں کوئی خیال پیدا ہوا اور کسی بڑے کام کی طرف نفس کو توجہ ہوئی تو پھر وہ خدا سے کسی قسم کا خوف نہیں کرتا اور اس کام کے کرنے سے دنیا یا آخرت میں اس کو جس مصیبت کا سامنا کرنا ہوگا یا جس عذاب میں مبتلا ہونا پڑے گا اس کے (بقیہ صفحہ مابعد)

يَسِيْرًا، لَمْ يُفِدْ عِوَضًا، وَ لَمْ يَقْضِ مُفْتَرَضًا.

تو وہ فریب کھا کر مر گیا[1] اور اپنی غلطیوں میں تھوڑی سی زندگی بسر کر دی۔ نہ تو کسی عوض کو حاصل کیا اور نہ کسی فریضہ کو ادا کیا۔

دَهِمَتْهُ فَجَعَاتُ الْمَنِيَّةِ فِيْ غُبَّرِ جِمَاحِهٖ، وَ سَنَنِ مِرَاحِهٖ، فَظَلَّ سَادِرًا، وَ بَاتَ سَاهِرًا، فِيْ غَمَرَاتِ الْاٰلَامِ وَ طَوَارِقِ الْاَوْجَاعِ وَ الْاَسْقَامِ، بَيْنَ اَخٍ شَقِيْقٍ، وَ وَالِدٍ شَفِيْقٍ، وَ دَاعِيَةٍ بِالْوَيْلِ جَزَعًا، وَ لَادِمَةٍ لِّلصَّدْرِ قَلَقًا. وَ الْمَرْءُ فِيْ سَكْرَةٍ مُّلْهِيَةٍ، وَ غَمْرَةٍ كَارِثَةٍ، وَ اَنَّةٍ مُّوْجِعَةٍ، وَ جَذْبَةٍ مُّكْرِبَةٍ وَّ سَوْقَةٍ مُّتْعِبَةٍ.

(کہنا گاہ) اس کی بقیہ سرکشی اور اس کے عیش وعشرت کی راہوں میں موت کی مصیبتوں نے اسے آ پکڑا تو وہ رنجوں کی غفلتوں اور دردوں نیز بیماریوں کی آفتوں میں حقیقی (مہربان) بھائی، شفیق باپ اور جزع وفزع سے واویلا کرنے والی اور قلق سے سینہ پیٹنے والی کے درمیان حیران اور سرگرداں ہو گیا اور جگتا ہوا شب بسر کر دی حالانکہ یہ شخص بہت غافل کر دینے والی بے ہوشی اور چور کر دینے والی مصیبت اور درد انگیز نالہ اور کرب پہنچانے والی قبض روح اور تکلیف دینے والے (روح کے نکلنے اور اس کے) کھچاؤ میں (مبتلا) تھا۔[2]

(بقیہ صفحہ ماقبل) طرف سے بالکل آنکھ بند کر لیتا اور دل ودماغ کو پھیر لیتا ہے۔ گویا احکام خدا کو کوئی چیز ہی نہیں سمجھتا، احکام شریعت کی کوئی پرواہ ہی نہیں کرتا۔ مرنے کے بعد حساب دینے کی کوئی حقیقت ہی نہیں خیال کرتا اور عذاب جہنم اور اس کی اذیتوں کا اسے کچھ تصور ہی نہیں ہوتا ہے پس ایسے شخص یا تو انتہا درجہ کا سرکش ہوگا یا حد درجہ کا بے پروا یا اوّل درجہ کا لامذہب۔

[1] ''مَاتَ فِيْ فِتْنَتِهٖ'' سے اس مقام تک حضرتؑ اس شخص کی آخری زندگی کی حالت بیان فرماتے ہیں کہ وہ اپنے جوانی کے نشہ یا دنیاوی زندگی کے دھوکہ میں پڑا رہا اپنے نفع کی کوئی بات حاصل نہیں کی اور احکام خدا کو سمجھ کر اپنے واجبات ادا نہیں کیے کہ اس کی اسی حالت غفلت ولا پرواہی میں اسے امراض نے گھیر لیا۔ درد واذیت اور آلام وہموم نے اس پر ہجوم کیا تو گو اس کے مہربان بھائی بند شفیق والدین رونے والی ماں بہنیں اور بی بی تک موجود ہیں مگر موت اسے آ ہی گئی اور اس نے اس کو اپنا شکار بنا ہی لیا ایسی حالت میں کہ وہ سکرات موت کی بے ہوش کرنے والی اور بے حواس رکھنے والی سختیوں اور امیدوں، آرزوؤں، تمناؤں کی قطع کر دینے والی شدتوں میں مبتلا ہو گیا ہے۔ ہاتھ پاؤں مارتا ہے مگر اسے خبر نہیں ہوتی جان کنی کا کرب پیدا ہوتا ہے لیکن وہ اپنی غفلت میں پڑا ہوا ہے۔

[2] ''غَمْرَةٌ'' کا معنی وہ شدت اور سختی ہے جو انسان کی عقل اور حواس کا احاطہ کر کے ان کو معطل اور بے کار کر دے اور ''كَارِثَةٌ'' کا معنی امیدوں کا قطع کر دینے والا ہے تو ''سَكْرَةٍ مُّلْهِيَةٍ، وَ غَمْرَةٍ كَارِثَةٍ'' کا معنی ایسی سختی جو بدحواس کر دینے والی ہو اور ایسی آفت جو شاق ہو۔ عرب لوگ بولتے ہیں۔ ''كَرَثَهُ الْغَمُّ وَ اَكْرَثَهٗ'' یعنی غم والم نے اس کو سخت تکلیف اور مشقت میں (بقیہ صفحہ مابعد)

ثُمَّ اُدْرِجَ فِیْۤ اَكْفَانِهٖ مُبْلِسًا، وَ جُذِبَ مُنْقَادًا سَلِسًا، ثُمَّ اُلْقِیَ عَلَى الْاَعْوَادِ رَجِیْعَ وَصَبٍ، وَ نِضْوَ سَقَمٍ، تَحْمِلُهٗ حَفَدَةُ الْوِلْدَانِ، وَ حَشَدَةُ الْاِخْوَانِ، اِلٰى دَارِ غُرْبَتِهٖ، وَ مُنْقَطَعِ زَوْرَتِهٖ.

حَتّٰۤى اِذَا انْصَرَفَ الْمُشَیِّعُ، وَ رَجَعَ الْمُتَفَجِّعُ اُقْعِدَ فِیْ حُفْرَتِهٖ نَجِیًّا، لِبَهْتَةِ السُّؤَالِ، وَ عَثْرَةِ الْاِمْتِحَانِ. وَ اَعْظَمُ مَا هُنَالِكَ بَلِیَّةً نُزُوْلُ الْحَمِیْمِ، وَ تَصْلِیَةُ

پھر (دنیا کے مزوں سے) مایوس ہوکر وہ اپنے کفنوں میں لپیٹ دیا گیا اور بے بس ہوکر نرمی سے (آخرت کی طرف) کھینچ لیا گیا۔ اس کے بعد وہ (جنازے کے) تختوں پر ڈال دیا گیا اس حالت میں کہ اپنے دکھ سے شکستہ حال اور بیماری سے لاغر ہوگیا۔[1] اس کو خدمت کرنے والی اولاد اور مستعد (خبر گیری کرنے والے) بھائی بند اُٹھا کر اس کی مسافرت کے گھر اور اس سے ملاقات موقوف ہونے کی جگہ لے جارہے تھے۔

یہاں تک کہ جب مشایعتِ جنازہ کرنے والے واپس آگئے اور رونے پیٹنے والے پلٹ آئے تو وہ اپنے گڑھے میں بٹھا دیا گیا تاکہ (نکیرین کے) سوال کی دہشت اور امتحان کی لغزش میں آہستہ آہستہ جواب دے۔ اور اس وقت (قبر کی) سب سے بڑی مصیبت بھلستے پانی

(بقیہ صفحہ مابعد) ڈال دیا ہے اور ''جَذْبَةٍ'' سے مراد ملک الموت فرشتہ کا انسان کے بدن سے روح کو کھینچنا ہے اور روح نکلتے وقت انسان کو جو اذیت اور کرب ہوتا ہے وہ واضح ہے اس وجہ سے فرمایا ''جَذْبَةٍ مُّكْرِبَةٍ'' یعنی کرب دینے والا قبض روح اور ''سَوْقَةٍ'' معنی ہانکنا، لے چلنا ہے، یہاں روح کا بدن سے نکلنا مراد ہے۔ تو حضرتؑ نے یہاں دو حالتیں ذکر فرمائی ہیں ایک ''جَذْبَةٍ مُّكْرِبَةٍ'' اور دوسری ''سَوْقَةٍ مُّتْعِبَةٍ'' دونوں ایک ہی بات نہیں ہیں بلکہ فرق ہوسکتا ہے اور وہ یہ کہ ''جَذْبَةٍ مُّكْرِبَةٍ'' علت قرار پائے اور ''سَوْقَةٍ مُّتْعِبَةٍ'' معلول سمجھا جائے یعنی ملک الموت کا روح کو کھینچنا تو ''جَذْبَةٍ مُّكْرِبَةٍ'' ہو اور ان کے روح کو کھینچنے سے جب روح بدن انسانی کو چھوڑنے اور اس سے علیحدہ ہونے لگے تو یہ ''سَوْقَةٍ مُّتْعِبَةٍ'' ہو۔

[1] مفتی محمد عبدہ مصری لکھتے ہیں:

وَالرَّجِیْعُ مِنَ الدَّوَابِّ، مَا رَجَعَ بِهٖ مِنْ سَفَرٍ اِلٰى سَفَرٍ وَهُوَ الْكَالُّ۔

یعنی رجیع وہ جانور ہے جو ایک سفر سے دوسرے سفر کی طرف پلٹے تو تھک جائے۔

پس مقصود یہ ہے کہ یہ شخص چونکہ حالت مرض سے گزر کر موت کی طرف آرہا ہے لہٰذا اچھی طرح چور اور اپنی بیماریوں سے خوب نڈھال ہوگیا۔

الْجَحِيْمِ، وَ فَوْرَاتُ السَّعِيْرِ، وَ سَوْرَاتُ الزَّفِيْرِ، لَا فَتْرَةٌ مُّرِيْحَةٌ، وَ لَا دَعَةٌ مُّزِيْحَةٌ، وَ لَا قُوَّةٌ حَاجِزَةٌ، وَ لَا مَوْتَةٌ نَّاجِزَةٌ، وَ لَا سِنَةٌ مُّسَلِّيَةٌ، بَيْنَ اَطْوَارِ الْمَوْتَاتِ، وَ عَذَابِ السَّاعَاتِ! اِنَّا بِاللّٰهِ عَآئِذُوْنَ!.

کی ضیافت[1] اور جہنم میں (اس کا) ڈھکیل دیا جانا اور (دوزخ کے) بھڑکنے کے جوش اور (اس کے) خروش کی تیزیاں ہوتی ہیں کہ (اب) حالات مرگ اور عذاب قیامت کے درمیان (اس شخص کے لیے) نہ آرام دینے والا وقفہ ہے اور نہ تعب کرنے والی آسایش اور نہ (اس عذاب کی) روکنے والی قوت اور نہ (اس اذیت کی) جلد ختم کرنے والی موت اور نہ بھلا دینے والی نیند (جو اذیتوں کو بھلا کر آرام دیتی ہے) یقیناً ہم سب خدا ہی سے پناہ چاہتے ہیں (کہ ان عذابوں سے بچائے)۔

---

[1] علامہ ابن ابی الحدید اس جملہ کی شرح میں لکھتے ہیں کہ ''یہ کلام اس امر میں تصریح ہے کہ انسان کو مرنے کے بعد قبر میں بھی عذاب ہوگا جس کے بارے میں بہت کثرت سے احادیث جناب رسالت مآبؐ وارد ہیں۔ اگر کوئی کہے کہ جب سزا اور جزا کی جگہ خدا نے قیامت کو قرار دیا ہے تو پھر عذاب قبر کیسا جو دنیا ہی کی جگہ ہے؟ تو جواب دیا جائے گا کہ بے شک حقیقی اور پوری جزا و سزا کی جگہ آخرت ہی ہے مگر جس طرح بعض گناہوں کی خفیف سزا انسان کو دنیا میں بھی مل جاتی ہے (اگرچہ اس کی پوری سزا آخرت ہی میں ملے گی) اسی طرح انسان کو قبر میں بھی کچھ عذاب کر دیا جائے گا بشرطیکہ اس کے اعمال اس کو جہنم کا مستحق ٹھہراتے ہوں۔

وَ قَدْ رُوِیَ فِی الْمَسْاَلَةِ فِی الْقَبْرِ اَخْبَارٌ کَثِیْرَةٌ۔

یعنی قبر کے اندر منکر اور نکیر کے مُردوں سے سوال کرنے اور امتحان لینے کے متعلق بہت کثرت سے حدیثیں وارد ہوئی ہیں۔

مذہب شیعہ میں بھی قبر کا سوال اور اس کا عذاب ثابت ہے۔ اسی وجہ سے مردوں کو قبر میں رکھنے کے بعد تلقین پڑھی جاتی اور عقائد حقہ پر ان کو متنبہ کر دیا جاتا ہے کہ منکر و نکیر کی ہیبت ناک صورت دیکھ کر مُردے مرعوب نہ ہو جائیں اور ان کے سوالوں سے گھبرا کر غلط جواب نہ دے دیں۔ چنانچہ حضرت امیر المومنینؑ کی والدہ ماجدہ جناب فاطمہ بنت اسد نے انتقال فرمایا تو خود حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ کو تلقین پڑھی تھی اور جب فرشتوں نے حضرت فاطمہؑ سے دریافت کیا کہ ''مَنْ اِمَامُکِ'' تمہارا امام کون ہے تو آنحضرتؐ نے فرمایا:

اِبْنُکِ اِبْنُکِ اِبْنُکِ عَلِیٌّ لَا جَعْفَرٌ وَلَا عَقِیْلٌ۔

یعنی تمہارا امام تمہارا فرزند ہے، تمہارا فرزند ہے یعنی تمہارا فرزند علیؑ، نہ جعفر و عقیل۔

چنانچہ یہ واقعہ حضرات اہل سنت کی کتب معتبرہ مثلاً علامہ الشیخ ابوعلی المرزوقی کی کتاب الامکنہ والازمنہ مطبوعہ ریاست حیدرآباد دکن میں بھی موجود ہے۔

عِبَادَ اللّٰهِ! اَيْنَ الَّذِيْنَ عُمِّرُوْا فَنَعِمُوْا، وَ عُلِّمُوْا فَفَهِمُوْا، وَ انْظِرُوْا فَلَهُوْا، وَ سَلِمُوْا فَنَسُوْا؟ اُمْهِلُوْا طَوِيْلًا، وَ مُنِحُوْا جَمِيْلًا، وَ حُذِّرُوْا اَلِيْمًا، وَ وُعِدُوْا جَسِيْمًا! احْذَرُوا الذُّنُوْبَ الْمُوَرِّطَةَ، وَ الْعُيُوْبَ الْمُسْخِطَةَ.

بندگانِ خدا! (دیکھوتو) وہ لوگ کہاں ہیں جن کو بڑی عمریں دی گئیں تو نعمتوں میں گزارتے رہے اور تعلیم دیے گئے تو خوب سمجھے اور جنہیں مہلت دی گئی تو غافل ہو گئے اور سلامتی مرحمت کی گئی تو (موت کو) بھول بیٹھے۔ ان کو مدت دراز تک مہلت دی گئی اور عمدہ بخشش عنایت ہوئی اور وہ دردناک عذاب سے ڈرائے گئے اور بڑے ثواب کے وعدے دیے گئے؟ (تو ان کے انجام سے عبرت حاصل کر کے) تم ہلاک کرنے والے گناہوں اور خدا کو غضب میں لانے والے عیبوں سے بچو۔

اُولِي الْاَبْصَارِ وَ الْاَسْمَاعِ، وَ الْعَافِيَةِ وَ الْمَتَاعِ! هَلْ مِنْ مَّنَاصٍ اَوْ خَلَاصٍ، اَوْ مَعَاذٍ اَوْ مَلَاذٍ، اَوْ فِرَارٍ اَوْ مَحَارٍ! اَمْ لَا؟ ﴿فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ﴾! اَمْ اَيْنَ تُصْرَفُوْنَ! اَمْ بِمَاذَا تَغْتَرُّوْنَ؟ وَ اِنَّمَا حَظُّ اَحَدِكُمْ مِنَ الْاَرْضِ،

اے آنکھوں، کانوں، عافیت اور مال و متاع والو![1] (بتاؤ تو خدا سے) بچنے یا چھوٹنے یا پناہ لینے یا آڑ پکڑنے یا بھاگنے یا پھر جانے کی کوئی جگہ ہے یا نہیں؟ (یقیناً نہیں ہے) تو تم کہاں بہکے جاتے یا کدھر پھرے جاتے ہو یا کس دھوکے میں پڑے ہو؟ حالانکہ اس لمبی چوڑی زمین میں تم میں سے ہر شخص کا حصہ اس کے قدر ہی

---

[1] پہلے حضرتؑ نے بندوں کو خطاب کر کے پکار لیا اور فرما دیا تھا کہ ''عِبَادَ اللّٰهِ! اَيْنَ الَّذِيْنَ'' الخ اب یہاں دوبارہ انہیں پکار کر خطاب فرماتے ہیں کہ اے وہ لوگو جنہیں خداوند عالم نے آنکھ بھی دی ہے تاکہ دنیا کے حوادث کا خود مشاہدہ کرتے رہیں اور کان بھی دیے ہیں تاکہ سابق زمانہ کے لوگوں کے تذکرے سنیں۔ دنیا میں انہیں عافیت بھی دی ہے تاکہ اطمینان سے احکام خدا کے مطابق یہاں کی زندگی بسر کریں اور مال و متاع بھی دیا ہے تاکہ یہاں کی ضروریات میں خرچ کریں اور راہ خدا میں بھی صَرف کر کے ذخیرۂ آخرت مہیا کریں۔ اس کے بعد ان لوگوں سے دریافت فرماتے ہیں کہ دیکھو کوئی جگہ ایسی ہے جہاں تم جاؤ تو خدا کے حساب اور عقاب سے تمہارا چھٹکارا ہو سکے یا کوئی جگہ بچاؤ کی ہے یا اس کے سوا کوئی پناہ دینے والا ہے یا کوئی چھپنے کا مقام مل سکتا ہے یا بھاگنے اور پلٹ جانے کی صورت ممکن ہے؟ سب کا جواب یہی ہے کہ نہیں۔ چنانچہ خدا بھی کلام مجید سورۂ ص، کی ابتدا میں ارشاد فرماتا ہے:

﴿فَنَادَوْا وَّ لَاتَ حِيْنَ مَنَاصٍ﴾ (سورۂ ص، آیہ ۳)

یعنی وہ بہت چیخے چلائے مگر کوئی بچاؤ کی صورت نہیں ہے۔

ذَاتِ الطُّوْلِ وَ الْعَرْضِ، قِيْدُ قَدِّهٖ، مُتَعَفِّرًا عَلٰى خَدِّهٖ!.

اَلْاٰنَ عِبَادَ اللّٰهِ! وَ الْخِنَاقُ مُهْمَلٌ، وَ الرُّوْحُ مُرْسَلٌ، فِيْ فَيْنَةِ الْاِرْشَادِ، وَ رَاحَةِ الْاَجْسَادِ، وَ بَاحَةِ الْاِحْتِشَادِ، وَ مَهَلِ الْبَقِيَّةِ، وَ انُفِ الْمَشِيَّةِ، وَ اِنْظَارِ التَّوْبَةِ، وَ انْفِسَاحِ الْحَوْبَةِ قَبْلَ الضَّنْكِ وَ

کے برابر ہے جس پر وہ اپنے رخسارہ کے بل خاک آلودہ پڑ جائے گا۔

(تو) اے بندگانِ خدا! اب بھی (ہوشیار ہو کر عمل کر لو) کہ ابھی (تمہارے گردن کی) رسی کھلی ہوئی (یعنی موت گل وگیر نے تمہیں چھوڑ رکھا) اور تمہاری روح کو رہائی حاصل ہے۔[1] (اس) ہدایت پا جانے کے موقع اور بدنوں کے آرام اور (ایک دوسرے کی مدد کے لیے) اکٹھے ہو جانے کے میدان اور بقیہ زندگی کی تاخیر اور اختیار کی ابتدا اور توبہ کر لینے کی مہلت اور زمانۂ حاجت کی وسعت میں[2] (نیز) پریشان حالی اور مکان تنگ (قبر)[3] اور

---

[1] یعنی ابھی تمہاری قوت زائل نہیں ہوئی اور اختیار سلب نہیں کیا گیا ہے بلکہ ہر طرح آزاد اور صاحب اختیار ہو تو یہاں اعمال خیر بجالاؤ اور آخرت کا سامان مہیا کر لو کہ یہ وقت غنیمت ہے۔

[2] مقصود یہ ہے کہ ابھی تم لوگوں کو دنیا کی ہر عافیت اور تمام اختیارات واقتدارات حاصل ہیں؟ ہدایت یافتہ ہو جانے کا وقت بھی ہے، بدنوں کو راحت بھی ہے۔ ایسی حالت بھی ہے کہ بہت سے لوگ جمع ہو کر ایک دوسرے کی اعانت کریں اور امور خیر میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں۔ ابھی دنیا میں رہنے کی مہلت بھی حاصل ہے، گناہوں سے توبہ کر لینے کا موقع بھی دے دیا گیا ہے، حاجت یا حالت کا زمانہ بھی وسیع ہے۔

[3] یعنی قبل اس کے کہ تمہاری حالت تنگ ہو، اختیارات زائل ہونے لگیں، موت آنے لگے قبر میں جانے لگو، وہاں کا خوف پیدا ہو اور تم کھلنے لگو اور قبل اس کے کہ ان سب باتوں کے بعد موت بھی پہنچ جائے اور خدائے قہار کے حکم سے ملک الموت کے پنجہ میں بھی تم آجاؤ کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ آخر میں علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام کے جملے هَلْ مِنْ مَّنَاصٍ اَوْ خَلَاصٍ، اَوْ مَعَاذٍ اَوْ مَلَاذٍ، اَوْ فِرَارٍ اَوْ مَحَارٍ۔

کس قدر خوبصورت (اور مسجّع) ہیں اسی وجہ سے تو علامہ جعفر بن یحیی جو نہایت فصیح شخص تھا، حضرت علیؑ کو فصیح قریش کہتا تھا اور ہمیں تو اس میں بھی شک نہیں ہے کہ حضرت علیؑ ابتدا سے انتہا تک کل اہل عرب سے زیادہ فصیح وبلیغ تھے۔ سوا قرآن مجید کے کوئی کلام حضرتؑ کے کلام کا مقابلہ نہیں کر سکتا ہے اور فصاحت وبلاغت کی جس قدر خوبیاں حضرتؑ کے کلام میں ہیں وہ کسی اور کے کلام میں ہرگز نہیں ہیں۔

اگر حضرتؑ نے کوشش کر کے یہ صنائع وبدایع بھر دیے ہیں تو عجیب کمال کا ہنر دکھایا اور واجب ہے کہ فنفصاحت وبلاغت کے بھی آپ ہی امام تسلیم کیے جائیں اور اگر بغیر ارادہ وکوشش یہ خوبیاں جمع ہو گئیں تو اور بھی حیرت انگیز ہیں کہ فصحاء (بقیہ صفحہ مابعد)

الْمَضِيْقِ، وَ الرَّوْعِ وَ الزُّهُوْقِ، وَ قَبْلَ قُدُوْمِ الْغَآئِبِ الْمُنتَظَرِ، وَ اِخْذَةِ الْعَزِيْزِ الْمُقْتَدِرِ.

(قَالَ السَّيِّدُ الرَّضِيُّ عَلَيْهِ الرَّحْمَةُ)

وَ فِي الْخَبَرِ: اَنَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ لَمَّا خَطَبَ بِهٰذِهِ الْخُطْبَةِ اقْشَعَرَّتْ لَهَا الْجُلُوْدُ، وَ بَكَتِ الْعُيُوْنُ، وَ رَجَفَتِ الْقُلُوْبُ. وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يُّسَمِّيْ هٰذِهِ الْخُطْبَةَ: ''الْغَرَّآءَ''.

خوف و اضمحلال کے قبل اور (موت) جو (اس وقت) غائب (ہے اور) جس کا انتظار کیا جارہا ہے اس کے آدھمکنے اور غالب قدرت والے (خدا) کی پکڑ سے پہلے (اپنا سامان آخرت کرلو)

[جناب سید رضی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ]

روایت میں وارد ہوا ہے کہ جس وقت حضرت علیہ السلام نے یہ خطبہ ارشاد فرمایا تو اس (کے سننے) سے لوگوں کے رونگٹے کھڑے اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور ان کے دل دھڑکنے لگے اور بہت سے لوگ اس کو خطبۂ ''غراء'' کہتے ہیں۔

❁ خطبہ: ۸۲ ❁

وَ مِنْ كَلَامٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِيْ ذِكْرِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ:

خطبہ (۸۲)

حضرت علیہ السلام کے ایک کلام کا کچھ حصّہ عمرو بن العاص کے بیان میں۔[1]

(بقیہ صفحہ ماقبل) کوشش کر کے اور مدۃ العمر ریاضت کر کے بھی آپ کی گرد تک نہیں پہنچنے پاتے ہیں۔ کیا خوب معاویہ نے کہا جب اس کے پاس محقن ضبی نے آ کر کہا:

جِئْتُكَ مِنْ عِنْدِ اَعْيَا النَّاسِ۔

اے معاویہ میں تیرے پاس اس شخص کے پاس سے آیا جو بولنا نہیں جانتا۔

تو معاویہ نے خوب جواب دیا:

يَابْنَ اللَّخْنَاءِ، اَلِعَلِيٍّ تَقُوْلُ هٰذَا؟! وَهَلْ مَا سَنَّ الْفَصَاحَةَ لِقُرَيْشٍ غَيْرُهٗ۔

اے حرام زادے تو علیؑ کے بارے میں یہ کہتا ہے؟ بتا تو فصاحت و بلاغت میں قریش کا استاد علی کے سوا کوئی ہوا ہے؟

پھر علامہ لکھتے ہیں کہ کسی اندھے کو یہ بتانا بہت مشکل ہے کہ آفتاب روشن ہے بلکہ بتانے والے ہی کو اس میں زحمت شاقہ ہوگی۔ (شرح نہج البلاغہ مطبوعہ مصر جلد ۲ صفحہ ۹۹)

[1] اس خطبہ میں حضرتؑ نے عمرو بن العاص کا ذکر کیا ہے جس کے بڑے کارناموں سے اسلامی تاریخ بھری پڑی ہے۔ مگر حضرتؑ نے اس کے باپ کا نام نہیں لیا بلکہ ابن نابغہ کہا اور نابغہ اس کی ماں کا نام تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نابغہ ایک رنڈی تھی جس (بقیہ صفحہ مابعد)

عَجَبًا لِّابْنِ النَّابِغَةِ! يَزْعُمُ لِاَهْلِ الشَّامِ اَنَّ فِیَّ دُعَابَةً، وَ اَنِّیْ امْرُؤٌ تِلْعَابَةٌ:

فرزند نابغہ سے نہایت حیرت ہے کہ وہ شام والوں کو یہ وہم دلاتا ہے کہ مجھ میں مذاق (کی عادت) ہے اور یہ کہ میں دل لگی اور کھیل کرنے والا آدمی ہوں،[1] اسی

(بقیہ صفحہ ماقبل) سے ایک ہی زمانہ میں ابولہب، دامیہ بن خلف، ابوسفیان، وعاص بن وائل نے زنا کیا۔ ان کے نطفہ سے عمرو پیدا ہوا تو لوگوں نے نابغہ سے پوچھا بتا یہ کس کے نطفہ سے ہے؟ اس نے کہا ان سب نے میرے ساتھ ایسا کیا جس سے زیادہ صورت ملتی ہو اسی کا سمجھ لو۔ عاص سے زیادہ صورت مل گئی تو اسی کا بیٹا سمجھا جانے لگا۔ (تاریخ ابوالفداء صفحہ ۱۸۸ ج ۱، وانسان العیون حلبی ومستطرف جلد اول صفحہ ۱۷۱۔ وثمرۃ الاوراق جلد اول صفحہ ۴۴ وشرح ابن ابی الحدید مطبوعہ مصر جلد ۲ صفحہ ۱۰۰)

اللہ اکبر حضرت امیر المومنینؑ کس درجہ سچ بولنے کے پابند تھے کہ چونکہ آپ کو معلوم تھا عمرو عاص صرف عاص کا بیٹا نہیں ہے لہٰذا حضرتؑ نے عمرو کے باپ کا نام ہی نہیں لیا بلکہ ماں کا ذکر فرمایا جو یقینی تھی۔

[1] علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ عمرو عاص نے جو کہا کہ علیؑ میں مزاح ہے اور اس سے اس کا مقصود حضرتؑ کی عیب جوئی تھا تو اس کی اصلی ابتدا حضرت عمر خلیفہ دوم نے کی کہ کہا حضرت علیؑ میں مزاح ہے۔ پھر لوگوں نے عمر کی اس بات کو لے لیا اور آپؑ کے دشمنوں نے اسے آپؑ کا ایک عیب قرار دے کر آپؑ پر اعتراض کرنا شروع کیا۔ جب عمر مرنے لگے تو لوگوں نے خواہش کی کہ آپ کسی کو خلیفہ بنا جایئے۔ اس کے جواب میں بعض لوگوں کا ذکر کرتے اور ان میں کوئی عیب بتاتے گئے۔ حضرت علیؑ کے بارے میں کہا:

اِمْرَؤٌ فِیْهِ دَعَابَةٌ۔

یعنی ان میں مزاح بھی ہے۔

پھر حضرتؑ کے بارے میں کہا:

اِنْ اَحْرَاهُمْ اَنْ یَّحْمِلَهُمْ عَلٰی کِتَابِ اللّٰهِ وَ سُنَّةِ نَبِیِّهِمْ لِصَاحِبِكَ وَاللّٰهِ لَئِنْ وَلِیَهَا لَیَحْمِلَنَّهُمْ عَلَی الْمَحَجَّةِ الْبَیْضَاءِ وَ الصِّرَاطِ الْمُسْتَقِیْمِ۔

یعنی یقیناً کل مسلمانوں میں ان کو کتاب خدا اور سنت نبی پر چلانے کے لیے حضرت علیؑ بہترین شخص ہیں۔ خدا کی قسم اگر وہ خلیفہ ہوں گے تو مسلمانوں کو حق واضح اور رائے روشن اور صراط مستقیم پر چلائیں گے۔

یہ کل مضمون استیعاب مطبوعہ حیدر آباد جلد ۲ صفحہ ۴۸۰۔ ازالۃ الخفاء مطبوعہ بریلی جلد ۲ صفحہ ۱۹۴ وغیرہ میں ہے۔ اور کتاب الامامۃ وسیاسۃ مطبوعہ مصر جلد ۱ صفحہ ۴۱ میں ہے کہ حضرت عمر نے مرتے وقت حضرت امیر المومنینؑ سے کہا:

وَاِنَّكَ اَحْرَی الْقَوْمِ اِنْ وَلَّیْتَهَا اَنْ تُقِیْمَهُمْ عَلَی الْحَقِّ الْمُبِیْنِ۔

یعنی اے علی تم سب سے بہتر ہو کہ اگر خلیفہ ہو جاؤ گے تو لوگوں کو حق مبین پر قائم رکھو گے۔

مگر حضرت امیر المومنینؑ کی یہ صفت مزاح حضرت عمر کو عیب نظر آئی حالانکہ یہ کمال خوش خلقی کی دلیل ہے۔ چنانچہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں بھی بہت مزاح تھا۔ سیرۃ حلبیہ مطبوعہ مصر جلد ۳ ص ۳۳۵ میں ہے کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (بقیہ صفحہ مابعد)

اُعَافِسُ وَ اُمَارِسُ! لَقَدْ قَالَ بَاطِلًا، وَ نَطَقَ اٰثِمًا. اَمَا ۔ وَ شَرُّ الْقَوْلِ الْكَذِبُ ۔ اِنَّهٗ لَيَقُوْلُ فَيَكْذِبُ، وَ يَعِدُ فَيُخْلِفُ، وَ يَسْئَلُ فَيُلْحِفُ، وَ يُسْئَلُ فَيَبْخَلُ، وَ يَخُوْنُ الْعَهْدَ، وَ يَقْطَعُ الْاِلَّ، فَاِذَا كَانَ عِنْدَ الْحَرْبِ فَاَىُّ زَاجِرٍ وَّ اٰمِرٍ هُوَ! مَا لَمْ تَاْخُذِ السُّيُوْفُ مَاٰخِذَهَا. فَاِذَا كَانَ ذٰلِكَ كَانَ اَكْبَرُ مَكِيْدَتِهٖ اَنْ يَّمْنَحَ

میں لگا رہتا اور اسی میں بسر کرتا ہوں۔ یقیناً وہ بالکل جھوٹ بکتا اور ایسی باتیں زبان سے نکال کر گناہگار ہوتا رہتا ہے۔[1] سنو جی! بہت بُری بات جھوٹ ہے تو وہ جو بولتا ہے وہ جھوٹ ہوتا ہے اور جو وعدہ کرتا ہے اس کو پورا نہیں کرتا۔ خود کسی سے کچھ مانگتا ہے تو اس کے پیچھے پڑ جاتا ہے اور اس سے کوئی چیز مانگی جاتی ہے تو اس میں بخل کرتا ہے۔ اور وہ اپنے عہد میں بھی خیانت کرتا اور قطع رحم کا بھی مرتکب ہوتا رہتا ہے۔ پھر جب وہ جنگ کے موقع پر ہوتا ہے تو (دوسروں کو) کیسا ابھارتا اور حکم دیتا ہے (مگر اسی وقت تک) جب تک تلواریں میان سے نہیں نکلتی ہیں۔ پھر جب یہ موقع آجاتا ہے تو اس کا سب سے بڑا فریب یہ ہوتا ہے کہ (مدمقابل کی) فوج کو اپنی شرمگاہ

(بقیہ صفحہ ماقبل) خوش خلق، نرم مزاج، ہشاش بشاش تھے نہ تو سخت مزاج تھے، نہ ترش رُو، نہ بیہودہ بولنے والے۔

وَكَانَ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مُمَازِحَ اَصْحَابِهٖ۔

حضرتؐ اپنے اصحاب سے خوب مزاح فرمایا کرتے تھے۔

مگر جو فرماتے حق ہی بات فرماتے اس کے بعد حضرتؐ کا بہت سا مزاح اور مذاق نقل کیا ہے۔

اسی طرح روضۃ الاحباب مطبوعہ لکھنؤ جلد ۱ صفحہ ۶۷۷، مواہب لدنیہ مطبوعہ مصر جلد ۱ صفحہ ۲۹۷، مسند احمد بن حنبل، کنزل العمال، شمائل ترمذی وغیرہ سیکڑوں کتابوں میں آنحضرتؐ کے مزاحات منقول ہیں اور علامہ ابن ابی الحدید نے تو اسی خطبہ کی شرح لکھتے ہوئے کئی صفحہ میں از صفحہ ۱۱۴ تا ۱۱۸ جلد ۲، آنحضرت نیز صحابہ کے بکثرت مزاحوں کو نقل کیا ہے۔ پھر جو خوبی حضرت رسول خداؐ میں ہو وہ نفس رسول میں کیوں نہ ہوگی۔

[1] یعنی عمرو عاص میرے بارے میں جو یہ مشہور کرتا ہے کہ میں معیوب مزاح اور خوش خلقی سے گرا ہوا مذاق کرنے والا ہوں تو یہ سب باطل ہے۔ علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ حضرت علیؑ کو اتنا وقت ہی کہاں ملتا تھا کیونکہ آپ کا کل زمانہ تو عبادت، نماز، ذکر، فتاوی، علوم کی اشاعت، قرآن کی تفسیر، سیاست، جہاد، انتظام فوج و رعایا وغیرہ میں صَرف ہو جاتا تھا۔ تو جو شخص حضرتؑ کے حالات میں غور کرے گا وہ اس اتہام کو غلط سمجھ لے گا۔

الْقِرْمَ سَبَّتَهٗ.

اَمَا وَاللّٰهِ! اِنِّیْ لَیَمْنَعُنِیْ مِنَ اللَّعِبِ ذِکْرُ الْمَوْتِ، وَ اِنَّهٗ لَیَمْنَعُهٗ مِنْ قَوْلِ الْحَقِّ نِسْیَانُ الْاٰخِرَةِ. اِنَّهٗ لَمْ یُبَایِعْ مُعَاوِیَةَ حَتّٰی شَرَطَ لَهٗ اَنْ یُّؤْتِیَهٗۤ اَتِیَّةً، وَ یَرْضَخَ لَهٗ عَلٰی تَرْکِ الدِّیْنِ رَضِیْخَةً.

بخش دے۔[1]

سُنو جی! خدا کی قسم مجھے تو لہو ولعب سے موت کا خیال روکتا ہے اور اس (عمرو عاص) کو حق بات کہنے سے یہ امر باز رکھتا ہے کہ وہ آخرت کو بھولا ہوا ہے اور یقیناً اس نے معاویہ کی بیعت اس وقت تک نہیں کہ جب تک اس نے اس سے یہ شرط نہیں کر لی کہ وہ اس کو کوئی انعام دے گا اور اس دین فروشی کے عوض اس کو کوئی عطیہ مرحمت کرے گا۔[2]

❁ خطبہ :۸۳ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَیْهِ السَّلَامُ

وَ اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِیْكَ لَهٗ، اَلْاَوَّلُ لَا شَیْءَ قَبْلَهٗ، وَ الْاٰخِرُ لَا غَایَةَ لَهٗ، لَا تَقَعُ الْاَوْهَامُ لَهٗ عَلٰی صِفَةٍ، وَ لَا تُعْقَدُ الْقُلُوْبُ مِنْهُ عَلٰی کَیْفِیَّةٍ،

خطبہ (۸۳)

حضرت علیہ السلام کے ایک خطبہ کا کچھ حصّہ۔

اور میں اقرار کرتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے وہ یکہ وتنہا ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ وہی اوّل ہے جس کے قبل کوئی چیز نہیں ہوئی اور وہی آخر ہے جس کی کوئی انتہا نہیں ہوگی۔ (انسان کے) وہم وگمان تک میں اس کی کوئی (حقیقی) صفت نہیں آسکتی اور دلوں کو اس کی کسی

---

[1] جنگ صفین میں ایک روز حضرت امیر المومنینؑ نے مبارز طلب کیا، عمرو عاص آیا مگر حضرتؑ کو پہچان کر بھاگا حضرتؑ نے پیچھے سے ایک نیزہ لگایا تو فوراً گر کر دونوں ٹانگیں اونچی کر دیں اور ننگا ہو گیا۔ حضرتؑ نے ہاتھ روک کر فرمایا اے ابن نابغہ جا تجھ کو چھوڑ دیتا ہوں آج سے تو اپنی شرمگاہ کا آزاد کردہ ہے۔ (استیعاب مطبوعہ حیدر آباد جلد ۱ صفحہ ۶۷، وتاریخ مروج الذہب مطبوعہ مصر بر حاشیہ تاریخ کامل جلد ۵ صفحہ ۲۱۹ وغیرہ کتب کثیرہ)

[2] علامہ مسعودی مروج الذہب جلد ۵ صفحہ ۱۸۰ میں لکھتے ہیں: کہ جب معاویہ نے حضرت علیؑ سے بغاوت کرنا چاہی تو عمرو عاص سے کہا میری بیعت کر۔ اس نے کہا خدا کی قسم میں اپنا دین چھوڑ کر تمہاری مدد نہیں کروں گا ہاں تم اپنے دنیا میں مجھ کو شریک کر لو تو خیر (میں اپنا دین تمہارے ہاتھ بیچ ڈالوں)۔ معاویہ نے کہا جو مانگو دوں۔ کہا مجھے مصر کی طمع ہے اس کو معاویہ نے منظور کر لیا اور ایک دستاویز لکھ کر دے دی۔

وَ لَا تَنَالُهُ التَّجْزِئَةُ وَ التَّبْعِيْضُ، وَ لَا تُحِيْطُ بِهِ الْاَبْصَارُ وَ الْقُلُوْبُ.

[مِنْهَا]

فَاتَّعِظُوْا عِبَادَ اللّٰهِ! بِالْعِبَرِ النَّوَافِعِ، وَ اعْتَبِرُوْا بِالْاٰيِ السَّوَاطِعِ، وَ ازْدَجِرُوْا بِالنُّذُرِ الْبَوَالِغِ، وَ انْتَفِعُوْا بِالذِّكْرِ وَ الْمَوَاعِظِ، فَكَاَنْ قَدْ عَلِقَتْكُمْ مَّخَالِبُ الْمَنِيَّةِ، وَ انْقَطَعَتْ مِنْكُمْ عَلَآئِقُ الْاُمْنِيَّةِ، وَ دَهَمَتْكُمْ مُّفْظِعَاتُ الْاُمُوْرِ، وَ السِّيَاقَةُ اِلَى

کنہ حقیقت پر کوئی یقین نہیں ہوسکتا۔ نہ تو اس کے اجزا نکل سکتے ہیں اور نہ اس کا حصّہ ہوسکتا ہے اور نہ آنکھیں اور دل (ودماغ) اس کا احاطہ کرسکتے ہیں۔[1]

اسی خطبے کا کچھ حصہ

تو اے خدا کے بندو! ان نفع بخش عبرتوں سے نصیحت پکڑو اور ان روشن نشانیوں سے عبرت حاصل کرو اور کمال درجہ کی ڈرانے والی باتوں سے (اثر لے کر اپنی سرکشی سے) باز آجاؤ اور پند ونصیحت سے فائدہ اٹھالو (اس طرح) کہ گویا موت کے خاردار پنجے تم سے لپٹ گئے اور حسرت وآرزو کی دلبستگیاں تم سے زائل ہوگئیں اور تم پر سخت و شدید حالات اور آخری منزل (یعنی موت) تک کشاں کشاں جانے کا وقت آپہنچا۔[2] تو ہر

---

[1] علامہ ابن ابی الحدید اس خطبہ کی شرح میں لکھتے ہیں کہ توحید، عدل اور دوسرے مباحثِ الٰہیہ کے شریف واعلیٰ مضامین کی معرفت حضرت علیؑ کے سوا کسی دوسرے سے نہیں ہوئی۔ دوسرے صحابہ کبار کا کلام تو ان مضامین کو چھو تک نہیں سکا بلکہ وہ لوگ ان معارف و حقائق کا تصور تک نہ کرسکے اور حضرتؑ کے فضائل میں مجھے تو یہی حضرتؑ کی سب سے بڑی اور قابل فخر فضیلت معلوم ہوتی ہے۔

[2] یعنی کسی شخص کو معلوم نہیں ہے کہ اس کی زندگی کب تک ہے اور موت کس وقت آئے گی۔ ایسی حالت میں کسی کو بھی دنیا میں مطمئن ہو کر مشغول نہیں ہوجانا چاہیے اور یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ابھی موت بہت دور ہے جب اس کا زمانہ قریب پہنچے گا خدا کی طرف ہم متوجہ ہو جائیں گے اور آخرت کا سامان کرنے لگیں گے۔ یہ تو وہ شخص کرے جس کو معلوم ہو کہ فلاں وقت تک میں نہیں مرسکتا لیکن جب ایسا نہیں ہے اور ہر وقت اس کی موت آسکتی ہے تو انسان کو بھی ہر وقت اس کے لیے آمادہ رہنا اور آخرت کے سامان میں مشغول ہونا چاہیے۔ اسی مضمون کو حضرتؑ اس کلام میں ادا فرماتے ہیں کہ تمہیں مناسب ہے مواعظ اور نصائح کی باتوں سے سبق حاصل کرو اور یہ سمجھ لو کہ تمہاری موت کا زمانہ دور نہیں ہے بلکہ اس درجہ قریب ہے کہ گویا اس کے پنجوں میں آگئے اور صرف اس کے دہن کا لقمہ ہونا باقی ہے جس طرح شیر یا کوئی اور درندہ جانور کسی شکار کو گرفتار کرتا ہے تو پہلے وہ شکار اس کے پنجوں میں جاتا ہے اسی درندہ جانور سے موت کو تشبیہ دے کر حضرت امیر المومنین علیہ السلام اس کے لیے پنجوں کا لفظ بطور استعارہ لائے۔

اور ہم سب کو سمجھاتے ہیں کہ تم موت کے پنجوں میں آگئے ہو جس سے نجات نہیں پاسکتے گو اس کے مُنہ تک جانے میں کسی قدر تاخیر ہو۔ تو اس وقت بھی خدا سے ڈرو اور مواعظ واذکار سے نصیحت حاصل کر کے اپنے گناہوں سے توبہ کرلو اور اب آخرت کے سامان میں ہمہ تن منہمک ہوجاؤ اور دنیا کے تعلقات کو ختم کرلو کیونکہ جب موت کا پیغام آپہنچا تو آرزوہائے دنیا کے تمام تعلقات بھی ختم ہوگئے۔

الْوِرْدِ الْمَوْرُوْدِ، وَ ﴿كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّ شَهِيْدٌ﴾: سَآئِقٌ يَّسُوْقُهَا اِلٰى مَحْشَرِهَا وَ شَاهِدٌ يَّشْهَدُ عَلَيْهَا بِعَمَلِهَا.

نفس کے ساتھ ایک ہنکانے والا اور ایک گواہ رہے گا،[1] ہنکانے والا (فرشتہ) تو اس کو محشر کی طرف لے جائے گا اور گواہی والا (فرشتہ) اس کے خلاف اس کے اعمال کی گواہی دے گا۔

[وَ مِنْهَا: فِيْ صِفَةِ الْجَنَّةِ]

دَرَجَاتٌ مُّتَفَاضِلَاتٌ، وَمَنَازِلُ مُّتَفَاوِتَاتٌ، لَا يَنْقَطِعُ نَعِيْمُهَا، وَ لَا يَظْعَنُ مُقِيْمُهَا، وَ لَا يَهْرَمُ خَالِدُهَا، وَ لَا يَبْأَسُ سَاكِنُهَا.

[اسی خطبہ کا ایک حصّہ بہشت کے بیان میں]

(اس میں) کئی درجے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر اور بہت سی منزلیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اس کی نعمتیں ختم نہیں ہوں گی اور جو شخص اس میں پہنچ جائے گا وہ اس سے نکلے گا نہیں اور اس میں ہمیشہ رہنے والا بوڑھا نہیں ہوگا اور اس کے باشندے کو رنج و غم نہیں پہنچے گا۔

❁ خطبہ: ۸۴ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

قَدْ عَلِمَ السَّرَآئِرَ، وَ خَبَرَ الضَّمَآئِرَ، لَهُ الْاِحَاطَةُ بِكُلِّ شَيْءٍ، وَ الْغَلَبَةُ لِكُلِّ

خطبہ (۸۴)

حضرت علیہ السلام کے ایک خطبہ کا کچھ حصّہ۔

یقیناً وہ (خدا) کل رازوں کو جانتا اور دل کی تمام باتوں سے واقف ہے۔ وہ ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے اور ہر شے پر غلبہ اور ہر چیز پر قوت رکھتا ہے۔[2] پس تم میں سے

---

[1] یہ کلام مجید سے ماخوذ ہے سورہ ق رکوع ۲ میں خدا فرماتا ہے:

﴿وَ جَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّ شَهِيْدٌ﴾ (سورۂ ق، آیہ ۲۱)

یعنی بروز قیامت ہر شخص (خدا کے سامنے) اس طرح حاضر ہوگا کہ اس کے ساتھ ایک (فرشتہ) ہنکانے والا ہوگا اور ایک (اعمال کا) گواہ۔ انتہیٰ

حضرتؑ نے اس آیہ کو لے کر اس کے بعد سائق اور شہید کی تفسیر بھی فرمادی کہ ہنکانے والا فرشتہ وہ ہوگا۔ جو انسان کو ہنکا کر بروز قیامت خدا کے سامنے لائے گا اور گواہ وہ فرشتہ ہوگا جو اس شخص کے خلاف اس کے اعمال کی گواہی دے گا جن کا حساب کیا جائے گا اور اس کو برے اعمال کی سزا دی جائے گی۔

[2] یعنی خداوند عالم تمام رازوں اور بھیدوں کو جانتا اور دل و دماغ کے کل خیالوں اور باتوں سے واقف ہے کہ اس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں رہ سکتی خواہ وہ چیزیں ہمارے دلوں میں یا ذہنوں میں ہوں، خواہ ہماری زبان سے نکل کر دوسروں تک بصیغہ راز رہیں۔ (بقیہ صفحہ مابعد)

شَیْءٍ، وَ الْقُوَّةُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ. فَلْیَعْمَلِ الْعَامِلُ مِنْکُمْ فِیْ اَیَّامِ مَهَلِهٖ، قَبْلَ اِرْهَاقِ اَجَلِهٖ، وَ فِیْ فَرَاغِهٖ قَبْلَ اَوَانِ شُغْلِهٖ، وَ فِیْ مُتَنَفَّسِهٖ قَبْلَ اَنْ یُّؤْخَذَ

جوشخص عمل (خیر) کرنا چاہتا ہے وہ اپنی ۱؎ اجل آ پہنچنے سے پہلے (یعنی) اپنی مہلت کے ایام میں اور جو زمانہ (موت میں) مشغول ہونے کا ہے اس سے قبل (یعنی) اپنی فراغت میں اور اپنی روح قبض ہونے سے پہلے (یعنی) اپنی (زندگی کی) وسیع مدت میں عمل کرلے ۲؎ اور

(بقیہ صفحہ ماقبل) اس مقام پر حضرتؑ نے توحید کے تین بڑے مسئلوں کو ذکر فرمایا ہے۔ایک یہ کہ خدا ہر چیز کا جاننے والا اور ہر بات سے واقف اور باخبر ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ وحدہ لاشریک لہ ہے کہ خدائی میں اس کا کوئی ساتھی نہیں ہے۔ تیسرے یہ کہ وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے اور اس کی قوت سے کوئی چیز خارج نہیں ہے۔ان تینوں مسائل کی دلیلیں بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ خدا کے یہ اوصاف تقریباً بدیہیات کی حد تک پہنچ گئے ہیں اور کلام مجید میں بکثرت آیات بھی ان اوصاف کی موجود ہیں۔

۱؎ علامہ ابن ابی الحدید شرح نہج البلاغہ مطبوعہ مصر جلد ۲ صفحہ ۲۲۲ میں لکھتے ہیں کہ حضرت امیر المومنینؑ کا یہ کلام ''فَلْیَعْمَلِ الْعَامِلُ'' سے ''لِدَارِ اِقَامَتِهٖ'' تک حضرت رسول خداؐ کے قول سے ماخوذ ہے جسے حضرتؑ نے اپنے ایک مشہور خطبہ میں ارشاد فرمایا تھا وہ خطبہ یہ ہے:

یَا اَیُّهَا النَّاسُ اِنَّ لَکُمْ مَعَالِمَ فَانْتَهُوْا اِلٰی مَعَالِمِکُمْ، وَاِنَّ لَکُمْ غَایَةً فَانْتَهُوْا اِلٰی غَایَتِکُمْ، فَاِنَّ الْمُؤْمِنَ بَیْنَ مَخَافَتَیْنِ؛ بَیْنَ اَجَلٍ قَدْ مَضٰی لَا یَدْرِیْ مَا اللّٰهُ صَانِعٌ بِهٖ، وَاَجَلٍ قَدْ بَقِیَ، لَا یَدْرِیْ مَا اللّٰهُ قَاضٍ فِیْهِ، فَلْیَاْخُذِ الْعَبْدُ مِنْ نَفْسِهٖ لِنَفْسِهٖ، وَمِنْ دُنْیَاهُ لِاٰخِرَتِهٖ، وَمِنَ الشَّبِیْبَةِ قَبْلَ الْهَرَمِ، وَمِنَ الْحَیَاةِ قَبْلَ الْمَوْتِ، فَوَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِهٖ مَا بَعْدَ الْمَوْتِ مِنْ مُسْتَعْتَبٍ، وَمَا بَعْدَ الدُّنْیَا مِنْ دَارٍ اِلَّا الْجَنَّةَ اَوِ النَّارَ۔

یعنی لوگو تمہارے لیے کچھ نشانات ہیں تو اپنے نشانوں تک پہنچو اور تمہاری ایک غایت ہے تو اپنی غایت تک جاؤ۔ ہر مومن دو خوفوں کے درمیان ہے ایک اس کی وہ اجل ہے جو گزر گئی اور وہ نہیں جانتا ہے کہ خدا اس کے ساتھ کیا کرے گا اور دوسری اس کی وہ اجل ہے جو باقی ہے جس کے بارے میں وہ نہیں جانتا ہے کہ خدا اس میں کیا فیصلہ کرنے والا ہے۔تو ہر بندے کو چاہیے کہ اپنے لیے اپنے نفس ہی سے اور اپنی آخرت کے لیے اپنی دنیا سے اور اپنی جوانی سے بڑھاپے کے قبل اور زندگی سے موت کے قبل (آخرت کا توشہ) حاصل کرلے کیونکہ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں محمدؐ کی جان ہے موت کے بعد توبہ کرنے کا موقع نہیں ہوگا اور دنیا کے بعد کوئی گھر نہیں ہے سوا بہشت یا دوزخ کے۔ انتھیٰ۔

۲؎ ''فِیْ مُتَنَفَّسِهٖ'' کا مطلب ہے اپنے وسعت وقت میں، عربی میں بولتے ہیں ''اَنْتَ فِیْ نَفْسِ اَمْرِكَ'' یعنی تو اپنے امر کے نفس میں ہے۔جس کا مطلب یہ ہے کہ تو تنگی میں نہیں ہے بلکہ وسعت میں ہے۔تو حضرتؑ کا مقصود یہ ہوا کہ ابھی تم لوگوں کو اچھے اعمال کرلینے کا وسیع موقع مل گیا ہے اس میں آخرت کا سامان کرلو، جب وقت تنگ ہوجائے گا اس وقت کچھ نہ کرسکو گے۔

بِكَظَمِهٖ، وَ لْيُمَهِّدْ لِنَفْسِهٖ وَ قَدَمِهٖ، وَ لْيَتَزَوَّدْ مِنْ دَارِ ظَعْنِهٖ لِدَارِ اِقَامَتِهٖ.

اپنے نفس اور قدم کے آرام کے لیے (کسی جگہ کو) ہموار کر لے اور اپنے اس سفر کے گھر (دنیا) سے اصلی رہنے کے گھر (آخرت) کے لیے سامان مہیّا کر لے۔

فَاللّٰهَ اللّٰهَ اَيُّهَا النَّاسُ! فِيْمَا اسْتَحْفَظَكُمْ مِنْ كِتَابِهٖ، وَ اسْتَوْدَعَكُمْ مِّنْ حُقُوْقِهٖ، فَاِنَّ اللّٰهَ سُبْحَانَهٗ لَمْ يَخْلُقْكُمْ عَبَثًا، وَ لَمْ يَتْرُكْكُمْ سُدًى، وَ لَمْ يَدَعْكُمْ فِيْ جَهَالَةٍ وَّ لَا عَمًى، قَدْ سَمّٰى اٰثَارَكُمْ، وَ عَلِمَ اَعْمَالَكُمْ، وَ كَتَبَ

تو لوگوں! اللہ سے ڈرو، خدا سے خوف کرو اس چیز (احکام الٰہی) کے بارے میں جس کی حفاظت کا اس نے تمہیں اپنی کتاب میں حکم دیا اور ان حقوق کے بارے میں جو خدا نے تمہیں سونپ دیے ہیں۔ اس لیے کہ خدائے سبحانہ نے تم کو عبث نہیں پیدا کیا اور تمہیں یوں ہی نہیں چھوڑ دیا ہے اور تم کو جہالت و تاریکی میں نہیں رہنے دیا ہے [1] (بلکہ) اس نے یقیناً تمہاری غایت خلقت اور فرائض

[1] ''اِسْتَحْفَظَكُمْ مِنْ كِتَابِهٖ'' یعنی خدا نے تم کو اپنی کتاب قرآن مجید کا نگہبان اور حفاظت کرنے والا قرار دیا ہے اور اس حفاظت سے مراد یہ ہے کہ اس کے احکام، اوامر و نواہی میں غور و فکر کی جائے، ان میں تدبر سے کام لیا جائے اور ان اوامر پر پابندی سے عمل کیا جائے، ان نواہی سے برابر پرہیز کیا جائے، غرض قرآن مجید کی حفاظت صرف یہ نہیں ہے کہ اس کی بہت خوبصورت جِلد بندھوا کر، عمدہ غلاف سلوا کر اس میں اس کو بند کر دیا جائے، یا زبانی طوطے کی طرح پڑھ لیا جائے بلکہ حقیقی محافظت یہ ہے کہ اس کے مطالب سمجھے جائیں، اس میں جو باتیں معرفت کی ہیں ان کو سمجھا جائے، اس میں جو باتیں موعظہ کی ہیں ان سے نصیحت حاصل کی جائے، اس میں جو احکام ہیں ان کی پابندی کی جائے، اس میں جن باتوں سے باز رہنے کی تاکید ہے اس سے اپنے کو اور دوسروں کو بھی روکا جائے۔ یہی وہ حقوق قرآن مجید ہیں جنہیں خدا نے ہمارے سپرد کیا ہے۔

چنانچہ ان حقوق کی وجہ حضرتؑ بیان فرماتے ہیں کہ خدا نے تم لوگوں کو عبث نہیں پیدا کیا ہے اور نہ تمہیں دنیا میں شتر بے مہار کی طرح چھوڑ دیا ہے کہ جو ناجائز اور غیر مناسب باتیں چاہو کرتے رہو بلکہ کچھ خاص اغراض اور مقاصد کے لیے تمہیں مخلوق کیا ہے اور وہ یہی ہے کہ تم اپنی آلات بدنیہ کے ذریعہ سے فضائل نفسانیہ کی تکمیل کر لو، بری باتوں سے الگ رہو، اخلاق ذمیمہ سے اپنے کو بچاتے رہو اور اخلاق حسنہ سے خود کو آراستہ رکھو۔ اسی وجہ سے خدا نے تم پر اپنی کل حجّتیں تمام کر دی ہیں اور تمہیں کسی قسم کا عذر کرنے کا موقع باقی نہیں رکھا۔ اس کو حضرتؑ فرماتے ہیں ''وَ لَمْ يَدَعْكُمْ فِيْ جَهَالَةٍ وَّ لَا عَمًى'' یعنی خدا نے تم کو پیدا کرنے کے بعد اور احکام کا پابند کر کے تمہیں جہالت اور تاریکی میں چھوڑا بھی نہیں بلکہ اپنے انبیاء و رُسل اور آئمہ ہادیین کو بھیج کر تمہیں ہر ضروری امر کی تعلیم دلوا دی، ہر حکم کی توضیح کرا دی، ہر عمل کا طریقہ بتا دیا اور ہر قسم کی تاریکی زائل کر کے پوری روشنی دکھا دی۔

اٰجَالَكُمْ، وَ اَنْزَلَ عَلَيْكُمُ ﴿الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾ ، وَ عَمَّرَ فِيْكُمْ نَبِيَّهٗ اَزْمَانًا، حَتّٰٓى اَكْمَلَ لَهٗ وَ لَكُمْ ـ فِيْمَآ اَنْزَلَ مِنْ كِتَابِهٖ ـ دِيْنَهُ الَّذِيْ رَضِيَ لِنَفْسِهٖ، وَ اَنْهٰى اِلَيْكُمْ ـ عَلٰى لِسَانِهٖ ـ مَحَابَّهٗ مِنَ الْاَعْمَالِ وَ مَكَارِهَهٗ، وَ نَوَاهِيَهٗ

زندگی کو بتا دیا ہے ۱؎ (تو) وہ تمہارے اعمال کو جانتا ہے۔ اس نے تمہاری عمروں کی حد مقرر کر دی ہے ۲؎ اور تم پر اپنی کتاب (قرآن مجید) نازل کی ہے جو ہر چیز کی واضح کرنے والی ہے اور تم میں اپنے نبی کو ایک زمانہ تک زندہ رکھا یہاں تک کہ اس نبی کے لیے اور تمہارے واسطے اپنی اس کتاب میں جس کو نازل کیا ہے اپنے اس دین کو کامل کر دیا جس کو خود پسند کر لیا ہے ۳؎ اور اسی (نبی) کی زبان سے

۱؎ علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ حضرتؑ کے قول ''قَدْ سَمّٰى اٰثَارَكُمْ'' کی دو تفسیریں ہو سکتی ہیں ایک یہ کہ خدا نے تمہارے لیے تمہارے کل اعمال کو جو خواہ خیر ہوں خواہ شر واضح اور صاف کر دیا ہے۔ اور کسی امر کو مخفی اور مشتبہ نہیں چھوڑا۔ جیسا کہ خدا کا قول قرآن مجید میں ہے:

﴿وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ﴾ (سورۂ البلد، آیہ ۱۰)

یعنی اس کو اچھی بری دونوں راہیں بھی دکھا دیں۔

دوسری تفسیر یہ کہ خدا نے تمہاری ماثر کو اعلیٰ کیا یعنی تمہارے درجوں کو بلند کیا بشرطیکہ تم اس کی اطاعت کرو۔

۲؎ ''كَتَبَ اٰجَالَكُمْ''، یعنی خداوند عالم نے اپنی کتاب مبین اور ان لوحوں میں ۔۔۔ محفوظ رہے گی، تمہاری اجلوں (یعنی عمر کی مدت اور زمانہ) کو لکھ دیا ہے کہ اس کے خلاف نہیں ہو سکتا۔

۳؎ ''وَ عَمَّرَ فِيْكُمْ نَبِيَّهٗ''، یعنی حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر کو مختصر نہیں کیا گیا بلکہ بقدر ضرورت آپ کی اجل میں وسعت رکھی تا کہ حضرت لوگوں کو اچھی طرح ہدایت کر دیں اور اس طرح خدا نے اپنے رسول کریم کے ذریعہ سے لوگوں کے وجود کا نظم و نسق درست کر دیا یہاں تک کہ خدا نے حضرت کی زندگی ہی میں حضرت کے لیے نیز مسلمانوں کے لیے اس دین اسلام کو کامل کر دیا جس کو اپنے نفس کے لیے پسند کر لیا تھا۔

علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ حضرت کا قول ''حَتّٰى اَكْمَلَ لَهٗ وَلَكُمْ دِيْنَهٗ'' خدا کے اس قول سے ہے جو قرآن مجید کے سورۂ مائدہ رکوع ۱ میں مذکور ہے کہ

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾

یعنی اے رسول آج میں نے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے اس دین اسلام کو پسند کر لیا۔

محدثین و مفسرین اسلام کا اس امر پر اتفاق ہے کہ یہ آیہ مبارکہ ۱۸ ذی الحجہ ۱۰ھ کو بمقام غدیر خم اس وقت نازل ہوئی جب حضرت رسول خداؐ نے حضرت امیر المومنینؑ کو تمام مسلمانوں کا پیشوا اور اپنے بعد اپنا خلیفہ بنایا اور مسلمانوں کو دکھا بھی (بقیہ صفحہ مابعد)

وَ اَوَامِرَهٗ، فَاَلْقٰی اِلَیْکُمُ الْمَعْذِرَةَ، وَ اتَّخَذَ عَلَیْکُمُ الْحُجَّةَ، وَ قَدَّمَ اِلَیْکُمْ

ان اعمال کو بھی بتا دیا جو اسے پسندیدہ اور جو ناگوار ہیں [1] اور جن کاموں سے منع کیا ہے اور جن کا حکم دیا ہے تو اس

(بقیہ صفحہ ماقبل) دیا اور گواہ بھی کر دیا۔ جس کی فی الجملہ تفصیل یہ ہے کہ جب حضرت رسول خداؐ اپنے آخری حج سے فارغ ہو کر مدینہ منورہ کی طرف واپس تشریف لا رہے تھے۔ تو راستہ میں ۱۸ ذی الحجہ ۱۰ھ کو بمقام غدیر خم تاکیداً یہ حکم نازل ہوا کہ اے ہمارے رسول تم لوگوں سے نہ ڈرو اور علیؑ کی خلافت کے بارے میں جو حکم ہم نے تمہارے پاس بھیجا ہے اسے جلد از جلد لوگوں تک پہنچا دو۔ اس پر آنحضرتؐ نے فوراً لوگوں کو روکا اور مجمع کثیر کے سامنے ایک طولانی خطبہ کے بعد حضرت علیؑ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا:

مَنْ کُنْتُ مَوْلَاهُ، فَعَلِیٌّ مَوْلَاهُ، اَللّٰهُمَّ وَالِ مَنْ وَالَاهُ، وَعَادِ مَنْ عَادَاهُ، وَانْصُرْ مَنْ نَصَرَهٗ، وَاخْذُلْ مَنْ خَذَلَهٗ۔

یعنی اے مسلمانو! سُن رکھو جس کا پیشوا اور حاکم میں ہوں میرے بعد اس کا پیشوا اور حاکم علیؑ ہے۔ اے خدا جو علیؑ کو دوست رکھے اسے تو بھی دوست رکھنا اور جو اسے دشمن رکھے اسے تو بھی دشمن رکھنا اور جو اس کی مدد کرے اس کی تو بھی مدد کرنا اور جو اس کو چھوڑ دے اسے تو بھی چھوڑ دینا۔

اس کے بعد مسلمانوں نے حضرت علیؑ کو خلافت اور امامت کی مبارکباد دینی شروع کی، چنانچہ حضرت عمر نے بھی کہا:

بَخٍّ بَخٍّ لَکَ یَابْنَ اَبِیْ طَالِبٍ لَقَدْ اَصْبَحْتَ مَوْلَایَ وَ مَوْلَا کُلِّ مُؤْمِنٍ وَ مُؤْمِنَةٍ۔

یعنی اے علیؑ تمہیں مبارک ہو مبارک ہو کہ اب تو تم ہمارے اور ہر مومن مرد اور مومنہ عورت کے حاکم اور پیشوا ہو گئے۔

جب یہ سب ہو چکا اس وقت حضرت جبریلؑ یہ آیت لے کر نازل ہوئے۔ دیکھو تفسیر درمنثور از علامہ جلال الدین سیوطی مطبوعہ مصر جلد ۲ صفحہ ۲۰۹۔

اور اس کے بعد کا قول ''اَلَّذِیْ رَضِیَ لِنَفْسِهٖ'' خدا کے اس قول سے ماخوذ ہے جو سورۂ نور رکوع ۷ میں مذکور ہے:

﴿وَلَیُمَکِّنَنَّ لَهُمْ دِیْنَهُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَهُمْ﴾ (سورۂ النور، آیہ ۵۵)

یعنی خدا نے جس دین (اسلام) کو ان لوگوں کے لیے پسند فرما لیا ہے اس پر انہیں ضرور ضرور پوری قدرت دے گا۔

کیونکہ جب خدا نے اس دین کو ان لوگوں کے لیے پسند فرما لیا تو گویا اسے اپنے نفس کے لیے بھی پسند کر لیا بایں معنی کہ خدا نے اس امر کو پسند کیا کہ یہ دین اس کی طرف منسوب کیا جائے جس کے بعد کہا جائے گا کہ یہی دین حق ہے۔

[1] ''مَحَابَّهٗ مِنَ الْاَعْمَالِ وَ مَکَارِهَهٗ'' کے بارے میں علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں:

وَفِیْ هٰذَا دَلَالَةٌ اَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی یُحِبُّ الطَّاعَةَ وَ یَکْرَهُ الْمَعْصِیَةَ وَهُوَ خِلَافُ قَوْلِ الْجَبْرِیَّةِ۔

یعنی حضرت علی علیہ السلام کے اس قول میں اس امر کی واضح دلیل ہے کہ خدائے تبارک وتعالیٰ اطاعت کو پسند اور گناہ کو ناپسند فرماتا ہے اور یہ قول ان لوگوں کے مذہب کے خلاف ہے جو جبریہ ہیں اور جبر کا اعتقاد رکھتے ہیں۔

اس سے ثابت ہوا کہ فرقہ جبریہ کا مذہب باطل ہے۔

بِالْوَعِيْدِ، وَ اَنْذَرَكُمْ ﴿بَيْنَ يَدَىْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ﴾.

طرح خدا نے تمہارے سامنے اپنا عذر پیش کر دیا اور تم پر اپنی حجت قائم کر دی اور تمہاری طرف اپنے وعید کو بڑھا دیا اور تمہیں سخت عذاب سے ڈرا دیا جو تمہارے سامنے ہے۔

فَاسْتَدْرِكُوْا بَقِيَّةَ اَيَّامِكُمْ، وَ اصْبِرُوْا لَهَا اَنْفُسَكُمْ، فَاِنَّهَا قَلِيْلٌ فِىْ كَثِيْرِ الْاَيَّامِ الَّتِىْ تَكُوْنُ مِنْكُمْ فِيْهَا الْغَفْلَةُ وَ التَّشَاغُلُ عَنِ الْمَوْعِظَةِ، وَ لَا تُرَخِّصُوْا لِاَنْفُسِكُمْ، فَتَذْهَبَ بِكُمُ الرُّخَصُ مَذَاهِبَ الظَّلَمَةِ، وَ لَا تُدَاهِنُوْا فَيَهْجُمَ بِكُمُ الْاِدْهَانُ عَلَى الْمَعْصِيَةِ.

تو اب اپنی بقیہ عمر میں (گزشتہ کی) تلافی کر لو اور ان ایام میں اپنے نفس پر صبر کرو اور یہ (ایام) ان بہت سے دنوں کے مقابلہ میں کم ہیں جن میں ۔۔۔غفلت اور وعظ و پند سے علیحدگی رہتی تھی۔[1] اور اپنے نفسوں کو ۔۔۔نہ چھوڑ دو کہ اس طرح چھوڑ دینا تمہیں ظالموں کا پیرو بنا دے گا اور (احکام خدا میں) سہل انگاری نہ کرو کہ (یہ) سہل انگاری تمہیں گناہ پر آمادہ کر دے گی۔[2]

---

[1] یعنی تم لوگوں کی عمر کا زیادہ حصہ غفلت اور گناہوں میں بسر ہو گیا اب جو حصہ رہ گیا ہے اس میں تلافی مافات کر لو اور نیک اعمال انجام دے کر ذخیرۂ آخرت مہیا کر لو کہ ابھی موقع باقی ہے۔

[2] ان دو جملوں میں حضرتؑ نے بڑی حکمت کا مضمون ارشاد فرمایا ہے کہ اپنے نفس کو چھوڑ نہ دو اور آزاد نہ کرو کہ وہ جس امر کی خواہش کرے یا جس برے امر کا ارادہ کرے اس کے کرنے پر آمادہ ہو جاؤ کہ ایسا کرنے سے نفس آرام طلب، شہوت پسند اور ظلم و فساد کا خوگر ہو جائے گا جس سے وہ ظالموں کی راہ اختیار کرے گا اور بدمعاشوں، شریروں کے روش کا عادی ہو جائے گا کیونکہ عام قاعدہ ہے انسان کی طبیعت تھوڑی اور ہلکی خیر سے ترقی کرتے کرتے بڑی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ پھر اگر اس کو مباح اور مکروہ شہوتوں کے لیے بھی چھوڑ دیا جائے گا تو وہ آئندہ چل کر حرام اور ناجائز لذتوں کی خواہش کرے گی۔ اور پرہیز گاری و تقویٰ و احتیاط میں سہل انگاری نہیں کرنی چاہیے کہ یہ لاپرواہی اور غفلت آہستہ آہستہ انسان کو خدا کی معصیت اور نافرمانی پر آمادہ کر دیتی ہے مثلاً نماز پڑھنے میں تاخیر کرنے لگے اور بغیر کسی عذر کے فضیلت کا وقت ترک کرنے لگے تو اس کا نتیجہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کبھی نماز میں اس قدر تاخیر ہو جائے جس سے نماز ہی قضا ہو جائے جو عین گناہ ہے۔

علامہ ابن میثم علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ روایت میں وارد ہوا ہے ایک مرتبہ ابلیس حضرت یحییٰ بن زکریاؑ کے پاس آیا اس کے پاس ہر چیز کا پھندہ تھا۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام نے اسے دریافت کیا کہ یہ پھندے کیسے ہیں؟ اس نے جواب دیا کہ یہی وہ شہوتیں ہیں جن سے میں بنی آدم کے دلوں کو فریفتہ کر کے گناہوں میں مبتلا کر دیتا ہوں۔ حضرت یحییٰؑ نے فرمایا کیا ان پھندوں میں کوئی پھندا میرے لیے بھی ہے؟ ابلیس نے کہا ہاں۔ آپ بعض وقت خوب سیر ہو کر کھانا کھاتے ہیں تو میں اکثر آپ کو (مستحبی) نماز اور وظیفہ سے غافل کر دیتا ہوں۔ حضرت یحییٰؑ نے فرمایا اس کے علاوہ بھی میرے لیے کوئی پھندا ہے؟ ابلیس نے کہا نہیں۔ تو حضرت یحییٰؑ نے فرمایا: اب میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ کبھی اپنے شکم کو کھانے سے نہیں بھروں گا۔ اس پر ابلیس نے کہا میں بھی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ (بقیہ صفحہ مابعد)

عِبَادَ اللّٰهِ! اِنَّ اَنْصَحَ النَّاسِ لِنَفْسِهٖ اَطْوَعُهُمْ لِرَبِّهٖ، وَ اِنَّ اَغَشَّهُمْ لِنَفْسِهٖ اَعْصَاهُمْ لِرَبِّهٖ وَ الْمَغْبُوْنُ مَنْ غَبَنَ نَفْسَهٗ، وَ الْمَغْبُوْطُ مَنْ سَلِمَ لَهٗ دِيْنُهٗ، وَ السَّعِيْدُ مَنْ وُّعِظَ بِغَيْرِهٖ، وَ الشَّقِيُّ مَنِ انْخَدَعَ لِهَوَاهُ (وَ غُرُوْرِهٖ).

بندگانِ خدا! اپنے نفس کا سب سے زیادہ بہی خواہ وہ شخص ہے جو اپنے پروردگار کا مطیع ہے اور اپنے نفس کو سب سے زیادہ فریب دینے والا وہ ہے جو سب سے زیادہ اپنے پروردگار کا نافرمان ہے۔ اور (درحقیقت) فریب خوردہ وہ شخص ہے جو اپنے نفس کو آپ فریب دے اور قابل رشک وہ ہے جس کا دین اس کے لیے محفوظ ہو۔ اور سعید وہ ہے جو اپنے غیر سے نصیحت کیا جائے اور شقی وہ ہے جو خود اپنی ہوا و ہوس اور اپنے فریب سے دھوکے میں رہے۔

وَ اعْلَمُوْا اَنَّ يَسِيْرَ الرِّيَآءِ شِرْكٌ، وَ مُجَالَسَةَ اَهْلِ الْهَوٰى مَنْسَاةٌ لِّلْاِيْمَانِ، وَ مَحْضَرَةٌ لِّلشَّيْطٰنِ. جَانِبُوا الْكَذِبَ فَاِنَّهٗ مُجَانِبٌ لِّلْاِيْمَانِ. الصَّادِقُ عَلٰى شَرَفٍ

اور خوب جان لو کہ تھوڑی سی ریاکاری بھی شرک ہے[1] اور نفس پرستوں کی ہم نشینی ایمان فروشی کا ذریعہ اور شیطان کے حاضر ہونے کی جگہ ہے۔ (تم لوگ) جھوٹ سے (بھی بہت) بچنا کیونکہ وہ (انسان) کو ایمان سے الگ کر دیتا ہے۔[2] سچ بولنے والا نجات اور کرامت کے

(بقیہ صفحہ ماقبل) آج سے کسی مسلمان سے سچی اور ہمدردی کی بات نہیں کروں گا۔ انتہیٰ۔

اور ''وَ لَا تُدَاهِنُوْا'' کی شرح میں علامہ ابن میثم علیہ الرحمہ تحریر فرماتے ہیں کہ ظالموں اور گنہگاروں سے نرمی اور خاطر داری کا برتاؤ نہ رکھو اور ان کے ساتھ چشم پوشی اور مسامحہ سے نہ پیش آؤ۔ اس طرح کہ ان کی جو برائیاں اور مظالم دیکھو ان پر خاموش رہ جاؤ اور فریضہ نہی عن المنکر کو ترک کر دو کہ اس سے گناہ پر اور زیادتی ہوگی، اس لیے کہ جب گناہوں کو ہوتے ہوئے بار بار دیکھتے رہو گے اور اس سے مانوس ہوتے جاؤ گے تو اس پر خاموش رہنے سے بھی تم گنہگار ہو گے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان گناہوں کو برابر دیکھتے دیکھتے ان گنہگاروں کی محبت میں رہتے رہتے تم بھی وہ گناہ کرنے لگو۔ مداہنہ کا معنی نرمی کرنا، نفاق کرنا، ظاہر داری کرنا یعنی ظاہر کچھ باطن کچھ یہی معنی ادہان کا بھی ہے۔ خداوند عالم قرآن مجید سورۂ ن میں ارشاد فرماتا ہے:

﴿ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ﴾ (سورۂ القلم، آیہ ۹)

یعنی وہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اگر تم نرمی اختیار کرو تو وہ بھی نرم ہو جائیں۔

[1] ریا کی مذمت پہلے اسی کتاب میں بیان ہو چکی ہے اس کا شرک ہونا بھی واضح ہے۔

[2] جھوٹ سے بچنے کی بڑی تاکید احادیث میں وارد ہوئی ہے۔ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تم ہرگز جھوٹ کے قریب نہ جانا کیونکہ جھوٹ تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ کوئی شخص حضرت رسول خداؐ کے پاس آیا اور کہا میں چار گناہ چھپا کر کرنے کا (بقیہ صفحہ مابعد)

مَنْجَاةٍ وَّ كَرَامَةٍ، وَ الْكَاذِبُ عَلٰى شَفَا مَهْوَاةٍ وَّ مَهَانَةٍ.

وَ لَا تَحَاسَدُوْا، فَاِنَّ الْحَسَدَ يَاْكُلُ الْاِيْمَانَ كَمَا تَاْكُلُ النَّارُ الْحَطَبَ، وَ لَا تَبَاغَضُوْا، فَاِنَّهَا الْحَالِقَةُ.

وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ الْاَمَلَ يُسْهِى الْعَقْلَ، وَ يُنْسِى الذِّكْرَ، فَاَكْذِبُوا الْاَمَلَ فَاِنَّهٗ غُرُوْرٌ، وَ صَاحِبُهٗ مَغْرُوْرٌ.

کنارے اور جھوٹ بولنے والا گڑھے اور ذلت کی جگہ کے کنارے (رہتا) ہے۔

اور تم ایک دوسرے سے حسد بھی نہ کرنا اس لیے کہ حسد ایمان کو کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔ اور آپس میں بغض (و عداوت) نہ رکھا کرو کہ وہ (تمام خوبیوں کا) مٹا دینے والا ہے۔

اور خوب سمجھ لو کہ امید عقل کو سہو میں مبتلا کر دیتی اور ذکر (آخرت) کو بھلا دیتی ہے۔ تو تم اپنی امید کے خلاف کیا کرو کیونکہ وہ فریب (ہی فریب) ہے اور اس کا صاحب فریب خوردہ (ہی) رہتا ہے۔

❁ خطبہ :۸۵ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

عِبَادَ اللّٰهِ! اِنَّ مِنْ اَحَبِّ عِبَادِ اللّٰهِ اِلَيْهِ عَبْدًا اَعَانَهُ اللّٰهُ عَلٰى نَفْسِهٖ، فَاسْتَشْعَرَ الْحُزْنَ، وَ تَجَلْبَبَ الْخَوْفَ، فَزَهَرَ مِصْبَاحُ الْهُدٰى فِيْ قَلْبِهٖ، وَ اَعَدَّ الْقِرٰى لِيَوْمِهِ النَّازِلِ بِهٖ، فَقَرَّبَ عَلٰى

خطبہ (۸۵)

حضرت علیہ السلام کے ایک خطبہ کا کچھ حصّہ۔

خدا کے بندو! یقیناً خدا کو اس کے بندوں میں سب سے زیادہ محبوب وہ بندہ ہے جسے خدا نے اس کے نفس پر اعانت (کر کے غالب) کیا تو اس نے حزن و اندوہ کو اپنا باطنی لباس اور خوف کو ظاہری لباس بنا لیا جس سے شمعِ ہدایت اس کے دل میں روشن ہو گئی اور اس نے اپنے آنے والے دن (یعنی موت) کی میزبانی کا سامان کر لیا اس

(بقیہ صفحہ ماقبل) عادی ہو گیا ہوں: زنا، شراب خوری، چوری اور جھوٹ بولنے کا۔ آپ کے خاطر سے صرف ایک گناہ کو چھوڑ سکتا ہوں۔ فرمایا اچھا جھوٹ بولنا ترک کر دے۔ وہ وعدہ کر کے چلا گیا چند دنوں کے بعد زنا کا ارادہ کیا مگر فوراً ہی خیال ہوا کہ آنحضرتؐ کو خبر ہو جائے، آپ مجھ سے دریافت فرمائیں تو میں جھوٹ بول نہیں سکتا کیونکہ اس کا وعدہ کر آیا ہوں اور سچ بول کر زنا کا اقرار کر لوں گا تو آنحضرتؐ مجھ پر حد جاری کر دیں گے، لہٰذا زنا سے باز رہا۔ پھر چوری کا قصد کیا اس میں بھی یہی خیال ہوا۔ پھر شراب پینے کا ارادہ کیا اس وقت بھی یہی خوف پیدا ہوا۔ غرض اس طرح صرف ایک جھوٹ چھوڑ دینے سے وہ شخص تمام گناہوں سے بچ گیا۔

نَفْسِهِ الْبَعِيْدَ، وَ هَوَّنَ الشَّدِيْدَ، نَظَرَ فَاَبْصَرَ، وَ ذَكَرَ فَاسْتَكْثَرَ، وَ ارْتَوٰى مِنْ عَذْبٍ فُرَاتٍ سُهِّلَتْ لَهٗ مَوَارِدُهٗ، فَشَرِبَ نَهَلًا، وَ سَلَكَ سَبِيْلًا جَدَدًا. قَدْ خَلَعَ سَرَابِيْلَ الشَّهَوَاتِ، وَ تَخَلّٰى مِنَ الْهُمُوْمِ، اِلَّا هَمًّا وَّاحِدًا انْفَرَدَ بِهٖ، فَخَرَجَ مِنْ صِفَةِ الْعَمٰى، وَ مُشَارَكَةِ اَهْلِ الْهَوٰى، وَ صَارَ مِنْ مَّفَاتِيْحِ اَبْوَابِ الْهُدٰى، وَ مَغَالِيْقِ اَبْوَابِ الرَّدٰى.

قَدْ اَبْصَرَ طَرِيْقَهٗ، وَ سَلَكَ سَبِيْلَهٗ، وَ

طرح اس نے اپنے نفس پر بعید (یعنی موت) کو قریب اور سخت کو آسان کر لیا ہے۔ (غرض) اس نے غور وفکر کی تو بینا ہو گیا اور سمجھا تو بہت با معرفت ہو گیا اور ایسے شیریں خوشگوار چشمہ سے سیراب ہو گیا جس کی گھاٹیں اس کے لیے سہل کر دی گئیں۔ تو اس نے بار بار اس سے پیا اور (پھر سفر کیا تو) راہ ہموار پر روانہ ہو گیا (اس طرح کہ) شہوات نفسانیہ کا پیراہن اتار پھینکا [1] اور تمام ہموم (وآلام) سے الگ ہو گیا سوا ایک غم کے جس میں وہ تنہا مبتلا ہے۔ تو (اس طرح) وہ نابینائی (اور جہالت) کی صفت اور نفس پرستوں کی صحبت سے نکل گیا اور دروازہ ہائے ہدایت کی کنجیوں سے (ایک کنجی) اور دروازہ ہائے گمراہی کے قفلوں سے (ایک قفل) بن گیا۔

اس نے اپنی (ہدایت کی) راہ دیکھ لی اور اس کے

---

[1] علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ ''علم طریقت وحقیقت کے اصحاب نے اپنا علم حضرتؑ کے اسی خطبہ سے حاصل کیا ہے اور یہ خطبہ عارفین کی حالت اور خدا کے یہاں ان کے درجہ کی تصریح ہے اور عرفان اس رفیع اور شریف درجہ کا نام ہے جو نبوت کے مناسب ہے جس سے خدا ان لوگوں کو مخصوص کرتا ہے جنہیں اپنے یہاں مقرب کرنا چاہتا ہے اور اولیاء کے تین طبقہ ہیں، پہلا طبقہ عابدوں کا ہے دوسرا زاہدوں کا اور تیسرا عارفوں کا۔ اور یہ سب سے۔۔۔

(صفحات کی عدم موجودگی کی وجہ سے یہ حاشیہ نامکمل ہے)

(عدم دستیاب صفحات کا باقیہ حاشیہ)۔۔۔تھی اسی وجہ سے تم دیکھتے ہو کہ حکمت وفلسفہ وکلام کے وہ بڑے بڑے علمائے اسلام ومتکلمین جنہوں نے علوم عقلیہ کے سمجھنے سمجھانے اور ان میں تصنیف وتالیف کرنے میں اپنی عمریں بسر کر دیں سب کے سب اپنے کو حضرت علیؑ کی طرف منسوب کرتے اور حضرتؑ ہی سے خوشہ چینی کا دعویٰ کرتے ہیں اور اس فن میں آپ کے سوا کسی کا نام نہیں لیتے ہیں اور ان سب نے حضرتؑ کو اپنا استاد اور سردار وآقا مان لیا ہے اور اسلام کے کل فرقے اپنے کو حضرتؑ ہی کا شاگرد اور پیرو بتاتے ہیں۔ معتزلہ، اشاعرہ، زیدیہ، امامیہ، کرامیہ حتی کہ خوارج بھی اپنے کو حضرتؑ ہی کے سلسلہ میں شمار کرتے ہیں اگرچہ وہ لوگ بعد میں حضرتؑ کے خلاف ہو گئے مگر علم الٰہی حاصل کرنے کا جو کچھ فخر انہیں رہا وہ حضرتؑ ہی سے''۔

عَرَفَ مَنَارَهٗ، وَ قَطَعَ غِمَارَهٗ، اسْتَمْسَكَ مِنَ الْعُرٰى بِاَوْثَقِهَا، وَ مِنَ الْحِبَالِ بِاَمْتَنِهَا، فَهُوَ مِنَ الْيَقِيْنِ۔

رستہ پر چل پڑا۔ وہ اس کی علامتوں کو پہچان گیا اور اس کی دقتوں کو طے کر گیا اور (مذہب کی) رسیوں سے مضبوط ترین (رسی) اور (دین کی) ڈوریوں سے محکم ترین (ڈوری) کو تھام لیا۔ اس طرح وہ صفت یقین۔

(صفحہ ۲۵۰و۲۵۱ کی عدم دستیابی کی وجہ سے عربی اور ترجمہ مفتی جعفر حسینؒ کے ترجمہ سے لیا گیا ہے)

ترجمہ از مفتی جعفر حسینؒ

عَلٰى مِثْلِ ضَوْءِ الشَّمْسِ، قَدْ نَصَبَ نَفْسَهٗ لِلّٰهِ سُبْحَانَهٗ فِيْۤ اَرْفَعِ الْاُمُوْرِ، مِنْ اِصْدَارِ كُلِّ وَارِدٍ عَلَيْهِ، وَ تَصْيِيْرِ كُلِّ فَرْعٍ اِلٰۤى اَصْلِهٖ. مِصْبَاحُ ظُلُمَاتٍ، كَشَّافُ عَشَوَاتٍ، مِفْتَاحُ مُبْهَمَاتٍ، دَفَّاعُ مُعْضِلَاتٍ، دَلِيْلُ فَلَوَاتٍ، يَقُوْلُ فَيُفْهِمُ، وَ يَسْكُتُ فَيَسْلَمُ.

کی وجہ سے ایسے اجالے میں ہے جو سورج کی چمک دمک کے مانند ہے۔ وہ صرف اللہ کی خاطر سب سے اونچے مقصد کو پورا کرنے کیلئے اٹھ کھڑا ہوا ہے کہ ہر مشکل کو جو اس کے سامنے آئے، مناسب طور سے حل کر دے، ہر فرع کو اس کے اصل و مآخذ کی طرف راجع کرے۔ وہ تاریکیوں میں روشنی پھیلانے والا، مشتبہ باتوں کو حل کرنے والا، الجھے ہوئے مسئلوں کو سلجھانے والا، گنجلکوں کو دور کرنے والا اور لق و دق صحراؤں میں راہ دکھانے والا ہے۔ وہ بولتا ہے تو پوری طرح سمجھا دیتا ہے اور کبھی چپ ہو جاتا ہے اس وقت جب چپ رہنا ہی سلامتی کا ذریعہ ہے۔

قَدْ اَخْلَصَ لِلّٰهِ فَاسْتَخْلَصَهٗ، فَهُوَ مِنْ مَّعَادِنِ دِيْنِهٖ، وَ اَوْتَادِ اَرْضِهٖ. قَدْ اَلْزَمَ نَفْسَهُ الْعَدْلَ، فَكَانَ اَوَّلُ عَدْلِهٖ نَفْيَ الْهَوٰى عَنْ نَّفْسِهٖ، يَصِفُ الْحَقَّ وَ يَعْمَلُ بِهٖ، لَا يَدَعُ لِلْخَيْرِ غَايَةً اِلَّاۤ اَمَّهَا، وَ لَا مَظِنَّةً اِلَّا

اس نے ہر کام اللہ کیلئے کیا تو اللہ نے بھی اسے اپنا بنا لیا ہے۔ وہ دین خدا کا معدن اور اس کی زمین میں گڑی ہوئی میخ کی طرح ہے۔ اس نے اپنے لئے عدل کو لازم کر لیا ہے چنانچہ اس کے عدل کا پہلا قدم خواہشوں کو اپنے نفس سے دور رکھنا ہے۔ حق کو بیان کرتا ہے تو اس پر عمل بھی کرتا ہے۔ کوئی نیکی کی حد ایسی نہیں جس کا اس نے ارادہ نہ کیا ہو اور کوئی جگہ ایسی نہیں ہے کہ جہاں نیکی کا امکان ہو اور اس نے قصد نہ کیا

قَصَدَهَا، قَدْ اَمْكَنَ الْكِتَابَ مِنْ زِمَامِهٖ، فَهُوَ قَآئِدُهٗ وَ اِمَامُهٗ، يَحُلُّ حَيْثُ حَلَّ ثَقَلُهٗ، وَ يَنْزِلُ حَيْثُ كَانَ مَنْزِلُهٗ. وَ اٰخَرُ قَدْ تَسَمّٰى عَالِمًا وَّ لَيْسَ بِهٖ فَاقْتَبَسَ جَهَآئِلَ مِنْ جُهَّالٍ وَّ

ہو۔اس نے اپنی باگ ڈور قرآن کے ہاتھوں میں دے دی ہے۔ وہی اس کا رہبر اور وہی اس کا پیشوا ہے۔ جہاں اس کا بارِگراں اترتا ہے وہیں اس کا سامان اترتا ہے اور جہاں اس کی منزل ہوتی ہے وہیں یہ بھی اپنا پڑاؤ ڈال دیتا ہے۔(اس کے علاوہ) ایک دوسرا شخص ہوتا ہے جس نے (زبردستی) اپنا نام عالم رکھ لیا ہے، حالانکہ وہ عالم۔(اختتام ترجمہ مفتی صاحب) نہیں ہے۔[1] اس نے تو جاہلوں سے جہالت کی اور

---

[2] علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ ''اس خطبہ کے شروع سے یہاں تک حضرتؑ نے عارفین کی صفات اور شرطوں میں سولہ باتیں ذکر کی ہیں تو اس پورے کلام کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن۔ ظاہر تو مطلقاً عارفین کے اوصاف کا بیان ہے مگر باطن یہ ہے کہ یہ تمام اوصاف خود حضرت علی علیہ السلام کے ہیں''۔

[1] یہ دوسرے بندے کا ذکر ہے جو مذکورہ بالا بندے کا ضد ہے اور جس میں وہ اوصاف ہوتے ہیں جو اوصاف مذکورہ کے خلاف ہیں اس سے کل وہ خلفاء مراد ہو سکتے ہیں جنہوں نے خلافت کو غصب کر کے اس پر قبضہ کر لیا اور بغیر قابلیت و اہلیت امامت رکھے ہوئے لوگوں کی دینی پیشوائی کرنے لگے۔ ''حَمَلَ الْكِتَابَ عَلٰٓى اٰرَآئِهٖ'' کا مطلب یہ ہے کہ وہ قرآن کی تفسیر اپنی خواہش کے مطابق کرتے ہیں جو ارشاد رسول خداؐ کے خلاف ہوتی ہے۔ یہ شخص کہتا ہے کہ میں شبہوں کے نزدیک رک جاتا ہوں حالانکہ اسی میں وہ واقع ہوتا ہے۔ حضرت ابوبکر نے خطبہ میں فرمایا ہے:

فَاِذَا رَاَيْتُمُوْنِيْ زِغْتُ فَقَوِّمُوْنِيْ، وَاعْلَمُوْا اَنَّ لِيْ شَيْطَانًا يَعْتَرِيْنِيْ۔
یعنی مسلمانو! جب تم دیکھو کہ میں کج روی اختیار کر رہا ہوں تو مجھے سیدھا کر دینا اور جان رکھو کہ میرا ایک شیطان ہے جو مجھ پر مسلّط رہتا ہے۔(صواعق محرقہ، صفحہ ۱۰، و تاریخ الخلفاء صفحہ ۴۹)

اور حضرت عمر نے ایک مرتبہ برسر منبر فرمایا:
لوگو اپنی ازواج کے مہر بھاری نہ کرو جو کوئی چار سو درہم سے زیادہ مہر مقرر کرے گا میں اس زیادتی کو چھین کر بیت المال میں داخل کر دوں گا۔

اس پر ایک قریشی عورت نے ٹوکا کہ اے پسر خطاب خدا کا کلام پیروی کے لائق ہے یا تمہارا؟ حضرت عمر نے فرمایا خدا کا۔ اس نے کہا پھر تم زائد مہر کو کیوں کر لے سکتے ہو۔ خدا فرماتا ہے:

﴿وَّ اٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا﴾ (سورۃ النساء، آیہ ۲۰)
اگر تم کسی عورت کو ایک قنطار بھی مہر دے دو تو اس میں سے کچھ بھی واپس نہ لو۔

(بقیہ صفحہ مابعد)

اَضَالِيْلَ مِنْ ضُلَّالٍ، وَ نَصَبَ لِلنَّاسِ اَشْرَاكًا مِّنْ حَبَآئِلِ غُرُوْرٍ، وَ قَوْلِ زُوْرٍ، قَدْ حَمَلَ الْكِتَابَ عَلٰٓى اٰرَآئِهٖ، وَ عَطَفَ الْحَقَّ عَلٰٓى اَهْوَآئِهٖ، يُؤَمِّنُ النَّاسَ مِنَ الْعَظَآئِمِ، وَ يُهَوِّنُ كَبِيْرَ الْجَرَآئِمِ، يَقُوْلُ: اَقِفُ عِنْدَ الشُّبُهَاتِ، وَ فِيْهَا وَقَعَ، وَ يَقُوْلُ: اَعْتَزِلُ الْبِدَعَ، وَ بَيْنَهَا اضْطَجَعَ، فَالصُّوْرَةُ صُوْرَةُ اِنْسَانٍ، وَ الْقَلْبُ قَلْبُ حَيَوَانٍ، لَا يَعْرِفُ بَابَ الْهُدٰى فَيَتَّبِعَهٗ، وَ لَا بَابَ الْعَمٰى فَيَصُدَّ

گمراہوں سے گمراہی کی باتیں سیکھ رکھی ہیں اور لوگوں کے لیے دھوکے اور فریب کی باتوں کی رسیوں سے (بنے ہوئے) جال بچھا دیے ہیں۔ یہ شخص (ایسا شیطان ہے کہ) کتاب (خدا) کی تفسیر اپنی رایوں سے کرتا اور امر حق کو اپنی ہواو ہوس (نفسانی) پر موڑتا رہتا ہے۔ لوگوں کو بڑے بڑے جرموں سے مطمئن کر دیتا اور گناہان کبیرہ کو (ان کی نظروں میں) حقیر کر دکھاتا ہے۔ دعوے تو یہ کرتا ہے کہ میں شبہوں تک پر رک جاتا ہوں مگر انہی میں وہ گرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں بدعتوں سے الگ رہتا ہوں حالانکہ انہی میں پڑا ہوا ہے (ایسے شخص کی) صورت شکل تو انسان کی مگر دل (و دماغ) بہائم کا ہے[1] وہ نہ دروازہ ہدایت کو پہچانتا ہے تا کہ اس کی پیروی کرے اور نہ گمراہی کے در کو (جانتا ہے) تا کہ اس سے باز رہے۔ یہ شخص زندوں کا مردہ ہے۔

تو (دیکھو) تم لوگ کہاں چلے جا رہے ہو اور کدھر

یہ سن کر حضرت عمر نے دو تین مرتبہ فرمایا:

كُلُّ النَّاسِ اَفْقَهُ مِنْ عُمَرَ حَتّٰى مُخَدَّرَاتِ الْحِجَالِ۔

یعنی سب لوگ عمر سے زیادہ علم فقہ جانتے ہیں یہاں تک کہ پردہ نشین عورتیں بھی۔ (دیکھو تحفہ اثنا عشریہ مطاعن عمر، فیض القدیر، وکنز العمال صفحہ ۴۰۱ جلد ۶، وتفسیر درمنثور صفحہ جلد وغیرہ)

[1] ایک چڑیا درخت پر بیٹھ کر بولنے لگی، حضرت ابوبکر نے اس کو دیکھ کر فرمایا کاش ابوبکر بھی تجھ ہی جیسا ہوتا، بلکہ اس سے بھی آپ نے ترقی کی اور فرمایا کاش میں درخت ہوتا جس کو جانور کھا جاتے۔ (تاریخ الخلفاء صفحہ ۷۱) پھر فرمایا کاش میں سڑک کے کنارے ایک درخت ہوتا اور کوئی اونٹ آ کر مجھے چبا جاتا اور نگل جاتا، پھر مینگنی کر کے مجھے پھینک دیتا اور میں آدمی نہ ہوتا۔ اور حضرت عمر فرمایا کرتے تھے کاش میں دنبہ ہوتا اور مجھے پال کر ایسا موٹا کیا جاتا کہ لوگ مجھے ذبح کر ڈالتے اور میرے گوشت کا قیمہ کرتے اور کچھ حصہ کا شوربہ پکا کر کھا جاتے مگر میں آدمی نہ ہوتا۔ (تاریخ الخلفاء، صفحہ ۹۰) انہیں حضرت عمر نے ایک مرتبہ گھانس کا تنکا اٹھا کر کہا کاش میں بھی تنکا ہوتا۔ (تاریخ الخلفاء صفحہ ۸۸)

عَنْهُ، وَ ذٰلِكَ مَيِّتُ الْاَحْيَآءِ!.

﴿فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ﴾ وَ ﴿اَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ﴾!

وَ الْاَعْلَامُ قَآئِمَةٌ، وَ الْاٰيَاتُ وَاضِحَةٌ، وَ الْمَنَارُ مَنْصُوْبَةٌ، فَاَيْنَ يُتَاهُ بِكُمْ؟ بَلْ كَيْفَ تَعْمَهُوْنَ وَ بَيْنَكُمْ عِتْرَةُ نَبِيِّكُمْ؟ وَ هُمْ

بہکے جاتے ہو باوجودیکہ (ہدایت کے) جھنڈے گڑھے اور (حق) کے نشان واضح اور (صراط مستقیم کی) علامتیں قائم ہیں۔ پھر تم کہاں سرگرداں ہو رہے اور کیسے بھٹک رہے ہو۔ حالانکہ تمہارے درمیان تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عترت (اہل بیتؑ) موجود ہیں[1] اور وہی حق کے زمام اور دین کے جھنڈے اور سچائی کی زبانیں ہیں۔[2] تو

---

[1] تمہارے درمیان تمہارے نبی کی عترت طاہرہ موجود ہے پھر تم انہیں چھوڑ کر دوسروں کی پیروی کیوں کرتے ہو حالانکہ حضرت رسول خداؐ نے تو انہیں عترت کی پیروی کا تمہیں حکم دیا ہے۔ بار بار فرمایا ہے:

اَيُّهَا النَّاسُ، اِنِّيْ تَرَكْتُ فِيْكُمْ مَا اِنْ اَخَذْتُمْ بِهٖ لَنْ تَضِلُّوْا: كِتَابَ اللّٰهِ، وَعِتْرَتِيْ اَهْلَ بَيْتِيْ۔

(مشکوٰۃ فصل دوم مناقب اہل بیت صفحہ ۵۶۹ از ترمذی)

یعنی مسلمانو! میں تم میں وہ چیزیں چھوڑے جاتا ہوں جن کی تم پیروی کرتے رہو گے تو ہرگز ہرگز گمراہ نہ ہو گے وہ قرآن مجید اور میری عترت ہیں، وہی میرے اہل بیت ہیں۔

نیز فرمایا:

اِنِّيْ تَارِكٌ فِيْكُمْ مَا اِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهٖ لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِيَ الثَّقَلَيْنِ اَحَدُهُمَا اَعْظَمُ مِنَ الْاٰخَرِ: كِتَابُ اللّٰهِ، حَبْلٌ مَّمْدُوْدٌ مِنَ السَّمَاءِ اِلَى الْاَرْضِ، وَعِتْرَتِيْ اَهْلُ بَيْتِيْ، وَلَنْ يَّفْتَرِقَا حَتّٰى يَرِدَا عَلَيَّ الْحَوْضَ۔

یعنی مسلمانو! میں تم میں دو بزرگ چیزیں چھوڑے جاتا ہوں جب تک دونوں سے تم متمسک رہو گے ہرگز گمراہ نہ ہو گے۔ ایک دوسرے سے عظیم تر ہے ایک کتاب خدا ہے جو آسمان سے زمین تک خدا کی رسی ہے (یعنی جس میں آسمان سے زمین تک کا علم ہے) دوسرے میری عترت اہل بیتؑ ہیں، یہ دونوں قیامت تک ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے۔ (دیکھو جامع ترمذی صفحہ ۲۲۰ جلد ۲ وصواعق محرقہ صفحہ ۸۹، مدارج النبوۃ ص ۵۶۱، جلد ۲ وحبیب السیر جلد ۱ جزو ۳ صفحہ ۴۷، وجامع الاصول قلمی صفحہ ۲۰ وغیرہ)۔

[2] ''اَزِمَّةُ الْحَقِّ''، یعنی وہ حضرات حق کے زمام ہیں۔ جس طرح گھوڑا لگام کا تابع ہوتا ہے کہ جدھر لگام موڑتی ہے ادھر گھوڑا مڑ جاتا ہے، اسی طرح حق حضرات اہل بیتؑ کا تابع ہے کہ یہ حضرات جدھر جاتے ہیں ادھر ہی حق بھی جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت رسول خداؐ نے بھی یہی فرمایا ہے:

اَللّٰهُمَّ اَدِرِ الْحَقَّ مَعَهٗ حَيْثُ دَارَ۔ یا اللہ حق کو علیؑ کے ساتھ پھیر جدھر جدھر وہ پھریں۔ (مدارج النبوۃ صفحہ ۲۲۸ و ۵۲۱ جلد ۲، تحفہ اثنا عشریہ باب ۷ صفحہ ۳۴۳ و کنز العمال وشرح ابن ابی الحدید جلد ۲ صفحہ ۱۳۰ وغیرہ میں)

اَزِمَّةُ الْحَقِّ، وَ اَعْلَامُ الدِّيْنِ، وَ اَلْسِنَةُ الصِّدْقِ! فَاَنْزِلُوْهُمْ بِاَحْسَنِ مَنَازِلِ الْقُرْاٰنِ، وَ رِدُوْهُمْ وُرُوْدَ الْهِيْمِ الْعِطَاشِ.

اَيُّهَا النَّاسُ! خُذُوْهَا عَنْ خَاتَمِ النَّبِيِّيْنَ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: ''اِنَّهٗ يَمُوْتُ مَنْ مَّاتَ مِنَّا وَ لَيْسَ بِمَيِّتٍ، وَ يَبْلٰى مَنْ بَلِيَ مِنَّا وَلَيْسَ بِبَالٍ''.

تم قرآن کو جن مرتبوں کا سمجھتے ہو ان سے (بھی) بہتر درجوں پر ان (حضرات) کو سمجھو[1] اور ان کے پاس اس طرح پہنچو جس طرح پیاسے اونٹ (بے چین ہو کر پانی پر) ٹوٹتے ہیں۔

لوگو اس (بات) کو حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (کی زبان مبارک) سے سنو کہ (حضرتؐ نے فرمایا ہے) جو شخص ہم (اہل بیتؑ) میں سے مرتا ہے وہ (صرف ظاہری موت) مرتا ہے مگر (درحقیقت) وہ مردہ نہیں ہے۔ اور جو شخص ہم میں سے کہنہ ہو جاتا ہے وہ (ظاہراً تو) پرانا ہوتا ہے مگر (فی الواقع) پرانا نہیں ہوتا۔[2]

---

[1] ابن ابی الحدید لکھتے ہیں ''فَاَنْزِلُوْهُمْ'' کے نیچے ایک عظیم الشان نکتہ ہے اور وہ یہ کہ خدا نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ عترت و اہل بیتؑ کی تعظیم اور اکرام اور ان کی اطاعت اور پیروی و فرمانبرداری اسی شان سے کریں جس طرح قرآن کی کرتے ہیں کہ اس کے ذرہ برابر فرق نہ ہو، اگر تم کہو کہ یہ قول تو بتاتا ہے کہ اہل بیت معصوم ہیں پھر تم اہل سنت کا مذہب اس کے بارے میں کیا ہے؟ تو میں کہوں گا کہ ابو محمد بن متویہ رحمہ اللہ نے کتاب الکفایۃ میں اس مضمون پر نص کر دی ہے کہ حضرت علی علیہ السلام معصوم ہیں اور نصوص کی دلیلوں نے حضرتؑ کی عصمت پر مہر کر دی ہے اور یہ ایسی صفت ہے جو حضرت علیؑ ہی میں پائی جاتی ہے آپ کے سوا کسی صحابی رسولؐ کو یہ شرف حاصل نہیں ہے۔

[2] ایک مطلب اس کا یہ ہے کہ یہ حضرات گو دنیا میں موجود نہیں ہیں مگر ان کا نام اور ان کے برکات موجود ہیں لہٰذا یہ حضرات زندہ ہیں۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ کوئی زمانہ ایسا نہیں ہوتا جس میں ائمہ طاہرین علیہم السلام سے دنیا میں کوئی موجود نہ رہتا ہو اس وقت بھی حضرت حجت موجود ہیں۔ تیسرا یہ کہ کل ائمہ طاہرینؑ خدا کی راہ میں شہید کیے گئے لہٰذا قول خدا کے مطابق یہ حضرات مردہ نہیں ہوئے بلکہ زندہ ہیں۔ خدا فرماتا ہے:

﴿وَ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ﴾ (سورۂ آل عمران، آیہ ۱۶۹)

یعنی جو لوگ خدا کی راہ میں شہید کیے گئے انہیں ہرگز مردہ نہ سمجھنا بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے پروردگار کے یہاں سے روزی پاتے رہتے ہیں۔

اور مفتی محمد عبدہ مصری لکھتے ہیں کہ وہ حضرات درحقیقت زندہ ہیں کیونکہ ان کی روح باقی اور ان کا نور عالم ظہور میں روشن و درخشندہ ہے۔

فَلَا تَقُوْلُوْا بِمَا لَا تَعْرِفُوْنَ، فَاِنَّ اَكْثَرَ الْحَقِّ فِيْمَا تُنْكِرُوْنَ، وَ اعْذِرُوْا مَنْ لَّا حُجَّةَ لَكُمْ عَلَيْهِ۔ وَ اَنَا هُوَ۔

تو تم وہ بات نہ کہو جس کو سمجھتے نہیں ہو کیونکہ اکثر (امر) حق اسی میں ہوتا ہے جس کو تم عجیب سمجھتے ہو۔[1] اور اس شخص کو معذور سمجھو جس پر تمہاری کوئی حجت نہیں ہے اور وہ میں ہی ہوں۔

اَلَمْ اَعْمَلْ فِيْكُمْ بِالثَّقَلِ الْاَكْبَرِ؟! وَ اَتْرُكْ فِيْكُمُ الثَّقَلَ الْاَصْغَرَ؟! وَ رَكَزْتُ فِيْكُمْ رَايَةَ الْاِيْمَانِ، وَ وَقَفْتُكُمْ عَلٰى حُدُوْدِ الْحَلَالِ وَ الْحَرَامِ، وَ اَلْبَسْتُكُمُ الْعَافِيَةَ مِنْ عَدْلِيْ، وَ فَرَشْتُكُمُ الْمَعْرُوْفَ مِنْ قَوْلِيْ وَ فِعْلِيْ، وَ اَرَيْتُكُمْ كَرَآئِمَ الْاَخْلَاقِ مِنْ نَّفْسِيْ، فَلَا تَسْتَعْمِلُوا الرَّاْيَ فِيْمَا لَا يُدْرِكُ قَعْرَهُ الْبَصَرُ، وَ لَا تَتَغَلْغَلُ اِلَيْهِ الْفِكَرُ.

کیا میں نے تمہارے بارے میں ثقلِ اکبر (قرآن مجید) پر عمل نہیں کیا؟ اور تم میں ثقلِ اصغر (اہل بیت علیہم السلام) کو نہیں چھوڑ دیا ہے؟[2] اور میں ہی نے تو تم میں ایمان کا جھنڈا گاڑا اور تم کو حلال و حرام کی حدوں پر ٹھہرایا اور تمہیں اپنے عدل سے عافیت کا لباس پہنایا اور قول و فعل اپنے اعمال خیر کو تمہارے لیے بچھایا اور تمہیں اپنے نفس کے بہترین اخلاق دکھائے ہیں۔ تو جس کی تہ کو آنکھیں نہیں پا سکتی ہیں اور جس امر تک فکر کی رسائی نہیں ہو سکتی ہے اس میں اپنی رائے زنی نہ کرو۔[3]

[وَ مِنْهَا]

[اور اسی خطبہ کے بعض جملے یہ بھی ہیں۔[4]

حَتّٰى يَظُنَّ الظَّانُّ اَنَّ الدُّنْيَا مَعْقُوْلَةٌ عَلٰى بَنِيْ اُمَيَّةَ، تَمْنَحُهُمْ دَرَّهَا، وَ تُوْرِدُهُمْ

یہاں تک کہ گمان کرنے والا یہ خیال کرتا ہے کہ دنیا تو بنی امیہ ہی کے اوپر باندھ دی گئی ہے انہی کو وہ اپنا دودھ دیتی اور انہی

---

[1] مثلاً بروز قیامت مُردوں کا زندہ ہونا پل صراط اور میزان اعمال کا قائم ہونا، بہشت و دوزخ کا موجود ہونا وغیرہ کل امور آخرت ایسے ہی ہیں کہ گو عجیب معلوم ہوتے ہیں مگر حق ہیں۔

[2] لغت میں ثقل کا حقیقی معنی مسافر کے اسباب اور بوجھ کے ہیں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ میں دنیا سے جا رہا ہوں تو اپنے دو بڑے سامان یعنی قرآن مجید اور اپنی اہل بیتؑ کو تم میں چھوڑے جاتا ہوں یہی ثقلین ہیں۔

[3] یعنی اہل بیتؑ کے فضائل و مناقب بے حد و حساب اور انسانی ادراک سے بالاتر ہیں وہاں تک عقلوں کی رسائی نہیں ہو سکتی اور کسی کا دماغ ان کے درجہ کو پہچان نہیں سکتا ہے تو تم ان کی حقیقی معرفت کی کنہ تک پہنچنے کی کوشش نہ کرو۔

[4] علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ یہ خطبہ طویل ہے جس کے بہت سے جملوں کو جناب سید رضی علیہ الرحمہ نے حذف کر دیا ہے (یہ جملے انشاء اللہ ضمیمہ میں درج کر دیے جائیں گے)۔

صَفْوَهَا، وَ لَا يُرْفَعُ عَنْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ سَوْطُهَا وَ لَا سَيْفُهَا، وَ كَذَبَ الظَّانُّ لِذٰلِكَ. بَلْ هِيَ مَجَّةٌ مِّنْ لَّذِيْذِ الْعَيْشِ يَتَطَعَّمُوْنَهَا بُرْهَةً، ثُمَّ يَلْفِظُوْنَهَا جُمْلَةً!.

کو اپنے صاف اور شیرین چشموں پر لاتی ہے اور اس امت کے سر سے نہ ان کا کوڑا ہٹے گا نہ ان کی تلوار علیحدہ ہوگی حالانکہ ایسا گمان کرنے والا بالکل غلط سمجھا۔ بلکہ یہ (بنی امیہ کی سلطنت) تو لذیذ عیش کی صرف ایک کلّی ہے جس کو کچھ زمانہ تک تو وہ نوش جان کریں گے پھر سب کو اُگل دینا پڑے گا۔[1]

❁ خطبہ :۸۶ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

اَمَّا بَعْدُ! فَاِنَّ اللّٰهَ لَمْ يَقْصِمْ جَبَّارِيْ دَهْرٍ قَطُّ اِلَّا بَعْدَ تَمْهِيْلٍ وَّ رَخَآءٍ، وَ لَمْ يَجْبُرْ عَظْمَ اَحَدٍ مِّنَ الْاُمَمِ اِلَّا بَعْدَ اَزْلٍ وَّ بَلَآءٍ، وَ

خطبہ(۸۶)

حضرت علیہ السلام کے ایک خطبہ کا کچھ حصّہ۔

حمد و نعت کے بعد (واضح ہو کہ) یقیناً خدا نے کسی زمانہ کے ظالموں (اور سرکشوں کی قوت) کو نہیں توڑا ہے مگر (انہیں اچھی طرح) مہلت دینے اور عیش و راحت پہنچانے کے بعد[2] اور کسی امت کی (ٹوٹی ہوئی) ہڈی کو نہیں جوڑا

---

[1] اللہ اکبر حضرت امیر المومنینؑ کو خدا نے علم غیب بھی کس قدر تعلیم فرمایا تھا کہ آپ کی کوئی پیشین گوئی غلط نہیں ہوتی ہے۔ بنی امیہ نے بھی عرب میں ۴۱ھ سے ۱۳۲ھ تک اور اندلس میں ۲۸۸ھ سے ۴۲۲ھ تک تو بادشاہت کا مزہ چکھا پھر ایسا مٹا کہ آج دنیا میں ان کا کوئی نام و نشان تک موجود نہیں ہے۔

[2] یعنی خداوند عالم کا شروع سے یہ اصول رہا ہے کہ جب تک کوئی بادشاہ یا کوئی قوم دنیا میں اچھی طرح شر و فساد نہیں پھیلا دیتی اور فسق و فجور میں نہیں ڈوب جاتی ہے اس وقت تک خدا اسے چھوڑے رہتا ہے اور دنیا کی جو نعمتیں دے رکھی ہیں، جو اسباب عیش و عشرت اس کے لیے مہیا ہو گئے ہیں ان سے تعرض نہیں کرتا ہے۔ ہاں جب وہ اپنی گمراہی اور سرکشی میں حد سے گزر جاتے ہیں تو خدا انہیں دنیا میں بھی سزا دیتا ہے کیونکہ جب وہ لوگ پوری آزادی حاصل کر لیتے اور دنیا کی لذتوں اور امیدوں میں غرق ہو جاتے ہیں تو آخرت کو بھول بیٹھتے اور ذکر خدا کو فراموش کر جاتے ہیں اس وجہ سے دین اور عقل کے ان قواعد کو چھوڑ دیتے ہیں جن سے دنیا کا انتظام قائم ہے اور اس طرح وہ ہلاکت پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اسی کی طرف خداوند عالم بھی اشارہ فرماتا ہے، سورۂ بنی اسرائیل آیہ ۱۶ میں ہے:

﴿وَ اِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا﴾

یعنی ہم کو کسی بستی کا ویران کرنا منظور ہوتا ہے تو ہم وہاں کے خوش حالوں کو (طاعت کا) حکم دیتے ہیں تو وہ لوگ اس میں نافرمانیاں کرنے لگتے ہیں تب وہ بستی عذاب کی مستحق ہو جاتی ہے، اس وقت ہم اچھی طرح اس کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔

فِيْ دُوْنِ مَا اسْتَقْبَلْتُمْ مِنْ عَتْبٍ وَّ مَا اسْتَدْبَرْتُمْ مِنْ خَطْبٍ مُعْتَبَرٌ! وَ مَا كُلُّ ذِيْ قَلْبٍ بِلَبِيْبٍ، وَ لَا كُلُّ ذِيْ سَمْعٍ بِسَمِيْعٍ، وَ لَا كُلُّ نَاظِرٍ بِبَصِيْرٍ.

فَيَا عَجَبًا! وَ مَا لِيَ لَآ اَعْجَبُ مِنْ خَطَإِ هٰذِهِ الْفِرَقِ عَلَى اخْتِلَافِ حُجَجِهَا فِيْ دِيْنِهَا! لَا يَقْتَصُّوْنَ اَثَرَ نَبِيٍّ، وَ لَا يَقْتَدُوْنَ بِعَمَلِ وَصِيٍّ، وَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِغَيْبٍ، وَ لَا يَعِفُّوْنَ عَنْ عَيْبٍ، يَعْمَلُوْنَ فِي الشُّبُهَاتِ، وَ

ہے لیکن سختی اور آزمائش کے بعد[1] اور جس مشقت کا تمہیں سامنا ہوا ہے اور جس (شدت و) مصیبت سے تم (گزرے اور) پھرے ہو اس سے کم ہی میں عبرت (کا کافی سامان موجود) ہے[2] اور (یاد رکھو کہ) ہر دل (و دماغ) والا عقلمند نہیں ہے اور نہ ہر وہ شخص جو کان رکھتا ہے سننے والا ہے اور نہ ہر آنکھ والا بینا ہے۔[3]

تو کس درجہ حیرت ہے اور میں کیوں نہ حیرت زدہ ہوں ان فرقوں کی غلطی سے کہ باوجود یکہ ان کے دین کی دلیلیں مختلف ہیں (لیکن یہ) نہ کسی نبی کی شریعت کی پیروی کرتے ہیں اور نہ کسی وصی کے (طریق) عمل پر چلتے ہیں اور نہ کسی غیب (کی خبر) پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ کسی برائی سے بچتے ہیں (بلکہ) شبہوں میں (پڑے) عمل کرتے اور

---

[1] یعنی کسی امت کی حالت اس وقت تک درست اور قابل اطمینان بھی نہیں ہوتی ہے جب تک وہ پہلے خوب سختی اور مصیبت نہ برداشت کر لے، مسلمان بھی شروع میں بمقام مکہ معظّمہ انتہائی مصائب و مظالم میں بسر کرتے رہے اس کے بعد مدینہ میں آ کر انہیں قوت حاصل ہوئی۔

[2] یعنی جن لڑائیوں اور حوادث و واقعات سے تم کو مقابلہ ہو چکا خواہ عہد حضرت رسول خداؐ میں خواہ میری ظاہری خلافت میں، وہ سب تمہاری عبرت کے لیے کافی ہے۔

[3] یہ خدا کے اس کلام سے ماخوذ ہے جسے سورۂ اعراف آیہ ۱۷۹ میں ارشاد فرماتا ہے:

﴿لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۫ وَ لَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۫ وَ لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ﴾

یعنی ان لوگوں کے دل تو ہیں مگر ان دلوں سے سمجھتے نہیں ہیں اور ان کے کان بھی ہیں لیکن ان سے سنتے نہیں ہیں خلاصہ یہ کہ یہ لوگ گویا جانور ہیں بلکہ ان سے بھی کہیں زیادہ گمراہ یہی لوگ امور حق سے بالکل بے خبر ہیں۔

اور سورۂ حج آیہ ۴۶ میں فرماتا ہے:

﴿فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَ لٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ﴾

یعنی بات یہ ہے کہ کچھ آنکھیں اندھی نہیں ہوا کرتی بلکہ سینوں میں جو دل ہیں وہی اندھے ہو جایا کرتے ہیں۔

يَسِيْرُوْنَ فِي الشَّهَوَاتِ، اَلْمَعْرُوْفُ فِيْهِمْ مَا عَرَفُوْا، وَ الْمُنْكَرُ عِنْدَهُمْ مَآ اَنْكَرُوْا، مَفْزَعُهُمْ فِي الْمُعْضِلَاتِ اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ، وَ تَعْوِيْلُهُمْ فِي الْمُهِمَّاتِ عَلٰى اٰرَآئِهِمْ، كَاَنَّ كُلَّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اِمَامُ نَفْسِهٖ، قَدْ اَخَذَ مِنْهَا فِيْمَا يَرٰى بِعُرًى ثِقَاتٍ، وَ اَسْبَابٍ مُّحْكَمَاتٍ.

(اپنی) خواہشہائے (نفسانی) پر چلتے ہیں۔[1] جس چیز کو یہ اچھی جان لیتے ہیں وہی ان (کے خیال) میں اچھی ہے اور جس چیز کو یہ بری سمجھ لیتے ہیں وہی ان کے نزدیک بری ہے۔[2] پیچیدہ مسئلوں کی پریشانی میں ان کی رجوع اپنے نفسوں ہی کی طرف ہوتی ہے اور (دین کی) اہم باتوں میں ان کا اعتماد اپنی رایوں ہی پر ہوتا ہے[3] گویا ان میں سے ہر شخص (خود ہی) اپنے نفس کا امام (اور پیشوا) ہے کہ جو سمجھ لیتا ہے اس میں اسی (یعنی اپنے نفس ہی) سے زبردست اجتہاد (کرتا) اور (اس پر) قوی دلیلیں قائم کر لیتا ہے۔[4]

---

[1] حضرتؑ ان جملوں میں ان فرقوں کی حالت سے تعجب کرتے ہیں جن کے دین کی دلیلیں اور حجتیں مختلف ہیں، کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ دلیل پیش کرتا ہے مگر اس اختلاف کے موقع پر انہیں جو کرنا تھا وہ نہیں کرتے، نہ تو انبیاء کے قولوں کی پیروی کرتے ہیں، نہ اوصیا کے طریقہ پر چلتے ہیں، نہ کسی غیب کی خبر یا پیشین گوئی پر ایمان لاتے ہیں، نہ کسی برائی اور عیب و گناہ سے پرہیز کرتے ہیں بلکہ جو کچھ کرتے ہیں وہ ایسے اعمال ہوتے ہیں جو شبہوں میں داخل اور انہیں کا واسطہ ہیں اور اپنی شہوتوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔

[2] یعنی ان لوگوں کے خیال میں حق اور اچھی بات وہ نہیں ہے جس کو خدا اور رسولؐ نے بتایا ہو یا اس پر کوئی عقلی، شرعی، عرفی دلیل قائم ہو بلکہ یہ حق اور ثواب اسی کو سمجھتے ہیں جس کو اپنی جگہ آپ ہی عمدہ سمجھ لیتے ہیں اگرچہ وہ درحقیقت نہایت بری ہو اور اسی طرح بری چیز بھی ان کی نظر میں وہ ہے جس کو یہ خود بری سمجھ لیں (اگرچہ شرع یا عقل اس کو اچھی ہی کہتی ہو)۔

[3] یعنی یہ لوگ دین اور شریعت کے مشکل احکام میں نہ کسی عالم سے مسئلہ دریافت کرتے ہیں نہ کسی مجتہد سے فتوی لیتے ہیں، نہ کسی فقیہ فاضل سے حکم پوچھتے ہیں بلکہ کل مشکلات مسائل میں اپنے ہی نفس کی طرف رجوع کرتے ہیں جو بات ان کے دل میں آتی ہے اس پر عمل کرتے ہیں اگرچہ وہ حکم خدا اور رسولؐ کے خلاف ہو۔

[4] یعنی اپنے خودساختہ اجتہاد اور ذاتی رائے ہی سے مسائل حلال و حرام کو طے کر لیتا اور انہیں پر یقین کر کے اڑ بیٹھتا ہے پھر اس سے ہٹتا ہی نہیں ہے اور احکام قرآن و حدیث جناب رسالت مآبؐ کی طرف رجوع ہی نہیں کرتا ہے۔ علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ حضرت علیہ السلام نے یہ تمام باتیں سچ فرمائی ہیں کیونکہ ہمارے زمانہ میں جو شخص جاہل ہوتا مگر علم کا دعویٰ کرتا ہے اس کی بعینہ یہی صفتیں ہیں اور ہمارے زمانہ سے پہلے جو لوگ گزرے ہیں ان کا بھی یہی حال تھا جس کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہ لوگ طالب العلم بننا ذلیل سمجھتے، علم سیکھنا اور شاگردی کرنا حقیر خیال کرتے ہیں لہٰذا نہ حقیقی علم حاصل کرتے ہیں نہ صحیح طریقہ پر چلتے ہیں۔

❁ خطبہ :۸۷ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

اَرْسَلَهٗ عَلٰى حِيْنِ فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ، وَ طُوْلِ هَجْعَةٍ مِّنَ الْاُمَمِ، وَ اعْتِزَامٍ مِّنَ الْفِتَنِ، وَ انْتِشَارٍ مِّنَ الْاُمُوْرِ، وَ تَلَظٍّ مِّنَ الْحُرُوْبِ، وَ الدُّنْيَا كَاسِفَةُ النُّوْرِ، ظَاهِرَةُ الْغُرُوْرِ، عَلٰى حِيْنِ اصْفِرَارٍ مِّنْ وَّرَقِهَا، وَ اِيَاسٍ مِّنْ ثَمَرِهَا، وَ اغْوِرَارٍ مِّنْ مَّآئِهَا، قَدْ

خطبہ(۸۷)

حضرت علیہ السلام کے ایک خطبہ کا کچھ حصّہ۔

(خدا نے) پیغمبروں سے خالی رہنے کے زمانہ میں اور قوموں کی طولانی غفلت و گمراہی میں اور فتنوں کے غلبہ اور حالتوں کی پراگندگی اور (آپس کی) خانہ جنگیوں کے وقت حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو (دنیا میں) بھیجا۔[1] اس وقت دنیا دھندلی روشنی، کھلے ہوئے دھوکے میں (مبتلا) تھی جب کہ اس (درخت دنیا) کے پتے زرد ہو گئے تھے، اس کے پھلوں سے مایوسی ہو گئی تھی، اس کا پانی (جذب ہو کر) غائب ہو گیا تھا۔ ہدایت کے نشان مٹ گئے تھے اور گمراہی

---

[1] جس وقت حضرت رسول خداؐ مبعوث ہوئے ہیں اس وقت دنیا میں شدید جہالت اور گمراہی پھیلی ہوئی تھی خصوصاً عرب کے لوگ تو درجہ انسانیت سے گزر کر حیوانیت تک پہنچ گئے تھے۔ وہ ایک لٹیرے، چور، قراق، خانہ بدوش اور ایسی قوم تھی جس میں ذرہ ذرہ سی باتوں پر ہمیشہ خون ریزیاں ہوتی تھیں مثلاً حرب لسوس جو چالیس برس تک رہی اور اس میں ستّر ہزار آدمی مارے گئے تھے۔ یا حرب داحس جو ترسٹھ برس تک رہی تھی کینہ و فسادات کا یہ حال تھا کہ عورتیں اپنے زخمی اور مقتول دشمنوں کا کلیجہ نکال کر دانتوں سے چباتیں اور ناک، کان اور آلہ تناسل کاٹ کر اور تاگے میں پرو کر ہار اور پہنچیوں کی طرح گلے اور ہاتھوں میں پہنتی تھیں۔ چوری اور قزاقی کا دور دورہ تھا۔ بے رحمی، سنگ دلی، ننھے ننھے معصوم اور شیر خوار بچوں کا زندہ زمین میں گاڑ کر مار ڈالنا یا بتوں پر قربانی چڑھا دینا، ان کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا، کنواری اور بیاہی عورتیں زنا کو فخر سمجھتی تھیں۔ مادر زاد برہنہ ہو کر خانہ کعبہ کا طواف کرتے تھے، باپ کے مرنے پر بیٹا اپنی سوتیلی ماؤں کا شوہر بن جاتا تھا، شراب خوری، قمار بازی اور بت پرستی ہر شخص کا شغل تھا۔

گھر گھر بت پجتے تھے اور قبیلہ قبیلہ کا خدا جدا تھا، کوئی ایک خدا کی جگہ دو مقابل وجود نور و ظلمت یا یزدان و اہرمن کو قائم کر کے نیکی و بدی کے اختیار کو ان میں تقسیم کرتا تھا، کوئی چاند، سورج وغیرہ ستاروں کے نور و ضیا کا فریفتہ تھا اور نور خدا بلکہ خدا سمجھ کر ان کے آگے سر جھکاتا تھا۔ عورتیں کسی جانور کا دودھ نہیں دوہتی تھیں، مردہ جانوروں کا گوشت عمدہ اور لذیذ ترین غذا سے تھا۔ اونٹنی، بھیڑ، بکری دس بچے جننے کے بعد چھوڑ دی جاتی تھی اور جب وہ مر جاتی تھی تو اس کا گوشت نہایت شوق سے صرف مرد کھایا کرتے تھے۔ گوہ، بچھو، سانپ مردہ جانوروں کو کھاتے تھے، اونٹوں کا خون پیا کرتے تھے۔ انگریزی مؤرخ گبن تاریخ زوال رومن امپائر میں لکھتا ہیں کہ ''آنحضرتؐ کے ظہور سے پہلے ان عربوں میں سترہ سو لڑائیاں ہو چکی تھیں اور یہ لڑائیاں اس قسم کی ہوتی تھیں کہ اگر ایک قبیلہ کا آدمی دوسرے قبیلہ کے آدمی کو مار دیتا تھا تو اس کا قصاص لینے کے لیے پچاس پچاس برس تک لڑائی قائم رہتی تھی''۔

دَرَسَتْ مَنَارُ الْهُدٰى، وَ ظَهَرَتْ اَعْلَامُ الرَّدٰى، فَهِيَ مُتَجَهِّمَةٌ لِّاَهْلِهَا، عَابِسَةٌ فِيْ وَجْهِ طَالِبِهَا، ثَمَرُهَا الْفِتْنَةُ، وَ طَعَامُهَا الْجِيْفَةُ، وَ شِعَارُهَا الْخَوْفُ، وَ دِثَارُهَا السَّيْفُ.

کے جھنڈے نمایاں ہو گئے تھے تو (اس وقت) اس (دنیا) نے اپنے رہنے والوں کے لیے منہ بنا لیا تھا اور وہ اپنے چاہنے والوں کے لیے ترش رو ہو گئی تھی۔ اس کا پھل فتنہ (و فساد) اور اس کی غذا مُردار اور اس کا اندرونی لباس خوف (و دہشت) اور اس کا بیرونی لباس (نیزہ و) تلوار ہو رہی تھی۔[1]

فَاعْتَبِرُوْا عِبَادَ اللّٰهِ، وَ اذْكُرُوْا تِيْكَ الَّتِيْ اٰبَاؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ بِهَا مُرْتَهَنُوْنَ، وَ عَلَيْهَا مُحَاسَبُوْنَ.

تو اے بندگان خدا (ان باتوں سے) عبرت حاصل کرو اور ان (حالتوں) کو یاد کرو جن میں تمہارے باپ، دادا اور بھائی بند (گویا) گرو (ہو کر گرفتار) تھے اور جن پر ان کا حساب کیا جائے گا۔

وَ لَعَمْرِيْ! مَا تَقَادَمَتْ بِكُمْ وَ لَا بِهِمُ الْعُهُوْدُ، وَ لَا خَلَتْ فِيْمَا بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمُ الْاَحْقَابُ وَ الْقُرُوْنُ، وَ مَآ اَنْتُمُ الْيَوْمَ مِنْ يَّوْمَ كُنْتُمْ فِيْ اَصْلَابِهِمْ بِبَعِيْدٍ.

اور میری زندگی کی قسم ابھی ان کے اور تمہارے تعلقات پرانے نہیں ہوئے ہیں اور نہ تمہارے اور ان کے درمیان ابھی بہت زیادہ زمانے اور مدتیں گزری ہیں اور جس دن تم ان لوگوں کی صلبوں میں تھے وہ آج سے بہت دور نہیں تھا۔[2]

---

[1] عربی زبان میں ''شِعَارٌ'' اس کپڑے کو کہتے ہیں جو بدن سے ملا ہوا رہے جیسے بنیان، کرتہ وغیرہ اور ''دِثَارٌ'' اس کپڑا کو کہتے ہیں جو شعار کے اوپر رہے جیسے شیروانی، اچکن وغیرہ تو یہاں حضرتؑ نے جاہلیت کے عربوں کا اندرونی لباس خوف اور ظاہری لباس تلوار قرار دیا ہے۔ علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ یہ نہایت بدیع کلام اور بے مثل تشبیہ کی صنعت ہے کیونکہ جب لڑائی وغیرہ کا موقع ہوتا ہے تو پہلے انسان کو خوف پیدا ہوتا ہے اس کے بعد اس پر تلوار پڑتی ہے لہٰذا حضرتؑ نے خوف کو شعار سے تشبیہ دی جو پہلے پیدا ہوتا اور اندر رہتا ہے اور تلوار کو دثار سے تشبیہ دی جو بعد میں پڑتی اور ظاہر جسم پر لگتی ہے۔

[2] یعنی حضرتؑ جس وقت یہ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے اس وقت سے زمانہ جاہلیت تک زیادہ مدت نہیں گزری تھی کیونکہ حضرتؑ کی خلافت ظاہری ۳۵ھ سے ۴۰ھ تک رہی ہے، تو زیادہ سے زیادہ چالیس برس یہ ہوئے اور بعثت کے بعد تیرہ برس تک مکہ معظّمہ میں آنحضرتؐ نے قیام فرمایا تھا تو کل اس وقت تک ترپن برس ہوئے تھے اور یہ وہ وقت تھا جب بہت سے لوگ زمانہ جاہلیت کے موجود تھے چنانچہ معاویہ بھی اسی زمانہ کا تھا۔ پس تم لوگ ان کے حالتوں کا تذکرہ بھی اچھی طرح کر سکتے ہو اور ان کے شرمناک واقعات کو بھی سن سکتے ہو۔ ان کے برے اخلاق بھی تمہیں پورے طور پر معلوم ہو سکتے ہیں اور آخر میں ان کا جو کچھ بھی انجام ہوا اس سے بھی تم بے خبر نہیں رہ سکتے ہو۔ تو غور کرو تمہاری کیا حالت ہے اگر وہی روش تم بھی اختیار کرو گے تو دنیا اور آخرت میں تمہاری بھی کیسی ذلت اور رسوائی ہو گی۔

وَاللّٰهِ! مَآ اَسْمَعَهُمُ الرَّسُوْلُ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شَيْئًا اِلَّا وَ هَآ اَنَا ذَا الْيَوْمَ مُسْمِعُكُمُوْهُ، وَ مَآ اَسْمَاعُكُمُ الْيَوْمَ بِدُوْنِ اَسْمَاعِهِمْ بِالْاَمْسِ، وَ لَا شُقَّتْ لَهُمُ الْاَبْصَارُ، وَ لَا جُعِلَتْ لَهُمُ الْاَفْئِدَةُ فِيْ ذٰلِكَ الْاَوَانِ، اِلَّا وَ قَدْ اُعْطِيْتُمْ مِثْلَهَا فِيْ هٰذَا الزَّمَانِ.

خدا کی قسم (حضرت) رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے (اپنی زندگی میں احکام خدا سے جس) جس چیز کو انہیں سنایا تھا۔ میں بھی آج وہی (سب) تم کو سنا رہا ہوں [1] اور آج جو کان تمہارے ہیں وہ ان کے کانوں سے کم نہیں ہیں جو کل تھے۔ اور اس زمانہ میں جو آنکھیں ان (تمہارے بزرگوں) کے لیے پیدا کی گئی تھیں اور جو دل (ودماغ) ان کے لیے بنائے گئے تھے ویسے ہی (آنکھ اور دل ودماغ) تم کو بھی اس زمانہ میں دیے گئے ہیں۔

وَ وَاللّٰهِ! مَا بَصُرْتُمْ بَعْدَهُمْ شَيْئًا جَهِلُوْهُ، وَ لَآ اُصْفِيْتُمْ بِهٖ وَ حُرِمُوْهُ، وَ لَقَدْ نَزَلَتْ بِكُمُ الْبَلِيَّةُ جَآئِلًا خِطَامُهَا، رِخْوًا

اور خدا کی قسم ان لوگوں کے بعد تم کوئی ایسی چیز نہیں دکھائے گئے جس کو وہ لوگ نہ جانتے ہوں اور نہ تم کسی ایسی چیز سے ممتاز (اور مخصوص) کیے گئے جس سے وہ لوگ محروم رکھے گئے ہوں۔ ہاں البتہ تم پر یہ مصیبت [2] نازل ہوئی

---

[1] علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ اس کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرتؑ اپنے وقت کے مسلمانوں سے خطاب کر کے فرماتے ہیں کہ حضرت رسول خداؐ اپنے زمانہ میں مسلمانوں سے جو کچھ بھی فرماتے تھے اور جو حکم انہیں دیتے تھے ویسے ہی احکام میں بھی تم لوگوں کو دیتا ہوں اور وہی باتیں میں بھی تم سے کہتا ہوں تو حضرتؐ کے زمانہ میں مسلمان آنحضرتؐ کی اطاعت کرتے تھے اور تم لوگ میری نافرمانی کرتے ہو حالانکہ تمہاری حالت اس زمانہ کے مسلمانوں ہی ایسی ہے۔ یہ کلام علامہ ابن ابی الحدید کا ہے، مگر میں کہتا ہوں کہ حضرتؑ نے اس میں یہ نہیں فرمایا ہے کہ آنحضرتؐ کے احکام کی اطاعت اس وقت کے مسلمان کرتے تھے۔ ایسا کیونکر فرما سکتے تھے کیونکہ صحابہ نے خود آنحضرتؐ کے احکام کی اس درجہ مخالفت کی جس کی حد نہیں بیان ہوسکتی۔ غزوہ اُحد میں مسلمانوں کو حکم دیا کہ فتح ہونے پر مال غنیمت کی طمع میں اپنی جگہ نہیں چھوڑیں گے مگر صحابہ نے اس حکم کی مخالفت کی جس سے پھر شکست واصل ہوگئی۔ غزوہ حدیبیہ میں آنحضرتؐ نے حضرت عمر کو مکہ معظّمہ میں جانے کا حکم دیا حضرت عمر نے صاف انکار کر دیا۔ اور جب وہاں صلح حدیبیہ ہوگئی تو حضرتؐ نے صحابہ کو حکم دیا کہ وہیں رمی ادا کریں اور فرمایا کہ یہیں سے قربانی کر کے اور بال منڈوا کر مدینہ واپس چلیں۔ تین مرتبہ حضرتؐ نے ایسا ہی فرمایا لیکن کسی نے حکم کی تعمیل نہیں کی۔ (تاریخ طبری وروضۃ الاحباب وغیرہ) غرض اسی طرح ہزاروں واقعات ہیں جن میں حضرت رسول خداؐ نے اپنے صحابہ کو کوئی حکم دیا ہے اور (سوا چند حضرات کے) سب نے اس حکم سے یا انکار کر دیا یا اس کی مخالفت کی ہے۔

[2] ابن ابی الحدید کہتے ہیں کہ

قَالَ وَ لَقَدْ نَزَلَتْ بِكُمُ الْبَلِيَّةُ اَيِ الْمِحَنَةُ الْعَظِيْمَةُ يَعْنِيْ فِتْنَةَ مُعَاوِيَةَ وَ بَنِيْ اُمَيَّةَ۔

(بقیہ صفحہ مابعد)

بِطَانُهَا، فَلَا يَغُرَّنَّكُمْ مَآ اَصْبَحَ فِيْهِ اَهْلُ الْغُرُوْرِ، فَاِنَّمَا هُوَ ظِلٌّ مَّمْدُوْدٌ، اِلٰٓى اَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ.

ہے جس کی مہار ہل رہی ہے اور جس کا تنگ ڈھیلا ہو گیا ہے تو جس دھوکہ میں (اس زمانہ کے) دھوکہ والے پڑے ہیں اس میں تم نہ پڑنا کیونکہ وہ صرف ایک مختصر زمانہ تک پھیلی ہوئی چھاؤں ہے (پھر کچھ بھی نہیں)۔

❁ خطبہ :۸۸ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الْمَعْرُوْفِ مِنْ غَيْرِ رُؤْيَةٍ، وَ الْخَالِقِ مِنْ غَيْرِ رَوِيَّةٍ، الَّذِىْ لَمْ يَزَلْ قَآئِمًا دَآئِمًا، اِذْ لَا سَمَآءٌ ذَاتُ اَبْرَاجٍ، وَ لَا حُجُبٌ

خطبہ (۸۸)

حضرت علیہ السلام کے ایک خطبہ کا کچھ حصّہ۔

ہر قسم کی تعریف خدا ہی کے لیے زیبا ہے جو بغیر دیکھے پہچانا جاتا (اور بغیر غور و فکر کیے مخلوقات کو پیدا کرتا ہے) ۱؎ ایسا (خدا) جو ہمیشہ سے موجود ہے (جو اس وقت سے بھی پہلے تھا) جب نہ برجوں والے آسمان تھے ۲؎ اور نہ

یعنی فتنہ معاویہ و بنی امیہ یعنی حضرتؐ نے جو فرمایا کہ تم لوگوں پر مصیبت اور آفت نازل ہو گئی ہے تو اس سے مراد معاویہ اور بنی امیہ کا فتنہ ہے۔

تاریخ ابن واضح اور تاریخ مروج الذہب میں ہے کہ جب حضرت ابوذر خلیفہ ثالث کے دربار میں حاضر کیے گئے تو حضرت عثمان نے ان سے کہا کہ مجھے معلوم ہوا ہے تم نے لوگوں سے یہ حدیث بیان کی ہے کہ جس وقت بنی امیہ کے مردوں کی تعداد تیس پوری ہو گی اس وقت وہ خدا کے شہروں کو مال غنیمت اور خدا کے بندوں کو لونڈی غلام سمجھیں گے اور خدا کے دین کو مکاری کے طور پر اختیار کریں گے؟ ابوذر نے کہا: ہاں، میں نے رسول اللہ کو یہ فرماتے سنا ہے۔

اور نصائح کافیہ صفحہ ۱۰۶ میں ہے:

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: اِنَّ لِكُلِّ دِيْنٍ اٰفَةً، وَاٰفَةُ هٰذَا الدِّيْنِ بَنُوْ اُمَيَّةَ۔

یعنی ابن مسعود سے روایت ہے کہ حضرتؐ نے فرمایا: ہر دین کی ایک آفت ہے اور اسلام کی آفت بنو امیہ ہیں۔

اور صفحہ ۱۰۸ میں ہے کہ امام فخر الدین نے اپنی تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ ابن عباس نے فرمایا قرآن میں شجرۂ ملعونہ سے مراد بنی امیہ ہیں۔

۱؎ نہج البلاغہ کے اکثر نسخوں میں۔ ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الْمَعْرُوْفِ مِنْ غَيْرِ رُؤْيَتِهٖ'' کے بعد یہ جملہ بھی ہے ''وَالْخَالِقِ مِنْ رُؤْيَةٍ'' یعنی وہ خدا ایسا پیدا کرنے والا ہے جو کسی چیز کے پیدا کرنے سے پہلے غور و فکر نہیں کرتا ہے۔

۲؎ علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ ''اَبْرَاجٌ'' معنی عربی لغت میں ارکان ہے یعنی ستون اور پائے۔ یہاں اگر کوئی شخص کہے کہ کیا یہ تفسیر اس قول کے مطابق ہے جس کا اعتقاد علمائے علم ہیئت کرتے ہیں کیونکہ اکثر حکماء اور متکلمین تو یہ کہتے ہیں کہ آسمان (بقیہ صفحہ مابعد)

ذَاتُ اِرْتَاجٍ، وَ لَا لَيْلٌ دَاجٍ، وَ لَا بَحْرٌ سَاجٍ، وَ لَا جَبَلٌ ذُوْ فِجَاجٍ، وَ لَا فَجٌّ ذُو اعْوِجَاجٍ، وَ لَآ اَرْضٌ ذَاتُ مِهَادٍ، وَ لَا خَلْقٌ ذُوا اعْتِمَادٍ: ذٰلِكَ مُبْتَدِعُ الْخَلْقِ وَ وَارِثُهٗ، وَ اِلٰهُ الْخَلْقِ وَ رَازِقُهٗ، وَ الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ دَآئِبَانِ فِيْ مَرْضَاتِهٖ: يُبْلِيَانِ كُلَّ جَدِيْدٍ، وَ يُقَرِّبَانِ كُلَّ بَعِيْدٍ.

بندشوں والے پردے اور نہ اندھیری رات اور نہ رکا ہوا سمندر اور نہ گھاٹیوں والا پہاڑ اور نہ کج و کاواک رستہ اور نہ بچھی ہوئی زمین اور نہ قوت والی مخلوق۔ ہاں یہی (خدا) دنیا کا ایجاد کرنے والا[1] اور اس کے (سب سے) آخر رہنے والا اور مخلوقات کا معبود اور اس کو روزی دینے والا ہے۔ اور آفتاب و ماہتاب برابر اس کی مرضی اور خوشنودی میں لگے ہوئے ہیں کہ ہر نئے کو پرانا اور ہر دور کو نزدیک کرتے رہتے ہیں۔[2]

قَسَمَ اَرْزَاقَهُمْ، وَ اَحْصٰى اٰثَارَهُمْ وَ

اس (خدا) نے ان لوگوں کی روزیاں تقسیم کر دی ہیں

(بقیہ صفحہ ماقبل) مثل ایک کرہ کے ہے جس میں نہ کوئی گوشہ ہے نہ کوئی پہلو نکل سکتا ہے۔ تو میں جواب دوں گا کہ ہاں ان دونوں قولوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے کیونکہ فلک اگرچہ کرہ ہے لیکن اس میں وہ متمم چیزیں ہیں جو بمنزلہ ان رکنوں (ستونوں اور پایوں) کے ہیں جو قلعے یا شہر پناہ میں ہوتے ہیں، لہٰذا برجوں کا لفظ ان پر بولنا صحیح ہے اور متمم چیزیں وہ جسم ہیں جو فلک کے کنارے ہیں جو کسی جگہ تو ہلکے ہو جاتے ہیں اور کسی جگہ وزنی ہو جاتے ہیں اور کل لوگوں نے ان کو ثابت کیا ہے۔ خداوند عالم بھی کلام مجید پارہ ۳۰ سورہ بروج میں فرماتا ہے:

﴿وَ السَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ﴾

یعنی برجوں والے آسمان کی قسم۔

تو اس سے حضرت امیر المومنینؑ نے بھی لفظ ''سَمَآءٌ ذَاتُ اَبْرَاجٍ'' استعمال کیا ہے (آٹھویں آسمان کے خریزے کے ایسے بارہ ٹکڑوں کے نام بروج ہیں۔ فلسفہ جدیدہ کے مطابق اس قول کی شرح انشاء اللہ ضمیمہ میں آئے گی) کیونکہ یہ مختصر حاشیہ اس قدر طویل مضامین کی گنجائش نہیں رکھتا ہے۔

[1] ''مُبْتَدِعُ الْخَلْقِ''۔ یعنی خلق کا ایجاد کرنے والا جیسا خداوند عالم سورۂ بقرہ آیہ ۱۱۷ میں ارشاد فرماتا ہے:

﴿بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾

یعنی وہی خدا آسمان اور زمین کا موجد ہے۔

[2] یعنی برابر اس کی مرضی اور مشیت کے مطابق حرکت کرتے رہتے اور فرمانبرداری کا ثبوت دیتے رہتے ہیں کہ انہیں دو سے ہر نئی چیز پرانی ہو جاتی ہے مثلاً سو برس قبل کا واقعہ انہیں دونوں کی حرکت سے پرانا ہو گیا اور ہر دور کی چیز کو یہی دونوں قریب کر دیتے ہیں مثلاً سو برس کے بعد جو واقعہ ہوگا اس کا زمانہ انہیں دونوں کی حرکت سے آئے گا اگر یہ حرکت نہ کریں تو کوئی زمانہ ہی نہ پیدا ہو۔

اَعْمَالَهُمْ، وَ عَدَدَ اَنْفَاسِهِمْ، وَ خَآئِنَةَ اَعْيُنِهِمْ وَ مَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ مِنَ الضَّمِيْرِ، وَمُسْتَقَرَّهُمْ وَ مُسْتَوْدَعَهُمْ مِّنَ الْاَرْحَامِ وَالظُّهُوْرِ، اِلٰٓى اَنْ تَتَنَاهٰى بِهِمُ الْغَايَاتُ.

اور ان کی حالتوں اور کاموں کو شمار کر رکھا ہے اور ان کے نفسوں کو اور ان کی آنکھوں کی خیانت کو اور ان بھیدوں کو جنھیں ان کے سینے چھپائے ہوئے ہیں۔ اور ان کے (ماؤں کے) رحموں اور (آبا و اجداد کے) صلبوں سے (جیتے جی کے) ٹھکانے اور (مرنے پر زمین میں) سونپے جانے کی جگہ کو گن لیا ہے[1] یہاں تک کہ وہ (اپنی) آخری منزلوں (عالم آخرت) تک پہنچ جائیں۔[2]

هُوَ الَّذِیْ اشْتَدَّتْ نِقْمَتُهٗ عَلٰٓى اَعْدَآئِهٖ

وہ (خدا) ایسا ہے جس کی وسیع رحمت میں بھی اس کا عذاب اس کے دشمنوں پر سخت اور اس کے سخت عذاب میں

---

[1] ''وَ اَحْصٰى اٰثَارَهُمْ وَ اَعْمَالَهُمْ'' یعنی سب کی حالتوں اور ان کے اعمال کو قضاء الٰہی کے قلم سے لوح محفوظ میں شمار کر رکھا ہے۔ گویا حضرتؑ اس امر پر لوگوں کو مطلع فرماتے ہیں کہ خداوند عالم ہر جاننے کے قابل بات کو جانتا ہے جیسا کہ خود خدا نے بھی قرآن مجید میں ایسا ہی اعلان فرما دیا ہے۔ پارہ ۷ سورۂ انعام آیہ ۶۰ میں فرماتا ہے:

﴿وَ عِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ؕ وَ يَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ ؕ وَ مَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَ لَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَ لَا رَطْبٍ وَّ لَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ﴾ (سورۂ الانعام، آیہ ۵۹)

یعنی اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جن کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا اور جو کچھ خشکی اور تری میں ہے اس کو بھی وہی جانتا ہے اور کوئی پتہ بھی نہیں کھڑکتا مگر وہ اسے ضرور جانتا ہے اور نہ زمین کی تاریکیوں میں کوئی دانہ اور نہ کوئی ہری اور نہ کوئی خشک چیز ہے مگر یہ کہ وہ نورانی کتاب (لوح محفوظ) میں موجود ہے۔

''مُسْتَقَرَّهُمْ'' الخ۔ قرآن مجید پارہ ۱۲ کے شروع میں فرماتا ہے:

﴿وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَ يَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَ مُسْتَوْدَعَهَا ؕ كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ﴾

زمین پر چلنے والوں میں کوئی ایسا نہیں جس کی روزی خدا کے ذمہ نہ ہو اور خدا ان کے ٹھکانیں اور (مرنے کے بعد) ان کے سونپے جانے کی جگہ (قبر) کو بھی جانتا ہے۔ سب کچھ روشن کتاب (لوح محفوظ) میں موجود ہے۔

[2] یعنی خدا مخلوقات کے کل حالات و اعمال کو جانتا ہے۔ ان کی ابتداء خلقت سے اس وقت تک جب تک سب اپنا حساب دینے کے لیے خدا کے سامنے کھڑے ہوں گے خواہ وہ حالات و اعمال خیر ہوں یا شر۔

فِيْ سَعَةِ رَحْمَتِهٖ، وَ اتَّسَعَتْ رَحْمَتُهٗ لِاَوْلِيَآئِهٖ فِيْ شِدَّةِ نِقْمَتِهٖ، قَاهِرُ مَنْ عَازَّهٗ، وَ مُدَمِّرُ مَنْ شَاقَّهٗ، وَ مُذِلُّ مَنْ نَّاوَاهُ، وَ غَالِبُ مَنْ عَادَاهُ. مَنْ تَوَكَّلَ عَلَيْهِ كَفَاهُ، وَ مَنْ سَئَلَهٗ اَعْطَاهُ، وَ مَنْ اَقْرَضَهٗ قَضَاهُ، وَ مَنْ شَكَرَهٗ جَزَاهُ.

بھی اس کی رحمت اس کے دوستوں کے لیے وسیع رہتی ہے[1]۔ جو اس پر غالب رہنا چاہے اس کو زیر کرنے والا اور جو اس سے جنگ کرے اس کو برباد کرنے والا اور جو اس سے مقابلہ کرے اس کو ذلیل کرنے والا اور جو اس سے مخالفت کرے اسے مغلوب کرنے والا ہے۔ جو اس پر توکل رکھے اس کے لیے کافی ہوتا ہے اور جو اس سے سوال کرے اس کو عطا فرماتا ہے اور جو اس کو قرض دے اس کو ادا کر دیتا ہے اور جو اس کا شکر بجالائے اس کو (پوری) جزا دیتا ہے۔

عِبَادَ اللّٰهِ! زِنُوْٓا اَنْفُسَكُمْ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُوْزَنُوْا، وَ حَاسِبُوْهَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تُحَاسَبُوْا، وَ تَنَفَّسُوْا قَبْلَ ضِيْقِ الْخِنَاقِ، وَ انْقَادُوْا

بندگان خدا! تم اپنے نفسوں کو خود تول لو قبل اس کے کہ تو لے جاؤ۔ اور ان کا خود محاسبہ کر لو اس سے پہلے کہ (خدا کی طرف سے) تمہارا حساب لیا جائے۔[2] اور تنگی سے گلا گھٹنے (یعنی قبض روح) کے قبل سانس لے لو (اعمال خیر کر

---

[1] یعنی باوجود یکہ خدا فی نفس الامر نہایت رحیم اور ارحم الراحمین بلکہ رحم ہی رحم ہے، لیکن وہ اپنے دشمنوں یعنی اپنے نافرمان بندوں کے لیے سخت سزا دینے والا اور ان سے پورا انتقام لینے والا بھی ہے اور باوجود یکہ وہ فی نفس الامر بڑا انتقام لینے والا ہے لیکن اپنے دوستوں یعنی فرمانبردار بندوں کے لیے کمال درجہ رحم کرنے والا بھی ہے۔ اس جملہ سے حضرتؑ نے خدا کے کمال ذات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ دنیا کے صاحب اقتدار و اختیار بادشاہوں کے خلاف خدا کی حالت ہے کیونکہ دنیاوی بادشاہ جب کسی پر غضب ناک ہوتے ہیں تو اس وقت رحم کا مادہ ہی ان سے سلب ہو جاتا ہے۔ نہ تو اس شخص مجرم پر رحم آتا ہے اور نہ اس وقت دوسروں پر رحم کرتے ہیں۔ یا جب کسی سے خوش ہوتے ہیں تو اس کے بڑے بڑے جرموں اور گناہوں سے بھی چشم پوشی کر لیتے ہیں۔ برخلاف خدا کے کہ جب کسی نیک بندے پر اس کی رحمت نازل کرنے سے غافل نہیں ہوتا غرض اس کی ذات ایسی ہے جس میں ایک وقت رحم اور سزا دونوں جمع ہو جاتے ہیں۔

[2] علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں:

قَوْلُهٗ ''زِنُوْٓا اَنْفُسَكُمْ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُوْزَنُوْا'' مِنَ الْكَلَامِ الْفَصِيْحِ النَّادِرِ اللَّطِيْفِ۔

یعنی حضرتؑ کا کلام اپنے نفسوں کو تول لو قبل اس کے کہ تم خود تولے جاؤ، نہایت ہی فصیح اور نادر لطیف کلام ہے۔

فرماتے ہیں کہ تم لوگ یہاں اپنے عملوں کو جانچ لو کہ ابھی تم کو اس کا اختیار باقی ہے اور جو کمی ہو گئی ہے اس کے پورا کرنے کی قدرت رکھتے ہو ورنہ جب یہ جانچنا دوسرے (یعنی خدا) کے ہاتھ میں چلا جائے گا تو اس وقت تم اپنے اعمال کی کسی کمی کو پورا نہیں کر سکو گے۔ غرض جب تک زندہ ہو اچھے اعمال، توبہ و استغفار کر لینے کا موقع حاصل ہے مرنے کے بعد کچھ نہیں کر سکو گے۔

قَبْلَ عُنْفِ السِّيَاقِ، وَ اعْلَمُوْا اَنَّهٗ مَنْ لَّمْ يُعَنْ عَلٰى نَفْسِهٖ حَتّٰى يَكُوْنَ لَهٗ مِنْهَا وَاعِظٌ وَّ زَاجِرٌ، لَمْ يَكُنْ لَّهٗ مِنْ غَيْرِهَا زَاجِرٌ وَّ لَا وَاعِظٌ.

لو) ۱؎ اور (گرفتار ہو کر) سختی سے کھینچے جانے کے قبل (آہستہ سے خدا کے) فرمانبردار بن جاؤ۔ ۲؎ اور خوب جان رکھو کہ جس کی مدد اس کے نفس پر نہیں کی جائے گی تا کہ اس کے لیے اسی (نفس) سے ایک نصیحت کرنے والا اور جھڑکنے والا ہو اس کے لیے غیر سے اس کے کہنے کی نصیحت کرنے والا اور جھڑکنے والا نہیں ہوگا۔ ۳؎

❁ خطبہ :۸۹ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ تُعْرَفُ ''بِخُطْبَةِ الْاَشْبَاحِ'' وَ هِيَ مِنْ جَلَائِلِ

خطبہ (۸۹)

حضرت علیہ السلام کے ایک خطبہ کا کچھ حصّہ۔

(جو) خطبۂ اشباح (کے نام سے) مشہور ہے ۴؎ اور

۱؎ یعنی روح نکلنے کے قبل فرصت کو غنیمت سمجھو اور جو کچھ عمل خیر یا توبہ وغیرہ کرنا ہو کر لو کہ جب پیغام اجل پہنچ جائے گا تو کچھ نہیں کر سکو گے۔

۲؎ یعنی اپنے نفسوں کو خدا کا مطیع اور فرمانبردار کر لو اس سے پہلے کہ تمہارا اختیار سلب کر لیا جائے اور تم سختی سے کھینچ کر آخرت کی طرف روانہ کیے جاؤ۔

۳؎ یعنی جو شخص بالکل آزاد اور بے پرواہ ہو جائے اس حد تک کہ خدا کو بھی اس کی ہدایت کی امید نہ رہے اور اس کی توفیق اس کے شامل حال نہ ہو اور خود اس کا نفس اس کی اصلاح اور اس کی زجر و توبیخ نہ کر سکے اس کو کوئی خارجی واعظ بھی سمجھا نہیں سکتا اور نہ اس کی حالت کسی طرح درست ہو سکتی ہے لہٰذا وہ ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ (سورۂ البقرہ، آیہ ۷) میں داخل ہو جائے گا۔

۴؎ علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں، اشباح کا معنی اشخاص (ڈھانچے، صورتیں) ہے اور ان اشخاص سے مراد اس خطبہ میں ملائکہ ہیں کیونکہ اس خطبہ میں فرشتوں کا تفصیلی ذکر ہے۔ اور جلیل القدر علامہ اہل سنت مولوی وحید الزمان خان صاحب وقار نواز جنگ اپنی کتاب انوار اللغۃ پارہ ۱۳ صفحہ ۷۰ میں لکھتے ہیں:

خَلَقَ اللّٰهُ مُحَمَّدًا وَ عِتْرَتَهٗ اَشْبَاحَ نُوْرٍ بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ قُلْتُ وَ مَا الْاَشْبَاحُ قَالَ ظِلُّ النُّوْرِ لَا اَبْدَانٌ نُوْرَانِيَّةٌ بَلْ اَرْوَاحٌ۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپؐ کے آل کے نور کی تصویریں اپنے سامنے پیدا کیں۔ میں نے عرض کیا نور کی تصویروں سے کیا مراد ہے؟ فرمایا نور الٰہی کا ایک سایہ یعنی نورانی بدن نہیں بلکہ نورانی روحیں۔

بِاَنَّ اٰدَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ رَاٰى عَلَى الْعَرْشِ اَشْبَاحًا يَلْمَعُ نُوْرُهَا، فَسَاَلَ اللّٰهَ عَنْهَا فَاَوْحَى اللّٰهُ اِلَيْهِ: اَنَّهَا اَشْبَاحُ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَ اَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْحَسَنِ وَالْحُسَيْنِ وَ فَاطِمَةَ۔

(بقیہ صفحہ بعد)

خُطَبِہٖ عَلَیْہِ السَّلَام ۔رَوٰی مَسْعَدَۃُ بْنُ صَدَقَۃَ عَنِ الصَّادِقِ جَعْفَرِ بْنِ مُحَمَّد عَلَیْہِمَا السَّلَامُ اَنَّہٗ قَالَ خَطَبَ اَمِیْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ بِھٰذِہِ الْخُطْبَۃِ عَلٰی مِنْبَرِ الْکُوْفَۃِ وَ ذٰلِکَ اَنَّ رَجُلًا اَتَاہُ فَقَالَ لَہٗ یَا اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ صِفْ لَنَا رَبَّنَا مِثْلَ مَا نَرَاہُ عِیَانًا لِنَزْدَادَ لَہٗ حُبًّا وَ بِہٖ مَعْرِفَۃً فَغَضِبَ عَلَیْہِ السَّلَامُ وَ نَادَی الصَّلٰوۃَ جَامِعَۃً فَاجْتَمَعَ اِلَیْہِ النَّاسُ حَتّٰی غَصَّ الْمَسْجِدُ بِاَھْلِہٖ فَصَعِدَ الْمِنْبَرَ وَھُوَ مُغْضَبٌ مُتَغَیِّرُ اللَّوْنِ فَحَمِدَ اللّٰہَ سُبْحَانَہٗ وَ اَثْنٰی عَلَیْہِ وَ صَلّٰی عَلَی النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ثُمَّ قَالَ:

یہ حضرت علیہ السلام کے (نہایت) جلیل القدر خطبوں سے ہے۔ مسعدہ بن صدقہ نے حضرت امام جعفر صادق فرزند (حضرت امام) محمد (باقر) علیہما السلام سے روایت کی ہے کہ آپؑ نے فرمایا حضرت امیر المومنین علیہ الصلاۃ والسلام نے اس خطبہ کو (مسجد) کوفہ کے منبر پر ارشاد کیا تھا۔ وہ اس طرح کہ ایک شخص نے حاضر خدمت ہو کر عرض کی ''اے امیر المومنین ہم سے ہمارے پروردگار کی حقیقت اس طرح بیان فرمائیں جیسے ہم اس کو ظاہر بظاہر دیکھ لیں تا کہ ہم میں اس کی محبت اور معرفت زیادہ ہو جائے''۔ اس پر حضرتؑ کو غیظ آ گیا اور منادی کرا دی کہ لوگ نماز کے لیے جمع ہوں تو آپؑ کے پاس اس کثرت سے لوگ حاضر ہوئے کہ (پوری) مسجد نمازیوں سے بھر گئی۔ پھر حضرتؑ اسی غضب کی حالت میں کہ غصہ سے چہرہ سُرخ ہو رہا تھا منبر پر تشریف لے گئے پہلے خدائے سبحانہ کی حمد و ثنا بجا لائے اور حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود بھیجا پھر فرمایا:

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ لَا یَفِرُہُ الْمَنْعُ وَ الْجُمُوْدُ، وَ لَا یُکْدِیْہِ الْاِعْطَآءُ وَ الْجُوْدُ، اِذْ کُلُّ مُعْطٍ مُّنْتَقِصٌ سِوَاہُ، وَ کُلُّ مَانِعٍ مَّذْمُوْمٌ مَا خَلَاہُ، وَ ھُوَ الْمَنَّانُ

سب تعریف (اسی) خدا کے لیے ہے جس کا (اپنے جود و عطا کو) روکنا اور کنجوس بننا اس (کے مال) کو بڑھا نہیں سکتا اور بخشش و سخاوت اس کو خالی اور عاجز نہیں کر سکتی۔ اس لیے کہ اس کے سوا جو شخص جود و عطا کرنے والا ہے اس کے یہاں (بے شک) کمی ہوتی ہے اور اس کے سوا جو بخل کرنے والا ہے اس کی البتہ مذمت کی جاتی ہے اور وہ

نقطہ: حضرت آدمؑ نے عرش پر کچھ تصویریں دیکھیں ان کا نور چمک رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ سے پوچھا یہ تصویریں (مثالیں) کن لوگوں کی ہیں؟ فرمایا یہ مثالیں ہیں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب اور امام حسن و امام حسین علیہم السلام اور جناب سیدہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہم کی۔

بِفَوَآئِدِ النِّعَمِ، وَ عَوآئِدِ الْمَزِيْدِ وَ الْقِسَمِ، عِيَالُهُ الْخَلَآئِقُ، ضَمِنَ اَرْزَاقَهُمْ، وَ قَدَّرَ اَقْوَاتَهُمْ، وَ نَهَجَ سَبِيْلَ الرَّاغِبِيْنَ اِلَيْهِ، وَ الطَّالِبِيْنَ مَا لَدَيْهِ، وَ لَيْسَ بِمَا سُئِلَ بِاَجْوَدَ مِنْهُ بِمَا لَمْ يُسْئَلْ.

تو (اپنی) فراوان نعمتوں اور بکثرت بخششوں اور تقسیموں کا بڑا احسان کرنے والا ہے۔[1] اس کے عیال یہی مخلوق ہیں جن کے رزق کا وہ ضامن ہے اور جن کی روزیوں کو وہ مقدر کر چکا ہے اور جو لوگ اس سے لو لگائے اور اس چیز کے خواہاں رہتے ہیں جو اس کے پاس ہے ان کی راہ اس نے واضح کر دی ہے۔ اور جس چیز کا اس سے سوال کیا جاتا ہے اس کے بخشنے میں وہ اس چیز سے زیادہ سخی نہیں ہے جس کا سوال نہیں کیا جاتا ہے۔[2]

اَلْاَوَّلُ الَّذِیْ لَمْ یَکُنْ لَّهٗ قَبْلٌ فَیَکُوْنَ شَیْءٌ قَبْلَهٗ، وَ الْاٰخِرُ الَّذِیْ لَیْسَ لَهٗ بَعْدٌ

وہ ایسا اول ہے جس کے لیے کوئی ابتدا نہیں تھی جس سے کوئی چیز اس کے پہلے ہوتی اور ایسا آخر ہے جس کے لیے کوئی انتہا نہیں ہے تا کہ کوئی چیز اس کے بعد ہو سکے۔ وہ

---

[1] علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ کسی نے حضرت امام علی رضا علیہ السلام سے دریافت کیا کہ جواد (سخی) کس کو کہتے ہیں اس کی تعریف فرمائیں۔ تو ارشاد فرمایا کہ تمہارے کلام کے دو صورتیں ہیں۔ اگر تمہارا سوال مخلوقات کے بارے میں ہے کہ ان سے کون شخص سخی اور کون بخیل ہے تو سخی وہ ہے جو اس قدر مال خرچ کرے جس قدر خدا نے اس پر واجب کیا ہے اور بخیل وہ ہے جو اس قدر بھی خرچ نہ کرے جتنا خدا نے اس پر واجب کیا ہے۔ اور اگر تمہارا سوال خالق کے بارے میں ہے تو اگر وہ بخشش وعطا کرے جب بھی جواد اور سخی ہے اور نہ دے بلکہ اپنی نعمتوں سے محروم رکھے جب بھی جواد اور سخی ہے، کیونکہ اگر وہ کسی بندے کو کچھ دے گا تو وہی دے گا جو اس بندے کا نہیں ہے، نہ اس کو اس سے مطالبہ کرنے کا کوئی حق ہے اور اگر کسی بندے کو محروم رکھے گا تو اسی چیز سے محروم رکھے گا جس میں اس بندے کا کوئی حق نہیں ہے، نہ اس کے مطالبہ کرنے کی کوئی وجہ ہے۔

[2] اس میں بھی ایک لطیف معنی ہے اور وہ یوں کہ یہ معنی ان باتوں سے ہے جو بشر سے مخصوص ہے۔ کیونکہ جب لوگوں سے کوئی سوال کیا جاتا ہے تو ان میں بخشش کرنے کی آمادگی پیدا ہوتی ہے اور وہ کچھ دینا چاہتے ہیں اور سائل کا سوال ہی ان کو اس جود وعطا کی تحریک کرتا ہے تو سائل جس چیز کا سوال کرتا ہے اس کے دینے میں انسان زیادہ سخی اور جواد ہوتا ہے بہ نسبت ان چیزوں کے جن کا سوال نہیں کیا جاتا کہ ان چیزوں کے دینے کا خیال ہی اس کو نہیں ہوتا ہے یا ہوتا بھی ہے تو بہت کم اور شاذ و نادر۔ برخلاف خداوند عالم کے کہ اس کی سخاوت اس طریقہ کی نہیں ہے بلکہ اس کی بخشش ہر حالت کے لیے عام ہے اور کسی کے سوال پر موقوف نہیں ہے، بغیر سوال کیے بھی وہ ضرورت سمجھتا اور اپنا فیضان کرتا رہتا ہے۔ غرض یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ خدا سے جب کوئی شخص سوال کرے گا تو خدا اس وقت زیادہ بخشش کرے گا اور جب کوئی سوال نہیں کرے گا تو اس وقت وہ بخشش نہیں کرے گا یا کم کرے گا بلکہ ہر حالت میں وہ بہت بڑا منعم اور سخی ہے۔

فَيَكُوْنَ شَيْءٌ بَعْدَهٗ، وَ الرَّادِعُ اَنَاسِيَّ الْاَبْصَارِ عَنْ اَنْ تَنَالَهٗ اَوْ تُدْرِكَهٗ، مَا اخْتَلَفَ عَلَيْهِ دَهْرٌ فَيَخْتَلِفَ مِنْهُ الْحَالُ، وَ لَا كَانَ فِيْ مَكَانٍ فَيَجُوْزَ عَلَيْهِ الْاِنْتِقَالُ.

آنکھوں کی پتلیوں کو اس سے باز رکھتا ہے کہ اس کو دیکھ یا پاسکیں۔[1] اس پر کوئی زمانہ بدلا ہی نہیں ہے جس سے اس کا حال متغیر ہوتا اور وہ کسی خاص جگہ رہا ہی نہیں جس سے ہٹنا اس کے لیے جائز ہو۔

وَ لَوْ وَهَبَ مَا تَنَفَّسَتْ عَنْهُ مَعَادِنُ الْجِبَالِ، وَ ضَحِكَتْ عَنْهُ اَصْدَافُ الْبِحَارِ، مِنْ فِلِزِّ اللُّجَيْنِ وَ الْعِقْيَانِ، وَ نُثَارَةِ الدُّرِّ وَ حَصِيْدِ الْمَرْجَانِ، مَآ اَثَّرَ ذٰلِكَ فِيْ جُوْدِهٖ، وَ لَاَنْفَدَ سَعَةَ مَا عِنْدَهٗ، وَ لَكَانَ عِنْدَهٗ مِنْ

اور جن چیزوں کو پہاڑوں کے کان نکالتے ہیں اور جن اشیاء کو سمندروں کے صدف باہر لاتے ہیں یعنی چاندی اور سونے کے فلزات اور موتیوں کے بکھرے ہوئے دانے اور مرجان کے خوشے، اگر ان سب کو وہ بخش دے جب بھی یہ اس کی بخشش پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتا اور نہ ان نعمتوں کی وسعت کو تمام کرسکتا ہے جو اس کے پاس ہیں۔ اس کے یہاں تو نعمتوں کے ذخیرے اس کثرت

---

[1] یعنی خدا کو کوئی شخص دیکھ نہیں سکتا نہ تو دنیا میں اور نہ آخرت میں۔ اس لیے کہ خدا نہ جسم ہے نہ جسمانی، اور ظاہر ہے کہ جو چیز جسم یا جسمانی نہیں ہوگی اس کو کوئی شخص کسی طرح نہیں دیکھ سکتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں بھی اس پر نص فرمادی ہے۔ پارہ ۷ سورۂ انعام آیہ ۱۰۳ میں فرماتا ہے:

﴿لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۫ وَ هُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ﴾

یعنی اس کو آنکھیں کسی طرح نہیں دیکھ سکتی ہیں اور وہ لوگوں کی نظروں کو خوب دیکھتا ہے۔

پھر پارہ ۹ سورۂ اعراف آیہ ۱۴۳ میں ہے:

﴿قَالَ رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ؕ قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ﴾

یعنی حضرت موسیٰؑ نے دعا کی اے خدا مجھے اپنے کو دکھادے۔ خدا نے فرمایا تم مجھے کبھی بھی نہیں دیکھ سکتے ہو۔

مگر حضرات اہل سنت کا اعتقاد ہے کہ خدا کو قیامت میں دیکھ لیں گے۔ صحیح بخاری وغیرہ میں بکثرت اس مضمون کی حدیثیں ہیں۔

سَتَرَوْنَ رَبَّكُمْ كَالْقَمَرِ۔

یعنی بہت جلد تم لوگ اپنے خدا کو اس طرح دیکھو گے جیسے چاند کو دیکھتے ہو۔ (صحیح بخاری مطبوعہ دہلی جلد ۱، صفحہ ۳۱۲)

سَتَرَوْنَ رَبَّكُمْ عَيَانًا۔

یعنی عنقریب تم خدا کو کھلم کھلا دیکھ لوگے۔ (صفحہ ۳۲۱)۔

ذَخَآئِرِ الْاِنْعَامِ مَا لَا تُنْفِدُهٗ مَطَالِبُ الْاَنَامِ، لِاَنَّهُ الْجَوَادُ الَّذِیْ لَا یَغِیْضُهٗ سُؤَالُ السَّآئِلِیْنَ، وَ لَا یُبْخِلُهٗ اِلْحَاحُ الْمُلِحِّیْنَ.

سے ہیں جن کو مخلوقات کی خواہشیں ختم ہی نہیں کرسکتی ہیں اس لیے کہ وہ ایسا سخی ہے جس (کے کرم) کو سائلوں کی طلب کم نہیں کرسکتی اور نہ الحاح وزاری کرنے والوں کا گڑگڑانا اسے بخیل کرسکتا ہے۔

فَانْظُرْ اَیُّهَا السَّآئِلُ: فَمَا دَلَّكَ الْقُرْاٰنُ عَلَیْهِ مِنْ صِفَتِهٖ فَائْتَمَّ بِهٖ وَ اسْتَضِیْٓءْ بِنُوْرِ هِدَایَتِهٖ، وَ مَا كَلَّفَكَ الشَّیْطٰنُ عِلْمَهٗ مِمَّا لَیْسَ فِی الْكِتَابِ عَلَیْكَ فَرْضُهٗ، وَ لَا فِیْ سُنَّةِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وَ اَئِمَّةِ الْهُدٰی اَثَرُهٗ، فَكِلْ عِلْمَهٗ اِلَی اللّٰهِ

تو اے سائل دیکھ![1] قرآن مجید تجھے اس (خدا) کی جو صفت بتائے اس کی پیروی کر اور اس کی ہدایت کے نور سے (علم کی) روشنی لے اور جس چیز کا علم حاصل کرنے پر شیطان تجھ کو برانگیختہ کرے اس قسم سے جس کا تجھ پر فرض ہونا نہ تو قرآن ہی میں (بیان کیا گیا) ہے اور نہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ ہدیٰ (علیہم السلام) کی سنت ہی میں اس کا کوئی نشان ہے (اس کے درپے نہ ہو بلکہ) اس کا

---

[1] چونکہ سائل نے حضرتؑ سے درخواست کی تھی کہ ہم سے ہمارے پروردگار کی حقیقت اور صفت اس طرح بیان فرمائیں جیسے ہم اس کو ظاہر بظاہر دیکھ لیں تو حضرتؑ غضبناک ہوئے اور آپ کے چہرہ کا رنگ اڑ گیا لہٰذا اب حضرتؑ اس مقام سے گویا بطور وصیت اس سے فرماتے ہیں کہ خدا کے جو اوصاف قرآن مجید یا حضرت رسول خداؐ کی حدیثوں میں یا ائمہ طاہرین علیہم الصلوۃ کے بیانات میں ہیں ان کو تو مان لینا اور جو باتیں ان کے خلاف ہوں ان کو چھوڑ دینا، اس لیے کہ کسی چیز کو کھلم کھلا دیکھ لینے سے اس کا جو علم حاصل ہوتا ہے ویسا علم خدا کا حاصل ہی نہیں ہوسکتا کیونکہ اس کی ذات اس قابل ہی نہیں ہے کہ حقیقی طور پر سمجھ میں آسکے یا اس کی ماہیت کا ادراک کرنا ممکن ہو۔ اس میں جب معلوم ہوا کہ خدا صانع عالَم ہے، قادر، عالم، حی، سمیع، بصیر، مرید ہے اور یہ کہ وہ نہ جسم ہے، نہ جوہر، نہ عرض۔ اور ہم نے ان کل چیزوں کو جو اس سے متعلق ہیں جان لیا تو صرف چند سلبی اور چند اضافی ہی باتیں جانیں اور اس میں شک نہیں کہ موصوف کی ماہیت صفات کی ماہیت سے مغایر اور اس کے خلاف ہوتی ہے۔ لہٰذا محال ہے کہ خدا کا علم ویسا حاصل ہوسکے جیسا آنکھ سے دیکھی ہوئی چیز کا علم ہوتا ہے۔ لہٰذا حضرت امیر المومنینؑ نے سائل کے اس سوال پر اس طرح اعتراض کیا جس طرح بنی اسرائیل کے سوال پر خدا نے اعتراض کیا تھا کہ جب انہوں نے حضرت موسیٰؑ سے کہا، یا موسیٰ:

﴿ لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰی نَرَی اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ﴾ (سورۂ البقرہ، آیہ ۵۵)

یعنی اے موسیٰؑ ہم تم پر اس وقت تک ہرگز ایمان نہ لائیں گے جب تک خدا کو ظاہر بظاہر نہ دیکھ لیں اس پر خدا بھی غضبناک ہوا اور بنی اسرائیل پر بجلی گری اور وہ تکتے ہی رہ گئے۔

سُبْحَانَهٗ، فَاِنَّ ذٰلِكَ مُنْتَهٰى حَقِّ اللّٰهِ عَلَيْكَ.

علم خدائے سبحانہ پر ہی چھوڑ دے کہ تجھ پر خدا کا زیادہ سے زیادہ حق یہی ہے۔[1]

وَ اعْلَمْ اَنَّ الرَّاسِخِيْنَ فِي الْعِلْمِ هُمُ الَّذِيْنَ اَغْنَاهُمْ عَنِ اقْتِحَامِ السُّدَدِ الْمَضْرُوْبَةِ دُوْنَ الْغُيُوْبِ، الْاِقْرَارُ بِجُمْلَةِ مَا جَهِلُوْا تَفْسِيْرَهٗ مِنَ الْغَيْبِ الْمَحْجُوْبِ، فَمَدَحَ اللّٰهُ اعْتِرَافَهُمْ بِالْعَجْزِ عَنْ تَنَاوُلِ مَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِهٖ عِلْمًا، وَ سَمّٰى تَرْكَهُمُ التَّعَمُّقَ فِيْمَا لَمْ يُكَلِّفْهُمُ الْبَحْثَ عَنْ كُنْهِهٖ رُسُوْخًا،

اور خوب جان لے کہ علم میں راسخ (پختہ) وہی حضرات ہیں[2] جنھیں ان دروازوں میں گھسنے سے جو غیب کی باتوں کے سامنے لگا دیے گئے ہیں اس امر نے بے نیاز کر دیا ہے کہ جن مخفی امور غیب کی تفسیر وہ نہیں جانتے ان کا اجمالی اعتقاد رکھتے ہیں۔ تو خدا نے ان کی تعریف کی کہ یہ لوگ اپنے علم سے جس چیز پر حاوی نہیں ہو سکتے اس کے ادراک سے عاجز رہنے کا اقرار کرتے ہیں اور انھیں جس چیز کی کنہ حقیقت سے بحث کرنے کی تکلیف نہیں دی ہے

---

[1] اگر غور کیجیے تو اس کلام سے مذہب شیعہ کی پوری حقیت ثابت ہوتی ہے کیونکہ یہی لوگ اپنے عقائد کا دارومدار قرآن مجید، احادیث جناب رسالت مآبؐ اور بیانات حضرات ائمہ معصومینؑ پر رکھتے ہیں برخلاف دوسرے اسلامی فرقوں کے کہ کوئی اشعری ہو کر (ابوالحسن اشعری) کا پیرو ہوا، کوئی معتزلہ ہوا، کوئی ماتریدی ہوا، کوئی قدری ہوا، کوئی جہمی ہوا، کوئی مجسمہ ہوا، غرض متعدد عقائد کے فرقے پیدا ہوتے گئے اور انہوں نے خدا کے بارے میں کچھ نہ کہا۔

[2] خدا نے بھی قرآن مجید پارہ ۳ سورۂ آل عمران آیہ ۷ میں فرمایا ہے:

﴿وَ مَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَ مَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴾

خدا اور ان لوگوں کے سوا جو علم میں بڑے پایہ پر فائز ہیں ان کا اصلی مطلب کوئی نہیں جانتا۔ وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے یہ سب خدا کی طرف سے ہے اور صاحبان عقل ہی سمجھتے ہیں۔

تفسیر درمنثور جلد ۲ صفحہ ۷ میں ہے انس بن مالک کہتے ہیں کہ میں نے رسول خداؐ سے پوچھا کہ ﴿رَاسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ﴾ کون لوگ ہیں؟ آپؐ نے فرمایا وہ جن کے ہاتھ نیکی کرنے والے، زبان سچی، دل سیدھے ہوں اور جو حرام پیٹ اور فرج سے محفوظ ہوں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ یہ صفات حضرت رسولؐ اور ائمہ معصومینؑ کے سوا کسی میں پائے ہی نہیں گئے کیونکہ ان حضرات کے سوا اس وقت امت میں کوئی ایسا نہیں جن کے ہاتھوں نے نیکی کے سوا ظلم، زبان نے سچ کے سوا جھوٹ، دل نے استقامت کے سوا کجی، پیٹ اور فرج نے حلال کے سوا حرام اختیار ہی نہ کیا ہو۔ اور بھی بکثرت کتب اہل سنت سے ثابت ہے کہ ﴿رَاسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ﴾ حضرات ائمہ طاہرینؑ ہی ہیں۔ (اس کی تفصیل انشاء اللہ ضمیمہ میں آئے گی)

فَاقْتَصِرْ عَلٰى ذٰلِكَ، وَ لَاتُقَدِّرْ عَظَمَةَ اللّٰهِ سُبْحَانَهٗ عَلٰى قَدْرِ عَقْلِكَ فَتَكُوْنَ مِنَ الْهَالِكِيْنَ.

اس میں ڈوبتے نہیں۔(ان کی) اسی (صفت) کا نام (خدا نے) رسوخ رکھا ہے۔(اے سائل) تو بھی اسی پر بس کر اور خدائے سبحانہ کی بزرگی کا اندازہ اپنی عقل کے موافق نہ کرورنہ ہلاک ہونے والوں سے ہوجائے گا۔[1]

هُوَ الْقَادِرُ الَّذِيْ اِذَا ارْتَمَتِ الْاَوْهَامُ لِتُدْرِكَ مُنْقَطَعَ قُدْرَتِهٖ، وَ حَاوَلَ الْفِكْرُ الْمُبَرَّاُ مِنْ خَطَرَاتِ الْوَسَاوِسِ اَنْ يَّقَعَ عَلَيْهِ فِيْ عَمِيْقَاتِ غُيُوْبِ مَلَكُوْتِهٖ، وَ تَوَلَّهَتِ الْقُلُوْبُ اِلَيْهِ لِتَجْرِيَ فِيْ كَيْفِيَّةِ صِفَاتِهٖ، وَ غَمَضَتْ مَدَاخِلُ الْعُقُوْلِ فِيْ حَيْثُ لَا تَبْلُغُهُ الصِّفَاتُ لِتَنَاوُلِ عِلْمِ ذَاتِهٖ، رَدَعَهَا وَ هِيَ تَجُوْبُ مَهَاوِيَ سُدَفِ الْغُيُوْبِ، مُتَخَلِّصَةً اِلَيْهِ ـ سُبْحَانَهٗ ـ فَرَجَعَتْ اِذْ جُبِهَتْ، مُعْتَرِفَةً بِاَنَّهٗ لَا يُنَالُ بِجَوْرِ الْاِعْتِسَافِ كُنْهُ مَعْرِفَتِهٖ، وَ لَا تَخْطُرُ بِبَالِ اُولِي الرَّوِيَّاتِ خَاطِرَةٌ مِّنْ

وہ ایسا قادر ہے کہ جب (انسان کا) وہم وگمان اس کی منتہائے قدرت جاننے کے لیے (غور وفکر کی) تیر بارانی کرتا ہے وہ فکر جو (شیطانی) وسوسوں کے خطوروں سے بری ہے قصد کرتی ہے کہ اس کی سلطنت کے غیبی امور کی گہرائیوں میں (داخل ہوکر) اس تک پہنچے اور قلوب اس کی صفتوں کی کیفیت سمجھنے کے لیے اس کی طرف دیوانہ وار بڑھتے ہیں اور جب عقل کی راہیں اس قدر باریک ہوجاتی ہیں کہ وہاں تک صفتیں نہیں پہنچ سکتی ہیں تاکہ اس کی ذات کا علم حاصل کرلیں تو خدا ان سب کو ہٹا دیتا ہے۔پس یہ چیزیں غیب کی تاریکیوں کی جاہائے ہلاکت کو طے کرتے ہوئی (ان کوششوں سے) چھٹکارہ پاکر (یعنی مایوس ہوکر) خدا کی طرف متوجہ ہوجاتی ہیں۔غرض جب روک دی جاتی ہیں تو یہ اقرار کرکے پلٹ پڑتی ہیں کہ بے شک زبردستی اور

---

[1] یعنی بہت سی باتیں وہ ہیں جن کو خدا نے مصالح کی وجہ سے پردۂ خفا وغیب میں رکھا ہے اور کسی کو اس سے مطلع نہیں کیا تو جو حضرات راسخون فی العلم ہیں وہ ان غیب کی خبروں کے جاننے کے درپے نہیں ہوتے بلکہ جب انہوں نے اپنی عقل اور معرفت سے اس کو طے کرلیا کہ خداوند عالم ودانا اور حکیم ہے تو سمجھ لیا کہ جن باتوں کو اس نے غیب کے پردہ میں رکھا ہے وہ سب بھی صحیح اور پر از حکمت ومصلحت ہیں اس وجہ سے خدا نے سورۂ بقرہ کے شروع ہی میں فرمادیا ہے کہ

﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾ (سورۂ البقرہ، آیہ ۲)

یعنی اس کتاب قرآن مجید میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے یہ پرہیزگاروں کے لیے ہدایت ہے اور پرہیزگار وہ ہیں جو غیب پر ایمان لاتے ہیں۔

تَقْدِيْرِ جَلَالِ عِزَّتِهٖ.

اَلَّذِی ابْتَدَعَ الْخَلْقَ عَلٰی غَيْرِ مِثَالٍ اَمْتَثَلَهٗ، وَ لَا مِقْدَارٍ احْتَذٰی عَلَيْهِ، مِنْ خَالِقٍ مَّعْبُوْدٍ كَانَ قَبْلَهٗ، وَ اَرَانَا مِنْ مَّلَكُوْتِ قُدْرَتِهٖ، وَ عَجَآئِبِ مَا نَطَقَتْ بِهٖ

زور سے اس کی کنہ معرفت نہیں حاصل ہوسکتی ہے۔ ۱؎

اور غور وفکر کرنے والوں کے دل میں اس کی جلالت عزت (وعظمت) کے اندازہ کرنے کا کوئی خیال نہیں پیدا ہوسکتا ہے۔ ۲؎ ایسا (خدا) جس نے کسی مثال سے سبق لیے بغیر مخلوق کو ایجاد کر دیا نہ (اس کے سامنے) کوئی ایسا معیار تھا جو اس سے پہلے کسی خالق نے مقرر کیا اور اس (خدا) نے اسی کی پیروی کی ہو۔ ۳؎ اور اس نے اپنی

۱؎ اس پورے خطبہ کا خلاصہ مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی عقل کے زور اور علم وحکمت اور غور وفکر کی کوشش سے چاہے کہ خدا کی کنہ حقیقت وماہیت کو سمجھ لے وہ کامیاب نہیں ہوسکتا ہے۔ ہماری کوشش ہی کیا سرور عالم حضرت رسالت مآبؐ تک نے فرمادیا ہے:

مَاعَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ۔

اے خدا ہم نے بھی تجھ کو ویسا نہیں پہچانا جو تیرے پہچاننے کا حق ہے۔

۲؎ اس فصل کا خلاصہ یہ ہے کہ جب انسانی عقلیں قصد کرتی ہیں کہ معلوم کریں خدا کی قدرت اس کے مقدورات پر کہاں ختم اور تمام ہوتی ہے۔ تو اس سے تھک جاتی ہیں کیونکہ وہ تو ابدی اور دائمی ایسا قادر ہے اور ہر اس چیز پر قدرت رکھتا ہے جس کی انتہا ہی نہیں ہے۔ اور وہ فکر جو وسوسوں اور تر ددات سے خالی اور صاف ہے جب کوشش کرتی ہے کہ خدا کے علم میں جو غیبی امور ہیں ان کو جان لیں تو عاجز اور درماندہ ہوکر پلٹ پڑتی ہے اور جب لوگوں کے نفس مشتاق ہوکر اس کی طرف دیوانہ وار بڑھتے ہیں تاکہ اس راستہ پر چلیں جس سے اس کے صفات کی کیفیت پر واقف ہوسکیں تو اس میں ناکامیاب رہتے ہیں۔ اور جب انسان کی عقل اور دماغی قوت علوم نظریہ الٰہیہ کے دقائق میں گھس کر اور اچھی طرح زور آزمائی کر کے چاہتی ہے کہ خدا کی حقیقت ذات کو جان لے تو اپنے ارادہ میں خائب اور خاسر ہو جاتی اور خدا اس کو رد کر دیتا ہے اور وہ غیب کی تاریکیوں میں جولانی کرتی ہوئی چاہتی ہے کہ خدا تک پہنچ جائے تو خدا اس کو اس سے باز رکھتا ہے۔ پس اب وہ یہ اقرار کر کے پلٹ پڑتی ہے کہ بے شک خواہ کچھ بھی جدوجہد اور محنت ومشقت کی جائے اس سے خدا کی اصلی حقیقت سمجھ میں نہیں آسکتی ہے اور صاحبان نظر وفکر اور ارباب غور وتامل اس امر سے معذور رہتے ہیں کہ ان کے ذہن میں ایسا کوئی امر خطور کر سکے جو خدا کی جلالت عزت کے اندازے کے مطابق ہو۔

۳؎ مقصود یہ ہے کہ جس طرح سنار مثلاً سیسہ رانگے وغیرہ کا کوئی نمونہ پہلے بنا کر اس پر سونے چاندی کی چیز بناتے یا جس طرح معمار کسی مکان کا نقشہ وغیرہ مرتب کرنے اور مکان کے ہر حصہ کی حد بندی وغیرہ کرنے کے بعد اس کی تعمیر شروع کرتے ہیں یا جس طرح استاد کے طریقہ کو دیکھ کر شاگرد بھی اسی طرح کام کرتا ہے اس طرح خدا نے دنیا کو نہیں پیدا کیا کہ نہ تو پہلے کوئی ڈھانچہ بنالیا اس کے بعد مخلوق کو اس پر پیدا کیا اور نہ کسی اور خدا کی کوئی صنعت اور کاریگری دیکھ کر اس کی تقلید کی اور اسی طرح خود بھی اس خلق کو پیدا کر دیا بلکہ اس نے ایک لفظ کن کہہ کر تمام عالم کو پیدا کر دیا۔

اٰثَارُ حِكْمَتِهٖ، وَ اعْتِرَافِ الْحَاجَةِ مِنَ الْخَلْقِ اِلٰٓى اَنْ يُّقِيْمَهَا بِمَسَاكِ قُوَّتِهٖ، مَا دَلَّنَا بِاضْطِرَارِ قِيَامِ الْحُجَّةِ لَهٗ عَلٰى مَعْرِفَتِهٖ، وَ ظَهَرَتْ فِي الْبَدَآئِعِ الَّتِيْ اَحْدَثَهَآ اٰثَارُ صَنْعَتِهٖ، وَ اَعْلَامُ حِكْمَتِهٖ، فَصَارَ كُلُّ مَا خَلَقَ حُجَّةً لَّهٗ وَ دَلِيْلًا عَلَيْهِ، وَ اِنْ كَانَ خَلْقًا صَامِتًا، فَحُجَّتُهٗ بِالتَّدْبِيْرِ نَاطِقَةٌ، وَ دَلَالَتُهٗ عَلَى الْمُبْدِعِ قَآئِمَةٌ.

قدرت کے تسلط واختیار اوران چیزوں کے عجائب وغرائب سے جن کو اس کی حکمت کے آثار بول رہے ہیں اور مخلوق کے اس اقرار سے کہ یہ محتاج ہے کہ وہ (خدا) اس کو اپنی قوت کے آڑ سے تھامے رہے ہم کو وہ نشانیاں دکھادی ہیں جو ہمیں (اچھی طرح) بتاتی ہیں کہ خدا کی معرفت پر اس کی حجت وبرہان قہراً قائم ہے [1] اور جن نرالی چیزوں کو اس نے (اپنی قدرت کاملہ سے) پیدا کیا ہے ان میں اس کی صنعت کے علامات اور حکمت کے نشان ظاہر ہیں تو ہر وہ چیز جس کو اس نے پیدا کیا ہے اس کی ایک (زبردست) حجت اور (قوی) دلیل ہوگئی ہے اور اگر وہ بے زبان مخلوق ہے تو (اس کی خلقت کے بہترین) انتظام سے اس کی دلیل بولتی اور خالق (مطلق) پر اس کی دلالت قائم ہے۔ [2]

---

[1] یعنی خدا نے اس میں اپنی عجیب وغریب صنعتوں میں اور کل موجودات کے اس اقرار کرنے میں (کہ وہ سب خدا کی محتاج ہیں کہ ان کو اپنی قوت سے پکڑے رہے یعنی قائم رکھے) وہ نشانیاں دکھادی ہیں جو ہم کو اس امر کے ماننے پر مجبور کرتی ہیں کہ خدا کی معرفت پر یقیناً دلیل اور حجت وبرہان قائم ہے۔ اور اس سے کسی طرح انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔

[2] خدا کی صنعت کے آثار اس کی حکمت کی دلیلیں اس کی تمام مخلوقات سے ظاہر ہیں۔ اگر ان میں بعض مخلوقات بے زبان ہونے کی وجہ سے اپنے خالق کو نہیں بتاسکتی ہیں تو اپنی زبان حال سے گویا ہیں کہ وہ بغیر کسی صانع علیم وحکیم کے بنائے بن ہی نہیں سکتی تھیں۔ غرض اگر وہ اپنی صورت سے خاموش ہیں تو اپنے معنی حقیقت اور حال وجود سے بول رہی ہیں کہ اللہ ہی ان کا خالق اور پروردگار ہے۔ اسی مطلب کو شاعر نے یوں ادا کیا ہے:

فَوَا عَجَبًا كَيْفَ يَعْصِي الْاِلٰهَ ... اَمْ كَيْفَ يَجْحَدُهُ الْجَاحِدُ

وَفِيْ كُلِّ شَيْءٍ لَهٗ اٰيَةٌ ... تَدُلُّ عَلٰى اَنَّهٗ وَاحِدٌ

نہایت حیرت اور تعجب ہے کہ کوئی شخص خدا کی نافرمانی کیوں کر کرتا ہے یا کوئی اس کا انکار کس طرح کرسکتا ہے ہر چیز میں اس کی ایک نشانی ہے۔ جو اس کو بتاتی ہے کہ وہی ایک خدا سب کا خالق ہے۔

خدا نے کلام مجید میں بھی تقریباً اسی مضمون کو فرمایا ہے۔ پارہ ۱۵ سورہ بنی اسرائیل آیہ ۴۴ میں ہے:

﴿وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ﴾

(بقیہ صفحہ بالا)

وَ اَشْهَدُ اَنَّ مَنْ شَبَّهَكَ بِتَبَايُنِ اَعْضَآءِ خَلْقِكَ، وَ تَلَاحُمِ حِقَاقِ مَفَاصِلِهِمُ الْمُحْتَجِبَةِ لِتَدْبِيْرِ حِكْمَتِكَ، لَمْ يَعْقِدْ غَيْبَ ضَمِيْرِهٖ عَلٰى مَعْرِفَتِكَ، وَ لَمْ يُبَاشِرْ قَلْبَهُ الْيَقِيْنُ بِاَنَّهٗ لَا نِدَّ لَكَ، وَ كَاَنَّهٗ لَمْ يَسْمَعْ تَبَرُّؤَ التَّابِعِيْنَ مِنَ الْمَتْبُوْعِيْنَ اِذْ يَقُوْلُوْنَ: ﴿تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ - اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾.

پس (اے خدا) میں گواہی دیتا ہوں کہ جس نے تیری مخلوق کے ایک دوسرے سے مخالف اعضاء اور ان کے ان جوڑوں کی ہڈیوں اور سوراخوں کے پیوند سے تجھ کو تشبیہ دی جو تیری حکمت آمیز تدبیر سے (گوشت و پوست میں پیوست ہو کر) پوشیدہ ہیں اس نے اپنے قلبی اسرار کو تیری معرفت کا معتقد نہیں کیا اور اس کے دل سے یہ یقین مس بھی نہیں ہوا کہ تیرا کوئی مثل و نظیر نہیں ہے۔[1] اور گویا اس نے مقتداؤں سے پیروؤں کی وہ بیزاری سنی ہی نہیں جب وہ (بروز قیامت) کہیں گے کہ ''خدا کی قسم ہم کھلی گمراہی میں تھے جو تم کو پروردگار عالم کے برابر سمجھتے رہے''۔[2]

(بقیہ صفحہ سابق) سارے جہاں میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو خدا کی حمد و ثنا کی تسبیح نہ کرتی ہو مگر تم لوگ ان کی تسبیح نہیں سمجھتے۔

ہر گُل کے ورق میں رنگ و بو تیری ہے — بُلبُل کو چمن میں گفتگو تیری ہے
ہر ذرہ ہے تر زبان ثنا میں تیری — ہر شی کو جہاں میں آرزو تیری

[1] اس کلام کا خلاصہ مطلب یہ ہے کہ حضرتؑ قسم کھا کر ارشاد فرماتے ہیں کہ جو لوگ خدا کو جسمانی سمجھتے ہیں اور اس کے اعضاء کا اعتقاد رکھتے ہیں وہ کافر ہیں اور وہ خدا کو پہچانتے ہی نہیں ہیں اور یہ کہ جو شخص خدا کو مخلوقات سے تشبیہ دے اس کو خدا کی معرفت حاصل ہی نہیں ہوئی اور اس کے قلب میں یقین کا اثر تک نہیں ہوا اس لیے کہ خدا کی مخلوقات کے ہاتھ، پاؤں دوسرے اعضاء و جوارح ہیں جو ایک دوسرے سے مغایر ہیں اور ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہڈیاں اور ان کے جوڑ پیوند ہیں برخلاف خدا کے کہ اس میں ان چیزوں سے کچھ بھی نہیں ہے اور اس کا تو کوئی بھی مثل و نظیر نہ ہے نہ ہو سکتا ہے۔

[2] فرقہ مجسمہ کے کفر اور خدا کے تمام مخلوقات سے مغایر ہونے کی تاکید میں یہ جملے بھی ارشاد فرمائے ہیں جو قرآن مجید سے ماخوذ ہیں پارہ ۱۹ سورہ شعراء آیہ ۹۴ تا ۹۸ میں ہے:

﴿فَكُبْكِبُوْا فِيْهَا هُمْ وَ الْغَاوٗنَ ۝ وَ جُنُوْدُ اِبْلِيْسَ اَجْمَعُوْنَ ۝ قَالُوْا وَ هُمْ فِيْهَا يَخْتَصِمُوْنَ ۝ تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾

پھر وہ (معبود) اور گمراہ لوگ اور شیطان کا لشکر سب کے سب جہنم میں اوندھے منہ ڈھکیل دیے جائیں گے اور یہ لوگ جہنم میں باہم جھگڑا کریں گے اور گمراہ اپنے معبود سے کہیں گے خدا کی قسم ہم لوگ تو یقیناً صریحی گمراہی میں تھے کہ ہم تم کو تمام جہان کے پالنے والے خدا کے برابر سمجھتے رہے۔

(بقیہ صفحہ لاحق)

(بقیہ صفحہ ماقبل) مگر مسلمانوں میں بھی بعض فرقے ایسے پیدا ہو گئے جو خدا کے ہاتھ، پاؤں وغیرہ کو تجویز کرتے ہیں۔ علامہ اہل سنت مولوی وحید الزمان خان صاحب کی کتاب انوار اللغۃ پارہ ۱۲ صفحہ ۱۶۶ میں ہے:

''پروردگار اپنی پنڈلی کھول دے گا، اپنے بندوں کو قدم بوسی کا شرف عنایت فرمائے گا۔ اس کو دیکھ کر تمام مومنین سجدے میں گر پڑیں گے یہ حدیث احادیث صفات میں سے ہے اور اہل حدیث ایسی حدیثوں کے ظاہری معنی پر ایمان رکھ کر اس کی حقیقت اور کیفیت کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتے ہیں یعنی اس بات کا اعتقاد رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا منہ ہے، ہاتھ ہیں، آنکھیں ہیں، پنڈلی ہے''۔ اس کلام کے آخر میں لکھتے ہیں ''سلف صالحین سب اسی اعتقاد پر گزرے ہیں''۔

پھر پارہ ۱۸ صفحہ ۶ میں لکھتے ہیں:

''ایک فرقہ ہے جو اللہ تعالیٰ کو آدمی کی صورت پر کہتا ہے کیونکہ حدیث میں ہے۔ ''اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ'' مترجم کہتا ہے اہل حدیث بھی اس کے قائل ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ایک صورت ہے۔ ہاتھ اور پاؤں اور منہ اور آنکھ وغیرہ۔ جو صفتیں اس کی قرآن و حدیث میں وارد ہیں وہ اس کے لیے ثابت کرتے ہیں''

اور پارہ ۶ صفحہ ۳۶ میں ہے:

وَاِنَّہٗ لَیَئِطُّ اَطِیْطَ الرَّحْلِ الْجَدِیْدِ۔

یعنی عرش حضرت اسرافیل کے مونڈھے پر ہے اور وہ پروردگار کی عظمت سے اس طرح چرچر کرتا ہے جیسے نئی زین پر کوئی سوار ہو اور وہ چرچر کرتی ہے۔

وَاِنَّہٗ لَیَئِطُّ بِہٖ اَطِیْطَ الرَّحْلِ بِالرَّاکِبِ۔

عرش پروردگار کے اس پر بیٹھنے سے ایسا چرچراتا ہے جیسے زین سوار کے تلے چرچر کرتا ہے۔

یَوْمَ یَنْزِلُ اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی کُرْسِیِّہٖ وَیَئِطُّ کَمَا یَئِطُّ الرَّحْلُ۔

جس دن اللہ تعالیٰ اپنے عرش پر سے کرسی پر اتر آئے گا وہ زین کی طرح چرچرائے گی۔

ان حدیثوں سے جہمیوں کی جان نکلتی ہے اس حدیث کے بعد یہ ہے پھر میں اللہ جل جلالہ کے داہنے طرف کھڑا ہوں گا۔ سبحان اللہ اس حدیث سے اللہ تعالیٰ کی عظمت اور ہمارے پیغمبر کی فضیلت ایسی نکلتی ہے کہ مخالفین کے دانت کھٹے ہو جاتے ہیں''۔ اور پارہ ۶ صفحہ ۱۰۰ میں ہے:

اِنَّمَا نَحْنُ حَفَنَۃٌ مِنْ حُفَنَاتِ اللّٰہِ!۔

ہم لوگ اللہ تعالیٰ کے لبوں میں سے ایک لب ہیں۔

اور پارہ ۵ صفحہ ۵ میں ہے:

حَتّٰی یَضَعَ الْجَبَّارُ فِیْھَا قَدَمَہٗ۔

یہاں تک کہ جبار یعنی پروردگار اپنا قدم اس میں یعنی دوزخ میں رکھ دے گا اس وقت وہ کہے گی بس بس میں بھر گئی۔

(بقیہ صفحہ آئندہ)

كَذَبَ الْعَادِلُوْنَ بِكَ، اِذْ شَبَّهُوْكَ بِاَصْنَامِهِمْ وَ نَحَلُوْكَ حِلْيَةَ الْمَخْلُوْقِيْنَ بِاَوْهَامِهِمْ، وَ جَزَّاُوْكَ تَجْزِئَةَ الْمُجَسَّمَاتِ بِخَوَاطِرِهِمْ، وَ قَدَّرُوْكَ عَلَى الْخِلْقَةِ الْمُخْتَلِفَةِ الْقُوٰى، بِقَرَائِحِ عُقُوْلِهِمْ.

وَ اَشْهَدُ اَنَّ مَنْ سَاوَاكَ بِشَیْءٍ مِّنْ خَلْقِكَ فَقَدْ عَدَلَ بِكَ، وَ الْعَادِلُ بِكَ كَافِرٌ بِمَا تَنَزَّلَتْ بِهٖ مُحْكَمَاتُ اٰيَاتِكَ، وَ نَطَقَتْ عَنْهُ شَوَاهِدُ حُجَجِ بَيِّنَاتِكَ، وَ اَنَّكَ اَنْتَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَمْ تَتَنَاهَ فِی الْعُقُوْلِ، فَتَكُوْنَ فِیْ مَهَبِّ فِكْرِهَا مُكَيَّفًا، وَ لَا فِیْ رَوِيَّاتِ خَوَاطِرِهَا فَتَكُوْنَ مَحْدُوْدًا مُّصَرَّفًا.

(اے خدا) تیرے ساتھ دوسروں کو برابر کرنے والے جھوٹے ہیں جو انہوں نے تجھ کو اپنے بتوں سے تشبیہ دی اور اپنے اوہام باطلہ کے سبب تجھ کو مخلوقوں کی صفت سے متصف کیا اور اپنے فاسد گمانوں سے جسم دار چیزوں کے تجزیہ کی طرح تجھے بھی صاحب (اعضاء و) اجزا قرار دیا اور اپنی عقلی خیال آفرینیوں سے مختلف قوتوں والی مخلوق پر تیرا اندازہ کرلیا۔

مگر (اے خدا) میں گواہی دیتا ہوں کہ جس نے تجھے تیری مخلوق کی کسی چیز سے بھی برابر کیا اس نے یقیناً تیرا شریک تجویز کیا اور تیرا شریک تجویز کرنے والا ان دلیلوں سے کافر ہے جن کے ساتھ تیری آیات محکمات نازل ہوئیں اور جن سے تیری واضح دلیلوں کے شواہد گویا ہیں۔ اور اس کی (بھی گواہی دیتا ہوں) کہ یقیناً تو ایسا خدا ہے جو (اپنی کنہ حقیقت کے اعتبار سے) عقلوں میں سما ہی نہیں سکتا تا کہ ان کی جولان گاہِ فکر میں تیری کوئی کیفیت قائم ہو سکے یا ان کے خیالات کے غور خوض میں تیری کوئی حد مقرر اور تو قابل حرکت و تغیر ہو سکے۔ [1]

(بقیہ صفحہ ماقبل) اور پارہ ۲۱ صفحہ ۴۱ میں بھی یہی مضمون ہے اور پارہ ۲۱ صفحہ ۱۰۸ میں ہے:

حَتّٰی یَضَعَ الْجَبَّارُ فِیْهَا قَدَمَهٗ فَتَقُوْلُ قَطْ قَطْ۔

آنحضرتؐ نے دوزخ کا ذکر کیا کہ وہ برابر کہتی رہے گی اور کچھ ہے اور کچھ ہے یہاں تک کہ پروردگار اپنا مبارک قدم اس میں رکھ دے گا تب کہے گی بس بس میں بھر گئی۔

مولوی صاحب موصوف نے جو حدیثیں لکھی ہیں یہ صحاح ستہ۔ کنز العمال۔ تفسیر درمنثور وغیرہ میں بھی بھری پڑی ہیں۔

[1] حضرتؑ فرماتے ہیں کہ اے خدا میں گواہی دیتا ہوں کہ تو وہ خدا ہے کہ عقلیں جس طرح متناہی اور محدود چیزوں کا احاطہ کرتی ہیں اس طرح تیرا احاطہ نہیں کر سکتی ہیں کیونکہ اگر ایسا ہو سکتا تو تیری کوئی حد قائم ہوتی اور تو حرکت اور تغیر کے قابل ہو جاتا مگر تیرا احاطہ ہو ہی نہیں سکتا لہٰذا نہ تیری حد قائم ہو سکتی ہے نہ حرکت و تغیر تیرے لیے ممکن ہے۔ اس مقام پر علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں: (بقیہ صفحہ مابعد)

[وَ مِنْهَا]

قَدَّرَ مَا خَلَقَ فَاَحْكَمَ تَقْدِيْرَهٗ، وَ دَبَّرَهٗ فَاَلْطَفَ تَدْبِيْرَهٗ، وَ وَجَّهَهٗ لِوِجْهَتِهٖ فَلَمْ يَتَعَدَّ حُدُوْدَ مَنْزِلَتِهٖ، وَ لَمْ يَقْصُرْ دُوْنَ الْاِنْتِهَآءِ اِلٰى غَايَتِهٖ، وَ لَمْ يَسْتَصْعِبْ اِذْ اُمِرَ بِالْمُضِيِّ عَلٰٓى اِرَادَتِهٖ، وَ كَيْفَ وَ اِنَّمَا صَدَرَتِ الْاُمُوْرُ عَنْ مَّشِيْٓئَتِهٖ؟

[اور اسی خطبہ کا ایک حصّہ]

اس نے جس چیز کو پیدا کیا اس کا ایک اندازہ مقرر کر دیا پھر اس اندازے کو مضبوط اور محکم کیا اور اس کی تدبیر کی نیز اس تدبیر کو عمدہ اور اعلیٰ کیا۔ اور اس کو اس کی (خلقت کی) غرض (اور مطلوب) کی طرف متوجہ کر دیا تو وہ (مخلوق) اپنی (حالت اور) منزلت کی حدوں سے تجاوز نہ کر سکی اور اس نے اپنی غایت و مقصود تک پہنچنے میں قصور نہیں کیا[1] اور جب اس کو اپنے ارادے پر چلنے کا حکم دیا تو دشوار نہیں سمجھا اور ایسا ہوتا بھی کیوں اس لیے کہ تمام امور تو اسی کی مشیت سے صادر ہوئے ہیں۔[2]

وَقَدْ اِسْتَدَلَّ بَعْضُ الْمُتَكَلِّمِيْنَ عَلٰى نَفْيِ كَوْنِ الْبَارِيْ سُبْحَانَهٗ جِسْمًا بِمَا هُوَ مَاْخُوْذٌ مِنْ هٰذَا الْكَلَامِ.

یعنی اس دعوے پر کہ خدا جسم نہیں ہے بعض علماءِ علمِ کلام نے جو دلیل ذکر کی ہے وہ اسی کلام حضرت امیر المومنینؑ سے ماخوذ ہے۔

[1] یعنی خدا نے جن چیزوں کو پیدا کیا ان کا ایک اندازہ مقرر کر دیا اور ان کو اسی اندازے کے مطابق مضبوط اور استوار کیا اور ان کے انتظام کو لطیف کیا اور ہر چیز کو اس کی غایت اور اس حد پر قائم رکھا جو اس کے لیے اندازہ کی گئی ہے مثلاً باز اور شکروں کو شکار کے لیے مقرر کیا، تو گھوڑوں کو سواری اور بار برداری کے لیے قرار دیا، تلوار کو کاٹنے اور مارنے کے لیے بنایا، تو قلم کو لکھنے کے لیے ایجاد کیا۔ پس ان چیزوں کی جو حدیں ہیں ان سے نہ یہ پیچھے رہ سکتیں ہیں اور نہ ان سے تجاوز کر سکتیں ہیں۔

[2] مقصود یہ ہے کہ خدا نے جن چیزوں کو جن کاموں کے لیے پیدا کیا ہے ان کے لیے ان کاموں کا انجام دینا مشکل اور دشوار نہیں ہے یعنی بہت آسانی سے وہ فوائد اور اغراض ان چیزوں سے حاصل ہوتے رہتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن مجید پارہ ۲۴ سورہ حم سجدہ آیت ۱۱ میں ہے:

﴿فَقَالَ لَهَا وَ لِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ؕ قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ﴾

یعنی پھر آسمان اور زمین سے خدا نے فرمای: کہ تم دونوں آؤ خواہ خوشی سے اور خواہ کراہت سے، تو دونوں نے عرض کی ہم خوش خوش حاضر ہیں۔

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان دونوں کی شان اور حالت یہ تھی کہ اگر ان میں زبان ہوتی تو یہی جواب دیتے جسے ہمارے اردو محاورات میں بولتے ہیں کہ فلاں چیز زبان حال سے کہہ رہی تھی۔

اَلْمُنْشِئُ اَصْنَافَ الْاَشْيَآءِ بِلَا رَوِيَّةٍ فِكْرٍ اٰلَ اِلَيْهَا، وَ لَا قَرِيْحَةِ غَرِيْزَةٍ اَضْمَرَ عَلَيْهَا، وَ لَا تَجْرِبَةٍ اَفَادَهَا مِنْ حَوَادِثِ الدُّهُوْرِ، وَ لَا شَرِيْكٍ اَعَانَهٗ عَلَى ابْتِدَاعِ عَجَآئِبِ الْاُمُوْرِ، فَتَمَّ خَلْقُهٗ، وَ اَذْعَنَ لِطَاعَتِهٖ، وَ اَجَابَ اِلٰى دَعْوَتِهٖ، وَ لَمْ يَعْتَرِضْ دُوْنَهٗ رَيْثُ الْمُبْطِئِ، وَ لَآ اَنَاةُ الْمُتَلَكِّئِ، فَاَقَامَ مِنَ الْاَشْيَآءِ اَوَدَهَا، وَ نَهَجَ حُدُوْدَهَا، وَ لَآءَمَ بِقُدْرَتِهٖ بَيْنَ مُتَضَادِّهَا، وَ وَصَلَ اَسْبَابَ قَرَآئِنِهَا، وَ فَرَّقَهَا اَجْنَاسًا مُّخْتَلِفَاتٍ فِي الْحُدُوْدِ وَ الْاَقْدَارِ، وَ الْغَرَآئِزِ وَ الْهَيْئَاتِ، بَدَايَا خَلَآئِقَ اَحْكَمَ صُنْعَهَا، وَ فَطَرَهَا عَلٰى مَآ اَرَادَ وَ ابْتَدَعَهَا!.

وہ قسم قسم کی چیزوں کا پیدا کرنے والا ہے بغیر کسی غور و فکر کے جدھر رجوع کیا ہو اور بغیر کسی قوت ذہنیہ کے جس پر (مخلوقات کی پیدائش کو) دل میں سوچ رکھا ہو اور بغیر کسی تجربہ کے جس کو حوادث زمانہ سے حاصل کیا ہو اور بغیر کسی شریک کے جس نے (ان) عجیب وغریب چیزوں کے ایجاد کرنے میں اس کی مدد کی ہو۔ غرض صرف اس کے حکم سے اس (کی مخلوق) کی خلقت تمام اور کامل ہوگئی اور اس نے اس کی اطاعت کا اقرار کر لیا اور اس کی دعوت قبول کر لی۔ اس میں نہ دیر کرنے والے کی کوئی سستی حائل ہوئی اور نہ رکنے والے کی کوئی تاخیر۔ پھر اس نے چیزوں کی کجی کو سیدھا اور ان کی حدوں کو واضح کر دیا اور اپنی قدرت سے ان کی ایک دوسرے کی ضد کیفیتوں میں مناسبت پیدا کر دی[1] اور ان کے اسباب قرائن (وعوارض) کو ملا دیا۔[2] اور (پھر) انہیں ان کی حدوں، مقداروں، طبیعتوں اور ہیئتوں میں مختلف قسموں پر پھیلا دیا۔[3] (غرض یہ) عجیب وغریب مخلوقات ہیں جن کی خلقت کو اس نے محکم اور استوار کیا اور جس طرح چاہا انہیں پیدا اور ایجاد کیا۔

---

[1] جیسے حیوانات اور نباتات میں ان کیفیتوں اور مزاج کے درمیان جو ایک دوسرے کی ضد اور ایک دوسرے سے نفرت کرنے والی ہیں ملاپ پیدا کر دیا مثلاً گرمی اور سردی، تری اور خشکی، نرمی اور سختی کہ ہر صفت دوسری کی ضد ہے مگر ایک ایک چیز میں خدا نے ان کیفیتوں اور مزاجوں کو اپنی قدرت کاملہ سے جمع کر دیا ہے۔

[2] یعنی ان چیزوں کے نفسوں کے مزاج میں تعدیل پیدا کر کے ان کو ملا دیا اس لیے کہ مزاج کا اعتدال یا اس کا حد اعتدال سے قریب ہونا اور روح باقی رہنے کا سبب ہے تو خدا نے اس ذریعہ سے نفسوں کے باقی رہنے کے اسباب پیدا کر دیے۔

[3] یعنی دنیا میں بہت سی چیزیں ہیں جو سب کو ایک طرح پیدا نہیں کیا بلکہ مختلف حدوں، اندازوں، مزاجوں اور ہیئتوں پر پیدا کر کے ان کی علیحدہ علیحدہ جنسیں قائم کر دیں۔ غرض خدا نے ہر چیز کو ہمارے لیے عجیب وغریب ہی پیدا کی اور ہر مخلوق کی خلقت مستحکم اور استوار ہی طریقہ پر رکھی جو کسی کی سمجھ میں نہیں آتی۔

[مِنْهَا: فِيْ صِفَةِ السَّمَآءِ]

وَ نَظَمَ بِلَا تَعْلِيْقٍ رَّهَوَاتِ فُرَجِهَا، وَ لَاحَمَ صُدُوْعَ انْفِرَاجِهَا، وَ وَشَّجَ بَيْنَهَا وَ بَيْنَ اَزْوَاجِهَا، وَ ذَلَّلَ لِلْهَابِطِيْنَ بِاَمْرِهٖ، وَ الصَّاعِدِيْنَ بِاَعْمَالِ خَلْقِهٖ، حُزُوْنَةَ مِعْرَاجِهَا، وَ نَادَاهَا بَعْدَ اِذْ هِيَ دُخَانٌ، فَالْتَحَمَتْ عُرٰى اَشْرَاجِهَا، وَ فَتَقَ بَعْدَ الْاِرْتِتَاقِ صَوَامِتَ اَبْوَابِهَا، وَ اَقَامَ رَصَدًا مِّنَ الشُّهُبِ الثَّوَاقِبِ عَلٰى نِقَابِهَا، وَ اَمْسَكَهَا مِنْ اَنْ تَمُوْرَ فِيْ خَرْقِ الْهَوَآءِ بِاَيْدِهٖ، وَ اَمَرَهَا اَنْ تَقِفَ مُسْتَسْلِمَةً لِّاَمْرِهٖ، وَ جَعَلَ شَمْسَهَا اٰيَةً مُّبْصِرَةً لِّنَهَارِهَا، وَ قَمَرَهَا اٰيَةً مَّمْحُوَّةً مِّنْ لَّيْلِهَا، وَ اَجْرَاهُمَا فِيْ مَنَاقِلِ مَجْرَاهُمَا، وَ قَدَّرَ مَسِيْرَهُمَا فِيْ مَدَارِجِ دَرَجِهِمَا، لِيُمَيِّزَ بَيْنَ

[اسی خطبہ کا ایک حصّہ آسمان کے بیان میں]

اور آسمان کی کشادہ اور فراخ مقامات کو بغیر کسی رشتہ کے پیوست کر دیا اور اس کی کشادگی کے ٹکڑوں (طبقات مختلفہ) کو باہم چسپاں کر دیا اور اس میں اور اس کے جوڑوں میں وصل پیدا کر دیا۔ اور ان فرشتوں کے لیے جو اس کے حکم کے ساتھ نیچے اُترتے اور اعمال مخلوقات کے ساتھ اوپر جاتے ہیں اس کے چڑھنے کی سختی کو آسان اور نرم کر دیا اور اس کے بعد کہ وہ (آسمان) صرف دھواں تھا اسے ندا دی تو (فوراً) اس کے فراخ مقامات کے شگاف جڑ گئے اور اس کے بعد کے اس کے بستہ دروازے بند تھے ان کو کھول دیا اور اس کے رخنوں پر نگہبانی کے لیے شہاب کے دہکتے انگارے (روشن ستارے) مقرر کیے اور بذریعہ اپنی قوت کے اس کو ہوا کے شگاف میں چکر کھانے سے روکا اور اسے حکم دیا کہ اس کا فرمانبردار ہو کر قائم رہے۔[1] اور اس کے آفتاب کو اس کے دن کے لیے روشنی دینے والی اور اس کے ماہتاب کو اس کی رات کی ماند نشانی بنائی۔ پھر ان دونوں کو ان کی راہ کی منزلوں میں متحرک اور ان دونوں کی مقدار حرکت کو ان کے درجات کے مدارج میں معین کر دیا[2] تا کہ ان

---

[1] اس خطبہ میں آسمان کے متعلق حضرتؑ نے جو کچھ ارشاد فرمایا اس کی مفصل شرح میں طول ہوگا (لہٰذا انشاءاللہ ضمیمہ میں لکھی جائیں گی)

[2] سات سیر کرنے والے ستارے ہیں جن کو سبعہ سیارہ کہتے ہیں شمس، قمر، زہرہ، مشتری، مریخ، زحل، عطارد۔ ان کا ہر ایک ایک آسمان میں ہے اور آٹھویں آسمان کے خریزے کی قاشوں ایسے بارہ ٹکڑے ہیں جن کو بروج کہتے ہیں ان سے ہر ایک میں آفتاب ایک مہینہ اور چاند دو روز آٹھ گھنٹے رہتا ہے اور ہر مہینہ کی ۲۸ منزلیں ہیں اور چاند ہر منزل میں ایک روز رہتا ہے اور اٹھائیس روز میں سب منزلیں طے کر جاتا ہے اور بارھوں بروج ۳۶۰ درجوں میں منقسم ہیں ان سے ہر برج کے لیے ۳۰ درجے ہیں کہ ہر سال میں ایک مرتبہ آفتاب ان کو قطع کرتا ہے اور اس طرح اس کا دورہ فلکی سال بھر میں تمام ہو جاتا ہے اور ماہتاب ۲۸ روز میں ان کو طے کرتا ہے (ان سب کی تفصیل انشاءاللہ ضمیمہ میں آئے گی)

(بقیہ صفحہ مابعد)

اللَّيْلِ وَ النَّهَارِ بِهِمَا، وَ لِيُعْلَمَ عَدَدُ السِّنِيْنَ وَ الْحِسَابُ بِمَقَادِيْرِهِمَا.

ثُمَّ عَلَّقَ فِيْ جَوِّهَا فَلَكَهَا، وَ نَاطَ بِهَا زِيْنَتَهَا، مِنْ خَفِيَّاتِ دَرَارِيِّهَا وَ مَصَابِيْحِ كَوَاكِبِهَا، وَ رَمٰى مُسْتَرِقِ السَّمْعِ بِثَوَاقِبِ شُهُبِهَا، وَ اَجْرَاهَا عَلٰى اِذْلَالِ تَسْخِيْرِهَا مِنْ

دونوں سے رات اور دن میں تمیز پیدا کر دے اور ان کی مقداروں سے برسوں کی گنتی اور حساب معلوم ہو سکے۔

پھر اس کی فضا میں فلک (مدار آسمان) کو معلق کیا اور اس کے ان چمکتے ستاروں سے جو (دن کو) پوشیدہ ہو جاتے ہیں اور ستاروں کے چراغوں سے اس کی زینت کو اس کے ساتھ مربوط کیا اور چوری چھپے وہاں کی باتوں پر کان لگانے والے (شیطانوں) کو شہاب کے دہکتے شعلوں کا تیر مارا[1] اور ان کو اپنی صورت اور راہ پر مسخر رہنے یعنی ثوابت

(بقیہ صفحہ ماقبل) حضرتؑ نے آفتاب و ماہتاب کے متعلق جو ارشاد فرمایا اس کی طرف قرآن مجید میں بھی اشارہ ہے پارہ ۱۱ سورہ یونس آیہ ۶ میں ہے:

﴿هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا وَّ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَ الْحِسَابَ﴾

وہی ہے جس نے آفتاب کو چمکدار اور ماہتاب کو روشن بنایا اور اس کی منزلیں مقرر کیں تاکہ تم لوگ برسوں کی گنتی اور حساب معلوم کرو۔

اور پارہ ۳ سورہ یٰس آیہ ۳۸ میں ہے فرمایا:

﴿وَ الشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا﴾

اور آفتاب اپنے ایک ٹھکانے میں چل رہا ہے۔

﴿وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا وَّ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ﴾

اور ہم نے چاند کے لیے منزلیں مقرر کر دیں ہیں۔

[1] جیسے قرآن مجید پارہ ۲۹ سورہ جن آیہ ۹ میں فرمایا:

﴿وَّ اَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِیْدًا وَّ شُهُبًا﴾ ﴿وَّ اَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ؕ فَمَنْ یَّسْتَمِعِ الْاٰنَ یَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا﴾

ہم نے آسمان کو ٹٹولا تو اس کو بھی بہت قوی نگہبانوں اور شعلوں سے بھرا پایا اور پہلے وہاں بہت سے مقامات میں باتیں سننے کے لیے بیٹھا کرتے تھے مگر اب کوئی سننا چاہے تو اپنے لیے شعلہ تیار پائے گا۔

اور پارہ ۲۳ سورۂ صافات آیہ ۱۰ میں ہے:

﴿اِنَّا زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِزِیْنَةِ ۨ الْكَوَاكِبِ ۝۶ وَ حِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَیْطٰنٍ مَّارِدٍ ۝۷ وَ حِفْظًا مِّنْ كُلِّ

(بقیہ صفحہ آئندہ)

ثَبَاتِ ثَابِتِهَا، وَ مَسِيْرِ سَآئِرِهَا، وَ هُبُوْطِهَا وَ صُعُوْدِهَا، وَ نُحُوْسِهَا وَ سُعُوْدِهَا.

[وَ مِنْهَا: فِيْ صِفَةِ الْمَلٰٓئِكَةِ]

ستاروں کے ثابت رہنے اور سیاروں کے سیر کرنے اور ان کے ہبوط اور صعود (اتار چڑھاؤ) اور نحس وسعد ہونے پر ان کو جاری کر دیا۔ ۱؎

[اسی خطبہ کا کچھ حصّہ فرشتوں کے بیان میں] ۲؎

تفسیر نمونہ: شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ ۝ لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى وَ يُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ۝ دُحُوْرًا وَّ لَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ ۝ اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ۝

ہم نے نیچے والے آسمان کو تاروں کی آرائش (جگمگاہٹ) سے آراستہ کیا اور ہر سرکش شیطان سے حفاظت کے واسطے۔ کہ اب شیطان عالم بالا کی طرف کان بھی نہیں لگا سکتے اور جہاں سن لینا چاہا تو ہر طرف سے کھدیرنے کے لیے شہاب پھینکے جاتے ہیں اور ان کے لیے پائیدار عذاب ہے مگر جو کوئی شیطان بات اچک لے بھاگتا ہے تو آگ کا دہکتا ہوا تیر اس کا پیچھا کرتا ہے۔

۱؎ ثوابت سے مراد وہ ستارے ہیں جو آٹھویں فلک میں ثابت رہتے ہیں اور سیاروں سے سات سیر کرنے والے ستارے مراد ہیں جو حاشیہ صفحہ ۲۷۹ میں ذکر کیے گئے۔ اور ہبوط وصعود سے ستاروں خصوصاً آفتاب و ماہتاب کا اُترنا چڑھنا مراد ہے کل سیارے ستارے جب تک قوۃ شرف کی طرف متوجہ رہتے ہیں اس وقت تک زیادہ ہوتے اور صعود کرتے رہتے ہیں اور جب اس سے گزر جاتے ہیں تو کم ہونے اور اترنے لگتے ہیں۔ اور ستاروں کے سعد ونحس ہونے سے عالم کی بھلائی اور برائی کا بھی کچھ تعلق ہے۔ (ان سب کی تفصیل ان شاء اللہ تعالیٰ ضمیمہ میں آئے گی)

۲؎ اس کلام مبارک کی شرح میں علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں:

''یہ وہ مقام ہے جہاں عرب کے مشہور مثل ''اِذَا جَاءَ نَهَرُ اللّٰهِ بَطَلَ نَهَرُ الْمَعْقِلِ'' ''جب خدا کا دریا پہنچا تو معقل کی نہر بیکار ہو گئی'' صادق آتی ہے۔ یعنی حضرت امیر المومنینؑ کا یہ کلام ربانی اور بیان مقدس آیا تو تمام فصحاء وبلغاء عرب کی فصاحت وبلاغت اس کے مقابلہ میں ہیچ اور بے کار ہو کر رہ گئی اور عرب کے بڑے سے بڑے فصیح شخص کے کلام کو بھی حضرت علیؑ کے کلام سے وہی نسبت معلوم ہوتی ہے جو مٹی کو خالص سونے سے ہے کہ جس طرح خالص سونے کے مقابلہ میں مٹی بے قیمت چیز ہے۔ اسی طرح حضرت امیر المومنینؑ کے اس کلام کے مقابلہ میں تمام فصحائے عرب کا کلام حقیر وذلیل اور بے وزن محض ہے۔ اور اگر ہم (بفرض محال) تسلیم بھی کر لیں کہ فصحائے عرب کو قدرت تھی کہ جیسے الفاظ حضرت امیر المومنینؑ نے اس خطبہ میں استعمال فرمائے ہیں ویسے ہی فصیح مناسب یا اس سے لگ بھگ الفاظ کی فصیح عبارت وہ بھی بیان کر سکتے تھے تو ان کو یہ مادہ اور معنویت کیوں کر حاصل ہوتی جو ان الفاظ میں جواہر کے خزانوں کی طرح بھری ہوئی ہے اور جن کی چمک دمک ان الفاظ سے جھلک رہی ہے۔

اور زمانہ جاہلیت کے فصحائے عرب بلکہ عہد اسلام کے علمائے اعلام اور حضرت رسول خداؐ کے وہ صحابہ کرام بھی جو حضرت امیر المومنینؑ کے ہم عصر تھے ان آسمانی علوم دقیقہ اور فلکی وہیئتی مسائل غامضہ اور معانی مشکلہ کو کہاں سے لاتے جن سے (بقیہ صفحہ مابعد)

(بقیہ صفحہ ماقبل) وہ ان مطالب ومعانی کو ایسے الفاظ میں ادا کرنے کی کوشش کرتے، ان علوم وفنون اور مباحث ومعانی کا جاننا تو درکنار رہا ان بیچاروں کے تو سمجھ میں بھی یہ مسائل نہ آتے، اس لیے کہ زمانۂ جاہلیت کے علماء کی حالت تو یہ رہی کہ ان کی فصاحت و بلاغت اور عقلی وذہنی قوت کا کمال جو کچھ ظاہر ہوا وہ اونٹ، گھوڑے، گدھے، وحشی جانوروں، بیلوں کے بیان میں یا ان کی میگنیوں اور فضلوں کے ذکر میں یا پہاڑوں، ٹیلوں، چٹیل میدانوں اور اسی قسم کی دوسری پیش نظر چیزوں کے اوصاف اور حالات میں۔

رہے صحابہ کرام تو ان سے بھی جو حضرات فصیح اور بلیغ سمجھے اور بیان کیے جاتے ہیں ان کی منتہائے فصاحت چند کلمہ ہوگی جو دو سطروں سے بھی آگے نہیں بڑھ سکتی جو خواہ موعظہ ہوگا جس میں موت یا دنیا کی مذمت کا ذکر ہوگا یا وہ کلام کسی جنگ وجدال کے متعلق ہوگا یا ترغیب وترہیب کے بارے میں اور کوئی ایسا کلام جو فرشتوں کے متعلق ان کی صفت، صورت، عبادت، تسبیح، خالق کی معرفت، خدا کی محبت وعشق اور ایسے ہی دوسرے حالات جو حضرت امیر المومنینؑ کے اس طولانی اور مفصل کلام میں ہیں تو ان صحابہ کے خواب و خیال میں بھی نہیں گزرے بلکہ ان کے فرشتوں کا بھی گزر ان مضامین عالیہ تک نہیں ہوا۔ ہاں قرآن مجید میں فرشتوں کا ذکر سننے کے بعد ان لوگوں کی زبان سے بعض جملے فرشتوں کے متعلق بھی نکلے ہیں مگر بالکل پھسپھسے جن میں نہ اس قسم کی کوئی تقسیم ہے اور نہ اس مرتبہ کی کوئی ترتیب۔

رہے وہ چند لوگ جن کو کچھ ایسے معانی اور مطالب حاصل تھے مثل عبداللہ بن سلام اور امیہ بن ابی الصلت وغیرہم کے، تو ان کو اس فصاحت کی عبارت میسر نہیں تھی، نہ اس طرز کے ادا کرنے پر ان کو قدرت تھی۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ یہ امور دقیقہ اور مطالب عالیہ جو اس خطبہ اشباح میں مذکور ہیں محض حضرت علیؑ ہی کے لیے مخصوص اور آپ ہی کا حصہ ہیں کسی دوسرے کو حاصل ہی نہیں ہوئے۔ اور میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس کلام کو جو عاقل غور کر کے پڑھے گا اس کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے اس کا دل دھڑکنے لگے گا اور خدا اعظم کی عظمت اور جبروت کے تصور سے اس کا دل بلکہ ظاہری جلد تک سہم جائے گی اور ہر انسان اس کے خیال سے بدحواس ہو جائے گا اور خدا کی طرف جھومتا ہوا بڑھے گا اور اس پر وجد کی حالت طاری ہو جائے گی اور عجیب نہیں کہ وہ اس کے شوق میں اپنے آپے سے گزر جائے اور عشق الٰہی میں قفص عنصری سے اس کا طائر روح ہی پرواز کر جائے''۔

علامہ ابن ابی الحدید کا یہ کلام بہت طولانی ہے میں نے بقدر ضرورت لے لیا۔ اور علامہ فخر الدین رازی اپنی تفسیر کبیر جلد اول صفحہ ۳۸۱ میں لکھتے ہیں:

وَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَيْسَ بَعْدَ كَلَامِ اللّٰهِ وَكَلَامِ رَسُوْلِهٖ كَلَامٌ فِيْ وَصْفِ الْمَلَائِكَةِ اَعْلٰى وَاَجَلَّ مِنْ كَلَامِ اَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ۔

یعنی جان رکھ کہ ملائکہ کے بیان میں خدا اور رسولؐ کے کلام کے بعد امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کلام دنیا بھر میں سب سے اعلیٰ اور اجل ہے۔

علامہ رازی نے اس قدر لکھ کر فرشتوں کے متعلق اسی نہج البلاغہ سے حضرتؑ کا ایک خطبہ بھی نقل کیا ہے تا کہ اپنے دعویٰ کا ایک شاہد پیش کر دیں۔ (جدید مذاق کے مطابق فرشتوں پر ایک مفصل نوٹ انشاء اللہ ضمیمہ میں لکھا جائے گا)

ثُمَّ خَلَقَ سُبْحَانَهٗ لِاِسْكَانِ سَمٰوٰتِهٖ، وَ عِمَارَةِ الصَّفِيْحِ الْاَعْلٰى مِنْ مَّلَكُوْتِهٖ، خَلْقًا بَدِيْعًا مِّنْ مَّلٰٓئِكَتِهٖ، وَ مَلَاَ بِهِمْ فُرُوْجَ فِجَاجِهَا، وَ حَشَا بِهِمْ فُتُوْقَ اَجْوَآئِهَا، وَ بَيْنَ فَجَوَاتِ تِلْكَ الْفُرُوْجِ زَجَلُ الْمُسَبِّحِيْنَ مِنْهُمْ فِيْ حَظَآئِرِ الْقُدْسِ، وَ سُتُرَاتِ الْحُجُبِ، وَ سُرَادِقَاتِ الْمَجْدِ، وَ وَرَآءَ ذٰلِكَ الرَّجِيْجِ الَّذِيْ تَسْتَكُّ مِنْهُ الْاَسْمَاعُ سُبُحَاتُ نُوْرٍ تَرْدَعُ الْاَبْصَارَ عَنْ بُلُوْغِهَا، فَتَقِفُ خَاسِئَةً عَلٰى حُدُوْدِهَا.

پھر خدائے سبحانہ نے اپنے آسمانوں کے بسانے اور اپنی حکومت کے سب سے اونچے طبقہ کو آباد کرنے کے لیے اپنے فرشتوں کی ایک عجیب وغریب مخلوق پیدا کی جن سے ان (آسمانوں) کی فراخ راہوں کے شگاف بھر دیے اور ان سے ان (آسمانوں) کی فضاؤں کی کشادگیوں کو پُر کر دیا اور ان شگافوں کی وسیع وفراخ راہوں کے درمیان ان (فرشتوں) سے تسبیح کرنے والوں کی بہت بلند آواز پاکیزہ حیظروں[1] (کی فضا) اور پردہ ہائے حجاب (کی آڑوں) اور بزرگی کی قناتوں میں گونجتی رہتی ہے اور اس گہڑ گہڑاہٹ کے پیچھے جس سے کان پھٹے پڑتے ہیں نور (خدا) کی وہ چمک دمک اور شعائیں ہیں جو نظروں کو (خیرہ کرتی اور) وہاں تک پہنچنے سے باز رکھتی ہیں تو وہ کھسیانی ہو کر اپنی حدوں پر ٹھہر جاتی ہیں۔[2]

اَنْشَاَهُمْ عَلٰى صُوَرٍ مُّخْتَلِفَاتٍ، وَ اَقْدَارٍ مُّتَفَاوِتَاتٍ، ﴿اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ﴾ تُسَبِّحُ جَلَالَ

(خدا نے) ان کو مختلف صورتوں اور جدا جدا اندازوں پر کئی پروں والا (بنا کر) پیدا کیا ہے[3] یہ اس کی جلالت

---

[1] ''حَظَآئِرِ الْقُدْسِ''۔ وہ لفظ ہے جو حضرت رسول خداؐ کے کلام میں بھی وارد ہوا ہے یہ جمع ہے حظیرۃ کی اور اصل میں حظیرۃ اس احاطہ کو کہتے ہیں جس میں بکریوں کا مندہ اونٹ وغیرہ جانوران کو ہوا اور سردی سے بچانے کے لیے رکھے جاتے ہیں۔ اس لفظ سے اکثر بہشت مراد ہوتی ہے۔ یہاں حضرتؑ نے ان مقامات شریفہ مقدسہ عالیہ کو جو فلک کے اوپر ہیں ان کی پاکیزگی اور عظمت وجلالت کے اعتبار سے حَظَآئِرِ الْقُدْسِ کہا ہے۔

[2] قرآن مجید پارہ ۲۹ سورہ ملک آیہ ۴ میں ہے:

﴿ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّ هُوَ حَسِيْرٌ﴾

پھر بار بار نظر کر تیری نظر کھسیانی ہو کر تھکی ماری تیری طرف الٹی لوٹ آئے گی۔

[3] فرشتوں کا پروں والا ہونا قرآن مجید سے بھی ثابت ہے۔ پارہ ۲۲ سورۂ فاطر آیہ ۱ میں ہے:

﴿جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ﴾

اسی نے فرشتوں کو اپنا قاصد بنایا جن کے دو دو اور تین تین اور چار چار پر ہیں۔

عِزَّتِهٖ، لَا يَنْتَحِلُوْنَ مَا ظَهَرَ فِي الْخَلْقِ مِنْ صُنْعِهٖ، وَ لَا يَدَّعُوْنَ اَنَّهُمْ يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا مَّعَهٗ مِمَّا انْفَرَدَ بِهٖ، ﴿بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ۔ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَ هُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ﴾.

عزت کی تسبیح کرتے رہتے ہیں۔مخلوق میں اس (خدا) کی صنعت کا جو (کمال) ظاہر ہوتا ہے اس کو یہ اپنی طرف نسبت نہیں دیتے ہیں اور نہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اس کے ساتھ کسی چیز کو جس (کے خلق) میں وہ منفرد ہے یہ بھی پیدا کرتے ہیں۔ بلکہ (یہ خدا کے) معزز بندے ہیں اس کے آگے بڑھ کر بات تک نہیں کرتے اور یہ سب اس کے حکم پر کاربند رہتے ہیں۔[1]

جَعَلَهُمْ فِيْمَا هُنَالِكَ اَهْلَ الْاَمَانَةِ عَلٰى وَحْيِهٖ، وَ حَمَّلَهُمْ اِلَى الْمُرْسَلِيْنَ وَ دَآئِعَ اَمْرِهٖ وَ نَهْيِهٖ، وَ عَصَمَهُمْ مِنْ رَّيْبِ الشُّبُهَاتِ، فَمَا مِنْهُمْ زَآئِغٌ عَنْ سَبِيْلِ مَرْضَاتِهٖ، وَ اَمَدَّهُمْ بِفَوَآئِدِ الْمَعُوْنَةِ، وَ اَشْعَرَ قُلُوْبَهُمْ تَوَاضُعَ اِخْبَاتِ السَّكِيْنَةِ، وَ فَتَحَ لَهُمْ اَبْوَابًا ذُلُلًا اِلٰى تَمَاجِيْدِهٖ، وَ نَصَبَ لَهُمْ مَنَارًا وَّاضِحَةً عَلٰٓى اَعْلَامِ تَوْحِيْدِهٖ،

خدا نے انہیں ان (امور) میں جو وہاں (پیش رہتے) ہیں اپنی وحی پر صاحب امانت مقرر کیا ہے اور پیغمبروں کی طرف اپنے امر و نہی (احکام) کی ودیعتیں انہی سے روانہ کرتا رہا ہے اور شبہوں کے شک (عیب) سے انہیں محفوظ رکھا ہے۔تو ان میں سے کوئی بھی اس (خدا) کی خوشنودیوں کی راہ سے منحرف نہیں ہے اور (خدا) معونت کے فائدوں سے ان کی مدد کرتا رہا ہے اور ان کے دلوں کو قرار و آرام کے خشوع و تواضع کا خوگر کر دیا ہے اور اپنی تمجید و تکریم کے انواع و اقسام کی طرف ان کے لیے سہل دروازے کھول دیے ہیں اور اپنی توحید کے جھنڈوں پر ان کے لیے واضح علامتیں قائم کر دی ہیں۔

لَمْ تُثْقِلْهُمْ مُوْصِرَاتُ الْاٰثَامِ، وَ لَمْ

معصیتوں کے بڑھانے والے اسباب نے انہیں

---

[1] قرآن مجید پارہ ۱۷ سورۂ انبیاء آیہ ۲۷ میں ہے:

﴿بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَ هُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ﴾

بلکہ یہ فرشتے خدا کے معزز بندے ہیں اس کے آگے بڑھ کر بات نہیں کر سکتے اور وہ اسی کے حکم پر کاربند رہتے ہیں۔

حضرت رسول خداؐ سے مروی ہے کہ شب معراج میں آپؐ نے دیکھا کہ خدا کے ڈر سے حضرت جبرئیلؑ چپکے یا پرانی کملی کی طرح پڑے ہوئے ہیں۔

تَرْتَحِلُهُمْ عُقَبُ اللَّيَالِيْ وَ الْاَيَّامِ، وَ لَمْ تَرْمِ الشُّكُوْكُ بِنَوَازِعِهَا عَزِيْمَةَ اِيْمَانِهِمْ، وَ لَمْ تَعْتَرِكِ الظُّنُوْنُ عَلٰى مَعَاقِدِ يَقِيْنِهِمْ، وَ لَا قَدَحَتْ قَادِحَةُ الْاِحَنِ فِيْمَا بَيْنَهُمْ، وَ لَا سَلَبَتْهُمُ الْحَيْرَةُ مَا لَاقَ مِنْ مَّعْرِفَتِهٖ بِضَمَآئِرِهِمْ، وَ مَا سَكَنَ مِنْ عَظَمَتِهٖ وَ هَيْبَةِ جَلَالَتِهٖ فِيْ اَثْنَآءِ صُدُوْرِهِمْ، وَ لَمْ تَطْمَعْ فِيْهِمُ الْوَسَاوِسُ فَتَقْتَرِعَ بِرَيْنِهَا عَلٰى فِكْرِهِمْ.

(گناہوں سے) گرانبار نہیں کیا اور یکے بعد دیگرے آنے والی راتوں اور دنوں نے [1] ان کو ایک حال سے دوسرے کی طرف نہیں پلٹایا۔ اور شکوک اپنی لڑانے والی تحریکوں کے ساتھ ان کے پختہ ایمان سے جھگڑا نہیں کر سکے اور (وہم و) گمان کی باتیں ان کے مضبوط یقین کو رگڑ نہیں سکیں اور کینوں کا چقماق ان کے درمیان (بغض و عداوت کی) آگ روشن نہیں کر سکا اور ان کے دلوں کو معرفت کی جو کیفیت حاصل ہے اور ان کے سینوں کے درمیان اس کی عظمت و ہیبت جلالت کی جو حالت جاگزین ہوگئی ہے اس کو حیرت ان سے سلب نہیں کر سکی اور (شیطانی) وسوسوں کو ان میں کوئی طمع نہیں پیدا ہو سکی تا کہ وہ اپنے زنگ سے ان کی فکروں کو ٹھوک (پریشان کر) سکیں۔ [2]

مِنْهُمْ مَنْ هُوَ فِيْ خَلْقِ الْغَمَامِ الدُّلَّحِ، وَ فِيْ عِظَمِ الْجِبَالِ الشُّمَّخِ، وَ فِيْ قَتْرَةِ الظَّلَامِ الْاَيْهَمِ، وَ مِنْهُمْ مَنْ قَدْ خَرَقَتْ اَقْدَامُهُمْ تُخُوْمَ الْاَرْضِ السُّفْلٰى، فَهِيَ كَرَايَاتٍ بِيْضٍ قَدْ نَفَذَتْ فِيْ مَخَارِقِ الْهَوَآءِ، وَ تَحْتَهَا رِيْحٌ هَفَّافَةٌ تَحْبِسُهَا عَلٰى حَيْثُ انْتَهَتْ مِنَ

اور ان (فرشتوں) سے بعض وہ ہیں جو بڑے پانی والے ابر کی پیدائش اور اونچے پہاڑوں کی بڑائی اور تاریکی و اندھیری کے غبار میں (مشغول) رہتے ہیں اور ان سے بعض وہ ہیں جن کے قدم سب سے نیچی زمین کی سرحدوں میں گڑے ہوئے ہیں تو یہ سفید جھنڈوں ایسے ہیں جو ہوا کی شگافوں (کے مقامات) میں نفوذ کیے ہوئے ہیں اور ان کے نیچے عمدہ ساکن ہوا ہے جس کو یہ (علم) اس جگہ روکے رہتے ہیں۔ جہاں وہ (اپنی) متناہی حدود کے اعتبار سے ختم

---

[1] ''لَمْ تَرْتَحِلُهُمْ عُقَبُ اللَّيَالِيْ''۔ یعنی جس طرح اونٹ کی پشت پر انسان کے سوار ہونے اور سفر کرنے سے نشان پڑ جاتا ہے اس طرح پے در پے رات اور دن کے آنے جانے سے ان فرشتوں پر کوئی تغیر یا اثر نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ ایک ہی حالت میں رہتے ہیں۔

[2] قرآن مجید پارہ ۳۰ سورۂ المطففین آیہ ۱۴ میں ہے:

﴿كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾

نہیں بلکہ بات یہ ہے کہ ان کے دلوں پر انہی کے اعمال بد کے زنگ بیٹھ گئے ہیں۔

الْحُدُوْدِ الْمُتَنَاهِيَةِ.

قَدِ اسْتَفْرَغَتْهُمْ اَشْغَالُ عِبَادَتِهٖ، وَ وَصَلَتْ حَقَآئِقُ الْاِيْمَانِ بَيْنَهُمْ وَ بَيْنَ مَعْرِفَتِهٖ، وَ قَطَعَهُمُ الْاِيْقَانُ بِهٖٓ اِلَى الْوَلَهِ اِلَيْهِ، وَ لَمْ تُجَاوِزْ رَغَبَاتُهُمْ مَا عِنْدَهٗ اِلٰى مَا عِنْدَ غَيْرِهٖ.

قَدْ ذَاقُوْا حَلَاوَةَ مَعْرِفَتِهٖ، وَ شَرِبُوْا بِالْكَاْسِ الرَّوِيَّةِ مِنْ مَّحَبَّتِهٖ، وَ تَمَكَّنَتْ مِنْ سُوَيْدَآءِ قُلُوْبِهِمْ وَ شِيْجَةُ خِيْفَتِهٖ، فَحَنَوْا بِطُوْلِ الطَّاعَةِ اعْتِدَالَ ظُهُوْرِهِمْ، وَ لَمْ يُنْفِدْ طُوْلُ الرَّغْبَةِ اِلَيْهِ مَادَّةَ تَضَرُّعِهِمْ، وَ لَآ اَطْلَقَ عَنْهُمْ عَظِيْمُ الزُّلْفَةِ رِبَقَ خُشُوْعِهِمْ.

وَ لَمْ يَتَوَلَّهُمُ الْاِعْجَابُ فَيَسْتَكْثِرُوْا مَا سَلَفَ مِنْهُمْ، وَ لَا تَرَكَتْ لَهُمُ اسْتِكَانَةُ

ہوتی ہے (یہی فرشتہ حاملانِ عرش ہیں)۔[1]

اس (خدا) کی عبادت کے شغلوں نے ان کو (دوسرے کاموں سے) فارغ کر رکھا ہے اور حقائق ایمان نے ان کے اور خدا کی معرفت کے درمیان وصل پیدا کر دیا ہے اور اس کے یقین نے ان کو اس کی طرف والہ وشیدا ہونے سے باز رکھا ہے اور ان کی رغبتیں ان چیزوں سے پھیر کر جو اس کے پاس ہیں ان چیزوں کی طرف مائل نہیں کرتی ہیں جو دوسروں کے پاس ہیں۔

یہ اس (خدا) کی معرفت کی شیرینی اور اس کے محبت کا سیراب کرنے والا ساغر پیے ہوئے ہیں اور ان کے دل کے بیچا بیچ خوفِ خدا کے ریشہ نے جڑ پکڑ لیا ہے[2] لہٰذا انہوں نے (اپنی) طویل اطاعت سے اپنی پشتوں کا اعتدال جھکا دیا اور اس کی طرف شدید رغبت نے ان کے تضرع وزاری کا مادہ ختم نہیں کیا اور بڑھے ہوئے تقرب نے حلقۂ خشوع وخضوع کو ان (کی گردنوں) سے علیحدہ نہیں کیا ہے۔

اور خود پسندی ان پر حاوی نہیں ہوئی ہے جس سے یہ (اپنے گزشتہ اعمال) کو زیادہ سمجھیں اور ان کی فروتنی نے

---

[1] یعنی گویا ان کے وہ قدم جو ہوا میں نچلی زمین تک گڑے ہوئے ہیں سیف بیرق ہیں جن کے نیچے ساکن ہوا ہے جو ذرہ برابر بھی ہلتی ڈولتی نہیں ہے جس سے یہ بیرق بھی حرکت کرنے لگیں بلکہ وہ ہوا بالکل ساکن اور ان فرشتوں کے قدموں کو وہاں روکے ہوئے ہے جہاں وہ پہنچے ہیں۔

علامہ ابن عبدالحدید لکھتے ہیں کہ حدیث میں وارد ہوا ہے کہ اسرافیل فرشتہ کے دو بازو ہیں، ایک پورب کی آخری حد پر اور دوسرا پچھّم کی آخری حد پر اور عرش ان کے کاندھے پر ہے۔

[2] ''وَشِيْجَةٌ''، دراصل درخت کے نرم ریشہ کو کہتے ہیں اور یہاں اس لفظ کو بطور استعارہ خوف خدا کے دل میں پیوست ہو جانے اور اس کے اسباب وذرائع ووجوہ کے لیے استعمال فرمایا ہے اور خوف میں مبالغہ کرنے کے لیے بھی اس لفظ کو بطور استعارہ استعمال کرتے ہیں۔

الْاِجْلَالِ نَصِيْبًا فِيْ تَعْظِيْمِ حَسَنَاتِهِمْ، وَ لَمْ تَجْرِ الْفَتَرَاتُ فِيْهِمْ عَلٰى طُوْلِ دُؤُبِهِمْ، وَ لَمْ تَغِضْ رَغَبَاتُهُمْ فَيُخَالِفُوْا عَنْ رَّجَآءِ رَبِّهِمْ، وَ لَمْ تَجِفَّ لِطُوْلِ الْمُنَاجَاةِ اَسَلَاتُ اَلْسِنَتِهِمْ، وَ لَا مَلَكَتْهُمُ الْاَشْغَالُ فَتَنْقَطِعَ بِهَمْسِ الْجُؤَارِ اِلَيْهِ اَصْوَاتُهُمْ، وَ لَمْ تَخْتَلِفْ فِيْ مَقَاوِمِ الطَّاعَةِ مَنَاكِبُهُمْ، وَ لَمْ يَثْنُوْا اِلٰى رَاحَةِ التَّقْصِيْرِ فِيْ اَمْرِهٖ رِقَابَهُمْ، وَ لَا تَعْدُوْ عَلٰى عَزِيْمَةِ جِدِّهِمْ بَلَادَةُ الْغَفَلَاتِ، وَ لَا تَنْتَضِلُ فِيْ هِمَمِهِمْ خَدَآئِعُ الشَّهَوَاتِ.

جواس کی جلالت (وعظمت) سے ہے ان میں اپنے اعمال حسنہ کو بڑا سمجھنے کا کوئی حصہ ہی نہیں چھوڑا ہے اور باوجود ان کی طویل عبادت واطاعت کے ان میں سُستی وکاہلی کا عمل دخل نہیں ہوا اور نہ ان کے شوق کم ہوئے ہیں تا کہ وہ اپنے پروردگار کی امید سے مخالفت کریں اور طویل مناجاتوں سے ان کی زبانوں کے کنارے سوکھ نہیں گئے ہیں اور (دوسرے) شغلوں نے ان پر قبضہ نہیں کیا ہے تا کہ اس کی درگاہ میں آہستہ آہستہ فریاد کرنے سے ان کی آوازیں رُک جائیں اور اطاعت (وفرمانبرداری) کی صفوں میں ان کے شانے مختلف نہیں ہوئے اور اس کے حکم کی (بجا آوری) میں تقصیر وکوتاہی کا آرام حاصل کرنے کے لیے انہوں نے اپنی گردنیں نہیں موڑیں اور ان کی مستقل جدوجہد پر غفلتوں کی غباوت حملہ نہیں کرتی اور ان کی ہمتوں میں شہوتوں کے مکر وفریب تیر بارانی نہیں کرتے۔

قَدِ اتَّخَذُوْا ذَا الْعَرْشِ ذَخِيْرَةً لِّيَوْمِ فَاقَتِهِمْ، وَ يَمَّمُوْهُ عِنْدَ انْقِطَاعِ الْخَلْقِ اِلٰى

انہوں نے اپنے روز احتیاج کے لیے مالک عرش (خدا) ہی کو (اپنا) ذخیرہ قرار دے لیا ہے [1] اور خلقت کے مخلوقین کی طرف منقطع ہوتے وقت ان (فرشتوں) نے

---

[1] مالک عرش سے مراد خود خداوند عالم اس کا خالق ہے جیسا قرآن مجید پارہ ۱۵ سورہ بنی اسرائیل آیہ ۴۲ میں ہے:

﴿اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِى الْعَرْشِ سَبِيْلًا﴾

یعنی اس صورت میں ان لوگوں نے مالک عرش تک پہنچنے کا کوئی راستہ ڈھونڈ نکالا ہوتا۔

اور پارہ ۳۰ سورہ بروج آیہ ۱۵ میں ہے:

﴿ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ﴾

یعنی عرش کا مالک بڑا عالی شان ہے وہی کرتا ہے جو وہ خود چاہتا ہے۔

الْمَخْلُوْقِيْنَ بِرَغْبَتِهِمْ، لَا يَقْطَعُوْنَ اَمَدَ غَايَةِ عِبَادَتِهٖ، وَ لَا يَرْجِعُ بِهِمُ الْاِسْتِهْتَارُ بِلُزُوْمِ طَاعَتِهٖ، اِلَّآ اِلٰى مَوَادَّ مِنْ قُلُوْبِهِمْ غَيْرِ مُنْقَطِعَةٍ مِّنْ رَّجَآئِهٖ وَ مَخَافَتِهٖ، لَمْ تَنْقَطِعْ اَسْبَابُ الشَّفَقَةِ مِنْهُمْ، فَيَنُوْا فِيْ جِدِّهِمْ، وَ لَمْ تَأْسِرْهُمُ الْاَطْمَاعُ فَيُؤْثِرُوْا وَشِيْكَ السَّعْيِ

اپنی رغبت سے اسی کا قصد کیا ہے[1] وہ اس کی غایت عبادت کی مدت کو ختم نہیں کرنا چاہتے اور اس کی طاعت کی پابندی کی خواہش وحرص[2] ان کو کچھ مائل بھی کرتی ہے تو ان کے دلوں میں خوف و امید کے ان ہی مادوں کی طرف جو کبھی تمام نہیں ہو سکتے۔[3] ان سے خوفِ (خدا) کے اسباب ختم نہیں ہوئے جس سے وہ اپنی جدوجہد میں سُستی کریں[4] اور لالچوں نے انہیں اسیر نہیں کیا ہے تا کہ وہ

---

[1] ''وَ يَمَّمُوْا'' کا معنی قصد کیا۔ یعنی جب دنیا کی دوسری مخلوق (جو فرشتوں کے سوا ہے) مخلوقوں کی طرف منقطع ہو جاتی اور ان سے لو لگاتی ہے اس وقت یہ فرشتے اپنی رغبت اور شوق سے خداوند عالم کا قصد کرتے ہیں۔ غرض ہر حالت میں ان کی توجہ، ان کی رجوع خدا ہی کی طرف ہوتی ہے اور کسی وقت بھی وہ اس سے منہ موڑ کر دوسروں کی طرف رخ نہیں کرتے۔

[2] ''اِسْتِهْتَارٌ'' معنی اپنی خواہش پر چلنا۔ کسی کام کے پرواہ نہ کرنا۔

[3] یعنی یہ فرشتے خداوند عالم کی اطاعت وعبادت بجالاتے رہنے اور اس کی پابندی کرنے کے جو خواہاں رہتے ہیں تو ان کی یہ حالت ان کو خدا کی امید وبیم سے پلٹاتی نہیں ہے بلکہ ان کے دلوں میں خدا سے امید اور خوف کے اس قدر مواد پیدا ہو جاتے ہیں جو ختم نہیں ہو سکتے۔ پس جب ان کو اپنی اطاعت وعبادت کے مقبول ہونے کی امید اور رد کیے جانے کا خوف لگا رہتا ہے اور وہ اس اندیشہ میں بسر کرتے ہیں کہ دیکھیں ہمارے اعمال پسندیدہ قرار دیے جاتے ہیں یا ناپسند ہوتے ہیں تو ان کے دلوں میں خدا سے امید رکھنے اور خوف زدہ رہنے کی وہ استعداد پیدا ہوتی رہتی ہے جو کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ اس کے بعد کے جملے بھی اسی مطلب کے متعلق حضرتؑ نے ارشاد فرمائے ہیں۔

[4] یعنی جس وقت انسان کو اطمینان ہو جاتا ہے کہ فلاں کام میں ہمیں کامیابی یقیناً حاصل ہوگی اور نا کامیاب ہونے کا اندیشہ زائل ہو جاتا ہے اس وقت وہ اس میں محنت ومشقت کرنے سے رک جاتا اور اس کی جدوجہد میں سستی کرنے لگتا ہے۔ تو فرشتے بھی اگرچہ اس قدر عبادت اور اطاعت خدا بجالاتے ہیں کہ ان کو اپنی کامیابی کا یقین ہو جاتا اور وہ مطمئن ہونے کی وجہ سے اپنے اعمال میں سستی کرنے لگتے مگر ان کے دلوں سے خوف وحراس کے اسباب کم نہیں ہوتے ہیں لہٰذا وہ اپنے اعمال عبادت واطاعت میں سُستی بھی نہیں کرتے بلکہ برابر ایک شان سے جدوجہد کیے جاتے ہیں اور لالچوں نے انہیں اسیر نہیں کیا ہے یعنی دنیا کی طمعوں نے انہیں اپنا اسیر نہیں کیا ہے جس سے وہ دنیا کی فوری کوشش کو اختیار کریں اور آخرت کے سامان پر اس کو ترجیح دیں۔ اور مفتی محمد عبدہ اس کا مطلب یہ لکھتے ہیں کہ ان فرشتوں کو خدا کے سوا کسی کا لالچ ہی نہیں ہے تا کہ وہ پوری محنت ومشقت سے اجتہاد کامل کرنے پر معمولی کوشش کو ترجیح دیں یعنی پوری محنت نہ کریں۔ بلکہ ہلکی کوشش کریں اور سستی کو برتیں۔

عَلَى اجْتِهَادِهِمْ. وَ لَمْ يَسْتَعْظِمُوْا مَا مَضٰى مِنْ اَعْمَالِهِمْ، وَ لَوِ اسْتَعْظَمُوْا ذٰلِكَ لَنَسَخَ الرَّجَآءُ مِنْهُمْ شَفَقَاتِ وَجَلِهِمْ، وَ لَمْ يَخْتَلِفُوْا فِيْ رَبِّهِمْ بِاسْتِحْوَاذِ الشَّيْطٰنِ عَلَيْهِمْ، وَ لَمْ يُفَرِّقْهُمْ سُوْٓءُ التَّقَاطُعِ، وَ لَاتَوَلَّاهُمْ غِلُّ التَّحَاسُدِ، وَ لَا تَشَعَّبَتْهُمْ مَصَارِفُ الرِّيْبِ، وَ لَا اقْتَسَمَتْهُمْ اَخْيَافُ الْهِمَمِ.

فَهُمْ اَسَرَآءُ اِيْمَانٍ لَّمْ يَفُكَّهُمْ مِنْ رِّبْقَتِهٖ زَيْغٌ وَّ لَا عُدُوْلٌ وَّ لَا وَنًى وَّ لَا فُتُوْرٌ، وَ لَيْسَ فِيْٓ اَطْبَاقِ السَّمَآءِ مَوْضِعُ اِهَابٍ اِلَّا وَ عَلَيْهِ مَلَكٌ سَاجِدٌ، اَوْ سَاعٍ حَافِدٌ، يَزْدَادُوْنَ عَلٰى طُوْلِ الطَّاعَةِ بِرَبِّهِمْ عِلْمًا، وَ تَزْدَادُ عِزَّةُ رَبِّهِمْ فِيْ قُلُوْبِهِمْ عِظَمًا.

اپنی کامل محنت ومشقت پر ہلکی کوشش کو ترجیح دیں اور انہوں نے اپنے گزشتہ اعمال کو بڑا نہیں خیال کیا اور اگر وہ ان کو بڑا سمجھتے تو ان کی امید ان کے خوف کی دہشتوں کو زائل کر دیتی اور اپنے اوپر شیطان کے مسلط ہونے سے انہوں نے اپنے پروردگار کے بارے میں اختلاف نہیں کیا اور ایک دوسرے سے علیحدگی کے عیب نے ان سب کو متفرق نہیں کیا اور ایک دوسرے سے حسد بازی کا کھوٹ ان پر مسلط نہیں ہوا اور شک وشبہ کی گردشوں نے انہیں پراگندہ اور مختلف ہمتوں نے انہیں منقسم نہیں کیا۔

غرض یہ سب ایمان کے قیدی ہیں جس کے قبضہ سے انہیں کجی یا موڑ یا سُستی یا ضعف چُھڑا نہیں سکا۔ اور آسمان کے طبقوں میں کوئی بھی ایسی ظاہری جگہ نہیں ہے جہاں کوئی سجدہ کرنے والا یا برابر خدمت میں مشغول رہنے اور جدوجہد کرنے والا (فرشتہ) نہ ہو۔ طولِ طاعت سے ان میں ان کے پروردگار کا علم بڑھتا ہی جاتا ہے اور ان کے دلوں میں ان کے پروردگار کی عظمت زیادہ ہی ہوتی جاتی ہے۔[1]

---

[1] حضرت امیر المومنینؑ نے فرشتوں کی صفتیں بیان کرنے کے بعد آخر میں تاکیدی جملے ان کے اوصاف میں بیان کیے تاکہ یہ ایک مثال ہو جائے جس کی پیروی آدمیوں سے اہل معرفت حضرات بھی کریں کیونکہ انسان کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ معرفت، عبادت، اطاعت، فروتنی اور خشوع وخضوع میں وہ فرشتوں سے مشابہ ہو جائے تو ان اوصاف کا خلاصہ چند باتیں ہیں۔ ایک دائمی عبادت، دوسرے یہ کہ کوئی شخص اپنی قوت وطاقت کا دعویٰ نہ کرے بلکہ یقین رکھے کہ جو کچھ قوت وطاقت ہے وہ خدا ہی کی مرحمت سے، تیسرے یہ کہ ہر شخص برابر متواضع اور صاحب سکینہ وقار رہے، چوتھے یہ کہ اس کا یقین ایسا اعلیٰ ہو جس میں کسی شک وشبہ کو گنجائش نہ ملے، پانچویں یہ کہ اس کے سینہ میں کینہ، حسد وبغض کسی شخص سے بھی نہ ہو۔ اسی طرح آخر تک کل صفتوں کو سمجھ لینا چاہیے اور ہر شخص کو کوشش کرنی چاہیے کہ یہ صفتیں اس میں بھی پیدا ہوں تاکہ وہ تقرب میں فرشتوں کا درجہ حاصل کر سکے۔ (الکلام میں نئے کاتب کا ایک صفحہ اضافی ہے۔)

[وَ مِنْهَا: فِيْ صِفَةِ الْاَرْضِ وَ دَحْوِهَا عَلَى الْمَآءِ]

وَ لُجَجِ بِحَارٍ زَاخِرَةٍ، تَلْتَطِمُ اَوَاذِيُّ اَمْوَاجِهَا، وَ تَصْطَفِقُ مُتَقَاذِفَاتُ اَثْبَاجِهَا، وَ تَرْغُوْ زَبَدًا كَالْفُحُوْلِ عِنْدَ هِيَاجِهَا، فَخَضَعَ جِمَاحُ الْمَآءِ الْمُتَلَاطِمِ لِثِقَلِ حَمْلِهَا، وَ سَكَنَ هَيْجُ ارْتِمَآئِهٖ اِذْ وَطِئَتْهُ بِكَلْكَلِهَا، وَ ذَلَّ مُسْتَخْذِيًا اِذْ تَمَعَّكَتْ عَلَيْهِ بِكَوَاهِلِهَا، فَاَصْبَحَ بَعْدَ اصْطِخَابِ اَمْوَاجِهٖ، سَاجِيًا مَّقْهُوْرًا، وَ فِيْ حَكَمَةِ الذُّلِّ مُنْقَادًا اَسِيْرًا، وَ سَكَنَتِ الْاَرْضُ مَدْحُوَّةً فِيْ لُجَّةِ تَيَّارِهٖ، وَ رَدَّتْ مِنْ

[اسی خطبہ کا کچھ حصّہ زمین کے بیان اور اس کے پانی پر بچھانے کے متعلق]

(خداوند عالم نے) زمین کو سخت اور شدید موجوں کے اضطراب اور جوش مارنے والے دریاؤں کی بلندیوں پر زمین کو بچھایا اس وقت ان دریاؤں کی تیز وتند موجیں ایک دوسرے کو تھپیڑے مارتی اور ان کی تیز رو اونچی لہریں آپس میں ٹکراتی تھیں اور جھاگ کو اس طرح پھینکتی تھیں جیسے مستی کے وقت نر جانور (کف پھینکتے ہیں) تو زمین کے بوجھ کی گرانی سے اُمنڈتے ہوئے پانی کا جوش فرو ہو گیا اور جب زمین نے اس کو اپنے سینہ سے دبا دیا تو اس کے اُبلنے کی تیزی غائب ہو گئی اور جب زمین نے اپنے شانوں کو اس پر جمایا تو وہ (پانی) عاجز ہو کر نرم ہو گیا۔ پھر اپنی موجوں کے شور وغل کے بعد خاموش ساکن اور اطاعت کے لگام میں مقید اور اسیر ہو گیا اور اس کی زبردست موج پر[1] بچھ کر

---

[1] اس حصہ میں بکثرت مشکل الفاظ ہیں جن کو بغیر علیحدہ علیحدہ سمجھے ہوئے اس عبارت کا مطلب واضح نہیں ہوگا۔ ''دَحْوٌ''، معنی پھیلانا، بچھانا وغیرہ۔ ''کَبسٌ''، معنی بھر دینا۔ پاٹ دینا۔ چھپانا۔ داخل کرنا۔ انوار اللغۃ پارہ ۲۲ صفحہ میں ہے ''یَا مَنْ کَبَسَ الْاَرْضَ عَلَی الْمَاءِ''۔ اے وہ خدا جس نے زمین کو پانی میں گھیر دیا یا چھپا دیا۔ ''مَوْرٌ''۔ معنی حرکت کرنا۔ ہلنا۔ ڈولنا۔ ''زَاخِرَۃٌ''۔ جوش مارنے والا۔ موج مارنے والا، بلند ہونے والا۔ ''اَوَاذِیُّ''، جمع ہے اذی کی، اس کا معنی بھی موج ہے اور مفتی عبدہ مصری نے اس کا معنی موج کے سرے کا حصہ لکھا ہے۔ اِصْطَفَاقٌ۔ تھپیڑا مارنا۔ مُتَقَاذِفَاتٌ۔ ایک دوسرے کو پھینک مارنے والی۔ ''اَثْبَاجٌ''، جمع ہے ثَبَجٌ کی۔ اصل میں ثَبَجٌ مونڈھے اور پشت کے درمیان حصہ کو کہتے ہیں۔ یہاں اس استعارہ کے طور پر اونچی موجوں کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ ''تَرْغُوْ''۔ معنی یہ کہ جس طرح اونٹ بڑبڑاتا ہے اسی طرح ان موجوں کی آواز نکلتی تھی۔ ''جِمَاحُ''۔ کا اصلی معنی گھوڑے کا اپنے سوار کو بگ ٹٹ لے کر بھاگنا ہے کہ پھر لوٹنے کا نام نہ لے۔ یہاں مقصود پانی کا چڑھاؤ اور جوش مارنا ہے۔ ''کَلْکَلٌ''، کا اصلی معنی سینہ ہے، یہاں مراد زمین کے نیچے کی سطح ہے جو پانی پر بچھائی گئی۔ ''مُسْتَخْذِیْ''۔ عاجز، بے بس۔ ''تَمَعَّکَتْ''۔ لوٹی، جس طرح جانور زمین میں لوٹتا ہے۔ ''سَاجِیًا''۔ معنی ساکن۔ ''حَکَمَۃٌ''۔ معنی لگام کا وہ لوہا جو گھوڑے کی ناک پر رہتا ہے اور اس کی ٹڈی کے تلے۔

نَّخْوَةِ بَأْوِهٖ وَ اعْتِلَآئِهٖ، وَ شُمُوْخِ اَنْفِهٖ وَ سُمُوِّ غُلَوَآئِهٖ، وَ كَعَمَتْهُ عَلٰى كِظَّةِ جَرْيَتِهٖ، فَهَمَدَ بَعْدَ نَزَقَاتِهٖ، وَ لَبَدَ بَعْدَ زَيَفَانِ وَثَبَاتِهٖ.

زمین ساکن ہوگئی۔ اور اس (پانی) کی نخوت غرور (فخر و سرکشی) اور بلند ہونے (اکڑنے) اور تکبر اور اس کے حد سے بڑھے ہوئے جوش وخروش کو اس نے بالکل برطرف کر دیا۔ اور اس کی تیز وتندروانی پر اس کا منہ باندھ دیا۔ تو وہ (پانی) اپنے تلاطم کے بعد تھم گیا اور اپنے جست وخیز اور طغیانی کے بعد نچلا ہو کر بیٹھ گیا۔

فَلَمَّا سَكَنَ هَيْجُ الْمَآءِ مِنْ تَحْتِ اَكْنَافِهَا، وَ حَمَلَ شَوَاهِقَ الْجِبَالِ الشُّمَّخِ الْبُذَّخِ عَلٰٓى اَكْتَافِهَا، فَجَّرَ يَنَابِيْعَ الْعُيُوْنِ مِنْ عَرَانِيْنِ اَنْوُفِهَا، وَ فَرَّقَهَا فِيْ سُهُوْبِ بِيْدِهَا وَ اَخَادِيْدِهَا، وَ عَدَّلَ حَرَكَاتِهَا بِالرَّاسِيَاتِ مِنْ جَلَامِيْدِهَا، وَ ذَوَاتِ الشَّنَاخِيْبِ الصُّمِّ مِنْ

پھر جب کنارہائے زمین کے دباؤ سے پانی کا ہیجان مٹ گیا اور (خدا نے) بڑے اونچے اور بھاری پہاڑوں کو اس (زمین) کے شانوں پر بلند کر دیا تو انہی (پہاڑوں) کی اونچی چوٹیوں سے نہروں کے چشمے شگافتہ کر کے جاری کیے اور ان سب کو اس (زمین) کے کشادہ میدانوں، بیابانوں اور گڑھوں میں پراگندہ کر دیا اور (پھر) اس (زمین) کی حرکتوں کو ان گڑے ہوئے (پہاڑوں کے) سخت پتھروں [1] اور بلندیوں والے ٹھوس زبردست

---

[1] ''كَعَمَتْ''۔ كَعَمٌ معنی منہ باندھ دینا تاکہ کاٹ نہ سکے، نہ کھا سکے۔ ''كِظَّةٌ''۔ معنی خوب بھر جانا۔ ''هَمَدَ''، معنی مرجھا گیا یا بجھ گیا۔ یہاں مقصود ساکن ہو جانا ہے۔ ''نَزَقَاتٍ''۔ معنی طیش، خفت۔ ''لَبَدَ''۔ معنی لپٹ گیا، چمٹ گیا۔ ''زَيَفَانٍ''۔ معنی اکڑ کر یا اترا کر چلنا۔ ''اَلشُّمَّخِ''، جمع ہے شَامِخٌ کی بمعنی اونچے، بلند۔ ''بُذَّخٌ''، جمع ہے بَاذِخٌ کی اونچے بلند۔ اور ''شامخ'' اور ''باذخ'' میں یہ فرق ہوسکتا ہے کہ ''شامخ'' مطلقاً اونچے کو کہتے ہیں اور ''باذخ'' اس اونچے کو جس میں ضخامت بھی ہو۔ ''عَرَانِيْنٌ''، جمع ہے عَرنین کی کہ جس کا اصلی معنی ناک کے اوپر کی ہڈی (بانسہ) ہے اور یہاں اس سے مراد پہاڑ کی چوٹیاں ہیں۔

چنانچہ علامہ مفتی محمد عبدہ مصری لکھتے ہیں کہ ''عَرَانِيْنٌ'' سے مراد پہاڑ کی چوٹیاں ہیں مگر حضرتؑ نے ان چوٹیوں کے لیے ''عَرَانِيْنِ'' کا لفظ بطور استعارہ استعمال فرمایا۔ یہ استعارہ کی بہترین اور لطیف ترین قسم ہے۔

''سُهُوْبِ''، جمع ہے سُهُبٌ کی بمعنی کشادہ زمین۔ ''بِيْدِ''، جمع ہے بیداء کی۔ اس کا معنی بھی میدان ہی ہے۔ ''اَخَادِيْدٌ''، جمع ہے اَخْدُوْدٌ کی بمعنی خندق، کھائی۔ ''رَاسِيَاتٌ''۔ معنی وزنی اور گڑے ہوئے یعنی بڑے بڑے پتھروں کو اس کے لیے لنگر کر دیا جن کے بوجھ سے اب زمین ذرہ برابر بھی کسی طرح ہل نہیں سکتی ہے۔ قرآن مجید سورۂ نازعات میں ہے:

﴿وَ الْجِبَالَ اَرْسٰهَا﴾ (سورۂ النازعات، آیہ ۳۲)

(بقیہ صفحہ مابعد)

صَيَاخِيْدِهَا، فَسَكَنَتْ مِنَ الْمَيَدَانِ لِرُسُوْبِ الْجِبَالِ فِيْ قِطَعِ اَدِيْمِهَا، وَ تَغَلْغُلِهَا مُتَسَرِّبَةً فِيْ جَوْبَاتِ خَيَاشِيْمِهَا، وَ رُكُوْبِهَآ اَعْنَاقَ سُهُوْلِ الْاَرَضِيْنَ وَ جَرَاثِيْمِهَا،

وَ فَسَحَ بَيْنَ الْجَوِّ وَ بَيْنَهَا، وَ اَعَدَّ الْهَوَآءَ مُتَنَسَّمًا لِّسَاكِنِهَا، وَ اَخْرَجَ اِلَيْهَآ اَهْلَهَا عَلٰى تَمَامِ مَرَافِقِهَا.

ثُمَّ لَمْ يَدَعْ جُرُزَ الْاَرْضِ الَّتِيْ تَقْصُرُ مِيَاهُ الْعُيُوْنِ عَنْ رَّوَابِيْهَا، وَ لَا تَجِدُ جَدَاوِلُ

چٹانوں سے برابر کر دیا۔ تو سطحِ زمین کے ٹکڑوں اور اجزا میں ان پہاڑوں کے پیوست ہو جانے اور اس (زمین) کی بلندیوں کے شگافوں میں ان (پہاڑوں) کے گھس جانے۔ اور ہموار و ناہموار زمین کی گردنوں پر ان (پہاڑوں) کے سوار ہو جانے سے زمین اپنی حرکت سے رُک کر بالکل ساکن ہو گئی۔

اور (خدا نے) زمین اور اس کی فضا کے درمیانی حصّہ کو کشادہ کر دیا اور اس کے باشندوں کے لیے ہوا کو سانس لینے کی جگہ بنائی اور اس کے رہنے والوں کو تمام سامانوں کے ساتھ عدم سے وجود کی طرف لا کر اس پر آباد کر دیا۔

پھر ان چٹیل زمینوں کو بھی جن کے ٹیلوں تک چشموں کے پانی نہیں پہنچتے اور نہ دریاؤں کے سوتے وہاں تک جانے کا کوئی ذریعہ پاتے ہیں[1] نہیں چھوڑا یہاں تک کہ

(بقیہ صفحہ ماقبل) یعنی پہاڑوں کو زمین میں گاڑ دیا۔

اور سورۂ رعد میں فرمایا:

﴿ وَ هُوَ الَّذِيْ مَدَّ الْاَرْضَ وَ جَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ ﴾

وہی خدا ہے جس نے زمین کو بچھایا اور اس میں پہاڑ گاڑ دیے۔

اور سورۂ حجر میں ہے:

﴿وَ الْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَ اَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ﴾

یعنی زمین کو ہم ہی نے پھیلایا اور اس میں میخ کی طرح پہاڑوں کے لنگر ڈال دیے۔

[1] ''جَلَامِيْدُ'' جمع ہے جَلْمُوْدٌ کی بمعنی سخت اور بڑے پتھر۔ ''شَنَاخِيْبٌ'' جمع ہے شَنْخُوْبٌ کی بمعنی پہاڑ کی چوٹی۔ اور ''صَيَاخِيْدُ'' جمع ہے صَيْخُوْدٌ کی اس کا معنی سخت چٹان ہے۔ ''مَيَدَانِ'' معنی ہلنا، حرکت کرنا۔ ''قِطَعٌ'' جمع ہے قِطْعَةٌ کی اور مقصود زمین کے ٹکڑے اور اجزاء ہیں۔ ''اَدِيْمِ اَرْضٍ''۔ معنی زمین کی سطح۔ تَغَلْغُلٌ۔ معنی گھس پڑنا، زور سے یا زبردستی داخل ہو جانا۔ ''مُتَسَرِّبَةٌ'' معنی داخل ہوتے ہوئے، گھستے ہوئے۔ ''جَوْبَاتٌ'' جمع ہے جَوْبَةٌ کی جس کا معنی گڑھا ہے۔ ''خَيَاشِيْمُ'' جمع ہے خَيْشُوْمٌ کی جس کا معنی ناک کے اوپر کا حصہ (بانسہ) ہے۔ ''جَرَاثِيْمٌ'' جمع ہے جَرْثُوْمٌ کی جس کا معنی جڑ ہے یا (بقیہ صفحہ مابعد)

الْاَنْهَارِ ذَرِيْعَةً اِلٰى بُلُوْغِهَا، حَتّٰٓى اَنْشَاَ لَهَا نَاشِئَةَ سَحَابٍ تُحْيِىْ مَوَاتَهَا، وَ تَسْتَخْرِجُ نَبَاتَهَا. اَلَّفَ غَمَامَهَا بَعْدَ افْتِرَاقِ لُمَعِهٖ، وَ تَبَايُنِ قَزَعِهٖ. حَتّٰٓى اِذَا تَمَخَّضَتْ لُجَّةُ الْمُزْنِ فِيْهِ، وَ الْتَمَعَ بَرْقُهٗ فِىْ كُفَفِهٖ، وَ لَمْ يَنَمْ وَمِيْضُهٗ فِىْ كَنَهْوَرِ رَبَابِهٖ، وَ مُتَرَاكِمِ سَحَابِهٖ، اَرْسَلَهٗ سَحًّا مُّتَدَارِكًا، قَدْ اَسَفَّ هَيْدَبُهٗ، تَمْرِيْهِ الْجَنُوْبُ دِرَرَ اَهَاضِيْبِهٖ، وَ دَفْعَ شَآبِيْبِهٖ.

فَلَمَّآ اَلْقَتِ السَّحَابُ بَرْكَ بِوَانِيْهَا، وَ بِقَاعَ مَا اسْتَقَلَّتْ بِهٖ مِنَ الْعِبْءِ

ان کے لیے اٹھا ہوا ابر پیدا کیا جو بنجر زمینوں کو آباد کرتا اور ان کے نباتات کو اگاتا ہے۔ اس ابر کے ٹکڑوں کو جو جدا جدا اور ان کے حصّے ایک دوسرے سے الگ الگ تھے ملا کر ایک کر دیا یہاں تک کہ جب بڑا ابر اس میں زور سے حرکت کرنے لگا اور اس کی بجلی اس کے اطراف میں چمکنے لگی اور اس کی چمک سخت دلدار سفید اَبر میں موقوف نہیں ہوئی تو (خدا نے) اس ابر کو موسلا دھار بارش بنا کر چھوڑ دیا اس کا نچلا حصہ زمین سے مل گیا کہ دھن کی ہوا اس (ابر) کے پانی کی دھاریں دوھتی اور اس کی بوندیوں کو نچوڑتی تھی۔

غرض جب ابروں نے اپنی پسلیوں کا بوجھ زمین پر ڈال دیا اور (بارش کا) جو بار اس پر لادا گیا تھا[1] جس کو وہ

(بقیہ صفحہ ماقبل) وہ مٹی جو درخت کی جڑوں پر جمع ہوجاتی ہے اور پہاڑوں کا میدانوں یا نرم زمین کی گردنوں پر سوار ہونا، گو مجاز ہے مگر اس کا مطلب واضح ہے کہ پہاڑ زمین پر غالب اور قائم اور اس پر بلند ہیں۔ ''فَسَحٌّ'' معنی کشادہ کیا۔ اور ''مُتَنَسَّمًا'' معنی نسیم کی جگہ یعنی ہوا کو باشندگان زمین کے سانس لینے کی جگہ قرار دیا۔

''مَرَافِقٌ'' کے متعلق علامہ مفتی محمد عبدہ مصری لکھتے ہیں کہ گھر کے ''مَرَافِقْ'' ان چیزوں کو کہتے ہیں جن سے اس گھر کے رہنے میں مدد لی جاتی اور جن چیزوں کی احتیاج اس گھر کی سکونت کے وقت ہوتی ہے۔ خصوصاً وہ چیزیں جو قیام کرنے کی ہوں یا وہ چیزیں جن سے رہنے اور سکونت کرنے میں نفع پورا حاصل ہو مثلاً پانی گرنے اور بہنے اور نکلنے کی جگہیں اور وہ راہیں جو اس گھر تک پہنچاتی ہیں اور وہ جگہ جن کے بغیر اس گھر میں رہنا دشوار ہو جائے جیسے پائخانہ وغیرہ۔ ''جُرُزَ الْاَرْضِ'' وہ بنجر زمین جہاں پانی نہیں پہنچتا اور اسی وجہ سے وہاں کوئی چیز اگتی بھی نہیں ہے۔ ''رَوَابِیْ'' جمع ہے رَابِیَّةٌ کی بمعنی مسند، مقام یا ٹیلہ۔

[1] زمین کے پانی پر بچھائے جانے کا حال بیان کرنے کے بعد حضرتؑ نے اس مقام سے ابر کی پیدائش اور اس کی خلقت کی غرض و فوائد و حکم بیان کرنا شروع کیے جس میں برق و رعد کا ذکر بھی ہے چونکہ حاشیہ کی جگہ کم ہے اور یہ مضامین طویل الذیل اور بہت کچھ شرح و بسط کے محتاج ہیں نیز اس زمانہ میں سائنس کے جو مسائل شائع و ذائع ہیں ان کے مطابق ان بیانات کو سمجھنا ضروری ہے تاکہ کسی قسم کا تردد نہ ہو اور علوم جدیدہ سے کوئی اعتراض حضرتؑ کے کلام پر وارد نہ ہو۔ لہٰذا ان مطالب عالیہ کے لیے ضمیمہ کا انتظار کیجئے کہ انشاء اللہ اس میں تفصیل سے یہ مباحث آئیں گے۔ اور ہر امر کی پوری تحقیق کی جائے گی۔ ابھی صرف حضرتؑ کے کلام کا ظاہری مطلب سمجھ لینا چاہیے کہ اس خطبہ کے الفاظ خصوصاً مشکل اور دقیق ہیں اور متعدد الفاظ ایسے استعمال فرمائے ہیں جو ایک ہی معنی کے (بقیہ صفحہ مابعد)

الْمَحْمُوْلِ عَلَيْهَا، اَخْرَجَ بِهٖ مِنْ هَوَامِدِ الْاَرْضِ النَّبَاتَ، وَ مِنْ زُعْرِ الْجِبَالِ الْاَعْشَابَ، فَهِيَ تَبْهَجُ بِزِيْنَةِ رِيَاضِهَا، وَ تَزْدَهِيْ بِمَآ اُلْبِسَتْهُ مِنْ رَّيْطِ اَزَاهِيْرِهَا، وَ حِلْيَةِ مَا سُمِطَتْ بِهٖ مِنْ نَّاضِرِ اَنْوَارِهَا، وَ جَعَلَ ذٰلِكَ بَلَاغًا لِّلْاَنَامِ، وَ رِزْقًا لِّلْاَنْعَامِ، وَ خَرَقَ الْفِجَاجَ فِيْ اٰفَاقِهَا، وَ اَقَامَ الْمَنَارَ لِلسَّالِكِيْنَ عَلٰى جَوَادِّ طُرُقِهَا.

اُٹھائے تھا اُتار دیا تو خدا نے اسی (بارش) سے پڑتی زمینوں کی روئیدگی اور خشک زار پہاڑوں کے پودوں کو نکالنا شروع کیا۔ پس اب یہ (زمین) اپنے تر و تازہ پودوں سے خوشنما نظر آنے لگی اور اس کے پھولوں کی چادریں جو اس کو پہنائی گئیں اور اس کے ہرے بھرے شگوفوں کے جو ہار اس کو پہنائے گئے اس سے وہ خود (گویا) اترانے لگی اور (خدا نے) ان (نباتات اور سبزوں) کو مخلوقات کی غذا اور چوپایوں کا رزق قرار دیا اور اس (زمین) کے اطراف میں وسیع و فراخ راہیں کشادہ کر دیں اور اس کی شاہراہوں پر چلنے والوں کے لیے روشن علامتیں مقرر کر دیں۔[1]

(بقیہ صفحہ ماقبل) ہیں یا جن سب کا معنی ملتا ہوا ہے۔

نَاشِئَةَ سَحَابٍ معنی وہ ابر جو پہلے پہل ظاہر ہو۔ مَوَاتَ الْاَرْضِ۔ بنجر زمین کو کہتے ہیں جس میں نہ زراعت ہو نہ آبادی۔ لُمَعٌ جمع ہے لُمْعَةٌ کی اصل میں لُمْعَةٌ اس کو کہتے تھے کہ گھانس کا ایک حصہ سوکھ کر ہری گھانس میں چمکتا ہے یہاں حضرتؑ نے اس کو بطور استعارہ استعمال فرما کر اس سے ابر کے ٹکڑوں کو مراد لی ہے۔ ''قَزَعٌ'' بھی جمع ہے قَزْعَةٌ کہ اس کا معنی بھی ابر کا ٹکڑہ ہے۔ تَمَخَّضَتْ۔ جھاگ ہو گیا۔ یعنی خوب جوش میں آ کر زور سے حرکت کرنے لگا۔ ''كُفَفٌ'' جمع ہے کفۃ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو ترازو کے پلڑوں کی طرح گول ہو اور یہاں مراد اطراف و جوانب ہیں۔ كَنَهْوَرٍ۔ معنی بڑا غلیظ ابرو، ''وَمِيْضُهٗ فِيْ كَنَهْوَرِ رَبَابِهٖ'' یعنی اس کی چمک سخت دلدار سفید ابر میں معلوم ہوتی تھی۔ ''سَحًّا مُّتَدَارِكًا'' یعنی مسلسل بارش جس کا سلسلہ ٹوٹتا نہ ہو۔ ''اَسَفَّ'' معنی نزدیک ہوا۔ ''هَيْدَبُهٗ'' معنی دھاگے۔ ''هَيْدَبَ السَّحَابُ'' معنی ابر کے لمبے لمبے دھاگے۔

[1] علامہ ابن ابی الحدید نے ان الفاظ کی شرح کرنے کے بعد اس خطبہ کے متعلق چند فصلیں لکھی ہیں جن سے دو کا خلاصہ یہ ہے:

''پہلی فصل زمین کی ابتدائے خلقت کے متعلق ہے، حضرتؑ کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ زمین سے پہلے پانی پیدا کیا گیا تھا اور ہم پہلے اس کو ذکر کر چکے ہیں کہ بعض حکماء اور فلسفین کا یہی قول ہے اور تورات کے مطابق بھی یہی قول ہے مگر حضرتؑ کے کلام میں یہاں ایک اشکال ہوتا ہے کہ اس کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ پانی کا ہیجان اس کا جوش اور اس کا موج اس پر زمین بچھائے جانے سے زائل ہوا اور یہ بات مشاہدہ کے خلاف معلوم ہوتی ہے اور عقل بھی اس کو قبول نہیں کرتی ہے کیونکہ ساکن پانی میں جب بھاری جسم ڈالا یا اس پر رکھا جائے گا تو فوراً زیادہ ہلنے اور حرکت (بقیہ صفحہ مابعد)

(بقیہ صفحہ ماقبل) کرنے لگے گا اور اوپر چڑھ جائے گا، پھر جو پانی پہلے ہی سے ہلتا اور جوش مارتا ہو وہ بھاری جسم پڑنے سے ساکن کیوں کر ہو جائے گا تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب پانی میں جوش اور حرکت کسی تیز و تند ہوا کی وجہ سے ہو تو ہو سکتا ہے کہ کوئی بھاری جسم پڑھنے سے اس کی حرکت رک جائے کہ وہ بھاری چیز اس پانی تک نہیں پہنچنے پائے گی تو اس کی حرکت بھی جاری نہیں رہے گی اس کو یوں سمجھیے کہ گلاس میں پانی ڈال کر ہم اس کو پنکھے سے ہلائیں تو پانی ہلنے لگے گا لیکن اگر اس گلاس کو ڈھکنے سے چھپا دیں۔ پھر پنکھے سے ہلائیں تو وہ پانی نہیں ہلے گا کیونکہ اب یہ ڈھکنا ہوا کو اس پانی تک جانے نہیں دے گا۔ اسی طرح ممکن ہے کہ پہلے پانی ہوا کی وجہ سے حرکت کرتا رہا ہو پھر جب اس پر زمین بچھا دی گئی جو ہوا اور پانی کے درمیان حائل ہو گئی تو پانی ہلنے سے رک گیا کیونکہ اب اس پر ہوا کا اثر نہیں ہوتا اور حضرت امیر المومنینؑ کے پہلے خطبہ میں اس ہوا کا ذکر گزر چکا ہے''۔

اور علامہ ممدوح آخری فصل میں لکھتے ہیں:

''پانچویں فصل اس بیان میں کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام فن بدیع کے استاد و امام ہیں اور یہ اس سبب سے کہ آپ سے پہلے جو علمائے علم ادب گزرے ہیں ان کے کلام میں فن بدیع کے متعلق چند الفاظ کے سوا کچھ بھی نہیں ملتا ہے اور اس کو بھی ان لوگوں نے اپنے قصد و ارادہ سے نہیں کیا ہے بلکہ اتفاقاً ان کے کلام میں اس فن کا شائبہ آ گیا ہے جس طرح کلام مجید میں تجنیس اتفاقاً آ گئی ہے وہ مقصود بالذات نہیں تھی۔ برخلاف حضرت امیر المومنینؑ کے اس کلام کے کہ اس میں تو عجیب وغریب استعارہ وغیرہ امور جو فن بدیع سے متعلق ہیں اس کثرت سے موجود ہیں جو اگر کسی شاعر کے دیوان میں ہوتے تو صرف اسی وجہ سے وہ سب سے بڑا شاعر اور سب شاعروں کا امام و پیشوا مانا جاتا''۔

اس قدر لکھنے کے بعد علامہ ممدوح نے بہت سی مثالیں اسی خطبہ کے الفاظ سے دی ہیں اور پھر ان کی خوبیاں دکھا کر حضرتؑ کے فن بدیع میں کمال کو آشکار کیا ہے چونکہ یہ سب الفاظ عربی کے ہیں اور ان مثالوں کا تعلق بھی عربی زبان ہی سے ہے اس وجہ سے ان کو نقل کرنا بے کار ہے۔

ان مثالوں کا ذکر کرنے کے بعد علامہ ممدوح بڑے جوش میں آتے اور لکھتے ہیں:

''یا اللہ! کس قدر تعجب اور حیرت ہے ان لوگوں سے جو کہتے ہیں کہ ہر کلام جس میں فن بدیع کی چند مثالیں موجود ہوں اس کلام سے افضل ہوتا ہے جس میں فن بدیع کی کوئی مثال نہ ہو یا اس سے کم ہو، پھر جب یہ حضرات کسی شاعر یا مصنف کے کلام کا سینکڑوں ورق الٹنے اور ایک ایک حرف کو غور و فکر سے دیکھنے کے بعد اس میں وہ دو یا تین لفظ بدیع کے پاتے ہیں تو اچھل پڑتے اور قیامت قائم کر دیتے ہیں اور گویا صور پھونک دیتے ہیں اور اپنی کتابوں میں اس شاعر یا مصنف کی مدح و ثنا کے پل باندھ دیتے ہیں، مگر یہی حضرات جب حضرت امیر المومنینؑ کے اس خطبہ کا مطالعہ کرتے ہوئے گزرتے ہیں جو پورے کا پورا اسی صنعت بدیع سے لفظ بہ لفظ اور حرف بہ حرف لطیف ترین وجہ، خوبصورت ترین شکل، لذیذ ترین عبارت، نازک ترین معنی اور حسین ترین مقصد پر بھرا ہوا ہے تو صرف اس وجہ سے کہ یہ حضرت علیؑ کا کلام ہے ان کا تعصب اور مذہبی تنگ خیالی انہیں سکوت پر آمادہ کر دیتی اور ان کی زبان کو اس کلام کی افضلیت کا اعتراف کرنے سے روک دیتی ہے۔ اور اگر انہوں نے زیادہ سے زیادہ انصاف کیا اور اپنے خیال میں اس کلام کی بڑی قدر (بقیہ صفحہ مابعد)

فَلَمَّا مَهَدَ اَرْضَهٗ، وَ اَنْفَذَ اَمْرَهٗ، اخْتَارَ اٰدَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ، خِيْرَةً مِّنْ خَلْقِهٖ، وَ جَعَلَهٗ اَوّلَ جِبِلَّتِهٖ، وَ اَسْكَنَهٗ جَنَّتَهٗ، وَ اَرْغَدَ فِيْهَآ اُكُلَهٗ، وَ اَوْعَزَ اِلَيْهِ فِيْمَا نَهَاهُ عَنْهُ، وَ اَعْلَمَهٗ اَنَّ فِي الْاِقْدَامِ عَلَيْهِ التَّعَرُّضَ لِمَعْصِيَتِهٖ، وَ الْمُخَاطَرَةَ بِمَنْزِلَتِهٖ فَاَقْدَمَ عَلٰى مَا نَهَاهُ عَنْهُ۔ مُوَافَاةً لِّسَابِقِ عِلْمِهٖ ۔ فَاَهْبَطَهٗ بَعْدَ التَّوْبَةِ لِيَعْمُرَ اَرْضَهٗ بِنَسْلِهٖ، وَ لِيُقِيْمَ الْحُجَّةَ بِهٖ عَلٰى عِبَادِهٖ، وَ لَمْ يُخْلِهِمْ بَعْدَ اَنْ قَبَضَهٗ، مِمَّا يُؤَكِّدُ عَلَيْهِمْ حُجَّةَ رُبُوْبِيَّتِهٖ، وَ يَصِلُ بَيْنَهُمْ وَ بَيْنَ مَعْرِفَتِهٖ، بَلْ تَعَاهَدَهُمْ بِالْحُجَجِ عَلٰٓى اَلْسُنِ الْخِيَرَةِ مِنْ اَنْبِيَآئِهٖ، وَ مُتَحَمِّلِيْ وَدَآئِعِ رِسَالَاتِهٖ، قَرْنًا فَقَرْنًا، حَتّٰى تَمَّتْ بِنَبِيِّنَا

غرض جب خدا اپنی زمین بچھا اور اپنا حکم جاری کر چکا تو حضرت آدم علیہ السلام کو اپنی مخلوق سے پسند فرما کر برگزیدہ کیا اور آپ کو اپنی خلقت (انسان) کا اوّل قرار دیا اور اپنی بہشت میں آباد کیا اور اس میں ان کی روزی کو وسیع کیا اور انہیں جس کام سے روکا اس کی طرف متنبہ بھی کر دیا اور اس پر بھی مطلع کر دیا کہ اس (کام) پر آمادہ ہونے میں اس کی نافرمانی کا سامنا اور ان کے مرتبہ کی بربادی کا خطرہ ہے [1] مگر موافق اس کے جو خدا کے علم میں پہلے ہی گزر چکا تھا اس نے (حضرت آدمؑ) کو جس کام سے منع کیا تھا اس پر وہ آمادہ ہی ہو گئے۔ تو خدا نے آپ کو توبہ کے بعد (زمین پر) اتار دیا تا کہ آپؑ کی نسل سے اپنی زمین کو آباد اور آپ کی ذات سے اپنے بندوں پر حجت قائم کرے اور آپؑ کے مرنے پر بھی ان (بندوں) کو اس چیز سے خالی نہیں چھوڑا جو ان پر اس کی خدائی کی محبت کی تاکید کرتی اور ان کے اور اس کی معرفت کے درمیان ربط پیدا کرتی رہے بلکہ ہر ہر زمانہ میں اس کے نبیوں اور اس کی رسالت کی امانتوں کے اُٹھانے والوں سے جو برگزیدہ حضرات تھے انہی کی زبانی اپنی حجتوں کو بندوں پر تازہ کرتا رہا۔ یہاں تک کہ ہمارے

(بقیہ صفحہ مابعد) کی تو صرف یہ کہ دوسروں کو حضرت علیؑ پر فضیلت دینے سے باز رہتے اور سکوت اختیار کر لیتے ہیں۔ غرض کسی طرح حضرتؑ کے کلام کی خوبی ظاہر کرنا گوارا ہی نہیں کرتے۔ مگر اس پر تعجب بھی نہیں کرنا چاہیے کیونکہ آخر یہ کلام حضرت علی علیہ السلام ہی کا تو ہے اور دل کا تعلق جس طرح کسی شخص سے ہوتا ہے اسی طرح اس کے کلام سے بھی ہوتا ہے۔ یعنی جو لوگ حضرت علیؑ ہی کو اچھا کہنا یا سننا نہیں چاہتے وہ حضرتؑ کے کلام کی مدح کس دل سے مان سکتے اور کس زبان سے بیان کر سکتے ہیں''۔

[1] کلام مجید میں حضرت آدمؑ کی خلقت اور اس درخت سے بچنے کا حکم تفصیل سے مرقوم ہے مگر اس پر اجماع اور عقلی و نقلی دلیلیں کثرت سے قائم ہیں کہ انبیاءؑ معصوم ہوتے ہیں ان سے کوئی گناہ نہیں ہوتا۔ تو حضرت آدمؑ نے گناہ نہیں کیا بلکہ اس کام کو کیا جس کو نہ کرنا بہتر تھا۔

مُحَمَّدٍ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حُجَّتُهٗ، وَ بَلَغَ الْمُقْطَعَ عُذْرُهٗ وَ نُذُرُهٗ.

پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کی حجت تمام ہوگئی اور اس کا عذر اور اس کی تنبیہ اپنی حد کو پہنچ گئی۔

وَ قَدَّرَ الْاَرْزَاقَ فَكَثَّرَهَا وَ قَلَّلَهَا، وَ قَسَّمَهَا عَلَى الضِّيْقِ وَ السَّعَةِ فَعَدَلَ فِيْهَا لِيَبْتَلِيَ مَنْ اَرَادَ بِمَيْسُوْرِهَا وَ مَعْسُوْرِهَا، وَ لِيَخْتَبِرَ بِذٰلِكَ الشُّكْرَ وَ الصَّبْرَ مِنْ غَنِيِّهَا وَ فَقِيْرِهَا. ثُمَّ قَرَنَ بِسَعَتِهَا عَقَابِيْلَ فَاقَتِهَا، وَ بِسَلَامَتِهَا طَوَارِقَ اٰفَاتِهَا، وَ بِفُرَجِ اَفْرَاحِهَا غُصَصَ اَتْرَاحِهَا.

پھر خدا نے (لوگوں کی) روزیاں اندازے سے مقرر کیں تو (کسی کی روزی) زیادہ اور (کسی کی) کم معین کی اور اس کو تنگی اور وسعت پر تقسیم کر کے اس میں اصول عدل کو قائم رکھا تا کہ ان (روزیوں) کی وسعت اور تنگی سے جس شخص کا چاہے امتحان لے اور اس کے ذریعہ سے اپنی مخلوقات کے مالدار کا شکر اور فقیر کا صبر جانچے۔ پھر ان (روزیوں) کی وسعت سے ان کی فاقہ کی سختیوں کو متصل کر دیا اور ان (روزیوں) کے لیے آفتوں کے جو خطرے ہیں ان سے سلامتی کو اور ان میں رنج وغصہ کے جو اسباب ہیں ان سے خوشی اور مسرت کے اطمینان کو قریب کر دیا۔

وَ خَلَقَ الْاٰجَالَ فَاَطَالَهَا وَ قَصَّرَهَا، وَ قَدَّمَهَا وَ اَخَّرَهَا، وَ وَصَلَ بِالْمَوْتِ اَسْبَابَهَا، وَ جَعَلَهٗ خَالِجًا لِّاَشْطَانِهَا، وَ قَاطِعًا لِّمَرَآئِرِ اَقْرَانِهَا.

اور مخلوقات کی اجلوں کو بھی پیدا کیا جس سے کسی کو طولانی اور کسی کو کوتاہ اور کسی کو آگے اور کسی کو پیچھے کیا اور ان اجلوں کے اسباب کو موت سے ملا دیا اور اسی (موت) کو اجلوں کی رسیوں کا کھینچنے والا اور ان کے ریسمانوں کے اجزاء کا قطع کرنے والا بنایا۔

عَالِمُ السِّرِّ مِنْ ضَمَآئِرِ الْمُضْمِرِيْنَ، وَ

(وہ خدا)[1] چھپانے والوں کے

---

[1] علامہ ابن ابی الحدید معتزلی اس جگہ لکھتے ہیں:

اگر حضرت امیر المومنینؑ کے جد اعلیٰ نضر بن کنانہ اس کلام کو سنتے تو حضرت امیر المومنینؑ سے وہی کہتے جو علی ابن العباس بن جریح شاعر نے اسماعیل بن بلبل سے کہا تھا۔

قَالُوْا: اَبُو الصَّقْرِ مِنْ شَيْبَانَ قُلْتُ لَهُمْ كَلَّا وَلٰكِنْ لَعَمْرِيْ مِنْهُ شَيْبَانُ

وَ كَمْ مِنْ اَبٍ قَدْ عَلَا بِابْنٍ ذُرٰى شَرَفٍ كَمَا عَلَا بِرَسُوْلِ اللّٰهِ عَدْنَانُ

(بقیہ صفحہ آئندہ)

یعنی لوگوں نے کہا کہ ابوالصقر قبیلہ شیبان سے تھا تو میں نے ان سے کہا ہرگز نہیں بلکہ یوں کہو کہ ابوالصقر ہی سے قبیلہ شیبان تھا۔

نَجْوَى الْمُتَخَافِتِيْنَ، وَ خَوَاطِرِ رَجْمِ بھیدوں [1] اور آہستہ آہستہ باتیں کرنے والوں کی

اس لیے کہ دنیا میں بہت سے باپ ایسے ہوئے ہیں جو اپنے بیٹے کی وجہ سے عزت وشرف کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہوئے ہیں جس طرح رسول خدا کی وجہ سے جداعلیٰ عدنان کا نام آج تمام دنیا میں عزت وشرف سے لیا جاتا اور حضرتؐ ہی کی وجہ سے عدنان اور قحطان پر فخر کیا جاتا ہے۔

بلکہ حضرت علیؑ کی وجہ سے آپ کے جد بزرگوار جناب ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی آنکھ ٹھنڈی ہوتی ہے اور وہ نضر بن کنانہ حضرت ابراہیمؑ کو مبارکباد دے کر کہتے ہیں کہ آپ نے توحید خدا کی جو عمارت مضبوط کی تھی وہ کمزور نہیں ہوئی بلکہ خداوند عالم نے آپ کی نسل میں میرے صلب سے ایک ایسے فرزند کو پیدا کر دیا جس نے عرب کے زمانہ جاہلیت میں ایسے اعلیٰ درجہ کے علم توحید کو ایجاد کیا جس کو آپ نے بھی نبط کے زمانہ جاہلیت میں نہیں ظاہر کیا تھا۔ بلکہ اگر اس کلام کو ارسطو سن لیتا جو اس امر کا قائل تھا کہ خداوند عالم کو جزیات کا علم نہیں ہوتا ہے تو اس کا دل لرز جاتا اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے، اس کی عقل حیران ہو جاتی اور اس کی فکر مضطرب ہو جاتی۔ دیکھو تو حضرتؑ کے کلام میں رعب، تازگی، چمک دمک، بینہ وعظمت، نخامت، متانت، روانگی اور تاثیر کی کیسی عظیم الشان کیفیت بھری ہوئی ہے جو بیان نہیں ہو سکتی۔ علاوہ بریں اس کے الفاظ میں کس قدر شیرینی، رونق، لطف، نزاکت، سلامت کا ذخیرہ ہے میں تو دنیا میں کوئی کلام ایسا نہیں پاتا سوائے حضرت باری تعالیٰ کے کہ کلام کے وہی اس کے مشابہ ہے اور بس۔ اور کیوں نہ ہو کہ حضرت امیر المومنینؑ کا کلام تو اسی درخت کی ایک شاخ، اسی سمندر کا ایک دریا اور اسی روشنی کا ایک چمکتا ہوا جزو ہے۔

گویا حضرت امیر المومنینؑ نے اس کلام میں خداوند عالم کے اس ارشاد کی شرح کی ہے:

﴿وَ عِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ؕ وَ يَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ ؕ وَ مَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَ لَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَ لَا رَطْبٍ وَّ لَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ﴾

یعنی اسی خدا کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جن کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا اور جو کچھ خشکی اور تری میں ہے اس کو بھی وہی جانتا ہے اور کوئی پتہ بھی نہیں کھڑکتا مگر وہ اسے ضرور جانتا ہے اور نہ زمین کی تاریکیوں میں کوئی دانہ اور نہ کوئی ہری اور نہ کوئی خشک چیز ہے مگر یہ کہ وہ نورانی کتاب (لوح) محفوظ میں ضرور موجود ہے۔ (پارہ ۷ سورۂ انعام، آیہ ۷۰)

[1] ''نَجْوٰی'' کا معنی راز کی بات کرنا ہے اسی سے یہ حدیث ہے۔

اَنَّهٗ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اَطَالَ النَّجْوٰى مَعَ عَلِيٍّ عَلَيْهِ السَّلَامُ، فَقَالَ قَوْمٌ: لَقَدْ اَطَالَ الْيَوْمَ نَجْوَى ابْنِ عَمِّهٖ، فَبَلَغَهٗ ذٰلِكَ فَقَالَ: اِنِّيْ مَا انْتَجَيْتُهٗ، وَلٰكِنَّ اللّٰهَ انْتَجَاهُ۔

یعنی حضرت رسول خداؐ نے حضرت علی علیہ السلام سے دیر تک راز کی باتیں کی تو ایک جماعت صحابہ نے اعتراض کیا کہ آج حضرتؐ اپنے چچازاد بھائی (حضرت علیؑ) سے دیر تک راز کی باتیں کرتے رہے اس کی خبر حضرتؐ کو مل گئی تو فرمایا میں علیؑ سے راز کی باتیں نہیں کر رہا تھا بلکہ درحقیقت خدا ان سے سرگوشی کر رہا تھا۔

الظُّنُوْنِ، وَ عُقَدِ عَزِيْمَاتِ الْيَقِيْنِ، وَ مَسَارِقِ اِيْمَاضِ الْجُفُوْنِ، وَ مَا ضَمِنَتْهُ اَكْنَانُ الْقُلُوْبِ وَ غَيَابَاتُ الْغُيُوْبِ، وَ مَآ اَصْغَتْ لِاسْتِرَاقِهٖ مَصَآئِخُ الْاَسْمَاعِ، وَ مَصَآئِفِ الذَّرِّ، وَ مَشَاتِي الْهَوَامِّ، وَ رَجْعِ الْحَنِيْنِ مِنَ الْمُوْلَهَاتِ، وَ هَمْسِ الْاَقْدَامِ، وَ مُنْفَسَحِ الثَّمَرَةِ مِنْ وَلَآئِجِ غُلُفِ الْاَكْمَامِ، وَ مُنْقَمَعِ الْوُحُوْشِ مِنْ غِيْرَانِ الْجِبَالِ وَ اَوْدِيَتِهَا، وَ مُخْتَبَإِ الْبُعُوْضِ بَيْنَ سُوْقِ الْاَشْجَارِ وَ اَلْحِيَتِهَا، وَ مَغْرَزِ الْاَوْرَاقِ مِنَ الْاَفْنَانِ، وَ مَحَطِّ الْاَمْشَاجِ مِنْ مَّسَارِبِ الْاَصْلَابِ، وَ نَاشِئَةِ الْغُيُوْمِ وَ مُتَلَاحِمِهَا، وَ دُرُوْرِ قَطْرِ السَّحَابِ فِيْ مُتَرَاكِمِهَا، وَ مَا تَسْفِي الْاَعَاصِيْرُ بِذُيُوْلِهَا، وَ تَعْفُو الْاَمْطَارُ بِسُيُوْلِهَا، وَ عَوْمِ بَنَاتِ الْاَرْضِ فِيْ كُثْبَانِ الرِّمَالِ، وَ مُسْتَقَرِّ ذَوَاتِ الْاَجْنِحَةِ بِذُرٰى شَنَاخِيْبِ الْجِبَالِ، وَ تَغْرِيْدِ ذَوَاتِ الْمَنْطِقِ فِيْ دَيَاجِيْرِ الْاَوْكَارِ، وَ مَآ اَوْعَبَتْهُ الْاَصْدَافُ، وَ حَضَنَتْ عَلَيْهِ اَمْوَاجُ الْبِحَارِ، وَ مَا غَشِيَتْهُ سُدْفَةُ لَيْلٍ، اَوْ ذَرَّ عَلَيْهِ شَارِقُ نَهَارٍ، وَ مَآ اعْتَقَبَتْ عَلَيْهِ اَطْبَاقُ

سرگوشیوں اور گمانوں میں خطور کرنے والی چیزوں اور پختہ یقین کی رایوں اور پلکوں سے اشارہ بازی کی چوریوں اور ان چیزوں کے بھید کو جنھیں دلوں کے پردے اور غیب کی پوشیدگیاں چھپائے ہوئے ہیں اور اس چیز کو جسے چوری سے سننے کے لیے کانوں کے سوراخ متوجہ ہوتے ہیں اور چیونٹیوں کے موسم گرما میں رہنے کے مقاموں اور حشرات الارض کی موسم سرما میں رہنے کی جگہوں اور مدہوش مخلوق کے گڑگڑانے اور قدموں کی آہٹ اور خوشوں کے غلافوں کے تہوں میں پھل کے پھوٹنے کی جگہ اور پہاڑوں کے غاروں اور وادیوں میں وحشی جانوروں کے گھسنے کے مقام اور درختوں کے تنوں اور ریشوں کے درمیان مچھروں کے چھپنے کے سوراخ اور شاخوں کے پتوں کی جڑ اور (رحموں و) صلبوں کے کی راہوں سے مخلوط منی کے گرنے کی جگہ اور ظاہر ہونے اور آپس میں ملنے والے اَبروں اور اپنے پے در پے گرنے کی جگہوں میں قطرات باران کی ریزش اور ان چیزوں کو جنہیں بگولے اپنے دامنوں سے اڑا کر پراگندہ کر دیتے اور بارشیں اپنے سیلابوں سے مٹا دیتی ہیں اور ریگ کے ٹیلوں میں جو حشرات الارض رینگتے پھرتے ہیں اور پہاڑوں کی اونچی اور بلند چوٹیوں پر پرندوں کے بسیرے کے مقام اور آشیانوں کی تاریکیوں میں خوش الحان چڑیوں کے چہچہانے اور ان (موتیوں) کو جنہیں صدفوں نے چھپا رکھا ہے اور سمندروں کی موجیں جن کی پرستاری کر رہی ہیں اور جن چیزوں کو رات کی تاریکی نے ڈھانک لیا ہے یا جن

الدَّيَاجِيْرِ، وَ سُبُحَاتُ النُّوْرِ، وَ اَثَرِ كُلِّ خَطْوَةٍ، وَ حِسِّ كُلِّ حَرَكَةٍ، وَ رَجْعِ كُلِّ كَلِمَةٍ، وَ تَحْرِيْكِ كُلِّ شَفَةٍ، وَ مُسْتَقَرِّ كُلِّ نَسَمَةٍ، وَ مِثْقَالِ كُلِّ ذَرَّةٍ، وَ هَمَاهِمِ كُلِّ نَفْسٍ هَامَّةٍ، وَ

پر دن کا آفتاب چمکتا ہے اور جن چیزوں پر متواتر تاریکی کے پردے یا نور کی شعائیں پڑتی ہیں اور ہر قدم کے نشان[1] اور ہر حرکت کی حِس اور ہر کلمہ کی آواز اور ہر لب کی جنبش اور ہر جاندار کے رہنے کی جگہ اور ہر ذرّہ کے وزن اور ہر فکر کرنے والے نفس کی فکروں اور جو کچھ اس (زمین)

---

[1] ''مُثَرَاكِمٌ''، معنی تہ برتہ۔ ''تَسْفِيْ''، معنی خاک اڑاتی تھیں۔ ''اَعَاصِيْرُ''، جمع ہے اعصار کی معنی بگولہ، گرد بار یعنی وہ ہوا جو غبار کو اڑاتی ہے تو وہ غبار آسمان کی طرف بلند ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ﴾

یعنی اک بارگی اس پر ایسا بگولا آپڑا جس میں آگ بھری تھی کہ وہ باغ جل کر بھن کر رہ گیا۔ (سورۂ بقرہ، آیہ ۲۶۶)

''عَوْمٌ''، معنی تیرنا اور کشتی یا جانور کے بھی پانی میں چلنے کو ''عَوْمٌ'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ ''تَغْرِيْدٌ''۔ معنی پرندے کا بلند آواز سے طرب میں آکر گانا۔ ''ذَوَاتِ الْمَنْطِقِ''۔ معنی بولنے والے۔ اور یہ صفت اگرچہ درحقیقت انسان کے لیے استعمال کی جاتی ہے کیونکہ انسان ہی کی بولی کو منطق کہتے ہیں مگر یہاں مراد پرندے ہیں اور ان کی بولی کو حضرتؑ نے مجازاً منطق سے تعبیر فرمایا ہے۔ ''دَيَاجِيْرٌ''، جمع ہے دیجور کی معنی تاریکی، اندھیری۔ ''اَوْكَارٌ''، جمع ہے وِکْرٌ کی۔ معنی جھونجھ، گھونسلا۔ ''اَوْعَبَتْهُ الْاَصْدَافُ''۔ یعنی جن کو صدفوں نے جمع کیا، گھیر لیا۔ اس لفظ کا معنی لکھتے ہوئے جناب مولوی وحید الزمان خان صاحب انوار اللغۃ پارہ ۲۶ صفحہ ۶۹ میں لکھتے ہیں:

اَوْعَبَ الْاَنْصَارُ مَعَ عَلِيٍّ يَوْمَ صِفِّيْنَ۔

سارے انصار صفین کی جنگ میں حضرت علیؑ کے ساتھ تھے اسی طرح سارے مہاجرین اور اہل بدر اور بڑے بڑے اصحاب اور تابعین اور اولیاء اللہ سب حضرت علیؑ کے ساتھ تھے اور معاویہ کے ساتھ دو تین صحابہ کے سوا کوئی بڑے لوگ نہ تھے اور یہ بھی دنیا کی طمع سے ان کے ساتھ ہو گئے تھے۔

''حَضَنَتْ''۔ حَضْنٌ معنی گود میں لینا، پالنا، انڈے سینا۔ انوار اللغۃ میں ہے:

اَنَّهٗ خَرَجَ مُحْتَضِنًا اَحَدَ ابْنَيْ اِبْنَتِهٖ۔

آنحضرتؐ برآمد ہوئے اپنے ایک نواسہ کو گود میں لیے ہوئے امام حسنؑ یا امام حسینؑ کو۔۔۔ (پارہ ۶ صفحہ ۹۲) ''سُدْفَةٌ''، معنی تاریکی اندھیری۔ انوار اللغۃ میں ہے:

''سُدَفٌ''، تاریکی، روشنی صبح اس کی آمد رات اس کی تاریکی۔ ''قَدْ وَجَّهْتِ سَدَافَتَهٗ''۔ بی بی ام سلمہؓ نے حضرت عائشہ سے کہا تم نے تو پردہ آپ کا ہٹا دیا۔ پردے کی طرف رخ کیا اس کو اپنی جگہ سے سرکا دیا۔ یعنی تم کو گھر بیٹھنے کا حکم تھا تم بصرہ گئیں اور جنگ میں شریک ہوئیں''۔ (پارہ ۱۲ صفحہ ۵۶)

مَا عَلَيْهَا مِنْ ثَمَرِ شَجَرَةٍ، اَوْ سَاقِطِ وَرَقَةٍ، اَوْ قَرَارَةِ نُطْفَةٍ، اَوْ نُقَاعَةِ دَمٍ وَّ مُضْغَةٍ، اَوْ نَاشِئَةِ خَلْقٍ وَّ سُلَالَةٍ.

پر ہے خواہ وہ کسی درخت کا پھل ہو یا گرا ہوا پتہ یا نطفہ ٹھہرنے کی جگہ یا خون اور لوتھڑے کے رہنے کا سوراخ یا ظاہر ہونے والی مخلوق اور (مخلوقات کے) نتیجے۔

لَمْ تَلْحَقْهُ فِيْ ذٰلِكَ كُلْفَةٌ، وَ لَا اعْتَرَضَتْهُ فِيْ حِفْظِ مَا ابْتَدَعَ مِنْ خَلْقِهٖ عَارِضَةٌ، وَ لَا اعْتَوَرَتْهُ فِيْ تَنْفِيْذِ الْاُمُوْرِ وَ تَدَابِيْرِ الْمَخْلُوْقِيْنَ مَلَالَةٌ وَّ لَا فَتْرَةٌ، بَلْ نَفَذَهُمْ عِلْمُهٗ، وَ اَحْصَاهُمْ عَدُّهٗ، وَ وَسِعَهُمْ عَدْلُهٗ، وَ

(ان سب کو وہ اچھی طرح جانتا ہے) ان باتوں (کے جاننے) میں اسے کوئی زحمت نہیں ہوتی اور جس مخلوق کو اس نے ایجاد کیا ہے اس کی حفاظت میں اسے کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ نہ اپنے امور کے جاری کرنے اور مخلوقوں کی تدبیروں میں اسے کوئی دل تنگی یا سُستی طاری ہوتی ہے [1] بلکہ ان پر اس کا علم حاوی ہو گیا اور اس کے شمار کرنے نے ان کو گن لیا اور اس کا انصاف ان پر وسیع ہو گیا اور اس کے

---

[1] ''نَسَمَةٌ''۔ معنی جان، نفس، روح، جاندار۔ انوار اللغۃ میں ہے:

وَالَّذِیْ خَلَقَ الحَبَّةَ، وبَرَاَ النَّسَمَةَ۔

قسم اس پروردگار کی جس نے دانہ چیرا اس کو اگایا اور جاندار کو پیدا کیا۔

حضرت علیؑ اکثر اسی طرح قسم کھاتے تھے۔

﴿وَ مِثْقَالِ كُلِّ ذَرَّةٍ﴾ (پارہ ۲۵، آیہ ۵۶)

یعنی ہر ذرہ کے وزن کے برابر، مثقال ہر چیز کے وزن کو کہتے ہیں۔

چنانچہ قرآن مجید میں ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ﴾ (سورۂ النساء، آیہ ۴۰)

یعنی خدا تو ہرگز ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا۔

''هَمَاهِمُ''، جمع ہے هَمْهَمَةٌ کی اور یہ اصل میں گائے کی آواز کو کہتے ہیں، پھر مطلقاً آہستہ آہستہ گنگنانے، عورت کے بچہ کو باریک آواز سے سلانے کو مھمہ کہنے لگے۔ ''قَرَارَةِ نُطْفَةٍ''۔ معنی وہ جگہ جہاں پانی ٹھہرتا ہے کیونکہ نطفہ معنی پانی بھی آیا ہے۔ چنانچہ اسی نہج البلاغہ میں اس کے پہلے یہ لفظ نطفہ اسی پانی کے معنی میں گزر گیا ہے اور ہو سکتا ہے کہ یہاں نطفہ سے مراد منی اور ''قَرَارَةِ نُطْفَةٍ'' سے مراد نطفہ کے ٹھہرنے کی جگہ ہو۔ ''نُقَاعَةٌ''، معنی وہ سوراخ جہاں خون جمع ہوتا ہے۔ ''سُلَالَةٌ''، مشتق ہے سَل سے جس کا معنی سونت لینا۔ نرمی سے نکال لینا ہے تو سلالۃ معنی سونتا، نرمی سے نکالا ہوا۔ چونکہ لڑکا بھی ماں باپ سے نکالا جاتا ہے لہٰذا ان کا سُلَالہ کہا جاتا ہے۔ ''اِعْتَوَرَتْ''۔ معنی لاحق ہوا، پیش آیا۔

غَمَرَهُمْ فَضْلُهٗ، مَعَ تَقْصِيْرِهِمْ عَنْ كُنْهِ مَا هُوَ اَهْلُهٗ.

فضل نے انہیں ڈھانک لیا باوجود یکہ جس بات کا وہ اہل ہے اس کی (اطاعت کی) تہ سے ان لوگوں نے کوتاہی کی۔

اَللّٰهُمَّ اَنْتَ اَهْلُ الْوَصْفِ الْجَمِيْلِ، وَ

اے خدا[1] تو خوبی ہی سے ذکر کیے جانے اور بکثرت

---

[1] ''فَتْرَةٌ''، معنی سستی، ضعف۔ ''نَفَذَ''، معنی جاری کیا۔ ''وَصْفٌ جَمِيْلٌ''۔ یعنی اس کی صفت اعلیٰ درجہ کی ہے اور یہی مطلب ہے عدل کا کہ اس میں کوئی برائی نہیں ہے ہر طرح اس کا کام اور اس کی صنعت اچھی ہی اچھی ہے حضرات اہل سنت خدا کے ہاتھ، پاؤں، آنکھ، کان کے قائل ہیں تو خدا کی خوبصورتی کا اعتقاد کیوں نہ رکھیں گے۔ چنانچہ انوار اللغۃ میں ہے:

اِنَّ اللّٰهَ جَمِيْلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ۔

اللہ تعالیٰ صاحب جمال ہے یعنی اوصاف کاملہ سے موصوف ہے یا جس کی کل باتیں اس کی ذات مقدس میں موجود ہیں۔

فائدہ جہمیہ اور منکرین صفات نے اس حدیث کا بھی انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ خبر واحد ہے اس پر بھروسا نہیں ہوسکتا اللہ کی طرف جمال کی نسبت نہیں کر سکتے۔ ارے بے وقوف جب اللہ تعالیٰ کے ہاتھ، پاؤں، آنکھیں، منہ سب شریعت سے ثابت ہیں تو جمال میں کیا شک ہے، بے شک وہ صاحب جمال ہے آخرت میں اس کا حسن و جمال دیکھ کر سب مومن فریفتہ ہوں گے اور اس کے دیدار سے ایسی خوشی ہوگی کہ دوسری بہشت کی سب نعمتیں بے حقیقت ہو جائیں گی مگر یہ کمبخت جہمیہ اور معتزلہ اس نعمت سے محروم رہیں گے۔ دوسری حدیث میں ہے کہ دجال کانا ہوگا اور تمہارا پروردگار کانا نہیں ہے۔ یہ بھی ارشاد ہے اس کے جمال کی طرف۔ مومنین کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ جس پروردگار نے ایسے جمیل اور حسین انسان اور جانور، پرند اور چرند پیدا کیے ہیں وہ جب اپنے تئیں کسی صورت میں ظاہر کرے گا تو وہ صورت کیسی حسین اور جمیل ہوگی'' (پارہ ۵ صفحہ ۷۷) اور علامہ موصوف نے اپنی ایک اور کتاب ہدیۃ المہدی میں بھی بکثرت ایسے ہی مضامین لکھے ہیں۔ چنانچہ صفحہ ۱۰ میں لکھتے ہیں'' خدا کی شکل وصورت نہایت حسین وجمیل ہے وہ جس شکل وصورت میں چاہے روشن اور ظاہر ہوسکتا ہے اور اس خداوند عالم کے لیے تمام اعضاء ہیں مثلاً منہ، آنکھ ہاتھ، ہتھیلی، مٹھی، انگلیاں، بازو، بانہ، سینہ، پہلو، کمر، قدم، پاؤں، پنڈلی، مونڈھا جیسا کہ اس کی ذات کے لائق ہے۔ اور علامہ شہرستانی ملل نحل صفحہ ۷۸ میں بعض علمائے اسلام کا قول نقل کرتے ہیں کہ

اُعْفُوْنِيْ عَنِ الْفَرْجِ وَ اللِّحْيَةِ وَاسْأَلُوْنِيْ عَمَّا وَرَاءَ ذٰلِكَ۔

یعنی خدا کی داڑھی اور شرمگاہ کے متعلق تو مجھ سے کچھ نہ پوچھو مجھے معاف کرو، ان دونوں کے علاوہ خدا کے ہر بدن کو مجھ سے پوچھ سکتے ہو۔

اور علامہ سیوطی ''لآلی مصنوعہ'' صفحہ ۱۳ میں لکھتے ہیں:

رَاَيْتُ رَبِّيْ فِيْ صُوْرَةِ شَابٍّ ذَا وَفْرَةٍ وَ رُوِيَ فِيْ صُوْرَةِ شَابٍّ اَمْرَدَ۔

یعنی میں نے اپنے پروردگار کو ایک جوان کی صورت میں دیکھا جس کے بال گھونگر والے تھے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ میں نے خدا کو بے داڑھی، مونچھ والے جوان لونڈے کی صورت میں دیکھا ہے۔

التَّعْدَادِ الْكَثِيْرِ. اِنْ تُؤَمَّلْ فَخَيْرُ مَأْمُوْلٍ، وَ اِنْ تُرْجَ فَاَكْرَمُ مَرْجُوٍّ.

(بلکہ) بے شمار کمالات کا اہل ہے۔ اگر تجھ سے امید کی جائے تو اس کا بہترین برلانے والا اور اگر تجھ سے آس لگائی جائے تو نہایت کرم سے اس کا پورا کرنے والا ہے۔

اَللّٰهُمَّ وَ قَدْ بَسَطْتَّ لِيْ فِيْمَا لَآ اَمْدَحُ بِهٖ غَيْرَكَ، وَ لَآ اُثْنِيْ بِهٖ عَلٰٓى اَحَدٍ سِوَاكَ، وَ لَآ اُوَجِّهُهٗٓ اِلٰى مَعَادِنِ الْخَيْبَةِ وَ مَوَاضِعِ الرِّيْبَةِ، وَ عَدَلْتَ بِلِسَانِيْ عَنْ مَّدَآئِحِ الْاٰدَمِيِّيْنَ، وَ الثَّنَآءِ عَلَى الْمَرْبُوْبِيْنَ الْمَخْلُوْقِيْنَ.

اے خدا تو نے میرے لیے اس چیز میں کشادگی پیدا کر رکھی ہے جس سے میں تیرے سوا کسی کی مدح اور تیرے سوا کسی کی تعریف نہیں کر سکتا اور اس کو میں نا امیدی کے خزانوں اور تہمت کی جگہ کی طرف نہیں پھیر سکتا اور تو نے میری زبان کو آدمیوں کی مدحوں اور پروردہ مخلوقوں کی تعریف سے موڑ دیا ہے۔

اَللّٰهُمَّ وَ لِكُلِّ مُثْنٍ عَلٰى مَنْ اَثْنٰى عَلَيْهِ مَثُوْبَةٌ مِّنْ جَزَآءٍ، اَوْ عَارِفَةٌ مِّنْ عَطَآءٍ، وَ قَدْ رَجَوْتُكَ دَلِيْلًا عَلٰى ذَخَآئِرِ الرَّحْمَةِ وَ كُنُوْزِ الْمَغْفِرَةِ.

اے خدا اور ہر مدح وثنا کرنے والے کا اس شخص پر جس کی اس نے مدح کی ہے کوئی اجر ہوتا ہے جو خواہ بڑی جزا ہو یا بخشش کا کوئی احسان۔ تو میں نے تجھ سے رحمت کے ذخیروں اور بخشش کے خزانوں کی طرف رہبری کی امید کی ہے۔

اَللّٰهُمَّ وَ هٰذَا مَقَامُ مَنْ اَفْرَدَكَ بِالتَّوْحِيْدِ الَّذِيْ هُوَ لَكَ، وَ لَمْ يَرَ مُسْتَحِقًّا لِّهٰذِهِ الْمَحَامِدِ وَ الْمَمَادِحِ غَيْرَكَ، وَ بِيْ فَاقَةٌ اِلَيْكَ لَا يَجْبُرُ مَسْكَنَتَهَا اِلَّا فَضْلُكَ، وَ لَا

اے خدا اور یہ اس شخص کی جائے قیام ہے جس نے تجھ کو اس توحید کے ساتھ یکتا سمجھ لیا ہے[1] جو تیرے ہی لائق ہے اور تیرے سوا (کسی) کو بھی ان تعریفوں اور مدحوں کا مستحق نہیں پایا۔ اور (اے خدا) مجھے تیری طرف وہ احتیاج ہے جس کی مفلسی کو تیرے فضل کے سوا کوئی چیز

---

[1] اس جائے قیام سے حضرتؑ نے اپنے قیام کی جگہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ اے خدا تیری درگاہ میں کھڑا ہو کر جو شخص (یعنی یہ حقیر بندہ) دعا کر رہا ہے اس نے تیرے سوا کسی کو خدا اور یکتا نہ مانا جو حضرتؑ کے بچپن سے مسلمان ہونے کی بین دلیل ہے کیونکہ اگر حضرتؑ کبھی بھی کسی اور چیز کو اپنا معبود سمجھے ہوتے تو یہ نہیں فرماتے کہ اس نے تیرے سوا کسی کو اس کا اہل نہیں پایا جو زمانہ ماضی کی حالت کا پتہ دے رہا ہے بلکہ یہ فرماتے کہ اب یہ تیرے سوا کسی کو ان تعریفوں کا مستحق نہیں پاتا۔ پھر جو لوگ دوسرے شخص کو کہتے ہیں کہ حضرتؑ سے پہلے مسلمان ہوئے وہ کیسی غلطی کرتے ہیں۔

يَنْعَشُ مِنْ خَلَّتِهَا اِلَّا مَنُّكَ وَ جُوْدُكَ، فَهَبْ لَنَا فِيْ هٰذَا الْمَقَامِ رِضَاكَ، وَ اَغْنِنَا عَنْ مَّدِّ الْاَيْدِيْ اِلٰى مَنْ سِوَاكَ، ﴿اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾!.

دور نہیں کرسکتی اور جس کے فقر کو کوئی چیز تیرے فضل واحسان کے سوا اٹھا نہیں سکتی تو ہمیں اس جگہ اپنی خوشی مرحمت فرما اور اپنے سوا (دوسروں) کے آگے ہاتھ پھیلانے سے بے نیاز کردے کیونکہ یقیناً تو ہر چیز پر قادر ہے۔

❁ خطبہ: ۹۰ ❁

وَ مِنْ كَلَامٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

لَمَّآ اَرَادَهُ النَّاسُ عَلَى الْبَيْعَةِ بَعْدَ قَتْلِ عُثْمَانَ:

خطبہ (۹۰)

اور حضرت علیہ السلام کے کلام کا کچھ حصّہ۔

(حضرت) عثمان کے قتل ہونے پر لوگوں نے حضرت (امیر المومنینؑ) کی بیعت کرنی چاہیے (تو فرمایا): [1]

---

[1] ۱۸ ذی الحجہ ۳۵ھ کو حضرت عثمان مدینہ منورہ میں قتل کیے گئے اور اس وقت دنیائے اسلام کی عجب پر آشوب اور تلاطم خیز حالت ہو رہی تھی اس وقت عامہ مسلمین نے حضرت امیر المومنینؑ سے اقرار کیا کہ آپ خلافت کو قبول کریں مگر حضرتؑ نے انکار کیا کیونکہ حضرت عثمان نے لوگوں کا مزاج بدل دیا، ان کے خیالات متغیر کر دیے، ان کے تدین اور ایمانداری کو کچھ اور ہی کر دیا تھا، اس وقت بروایت مروج الذہب وتاریخ الخمیس وغیرہ، تمام اشراف قبائل مصر وکوفہ وبصرہ بلکہ تقریباً کل اصحاب جناب رسالت مآبؐ حضرتؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ مسلمانوں کے لیے کسی امام اور خلیفہ کا ہونا ضروری ہے اور بلحاظ شرف، نسب، وحسب وقرابت جناب رسالت مآبؐ اور پیروی آنحضرتؐ اور کمال علم وفضل وزکاوت وفراست اور زیادتی حلم وحسن تدبیر وعلو مراتب ودرجات اور زہد وورع و تقویٰ وخوفِ خدا وترک مزخرفات دنیویہ واصلاح امت واقامۃ شریعت کوئی شخص بھی آپ سے زیادہ خلافت کا اہل نہیں ہے۔ لہٰذا ہم سب کی تمنا ہے کہ آپ اس کو منظور فرمائیں گے۔ اس وقت حضرتؑ نے ان سے فرمایا کہ بھائیو مجھے چھوڑ دو اور جس طرح قول خدا اور رسولؐ کی مخالفت کر کے تم لوگوں نے پہلی دوسری اور تیسری دفعہ دوسرے لوگوں کو خلیفہ بنا لیا حالانکہ حضرت رسول خداؐ ابتدا سے آخر تک میری خلافت کو تم لوگوں پر ثابت کرتے رہے تھے، چنانچہ آیہ ﴿وَ اَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ﴾ (سورۂ الشعراء، آیہ ۲۱۴) کے نازل ہونے پر جب حضرتؐ نے عام طور پر دعوت اسلام شروع کی اور حاضرین سے دریافت کیا کہ کون شخص اس کام میں میرا ہاتھ بٹاتا ہے اور میرے سوا کوئی اس مجمع میں نہیں بولا تو حضرتؐ نے میرے بارے میں صاف صاف فرما دیا۔

هٰذَا اَخِيْ وَخَلِيفَتِيْ وَ وَصِيِّ وَ وَزِيرِيْ فِيكُمْ، فَاسْمَعُوْهُ وَاَطِيْعُوْهُ۔

کہ یہ علی ابن ابی طالبؑ میرے بھائی میرے خلیفہ میرے وصی اور میرے وزیر ہیں تم میں، تم سب ان کی ہر بات سنو اور اطاعت کرو۔

(بقیہ صفحہ آئندہ)

دَعُوْنِیْ وَ الْتَمِسُوْا غَیْرِیْ، فَاِنَّا مُسْتَقْبِلُوْنَ اَمْرًا لَّهٗ وُجُوْهٌ وَّ اَلْوَانٌ، لَا تَقُوْمُ لَهُ الْقُلُوْبُ، وَ لَا تَثْبُتُ عَلَیْهِ

مجھے چھوڑ دو اور میرے سوا (کسی اور) سے خواہش کرو کیونکہ ہم اس امر (انقلاب) کا سامان پاتے ہیں جس کی (مختلف) صورتیں اور (عجیب وغریب) رنگ ہیں کہ

پھر مکہ معظّمہ سے ہجرت کرتے وقت مجھے مکہ میں اپنا عملی خلیفہ بنایا پھر غزوۂ تبوک کو جاتے وقت مجھے اپنا عملی خلیفہ بنایا اور فرمایا۔

اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُّوْسٰی۔

پھر غدیر خم میں مجھے منبر پر نصب کر کے اور تمام مسلمانوں کو دکھا کر فرمادیا۔

مَنْ کُنْتُ مَوْلَاهُ، فَهٰذَا عَلِیٌّ مَوْلَاهُ۔

جس کا آقا اور پیشوا میں ہوں اس کے آقا اور پیشوا یہ علی بھی ہیں۔

لیکن تم لوگوں نے ان سب نصوص اور تاکیدات اور احکام خدا اور رسولؐ کو پس پشت ڈال کر اپنی خواہش کی پیروی کی تو اب اسلام کی اس قدر حالت بدلنے اور تمام اوصاف حمیدہ کے زائل ہوجانے پر مجھے کیوں اختیار کرتے ہو؟ جب میں حضرت رسول خداؐ کا خلیفہ رہتا تو جو نفع آنحضرتؐ سے تم کو تھا وہ مجھ سے بھی پہنچتا مگر اب ان خلفاء ثلاثہ کی خلافت کرنی ہے تو جو منافع ان سے لوگوں کو حاصل ہوتے تھے انہیں فوائد کی خواہش اب مجھ سے بھی کی جائے گی اور میں احکامِ خدا اور رسولؐ کے خلاف کچھ نہیں کرسکتا۔ چنانچہ اسی مضمون کو اس زمانہ کا بہت بڑا اور وسیع النظر عربی مؤرخ علامہ جرجی زیدان (جس کا مذہب عیسائی ہے) اپنی قابل قدر کتاب تاریخ وتمدن الاسلامی مطبوعہ مصر جلد ۴ صفحہ ۳۷ میں لکھتا ہے:

اَمَّا عَلِیٌّ فَحِکَایَاتُهٗ فِی الزُّهْدِ وَالتَّقْوٰی کَثِیْرَةٌ، وَکَانَ شَدِیْدَ التَّمَسُّكِ بِالْاِسْلَامِ، حُرُّ الْقَوْلِ وَالْفِعْلِ، لَا یَعْرِفُ الدُّهَاءَ وَلَا یَرْکَنُ اِلَی الْحِیْلَةِ فِیْ شَاْنٍ مِنَ الشُّؤُوْنِ، وَاِنَّمَا هَمُّهُ الدِّیْنُ وَعِمَادَتُهٗ فِیْ اَعْمَالِهِ الصِّدْقُ وَالْحَقُّ....وَکَانَ شَدِیْدًا فِیْ مُحَاسَبَةِ رِجَالِهٖ حِرْصًا عَلَی الْعَدْلِ وَالْحَقِّ....وَلَوْ تَوَلّٰی اُمُوْرَ الْمُسْلِمِیْنَ .... وَالنَّاسُ فِیْ دَهْشَةِ النُّبُوَّةِ وَصِدْقِ التَّدَیُّنِ، لَکَانَ نَصِیْبُهٗ مِنَ الْحُکْمِ اَطْوَلَ، وَلَمَّا بَدَا فِیْ تَدْبِیْرِهٖ ضَعْفٌ، وَلٰکِنَّهٗ تَوَلَّاهَا وَقَدْ فَسَدَتِ النِّیَّاتُ، وَطَمَعَ الْعُمَّالُ فِی الْاَحْکَامِ.

یعنی حضرت علیؑ کے واقعات زہد وتقوی بہت ہیں اور آپ اسلامی حدود کو پکڑے رہنے میں بہت سخت تھے نہایت آزاد قول اور فعل کے تھے کہ کسی حالت اور کیسی ہی مصیبت میں بھی کسی حیلہ کو کام میں نہیں لاتے تھے بلکہ مکر وحیلہ کو تو حضرتؑ جانتے تک نہیں تھے۔ آپ کی تمام کوشش دین کو قائم کرنا اور آپ کا اعتماد ہر کام میں سچائی اور حق ہی پر تھا۔ آپ عاملوں کا حساب لینے میں بڑے پابند تھے کیونکہ آپ خود حق اور انصاف کے شدید حریص تھے، جب لوگوں میں نبوت کا رعب اور سچا تدین باقی تھا آپ خلیفہ ہوتے تو آپ کی خلافت کا زمانہ بہترین اور آپ کی حکومت کا عہد سب سے اعلیٰ ثابت ہوتا اور آپ کی تدبیروں میں کوئی ضعف نہیں ظاہر ہوتا، لیکن افسوس حضرتؑ کو تو اس وقت خلافت ملی جب لوگوں کی نیتیں بگڑ گئی تھیں اور احکام میں عامل لوگ نہایت لالچی ہوگئے تھے۔

الْعُقُوْلُ، وَ اِنَّ الْاٰفَاقَ قَدْ اَغَامَتْ، وَ الْمَحَجَّةَ قَدْ تَنَكَّرَتْ.

وَ اعْلَمُوْٓا اَنِّیْٓ اِنْ اَجَبْتُكُمْ رَكِبْتُ بِكُمْ مَآ اَعْلَمُ، وَ لَمْ اُصْغِ اِلٰی قَوْلِ الْقَآئِلِ وَ عَتْبِ الْعَاتِبِ، وَ اِنْ تَرَكْتُمُوْنِیْ فَاَنَا كَاَحَدِكُمْ، وَ لَعَلِّیْٓ اَسْمَعُكُمْ وَ اَطْوَعُكُمْ لِمَنْ وَّلَّيْتُمُوْهُ اَمْرَكُمْ، وَ اَنَا لَكُمْ وَزِيْرًا، خَيْرٌ لَّكُمْ مِنِّیْٓ اَمِيْرًا!.

دل اس کے لیے آمادہ نہیں ہو سکتے اور عقلیں اس پر ثابت نہیں رہ سکتیں۔ اب تو تمام اطراف (اسلام) پر آشوب اور سیدھا راستہ بھیانک ہو گیا ہے۔

اور (یہ بھی) جان لو کہ اگر میں تمہاری استدعا قبول کر لوں تو تمہیں اسی راستہ پر لے چلوں گا جس کو خود جانتا ہوں اور کسی قائل کی بات اور شکایت کرنے والے کے اعتراض کی طرف توجہ بھی نہیں کروں گا۔ لیکن اگر تم لوگ مجھے چھوڑ دو گے تو پھر میں تم ہی جیسا ایک شخص ہوں اور جس کو تم لوگ اپنا حاکم مقرر کرو گے شاید میں تم سب سے زیادہ اس کی بات سننے اور ماننے والا ہوں۔ غرض اب میں (تمہاری دنیا کے لیے) تمہارا وزیر ہو کر بہتر ہوں گا اس سے کہ تمہارا امیر بنوں۔[1]

❁ خطبہ :۹۱ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

اَمَّا بَعْدَ حَمْدِاللّٰهِ وَالثَّنَاءِ عَلَيْهِ اَيُّهَا النَّاسُ! فَاِنِّیْ فَقَاْتُ عَيْنَ الْفِتْنَةِ، وَ لَمْ يَكُنْ لِّيَجْتَرِئَ عَلَيْهَآ اَحَدٌ غَيْرِیْ بَعْدَ اَنْ مَّاجَ غَيْهَبُهَا، وَ اشْتَدَّ كَلَبُهَا.

فَاسْئَلُوْنِیْ قَبْلَ اَنْ تَفْقِدُوْنِیْ، فَوَ

خطبہ (۹۱)

اور حضرت علیہ السلام کے ایک خطبہ کا کچھ حصّہ۔

لوگو! خدا کے حمد اور تعریف کے بعد (تمہیں معلوم ہو کہ) میں نے فتنہ و فساد کی آنکھ پھوڑ ڈالی ہے اور جب اس کی ظلمت چھا گئی تھی اور اس کے کانٹے کا زہر تیز ہو گیا تھا تو میرے سوا کسی کو بھی اس پر جرأت نہیں ہوتی تھی۔

پس (جو کچھ پوچھنا ہو) مجھ سے پوچھ لو قبل اس کے کہ

---

[1] حضرتؑ نے جو فرمایا کہ اب میرا وزیر ہونا بہتر ہے تمہارے امیر ہونے سے۔ اس سے بھی حضرتؑ نے اپنی کمال دور اندیشی اور فتنہ و فساد و جنگ و جدال سے نفرت اور علیحدگی کو ظاہر فرمایا ہے اور اس کو کہ آپ کو خلافت کی ذرہ برابر طمع نہیں تھی نہ اس سے کسی قسم کا نفع حاصل کرنے کا خیال تھا۔ (اس پر تفصیلی مضمون ضمیمہ میں آئے گا انشاء اللہ)

الَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ! لَا تَسْئَلُوْنِیْ عَنْ شَیْءٍ فِیْمَا بَیْنَکُمْ وَ بَیْنَ السَّاعَةِ، وَ لَا عَنْ فِئَةٍ تَھْدِیْ مِائَةً وَ تُضِلُّ مِائَةً اِلَّآ اَنْبَاْتُکُمْ بِنَاعِقِھَا وَ قَآئِدِھَا وَ سَآئِقِھَا، وَ مُنَاخِ رِکَابِھَا، وَ مَحَطِّ رِحَالِھَا، وَ مَنْ یُّقْتَلُ مِنْ اَھْلِھَا قَتْلًا وَ مَنْ یَّمُوْتُ مِنْھُمْ مَوْتًا.

میں تم میں سے اُٹھ جاؤں کیونکہ اس (ذات) کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے تم مجھ سے کسی چیز کا سوال نہیں کرو گے جو تمہارے اور قیامت کی درمیان ہونے والی ہے اور نہ کسی گروہ سے جو سو کی ہدایت اور سو کو گمراہ کرے گا مگر یہ کہ میں اس کے پکارنے والے، کھینچنے والے، ہنکانے والے، اس کی سواریوں کے ٹھہرنے اور سامانوں کے اترنے کی جگہ اور اس شخص سے بھی جو اس میں قتل ہو کر مارا جائے گا اور جو اس میں اپنی موت سے مرے گا (غرض ان سب کی تفصیل) سے خبر دے دوں گا۔[1]

---

[1] علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ ''علامہ ابن عبدالبر صاحب کتاب استیعاب نے راویوں اور محدثین کی ایک بڑی جماعت سے روایت کی ہے وہ سب بیان کرتے تھے کہ صحابہ رضی اللہ عنہ سے کسی شخص نے بھی سوا حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے یہ بات زبان سے نہیں نکالی کہ مجھ سے پوچھ لو جو کچھ پوچھنا ہو''۔ (چنانچہ استیعاب مطبوعہ حیدرآباد دکن جلد ۲ صفحہ ۴۷۵ میں یہ عبارت موجود ہے) اور ہمارے استاد ابوجعفر اسکافی نے اپنی کتاب نقض العثمانیہ میں روایت کی ہے کہ

لَیْسَ لِاَحَدٍ مِّنَ النَّاسِ اَنْ یَّقُوْلَ عَلَی الْمِنْبَرِ سَلُوْنِیْ اِلَّا عَلِیُّ بْنُ اَبِیْ طَالِبٍ۔

یعنی حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے سوا کسی شخص کو بھی یہ بات حاصل نہیں ہوئی کہ برسر منبر عام مجمع کو مخاطب کر کے کہے کہ جو کچھ تمہیں پوچھنا ہو مجھ سے پوچھ لو۔

پھر علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں:

''جاننا چاہئے کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے اس فصل میں خدا کی (جس کے قبضۂ قدرت میں حضرتؑ کی جان ہے) قسم کھا کر ارشاد فرمایا ہے کہ وہ لوگ حضرتؑ سے کوئی بات نہیں دریافت کریں گے جو ان کے اور قیامت کے درمیان حادث ہونے والی ہے مگر یہ کہ حضرتؑ اس بات کو ضرور بتا دیں گے اور جو جنگ ہوگی، جو جماعت گمراہ اور جو ہدایت کرے گی ان سب کی تفصیل بیان فرما دیں گے تو اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ حضرتؑ نے یہ خدائی کا دعویٰ کیا یا نبوت کے مدعی ہوئے۔ یہ باتیں ہرگز نہیں ہیں کیونکہ خود حضرت علیؑ برابر فرمایا کرتے تھے کہ حضرت رسالت مآبؐ نے ان تمام باتوں کی خبر آپ کو دے دی تھی''۔

پھر علامہ ممدوح لکھتے ہیں کہ

''ہم لوگوں نے حضرت امیر المومنینؑ کی ان کل پیشین گویوں کا تجربہ کیا اور تحقیق کی تو سب کو واقعات کے مطابق پایا جس سے ہمیں اقرار کرنا پڑا کہ دعویٰ مذکور بالکل سچا اور درست تھا اور کبھی بھی بال برابر فرق نہیں ہوا۔ جیسے حضرتؑ نے ابن ملجم

(بقیہ صفحہ آئندہ)

وَ لَوْ قَدْ فَقَدْتُّمُوْنِیْ وَ نَزَلَتْ بِکُمْ کَرَآئِہُ الْاُمُوْرِ، وَ حَوَازِبُ الْخُطُوْبِ، لَاَطْرَقَ کَثِیْرٌ مِّنَ السَّآئِلِیْنَ، وَ فَشِلَ کَثِیْرٌ مِّنَ الْمَسْؤُوْلِیْنَ، وَ ذٰلِکَ اِذَا قَلَّصَتْ حَرْبُکُمْ، وَ شَمَّرَتْ عَنْ سَاقٍ، وَ ضَاقَتِ الدُّنْیَا عَلَیْکُمْ ضِیْقًا، تَسْتَطِیْلُوْنَ مَعَہٗ اَیَّامَ الْبَلَآءِ عَلَیْکُمْ، حَتّٰی یَفْتَحَ اللّٰہُ لِبَقِیَّۃِ الْاَبْرَارِ مِنْکُمْ.

اِنَّ الْفِتَنَ اِذَا اَقْبَلَتْ شَبَّہَتْ، وَ اِذَآ اَدْبَرَتْ نَبَّہَتْ، یُنْکَرْنَ مُقْبِلَاتٍ، وَ یُعْرَفْنَ مُدْبِرَاتٍ، یَحُمْنَ حَوْمَ الرِّیَاحِ، یُصِبْنَ بَلَدًا وَّ یُخْطِئْنَ بَلَدًا.

اور اگر میں تم لوگوں کے درمیان سے اٹھ جاؤں اور تم پر سخت مصیبتیں اور گھبرا دینے والے حادثے نازل ہوں تو پوچھنے والوں سے بہت لوگ اپنے سر جھکا لیں گے اور پوچھے جانے والوں سے بہت لوگ بزدل ہو جائیں گے اور یہ اس وقت جب لڑائی گھمسان کی ہوگی اور (میدان جنگ) گرم ہو جائے گا۔ اور دنیا تم پر اس قدر تنگ ہو جائے گی کہ تم اپنی مصیبت اور بلا کے دنوں کو طویل و دراز سمجھنے لگو گے۔ یہاں تک کہ تمہارے نیکوکاروں سے بقیہ کے لیے خدا فتح بخشے۔

(اور یہ بھی سمجھ لو کہ) فتنہ جب رُخ کرتے ہیں تو (لوگوں کو) شبہہ میں ڈال دیتے اور جب منہ موڑتے ہیں تو متنبّہ کرتے جاتے ہیں (غرض جب وہ) آگے بڑھتے ہیں تو پہچانے نہیں جاتے اور جب پھر جاتے ہیں تو خوب پہچان لیے جاتے ہیں۔ (یہ فتنے) ہواؤں کی طرح چکر لگاتے پھرتے ہیں کہ بعض شہروں میں پہنچتے اور بعض کو چھوڑ جاتے ہیں۔

(بقیہ صفحہ ماقبل) کے ہاتھ سے اپنے قتل ہونے اور آپ کی ریش مبارک کے آپ کے خون سے خضاب ہونے یا جب حضرتؑ زمین کربلا سے گزرے تو اس سے خطاب کر کے حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت کی خبر بیان کرنے یا آپ کے بعد معاویہ کے بادشاہ ہونے یا حجاج کے مظالم یا آپ کی اولاد میں آئندہ جن لوگوں پر جو مظالم ہونے والے تھے ان کے حالات کی تفصیل وغیرہ امور غیب کے متعلق جو خبریں دیں وہ بالکل درست ہوئیں۔ انہیں پیشین گوئیوں میں یہ بھی تھی کہ حضرتؑ نے بصرہ کی بربادی کے متعلق خبر دی تھی کہ یہ زنج قوم کے ہاتھ سے تباہ ہوگا مگر اس وقت لوگوں نے اس زنج کو سمجھا نہیں کیونکہ یہ قوم ان لوگوں کے علم میں نہیں تھی تو حضرتؑ کے کلام میں اس لفظ کو دیکھ کر لوگوں نے ریح پڑھا اور سمجھے کہ بصرہ سخت ہوا یعنی طوفان سے برباد ہوگا مگر بعد کو ثابت ہو گیا کہ وہ لفظ ریح نہیں بلکہ زنج تھا یعنی زنگی قوم کے ہاتھ سے برباد ہوگا جیسا کہ ہوا۔ اسی طرح حضرتؑ کی چند پیشین گوئیوں کو کئی صفوں میں ذکر کرنے کے بعد علامہ ممدوح لکھتے ہیں کہ اسی قسم کی حضرتؑ کی بکثرت پیشین گوئیاں ہیں جن کو اگر ہم پوری طرح لکھنا چاہتے تو بہت سے اجزاء کا سامان کرنا ہوتا اور سیر کی کتابیں ان پیشین گوئیوں کو شرح و بسط سے اپنے میں بھرے ہوئی ہیں''۔

اَلَا وَ اِنَّ اَخْوَفَ الْفِتَنِ عِنْدِیْ عَلَیْکُمْ فِتْنَةُ بَنِیْۤ اُمَیَّةَ. فَاِنَّهَا فِتْنَةٌ عَمْیَآءُ مُظْلِمَةٌ: عَمَّتْ خُطَّتُهَا، وَ خَصَّتْ بَلِیَّتُهَا، وَ اَصَابَ الْبَلَآءُ مَنْ اَبْصَرَ فِیْهَا، وَ اَخْطَاَ الْبَلَآءُ مَنْ عَمِیَ عَنْهَا.

وَ ایْمُ اللّٰهِ لَتَجِدُنَّ بَنِیْۤ اُمَیَّةَ لَکُمْ اَرْبَابَ سُوْٓءٍ بَعْدِیْ، کَالنَّابِ الضَّرُوْسِ: تَعْذِمُ بِفِیْهَا، وَ تَخْبِطُ بِیَدِهَا، وَ تَزْبِنُ بِرِجْلِهَا، وَ تَمْنَعُ دَرَّهَا، لَا یَزَالُوْنَ بِکُمْ حَتّٰی لَا یَتْرُکُوْا مِنْکُمْ اِلَّا نَافِعًا لَّهُمْ، اَوْ غَیْرَ ضَآئِرٍ بِهِمْ، وَ لَا یَزَالُ بَلَآؤُهُمْ عَنْکُمْ حَتّٰی لَا یَکُوْنَ انْتِصَارُ اَحَدِکُمْ مِنْهُمْ اِلَّا کَانْتِصَارِ الْعَبْدِ مِنْ رَّبِّهٖ، وَ الصَّاحِبِ مِنْ مُّسْتَصْحِبِهٖ، تَرِدُ

دیکھو! میرے نزدیک تم لوگو پر سب سے زیادہ خوفناک فتنہ بنی امیہ کا (نازل) ہوگا کہ وہ اندھا تیرہ و تاریک ہوگا، جس کا تسلط عام اور جس کی مصیبت خاص (اہل بیتؑ کے لیے بڑی) ہوگی اور جو اس میں دیکھے گا اس پر بلا نازل ہوگی اور جو اس سے آنکھیں بند کرلے گا اس سے وہ بلا الگ رہے گی۔

اور خدا کی قسم تم میری بعد بنی امیہ کو اپنے لیے برے مالک پاؤ گے۔ اس بڑی بڑی کچلیوں والی اونٹنی کی طرح جو اپنے منہ سے کاٹتی اور اپنے ہاتھ سے روندتی اور اپنے پاؤں سے لات مارتی اور اپنا دودھ نہیں دھونے دیتی ہے۔ وہ ہمیشہ تم پر مسلط رہیں گے یہاں تک کہ تم سے کسی کو نہیں چھوڑیں گے سوا اس کے جو ان کے لیے نفع بخش یا (کم از کم) بے ضرر ہو۔ اور ان کی آفت تم سے دفع نہیں ہوگی یہاں تک کہ تم میں سے کسی شخص کا ان سے بدلہ لینا ویسا ہی (محال) ہوگا جیسا کہ کسی غلام کا اپنے مالک سے اور تابع کا اپنے متبوع سے بدلہ لینا (ناممکن) ہے۔[1] تم لوگوں پر ان

---

[1] بنی امیہ کی مذمت سے تمام کتب تاریخ وتفسیر وحدیث بھری پڑی ہیں مثلاً تاریخ الخلفاء صفحہ ۲۳۱ میں ہے کہ حضرتؑ نے بنی امیہ کے کچھ لوگوں کو تکبر سے چلتے ہوئے دیکھا تو غضب ناک ہو گئے اور یہ آیت پڑھی ﴿وَ الشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِی الْقُرْاٰنِ﴾ ''لوگوں نے دریافت کیا یا حضرتؑ یہ کون سا ملعون درخت ہے جس سے ہم پرہیز کریں؟'' فرمایا وہ بنی امیہ ہیں۔ جب حکومت کریں گے تو ظلم واندھیر کردیں گے اور جب کوئی امانت رکھیں گے تو خیانت کرنے لگیں گے۔ اور صفحہ ۱۵۳ میں ہے تو نماز کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے بنی امیہ نے تو نماز کو مٹا ہی دیا تھا۔ اور صفحہ ۱۵۲ میں اس خاندان کے ایک انصاف پسند خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے بادشاہان بنی امیہ کے حکومت کی تصویر یوں کھینچی ہے، خدا کی قسم تمام زمین ظلم وجور سے بھر گئی ہے۔ اور صفحہ ۹ میں ہے کہ حضرت رسول خداؐ نے خواب میں بنی امیہ کو منبر پر دیکھا تو حضرت کو بڑا رنج ہوا۔ پھر اسی صفحہ میں ہے حضرت رسول خداؐ نے خواب میں دیکھا کہ بنی امیہ آپ کے منبر پر بندروں کی طرح اچک رہے ہیں تو حضرتؐ کو بڑا صدمہ ہوا جس سے آپ مرتے وقت تک مسکرائے بھی نہیں! تب خدا نے یہ آیت نازل کی:

عَلَيْكُمْ فِتْنَتُهُمْ شَوْهَآءَ مَخْشِيَّةً، وَ قِطَعًا جَاهِلِيَّةً، لَيْسَ فِيْهَا مَنَارُ هُدًى، وَ لَاعَلَمٌ يُّرٰى.

نَحْنُ اَهْلَ الْبَيْتِ مِنْهَا بِمَنْجَاةٍ، وَ لَسْنَا فِيْهَا بِدُعَاةٍ، ثُمَّ يُفَرِّجُهَا اللهُ عَنْكُمْ كَتَفْرِيْجِ الْاَدِيْمِ: بِمَنْ يَّسُوْمُهُمْ خَسْفًا، وَ يَسُوْقُهُمْ عُنْفًا، وَ يَسْقِيْهِمْ بِكَاْسٍ مُّصَبَّرَةٍ، لَا يُعْطِيْهِمْ اِلَّا السَّيْفَ، وَ لَا يُحْلِسُهُمْ اِلَّا الْخَوْفَ، فَعِنْدَ ذٰلِكَ تَوَدُّ قُرَيْشٌ بِالدُّنْيَا وَ مَا فِيْهَا لَوْ يَرَوْنَنِيْ مَقَامًا وَّاحِدًا، وَ لَوْ قَدْرَ جَزْرِ جَزُوْرٍ، لِاَقْبَلَ مِنْهُمْ مَآ اَطْلُبُ الْيَوْمَ بَعْضَهٗ فَلَا يُعْطُوْنَنِيْهِ!.

کا فتنہ نہایت منحوس اور ہیبت ناک اور جاہلیت کے زمانوں کی طرح (برباد کن) برپا ہوگا جس میں نہ تو ہدایت کی کوئی علامت ہوگی اور نہ (حق کا) کوئی نشان دکھائی دے گا۔

(ہاں) ہم اہل بیت علیہم السلام اس سے محفوظ رہیں گے اور نہ ہم اس میں دعوت کرنے والے ہوں گے۔ پھر خدا تم سے (اس فتنہ کو) اس طرح دفع کرے گا جس طرح (بدن کی) جلد (ادھیڑ دی جاتی ہے) بذریعہ ان لوگوں کے جو ان پر ذلت کا عذاب کریں گے اور ان کو سختی سے ہانکیں گے اور انہیں تلخ (شربت کی) کاسہ سے پلائیں گے۔ سوا تلوار کے ان کو کچھ نہیں دیں گے اور سوا ڈر کے انہیں کچھ نہیں پہنائیں گے۔ تو اس وقت قریش تمنا کریں گے کہ کاش وہ تمام دنیا و مافیہا کے عوض مجھے ایک ہی دفعہ دیکھ لیتے اگرچہ اس قدر مختصر جتنا وقت اونٹ کے ذبح کرنے میں صَرف ہوتا ہے تاکہ میں ان سے اس (پوری) چیز کو قبول کرلوں جس کا کچھ حصّہ آج طلب کرتا ہوں تو وہ مجھے نہیں دیتے ہیں۔[1]

(بقیہ صفحہ ماقبل) ﴿وَ مَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ﴾ (سورۂ بنی اسرائیل، آیہ ۶۰)

اور علامہ ابن ابی الحدید اس مقام پر لکھتے ہیں: معاویہ تو فاسق تھا اور اس کا ناقص الدین ہونا اور اسلام سے منحرف رہنا مشہور تھا۔ (تفصیل انشاءاللہ ضمیمہ میں آئے گی)

[1] علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ حضرتؑ کا یہ کلام دولت بنی امیہ کی بربادی اور دولت بنی عباس کے ظہور کے متعلق ہے اور حضرتؑ نے جیسا فرمایا تھا بالکل ویسا ہی ہوا یہاں تک حضرتؑ کا قول ''اس وقت قریش تمنا کریں گے'' بھی پورا سچا نکلا کیونکہ تمام مؤرخین نے لکھا ہے کہ آخری خلیفہ بنی امیہ نے جنگ زاب میں جب عبداللہ بن علی کو اپنے مقابل دیکھا ہے تو یہی جملہ کہا ''میری تمنا ہے کہ اس جھنڈے کے نیچے بجائے اس جوان کے حضرت علی ابن ابی طالبؑ ہوتے'' اور یہ قصہ مشہور ہے۔ اس خطبہ کو مؤرخین کی بڑی جماعت نے اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے اور یہ عام طور پر متداول اور منقول ہے حضرت علی علیہ السلام نے اس کو جنگ نہروان کے ختم ہونے کے بعد ارشاد فرمایا تھا اس میں اور بھی بعض الفاظ ایسے ہیں جن کو جناب سید رضی علیہ الرحمہ نے ذکر نہیں کیا ہے۔ (انشاءاللہ ضمیمہ میں یہ الفاظ بھی مع ترجمہ ذکر کردیے جائیں گے)۔

❁ خطبہ : ۹۲ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

فَتَبَارَكَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَا يَبْلُغُهٗ بُعْدُ الْهِمَمِ، وَ لَا يَنَالُهٗ حَدْسُ الْفِطَنِ، اَلْاَوَّلُ الَّذِیْ لَا غَايَةَ لَهٗ فَيَنْتَهِیَ، وَ لَآ اٰخِرَ لَهٗ فَيَنْقَضِیَ.

[مِنْهَا: فِیْ وَصْفِ الْاَنْبِيَآءِ]

فَاسْتَوْدَعَهُمْ فِیْٓ اَفْضَلِ مُسْتَوْدَعٍ، وَ اَقَرَّهُمْ فِیْ خَيْرِ مُسْتَقَرٍّ، تَنَاسَخَتْهُمْ كَرَآئِمُ الْاَصْلَابِ اِلٰی مُطَهَّرَاتِ الْاَرْحَامِ، كُلَّمَا مَضٰی مِنْهُمْ سَلَفٌ، قَامَ مِنْهُمْ بِدِيْنِ اللّٰهِ خَلَفٌ. حَتّٰٓی اَفْضَتْ كَرَامَةُ اللّٰهِ سُبْحَانَهٗ اِلٰی مُحَمَّدٍ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، فَاَخْرَجَهٗ مِنْ اَفْضَلِ الْمَعَادِنِ مَنْبِتًا وَّ اَعَزِّ الْاُرُوْمَاتِ مَغْرِسًا، مِنَ الشَّجَرَةِ الَّتِیْ صَدَعَ مِنْهَا

خطبہ (۹۲)

حضرت علیہ السلام کے ایک خطبہ کا کچھ حصّہ۔

بڑی برکت والا ہے وہ خدا جس تک بلند ہمتیں بھی نہیں پہنچ سکتیں اور نہ اس کو عقلوں کے رسائی پا سکتی ہے۔ وہ ایسا اوّل ہے جس کی کوئی حد نہیں جہاں وہ ختم ہو جائے اور نہ اس کے لیے کوئی انتہا ہے جہاں وہ تمام ہو جائے۔

[اسی خطبہ کا کچھ حصّہ انبیاء کے بیان میں]

(خدا نے) ان حضرات کو افضل مقام میں سپرد کیا اور بہترین جگہ میں ٹھہرایا (اس طرح کہ) ان کو شریف ترین صلب، پاکیزہ ترین رحموں کی طرف منتقل کرتے رہے [۱] جب ان میں کا کوئی سابق (نبی) (دنیا سے) اٹھا تو انہی کا جانشین دین خدا کی حفاظت کرنے لگا۔ [۲] یہاں تک کہ خدائے سبحانہ و تعالیٰ کا فضل و کرم (حضرت) محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچا تو آپؐ کو (خدا نے) شرافت کے بہترین خاندان اور باعتبار نسب کے معزز ترین اصل سے پیدا کیا۔ یعنی اس درخت (نور) سے جس سے اپنے (دوسرے) انبیاء کو

---

[۱] ''تَنَاسُخٌ'' کا معنی ایک دوسرے کا لوٹاتے رہنا ہے۔ تو مقصود یہ ہوا کہ انبیاء کے اجداد جو نہایت شریف اور پاکیزہ اصلوں کے تھے اور ان کی جدات کہ وہ بھی بڑی شریف اور نجیب الطرفین تھیں انبیاء کے نور کو اپنی صلب اور رحم سے نکال کر ان کے والدین کے صلب اور رحم کی طرف منتقل کرتے رہے۔

[۲] حضرتؑ کے اس کلام سے ثابت ہوا کہ انبیاء طاہرین ہمیشہ پاکیزہ ترین رحموں اور صلبوں میں رہا کیے ہیں اور ان کے نسب میں کوئی خرابی نہیں تھی وہ حضرات ہمیشہ حلال سے پیدا ہوئے مگر حضرات اہل سنت اس مسئلہ میں بھی شیعوں سے اختلاف کرتے اور کہتے ہیں کہ انبیاء کے لیے ان امور کی ضرورت نہیں ہے خدا جس کو چاہے اپنا پیغام پہنچانے کے لیے مقرر کر دے۔ چنانچہ انہیں سب خیالات سے ان لوگوں نے یہ شعر بھی کہا ہے:

مجھے دی ہے حق نے بس اتنی بزرگی　　کہ بندہ ہوں اس کا اور اپلچی بھی

اَنبِیَآئَہٗ، وَ انْتَخَبَ مِنْھَآ اُمَنَآئَہٗ.

عِتْرَتُہٗ خَیْرُ الْعِتَرِ، وَ اسْرَتُہٗ خَیْرُ

برآمد اور اپنے امینوں کو منتخب کرتا رہا ہے۔ ۱؎

(لہٰذا) حضرتؐ کی عترت بھی بہترین عترت اور آپؐ کے اہل بیت افضل اہل بیت ہیں۔ ۲؎ اور آپؐ کا درخت

۱؎ یہ کلام حضرت رسالت مآبؐ کے بہترین خاندان ہونے پر دلیل قاطع ہے اور حضرات اہل سنت کے یہاں بھی اس کی بکثرت حدیثیں موجود ہیں۔ چنانچہ خود صحیح بخاری میں ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: میں مبعوث ہوا بہترین قرن بنی آدم سے ایک قرن کے بعد دوسرے قرن میں یہاں تک کہ میں مبعوث ہوا اس قرن سے جس میں تھا۔ اور حدیث بیہقی میں ہے کہ حضرتؐ نے فرمایا:

جب آدمیوں کی تقسیم دو قبیلوں میں ہوئی تو خدا نے مجھے بہترین قبیلہ میں قرار دیا یہاں تک کہ میں اپنے والدین سے متولد ہوا، پس نہ پہنچی مجھ کو کوئی چیز جاہلیت کی برائیوں سے اور میں نکاح سے پیدا ہوا نہ سفاح (حرام کاری) سے، زمانہ حضرت آدمؑ سے یہاں تک کہ میں منتہی ہوا اور اپنے والدین تک۔

اور حدیث ابونعیم وغیرہ میں ہے کہ خدا ہم کو ہمیشہ اصلاب طیبہ سے ارحام طاہرہ کی طرف منتقل کرتا رہا۔ مگر باوجود ان حدیثوں کے بھی بکثرت علمائے اہل سنت حضرتؐ کے نسب میں خرابی کے قائل ہو گئے اور مدعی ہیں کہ معاذ اللہ اجداد حضرتؐ میں حرام کاری ہوئی اور اسی شاخ میں حضرتؐ نے وجود پایا جس میں حرام کاری ہوئی تھی، جیسا کہ ''روض الانف'' سہیلی اور ''معارف'' ابن قتیبہ اور کتاب ''الاکتفاء'' میں بتفصیل مذکور ہے۔

۲؎ حضرتؐ کی عترت کے فضائل کتب اہل سنت میں بھی کثرت سے ہیں۔ چنانچہ احادیث اہل سنت کے بڑے ذخیرے کنز العمال مطبوعہ حیدرآباد جلد ۶ صفحہ ۲۱۵ سے ۲۱۸ تک متعدد حدیثیں ہیں جن میں یہ بھی ہیں۔

اِنَّ لِکُلِّ بَنِیْ اَبٍ عَصَبَتُہٗ یَنْتَمُوْنَ اِلَیْھَا. اِلَّا وُلْدَ فَاطِمَۃَ فَاَنَا وَلِیُّھُمْ وَاَنَا عَصَبَتُھُم، وَھُمْ عِتْرَتِیْ، خُلِقُوْا مِنْ طِیْنَتِیْ، وَیْلٌ لِلْمُکَذِّبِیْنَ بِفَضْلِھِمْ. مَنْ اَحَبَّھُمْ اَحَبَّہُ اللّٰہُ وَمَنْ اَبْغَضَھُمْ اَبْغَضَہُ اللّٰہُ۔

یعنی حضرتؐ نے فرمایا: ہر اولاد اپنے دادیہال کے لوگوں کی طرف منسوب ہوتی ہے سوا اولاد فاطمہ کے کہ ان کا ولی میں ہوں اور ان کے لوگ بھی ہم ہی ہیں اور وہ لوگ میری عترت ہیں وہ میرے ہی نور سے پیدا ہوئے ہیں تو جو شخص ان کے فضل کی تکذیب کرے اس کے لیے ویل ہے، جو شخص ان لوگوں کو دوست رکھے گا اس کو خدا بھی دوست رکھے گا اور جو انہیں دشمن رکھے گا خدا بھی اسے دشمن رکھے گا۔

پھر فرمایا:

خَیْرُ رِجَالِکُمْ عَلِیٌّ وَخَیْرُ شَبَابِکُمُ الْحَسَنُ وَالْحُسَیْنُ وَخَیْرُ نِسَائِکُمْ فَاطِمَۃُ۔

یعنی کل مسلمانوں مردوں سے بہتر علیؑ اور کل مسلمانوں جوانوں سے بہتر حسنؑ و حسینؑ اور کل عورتوں سے بہتر فاطمہؑ ہیں۔

(بقیہ صفحہ مابعد)

پھر فرمایا:

مَنْ سَرَّهٗ اَنْ يَحْيَا حَيَاتِيْ، وَيَمُوْتَ مَمَاتِيْ، وَيَسْكُنَ جَنَّةَ عَدْنٍ غَرَسَهَا رَبِّيْ، فَلْيُوَالِ عَلِيًّا مِنْ بَعْدِيْ، وَلْيُوَالِ وَلِيَّهٗ، وَلْيَقْتَدِ بِاَهْلِ بَيْتِيْ مِنْ بَعْدِيْ، فَاِنَّهُمْ عِتْرَتِيْ، خُلِقُوْا مِنْ طِيْنَتِيْ، وَرُزِقُوْا فَهْمِيْ وَعِلْمِيْ، فَوَيْلٌ لِلْمُكَذِّبِيْنَ بِفَضْلِهِمْ مِنْ اُمَّتِيْ، الْقَاطِعِيْنَ فِيْهِمْ صِلَتِيْ لَا اَنَالَهُمُ اللّٰهُ شَفَاعَتِيْ۔

یعنی جس شخص کو یہ پسند ہو کہ میری حیات زندہ رہے اور میری موت مرے اور اس بہشت میں رہے جس کو خدا نے خود پیدا کیا ہے تو اسے چاہیے کہ میرے بعد علی کو اور ان کے جانشینوں کو اپنا امام اور خلیفہ مانے اور میرے اہل بیتؑ کی پیروی کرے کیونکہ وہ لوگ میری عترت ہیں، میرے ہی نور سے پیدا کیے گئے اور میری سمجھ انہیں بھی دی گئی اور میرا ہی علم انہیں بھی بخشا گیا ہے تو میری امت سے جو لوگ ان اہل بیتؑ کے فضائل کو جھٹلائیں اور انہیں چھوڑنے کی وجہ سے میرے صلہ رحم کو قطع کریں ان کے لیے ویل ہے خدا انہیں میری شفاعت نہ پہنچائے۔

پھر فرمایا:

نَحْنُ اَهْلُ الْبَيْتِ لَا يُقَاسُ بِنَا اَحَدٌ۔

یعنی ہم اہل بیتؑ وہ ہیں جن پر کسی دوسرے کا قیاس ہو ہی نہیں سکتا۔

پھر فرمایا:

اَسَاسُ الْاِسْلَامِ حُبِّيْ وَ حُبُّ اَهْلِ بَيْتِيْ۔

یعنی اسلام کی بنیاد میری محبت اور میرے اہل بیتؑ کی محبت پر ہے۔

پھر فرمایا:

اِنَّ مَثَلَ اَهْلِ بَيْتِيْ فِيْكُمْ مَثَلُ سَفِيْنَةِ نُوْحٍ مَنْ رَكِبَهَا نَجَا وَ مَنْ تَخَلَّفَ عَنْهَا غَرِقَ وَ هَلَكَ۔

میرے اہل بیتؑ کی مثال تم میں ایسے ہے جیسے حضرت نوحؑ کی کشتی تھی کہ جو اس میں سوار ہو گیا اس کی نجات ہو گئی اور جو اس سے رہ گیا وہ ڈوبا اور ہلاک ہو گیا۔

پھر فرمایا:

اَلنُّجُوْمُ اَمَانٌ لِاَهْلِ السَّمَاءِ وَ اَهْلُ بَيْتِيْ اَمَانٌ لِاُمَّتِيْ۔

یعنی آسمان والوں کے لیے ستارے امان ہیں اور میری امت کے لیے میرے اہل بیتؑ امان ہیں۔

پھر فرمایا:

نَحْنُ وُلْدُ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ سَادَةُ اَهْلِ الْجَنَّةِ، اَنَا وَحَمْزَةُ وَعَلِيٌّ وَجَعْفَرٌ وَالْحَسَنُ وَالْحُسَيْنُ وَالْمَهْدِيُّ۔

یعنی ہم لوگ حضرت عبدالمطلب کی اولاد ہی بہشت والوں کے سردار ہیں جیسے میں، حمزہ، علی، جعفر، حسن، حسین اور

الْاَسَرِ، وَ شَجَرَتُهٗ خَيْرُ الشَّجَرِ، نَبَتَتْ فِيْ حَرَمٍ، وَ بَسَقَتْ فِيْ كَرَمٍ، لَهَا فُرُوْعٌ طِوَالٌ، وَ ثَمَرَةٌ لَّا تُنَالُ.

فَهُوَ اِمَامُ مَنِ اتَّقٰى، وَ بَصِيْرَةُ مَنِ اهْتَدٰى، سِرَاجٌ لَّمَعَ ضَوْئُهٗ، وَ شِهَابٌ سَطَعَ نُوْرُهٗ، وَ زَنْدٌ بَرَقَ لَمْعُهٗ، سِيْرَتُهُ الْقَصْدُ، وَ سُنَّتُهُ الرُّشْدُ، وَ كَلَامُهُ الْفَصْلُ، وَ حُكْمُهُ الْعَدْلُ، اَرْسَلَهٗ عَلٰى حِيْنِ فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ، وَ هَفْوَةٍ عَنِ الْعَمَلِ، وَ غَبَاوَةٍ مِّنَ الْاُمَمِ.

اِعْمَلُوْا، رَحِمَكُمُ اللّٰهُ! عَلٰٓى اَعْلَامٍ بَيِّنَةٍ، فَالطَّرِيْقُ نَهْجٌ يَّدْعُوْ اِلٰى دَارِ السَّلَامِ، وَ اَنْتُمْ فِيْ دَارِ مُسْتَعْتَبٍ عَلٰى مَهَلٍ وَ فَرَاغٍ، وَ الصُّحُفُ مَنْشُوْرَةٌ، وَ الْاَقْلَامُ جَارِيَةٌ، وَ الْاَبْدَانُ صَحِيْحَةٌ، وَ الْاَلْسُنُ مُطْلَقَةٌ، وَ التَّوْبَةُ مَسْمُوْعَةٌ، وَ الْاَعْمَالُ مَقْبُوْلَةٌ.

(خاندان) عمدہ ترین درخت ہے جو حرم میں پیدا ہوا اور جس نے شرف و بزرگی ہی میں نشو ونما پائی ہے۔ اس (درخت) کی شاخیں بہت اونچی اور اعلیٰ ہیں اور ان کے پھل ایسے (ہیں) جن کے رتبہ کو کوئی نہیں پہنچ سکتا۔

تو وہ حضرتؑ پرہیزگاروں کے پیشوا اور ہدایت چاہنے والوں کے نورِ ایمان ہیں۔ آپؑ وہ چراغ ہیں جس کی روشنی چمکتی اور وہ شعلۂ (رہنمائی) ہیں جس کا نور تاباں اور (راہ بتانے کے) وہ چقماق ہیں جس کی درخشندگی تڑپتی ہے۔ آپؑ کی سیرت میانہ روی اور آپؑ کی سنت ہدایت اور آپؑ کا کلام فیصل کُن اور آپؑ کا حکم عین انصاف ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو (خدا نے) اس وقت بھیجا جب نبیوں سے زمانہ خالی تھا اور غلطیوں سے اعمال پر تھے اور نادانی میں امتیں مبتلا تھیں۔

(بھائیو!) خدا تم پر رحم کرے اب (اس دین کی) واضح نشانیوں پر عمل کرو کیونکہ اس کا راستہ صاف ہے جو دارالسلام کی طرف بلا رہا ہے اور تم ابھی اس گھر میں ہو جس میں خدا کی رضا حاصل کرنے والے کو (کافی) مہلت اور فراغت ہے اور نامہ ہای اعمال کھلے ہوئے اور قلم جاری اور بدن صحیح ہیں اور زبانیں کام کرتی ہیں اور توبہ سنا جاتا ہے اور اعمال مقبول ہوتے ہیں۔

❁ خطبہ : ۹۳ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

بَعَثَهٗ وَ النَّاسُ ضُلَّالٌ فِيْ حَيْرَةٍ، وَ خَابِطُوْنَ فِيْ فِتْنَةٍ، قَدِ اسْتَهْوَتْهُمُ الْاَهْوَآءُ، وَ اسْتَزَلَّتْهُمُ الْكِبْرِيَآءُ، وَ اسْتَخَفَّتْهُمُ الْجَاهِلِيَّةُ الْجَهْلَآءُ حَيَارٰى فِيْ زِلْزَالٍ مِّنَ الْاَمْرِ، وَ بَلَآءٍ مِّنَ الْجَهْلِ، فَبَالَغَ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فِي النَّصِيْحَةِ، وَ مَضٰى عَلَى الطَّرِيْقَةِ، وَ دَعَا اِلَى الْحِكْمَةِ ﴿وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ﴾.

خطبہ (۹۳)

اور حضرت علیہ السلام کے ایک خطبہ کا کچھ حصّہ۔

حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو (خدا نے) اس وقت بھیجا جب تمام آدمی حیرت (کے عالم) میں گمراہ اور فتنہ و فساد میں بھٹکے ہوئے تھے کہ خواہشوں نے انہیں بہکا رکھا تھا اور تکبر و غرور سے (ان کے قدم) پھسل رہے تھے اور شدید گہری جہالت نے ان کی عقل مار دی تھی۔ (اور وہ موجودہ) حالت کے تلاطم اور جہالت کی بلا میں حیران و سرگرداں ہو رہے تھے۔ تو (حضرت) صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے (لوگوں کے) سمجھانے میں بڑی جانفشانی کی اور اسی راہ پر قائم رہے اور (لوگوں کو) حکمت اور موعظہ حسنہ کی طرف دعوت دیتے رہے۔[1]

---

[1] حضرتؐ نے دین اسلام کی دعوت میں جو جد و جہد کی اس کی نظیر دنیا میں نہیں مل سکتی، مکہ معظّمہ میں تیرہ سال تک یہ خدمت انجام دی اور تمام صعوبات اور کفار کے شدائد و اذیّات برداشت کرتے رہے قریش نے بڑے بڑے لالچ دیے مگر حضرتؐ نے جواب دے دیا کہ اگر میرے داہنے ہاتھ میں آفتاب اور بائیں میں مہتاب دے دو جب بھی اس فرض کو نہیں چھوڑ سکتا۔ پھر قریش نے حضرتؐ کو شعب ابو طالب میں قید رہنے پر مجبور کیا جہاں جسمانی اور روحانی تکلیف کے علاوہ رزق کی تنگی کا یہ حال پہنچا کہ درختوں کے پتے کھانے پڑے، اس مصیبت میں تین سال رہے۔ پھر اپنے آبائی وطن سے ہجرت کی اور مدینہ کو آباد کیا، یہاں بھی دشمنوں نے اطمینان سے دین اسلام کی اشاعت نہیں کرنے دی اور دن رات لڑتے ہی رہے، مگر سبحان اللہ حضرتؐ جس غرض کو لے کر تشریف لائے تھے اس کو آخر وقت تک انجام دیتے رہے اور انتقال کے پہلے غدیر خم میں باعلان فرما دیا کہ میرے بعد اس خدمت کا انجام دینے والا میرا بھائی علی ابن ابی طالبؑ ہے جو تمہارے ویسے ہی دینی پیشوا ہیں جیسا میں تھا اور انتقال کے وقت بھی مسلمانوں سے اس حدیث کو پھر فرمایا جسے بارہا ارشاد فرمایا تھا کہ

اِنِّيْ تَارِكٌ فِيْكُمُ الثَّقَلَيْنِ مَا اِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِيْ كِتَابَ اللّٰهِ، وَعِتْرَتِيْ اَهْلَ بَيْتِيْ، وَلَنْ يَّفْتَرِقَا حَتّٰى يَرِدَا عَلَيَّ الْحَوْضَ۔

کہ مسلمانو! میں تم میں دو بڑی چیزیں ہدایت کی چھوڑے جاتا ہوں جن کی تم پیروی کرو گے تو ہرگز گمراہ نہ ہو گے ایک قرآن مجید دوسری میری عترت اہل بیتؑ، یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس حوض کوثر پر پہنچ جائیں۔

❁ خطبہ : ۹۴ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الْاَوَّلِ فَلَا شَيْءَ قَبْلَهٗ، وَالْاٰخِرِ فَلَا شَيْءَ بَعْدَهٗ، وَ الظَّاهِرِ فَلَا شَيْءَ فَوْقَهٗ، وَ الْبَاطِنِ فَلَا شَيْءَ دُوْنَهٗ.

[مِنْهَا: فِيْ ذِكْرِ الرَّسُوْلِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم]

مُسْتَقَرُّهٗ خَيْرُ مُسْتَقَرٍّ، وَ مَنْبِتُهٗ اَشْرَفُ مَنْبِتٍ، فِيْ مَعَادِنِ الْكَرَامَةِ، وَ مَمَاهِدِ السَّلَامَةِ، قَدْ صُرِفَتْ نَحْوَهٗ اَفْئِدَةُ الْاَبْرَارِ، وَ ثُنِيَتْ اِلَيْهِ اَزِمَّةُ الْاَبْصَارِ، دَفَنَ اللّٰهُ بِهِ الضَّغَآئِنَ، وَ اَطْفَاَ بِهِ الثَّوَآئِرَ، وَ

خطبہ (۹۴)

حضرت علیہ السلام کے ایک خطبہ کا کچھ حصّہ۔

جمیع حمد وثنا اسی خدا کے لیے ہے جو ایسا اول ہے کہ اس کے پہلے کوئی چیز نہیں تھی اور ایسا آخر ہے جس کے بعد کوئی چیز نہیں ہوگی اور ایسا ظاہر ہے جس کے اوپر کوئی چیز نہیں ہے اور ایسا باطن ہے جس کے نیچے کوئی چیز نہیں ہوسکتی۔

[اسی خطبہ کا کچھ حصہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیان میں]

شرف و بزرگی کی کانوں (خاندانوں) اور (نسبی عیوب سے) سلامتی کے گہواروں میں حضرتؐ کی جگہ (اور مرتبہ) بہترین جگہ اور آپؐ کی اصل شریف ترین۔ البتہ حضرتؐ کی طرف نیکوکار لوگوں کے دل پھیر دیے گئے اور (صاحبان معرفت وفکر و) نظر کی مہاریں آپؐ کی جانب موڑ دی گئی تھیں۔[1] خدا نے حضرتؐ کی وجہ سے (جاہلیت کے) کینوں کو دفن کر دیا اور عداوتوں کو مٹا دیا۔ بھائیوں کو ملا دیا اور ہمسروں کو متفرق کر دیا اور (دینداری کی) ذلت کو

---

[1] حضرتؐ کی طرف لوگوں کے دل نبوت سے پہلے بھی مائل تھے اور بعد نبوت بھی۔ چنانچہ آپ حلیمہ سعدیہ کو دودھ پلانے کے لیے حوالے کیے گئے تو اسی وقت سے لوگوں کے دل آپ کی طرف کھنچنے لگے۔ آٹھویں مہینہ ایسا بولنے لگے کہ لوگوں کی سمجھ میں آنے لگا، نویں مہینہ تو ایسی عقل وحکمت کی باتیں فصاحت و بلاغت سے کرنے لگے کہ کل سننے والوں کو تعجب ہوتا تھا اور سب آپ کو نہایت عزیز رکھنے لگے، نویں یا تیرہویں سال جناب ابوطالبؑ کے ہمراہ شام کا سفر کیا تو وہاں عیسائی راہبوں نے آپ پر آثارِ عظمت وجلالت اور آپ کو ان صفات سے موصوف پا کر جو انہوں نے توریت وانجیل اور دیگر آسمانی کتابوں میں پڑھی تھیں پہچان لیا کہ حضرتؐ ہی پیغمبر آخر الزمان ہیں اور مہر نبوت پر بوسہ دے کر جناب ابوطالبؑ سے کہا کہ یہ صاحبزادہ اس زمانہ کا پیغمبر ہوگا اس کی خوب حفاظت کرنا۔ آپ کے اخلاق ومحبت اور وفا شعاری ودیانتداری وراست گوئی اور بہترین رفتار وکردار سے آپ کا لقب بھی امین ہوگیا، تمام مکہ آپ کا مداح تھا ہر شخص آپ سے خاص عقیدت رکھنے لگا۔ پھر اسلام کا اعلان کرنے پر تو لوگوں کے دل آپ کی طرف اس طرح کھنچے کہ ۲۳ سال میں ایک لاکھ چوبیس ہزار سے زیادہ انسان آپ کا کلمہ پڑھنے والے ہو چکے تھے۔ (سیرت ابن ہشام، تاریخ خمیس وغیرہ)

اَلَّفَ بِهٖۤ اِخْوَانًا، وَ فَرَّقَ بِهٖۤ اَقْرَانًا، اَعَزَّ بِهِ الذِّلَّةَ، وَ اَذَلَّ بِهِ الْعِزَّةَ، كَلَامُهٗ بَيَانٌ، وَ صَمْتُهٗ لِسَانٌ.

عزت سے اور (دنیا کی) عزت کو ذلت سے بدل دیا (کہ دیندار جو ذلیل معلوم ہوتے تھے معزز ہو گئے اور دنیا پرست جو معزز سمجھے جاتے تھے حقیر ہو گئے)۔[1] آپؑ کا کلام واضح اور آپؑ کی خاموشی (بولتی ہوئی) زبان تھی۔[2]

---

[1] قرآن مجید پارہ ۴ سورہ ال عمران آیت ۱۰۳ میں بھی ہے:

﴿وَ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ وَ كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا﴾

یعنی اپنے حال پر خدا کے احسان کو تو یاد کرو جب تم آپس میں ایک دوسرے کے دشمن تھے تو خدا نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کر دی اب تم اس کے فضل سے بھائی بھائی ہو گئے اور تم گویا آگ کے گڑھے کے کنارے آ لگے تھے کہ خدا نے تم کو اس سے بچا لیا۔

اور پارہ ۱۰ سورہ انفال آیت ۶۳ میں فرماتا ہے:

﴿هُوَ الَّذِيْۤ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ وَ اَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ﴾

کہ وہی خدا ہے جس نے اپنی مدد اور مومنین سے تمہاری تائید کی اور ان لوگوں کے دلوں میں باہم الفت پیدا کر دی۔

اور علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ

''اسلام نے دور دور والوں میں تو الفت پیدا کر دی مگر جن لوگوں نے اس دین کو قبول نہیں کیا ان میں اور مسلمانوں میں تفریق کر دی جیسے جناب حمزہ اور ابولہب حقیقی بھائی تھے مگر ایک دوسرے کے مخالف ہو گئے اور حضرت علیؑ و جناب عمار رضی اللہ عنہ میں کوئی قرابت نہیں تھی لیکن دونوں کو ملا کر ایک کر دیا''۔

[2] آپ کی خاموشی زبان تھی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ کی خاموشی وہ زبان تھی جو منہ میں گوشت کی ہے بلکہ زبان سے مقصود وہ کلام ہے جو زبان سے نکلتا ہے۔ تو حضرتؑ فرماتے ہیں کہ حضرت رسول خداؐ کا کلام تو بیان ہوتا یعنی صاف واضح ہوتا تھا کہ اس کے سمجھنے میں کسی کوشش کی ضرورت نہیں ہوتی تھی اور آپ کا سکوت بھی خالی از نفع نہیں ہوتا بلکہ کلام مفید اور قول پر از فوائد ہوتا تھا اور اس خاموشی سے بھی عقل و حکمت اور دین و شریعت کی اتنی باتیں معلوم ہوتی تھیں جو بتانے سے ذہن میں آتی ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ حضرتؐ کی خاموشی بھی فائدہ سے خالی نہیں ہوتی تھی لہٰذا وہ بھی کلام ہی تھی اور یہ اس قسم کی تشبیہ ہے جس میں تشبیہ کا حرف حذف کر دیا جاتا ہے۔ جیسے بولتے ہیں ''يَدُهٗ بَحْرٌ'' اس کا ہاتھ دریا ہے۔ یعنی مثل دریا کے ہے اسی طرح حضرتؐ کی خاموشی زبان یعنی مثل زبان کے تھی۔

❁ خطبہ :۹۵ ❁

وَ مِنْ كَلَامٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

وَ لَئِنْ اَمْهَلَ اللّٰهُ الظَّالِمَ فَلَنْ يَفُوْتَ اَخْذُهٗ، وَ هُوَ لَهٗ بِالْمِرْصَادِ عَلٰى مَجَازِ طَرِيْقِهٖ، وَ بِمَوْضِعِ الشَّجَا مِنْ مَّسَاغِ رِيْقِهٖ.

اَمَا وَ الَّذِیْ نَفْسِیْ بِيَدِهٖ! لَيَظْهَرَنَّ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمُ عَلَيْكُمْ، لَيْسَ لِاَنَّهُمْ اَوْلٰى بِالْحَقِّ مِنْكُمْ، وَ لٰكِنْ لِّاِسْرَاعِهِمْ اِلٰى بَاطِلِ صَاحِبِهِمْ، وَ اِبْطَآئِكُمْ عَنْ حَقِّكُمْ.

خطبہ(۹۵)

حضرت علیہ السلام کے ایک کلام کا کچھ حصّہ۔

اگرچہ ظالم کو خدا (دنیا میں) چھوڑ کر مہلت دے دیتا ہے مگر وہ (ظالم) اس کی گرفت سے کسی طرح نکل نہیں سکتا کیونکہ وہ (خدا) اس (ظالم) کے دنیا سے گزرنے کی راہ پر تاک میں اور اس کے اس مقام کو جو مجرای آب دہن (ہے پکڑنے کے انتظار) میں [1] لگا ہوا ہے۔

سنو! اس (ذات) کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے یہ لوگ (بنی امیہ) تم پر غالب ہو کر ہی رہیں گے مگر اس وجہ سے نہیں کہ وہ بمقابلہ تمہارے حق پر ہیں بلکہ اس وجہ سے کہ وہ اپنے باطل سردار کی (اطاعت کی) طرف تیزی سے بڑھتے ہیں اور تم میرے حق (کی دعوت) میں سُستی کرتے ہو۔ [2]

---

[1] یہ کلام بطور توسع ومجاز ہے کیونکہ خدا کا کسی جہت میں ہونا محال ہے وہ تو مکان، حیّز، جہت ہر چیز سے منزّہ ومبرّہ ہے لیکن چونکہ وہ ہر جگہ ہے اور کوئی چیز اس کے علم واحاطہ سے باہر نہیں ہے لہٰذا حضرتؑ نے اس کلام کو فرمایا جس طرح قرآن مجید پارہ ۲۷ سورہ حدید آیت ۴ میں ہے کہ

﴿وَ هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ﴾

کہ تم چاہے جہاں کہیں ہو وہ خدا تمہارے ساتھ ضرور ہے۔

یا جس طرح پارہ ۲۶ سورہ کہف آیت ۱۶ میں ہے:

﴿ وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ﴾

یعنی ہم تو اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

[2] حضرت امیر المومنینؑ قسم کھا کر ارشاد فرماتے ہیں کہ اہل شام یقیناً عراق والوں پر غالب آئیں گے اور فتحیاب ہوں گے اور یہ اس وجہ سے نہیں کہ وہ لوگ حق پر اور عراق (کوفہ) والے باطل پر ہیں بلکہ شام والوں کی فتح عراق والوں پر اس وجہ سے ہوگی کہ وہ لوگ اپنے حاکم اور سردار (معاویہ) کی اطاعت بہت زیادہ اور عراق والے اپنے آقا ومولا (یعنی حضرت امیر المومنینؑ) کی اطاعت بہت کم کرتے ہیں اور یہ واضح بات ہے کہ جنگ میں وہی لشکر کامیاب اور فتحیاب ہوتا ہے جو سردار فوج کی بات زیادہ مانتا اور اس کے (بقیہ صفحہ مابعد)

وَ لَقَدْ اَصْبَحَتِ الْاُمَمُ تَخَافُ ظُلْمَ رُعَاتِهَا، وَ اَصْبَحْتُ اَخَافُ ظُلْمَ رَعِيَّتِيْ. اَسْتَنْفَرْتُكُمْ لِلْجِهَادِ فَلَمْ تَنْفِرُوْا، وَ اَسْمَعْتُكُمْ فَلَمْ تَسْمَعُوْا، وَ دَعَوْتُكُمْ سِرًّا وَّ جَهْرًا فَلَمْ تَسْتَجِيْبُوْا، وَ نَصَحْتُ

(افسوس تمام دنیا کے) لوگوں کی حالت تو یہ ہے کہ وہ اپنے بادشاہوں کے ظلم سے ڈرتے ہیں اور میں ایسی حالت میں ہو گیا کہ اپنی رعایا کے ظلم سے (خود) ہی ڈرتا رہتا ہوں۔[1] (دیکھو!) میں نے تمہیں جہاد کے لیے نکلنے کو کہا تو تم نکلے نہیں اور (موقع کی باتیں) بتائیں مگر تم نے سنا نہیں اور تم کو آہستہ بھی اور زور سے بھی بلایا لیکن تم آئے نہیں اور

(بقیہ صفحہ ماقبل) ہر اشارہ پر کام کرتا اور کسی امر میں اس کے حکم اور ہدایت سے باہر نہیں ہوتا ہے اور اس بات کو قلبی اعتقاد اور اسلام و ایمان سے کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ جو لشکر اپنے سردار کی بات زیادہ مانے اس کا خدا کے نزدیک ایماندار ہونا ضروری نہیں ہے۔ اس وقت بھی دنیا کی کتنی فوجیں (کافروں) کی ہیں جو اپنے سردار کی اطاعت کرنے اور آپس میں اتفاق و اتحاد رکھنے کی وجہ سے مسلمانوں پر فتح پا جاتے ہیں۔

علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں:

''اسی وجہ سے تم دیکھتے ہو کہ اہل شرک (کافروں) کو اکثر اہل توحید (مسلمانوں) پر غلبہ ہو جاتا ہے تو کیا اس سے اہل شرک حق پر اور اہل توحید باطل پر سمجھ لیے جائیں گے''۔

[1] علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ حضرتؑ نے عجیب لطیف نکتہ کو ذکر فرمایا ہے کہ دنیا کا دستور یہی رہا ہے کہ ہمیشہ رعایا ہی اپنے بادشاہ یا حاکم کے ظلم اور زیادتی یا سختی سے ڈرتی رہتی ہے لیکن میرے لیے یہ اصول بھی الٹ گیا کہ میں ان کا خلیفہ، بادشاہ اور حاکم ہوں مگر یہ لوگ مجھ سے نہیں ڈرتے ہیں بلکہ میں ہی ان کے ظلم سے خوفزدہ رہتا ہوں۔ اور جو شخص حضرتؑ کے حالات خلافت ظاہری کو غور و تامل سے دیکھے گا یقین کر لے گا کہ حضرتؑ بالکل بے دست و پا اور مجبور محض کر دیے گئے تھے کہ آپ جس طرح دنیائے اسلام کا انتظام کرنا چاہتے اور نشر دین و اشاعت اسلام کی جو تمنائیں پوری کرنے کا ارادہ کرتے ان کو نور ایمان سے ماننے والے اور حضرتؑ کی حقیقی معرفت رکھنے والے بہت کم تھے۔ حضرتؑ کو لوگوں نے پہچانا ہی نہیں تھا اور سواد اعظم حضرتؑ کے بارے میں اس امر کا اعتقاد ہی نہیں رکھتے تھے جو اعتقاد واجب تھا بلکہ وہ تو (ایسے نادان تھے کہ) خیال کرتے تھے حضرتؑ سے پہلے جو تین خلیفہ گزرے ہیں وہ حضرتؑ سے افضل تھے اور ان کا گمان یہ تھا کہ فضیلت صرف خلافت سے حاصل ہوتی ہے کہ جو شخص پہلے خلیفہ ہو گیا وہ سب سے افضل اور جو بعد کو خلیفہ ہوا وہ اس سے کمتر تھا اور ان کے بعد بھی جو لوگ سواد اعظم میں پیدا ہوتے گئے وہ اپنے انھیں آبا و اجداد کی تقلید کرنے لگے۔ اس طرح خلفاء ثلاثہ کے حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے افضل ہونے کا عقیدہ ان لوگوں میں پھیلتا گیا اور یہ کہنے لگے کہ اگر پہلے زمانہ کے مسلمان خلفاء ثلاثہ کو حضرت علیؑ سے افضل نہیں سمجھتے تو ان کو حضرتؑ سے پہلے خلیفہ کیوں مقرر کرتے۔ غرض وہ لوگ حضرت علیؑ کو خود سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے تھے بلکہ پہلے لوگ جیسا سمجھا گئے اسی کی پیروی یہ بھی کرتے تھے اور انداز یہ بتاتا تھا کہ وہی لوگ حضرت کو اپنی رعیت جانتے ہیں۔ (تفصیل ضمیمہ میں آئے گی)

لَكُمْ فَلَمْ تَقْبَلُوْا. اَ شُهُوْدٌ كَغُيَّابٍ، وَ عَبِيْدٌ كَاَرْبَابٍ؟!.

اَتْلُوْا عَلَيْكُمُ الْحِكَمَ فَتَنْفِرُوْنَ مِنْهَا، وَ اَعِظُكُمْ بِالْمَوْعِظَةِ الْبَالِغَةِ فَتَتَفَرَّقُوْنَ عَنْهَا، وَ اَحُثُّكُمْ عَلٰى جِهَادِ اَهْلِ الْبَغْيِ فَمَآ اٰتِيْ عَلٰٓى اٰخِرِ قَوْلِيْ حَتّٰٓى اَرَاكُمْ مُتَفَرِّقِيْنَ اَيَادِيَ سَبَا، تَرْجِعُوْنَ اِلٰى مَجَالِسِكُمْ، وَ تَتَخَادَعُوْنَ عَنْ مَّوَاعِظِكُمْ، اُقَوِّمُكُمْ غُدْوَةً، وَ تَرْجِعُوْنَ اِلَيَّ عَشِيَّةً، كَظَهْرِ الْحَنِيَّةِ، عَجَزَ الْمُقَوِّمُ، وَ اَعْضَلَ الْمُقَوَّمُ.

تمہیں خوب نصیحت کی مگر تم مانے نہیں (غرض دیکھنے میں تو تم) حاضر (مگر اثر میں) مثل غائب ہونے کے اور (کہنے کو) غلام (مگر کاموں میں) مالکوں ایسے (خودمختار) ہو۔

میں تم سے حکمت کی باتیں بیان کرتا ہوں تو تم ان سے بھڑکتے ہو اور جاگزیں ہو جانے والے موعظہ سے سمجھاتا ہوں تو اس سے پراگندہ ہو جاتے ہو۔ اور گمراہوں، ظالموں سے جہاد کرنے پر آمادہ کرتا ہوں تو میں اپنی بات تمام بھی نہیں کرنے پاتا کہ تم کو دیکھتا ہوں اولاد سبا کی طرح تتر بتر اور متفرق ہو جا رہے ہو۔[1] (یہاں سے) پلٹ کر اپنی مجلسوں میں جاتے ہو تو اپنے موعظوں سے ایک دوسرے کو دھوکہ فریب ہی دینے لگتے ہو۔ (غرض) میں تمہیں صبح کے وقت (تیر کی ٹیڑھی کمان کی طرح) سیدھا کرتا ہوں مگر تم میرے پاس شام کو (پھر) کمانوں کی پشت ایسے (ٹیڑھے) ہی رہ کر واپس آتے ہو۔ (بس) سیدھا کرنے والا تو عاجز اور جو سیدھا کیا گیا (اس کا درست ہونا نہایت) دشوار ہو گیا ہے۔

---

[1] ''اَيَادِيَ سَبَا'' ایک مثل ہے لوگوں کے متفرق اور تتر بتر ہو جانے میں بولتے ہیں۔ اس کی اصل یہ ہے کہ یمن کے عربوں کا بزرگ اعلیٰ ایک شخص سبا تھا اس کے دس لڑکے تھے۔ ان سے چھ لڑکوں کو تو باپ اپنے داہنے جانب رکھا کرتا اور چار بیٹوں کو بائیں طرف رکھتا اس مناسبت سے کہ داہنا ہاتھ بائیں سے بہتر اور قوی تر ہوتا ہے، لہٰذا چھ لڑکے داہنے ہاتھ کی جگہ اور چار بیٹے بائیں ہاتھ کی جگہ تھے مگر عجب اتفاق کہ پھر وہ کل لڑکے ایک دوسرے سے اس طرح جدا ہو گئے کہ ہر ایک نہایت دور جگہ پہنچ گیا، جب ہی سے یہ مثل بولی جانے لگی کہ ''ذَهَبُوْا اَيَادِيَ سَبَا'' کہ یہ سب سبا کے لڑکوں کی طرح متفرق اور تتر بتر ہو گئے۔ سبا والوں کا قصہ قرآن مجید پارہ ۲۲ سورہ سبا میں ہے۔ اس کی آیت ۲۰ میں بھی اس کا ذکر ہے:

﴿وَ مَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ﴾

یعنی ہم نے ان کو تتر بتر کر دیا۔

اَيُّهَا الشَّاهِدَةُ اَبْدَانُهُمْ، الْغَآئِبَةُ عَنْهُمْ عُقُوْلُهُمْ، الْمُخْتَلِفَةُ اَهْوَآئُهُمْ، الْمُبْتَلٰى بِهِمُ اُمَرَآئُهُمْ! صَاحِبُكُمْ يُطِيْعُ اللّٰهَ وَ اَنْتُمْ تَعْصُوْنَهٗ، وَ صَاحِبُ اَهْلِ الشَّامِ يَعْصِى اللّٰهَ وَ هُمْ يُطِيْعُوْنَهٗ، لَوَدِدْتُّ وَاللّٰهِ! اَنَّ مُعَاوِيَةَ صَارَفَنِىْ بِكُمْ صَرْفَ الدِّيْنَارِ بِالدِّرْهَمِ، فَاَخَذَ مِنِّىْ عَشَرَةً مِّنْكُمْ وَ اَعْطَانِىْ رَجُلًا مِّنْهُمْ!.

اے وہ جن کے بدن تو حاضر مگر ان سے ان کی عقلیں غائب ہیں جن کی خواہش مختلف اور جن کے حاکم ان کی (نافرمانیوں کی) وجہ سے (مصیبت میں) مبتلا ہیں۔ تمہارا سردار (علی ابن ابی طالبؑ) خدا کی اطاعت کرتا ہے مگر تم اس کی نافرمانی کرتے ہو اور شامیوں کا سردار (معاویہ) خدا کی نافرمانی کرتا ہے مگر وہ لوگ اس کی اطاعت کرتے ہیں۔ خدا کی قسم میں چاہتا ہوں کہ جس طرح (صراف) کو درہم دے کر اشرفی لی جاتی ہے اسی طرح معاویہ مجھ سے تمہیں بدل لینے کا معاملہ کرتا کہ مجھ سے تمہارے دس شخصوں کو لے لیتا اور (ان کے عوض) اپنا (صرف) ایک آدمی مجھے دے دیتا۔

يَآ اَهْلَ الْكُوْفَةِ! مُنِيْتُ مِنْكُمْ بِثَلَاثٍ وَّ اثْنَتَيْنِ: صُمٌّ ذَوُوْ اَسْمَاعٍ، وَ بُكْمٌ ذَوُوْ كَلَامٍ، وَ عُمْىٌ ذَوُوْ اَبْصَارٍ، لَآ اَحْرَارُ صِدْقٍ عِنْدَ اللِّقَآءِ، وَ لَآ اِخْوَانُ ثِقَةٍ عِنْدَ الْبَلَآءِ! تَرِبَتْ اَيْدِيْكُمْ! يَآ اَشْبَاهَ الْاِبِلِ غَابَ عَنْهَا رُعَاتُهَا! كُلَّمَا جُمِعَتْ مِنْ جَانِبٍ تَفَرَّقَتْ مِنْ جَانِبٍ اٰخَرَ، وَاللّٰهِ! لَكَاَنِّىْ بِكُمْ فِيْمَآ اِخَالُ: اَنْ لَّوْ حَمِسَ الْوَغٰى، وَ حَمِىَ الضِّرَابُ، قَدِ

کوفہ والو! میں تم سے تین اور دو (مصیبتوں) میں مبتلا ہوں (کہ تم) کانوں والے ہو کر بہرے اور بولنے والے ہو کر گونگے اور آنکھوں والے ہو کر اندھے (بنے) ہو، نہ تو (دوستوں سے) ملاقات کے وقت سچے (شریف اور) صاحب اختیار (معلوم ہوتے) ہو اور نہ مصیبت کے وقت قابل اعتماد بھائی (ثابت ہوتے ہو)۔ تمہارے ہاتھ خاک آلودہ ہو جائیں، اے ان اونٹوں ایسے (جانورو!!) جن سے ان کے چرواہے غائب ہو جاتے ہیں کہ جب وہ ایک طرف سے جمع کیے جاتے ہیں تو دوسری جانب سے متفرق ہو جاتے ہیں۔ خدا کی قسم میں تمہارے بارے میں جو خیال کرتا ہوں تو گویا سمجھتا ہوں کہ اگر جنگ سخت اور لڑائی (کا میدان) گرم ہو جائے تو تم لوگ فرزند ابو طالبؑ سے

انْفَرَجْتُمْ عَنِ ابْنِ اَبِیْ طَالِبٍ انْفِرَاجَ الْمَرْاَةِ عَنْ قُبُلِهَا، وَ اِنِّیْ لَعَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ، وَ مِنْهَاجٍ مِّنْ نَّبِیِّیْ، وَ اِنِّیْ لَعَلَی الطَّرِیْقِ الْوَاضِحِ اَلْقُطُهٗ لَقْطًا.

اس طرح چھٹ جاؤ گے جس طرح عورت اپنے بچہ سے (اس کے جننے پر) کنارے ہو جاتی ہے۔[1] حالانکہ یقیناً میں اپنے پروردگار کی واضح راہِ حق اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سچی (سیرت) رفتار پر قائم ہوں اور یقیناً میں (ہر امر میں) صراط مستقیم ہی پر رہتا ہوں جس کو (گمراہی کی راہوں سے) چھانٹ کر چن لیا کرتا ہوں۔

---

[1] علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ حضرت امیر المومنینؑ کی زندگی عجب کرب میں مبتلا تھی کہ لوگ تو آپ کا کہنا نہیں مانتے اور حق سے بالکل روگردانی کرتے مگر حضرتؑ ان کی خاطر مدارات کرنے پر مجبور تھے اور اپنے دلی جذبات کو ظاہر نہیں کر سکتے تھے ایک مرتبہ آپ نے عاجز آ کر قاضیوں کے نام لکھ دیا کہ اچھا جیسا تمہارا جی چاہے اسی طرح لوگوں میں فیصلہ وحکومت کرو۔ تو آپ کا یہ جملہ آپ کی قوت وغلبہ اور حکومت واقتدار بتاتا ہے یا ضعف اور مجبوری کی طرف اشارہ کرتا ہے؟ پس ایسے وقت میں مصلحت زمانہ اور حکمت ودور اندیشی کا مقتضٰی اس کے سوا کیا تھا کہ آپ سکوت کریں اور فتنہ وفساد نہ قائم ہونے دیں۔ ایک دفعہ حضرتؑ نماز صبح پڑھتے تھے تو جماعت میں ایک شخص نے نماز ہی میں پڑھ دیا۔

﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ یَقْضِیْ بِالْحَقِّ وَهُوَ خَیْرُ الْفَاصِلِیْنَ﴾ (سورۂ انعام، آیہ ۵۷)

کہ فیصلہ تو بس خدا ہی کا ہے وہی حق کے مطابق فیصلہ کرتا اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔

حضرتؑ نماز سے فارغ ہونے کے بعد اس کے سوا کیا فرما سکتے تھے کہ:

﴿فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلَا یَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِیْنَ لَا یُوْقِنُوْنَ﴾ (سورۂ روم، آیہ ۶۰)

یعنی صبر کر خدا کا وعدہ حق ہے اور جو لوگ یقین نہیں رکھتے وہ تجھے بہکا نہ دیں۔

تو حضرتؑ کا یہ برتاؤ آپ کا صبر عظیم اور عجیب بردباری اور واضح توفیق تھا۔ اسی سے تو ہمارے (یعنی اہل سنت کے) علمائے متکلمین نے رائے قائم کی ہے کہ حضرت امیر المومنینؑ کی سیاست بہت اعلٰی درجہ کی اور آپ کی تدبیر نہایت صحیح اور بے مثل تھی۔ حضرتؑ کی ایسی حسن سیاست اور صحت تدبیر دوسروں کو میسر نہیں ہو سکتی کیونکہ جس بزرگ کو ایسی ناشنوا اور پراگندہ خیالات اور مختلف آراء والی رعیت سے سابقہ ہوا اور اسے ایسا نافرمان، خودرائے، سرکش لشکر ملے باوجود ان مخالف اسباب کے وہ اپنے ذاتی بہترین انتظام اور اعلٰی تدبیر سے سب دشمنوں پر غالب آئے، مخالفوں کو زیر کر دے اور ان کے سرداروں کو قتل کرے، اس کی حسن سیاست اور صحت تدبیر کو کون شخص پہنچ سکتا ہے اور کون شخص ان حالات میں پڑ کر اس طرح اپنی حکومت کو محفوظ رکھ سکتا ہے؟ اور ہمارے (اہل سنت کے) بعض علمائے متکلمین نے کہا ہے کہ حضرت امیر المومنینؑ کی ان انتظامی دقتوں کو دیکھتے ہوئے جو شخص حضرتؑ کی سیاست میں انصاف سے غور و فکر کرے گا وہ بے تامل کہہ دے گا کہ حضرتؑ کے کل کارنامے آپ کے معجزات ہی معجزات تھے اور انسانی قوت سے یقیناً باہر یہ کامیابی تھی۔ (ابن ابی الحدید مطبوعہ مصر جلد ۲ صفحہ ۱۸۴)

اُنْظُرُوْٓا اَهْلَ بَيْتِ نَبِيِّكُمْ فَالْزَمُوْا سَمْتَهُمْ، وَ اتَّبِعُوْٓا اَثَرَهُمْ فَلَنْ يُّخْرِجُوْكُمْ مِنْ هُدًى، وَ لَنْ يُّعِيْدُوْكُمْ فِيْ رَدًى، فَاِنْ لَّبَدُوْا فَالْبُدُوْا، وَاِنْ نَّهَضُوْا فَانْهَضُوْا، وَ لَا تَسْبِقُوْهُمْ فَتَضِلُّوْا، وَ لَا تَتَاَخَّرُوْا عَنْهُمْ فَتَهْلِكُوْا.

اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت علیہم السلام کو اچھی طرح پہچان لو پھر ان کے طریقہ پر مضبوطی سے قائم رہو اور ان کے آثار (اقوال وافعال) کی پیروی کرتے رہو کہ وہ تمہیں کبھی راہِ ہدایت سے باہر نہیں کریں گے اور کبھی ہلاکت میں دوبارہ نہیں لائیں گے۔ غرض اگر وہ توقف کریں تو تم بھی توقف کرو اور اگر وہ (کسی کام پر) آمادہ ہوں تو تم بھی آمادہ ہو جاؤ۔ مگر ان سے آگے نہ بڑھنا کہ پھر گمراہ ہو جاؤ گے اور نہ ان سے پیچھے ہونا ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے (بس ساتھ ہی رہو)۔

لَقَدْ رَاَيْتُ اَصْحَابَ مُحَمَّدٍ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، فَمَآ اَرٰى اَحَدًا مِنْكُمْ يُشْبِهُهُمْ! لَقَدْ كَانُوْا يُصْبِحُوْنَ شُعْثًا غُبْرًا، قَدْ بَاتُوْا سُجَّدًا وَّ قِيَامًا، يُرَاوِحُوْنَ بَيْنَ جِبَاهِهِمْ وَ خُدُوْدِهِمْ، وَ يَقِفُوْنَ عَلٰى مِثْلِ الْجَمْرِ مِنْ ذِكْرِ مَعَادِهِمْ! كَاَنَّ بَيْنَ اَعْيُنِهِمْ رُكَبَ الْمِعْزٰى مِنْ طُوْلِ سُجُوْدِهِمْ! اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ هَمَلَتْ اَعْيُنُهُمْ حَتّٰى تَبُلَّ جُيُوْبَهُمْ، وَ مَادُوْا كَمَا يَمِيْدُ الشَّجَرُ يَوْمَ الرِّيْحِ الْعَاصِفِ، خَوْفًا مِّنَ الْعِقَابِ،

میں نے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کرام کو دیکھا ہے مگر تم میں سے کسی کو بھی ان سے ملتا ہوا نہیں پاتا۔ وہ لوگ پراگندہ مو، غُبار آلود چہروں سے صبح کو اُٹھتے اور سجدے کرتے، نمازیں پڑھتے رات بسر کرتے کہ یکے بعد دیگرے کبھی اپنی پیشانیاں (سجدہ گاہوں پر) رکھتے اور کبھی اپنے رخسارے۔ اور اپنی قیامت کے ذکر سے (ایسے ڈرتے رہتے کہ گویا) چنگاریوں ایسی (چیز) پر کھڑے ہیں۔ ان کے طولانی سجدوں سے ان کی پیشانیوں پر گویا بکری کے زانو ایسے (گھٹے پڑ گئے) تھے۔ جب خدا کا ذکر ہوتا تو ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے یہاں تک کہ ان کے گریبانوں کو تر کر دیتے اور خوفِ عذاب و امیدِ ثواب میں وہ اس طرح لرزتے رہتے تھے جیسے سخت آندھی کے وقت درخت زور

وَ رَجَآءً لِلثَّوَابِ!۔ سے ملتے ہیں۔[1]

❁ خطبہ :۹۶ ❁

وَ مِنْ كَلَامٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

وَاللّٰهِ! لَا يَزَالُوْنَ حَتّٰى لَا يَدَعُوْا لِلّٰهِ مُحَرَّمًا اِلَّا اسْتَحَلُّوْهُ، وَ لَا عَقْدًا اِلَّا حَلُّوْهُ، وَ حَتّٰى لَا يَبْقٰى بَيْتُ مَدَرٍ وَّ لَا وَبَرٍ اِلَّا دَخَلَهٗ ظُلْمُهُمْ وَ نَبَا بِهٖ سُوْٓءُ رَعْيِهِمْ، وَ حَتّٰى يَقُوْمَ الْبَاكِيَانِ يَبْكِيَانِ: بَاكٍ يَّبْكِيْ لِدِيْنِهٖ، وَ بَاكٍ يَّبْكِيْ لِدُنْيَاهُ، وَ حَتّٰى تَكُوْنَ نُصْرَةُ اَحَدِكُمْ مِنْ اَحَدِهِمْ كَنُصْرَةِ الْعَبْدِ مِنْ سَيِّدِهٖ، اِذَا شَهِدَ

خطبہ(۹۶)

حضرت علیہ السلام کے ایک کلام کا کچھ حصّہ۔

خدا کی قسم یہ لوگ (بنی امیہ) نہیں دفع ہوں گے جب تک خدا کے کسی حرام کو بغیر حلال کیے اور (شریعت اسلام کی) کسی گرہ (حکم) کو بغیر کھولے (یعنی مٹائے) نہ چھوڑیں اور یہاں تک کہ کوئی کچا مکان یا ادنی خیمہ نہیں بچے گا مگر یہ کہ ان سب میں ان کا ظلم داخل ہو کر رہے گا اور ان کی اندھیر مچا دینے والی حکومت انہیں اجاڑ کر رہے گی اور یہاں تک کہ دو (قسم کے) رونے والے روتے ہوئے کھڑے ہو جائیں گے۔ ایک رونے والا تو اپنے دین کے لیے اور دوسرا اپنی دنیا کے واسطے گریہ کرے گا۔ اور یہاں تک کہ ان کے کسی شخص سے تمہارے کسی شخص کا مدد کرنا ایسا ہی ہوگا جیسا کسی مالک سے اس کے غلام کی مدد کرنا کہ جب

---

[1] اس کلام سے معلوم ہوا کہ اصحاب رسول خداؐ دو قسم کے تھے ایک اچھے اور ایک برے۔ اچھے وہ تھے جو حضرت رسول خداؐ کے زمانہ سے اس وقت تک اوصاف مذکورہ سے متصف تھے اور برے وہ تھے جو آنحضرتؐ کے زمانہ سے موقع کے انتظار میں تھے پھر آنحضرتؐ کے انتقال پر دنیا پرستی میں مشغول ہو گئے اور زیادہ تر وہی لوگ حضرتؑ کے زمانہ میں بھی تھے۔ یہ شبہ نہ ہو کہ حضرت امیر المومنینؑ یہ کلام اپنے زمانہ کے لوگوں سے فرما رہے ہیں اس لیے کہ حضرتؑ کے زمانے میں بھی تو وہی صحابہ رسول خداؐ تھے جو آنحضرتؐ کے بعد "اہل دنیا کار دنیا ساختند۔ مصطفی را بی کفن انداختند"۔ کے مصداق ہو گئے تھے، تو حضرتؑ انہی دنیا پرست اور برے اصحاب رسول خداؐ سے (جو حضرتؑ کے وقت موجود تھے) فرماتے ہیں کہ تم میں حقیقی اصحاب رسول خداؐ کی کوئی صفت بھی نہیں پائی جاتی ہے اور میں تم لوگوں میں ان کے ایسا کسی کو بھی نہیں پاتا ہوں۔ وہ لوگ خدا اور رسولؐ کے احکام مانتے، حق پر قایم رہتے، شب بھر عبادت کرتے، صبح کو اسی عبادت اور خوفِ الٰہی کے اثر سے پراگندہ مو، زرد چہروں کے ساتھ اٹھتے، ذکر خدا سے ان کی آنکھیں اس قدر آنسو بہاتیں کہ ان کے سینے تر ہو جاتے اور عذابِ قیامت کے ڈر سے اس طرح لرزتے رہتے جس طرح درختوں کو سخت آندھی میں جنبش ہوتی رہتی ہے۔ مگر تم احکام خدا اور رسولؐ کی مخالفت، خلیفہ وقت کی نافرمانی کرتے اور دنیا پرستی میں مشغول رہتے ہو۔

اَطَاعَهٗ، وَ اِذَا غَابَ اغْتَابَهٗ، وَ حَتّٰى يَكُوْنَ اَعْظَمَكُمْ فِيْهَا عَنَآءً اَحْسَنُكُمْ بِاللّٰهِ ظَنًّا، فَاِنْ اَتَاكُمُ اللّٰهُ بِعَافِيَةٍ فَاقْبَلُوْا، وَ اِنِ ابْتُلِيْتُمْ فَاصْبِرُوْا، ﴿فَاِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ﴾.

(مالک) سامنے ہوتا ہے تو وہ (غلام) اس کی اطاعت کرتا ہے اور جب وہ غائب رہتا ہے تو اس کی غیبت کرنے لگتا ہے اور یہاں تک کہ اس (فتنہ بنی امیہ) میں تمہارا سب سے بڑا مصیبت زدہ شخص وہ ہوگا جس کا اعتقاد خدا کے متعلق سب سے اچھا ہوگا۔ غرض (اس وقت) اگر خدا تمہیں عافیت دے تو قبول کر لینا اور اگر تم بلا ہی میں گرفتار ہو تو صبر کرنا کہ انجام بخیر پرہیزگاروں ہی کے لیے ہے۔[1]

---

[1] علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ یہ کلام پورے کا پورا اشارہ ہے بنی امیہ کی طرف۔ اور علامہ محمد بن عقیل نصائح کافیہ صفحہ ۱۰۵ میں لکھتے ہیں کہ جب ہم معاویہ کے حالات بیان کر چکے تو اب چند ان حدیثوں کو بھی لکھتے ہیں جو بنی امیہ کی مذمت میں ہیں اور اس کو کہ انہیں خدا و رسولؐ سے کیا دشمنی تھی اور اسلام کے بدل دینے اور دین و شریعت خدا کے متغیر کر دینے میں انہوں نے کتنا بڑا حصہ لیا۔ حضرت رسول خداؐ نے فرمایا کہ جب بنی امیہ میں چالیس آدمی ہو جائیں گے تو وہ لوگ بندگان خدا کو اپنا غلام اور مال خدا کو اپنی ملکیت اور کتاب خدا کو لغویات بنا لیں گے۔ حضرتؐ کو سب سے زیادہ مبغوض بن امیہ ہی تھے۔ پھر فرمایا: اس دین کی تباہی بنی امیہ سے ہے۔ پھر فرمایا کہ میں اپنی امت پر سب سے زیادہ بنی امیہ کے فتنہ سے ڈرتا ہوں۔

اور آخری خلیفہ بنی امیہ جب بنی عباس سے شکست کھا کر بھاگا ہے تو ملک نوبہ میں پہنچا، وہاں کا بادشاہ اس سے ملنے آیا اور زمین پر بیٹھ گیا اور خلیفہ سے پوچھا تم لوگ شراب کیوں پیتے ہو جس کو قرآن نے حرام کیا ہے؟ خلیفہ نے کہا ہمارے غلاموں اور ملازموں کو اس پر جرأت ہوگئی ہے۔ پوچھا تم لوگ سفر میں کھیتوں کو کیوں روندتے جاتے ہو جو دین و قرآن میں حرام ہے؟ خلیفہ نے کہا ہمارے غلام اور خدام جہالت سے ایسا کرتے ہیں۔ بادشاہ نوبہ نے پوچھا تم لوگ ریشمی لباس اور سونے کا زیور کیوں پہنتے ہو جو اسلام اور تمہارے دین اور تمہاری کتاب (قرآن مجید) میں حرام کیا گیا ہے؟ خلیفہ نے کہا ہم لوگوں کی بادشاہت جاتی رہی تھی تو ہم نے عجمیوں کی ایک قوم سے مدد حاصل کی جو ہمارے دین میں داخل ہو گئے تو انہیں لوگوں نے یہ چیزیں ہمارے رائے کے خلاف استعمال کیں۔

یہ پورا کلام سن کر بادشاہ نوبہ نے اپنا سر جھکا لیا اور کبھی اپنے ہاتھوں کو الٹتا پلٹتا، کبھی زمین کو کریدتا، پھر بول اٹھا کہ ہمارے غلام ہمارے ملازم و خدمت گزار اور عجمی لوگ ہمارے اوپر ہمارے دین میں داخل ہو گئے اور یہ سب کرنے لگے!!! پھر اس نے سر اٹھا کر کہا: اے خلیفہ جو جو عذر تم نے کیے یہ سب کچھ بھی نہیں ہیں بلکہ تم (بنی امیہ) وہ قوم ہو جنہوں نے ان چیزوں کو حلال کر لیا جن کو خدا نے حرام کیا تھا اور ان کاموں کا ارتکاب کرنے لگے جن کو خدا نے منع کیا تھا اور جس جس جگہ تم نے حکومت کی وہاں ظلم و فساد ہی کرتے رہے، اسی وجہ سے خدا نے بھی تم لوگوں کی عزت تم سے چھین لی اور تمہارے گناہوں کے سبب سے تمہیں ذلت کا لباس پہنا دیا اور ابھی خدا کو تم پر وہ غیض و غضب ہے جو اپنی حد پر نہیں پہنچا اور وہ تمہیں جو سزا دینی چاہتا ہے وہ پوری نہیں ہوئی ہے بلکہ مجھے خوف ہے کہ (بقیہ صفحہ مابعد)

❁ خطبہ :۹۷ ❁

خطبہ(۹۷)

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

حضرت علیہ السلام کے ایک خطبہ کا کچھ حصّہ۔

نَحْمَدُهٗ عَلٰى مَا كَانَ، وَ نَسْتَعِيْنُهٗ مِنْ

ہم اسی (خدا) کی حمد کرتے ہیں اس حالت پر جو تھی

(بقیہ صفحہ مابعد) جلد تر تم لوگوں پر سخت عذاب نازل ہو کر رہے گا اور تم میرے ہی شہر میں ہو تو میں ڈرتا ہوں کہ کہیں تمہاری وجہ سے میں بھی مبتلا عذاب نہ ہو جاؤں۔ مہمانی تین دن ہوتی ہے وہ ہو گئی اب تم یہاں سے اپنا بور یا بستر باندھو اور جو کچھ چاہتے ہو مجھ سے لے کر فوراً میری زمین سے نکل جاؤ کہ گیہوں کے ساتھ گھن بھی نہ پس جائے۔ یہ سن کر بیچارہ خلیفہ وہاں سے نکل گیا۔ (تاریخ مروج الذہب برحاشیہ تاریخ کامل مطبوعہ مصر جلد آٹھ صفحہ ۶۲ ومقدمہ ابن خلدون مطبوعہ مصر صفحہ ۹۵)

اسی مروج الذہب صفحہ ۶۵ میں ہے کہ بنی امیہ کی تمام ہمت شہوت رانی اور خدا کے گناہوں کی جولذتیں ہیں ان سب کا ارتکاب کرتے رہنا تھی اور یہ سب اس وجہ سے کہ خدا نے جو انہیں دنیا میں ڈھیل دے دی تھی تو اس سے جاہل ہو گئے اور اس کی پکڑ اور عذاب سے مطمئن ہو گئے باوجود اس کے انہوں نے خلافت کی عزت کو خاک میں ملا دیا اور بادشاہت کے وقار کو مٹا دیا اور سیاست میں بھی کمزوری دکھا دی تو خدا نے ان بدکرداریوں کی پاداش میں ان کی دولت وعزت کو سلب کر لیا اور ان کو اس خواری میں ڈال دیا۔ اور اسی کتاب کے صفحہ ۵۸ میں یہ اشعار بھی ہیں۔

وَهِيَ مِنْ اُمَيَّةَ بُنْيَانُهَا — فَهَانَ عَلَى اللّٰهِ فُقْدَانُهَا

وَكَانَتْ اُمَيَّةُ فِيْ مَا مَضٰى — جَرِيْئًا عَلَى اللّٰهِ سُلْطَانُهَا

فَلَا اٰلُ حَرْبٍ اَطَاعُوْا الرَّسُوْلَ — وَلَمْ يَتَّقِ اللّٰهَ مَرْوَانُهَا

یعنی امیہ سے اس کی بنیاد بودی اور حقیر وذلیل ہو گئی تو خدا پر اس کا فقدان بے حقیقت چیز ہو گیا۔ بنی امیہ کی حکومت وسلطنت خدا پر بڑی جرأت اور دلیری تھی (کہ وہ جانتے تھے خدا ان کی بادشاہت سے حد درجہ غضبناک ہو رہا ہے پھر بھی وہ اس سے باز نہیں رہے اور جرأت کر کے اس پر قائم ہی رہے) بنی امیہ سے نہ تو آل حرب نے کبھی رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کی اور نہ ہی مروان نے کبھی خدا سے خوف کیا۔

اور عبدالرحمن بن محمد بن اشعث جو خلیفہ عبدالملک کے بڑے سپہ سالاروں سے تھا اور انہیں بنی امیہ کے مشہور گورنر حجاج میں اختلاف ہونے پر دونوں میں جو جنگ ہوئی ہے تو عبدالرحمن کی طرف والوں نے اپنے لوگوں سے کہا تھا ''لوگو ان بنی امیہ سے لڑو جنہوں نے حرام خدا کو حلال سمجھ لیا ہے اور دین خدا میں نئی شریعتیں اور عجیب بدعتیں پیدا کرتے رہتے ہیں، جو حق کو بھولے ہوئے ہیں اسے پہچانتے ہی نہیں اور ظلم وعدوان پر عمل کرتے رہتے اور اس کو برا سمجھتے تک نہیں ہیں، تم ان سے اپنے دین ودنیا کے بچاؤ کے لیے لڑو کیونکہ خدا کی قسم اگر یہ تم پر غالب آ گئے تو تمہارا دین مٹا ڈالیں گے اور تمہاری دنیا پر بھی قبضہ کر لیں گے خدا کی قسم روئے زمین پر ہم کسی قوم کو ان (بنی امیہ) سے زیادہ ظالم وجفا کار نہیں پاتے، ان سے لڑو کیونکہ یہ اپنے ہر حکم میں ظلم وجور ہی پر عمل کرتے اور دین میں جبر وزبردستی کو کام میں لاتے ہیں اور غریب کمزور کو حقیر وذلیل کرتے رہتے اور نماز کو مٹاتے رہتے ہیں''۔ (تاریخ طبری مطبوعہ مصر جلد ۸ صفحہ ۲۱)

اَمْرِنَا عَلٰی مَا یَکُوْنُ، وَ نَسْئَلُهُ الْمُعَافَاةَ فِی الْاَدْیَانِ، کَمَا نَسْئَلُهُ الْمُعَافَاةَ فِی الْاَبْدَانِ.

اور اسی سے مدد چاہتے ہیں اپنی اس حالت پر جو ہوگی [1] اور جس طرح اس سے (اپنے) اعضاء کی عافیت کا سوال کرتے ہیں اسی طرح اس سے (اپنے) دین و مذہب کی سلامتی کی دعا بھی مانگتے ہیں۔ [2]

عِبادَ اللهِ! اُوْصِیْکُمْ بِالزَّفْضِ لِهٰذِهِ الدُّنْیَا التَّارِکَةِ لَکُمْ وَ اِنْ لَّمْ تُحِبُّوْا تَرْکَهَا، وَ الْمُبْلِیَةِ لِاَجْسَامِکُمْ وَ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ تَجْدِیْدَهَا، فَاِنَّمَا مَثَلُکُمْ وَ مَثَلُهَا کَسَفْرٍ سَلَکُوْا سَبِیْلًا فَکَاَنَّهُمْ

بندگانِ خدا! میں تم سے وصیت کرتا ہوں اس دنیا کے چھوڑ دینے کی جو خود تمہیں چھوڑنے والی ہے اگرچہ تم اس کو چھوڑنا ناپسند نہیں کرتے [3] اور اس (دنیا کے چھوڑ دینے) کی جو تمہارے جسموں کو سڑا گلا دینے والی ہے اگرچہ تم ان کو نیا (اور تر و تازہ) ہی کرتے رہنا چاہتے ہو۔ تو تمہاری اور اس (دنیا) کی مثال ان مسافروں ایسی ہے جو کسی راہ چلے تو

---

[1] حضرتؑ کی فصاحت و بلاغت آپ کے ایک ایک حرف میں بھری ہوئی ہے یہاں بھی ملاحظہ ہو۔ جو زمانہ گزر گیا اس کے لیے حضرتؑ نے حمد کا لفظ استعمال کیا ہے کیونکہ اس زمانہ کی نعمتیں اور اس کے احسانات معلوم ہیں اور جو خوبیاں معلوم ہوتی ہیں انہیں پر حمد کی جاتی ہے۔ پھر جو زمانہ آنے والا ہے اس کے لیے حضرتؑ نے استعانہ کا لفظ استعمال فرمایا کہ اس کے لیے میں خدا سے مدد کا خواستگار ہوں۔

[2] اس جملہ میں بھی حضرتؑ نے عجیب خوش اسلوبی اور صنعت صَرف فرمائی ہے کہ جس طرح بدنوں میں بیماریاں اور اذیتیں ہوتی ہیں اور ان کا علاج دوا اسی طرح دینوں اور مذہبوں میں خرابیاں اور بیماریاں ہیں اور ان کا بھی علاج اور دوا مقرر ہے۔ اور دونوں میں سقم و صحت ہے اسی کے متعلق محمود وراق نے کیا خوب چند شعر کہے ہیں:

وَاِذا مَرِضْتَ مِنَ الذُّنُوْبِ فَدَاوِهَا بِالذِّکْرِ اِنَّ الذِّکْرَ خَیْرُ دَوَاءٍ

وَالسُّقْمُ فِی الْاَبْدَانِ لَیْسَ بِضَائِرٍ وَالسُّقْمُ فِی الْاَدْیَانِ شَرُّ بَلَاءٍ

یعنی جب تم اپنے گناہوں کی بیماری میں مبتلا ہو تو خدا کے ذکر اور قیامت کی یاد سے ان کا علاج کرو کیونکہ خدا کا ذکر اور آخرت کی یاد ہی گناہوں کی بہترین دوا ہے۔ بدنوں کی بیماریاں چنداں نقصان نہیں پہنچاتی ہیں البتہ دین اور مذہب کی بیماری بدترین عذاب اور سخت ترین مصیبت ہے۔

[3] یہ مضمون بھی بالکل نیا اور نہایت لطیف ہے، اسی سے مشہور عربی شاعر متنبی نے اپنا یہ شعر نظم کیا ہے:

کُلُّ دَمْعٍ یَسِیْلُ مِنْهَا عَلَیْهَا وَبِفَکِّ الْیَدَیْنِ عَنْهَا تَخَلّٰی

یعنی سب اشک کہ دنیا کے سبب بہتے ہیں وہ اسی دنیا کے غم میں جاری ہیں اور ہر شخص دنیا کو اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑتا ہے اور جب اس کے دونوں ہاتھ بزور نہ کھولے جائیں اس کو چھوڑتا ہے۔

قَدْ قَطَعُوْهُ، وَ اَمُّوْا عَلَمًا فَكَاَنَّهُمْ قَدْ بَلَغُوْهُ، وَ كَمْ عَسَى الْمُجْرِیْ اِلَى الْغَايَةِ اَنْ يَّجْرِیَ اِلَيْهَا حَتّٰى يَبْلُغَهَا! وَ مَا عَسٰى اَنْ يَّكُوْنَ بَقَآءُ مَنْ لَّهٗ يَوْمٌ لَّا يَعْدُوْهُ، وَ طَالِبٌ حَثِيْثٌ مِّنَ الْمَوْتِ يَحْدُوْهُ فِي الدُّنْيَا حَتّٰى يُفَارِقَهَا!.

فَلَاتَنَافَسُوْا فِيْ عِزِّ الدُّنْيَا وَفَخْرِهَا، وَلَا تَعْجَبُوْا بِزِيْنَتِهَا وَ نَعِيْمِهَا، وَلَا تَجْزَعُوْا مِنْ ضَرَّآئِهَا وَ بُؤْسِهَا، فَاِنَّ عِزَّهَا وَ فَخْرَهَا اِلَى انْقِطَاعٍ، وَ اِنَّ زِيْنَتَهَا وَ نَعِيْمَهَا اِلٰى زَوَالٍ، وَ ضَرَّآئَهَا وَ بُؤْسَهَا اِلٰى نَفَادٍ، وَ كُلُّ مُدَّةٍ فِيْهَآ اِلَى انْتِهَآءٍ، وَكُلُّ حَيٍّ فِيْهَا اِلٰى فَنَآءٍ.

اَوَ لَيْسَ لَكُمْ فِيْٓ اٰثَارِ الْاَوَّلِيْنَ مُزْدَجَرٌ، وَ فِيْٓ اٰبَآئِكُمُ الْمَاضِيْنَ تَبْصِرَةٌ وَّ مُعْتَبَرٌ، اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ! اَوَ لَمْ تَرَوْا اِلَى الْمَاضِيْنَ مِنْكُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ، وَ اِلَى الْخَلَفِ الْبَاقِيْنَ لَا يَبْقَوْنَ! اَوَ لَسْتُمْ تَرَوْنَ اَهْلَ الدُّنْيَا يُصْبِحُوْنَ وَ يُمْسُوْنَ عَلٰٓى اَحْوَالٍ شَتّٰى:

گویا اس کو قطع کر گئے اور کسی نشانِ (منزل) کا قصد کیا تو گویا اس تک پہنچ گئے اور (دنیا میں) کتنے ہیں جو کسی مطلوب کا اس امید میں قصد کرتے ہیں کہ اس کو پالیں گے یہاں تک کہ وہاں پہنچ جاتے ہیں اور وہ شخص جس کے لیے (اجل معین کا) ایک دن مقرر ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرسکتا (اس کو) باقی رہنے کی کس قدر امید ہوتی ہے حالانکہ موت ایسا تیز طلبگار اسے دنیا میں ہنکائے چل رہا ہے اور دنیا ہی میں دنیا سے اکھاڑ دینے والا (اس کے پیچھے لگا) ہے یہاں تک کہ وہ اس (دنیا) سے جدا ہو جاتا ہے۔

تو دنیا کی عزت اور فخر میں (دلچسپی نہ لو اور) ایک دوسرے پر حسد نہ کرو اور اس کی زینت و نعمت پر پھول نہ جایا کرو اور اس کی اذیت و مصیبت سے بے چین نہ ہوا کرو کیونکہ اس کی عزت و فخر تو ختم ہو جانے والا اور اس کی زینت و نعمت مٹ جانے والی اور اس کی اذیت و مصیبت بھی رفع ہو جانے والی ہے اور اس میں (کا) ہر (اچھا بُرا) وقت گزر جانے والا اور اس میں (کا) ہر جاندار ہلاک ہونے والا ہے۔

اگر تم عقل رکھتے ہو تو (بتاؤ کہ) کیا پہلے لوگوں کے نشانوں میں تمہارے لیے کوئی تنبیہ اور تمہارے اگلے آباؤ اجداد (کے حالات) میں (تمہارے لیے) کوئی سبق اور عبرت نہیں ہے؟ کیا تم نے ان کو نہیں دیکھا جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں کہ (اب) وہ پلٹ کر نہیں آسکتے اور پیچھے رہ جانے والے اعقاب کو (نہیں دیکھا) کہ وہ بھی باقی نہیں رہیں گے۔ کیا تم دنیا والوں کو نہیں دیکھتے جن کی حالت صبح کو

فَمَيِّتٌ يُّبْكٰى وَ اٰخَرُ يُعَزّٰى، وَ صَرِيْعٌ مُّبْتَلًى وَّ عَآئِدٌ يَّعُوْدُ، وَ اٰخَرُ بِنَفْسِهٖ يَجُوْدُ، وَ طَالِبٌ لِّلدُّنْيَا وَ الْمَوْتُ يَطْلُبُهٗ، وَ غَافِلٌ وَّ لَيْسَ بِمَغْفُوْلٍ عَنْهُ، وَ عَلٰٓى اَثَرِ الْمَاضِيْ مَا يَمْضِي الْبَاقِيْ!.

اَلَا فَاذْكُرُوْا هَادِمَ اللَّذَّاتِ، وَ مُنَغِّصَ الشَّهَوَاتِ، وَ قَاطِعَ الْاُمْنِيَّاتِ، عِنْدَ الْمُسَاوَرَةِ لِلْاَعْمَالِ الْقَبِيْحَةِ، وَ اسْتَعِيْنُوا اللّٰهَ عَلٰٓى اَدَآءِ وَاجِبِ حَقِّهٖ، وَ مَا لَا يُحْصٰى مِنْ اَعْدَادِ نِعَمِهٖ وَ اِحْسَانِهٖ.

کچھ اور شام کو کچھ ہوتی ہے؟۔ کہ (کہیں تو) کسی میت پر گریہ و بکا ہے اور کہیں کسی شخص کی تعزیت ہو رہی ہے۔ کوئی تو عبادت کر رہا ہے اور کوئی دم توڑ رہا ہے۔ کوئی دنیا کی طلب میں مشغول ہے مگر موت اسی کو طلب کرتی ہے اور (موت سے) غافل ہے مگر (موت) اس سے غفلت نہیں کرتی ہے اور چلے جانے والوں ہی کے نشان (قدم) پر باقی رہ جانے والے بھی گزرتے رہتے ہیں۔

سُنو! اس (موت) کو یاد کرو جو لذتوں کو ختم اور شہوتوں کو بے لطف کر دینے والی ہے اور جس وقت (تم) برے کاموں پر حملہ کرتے ہو (یہی موت تمہاری) امیدیں قطع کر دیتی ہے اور خدا کے واجبی حقوق اور اس کے بے حد و حساب اور ناقابل شمار نعمتوں اور احسانوں کا شکریہ ادا کرنے کے لیے اسی (خدا) سے مدد چاہتے رہو۔[1]

❁ خطبہ :۹۸ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ النَّاشِرِ فِي الْخَلْقِ فَضْلَهٗ،

خطبہ (۹۸)

حضرت علیہ السلام کے ایک خطبہ کا کچھ حصہ۔

ہر قسم کی حمد اسی خدا کے لیے ہے جو مخلوقات میں اپنے

---

[1] لفظ ''عِنْدَ''، قبل کے لفظ ''اُذْكُرُوْا'' سے متعلق ہے اور ''مُسَاوَرَةٌ''، معنی حملہ کرنا۔ تو مطلب گویا یہ ہوا کہ خدا نے انسانی طبیعت کو جس فطرت پر پیدا کیا ہے وہ فطرت چونکہ برے کام سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی لہٰذا برا کام اپنے کرنے والے سے اسی طرح بھاگتا اور وحشت کرتا ہے جیسا وحشی جانور بھاگتا اور بھڑکتا ہے۔ تو برے کام میں جو پھنسنے کے قریب ہوتا ہے وہ اس تک کود کر پہنچتا ہے مثل درندے جانوروں کے جو دفعتاً کود اور اچک کر حملہ کر بیٹھتے ہیں اسی طرح یہ جس کو پھنسانا چاہتا ہے اس پر اچانک حملہ کر بیٹھتا ہے تاکہ اس کو ہلاک کر دے۔ مختصر یہ کہ جس وقت تم برے کاموں کا ارتکاب کرنے کے لیے ان (برے کاموں) پر حملہ کرو، اس وقت موت کو یاد کر لو۔ اس جملہ کے بارے میں علامہ محمد عبدہ لکھتے ہیں:

فَمَا اَلْطَفَ التَّعْبِيْرَ بِالْمُسَاوَرَةِ فِيْ هٰذَا الْمَوْضِعِ

کہ اس جگہ اس مضمون کو لفظ مساورۃ سے تعبیر کرنا کس قدر خوبصورت اور لطیف ہے۔

وَ الْبَاسِطِ فِيْهِمْ بِالْجُوْدِ يَدَهٗ. نَحْمَدُهٗ فِيْ جَمِيْعِ اُمُوْرِهٖ. وَ نَسْتَعِيْنُهٗ عَلٰى رِعَايَةِ حُقُوْقِهٖ۔

فضل واحسان کا عام کرنے والا اور اپنے (انتہائے) کرم سے اپنی نعمتوں کو ان میں پھیلانے والا ہے۔ کُل باتوں میں ہم اسی کی حمد کرتے اور اس کے حقوق کا پاس ولحاظ رکھنے کے لیے ہم مدد بھی اسی سے چاہتے ہیں۔

وَ نَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ غَيْرُهٗ. وَ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ. اَرْسَلَهٗ بِاَمْرِهٖ صَادِعًا. وَ بِذِكْرِهٖ نَاطِقًا. فَاَدّٰى اَمِيْنًا. وَ مَضٰى رَشِيْدًا. وَ خَلَّفَ فِيْنَا رَايَةَ الْحَقِّ. مَنْ تَقَدَّمَهَا مَرَقَ. وَ مَنْ تَخَلَّفَ عَنْهَا زَهَقَ. وَ مَنْ لَّزِمَهَا لَحِقَ. دَلِيْلُهَا مَكِيْثُ الْكَلَامِ.

اور ہم گواہی دیتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کے بندے اور پیغمبر ہیں۔ اس نے حضرتؐ کو اس طرح مبعوث کیا کہ آپؐ برابر اس کے دین کا اعلان اور زبان سے اسی کا ذکر کرنے والے تھے۔ تو حضرتؐ نے نہایت امانت سے (اس فرض کو) ادا کیا اور کامیابی کے ساتھ (دنیا سے) تشریف لے گئے اور ہم لوگوں میں حق کا وہ جھنڈا چھوڑ گئے [1] جس سے کوئی آگے بڑھے گا تو (دین) سے خارج ہوگا [2] اور جو اس سے پیچھے رہے گا وہ (حق سے) الگ ہو جائے گا اور جو اس سے لپٹا ہوگا وہی (حق سے) ملا رہے گا۔ [3] اس (جھنڈے) کا رہبر ٹھہر ٹھہر کر کلام [4] اور سست قیام کرنے والا (اور کسی کام

---

[1] علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ ''رَايَةُ الْحَقِّ'' سے مراد وہ ثقلین ہیں جن کو حضرت رسول خداؐ نے اپنے بعد امت کی ہدایت کے لیے چھوڑا تھا اور وہ دونوں قرآن مجید اور آپؐ کی عترت طاہرہ اہل بیتؑ ہیں۔

[2] ''مَرَقَ''، معنی نکل جائیں گے۔ اسی سے خارجی فرقہ کو حضرت رسول خداؐ نے مارقین کہا تھا کہ یہ حضرت علیؑ کا ساتھ چھوڑنے کی وجہ سے حق سے نکل جائیں گے۔

[3] مراد یہ ہے کہ حضرت رسول خداؐ نے ہماری ہدایت کے لیے حق کا جو جھنڈا (کتاب خدا و اہل بیتؑ) چھوڑا تھا اس سے جو شخص مخالفت کرے گا خواہ یہ مخالفت اس سے آگے بڑھ جانے کی صورت میں ہو یا پیچھے رہ جانے کی حالت میں وہ گمراہ ہی ہو کر رہے گا اور جو شخص اس کے ساتھ لپٹا اور اسی دامن سے متمسک رہے گا وہی حق اور صراط مستقیم پر قائم رہے گا۔

[4] ''مَكِيْثُ الْكَلَامِ''۔ معنی ٹھہر ٹھہر کر اور متانت و وقار سے کلام کرنے والا جو بولنے میں جلدی نہ کرے سوچ سمجھ کر زبان کھولے اور گھبرا کر اپنے مطلب کو ادا نہ کرے بلکہ اطمینان سے کہے۔ علامہ وحید الزمان صاحب انوار اللغۃ پارہ ۲۴ صفحہ ۳۷ میں لکھتے ہیں:

وَ خَلَّفَ فِيْنَا رَايَةَ الْحَقِّ دَلِيْلُهَا مَكِيْثُ الْكَلَامِ سَرِيْعُ الْقِيَامَ۔ (بقیہ صفحہ مابعد)

بَطِیْٓءُ الْقِیَامِ، سَرِیْعٌ اِذَا قَامَ.

کے) آمادہ ہوجانے پر تیزی سے اٹھنے والا ہے۔ ۱؎

فَاِذَآ اَنْتُمْ اَلْنَتُمْ لَهٗ رِقَابَكُمْ، وَ اَشَرْتُمْ اِلَيْهِ بِاَصَابِعِكُمْ، جَآئَهُ الْمَوْتُ فَذَهَبَ بِهٖ، فَلَبِثْتُمْ بَعْدَهٗ مَا شَآءَ اللّٰهُ حَتّٰى يُطْلِعَ اللّٰهُ لَكُمْ مَنْ يَّجْمَعُكُمْ وَ يَضُمُّ نَشْرَكُمْ.

پس جب تم اس کے لیے اپنی گردنوں کو جھکا دو گے ۲؎ اور اس کی طرف اپنی انگلیوں سے اشارہ کرنے لگو گے ۳؎ تو اس کی موت آپہنچے گی جو اس کو (دنیا سے) اُٹھالے جائے گی۔ ۴؎ تو اس کے بعد تم (یہاں) اتنا ہی ٹھہرو گے جس قدر خدا چاہے گا یہاں تک کہ خدا تمہارے لیے اس (غائب) شخص کو برآمد کرے گا جو تمہیں اکٹھا کر دے گا اور تمہاری پراگندگی (زائل کر کے تمہیں) ملا دے گا۔ ۵؎

(نقیہ صفحہ سابق) حضرت علیؑ نے کہا آنحضرتؐ نے ہم میں حق کا جھنڈا اور اس کی دلیل کو چھوڑا۔ (حضرت علیؑ نے اس سے اپنے تئیں مراد لیا) جو ٹھہر ٹھہر کر بات کرنے والا ہے اور کاموں کو جلدی پورا کرنے والا ہے۔

اور علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ

حضرتؑ نے اس سے اپنے نفس کو مراد لیا ہے کیونکہ عترت سے آپ ہی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور کتاب خدا کے بھی سب سے بڑے عالم اور اس کے رموز کے واقف حضرتؑ ہی ہیں۔

۱؎ یعنی وہ غور و فکر سے ہر کام کو کرتا ہے مگر جب اس کام کو اپنی جگہ طے کر لیتا ہے تو پھر اس کے انجام دینے میں سستی اور غفلت نہیں کرتا بلکہ کمال مستعدی اور کوشش سے اسے حد تک پہنچانے پر آمادہ ہوجاتا ہے۔ غرض اس کا ہر کام سوچ سمجھ کر ہوتا اور پھر تیزی سے انجام پاتا ہے۔

۲؎ یعنی اس کی اطاعت کرو گے۔

۳؎ یعنی اس کی تعظیم و اجلال کرو گے جس طرح بادشاہ کے سامنے زبانی بات کرنے کی جرأت نہیں ہوتی اور مخفی طور پر اس کی طرف انگلی سے اشارہ کر کے اپنا مطلب ادا کیا جاتا ہے۔

۴؎ حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے اپنی آخری خلافت کے تیسرے جمعہ میں یہ خطبہ ارشاد فرمایا تھا اور اس میں اپنی ہی حالت کی طرف اشارہ فرمایا ہے اور انہیں مطلع کیا کہ جب وہ لوگ آپ کی اطاعت میں اکٹھے ہوجائیں گے اور آپ کی بات ماننے لگیں گے تو اس کے بعد ہی آپ بہت جلد ان لوگوں سے جدا ہوجائیں گے اور دنیا سے انتقال فرما جائیں گے اور ایسا ہی واقع ہوا۔ کیونکہ لوگوں نے بیان کیا ہے کہ اہل عراق نے حضرت علیؑ کی اطاعت میں کبھی اپنی وہ جمعیت نہیں دکھائی اور اس قدر انہماک سے نہیں شریک ہوئے جو اس مہینہ میں نظر آئی جس میں حضرتؑ شہید کیے گئے اور جب انہوں نے پورے اجتماع کا سامان کیا اسی وقت ابن ملجم نے حضرتؑ کو قتل کیا۔ (ابن ابی الحدید جلد ۲ صفحہ ۱۹۲)

۵؎ یعنی اہل بیت علیہم السلام سے خدا ایک شخص کو پیدا کرے گا اور یہ حضرت مہدی آخر الزماں علیہ السلام کی طرف اشارہ ہے جو آخر وقت میں پیدا ہو کر دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دیں گے۔

فَلَا تَطْمَعُوْا فِیْ غَیْرِ مُقْبِلٍ، وَ لَا تَیْأَسُوْا مِنْ مُّدْبِرٍ، فَاِنَّ الْمُدْبِرَ عَسٰی اَنْ تَزِلَّ اِحْدٰی قَآئِمَتَیْهِ، وَ تَثْبُتَ الْاُخْرٰی، وَ تَرْجِعَا حَتّٰی تَثْبُتَا جَمِیْعًا.

توتم اس شخص سے کچھ طمع نہ کرنا (جو انتظام دنیا میں) متوجہ نہیں ہے اور اس سے مایوس نہ ہونا جو منہ موڑے (یعنی تمہاری نظروں سے غائب) ہے [1] کیوں کہ جو منہ موڑے ہے شاید اس کا ایک پایہ (ظاہری سلطنت) علیحدہ اور دوسرا پایہ (باطنی حکومت) جما ہو۔ پھر دونوں (ظاہری اور باطنی بادشاہتیں) پلٹ آئیں یہاں تک کہ سب برقرار ہوجائیں۔

اَلَا اِنَّ مَثَلَ اٰلِ مُحَمَّدٍ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، كَمَثَلِ نُجُوْمِ السَّمَآءِ: اِذَا خَوٰی نَجْمٌ طَلَعَ نَجْمٌ، فَكَاَنَّكُمْ قَدْ تَكَامَلَتْ مِنَ اللّٰهِ فِيْكُمُ

سنو! آل محمدؐ کی مثال آسمان کے ستاروں ایسی ہے کہ جب ایک ستارہ ڈوبتا تو دوسرا ستارہ نکل آتا ہے [2] پس گویا تم میں خدا کی جانب سے عطایا اور نعمتیں کامل ہو گئیں اور (اس نے) تمہیں وہ دکھا دیا جس کی امید میں

---

[1] بظاہر دونوں جملوں میں تناقض نظر آتا ہے مگر درحقیقت نہیں ہے۔ فرماتے ہیں کہ تم لوگ ہر نئے سردار اور حاکم سے اس کی امید نہ رکھو کہ وہ تمہارے امور کی اصلاح کر دے گا بلکہ یہ بات اسی سے ہوگی جس کو ظاہر ہونے سے پہلے تم لوگ پہچانتے نہ ہو گے وہ گمنامی کی حالت میں بسر کرتا ہوگا (یہ بھی حضرت امام آخر الزمان علیہ السلام کی طرف اشارہ ہے، اس کی تفصیل انشاء اللہ ضمیمہ میں آئے گی)۔

[2] یہ کلام بھی شیعوں کے اعتقاد کی قوی دلیل ہے کہ کوئی زمانہ حجت خدا اور امام سے خالی نہیں ہوگا جب ایک امام دنیا سے اٹھے گا تو دوسرا اس کی جگہ ضرور آجائے گا۔ چنانچہ اس وقت حضرت حجت عصر ہمارے امام انہیں اہل بیتؑ کی فرد ہیں، احادیث اہل سنت میں بھی اس سے ملتی جلتی حدیثیں ہیں کنز العمال جلد ۶ صفحہ ۲۱۶ میں ہے:

اَلنَّجُوْمُ اَمَانٌ لِاَهْلِ السَّمَاءِ وَ اَهْلُ بَيْتِيْ اَمَانٌ لِاُمَّتِيْ۔

اہل آسمان کے امان ستارے اور میری امت کے امان میرے اہل بیتؑ ہیں۔

اور منتخب کنز العمال جلد ۴ صفحہ ۴۰ میں ہے کہ حضرتؑ نے فرمایا:

لَا تَخْلُو الْاَرْضُ مِنْ قَائِمٍ لِلّٰهِ بِحُجَّةٍ، اِمَّا هُوَ مَشْهُوْرٌ، وَ اِمَّا خَائِفٌ مَغْمُوْرٌ، لِئَلَّا تَبْطُلَ حُجَجُ اللّٰهِ وَ بَيِّنَاتُهٗ۔

کہ زمین کسی وقت بھی خدا کی کسی قائم رہنے والی حجت سے خالی نہیں ہوسکتی خواہ وہ حجت (امام) مشہور ہو خواہ خوف کی حالت میں مخفی، تاکہ خدا کی حجتیں اور دلیلیں باطل نہ ہونے پائیں۔

الصَّنَآئِعُ، وَ اَرَاكُمْ مَا كُنْتُمْ تَأْمُلُوْنَ.

تم تھے۔[1]

❁ خطبہ :۹۹ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

وَهِيَ مِنَ الْخُطَبِ الَّتِيْ تَشْتَمِلُ عَلٰى ذِكْرِ الْمَلَاحِمِ۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ اَلْاَوَّلُ قَبْلَ كُلِّ اَوَّلٍ، وَ الْاٰخِرُ بَعْدَ كُلِّ اٰخِرٍ، بِاَوَّلِيَّتِهٖ وَجَبَ اَنْ لَّآ اَوَّلَ لَهٗ، وَ بِاٰخِرِيَّتِهٖ وَجَبَ اَنْ لَّآ اٰخِرَ لَهٗ.

وَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ شَهَادَةً يُّوَافِقُ فِيْهَا السِّرُّ الْاِعْلَانَ، وَ الْقَلْبُ اللِّسَانَ.

اَيُّهَا النَّاسُ! ﴿لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْ﴾، وَ لَا يَسْتَهْوِيَنَّكُمْ عِصْيَانِيْ، وَ لَا تَتَرَامَوْا بِالْاَبْصَارِ عِنْدَ مَا تَسْمَعُوْنَهٗ مِنِّيْ.

فَوَ الَّذِيْ فَلَقَ الْحَبَّةَ وَ بَرَاَ النَّسَمَةَ!

خطبہ(۹۹)

حضرت علیہ السلام کے ایک خطبہ کا کچھ حصّہ۔

اور یہ ان خطبوں سے ہے جن میں حوادث عظیمہ اور بڑی بڑی لڑائیوں کی طرف اشارہ ہے۔

ہر قسم کی حمد خدا ہی کے لیے ہے جو ہر اوّل سے پہلے اوّل تھا اور ہر آخر کے بعد آخر ہوگا۔ اس کی اوّلیت کی وجہ سے ضروری ہوا کہ اس کے لیے کوئی اوّل نہ ہو اور اس کے سب سے بعد رہنے کے سبب سے لازم ہوا کہ اس کے لیے کوئی آخر نہ ہو۔

اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ ایسی گواہی جس میں باطن مطابق ہے ظاہر کے اور دل (موافق ہے) زبان کے۔

بھائیو! میری مخالفت تمہیں (میری تکذیب پر) آمادہ نہ کرے اور میری نافرمانی تمہیں بہکا نہ دے اور جس وقت مجھ سے کچھ سنا کرو آپس میں اپنی آنکھوں کو ایک دوسرے کی طرف پھیر کر اشارہ بازی نہ کیا کرو (یعنی میری باتوں کو غلط نہ سمجھا کرو)۔

کیونکہ اس ذات کی قسم جس نے دانہ کو شگافتہ اور جاندار

---

[1] یہ قیامت کے متعلق ارشاد ہے اور گو وہ ہمیں دور معلوم ہوتی ہے مگر درحقیقت سر پر آگئی ہے اور گویا خدا نے اسے ہمیں دکھا دیا یعنی اس کے آثار ایسے واضح کر دیے کہ وہ دیکھنے کے برابر ہوگئی۔ چنانچہ قرآن مجید پارہ ۲۹ سورہ معارج آیہ ۶ میں ہے:

﴿اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا ۙ وَّ نَرٰىهُ قَرِيْبًا﴾

کہ یہ لوگ اس کو دور سمجھ رہے ہیں مگر ہم اس کو نزدیک ہی دیکھ رہے ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْ اَنْبَّئُکُمْ بِهٖ عَنِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، مَا کَذَبَ الْمُبَلِّغُ، وَ لَا جَهِلَ السَّامِعُ.

لَکَاَنِّیْ اَنْظُرُ اِلٰی ضِلِّیْلٍ قَدْ نَعَقَ بِالشَّامِ، وَ فَحَصَ بِرَایَاتِهٖ فِیْ ضَوَاحِیْ کُوْفَانَ. فَاِذَا فَغَرَتْ فَاغِرَتُهٗ، وَ اشْتَدَّتْ شَکِیْمَتُهٗ، وَ ثَقُلَتْ فِی الْاَرْضِ وَطْاَتُهٗ، عَضَّتِ الْفِتْنَةُ اَبْنَآئَهَا

کو پیدا کیا۔ ۱؎ میں تمہیں جس بات کی خبر دیتا ہوں اسے (حضرت) نبی امی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے (سنا) ہے۔ خدا کی قسم نہ تو (اس خبر کے) پہنچانے والے نے غلط کہا اور نہ یہ سننے والا جاہل تھا (جس نے اس کو نہ سمجھا ہو)۔ ۲؎

البتہ میں گویا اس بڑے گمراہ کی طرف دیکھ رہا ہوں جو شام میں چیخے چلائے گا اور اطراف کوفہ میں اپنے جھنڈوں کو حرکت دے گا۔ ۳؎ پس جب اس کا منہ کھل جائے گا اور اس کے سرکشی سخت ہو جائے گی اور زمین میں اس کا روندنا اور پامالی بڑھ جائے گی اس وقت فتنہ وفساد اپنے دانتوں

۱؎ علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ یہ وہ قسم ہے کہ حضرت امیر المومنینؑ برابر اسی طرح قسم کھایا کرتے اور یہ قسم بھی حضرتؑ کی ایجادوں اور جدتوں سے ہے۔ اور مولوی وحید الزمان خان صاحب انوار اللغۃ پارہ ۲۵ صفحہ ۵۶ میں لکھتے ہیں۔

''وَالَّذِیْ خَلَقَ الحَبَّةَ وبَرَاَ النَّسَمَةَ''۔

قسم اس پروردگار کی جس نے دانہ چیرا (اس کو اگایا) اور جاندار کو پیدا کیا۔

حضرت علیؑ اکثر اسی طرح قسم کھاتے تھے۔

۲؎ خبر پہنچانے والے اور سننے والے دونوں سے مراد حضرت علیؑ ہی ہیں فرماتے ہیں کہ نہ تو میں اس خبر کو حضرت رسول خداؐ سے بیان کرنے میں جھوٹا ہوں کہ حضرتؐ نے فرمایا نہ ہو اور میں اپنے دل سے کہتا ہوں اور نہ میں اس وقت جاہل تھا کہ حضرتؐ نے فرمایا کچھ ہو اور میں اسے سمجھا کچھ ہوں، بلکہ حضرتؐ نے جو فرمایا وہی میں تم سے بیان کرتا ہوں۔

۳؎ علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ اس ضلیل (بڑے گمراہ) سے مراد عبدالملک بن مروان مشہور خلیفہ بنی امیہ ہے کیونکہ یہ صفات اور علامتیں اس میں بمقابلہ دوسروں کے سب سے زیادہ پائی جاتی تھیں کیونکہ جب وہ شام میں بادشاہت کے لیے آمادہ ہوا تو اپنی طرف لوگوں کو بلایا اسی کو حضرتؑ نے فرمایا کہ ''چیخے چلائے گا'' اور اس کے جھنڈوں کو بار بار کوفہ میں حرکت دی گئی، کبھی اس وقت جب وہ خود عراق کی طرف چلا اور مصعب بن زبیر کو قتل کیا اور کبھی اس وقت جب اپنے حاکموں کو کوفہ کا والی مقرر کیا، مثل بشیر بن مروان وغیرہ کے۔ یہاں تک کہ حجاج کی نوبت آئی اور یہی زمانہ عبدالملک کی سرکشی سخت ہو جانے کا ہے اور اسی وقت فتنہ وفساد بہت تیز ہو گیا کیونکہ خوارج نے بہت سر اٹھا لیا تھا اور عبدالرحمن بن اشعث کی بغاوت نے بھی ملک کو تہ وبالا کر دیا تھا۔

پھر علامہ ممدوح لکھتے ہیں کہ بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ اس بڑے گمراہ سے حضرتؑ نے معاویہ کی طرف اشارہ کیا ہے اور ان فتنوں کی طرف جو اس کے زمانہ میں اور جو اس کے بعد مثل فتنہ یزید وابن زیاد اور شہادت حضرت امام حسین علیہ السلام وغیرہ کے ہوئے۔

بِاَنْيَابِهَا، وَ مَاجَتِ الْحَرْبُ بِاَمْوَاجِهَا، وَ بَدَا مِنَ الْاَيَّامِ كُلُوْحُهَا، وَ مِنَ اللَّيَالِيْ كُدُوْحُهَا.

فَاِذَآ اَيْنَعَ زَرْعُهٗ، وَ قَامَ عَلٰى يَنْعِهٖ، وَ هَدَرَتْ شَقَاشِقُهٗ، وَ بَرَقَتْ بَوَارِقُهٗ، عُقِدَتْ رَايَاتُ الْفِتَنِ الْمُعْضِلَةِ، وَاَقْبَلْنَ كَاللَّيْلِ الْمُظْلِمِ، وَ الْبَحْرِ الْمُلْتَطِمِ.

هٰذَا، وَ كَمْ يَخْرِقُ الْكُوْفَةَ مِنْ قَاصِفٍ، وَ يَمُرُّ عَلَيْهَا مِنْ عَاصِفٍ! وَ عَنْ قَلِيْلٍ تَلْتَفُّ الْقُرُوْنُ بِالْقُرُوْنِ، وَ يُحْصَدُ الْقَآئِمُ، وَ يُحْطَمُ الْمَحْصُوْدُ!

سے اپنی اولاد کو کاٹنے لگے گا اور جنگ اپنی موجوں سے جنبش کرنے لگے گی اور دنوں سے ان کی سختی اور راتوں سے ان کی شدت ظاہر ہونے لگے گی۔ ۱

پس جب ان (فتنوں) کی زراعت پختہ (تیار) ہو جائے گی اور اس کے رسیدہ میوے نہال ہو جائیں گے اور اس کی آوازیں بلند ہونے لگیں گی ۲ اور اس کی بجلیاں چمکنے لگیں گی ۳ اس وقت زیادہ مشکل فتنوں کے جھنڈے باندھے جائیں گے اور وہ ڈراؤنی رات اور تلاطم خیز سمندر کی طرح امنڈتے ہوئے بڑھیں گے۔

یہ تو ہے ہی، اور کوفہ کو تو نہ معلوم کتنے جھکڑ پھاڑیں گے اور کتنی تیز آندھیاں اس پر آئیں گی ۴ اور بہت جلد چند گروہ کے لوگ دوسرے گروہ کے لوگوں سے دست و گریباں ہوں گے ۵ اور کھڑے ہونے والے ٹکڑے کیے جائیں گے اور ٹکڑے کیے ہوئے پیسے جائیں گے۔ ۶

---

۱ ''کُلُوْحٌ''۔ معنی ترش روئی۔ اور ''کُدُوْحٌ''، جمع ہے کدح کی کہ جس کا معنی خراش، کھرونچ، زخم کے نشان ہیں۔ حضرتؑ نے دنوں کی ترش روئی اور راتوں کی خراش فرمایا تو مطلب یہ کہ یہ فتنے زمانہ میں برابر مستمر رہیں گے کیونکہ زمانہ میں یا دن ہوتا ہے یا رات۔ تو دن کی وہ حالت بیان ہوئی اور رات کی یہ۔

۲ ''هَدَرَتْ''۔ معنی اٹھی، بلند ہوئی، نکلی۔ ''شَقَاشِقُ''، جمع ہے شِقْشِقِيَّةٌ کی جس کا معنی اونٹ کا بڑبڑانا، آواز کرنا، چیخنا ہے۔

۳ یعنی اس کی تلواریں قتل وخونریزی کے لیے چمکنے لگیں گی۔

۴ ''قَاصِفٌ''۔ معنی خوب، سخت، مضبوط اور تیز ہوا، جو ہر اس چیز کو توڑ پھوڑ دیتی ہے جس پر سے وہ گزرتی ہے۔

۵ ''قُرُوْنٌ''، جمع ہے قَرْنٌ کی بمعنی گروہِ مردم یا لوگوں کی جماعت یا امت۔ علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ اس سے مراد بنی عباس ہیں جنہوں نے بنی امیہ کو نکال کر سلطنت اسلام پر قبضہ کیا۔

۶ یہ بنی امیہ کے حاکموں اور والیوں کے قتل وتباہی کی طرف اشارہ ہے کہ بنی عباس ان لوگوں کو اچھی طرح تباہ وبرباد کر دیں گے۔ پہلے جملے سے مراد بنی امیہ کے وہ لوگ ہیں جن کو بنی عباس لڑائیوں میں قتل کریں گے اور دوسرے جملے سے مراد وہ ہیں جن (بقیہ صفحہ مابعد)

❁ خطبہ :۱۰۰ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

يَجْرِيْ مَجْرَى الْخُطْبَةِ:

وَ ذٰلِكَ يَوْمٌ يَّجْمَعُ اللّٰهُ فِيْهِ الْاَوَّلِيْنَ وَ الْاٰخِرِيْنَ لِنِقَاشِ الْحِسَابِ وَ جَزَآءِ الْاَعْمَالِ، خُضُوْعًا، قِيَامًا، قَدْ اَلْجَمَهُمُ الْعَرَقُ، وَ رَجَفَتْ بِهِمُ الْاَرْضُ، فَاَحْسَنُهُمْ حَالًا مَّنْ وَّجَدَ لِقَدَمَيْهِ مَوْضِعًا، وَ لِنَفْسِهٖ مُتَّسَعًا.

[مِنْهُ]

فِتَنٌ كَقِطَعِ اللَّيْلِ الْمُظْلِمِ، لَا تَقُوْمُ لَهَا قَآئِمَةٌ، وَ لَا تُرَدُّ لَهَا رَايَةٌ، تَاْتِيْكُمْ مَزْمُوْمَةً

خطبہ(۱۰۰)

حضرت علیہ السلام کے ایک خطبہ کا کچھ حصّہ۔

جو اسی اوپر کے خطبہ کے طرز پر بیان ہوا ہے

اور یہ (روز قیامت) وہ دن ہوگا جس میں خدا اگلوں اور پچھلوں کو حساب کے (تحقیق و) تصفیہ اور اعمال کی جزا (وسزا) کے لیے (اس طرح) جمع کرے گا کہ وہ لوگ فروتنی سے کھڑے ہوں گے، پسینہ ان کے منہ تک پہنچ کر لگام کی طرح ہو جائے گا اور زمین انہیں زور سے ہلاتی ہوگی تو (اس روز) ان میں سب سے اچھی حالت اس شخص کی ہوگی جسے اپنے دونوں قدم (رکھنے) کے لیے کوئی مقام اور سانس لینے کے لیے کوئی کھلی جگہ مل جائے گی۔

[اسی خطبہ سے یہ بھی ہے]

اندھیری رات کی تاریکیوں ایسے فتنے (سامنے ہیں) ۱؎ جن کا نہ کوئی مستعد مقابلہ کر سکتا ۲؎ اور نہ جن کا کوئی جھنڈا پلٹایا جا سکتا ہے۔ ۳؎ وہ تم پر اس لگام دی ہوئی

(بقیہ صفحہ ماقبل) کو بغیر لڑے زور حکومت سے اور قید کر کے یا ان کے گھروں میں گھس کر یا ان کو گرفتار کرا کے قتل کریں گے اور واقعاً ایسا ہی ہوا۔ چنانچہ بنی عباس کے ابتدائی ارکان عبداللہ بن علی اور ابوالعباس سفاح نے بالکل ایسے ہی کیا۔

۱؎ ''قِطَعِ اللَّيْلِ'' جمع ہے قِطْعٌ کی جس کا معنی اندھیری تاریکی ہے۔ قرآن مجید پارہ ۱۲ سورہ ھود آیت ۸ میں ہے:

﴿فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ﴾

اے لوط تم رات کی اندھیری میں اپنے اہل وعیال کے ساتھ نکل بھاگو۔

۲؎ یعنی اس جنگ پر کوئی مستعد اور قوی جماعت بھی آمادہ نہیں ہو سکتی یا یہ کہ ان فتنوں کے لیے گھوڑوں کے پاؤں جم نہیں سکتے بلکہ ان کی شدت اور عظمت سے اکھڑ جائیں گے، غرض اس فتنہ والوں سے جنگ وجدال اور مقابلہ ومواجہہ کی کوئی تدبیر نہیں ہوگی اور اس کے لیے کوئی قایم قلعہ یا استوار عمارت ثابت نہیں رہے گی بلکہ منہدم ہو جائے گی۔

۳؎ یعنی کوئی جھنڈا شکست نہیں کھائے گا اور فرار نہیں کرے گا کیونکہ جب فوج کا کوئی حصہ شکست کھا کر بھاگتا ہے تو گویا اپنے پچھلے پاؤں پلٹ جاتا ہے۔

مَّرْحُوْلَةً: يَحْفِزُهَا قَآئِدُهَا، وَ يَجْهَدُهَا رَاكِبُهَا، اَهْلُهَا قَوْمٌ شَدِيْدٌ كَلَبُهُمْ، قَلِيْلٌ سَلَبُهُمْ، يُجَاهِدُهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَوْمٌ اَذِلَّةٌ عِنْدَ الْمُتَكَبِّرِيْنَ، فِي الْاَرْضِ مَجْهُوْلُوْنَ، وَ فِي السَّمَآءِ مَعْرُوْفُوْنَ.

پالان، کسی ہوئی (طیار) اونٹنی کی طرح [1] آئیں گے جس کو اس کا کھینچنے والا زور سے ہانکتا اور اس کا سوار تیزی سے [2] دوڑاتا ہو۔ یہ فتنوں والے ایسی قوم ہوں گے جن کی اذیت (یا حرص) تو سخت مگر ہمت و جرأت خفیف ہوگی۔ ان سے راہ خدا میں وہ قوم جہاد کرے گی جو متکبروں کے نزدیک تو ذلیل اور زمین میں مجہول الحال مگر آسمان پر مشہور و معروف ہوگی۔ [3]

فَوَيْلٌ لَّكِ يَا بَصْرَةُ عِنْدَ ذٰلِكَ، مِنْ جَيْشٍ مِّنْ نِّقَمِ اللّٰهِ! لَا رَهَجَ لَهٗ، وَ لَا حَسَّ، وَ سَيُبْتَلٰٓى اَهْلُكِ بِالْمَوْتِ الْاَحْمَرِ، وَ

تو اے بصرہ! اس وقت تجھ پر وائے ہے عذاب خدا کی اس لشکر سے جس کے (آنے میں) نہ غبار ہوگا نہ (اس کے پہنچنے کی) آہٹ ملے گی اور (اے بصرہ!) تیرے باشندے عنقریب لال موت اور گرد آلود بھوک میں مبتلا

---

[1] یعنی وہ اونٹنی جس کے اوزار و آلات پورے اور ساز و سامان مکمل ہوں مثل اس اونٹنی کے جس پر اس کا پالان کسا ہوا اور اس کی لگام اس کے منہ میں لگائی ہوئی ہوتی ہے تو وہ اس کے لیے مستعد اور آمادہ رہتی ہے کہ اس پر سوار چڑھ جائے۔

[2] مقصود یہ ہے کہ ان فتنوں کے بانی اور ایسے فتنہ پرداز خوب کوشش کریں گے اور پوری مستعدی سے ان فتنوں کی آگ کو بھڑکائیں گے خواہ سوار ہوں یا پیادے، ہر شخص ان فتنوں کے بڑھانے اور ترقی دینے ہی کی جدوجہد کرے گا۔ قائد (کھینچنے والے) سے مراد پیدل سپاہی ہیں۔ ''رَاكِبٌ'' سے مراد گھوڑے سوار سپاہی ہیں۔

[3] حضرتؑ فرماتے ہیں کہ یہی لوگ فتنہ پرداز ہوں گے جن کے اوصاف اوپر ذکر کیے گئے تو ان فتنہ پردازوں سے لڑنے اور جہاد کرنے کے لیے ایک ایسی قوم آمادہ ہوگی جو دنیا والوں کی نظروں میں تو ذلیل و خوار اور متکبر مغرور لوگوں کے خیال میں بے حقیقت اور حقیر ہوگی اور زمین کے رہنے والے ان کو گویا پہچانیں گے بھی نہیں، کیونکہ وہ بیچارے گمنام اور بے نشان ہوں گے، مگر خدا کے یہاں وہی معزز اور شریف اور حقیقی مومن ہیں کیونکہ مومنین کی صفت یہی ہے۔

چنانچہ قرآن مجید پارہ ۶ سورۂ مائدہ آیت ۵۵ میں ہے:

﴿اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ﴾

یعنی ایمانداروں کے ساتھ ذلیل اور کافروں پر عزیز ہیں۔

علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ یہ ایک دوسری جنگ کی پیشین گوئی ہے جو آخر زمانہ میں ہوگی اور حضرت رسول خداؐ نے بھی اسی قسم کی خبر دی ہے۔

الْجُوْعِ الْاَغْبَرِ!.

ہوں گے۔[1]

❁ خطبہ :۱۰۱ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

اُنْظُرُوْا اِلَى الدُّنْيَا نَظَرَ الزَّاهِدِيْنَ فِيْهَا، الصَّادِفِيْنَ عَنْهَا، فَاِنَّهَا وَاللّٰهِ! عَمَّا قَلِيْلٍ تُزِيْلُ الثَّاوِيَ السَّاكِنَ، وَ تَفْجَعُ الْمُتْرَفَ الْاٰمِنَ، لَا يَرْجِعُ مَا تَوَلّٰى مِنْهَا فَاَدْبَرَ، وَ لَا يُدْرٰى مَا هُوَاٰتٍ مِّنْهَا فَيُنْتَظَرَ.

سُرُوْرُهَا مَشُوْبٌ بِالْحُزْنِ، وَجَلَدُ الرِّجَالِ فِيْهَا اِلَى الضَّعْفِ وَ الْوَهْنِ، فَلَا يَغُرَّنَّكُمْ كَثْرَةُ مَا يُعْجِبُكُمْ فِيْهَا لِقِلَّةِ مَا يَصْحَبُكُمْ مِنْهَا.

خطبہ(۱۰۱)

حضرت علیہ السلام کے ایک خطبہ کا کچھ حصّہ۔

تم (بھی) دنیا کی طرف زاہدوں اور اس سے منہ موڑ لینے والوں کی طرح دیکھو کیونکہ خدا کی قسم یہ بہت جلد جم کر رہنے والوں کو فنا کر دیتی اور خوشحال مطمئن لوگوں کو دردرسیدہ کر دیتی ہے۔اس کی جس حالت نے گزر کر منہ پھیر لیا وہ اب آنہیں سکتی اور اس کی جو حالت آئندہ پیش آئے گی وہ معلوم نہیں ہوسکتی تا کہ اس کا انتظار کیا جائے۔[2]

اس کی خوشی غم سے ملی ہوئی رہتی ہے اور اس کے رہنے والوں کی قوت ضعف واضمحلال کی طرف بڑھتی جاتی ہے تو اس میں جس چیز سے تم خوش ہوتے ہو اس کی کثرت تمہیں دھوکہ میں نہ رکھے کیونکہ یہ بہت کم تمہارے ساتھ رہے گی۔[3]

---

[1] حضرتؑ نے اس لشکر سے قحط، خشک سالی اور طاعون کی طرف اشارہ کیا ہے جو بصرہ والوں میں اس طرح پھیلے گا کہ وہاں کے باشندوں کو ہلاک کر دے گا اور سرخ موت سے مراد وباء طاعون اور غبار آلود بھوک سے مراد خشک سالی اور قحط ہے اور قحط کو غبار آلود بھوک اس وجہ سے فرمایا کہ بھوکے کی آنکھوں میں تمام دنیا غبار آلود معلوم ہوتی ہے۔بعض لوگوں نے اس سے صاحب زنج کے واقعہ کو سمجھا ہے مگر یہ بعید ہے کیونکہ اس کا لشکر تو صاحب حسیں اور غبار آلود تھا (اس واقعہ کی تاریخی تحقیق انشاءاللہ ضمیمہ میں آئے گی)۔

[2] یعنی آدمیوں کے جو حالات گزر جاتے ہیں وہ پھر پلٹ کر نہیں آسکتے مثلاً جوانی، قوت جو جا چکی وہ کسی طرح لوٹ نہیں سکتی اور نہ آئندہ کے حالات کا علم حاصل ہوسکتا ہے کہ صحت ہوگی یا مرض، زندگی ہوگی یا موت، خوشی ہوگی یا رنج تا کہ اس کا انتظار کیا جائے کہ اب فلاں حالت آرہی ہے۔

[3] حضرتؑ نے دنیا کی لذتوں اور نعمتوں پر اترانے اور خوش ہونے سے منع فرمایا ہے اور اس کی وجہ وہ بیان کی جس کو ہم دن رات مشاہدہ کرتے رہتے ہیں کہ جن چیزوں سے ہم خوش ہوتے ہیں وہ بہت کم مدت تک ہمارے پاس رہنے پاتی اور جلد زائل ہو جاتی ہیں پھر انسان ایسی نہ پائیدار خوشی اور لذت پر کیوں پھولے۔

رَحِمَ اللّٰهُ امْرَأً تَفَكَّرَ فَاعْتَبَرَ، وَ اعْتَبَرَ فَأَبْصَرَ، فَكَأَنَّ مَا هُوَ كَآئِنٌ مِّنَ الدُّنْيَا عَنْ قَلِيْلٍ لَّمْ يَكُنْ، وَ كَأَنَّ مَا هُوَ كَآئِنٌ مِّنَ الْاٰخِرَةِ عَمَّا قَلِيْلٍ لَّمْ يَزَلْ، وَ كُلُّ مَعْدُوْدٍ مُّنْقَضٍ، وَ كُلُّ مُتَوَقَّعٍ اٰتٍ، وَ كُلُّ اٰتٍ قَرِيْبٌ دَانٍ.

خدا اس شخص پر رحم کرے جو غور و فکر سے کام لے کر عبرت حاصل کرے اور عبرت حاصل کر کے بینا ہو جائے۔ غرض دنیا کی جو چیز ہونے والی ہے گویا وہ بہت جلد معدوم ہو جائے گی [1] اور گویا آخرت کی جو چیز ہونے والی ہے وہ بہت جلد دائمی ہو جائے گی اور ہر وہ چیز جو قابل شمار ہے (یقیناً) ختم ہو جانے والی ہے اور ہر وہ چیز جس کی امید ہے آ کر رہے گی اور ہر آنے والی چیز قریب اور نزدیک ہے۔

[مِنْهَا]

[اسی خطبہ سے یہ بھی ہے]

اَلْعَالِمُ مَنْ عَرَفَ قَدْرَهٗ، وَ كَفٰى بِالْمَرْءِ جَهْلًا اَلَّا يَعْرِفَ قَدْرَهٗ، وَ اِنَّ مِنْ اَبْغَضِ

عالم تو وہی ہے جو اپنی حقیقت سمجھے اور انسان کی جہالت کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ آپ اپنی حقیقت نہ سمجھے [2] اور یقیناً خدا کے نزدیک لوگوں میں سب سے

---

[1] مقصود یہ ہے کہ دنیا میں جو چیز موجود ہے تھوڑے ہی زمانہ یعنی اجل معین کے بعد اور موت کا پیغام آ جانے پر معدوم اور فنا ہو جائے گی اور آخرت کی جو چیز موجود ہے یا ہوگی وہ بہت جلد یعنی تھوڑے ہی زمانے میں ایسی ہو جائے گی جو مٹ نہیں سکتی اور ہمیشہ رہے گی۔ تو یہاں تھوڑے زمانہ سے مراد قیامت کا آنا ہے اور وہ اگرچہ بہت دنوں میں آئے مگر مرنے والوں کو تو اس کی طولانی مدت کا احساس نہیں ہوگا۔ اس کے بعد حضرتؑ نے فرمایا کہ جو چیز شمار ہوتی ہے وہ یقیناً ختم ہو کر رہے گی اور جس چیز کی توقع ہے۔

[2] حضرتؑ کا قول ''اَلْعَالِمُ مَنْ عَرَفَ قَدْرَهٗ''، مشہور مثلوں سے ہے پھر لوگوں نے اسی قول پر دوسری مثلیں بہت کثرت سے کہی ہیں۔ اس کے بعد حضرتؑ نے اسی مضمون کو دوسری عبارت میں فرمایا کہ ''كَفٰى بِالْمَرْءِ جَهْلًا اَلَّا يَعْرِفَ قَدْرَهٗ'' تو یہ بھی ضرب المثل ہو گئی۔

علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ ''اس مضمون کے متعلق حضرت جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

مَا هَلَكَ امْرَءٌ عَرَفَ قَدْرَهٗ۔

جس شخص نے اپنی قدر پہچان لی وہ ہلاک نہیں ہوگا۔

پھر حضرتؑ نے فرمایا:

وَمَا اَخَالُ رَجُلًا يَرْفَعُ نَفْسَهٗ فَوْقَ قَدْرِهَا اِلَّا مِنْ خَلَلٍ فِيْ عَقْلِهٖ۔

کہ میں کسی شخص کو خیال نہیں کرتا کہ وہ اپنے نفس کو اس کی قدر سے زیادہ بلند کرے گا مگر وہ جس کی عقل میں خلل ہوگا۔

اور امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا کہ

جب میرے پدر بزرگوار حضرت زین العابدین علیہ السلام کی وفات کا وقت آیا تو مجھے اپنے سینہ سے لگا کر فرمایا: ''بیٹا میں

(بقیہ صفحہ آئندہ)

الرِّجَالِ اِلَی اللّٰہِ لَعَبْدًا وَّکَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی نَفْسِہٖ، جَآئِرًا عَنْ قَصْدِ السَّبِیْلِ، سَآئِرًا بِغَیْرِ دَلِیْلٍ، اِنْ دُعِیَ اِلٰی حَرْثِ الدُّنْیَا عَمِلَ، وَاِنْ دُعِیَ اِلٰی حَرْثِ الْاٰخِرَۃِ کَسِلَ! کَاَنَّ مَا عَمِلَ لَہٗ وَاجِبٌ عَلَیْہِ، وَ کَاَنَّ مَا وَنٰی فِیْہِ سَاقِطٌ عَنْہُ!.

زیادہ وہ بندہ دشمن رکھا جاتا ہے جس کو خدا نے اس کے حال پر چھوڑ دیا ہو[1] تو وہ میانہ روی کی راہ سے ہٹا ہوا رہتا اور بغیر کسی رہبر کے چلتا ہو۔ اگر دنیا کی کھیتی کی طرف بلایا جاتا ہے تو (فوراً) عمل کرنے لگتا ہے اور اگر آخرت کی کھیتی کی طرف بلایا جاتا ہے تو اس کو کسل ہونے لگتا ہے[2] معلوم ہوتا ہے کہ یہ جس کام کو کرتا ہے وہ تو اس پر واجب ہے اور جس میں یہ سُستی کرتا ہے شاید وہ اس سے ساقط ہے۔[3]

ترجمہ صحیفہ: تمہیں وہی وصیت کرتا ہوں جو مجھے میرے پدر بزرگوار (حضرت امام حسین علیہ السلام) نے اپنی شہادت کے دن (بروز عاشورہ) وصیت فرمائی تھی اور جس کے بارے میں حضرتؑ نے مجھ سے فرمایا تھا کہ وہی وصیت ان کے پدر بزرگوار (حضرت امیر المومنین علیہ السلام) نے ان سے کی تھی، بیٹا وہ وصیت یہ ہے کہ کبھی اپنے نفس کو (بڑا اور معزز نہ سمجھنا کہ یہ تکبر ہے بلکہ اسے) حقیر اور ذلیل سمجھنا۔ تمہارا باپ اپنے نفس کو اس قدر ذلیل اور حقیر سمجھتا ہے کہ اس کو سرخ رنگ کے اونٹ بھی خوش نہیں کرتے ہیں (یعنی اتنی بڑی دولت سے بھی وہ اپنے کو بڑا نہیں خیال فرماتے ہیں۔ سبحان اللہ روحی لہ الفدا''

اور حدیث میں ہے کہ جو شخص دنیا میں اپنے نفس کو جس قدر بڑھا کر دکھائے گا خدا بروز قیامت اس سے بدر جہا زیادہ گھٹائے گا اور ذلیل وخوار کرے گا۔

[1] اس کے حال پر چھوڑ دیا ہو یعنی اپنی اعانت اور الطاف سے اس کی مدد نہ کی ہو کیونکہ اس کو معلوم ہے کہ یہ اعانت اس کو نفع بخش نہیں ہوگی اور وہ اس سے فائدہ نہیں اٹھائے گا بلکہ اپنی جہالت میں مبتلا رہ کر گمراہ ہی رہے گا اور اس کو امور خیر وطاعت کی طرف کسی طرح توجہ نہیں ہوگی لہٰذا خدا نے اس کو اسی کی حالت پر چھوڑ دیا کہ جو چاہے کرے خود ہی اس کا برا نتیجہ حاصل کرے گا۔

[2] قرآن مجید پارہ ۲۵ سورۂ شوریٰ آیہ ۲۰ میں ہے:

﴿مَنْ کَانَ یُرِیْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَۃِ نَزِدْ لَہٗ فِیْ حَرْثِہٖ ۚ وَ مَنْ کَانَ یُرِیْدُ حَرْثَ الدُّنْیَا نُؤْتِہٖ مِنْھَا وَ مَا لَہٗ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنْ نَّصِیْبٍ﴾

کہ جو شخص آخرت کی کھیتی کا طالب ہو ہم اس کے لیے اس کی کھیتی میں افزائش کریں گے اور جو دنیا کی کھیتی کا خواستگار ہو تو ہم اس کو اسی میں سے دیں گے مگر آخرت میں پھر اس کا حصہ کچھ حصہ نہ ہوگا۔

[3] یعنی یہ شخص اپنے عمل سے ثابت کرتا ہے کہ دنیا طلبی اور عیش وراحت جس کی کوشش میں یہ دن رات منہمک ہے اس پر خدا کے یہاں سے واجب کی گئی ہے حالانکہ خدا نے اس کو واجب نہیں کیا ہے اور فکر آخرت، ایمانداری، تقویٰ، فرائض کی انجام دہی جس سے یہ سستی اور غفلت کرتا ہے اس پر واجب نہیں کی گئی اور اس سے ساقط ہے حالانکہ خدا نے ان چیزوں کو کسی سے بھی ساقط نہیں کیا اور ہر شخص کے لیے لازم کیا ہے۔

[مِنْهَا]

وَذٰلِكَ زَمَانٌ لَّا يَنْجُوْ فِيْهِ اِلَّا كُلُّ مُؤْمِنٍ نُّوْمَةٍ، اِنْ شَهِدَ لَمْ يُعْرَفْ، وَ اِنْ غَابَ لَمْ يُفْتَقَدْ، اُولٰٓئِكَ مَصَابِيْحُ الْهُدٰى، وَ اَعْلَامُ السُّرٰى، لَيْسُوْا بِالْمَسَايِيْحِ، وَ لَا الْمَذَايِيْعِ الْبُذُرِ، اُولٰٓئِكَ يَفْتَحُ اللّٰهُ لَهُمْ

[اسی خطبہ سے یہ بھی ہے]

اور وہ ایسا زمانہ ہوگا جس میں نجات نہیں پائے گا مگر وہی مومن جو بالکل گمنام اور بے شر ہو۱ کہ اگر موجود ہو تو پہچانا نہ جائے اور اگر غائب ہو تو ڈھونڈا نہ جائے۔ وہی لوگ ہدایت کے چراغ اور تاریک رات میں چلنے کے روشن نشان ہیں۔ ۲ وہ نہ تو فساد پھیلانے والے ہیں اور نہ لوگوں کی عیب جوئی کرنے والے بے وقوف احمق۔ ۳ وہ

---

۱ انوار اللغۃ پارہ ۲۵ صفحہ ۱۴۷ میں ہے:

خَيْرُ اَهْلِ ذٰلِكَ الزَّمَانِ كُلُّ مُؤْمِنٍ نُّوْمَةٍ۔

حضرت علیؑ نے اخیر زمانہ کے فتنوں اور فسادات کا ذکر کیا تو کہا اس زمانہ میں بہتر وہ مسلمان ہوگا جو گمنام ہو ایک گوشہ عافیت میں بیٹھا ہو، کسی معاملہ میں دخل نہ دے، فتنوں سے الگ رہے۔ بعضوں نے کہا ہے ''نُّوْمَةٍ'' بفتحہ واو بہت سونے والا اور گمنام شخص ''نُّوْمَةٍ'' بسکون واو کہیں گے۔

اِنَّهٗ قَالَ لِعَلِيٍّ مَا النُّوْمَةُ قَالَ: اَلَّذِيْ يَسْكُتُ فِي الْفِتْنَةِ لَا يَبْدُوْا مِنْهُ شَيْئٌ۔

ابن عباس نے حضرت علیؑ سے پوچھا ''نُوْمَةٌ'' کون شخص ہے انہوں نے کہا جو شخص فتنہ کے وقت خاموش رہے اس سے کوئی بات ظاہر نہ ہو۔

۲ علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کلام میں بھی ایک عبارت ایسی بھی وارد ہوئی ہے جو حضرت امیر المومنینؑ کے اس کلام سے ملتی جلتی ہے فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْاَبْرَارَ الْاَتْقِيَاءَ الْاَخْفِيَاءَ، الَّذِيْنَ اِذَا غَابُوْا لَمْ يُفْتَقَدُوْا، وَاِنْ حَضَرُوْا، وَلَمْ يُعْرَفُوْا، قُلُوْبُهُمْ مَصَابِيْحُ الْهُدٰى، يَخْرُجُوْنَ مِنْ كُلِّ غَبْرَاءَ مُظْلِمَةٍ۔

خدا ان مومنین کو دوست رکھتا ہے جو چھپے ہوئے (یعنی نام اور شہرت کے طالب نہیں ہوتے) ہیں، خدا سے ڈرتے رہتے ہیں، برائیوں سے علیحدہ رہتے ہیں ایسے ہیں کہ جب غائب ہوتے ہیں تو کوئی انہیں ڈھونڈتا نہیں اور جب حاضر ہوتے ہیں تو لوگ انہیں پہچانتے نہیں۔ ان کے دل ہدایت کے چراغ ہیں، ہر تیرہ و تار یک غبار آلود مقام سے نکلتے ہیں۔

۳ لوگوں کی عیب گیری، غیبت، چغل خوری کرنے کی سخت مذمت قرآن وحدیث میں ہے۔ قرآن مجید پارہ ۲۹ سورۂ ن آیت ۱۱ میں ہے:

﴿وَ لَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ۝ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۭ بِنَمِيْمٍ﴾

یعنی تم اس کی بات نہ ماننا جو زیادہ قسمیں کھاتا، ذلیل اوقات عیب جو، اعلیٰ درجہ کا چغل خور بدمعاش ہے۔

اَبْوَابَ رَحْمَتِهٖ، وَ يَكْشِفُ عَنْهُمْ ضَرَّآءَ نِقْمَتِهٖ.

اَيُّهَا النَّاسُ! سَيَأْتِيْ عَلَيْكُمْ زَمَانٌ يُّكْفَأُ فِيْهِ الْاِسْلَامُ، كَمَا يُكْفَأُ الْاِنَآءُ بِمَا فِيْهِ.

اَيُّهَا النَّاسُ! اِنَّ اللّٰهَ قَدْ اَعَاذَكُمْ مِنْ اَنْ يَّجُوْرَ عَلَيْكُمْ، وَ لَمْ يُعِذْكُمْ مِنْ اَنْ يَّبْتَلِيَكُمْ، وَ قَدْ قَالَ جَلَّ مِنْ قَآئِلٍ: ﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ وَّ اِنْ كُنَّا لَمُبْتَلِيْنَ﴾.

(قَالَ الرَّضِيُّ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى) اَمَّا قَوْلُهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ: ''كُلُّ مُؤْمِنٍ نُوَمَةٍ'' فَاِنَّمَا اَرَادَ بِهٖ: الْخَامِلَ الذِّكْرِ الْقَلِيْلَ الشَّرِّ.

وَ ''اَلْمَسَايِيْحُ'': جَمْعُ مِسْيَاحٍ، وَ هُوَ الَّذِيْ

ایسے ہیں جن کے لیے خدا اپنی رحمت کے دروازے کھول دے گا اور ان سے اپنی عقوبت کی اذیت زائل کر دے گا۔

لوگو! عنقریب تم پر ایسا زمانہ آیا چاہتا ہے جس میں اسلام اُلٹ دیا جائے گا جس طرح ظرف اپنی اس چیز کے ساتھ اُلٹ دیا جاتا ہے جو اس میں ہوتی ہے۔

لوگو! [1] یقیناً خدا نے تم کو اس سے تو محفوظ رکھا ہے کہ وہ تم پر کوئی ظلم کرے مگر تمہیں امتحان وہ آزمائش میں مبتلا کرنے سے نہیں بچایا ہے اور اس بزرگ ارشاد فرمانے والے نے تو کہہ بھی دیا ہے کہ ''اس میں بہت سی نشانیاں ہیں اور ہم یقیناً آزمائش کرنے والے ہیں''۔ [2]

(جناب سید رضی علیہ رحمہ نے فرمایا کہ) حضرت علیہ السلام کے قول ''كُلُّ مُؤْمِنٍ نُوَمَةٍ'' کا مطلب گمنام ونشان اور کم شر وفساد والا شخص ہے۔

اور ''اَلْمَسَايِيْحُ'' جمع ہے مسیاح کی اور یہ وہ شخص

---

[1] حضرتؑ فرماتے ہیں کہ عنقریب لوگوں پر ایسا زمانہ آئے گا جس میں امور دینیہ منقلب ہو کر اضداد کی طرف آجائیں گے اور احکام ایمان کے عوض ان کی نقیض اور عکس باتیں رائج ہو جائیں گی اور ہم اس زمانہ میں اسلام وایمان کی اس حالت کو اپنے آنکھوں سے مشاہدہ کر رہے ہیں کہ تقریباً ہر امر شریعت الٹ دیا گیا ہے، روحی لہ الفدا حضرتؑ نے کس قدر زمانہ قبل اس حالت کی تصویر کھینچ دی تھی۔

[2] حضرت علیہ السلام نے خبر دی ہے کہ اللہ اپنے عباد پر ظلم وجور نہیں کرے گا کیونکہ وہ عادل ہے اور ظلم اس کی ذات پر محال ہے لیکن وہ اپنے بندوں کو مبتلا کرے گا یعنی آزمائے گا اور جانچے گا۔ پھر حضرتؑ نے قرآن مجید کے پارہ ۸ سورہ مومنون کی آیت ۳۰ کی تلاوت فرمائی کہ

﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ وَّ اِنْ كُنَّا لَمُبْتَلِيْنَ﴾

یعنی اس میں شک نہیں کہ اس میں ہماری قدرت کی بہت سی نشانیاں ہیں اور ہم کو تو بس ان کا امتحان لینا منظور تھا۔

اور حضرتؑ کی مراد اس سے یہ ہے کہ جب لوگ برائی کرنے لگتے اور فساد پر آمادہ ہو جاتے ہیں تو خدا انہیں مجبور کر کے نیکی کی طرف نہیں لاتا ہے بلکہ انہیں چھوڑ دیتا اور امتحان لیتا ہے کہ اس حالت میں جو اچھا کام کرے اس کو ثواب دے اور جو برا کام کرے اس کو عذاب کرے۔

يَسِيْحُ بَيْنَ النَّاسِ بِالْفَسَادِ وَ الذَّمَآئِمِ.

وَ ''اَلْمَذَايِيْعُ'': جَمْعُ مِذْيَاعٍ، وَ هُوَ الَّذِیْ اِذَا سَمِعَ لِغَيْرِهٖ بِفَاحِشَةٍ اَذَاعَهَا وَ نَوَّهَ بِهَا. وَ ''اَلْبُذُرُ'' : جَمْعُ بَذُوْرٍ وَ هُوَ الَّذِیْ يَكْثُرُ سَفَهُهٗ وَ يَلْغُوْ مَنْطِقُهٗ.

ہے جولوگوں کے درمیان فساد پھیلاتا اور چغلی کھاتا پھرتا ہے۔

اور ''اَلْمَذَايِيْع'' جمع ہے مذیاع کی اور یہ وہ شخص ہے جو کسی دوسرے کی برائی سنتا ہے تو اس کو فاش کر دیتا اور پھیلاتا پھرتا ہے اور ''اَلْبُذُرُ'' جمع ہے بذور کی۔ اور یہ وہ شخص ہے جس کی بے وقوفی زیادہ اور اس کی باتیں بیہودہ ہوتی ہے۔

❁ خطبہ : ۱۰۲ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

اَمَّا بَعْدُ! فَاِنَّ اللّٰهَ سُبْحَانَهٗ بَعَثَ مُحَمَّدًا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، وَ لَيْسَ اَحَدٌ مِّنَ الْعَرَبِ يَقْرَاُ كِتَابًا، وَ لَا يَدَّعِیْ نُبُوَّةً وَّ لَا وَحْيًا. فَقَاتَلَ بِمَنْ اَطَاعَهٗ مَنْ عَصَاهُ، يَسُوْقُهُمْ اِلٰى مَنْجَاتِهِمْ، وَ يُبَادِرُ بِهِمُ السَّاعَةَ اَنْ تَنْزِلَ بِهِمْ، يَحْسِرُ

خطبہ (۱۰۲)

حضرت علیہ السلام کے ایک خطبہ کا کچھ حصّہ۔

(حمد و نعت کے) بعد (واضح ہو کہ) یقیناً خدائے سبحانہ وتعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو (دنیا میں) اس وقت بھیجا جب ملک عرب میں کوئی شخص نہ تو کوئی کتاب پڑھ سکتا اور نہ نبوت یا وحی کا دعویٰ کرتا تھا۔ تو جن لوگوں نے حضرتؐ کی اطاعت کی ان کے ہمراہ حضرتؐ ان لوگوں سے جہاد کر کے جو آپؐ کی نافرمانی کرتے ان لوگوں کو جائے نجات کی طرف کھینچتے رہے [1] اور ان کو قیامت کی طرف جلد جلد بڑھاتے رہے اس خوف سے کہ وہ ان پر دفعۃً نہ

---

[1] نجات سے خواہ نفس نجات مراد ہے خواہ نجات کی جگہ، غرض دونوں ممکن ہیں۔ انوار اللغۃ پارہ ۲۵ صفحہ ۲۴ میں ہے:

وَلَا مَلْجَاَ اِلَّا اِلَيْهِ۔

یعنی کوئی چھٹکارا اور پناہ کا مقام خدا کے سوا نہیں ہے۔

اسی سے عرب کا یہ قول بھی ہے:

اَلصِّدْقُ مِنْجَاةٌ

سچائی نجات دلانے والی ہے۔

الْحَسِيْرُ، وَ يَقِفُ الْكَسِيْرُ فَيُقِيْمُ عَلَيْهِ حَتّٰى يُلْحِقَهُ غَايَتَهٗ. اِلَّا هَالِكًا لَّا خَيْرَ فِيْهِ، حَتّٰى اَرَاهُمْ مَنْجَاتَهُمْ وَ بَوَّاَهُمْ مَحَلَّتَهُمْ، فَاسْتَدَارَتْ رَحَاهُمْ، وَ اسْتَقَامَتْ قَنَاتُهُمْ، وَايْمُ اللّٰهِ! لَقَدْ كُنْتُ مِنْ سَاقَتِهَا حَتّٰى تَوَلَّتْ بِحَذَافِيْرِهَا، وَ اسْتَوْسَقَتْ فِيْ قِيَادِهَا، مَا

آ پڑے۔[1] (عقائد میں) درماندہ شخص تھک جاتا اور (ضعف اعتقاد سے) شکستہ آدمی رک جاتا تھا تو حضرتؑ اس پر اس قدر توجہ فرماتے کہ اس کو اس (کے ایمان و نجات) کی حد تک پہنچا دیتے تھے سوا اس ہلاک ہونے والے کے جس میں خیر (کی امید) نہیں ہوتی۔[2] یہاں تک کہ ان کو نجات کی جگہ دکھا دی اور ان کو ان کے ٹھکانے لگا دیا۔ غرض ان کی چکی گھومنے لگی اور ان کا نیزہ سیدھا ہو گیا[3] اور خدا کی قسم میں برابر اس (زمانہ جاہلیت کی فوج) کے پچھلے حصہ میں رہا یہاں تک کہ وہ سب کی سب پھر

---

[1] مطلب یہ ہے کہ گویا آنحضرتؐ کو خوف تھا کہ حضرتؑ کی تبلیغ رسالت اور ہدایت ناس سے پہلے قیامت نہ آ جائے جس سے وہ لوگ عذاب میں مبتلا ہو جائیں تو حضرتؐ کوشش فرماتے تھے کہ اس کے آنے سے پہلے لوگوں کی ہدایت کر دیں اور ان کو سیدھا راستہ بتا دیں تا کہ وہ اپنی گمراہی سے نکل جائیں۔

[2] یہ پورا کلام بطور استعارہ و مجاز ہے اور مقصود یہ بیان کرنا ہے کہ حضرت رسول خداؐ کو اسلام پھیلانے کی ایسی حرص تھی اور آپ مسلمانوں پر اس قدر شفیق رہتے اور مہربانی کرتے کہ ان میں جس شخص کے اعتقاد میں کوئی ضعف پیدا ہوتا یا یقین میں تزلزل رونما ہوتا یا کسی امر میں شبہ ہوتا یا کوئی شک حادث ہوتا اس کی پوری نگرانی کرتے اور اس کے حال پر متوجہ رہتے اور برابر اس کے اعتقاد کو درست اور مضبوط اور اس کے شکوک کو زائل کرتے رہنے کی کوشش فرماتے رہتے تھے یہاں تک کہ شیطانی وسوسوں سے اس کے خیالات میں جو خرابیاں پیدا ہو جاتی ان کو زائل کر کے اس کی پوری اصلاح فرما دیتے اور اس کو پکا مومن بنا کر خالص اور اول درجہ کے ایمان والوں میں شامل کر دیتے اور اس امر میں کسی شخص کے متعلق حضرتؑ کوئی کوتاہی نہیں فرماتے۔ ہاں جس شخص کی شیطنت اور خباثت سے حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یقین ہوتا کہ یہ کوئی بات ماننے والا نہیں ہے اور اس کے اصلاح کسی طرح نہیں ہو سکتی اس کو تو حضرتؑ مایوس ہو کر چھوڑ دیتے تھے۔

اور حد تک پہنچانے کا مطلب یہ کہ اس میں اعتقاد حق اور پختہ یقین اور نجات کی قابل سند حالت پیدا کر کے لائق اطمینان مومن بنا دیتے تھے۔

[3] چکی گھوم گئی یعنی حالت درست اور منظم ہو گئی اور جس طرح نیزہ کجی کے بعد سیدھا ہوتا ہے اسی طرح ان لوگوں کے دین و مذہب کی حالت گمراہی سے نکل کر حق و راستی کی طرف آ گئی غرض وہ آدمی بن گئے۔

ضَعُفْتُ، وَلَا جَبُنْتُ، وَ لَا خُنْتُ، وَ لَا وَهَنْتُ، وَايْمُ اللّٰهِ! لَاَبْقُرَنَّ الْبَاطِلَ حَتّٰٓى اُخْرِجَ الْحَقَّ مِنْ خَاصِرَتِهٖ.

گئی ۱؎ اور اپنے بندھنوں میں سمٹ گئی۔ ۲؎ میں نے کبھی کمزوری نہیں دکھائی، نہ بزدل بنا، نہ خیانت کی اور نہ کبھی سستی اور کاہلی کو دخل دیا ۳؎ اور خدا کی قسم میں یقیناً باطل کو چیرتا پھاڑتا رہوں گا یہاں تک کہ حق کو اس کے اندر سے نکال لوں۔

۱؎ ''سَاقَتْهَا'' میں ہا کی ضمیر زمانۂ جاہلیت کی طرف پھرتی ہے گویا اس زمانہ کو حضرتؑ نے بجائے ایک لشکر کے قرار دیا جو اسلام کے لشکر سے مقابلہ کرتا رہا اور اپنے کو ان لوگوں میں قرار دیا جو اسلام کی طرف سے لشکر جاہلیت پر تلوار کے حملے کر رہے تھے یہاں تک کہ وہ زمانہ جاہلیت کا لشکر بھاگ گیا اور حضرت نے اس کا پیچھا کیا تو وہ بھاگتا ہی چلا گیا یہاں تک کہ پورا لشکر فرار کر گیا۔ غرض کفر و ضلالت کی تاریکی کو دنیا سے مٹانے اور اسلام و ایمان کا نور پھیلانے میں حضرت نے بڑا حصہ لیا اور دین و ملت حقہ حضرت کی جان فشانیوں کا بے حد ممنون احسان ہے۔

۲؎ علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ ہوسکتا ہے اس اسے مراد دین اسلام کا مستحکم ہو جانا اور جم جانا ہو یعنی جب زمانہ جاہلیت جاتا رہا تو دین اسلام اپنی حدود میں خوب پائیدار ہو گیا۔ اور ہوسکتا ہے کہ اس جملہ سے بھی زمانہ جاہلیت ہی مراد ہو یعنی زمانہ جاہلیت زائل ہو گیا تو ذلت اور گمنامی کی حالت میں سمٹ کر آ گیا کہ اس کا کوئی حصہ بچا نہیں۔

۳؎ حضرتؑ کی سستی اور بزدلی کا شبہ تو آپ کے دشمن کو بھی نہیں ہو سکا بلکہ مخالفین اسلام تک آپ کے جان فشانیوں کے مداح ہیں۔ آیہ ﴿وَ اَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ﴾ (سورۂ الشعراء، آیہ ۲۱۴) کے نازل ہونے پر جب آنحضرتؐ نے لوگوں سے دریافت کیا کہ اس دین کی اشاعت میں کون شخص میری مدد کرے گا اور سب خاموش رہے صرف حضرت علیؑ بار بار آمادہ ہوئے حالانکہ آپ اس وقت بہت کم عمر تھے اور قریش اس بات پر ہنسنے لگے۔

تو اس کے متعلق یورپین مؤرخ مسٹر کارلائل اپنی کتاب ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ میں لکھتا ہے کہ

''بعد میں ثابت ہو گیا کہ یہ ہنسنے کے لائق بات نہ تھی بلکہ بہت ٹھیک اور درست تھی۔ یہ نوجوان علی ایسا شخص تھا کہ ضرور ہے ہر شخص اس کو پسند ہی کرے اور اس امر سے جو اوپر بیان کیا گیا اور نیز اور باتوں سے جو ہمیشہ اس کے بعد اس سے ظہور میں آئیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک صاحب اخلاق فاضلہ اور محبت سے بھرپور اور ایسا بہادر شخص تھا جس کی آگ جیسی تیز و تند جرأت کے سامنے کوئی چیز نہیں ٹھہر سکتی تھی اس شخص کی طبیعت میں کچھ عجیب طور کے جوانمردی تھی شیر سا تو بہادر تھا مگر باوجود اس کے مزاج میں ایسی نرمی، رحم، سچائی اور محبت تھی جیسے کہ ایک عیسائی دیندار جوانمرد کے شایاں ہے''۔

سیمون اوکلے ہسٹری آف سارانس میں لکھتا ہے کہ

''یہ نامور خلیفہ بلحاظ اپنی ہمت و جرأت اور طبیعت و خصلت اور پاک دامنی و عفت اور فہم و فراست کے نہایت عظیم المرتبت لوگوں سے تھا جو امت اسلامیہ میں آج تک پیدا ہوئے''۔

[قَالَ الرَّضِیُّ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی] وَ قَدْ تَقَدَّمَ مُخْتَارُ هٰذِهِ الْخُطْبَةِ اِلَّا اَنِّیْ وَجَدْتُّهَا فِیْ هٰذِهِ الرِّوَایَةِ عَلٰی خِلَافِ مَا سَبَقَ مِنْ زِیَادَةٍ وَ نُقْصَانٍ فَاَوْجَبَتِ الْحَالُ اِثْبَاتَهَا ثَانِیَةً۔

[جناب سید رضی علیہ رحمہ نے فرمایا کہ]
اس خطبہ کا منتخب حصہ پہلے بھی (اس کتاب میں) گزر چکا ہے[1] مگر میں نے اس کو اس روایت میں پہلے کے کچھ خلاف پایا کہ کچھ اس سے زیادہ ہے اور کچھ کم، تو اس وجہ سے ضروری ہوا کہ یہ دوبارہ لکھ دیا جائے۔

❁ خطبہ: ۱۰۳ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَیْهِ السَّلَامُ

حَتّٰی بَعَثَ اللّٰهُ مُحَمَّدًا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، شَهِیْدًا وَّ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا، خَیْرَ الْبَرِیَّةِ طِفْلًا، وَ اَنْجَبَهَا كَهْلًا، اَطْهَرَ الْمُطَهَّرِیْنَ شِیْمَةً، وَ اَجْوَدَ الْمُسْتَمْطَرِیْنَ دِیْمَةً.

فَمَا احْلَوْلَتْ لَكُمُ الدُّنْیَا فِیْ لَذَّتِهَا، وَ لَا تَمَكَّنْتُمْ مِنْ رَّضَاعِ اَخْلَافِهَا، اِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا

خطبہ (۱۰۳)

حضرت علیہ السلام کے ایک خطبہ کا کچھ حصّہ۔

یہاں تک کہ خدا نے حضرت محمد (مصطفیٰ) صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو (اپنی ذات یا امت کا) گواہ[2] اور (خلق خدا کو) خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا درحالیکہ آپؐ بچپن میں بہترین مخلوق[3] اور ادھیڑ ہونے پر بھی شریف ترین شخص رہے اور خصلت میں پاکیزوں سے زیادہ طاہر اور باعتبار سخاوت کے کل سخیوں سے زیادہ بخشش کرنے والے تھے۔

تو دنیا اپنی لذت میں تمہارے لیے شیرین نہیں ہوئی اور اس کے پستانوں کے سرے سے دودھ پینے پر تمہارا بس نہیں چلا[4] مگر اس وقت جب تم نے اس کو اس حال میں

---

[1] دیکھو خطبہ ۳۴ جو اس کتاب کے صفحہ ۱۴۴ میں گزر چکا ہے۔

[2] یعنی حضرتؐ کی امت جو عمل خیر یا گناہ کا کام کرے گی حضرتؐ اس کی گواہی دیں گے۔

[3] واقعاً حضرتؐ بچپن میں بھی بہترین طفل تھے اپنے ساتھیوں سے الگ رہتے اور کھیل کود میں شریک نہیں ہوتے، غور وفکر، معرفت و مراقبہ میں بسر کرتے، بری باتوں سے پوری نفرت کرتے، اچھی صحبت میں رہتے جب ۹ یا ۱۴ سال کے تھے تو حضرت ابو طالب کے ہمراہ شام کا سفر کیا وہاں راہبوں نے آپ کے چہرے سے آثارِ عظمت وجلالت اور عقلی کمالات ومکارم اخلاق دیکھ کر صاف کہہ دیا کہ یہی پیغمبر آخر الزمان ہیں۔ (تاریخ طبری جلد ۲ صفحہ ۱۹۴)

[4] حضرتؑ صحابہ سے خطاب کر کے فرماتے ہیں کہ خدا نے حضرت رسول خداؐ کو اس سے محفوظ رکھا کہ دنیا آپ کے لیے کھولی جاتی اور دنیا کو آپ سے علیحدہ رکھ کر خدا نے حضرتؐ کا اکرام واحترام کیا تو نہ اس وقت شہر فتح کیے گئے، نہ مالوں کے خزانے (بقیہ صفحہ مابعد)

صَادَفْتُمُوْهَا جَآئِلًا خِطَامُهَا، قَلِقًا وَضِيْنُهَا، قَدْ صَارَ حَرَامُهَا عِنْدَ اَقْوَامٍ بِمَنْزِلَةِ السِّدْرِ الْمَخْضُوْدِ، وَ حَلَالُهَا بَعِيْدًا غَيْرَ مَوْجُوْدٍ. وَ صَادَفْتُمُوْهَا وَاللّٰهِ! ظِلًّا مَمْدُوْدًا اِلٰٓى اَجَلٍ

پایا کہ اس کی مہار ہلتی تھی اور اس کا تنگ جنبش کرتا تھا۔[1] اس کا حرام بعض لوگوں کے نزدیک ایسا ہو گیا جیسے کانٹا نکالی ہوئی بیری[2] اور حلال دُور (بلکہ) معدوم ہو گیا۔[3] اور خدا کی قسم تم نے اس (دنیا) کو جان لیا ہے کہ ایک

(بقیہ صفحہ ماقبل) مسلمانوں کو ملے، نہ بیت المال بنانے کی ضرورت ہوئی اور نہ دنیا تمہاری طرف متوجہ ہوئی اور نہ دولت کا مزہ تم کو ملا۔ ہاں جب حضرتؑ اٹھ گئے (اور دنیا دار لوگوں کے ہاتھ میں اسلام کی باگ آئی) تو فتوح بھی ہوئے اور خزانوں نے اپنے منہ بھی کھول دیے اور مسلمانوں پہ دولت ٹوٹ پڑی۔ پھر تم لوگوں نے دنیا کے خوب خوب مزے لیے اور پوری طرح عیش ونشاط کی زندگانی بسر کی۔ جو لوگ حضرت امیر المومنینؑ پر اعتراض کرتے ہیں کہ خلفائے ثلاثہ کی طرح آپ کے زمانہ میں بڑے بڑے ملک نہیں فتح ہوئے اور دنیاوی ترقی نہیں ہوئی ان کا بہترین جواب یہ کلام ہے کہ عہدِ رسولؐ میں بھی نہیں ہوئی۔

[1] یعنی تم نے دنیا کمانے کا موقع اسی وقت پایا جب اس کے خلیفہ کو اس کا انتظام کرنا دشوار ہو گیا کہ جس طرح وہ ناقہ جس کی مہار ہلتی ہو اور اس کا تنگ جنبش کرتا ہو جس سے اس کا ہودج یا پالان اس کی پیٹھ پر جمتا نہ ہو ایسی ناقہ پر کسی شخص کا سوار ہونا دقتوں اور دشواریوں میں مبتلا ہونا ہے کیونکہ نہ تو اس پر اطمینان سے بیٹھنے کا موقع ملے گا نہ اس کی مہار قبضہ میں رہے گی۔ اسی طرح جب خلافت اسلام کی یہ حالت ہو گئی تو تم خوب دنیا پرستی میں مشغول ہو گئے۔ انوار اللغۃ پارہ ۲۶ صفحہ ۶۵ میں ہے:

اِنَّكَ لَقَلِقُ الْوَضِيْنِ۔

تو تو ہلتا ہوا تنگ ہے جو برابر حرکت کرتا جاتا ہے تھمتا نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تجھ میں ثبات اور استقلال نہیں ہے۔

یہ حضرت علیؑ کا کلام ہے۔

[2] انوار اللغۃ پارہ ۵ صفحہ ۵۳ میں ہے:

حَرَامُهَا عِنْدَ اَقْوَامٍ بِمَنْزِلَةِ السِّدْرِ الْمَخْضُوْدِ۔

اس کا حرام مال بعض لوگوں کے نزدیک ایسا ہے جیسے بیری کا نٹا نکالی ہوئی، حلوائے بے دود، مزے سے اس کو اڑاتے ہیں۔

[3] یعنی حرام مال اس درجہ غالب ہو گیا کہ حلال کا پتہ بھی نہیں ملتا ہے۔ علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ یہ جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے جس کو حضرتؑ برابر اپنے قبل کے خلفاء کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ ان لوگوں نے اپنی حکومت وسلطنت میں پوری استبدادیت برتی اور خلافت کے لیے زیادہ سزاوار اور حقدار حضرت علیؑ ہی تھے۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا کا رنگ اور مذاق حضرت علیہ السلام کے خلاف ہو گیا تو باوجودیکہ اس کی حکومت اور انتظام کا حق حضرتؑ ہی کو تھا اور وہی اس کے اصلی مستحق تھے مگر قبل کے خلفاء نے اس کو اس طرح بگاڑ دیا کہ اب حضرتؑ کے قبضہ میں نہیں رہتی تو یہ حضرتؑ کو اپنے اوپر سے اس طرح علیحدہ کر رہی ہے جس طرح ڈھیلی تنگ والا اونٹ اپنی پشت پر سوار کو جم کر نہیں بیٹھنے دیتا ہے۔

مَّعْدُوْدٍ، فَالْاَرْضُ لَكُمْ شَاغِرَةٌ، وَ اَيْدِيْكُمْ فِيْهَا مَبْسُوْطَةٌ، وَ اَيْدِی الْقَادَةِ عَنْكُمْ مَكْفُوْفَةٌ، وَ سُيُوْفُكُمْ عَلَيْهِمْ مُسَلَّطَةٌ، وَ سُيُوْفُهُمْ عَنْكُمْ مَقْبُوْضَةٌ.

محدود زمانہ تک پھیلا ہوا سایہ [1] ہے تو زمین تمہارے لیے خالی ہے اور تمہارے ہاتھ اس میں پھیلے ہوئے اور تمہارے حقیقی اماموں کے ہاتھ تم سے روک دیے گئے ہیں اور تمہاری تلواریں ان پر مسلط رہتی مگر ان کی تلواریں تم لوگوں سے تھام لی گئی ہیں۔ [2]

اَلَآ اِنَّ لِكُلِّ دَمٍ ثَآئِرًا، وَ لِكُلِّ حَقٍّ طَالِبًا، وَ اِنَّ الثَّآئِرَ فِیْ دِمَآئِنَا كَالْحَاكِمِ فِیْ حَقِّ نَفْسِهٖ، وَ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَا يُعْجِزُهٗ مَنْ طَلَبَ، وَ لَا يَفُوْتُهٗ مَنْ هَرَبَ.

سُنو! ہر خون کا ایک بدلہ لینے والا اور ہر حق کا ایک خواہاں ہوتا ہے۔ تو ہمارے خون کا بدلا چاہنے والا ایسا ہے جو اپنے حق میں خود ہی فیصلہ کرے اور وہ خدا ہے۔ ایسا (خدا) کہ جس کو وہ طلب کرے وہ اس کو عاجز نہیں کر سکتا اور جو اس سے بھاگنا چاہے وہ اس کے قبضہ سے نکل نہیں سکتا۔ [3]

فَاُقْسِمُ بِاللّٰهِ يَا بَنِیْٓ اُمَيَّةَ! عَمَّا قَلِيْلٍ لَتَعْرِفُنَّهَا فِیْٓ اَيْدِیْ غَيْرِكُمْ وَ فِیْ دَارِ عَدُوِّكُمْ! اَلَا اِنَّ اَبْصَرَ الْاَبْصَارِ مَا نَفَذَ فِی

پس اے بنی امیہ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ بہت جلد تم اس (سلطنت) کو اپنے غیر کے ہاتھوں اور اپنے دشمن کے گھر میں پاؤ گے۔ [4] سنو! سب نظروں سے تیز وہ

---

[1] یعنی دنیا فانی ہے مثل چلتی پھرتی چھاؤں کے آخر سب ختم ہو جائیں گے اور زمین بالکل خالی ہو جائے گی۔

[2] یعنی مسلمانو! تمہارے ہاتھ تو دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں کہ جو چاہتے کرتے ہو مگر جو دنیا کی حکومت اور سرداری کے اصلی مستحق اور اہل تھے یعنی ائمہ طاہرینؑ ان کے ہاتھ روک دیے گئے ہیں کہ مجبور محض ہیں۔ تم لوگوں کے ظلم و عدوان اور فتنہ و فساد کو کسی طرح دفع نہیں کر سکتے۔ اور تمہاری تلواریں اہل بیت طاہرین پر مسلط رہتی ہیں جو تمہارے امام اور حقیقی خلیفہ و پیشوا ہیں مگر ان لوگوں کی تلواریں تم سے روک دی گئی ہیں کہ وہ حفاظت خود اختیاری بھی نہیں کر سکتے۔ حضرتؑ کے اس بیان سے معلوم ہو سکتا ہے کہ خلفائے ثلاثہ نے بھی حضرت امیر المومنینؑ و جناب سیدہؑ و حضرات حسنین کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا جس کا حضرتؑ اس طرح ماتم کر رہے ہیں۔ پھر ان کے جانشین معاویہ و یزید سے اور کیا امید ہو سکتی تھی۔

[3] یعنی ہر خون کا قصاص لینے والا کوئی نہ کوئی ہوتا ہے مگر آل محمدؐ اس قدر مجبور اور حقیر کر دیے گئے جن کے خون کا قصاص چاہنے کی کسی کو جرأت نہیں ہو سکتی۔ ہاں ہمارے قصاص کا دعویٰ خدا ہی کرے گا اور فیصلہ کر کے ظالموں کو سزا بھی وہی دے گا۔

[4] آخر میں حضرتؑ بنی امیہ کو خطاب کرتے ہیں کیونکہ یہی لوگ خلفاء ثلاثہ کے واقعی جانشین اور ہر کام میں ان کے قدم بقدم تھے۔ فرماتے ہیں کہ بہت جلد تم سے یہ حکومت نکل کر بنی عباس میں چلی جائے گی۔ اس کو کہتے ہیں علم اور پیشین گوئی کہ جیسا فرمایا ویسا ہی ہوا یعنی ۱۳۲ھ میں بنی عباس نے غالب ہو کر بنی امیہ کو بالکل فنا کر دیا۔

الْخَيْرِ طَرْفُهٗ! اَلَا اِنَّ اَسْمَعَ الْاَسْمَاعِ مَا وَعَى التَّذْكِيْرَ وَ قَبِلَهٗ.

نظر ہے جس کی نگاہ امور خیر میں گڑی رہے۔ سنو! سب کانوں سے زیادہ سننے والا وہ کان ہے جو نصیحت کو یاد رکھے اور اس کو قبول کر لے۔ ۱

اَيُّهَا النَّاسُ! اسْتَصْبِحُوْا مِنْ شُعْلَةِ مِصْبَاحِ وَّاعِظٍ مُّتَّعِظٍ، وَ امْتَاحُوْا مِنْ صَفْوِ عَيْنٍ قَدْ رُوِّقَتْ مِنَ الْكَدَرِ.

لوگو! جو واعظ خود بھی اپنے وعظ پر عمل کرتا ہے اس کے چراغ کی روشنی سے تم بھی اپنا چراغ جلا لو ۲ اور اس صاف چشمہ سے پانی بھر لو جو میل وغیرہ سے پاک کر لیا گیا ہے۔ ۳

عِبَادَ اللّٰهِ! لَا تَرْكَنُوْا اِلٰى جَهَالَتِكُمْ، وَ لَا تَنْقَادُوْا لِاَهْوَآئِكُمْ، فَاِنَّ النَّازِلَ بِهٰذَا الْمَنْزِلِ نَازِلٌ بِشَفَا جُرُفٍ هَارٍ، يَنْقُلُ

بندگانِ خدا! اپنی جہالت پر نہ اڑو اور اپنی ہوا و ہوس نفسانی کی پیروی میں نہ پڑے رہو کیونکہ اس منزل پر اترنے والا (درحقیقت) پھسپھسے، کھوکھلے گارے کے کنارے اترنے والا ہے ۴ جو تباہی کو اپنی پشت پر لاد کر

---

۱ یعنی سب سے تیز دیکھنے والی مدح وہ آنکھ ہے جس کی نگاہ اچھے ہی کاموں میں گڑی رہے اور سب سے تیز سننے والا وہ کان ہے جو نصیحت اور وعظ کو دل لگا کر سنے اور قبول کرے۔

۲ کیونکہ جو شخص اپنے وعظ پر خود ہی عمل نہیں کرتا دوسروں پر اس کا کیا اثر ہوگا۔ خدا فرماتا ہے:

﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ تَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ﴾ (سورہ البقرہ، آیہ ۴۴)

تم دوسروں کو اچھا کام کرنے کو کہتے ہو اور خود اپنے کو نہیں کہتے۔

نیز فرمایا:

﴿لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ﴾ (سورۂ الصّف، آیہ ۲)

جس کو تم خود نہیں کرتے اسے دوسروں کو کیوں کہتے ہو۔

اور شاعر نے بھی کہا ہے:

لَا تَنْهَ عَنْ خُلُقٍ وَتَاْتِيَ مِثْلَهٗ۔

تم کسی ایسی بات سے دوسروں کو نہ روکو جس کے ایسی تم خود کرتے ہو۔

یہاں چراغ سے مراد خود حضرتؑ کی ذات ہے۔

۳ اس چشمہ سے بھی مراد حضرتؑ ہی کی ذات ہے جو ہر میل اور کدورت سے پاک و پاکیزہ اور صاف ہے۔

۴ پارہ ۱۱ سورۂ توبہ آیت ۱۰۹ میں ہے:

﴿اَوَ مَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ﴾ (سورۂ التوبہ، آیہ ۱۰۹)

جس نے اپنی عمارت کی بنیاد پھسپھسے، کھوکھلے گارے کے کنارے بنائی تو وہ اس کو لے گری۔

الرَّدٰی عَلٰی ظَهْرِهٖ مِنْ مَّوْضِعٍ اِلٰی مَوْضِعٍ، لِرَأْیٍ یُّحْدِثُهٗ بَعْدَ رَأْیٍ، یُرِیْدُ اَنْ یُّلْصِقَ مَا لَا یَلْتَصِقُ، وَ یُقَرِّبَ مَا لَا یَتَقَارَبُ! فَاللّٰهَ اللّٰهَ! اَنْ تَشْكُوْا اِلٰی مَنْ لَا یُشْكِیْ شَجْوَكُمْ، وَ لَا یَنْقُضُ بِرَأْیِهٖ مَا قَدْ اُبْرِمَ لَكُمْ.

ایک جگہ سے دوسری جگہ لیے پھرتا ہے[1]، اس فاسد رائے کے لیے جس کو دوسری (فاسد) رائے کے بعد ایجاد کرتا رہتا ہے۔ جو چاہتا ہے کہ اس چیز کو ملا دے جو مل ہی نہیں سکتی اور اس چیز کو قریب کر دے جو نزدیک ہو ہی نہیں سکتی۔ تو اللہ سے (ڈرو اور) برائے خدا اس شخص کے پاس اپنی شکایتیں نہ لے جاؤ[2] جو تمہاری اذیت زائل نہیں کر سکتا اور نہ اپنی رائے تدبیر سے ان (شبہوں) کو دفع کر سکتا ہے جن کو (شیطان نے) تمہارے لیے قوی کر دیا ہے۔

اِنَّهٗ لَیْسَ عَلَی الْاِمَامِ اِلَّا مَا حُمِّلَ مِنْ اَمْرِ رَبِّهٖ: الْاِبْلَاغُ فِی الْمَوْعِظَةِ، وَ الْاِجْتِهَادُ فِی النَّصِیْحَةِ، وَ الْاِحْیَآءُ لِلسُّنَّةِ، وَ اِقَامَةُ الْحُدُوْدِ عَلٰی مُسْتَحِقِّیْهَا، وَ اِصْدَارُ السُّهْمَانِ عَلٰٓی اَهْلِهَا.

(خوب جان لو کہ) امام (وقت) کے ذمہ اس کے سوا کچھ نہیں جو اس کے پروردگار کی جانب سے اس پر لازم کیا گیا ہے۔ یعنی پند و نصیحت میں مبالغہ کرنا، سمجھانے میں پوری جدوجہد کرنا، سنت (رسول) کو زندہ رکھنا۔ (شریعت کی) حدوں کو ان کے سزاواروں پر قائم کرنا اور (میراث کے) حصوں کو ان کے مالکوں تک پہنچانا۔

فَبَادِرُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِ تَصْوِیْحِ نَبْتِهٖ، وَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُشْغَلُوْا بِاَنْفُسِكُمْ عَنْ مُّسْتَشَارِ الْعِلْمِ مِنْ عِنْدِ اَهْلِهٖ، وَانْهَوْا

تو علم حاصل کرنے میں جلدی کرو قبل اس کے اس کی گھاس سوکھ کر پژمردہ ہو جائے[3] اور قبل اس کے کہ تم (دوسرے جھگڑوں میں پھنس کر مجبور ہو جاؤ کہ) علم کو اس کے اہل کے پاس سے حاصل کرنے سے اپنے نفسوں کو باز رکھو اور اپنے غیر کو ہر برائی سے روکو اور خود بھی اس

---

[1] یعنی وہ برابر گمراہی پھیلانے کی کوشش میں رہتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کو ثابت کر دے جس کا ثبوت ہو نہیں سکتا اور اس مذہب کی تائید کرے جس کی تائید ہو نہیں سکتی۔

[2] یعنی اس کے پاس اپنی شکایت نہ لے جاؤ جو تمہاری شکایت کو رفع نہیں کر سکتا ہے اور دین میں اس کی کوئی رائے یا بصیرت نہیں ہے تا کہ شیطانی وسوسوں اور شبہوں کو دفع کر سکے۔

[3] یعنی اس سے پہلے کہ یہ صاحب علم مر جائے اور اس کا یہ سکھانے والا باقی نہ رہے اس سے مراد بھی خود حضرتؑ کی ذات ہے۔

عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تَنَاهَوْا عَنْهُ، فَاِنَّمَا اُمِرْتُمْ بِالنَّهْيِ بَعْدَ التَّنَاهِيْ!.

سے باز رہو کیونکہ تمہیں تو بس یہی حکم ہے کہ (خود برے کام سے) رکنے کے بعد (دوسروں کو بھی اس سے) روکا کرو۔

❁ خطبہ: ۱۰۴ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ شَرَعَ الْاِسْلَامَ فَسَهَّلَ شَرَآئِعَهٗ لِمَنْ وَرَدَهٗ، وَ اَعَزَّ اَرْكَانَهٗ عَلٰى مَنْ غَالَبَهٗ، فَجَعَلَهٗۤ اَمْنًا لِّمَنْ عَلِقَهٗ، وَ سِلْمًا لِّمَنْ دَخَلَهٗ، وَ بُرْهَانًا لِّمَنْ تَكَلَّمَ بِهٖ، وَ شَاهِدًا لِّمَنْ خَاصَمَ بِهٖ، وَ نُوْرًا لِّمَنِ اسْتَضَآءَ بِهٖ، وَ فَهْمًا لِّمَنْ عَقَلَ، وَ لُبًّا لِّمَنْ تَدَبَّرَ، وَ اٰيَةً لِّمَنْ تَوَسَّمَ، وَ تَبْصِرَةً لِّمَنْ عَزَمَ، وَ عِبْرَةً لِّمَنِ اتَّعَظَ، وَ نَجَاةً لِّمَنْ صَدَّقَ، وَ ثِقَةً لِّمَنْ تَوَكَّلَ، وَ رَاحَةً لِّمَنْ فَوَّضَ، وَ جُنَّةً لِّمَنْ صَبَرَ. فَهُوَ اَبْلَجُ الْمَنَاهِجِ،

خطبہ (۱۰۴)

حضرت علیہ السلام کے ایک خطبہ کا کچھ حصّہ۔[1]

جمیع حمد اس خدا کے لیے ہے جس نے شریعت اسلام کو ظاہر کیا تو اس تک پہنچنے والے کے لیے اس کی راہیں سہل کر دیں اور اس کے ارکان کو ان لوگوں پر کامیاب کر دیا جنہوں نے اس سے غالب رہنے میں مقابلہ کیا۔ تو اس نے اس (اسلام) کو امن قرار دیا اس شخص کے لیے جو اس سے وابستہ ہو اور سلامتی اس کے لیے جو اس میں داخل ہو اور حجت و برہان اس کے لیے جو اس سے کلام (اور استدلال) کرے اور گواہ اس کے لیے جو اس کی طرف سے مقابلہ کرے اور نور اس کے لیے جو اس سے روشنی لے اور سمجھ اس کے لیے جو عقل سے کام لے اور مغز اس کے لیے جو غور تدبر کرے اور نشان اس کے لیے جو تفرس کرے اور ہدایت اس کے لیے جو پختہ ارادہ کرے اور عبرت اس کے لیے جو نصیحت قبول کرے اور نجات اس کے لیے جو تصدیق کرے اور بھروسہ اس کے لیے جو توکل کرے اور آرام

---

[1] علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ یہ خطابۃ کا بہت ہی شریف باب ہے کیونکہ اس میں حضرتؑ نے ہر لفظ کے ساتھ اس کے مناسب لفظ ہی کو رکھا ہے کہ اس کی جگہ اگر دوسرا لفظ رکھا جاتا تو اس پر منطبق نہیں ہوتا اور نہ اس سے چسپاں ہوتا جیسے ''لِمَنْ عَقَلَهٗ'' کے لیے ''اَمْنًا'' اور ''لِمَنْ دَخَلَهٗ'' کے لیے ''سِلْمًا'' اور ''لِمَنْ تَكَلَّمَ'' کے لیے ''بُرْهَانًا'' اور ''لِمَنْ خَاصَمَ'' کے لیے ''شَاهِدًا'' اور ''لِمَنِ اسْتَضَآءَ'' کے لیے ''نُوْرًا'' فرمایا تا آخر کلام۔

وَاضِحُ الْوَلَائِجِ، مُشْرَفُ الْمَنَارِ، مُشْرِقُ الْجَوَادِّ، مُضِيْءُ الْمَصَابِيْحِ، كَرِيْمُ الْمِضْمَارِ، رَفِيْعُ الْغَايَةِ، جَامِعُ الْحَلْبَةِ، مُتَنَافِسُ السُّبْقَةِ، شَرِيْفُ الْفُرْسَانِ. التَّصْدِيْقُ مِنْهَاجُهٗ، وَ الصَّالِحَاتُ مَنَارُهٗ، وَ الْمَوْتُ غَايَتُهٗ، وَ الدُّنْيَا مِضْمَارُهٗ، وَ الْقِيٰمَةُ ۔۔۔

اس کے لیے جو (اپنے امور کو اس کے) حوالہ کر دے اور سپر اس کے لیے جو صبر کرے۔ غرض یہ نہایت روشن راستہ بہت واضح راہ، بلند مینار، کھلی اور چمکتی سڑک، چراغوں کا روشن کرنے والا، عمدہ میدان [1]، بلند جھنڈا [2]، گھوڑوں کا اکٹھا کرنے والا [3] اور ایسا ہے جس میں لوگ ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی سخت کوشش کرتے ہیں جس کے گھوڑے بڑی اچھی نسل کے ہیں۔ [4] تصدیق جس کا طریقہ اور اعمال صالحہ جس کے نشان ہیں اور موت جس کی آخری حد اور دنیا جس کا میدان اور قیامت جس کے گھوڑ دوڑ کی جگہ ہے۔ [5]

(اصل کتاب کا صفحہ ۳۴۵ موجود نہیں ہے مفتی جعفر حسینؒ کا ترجمہ درج کیا جا رہا ہے۔)

---

[1] ''مِضْمَارِ'' اس میدان کو کہتے ہیں جس میں شرط اور بازی کے گھوڑوں کو پہلے خوب کھلا پلا کر موٹا کر کے پھر دانہ چارہ کم کر کے روز دوڑاتے اور اس طرح دبلا کرتے ہیں۔

[2] ''غَايَتْ'' معنی جھنڈا اور یہاں اس سے وہ جھنڈا مراد ہے جو گھوڑ دوڑ کے میدان میں ایک لکڑی کے سرے پر کپڑا باندھ کر گھوڑ دوڑ کی آخری حد بتانے کے لیے گاڑ دیتے ہیں جس طرح اس زمانہ کے انگریزی کھیل فٹبال میں دو سروں پر گول ہوتا ہے اسی طرح گھوڑ دوڑ میں غایت (جھنڈا) ہوتا ہے۔

[3] ''حَلَبَةٌ'' ان گھوڑوں کو کہتے ہیں جو گھوڑ دوڑ کے لیے اکٹھے کیے گئے ہوں۔ انوار اللغۃ میں ہے:

اَلْاِسْلَامُ يَسِيْرُ الْمِضْمَارِ جَامِعَ الْحَلَبَةِ۔

اسلام کے دین کا میدان جہاں پر دوڑ ہوتی ہے چھوٹا ہے یعنی دنیا اور وہ سب گھوڑوں کو اکٹھا کرنے والا ہے یعنی قیامت کے دن۔

[4] گویا حضرتؑ نے اسلام کو بمنزلہ ان گھوڑوں کے قرار دیا ہے جو گھوڑ دوڑ کے لیے خاص ہوتے ہیں اور جن کے دوڑائے جانے کا میدان بہت عمدہ، ان کا جھنڈا بلند اور شاندار، ان کی جگہ اتنی وسیع کہ بکثرت گھوڑوں کو اکٹھا کر لے اور گھیر لے اور اس کی گھوڑ دوڑ ایسی۔۔۔

(حاشیہ نمبر ۵ کا کچھ حصہ اور حاشیہ نمبر ۶ دستیاب نہیں ہے۔)

حَلْبَتُهٗ، وَ الْجَنَّةُ سُبْقَتُهٗ.

[مِنْهَا: فِيْ ذِكْرِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم]

حَتّٰۤى اَوْرٰى قَبَسًا لِّقَابِسٍ، وَ اَنَارَ عَلَمًا لِّحَابِسٍ، فَهُوَ اَمِيْنُكَ الْمَاْمُوْنُ، وَ شَهِيْدُكَ يَوْمَ الدِّيْنِ، وَ بَعِيْثُكَ نِعْمَةً، وَ رَسُوْلُكَ بِالْحَقِّ رَحْمَةً. اَللّٰهُمَّ اقْسِمْ لَهٗ مَقْسَمًا مِّنْ عَدْلِكَ، وَ اجْزِهٖ مُضَاعَفَاتِ الْخَيْرِ مِنْ فَضْلِكَ. اَللّٰهُمَّ اَعْلِ عَلٰى بِنَآءِ الْبَانِيْنَ بِنَآئَهٗ، وَ اَكْرِمْ لَدَيْكَ نُزُلَهٗ، وَ شَرِّفْ لَدَيْكَ مَنْزِلَهٗ، وَ اٰتِهِ الْوَسِيْلَةَ۔۔۔

وَ اَعْطِهِ السَّنَآءَ وَ الْفَضِيْلَةَ، وَ احْشُرْنَا فِيْ زُمْرَتِهٖ غَيْرَ خَزَايَا، وَ لَا نَادِمِيْنَ، وَ لَا نَاكِبِيْنَ، وَ لَا نَاكِثِيْنَ، وَ لَا ضَالِّيْنَ، وَ لَا مُضِلِّيْنَ وَ لَا مَفْتُوْنِيْنَ.

(قَالَ السَّيِّدُ الرَّضِيُّ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى)

وَ قَدْ مَضٰى هٰذَا الْكَلَامُ فِيْمَا تَقَدَّمَ اِلَّآ اَنَّنَا كَرَّرْنَاهُ هٰهُنَا لِمَا فِي الرِّوَايَتَيْنِ مِنَ

اور جنت بڑھنے کا انعام ہے۔

[اسی خطبہ کا یہ جز نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق ہے]

یہاں تک کہ آپؐ نے روشنی ڈھونڈھنے والے کیلئے شعلے بھڑکائے اور (راستہ کھوکر) سواری کے روکنے والے کیلئے نشانات روشن کئے۔ (اے اللہ!) وہ تیرے بھروسے کا امین اور قیامت کے دن تیرا (ٹھہرایا ہوا) گواہ ہے، وہ تیرا نبی مرسل ورسول برحق ہے جو (دنیا کیلئے) نعمت ورحمت ہے۔ (خدایا!) تو انہیں اپنے عدل وانصاف سے ان کا حصہ عطا کر اور اپنے فضل سے انہیں دہرے حسنات اجر میں دے۔ (اے اللہ!) ان کی عمارت کو تمام معماروں کی عمارتوں پر فوقیت عطا کر اور اپنے پاس ان کی عزت و آبرو سے مہمانی کر اور ان کے مرتبہ کو بلندی وشرف بخش اور انہیں بلند درجہ دے۔ (اختتام ترجمہ مفتی صاحب)

اور حضرتؐ کو عظمت وجلالت عطا فرما اور ہمیں آپؐ کے گروہ میں اس طرح محشور فرما کہ ہم (اس وقت) نہ رسوا ہوں، نہ شرمندہ، نہ حق سے مڑے ہوئے، نہ عہد کے توڑنے والے، نہ (خود) کو گمراہ، نہ (دوسروں) کو گمراہ کرنے والے اور نہ فتنوں میں مبتلا ہونے والے۔

[جناب سید رضی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ

پہلے یہ کلام گزر چکا ہے[1] مگر ہم نے اس کو یہاں دوبارہ اس وجہ سے لکھ دیا کہ دونوں روایتوں میں کچھ

[1] یہ عبارت خطبہ ۷۰ میں جو اس نسخہ کے صفحہ ۲۲۲ میں ہے ذکر کی گئی ہے۔

الْاِخْتِلَافِ.

اختلاف ہے][1]

[مِنْهَا: فِيْ خِطَابِ اَصْحَابِهٖ]

[اسی خطبہ کا کچھ حصّہ جس کو اپنے اصحاب سے فرمایا][2]

وَ قَدْ بَلَغْتُمْ مِنْ كَرَامَةِ اللّٰهِ تَعَالٰى لَكُمْ مَّنْزِلَةً تُكْرَمُ بِهَا اِمَآؤُكُمْ، وَ تُوْصَلُ

خدائے تعالیٰ نے تم کو جو عزت دی ہے اس سے تم اس مرتبہ کو پہنچ گئے کہ تمہاری لونڈیوں تک کا اعزاز اور تمہارے

---

[1] علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ میں نے اپنے استاد ابوجعفر رحمہ اللہ سے جو بڑے انصاف پسند اور غیر متعصب تھے کہا کہ میں نے دوسرے صحابہ کے کلام اور خطبوں کو بھی دیکھا ہے تو ان میں کسی کو بھی نہیں پایا جو حضرت رسول خداؐ کی اس قدر تعظیم کرتا ہو جیسی حضرت امیر المومنینؑ کرتے ہیں اور نہ کوئی حضرتؐ کو اس طرح یاد کرتا ہے جس طرح جناب امیرؑ یاد کرتے ہیں۔ چنانچہ میں نے نہج البلاغہ وغیرہ کی بہت سی فصلوں کو دیکھا ہے جو اسی کلام کے مناسب ہیں کہ ان میں آپ حضرت رسول خداؐ کی بے حد تعظیم و اجلال اور نہایت درجہ اکرام و احترام اور تبجیل و توقیر فرماتے ہیں تو اس کی کیا وجہ؟ مرحوم نے فرمایا: یہ تو بتاؤ کہ جناب امیرؑ کے سوا جو صحابہ تھے ان کا کوئی مدون (ترتیب دیا ہوا) کلام بھی تم کو کہیں ملتا ہے جس سے معلوم ہو سکے کہ انہوں نے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کس طرح ذکر کیا ہے؟ سوا چند لغو، مہمل، بے مزہ، بے نفع کلموں کے جو زبان سے بے سوچے سمجھے نکلے ہیں اور بھی کوئی کلام صحابہ کا ہوا ہے؟ پھر حضرتؑ کے مقابلہ میں ان صحابہ کا کیا شمار ہے۔

پھر مرحوم نے فرمایا کہ حضرت علی علیہ السلام جناب رسالت مآبؐ پر ایمان رکھنے اور آپ کی تصدیق کرنے میں بہت قوی اور پختہ یقین کے تھے اس کے خلاف کسی طرح ہل ڈول نہیں سکتے تھے اور انہی خیالات پر متحقق اور جمے ہوئے رہتے تھے۔ ان باتوں کے علاوہ آپ حضرت رسول خداؐ پر فدا بھی رہتے کیونکہ اول تو آپ کا خون حضرتؐ سے ملا ہوا تھا۔ پھر حضرتؐ ہی نے آپ کی پرورش بھی کی تھی اور دوسرے صحابہ کے مقابلہ میں آپ کو حضرتؐ سے خصوصیت بھی کمال درجہ کی حاصل تھی۔ علاوہ بریں حضرت رسول خداؐ کا شرف عین حضرت علیؑ ہی کا شرف تھا کیونکہ دونوں بزرگوار مثل ایک روح کے تھے جس کے قالب اور جسم دو تھے۔ جن کے دادا بھی ایک، گھر بھی ایک، خاندان بھی ایک، اخلاق بھی دونوں کے یکساں، طبیعت بھی ایک طرح، غرض دونوں بزرگ درحقیقت ایک ہی تھے اور ان کی ایک ہی خواہش، ایک ہی مقصد زندگی تھا۔ اسی وجہ سے تو حضرت علیؑ جان توڑ کوشش کرتے تھے کہ اسلام کی روشنی دنیا کے چپّہ چپّہ تک پہنچ جائے اور سب ایک ہی قبلہ کی طرف جھک جائیں۔ پھر آپ کیوں نہ حضرتؐ کی اس درجہ تعظیم و تبجیل فرماتے۔ (اس کے بعد علامہ ممدوح نے جناب امیرؑ و جناب ابوطالبؑ کے ان احسانوں کو ذکر کیا ہے جو اسلام پر ان حضرات نے کیے۔ (اس کی تفصیل انشاء اللہ ضمیمہ میں آئے گی)

[2] جنگ صفین میں شکست کھانے اور قصّۂ تحکیم میں مکر و فریب کرنے کے بعد معاویہ اور عمرو عاص نے حضرتؑ کو اس طرح پریشان کرنا شروع کیا کہ تھوڑا تھوڑا لشکر حضرتؑ کے مختلف شہروں پر بھیج دیتے کہ جا کر لوٹ مار، قتل و غارت کریں۔ مثلاً بصرہ، عین التمر، ہیت، انبار وغیرہ کے واقعات تو حضرتؑ اس جگہ انہیں شہروں کے لوگوں کو خطاب کرتے ہیں جو اپنے شہروں کو ان لشکروں کے حوالہ کر دیتے تھے۔ ان سے فرماتے ہیں کہ پہلے تم یہودی، مجوسی، بت پرست تھے تو کس قدر ذلیل سمجھے جاتے اور اسلام لانے کے بعد تم کو کیسے عزت ہو گئی کہ سب سے ممتاز ہو گئے اور سب تمہاری تعظیم کرنے لگے، تم سے ڈرنے لگے، تم کو اپنا سردار ماننے لگے۔

بِهَا جِيْرَانُكُمْ، وَ يُعَظِّمُكُمْ مَّنْ لَّا فَضْلَ لَكُمْ عَلَيْهِ، وَ لَا يَدَ لَكُمْ عِنْدَهٗ، وَ يَهَابُكُمْ مَنْ لَّا يَخَافُ لَكُمْ سَطْوَةً، وَ لَا لَكُمْ عَلَيْهِ اِمْرَةٌ.

ہمسائیوں کے ساتھ بھی صلہ رحم کیا جاتا ہے اور وہ لوگ تمہاری تعظیم کرنے لگے جن پر تم کو کوئی فضیلت نہیں ہے اور نہ ان پر تمہارا کوئی احسان ہے۔ اور تمہاری ہیبت ان پر قائم ہوگئی ہے جو کچھ تمہاری سطوت سے نہیں ڈرتے اور نہ تم کو ان پر حکومت (کا حق) ہے۔

وَ قَدْ تَرَوْنَ عُهُوْدَ اللّٰهِ مَنْقُوْضَةً فَلَا تَغْضَبُوْنَ! وَ اَنْتُمْ لِنَقْضِ ذِمَمِ اٰبَآئِكُمْ تَأْنَفُوْنَ! وَ كَانَتْ اَمْوُرُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ تَرِدُ، وَ عَنْكُمْ تَصْدُرُ، وَ اِلَيْكُمْ تَرْجِعُ، فَمَكَّنْتُمُ الظَّلَمَةَ مِنْ مَّنْزِلَتِكُمْ، وَ اَلْقَيْتُمْ اِلَيْهِمْ اَزِمَّتَكُمْ، وَ اَسْلَمْتُمْ اُمُوْرَ اللّٰهِ فِيْۤ اَيْدِيْهِمْ، يَعْمَلُوْنَ بِالشُّبُهَاتِ، وَ يَسِيْرُوْنَ فِي الشَّهَوَاتِ، وَ اَيْمُ اللّٰهِ! لَوْ فَرَّقْتُمْ كُلَّ كَوْكَبٍ لَّجَمَعَكُمُ اللّٰهُ

اور (باوجود ان احسانوں کے) تم دیکھتے ہو کہ خدا کے عہد توڑے جارہے ہیں مگر اس سے تم میں غیظ وغضب نہیں پیدا ہوتا حالانکہ تمہارے آباؤ اجداد کے جو عہد توڑے جاتے ہیں اس سے (فوراً) تم میں غیرت کا جوش ہونے لگتا ہے[1] حالانکہ تم تک احکام خدا پہنچتے اور پھر تم سے لوٹتے اور (سہ بارہ) تمہاری ہی طرف واپس آتے تھے۔[2] مگر تم نے ظالموں کو اپنے مرتبہ پر قبضہ دے دیا اور اپنی مہاریں ان کے حوالہ کر دیں اور خدائی امور کو ان کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا۔ اب وہ شبہوں پر عمل کرتے اور اپنی خواہشوں (کی پیروی) میں رفتار رکھتے ہیں اور بخدا اگر وہ لوگ تمہیں ایک ایک ستارے کے نیچے پراگندہ کر دیں جب بھی خدا تم کو اس روز اکٹھا کر کے رہے گا جو ان کے لیے سخت ترین

---

[1] یعنی کس قدر حیرت اور عجب ہے کہ انسان اپنے آباؤ اجداد کے عہد و پیمان ٹوٹنے پر تو غضبناک ہو اور غیرت سے اپنی جان دینے پر آمادہ ہو جائے مگر خدا جو اس کا خالق، اس کا رب، اس کا منعم اور رازق ہے اس کے عہد و پیمان توڑے جائیں اور کسی کو اس کی پرواہ نہ ہو اور کسی کو غصہ نہ آئے۔

[2] یعنی مجھ ہی سے تم لوگوں کو احکام خدا اور رسول کا علم ہوتا ہے اور میں ہی تمہیں بتاتا اور تمہاری تعلیم و اصلاح کرتا ہوں۔ پھر وہ احکام اور مسائل تم سے لوٹ کر تمہارے ان شاگردوں، دوستوں اور مخصوصین تک پہنچتے ہیں جن کو تم سکھاتے اور بتاتے ہو، پھر تمہاری اولاد اور اعزہ واقربا انہیں علوم و مسائل و احکام کو تمہارے شاگردوں سے حاصل کرتے ہیں تو اس طرح وہ کل چیزیں تم تک واپس آجاتی ہیں۔

لِشَرِّ يَوْمٍ لَّهُمْ.

دن ہوگا۔ [1]

❁ خطبہ :۱۰۵ ❁

وَ مِنْ كَلَامٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

فِيْ بَعْضِ اَيَّامِ صِفِّيْنَ

وَ قَدْ رَاَيْتُ جَوْلَتَكُمْ، وَ انْحِيَازَكُمْ عَنْ صُفُوْفِكُمْ، تَحُوْزُكُمُ الْجُفَاةُ الطَّغَامُ، وَ اَعْرَابُ اَهْلِ الشَّامِ، وَ اَنْتُمْ لَهَامِيْمُ الْعَرَبِ، وَ يَاٰفِيْخُ الشَّرَفِ، وَ الْاَنَفُ الْمُقَدَّمُ، وَ السَّنَامُ الْاَعْظَمُ، وَ لَقَدْ شَفٰى وَ حَاوِحَ صَدْرِيْ اَنْ رَّاَيْتُكُمْ بِاٰخَرَةٍ، تَحُوْزُوْنَهُمْ كَمَا حَازُوْكُمْ، وَ تُزِيْلُوْنَهُمْ عَنْ مَّوَاقِفِهِمْ كَمَآ اَزَالُوْكُمْ حَسًّا بِالنِّصَالِ، وَ شَجْرًا بِالرِّمَاحِ،

خطبہ(۱۰۵)

حضرت علیہ السلام کے ایک کلام کا کچھ حصّہ۔

جسے جنگ صفین میں کسی دن فرمایا:

اور البتہ میں نے تمہارے پلٹنے اور اپنی صفوں سے ہٹنے کو دیکھا کہ اکھڑ، اوباش، کمینے اور شام کے بدو لوگ تمہیں (تمہاری جگہ سے) ہٹاتے تھے حالانکہ تم (ملک و قوم) عرب کے سردار [2] اور فخر و شرف کی چوٹی اور اونچی ناک اور بزرگ و بلند ترین کوہان ہو۔ [3] لیکن خیر میرے سینہ کی حرقت اور دل کی سوزش کو اس امر نے ٹھنڈک پہنچا دی کہ میں نے (اپنی آنکھوں سے) دیکھ لیا آخر کار تم بھی ان کو اسی طرح بھگانے لگے جیسے انہوں نے (پہلے) تم کو بھگایا تھا اور تیروں سے مار کر اور نیزوں سے کونچ کر تم بھی ان کو ان کی جگہوں سے اس طرح ہٹانے لگے جیسے انہوں

---

[1] حضرتؑ قسم کھا کر فرماتے ہیں کہ اگر بنو امیہ تم لوگوں کو اس قدر پراگندہ اور متفرق کر دیں کہ تم میں کا ایک ایک شخص ایک ایک ستارے کے نیچے پہنچ کر چھپ جائے جب بھی خدا تمہیں اس روز اکٹھا کر دے گا جو ان بنی امیہ کے لیے بدترین دن ہوگا یعنی اس دن جب بنی عباس ان پر حملہ کریں گے تو تم سب مل جاؤ گے اور بنی عباس کے ساتھ ہو کر ان کو ہلاک کرو گے۔ حضرتؑ کی یہ پیشین گوئی بالکل پوری ہوئی کیونکہ ۱۳۲ھ میں خراسان والوں کے ساتھ عراق والے بھی مل گئے اور دونوں نے بنی امیہ کو مٹا دیا۔

[2] ''الطَّغَامُ'' معنی اوباش۔ کمینے لوگ۔ ''لَهَامِيْمُ'' جمع ہیں لَهْمُوْمٌ کی بمعنی سردار، آگے رہنے والا، جس طرح بعض مقام پر چودہری اور مکھیا ہوتے ہیں۔

[3] ''يَاٰفِيْخُ'' جمع ہے يَافُوْخٌ کی بمعنی سر کی چندیا۔ انوار اللغۃ میں ہے:

وَاَنْتُمْ لَهَا مِيْمُ الْعَرَبِ وَيَا فَيْخُ الشَّرَفِ۔

تم عربوں کے اعلیٰ ذات والے اور شرف و بزرگی کی چندیا ہو۔

تَرْكَبُ اُولَاهُمْ اُخْرَاهُمْ كَالْاِبِلِ الْهِيْمِ الْمَطْرُوْدَةِ، تُرْمٰى عَنْ حِيَاضِهَا، وَ تُذَادُ عَنْ مَّوَارِدِهَا.

نے تم کو ہٹایا تھا[1] کہ پیاسے اور مارے بھگائے ہوئے اونٹوں کی طرح جو (پانی پینے کے) گڑھوں سے دھتکارے جاتے اور اپنی گھاٹوں سے علیحدہ کر دیا جاتے ہیں ان کا اگلا حصہ پچھلا حصہ پر گرا پڑتا تھا۔[2]

❁ خطبہ :۱۰۶ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

وَ هِيَ مِنْ خُطَبِ الْمَلَاحِمِ۔

خطبہ(۱۰۶)

حضرت علیہ السلام کے ایک خطبہ کا کچھ حصّہ۔

اور یہ بڑے عظیم الشان حوادث کے خطبوں سے ہے۔[3]

---

[1] ''حَسًّا''، معنی قتل کرنا قرآن مجید سورۂ آل عمران آیت ۱۵۲ میں ہے:

﴿اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ﴾

جب تم اس کی اجازت سے ان لوگوں کو قتل کرتے تھے۔

انوار اللغۃ میں ہے:

لَقَدْ شَفٰى وَ حَاوِحَ صَدْرِيْ حَسُّكُمْ اِيَّاهُمْ بِالنِّصَالِ كَمَآ اَزَالُوْكُمْ حَسًّا بِالنِّصَالِ۔

میرے سینہ کے ٹسکوں کو اس سے تسلی ہوگئی جو تم نے ان کو تیر مار مار کر تمام کر دیا۔ یعنی میرے دل کی بھڑاس نکل گئی جیسے انہوں نے تیر مار مار کر تباہ کیا تھا۔

''شَجْرًا'' معنی نیزے سے کو نچنا۔

[2] جنگ صِفین میں معاویہ کے لشکر کی تعداد مؤرخین نے ایک لاکھ بیس ہزار لکھی ہے حالانکہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے ساتھ صرف نوے ہزار سپاہی جمع ہوئے وہ بھی متفرق طور پر بالکل والنٹیر ایسے تھے، برخلاف فوج معاویہ کے جو سب بڑے تجربہ کار، قوی ہمت اور باقاعدہ تربیت یافتہ تھی، پھر ایسے بے جوڑ مقابلہ میں اگر ابتداءً حضرتؑ کا لشکر کچھ بزدلی دکھاتا رہا تو کچھ تعجب کی بات نہیں ہے مگر آخر حضرتؑ ہی کا لشکر غالب رہا اور لشکر معاویہ کو بھگاتا رہا۔ چنانچہ معاویہ کی طرف ۴۵ ہزار آدمی مارے گئے اور جناب امیرؑ کی طرف ۲۵ ہزار شہید ہوئے۔ لشکر معاویہ میں ایسا اضطراب پیدا ہوا کہ خود معاویہ اپنے سواری کے لگام پکڑے کھڑا تھا کہ اب بھاگوں، مگر عمرو عاص کو ایک تدبیر مکر و فریب کی سوجھ گئی اور اس نے نیزوں پر قرآن بلند کرا دیے۔ تاریخ ابوالفداء مطبوعہ مصر جلد ۱ صفحہ ۱۷۵ و تاریخ کامل جلد ص۔

[3] ''مَلَاحِمُ''، جمع ہے مَلْحَمَةٌ کی جس کا معنی بڑا حادثہ، جنگ عظیم ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الْمُتَجَلِّيْ لِخَلْقِهٖ بِخَلْقِهٖ، وَ الظَّاهِرِ لِقُلُوْبِهِمْ بِحُجَّتِهٖ، خَلَقَ الْخَلْقَ مِنْ غَيْرِ رَوِيَّةٍ، اِذْ كَانَتِ الرَّوِيَّاتُ لَا تَلِيْقُ اِلَّا بِذَوِي الضَّمَآئِرِ، وَ لَيْسَ بِذِيْ ضَمِيْرٍ فِيْ نَفْسِهٖ. خَرَقَ عِلْمُهٗ بَاطِنَ غَيْبِ السُّتُرَاتِ، وَ اَحَاطَ بِغُمُوْضِ عَقَآئِدِ السَّرِيْرَاتِ.

[مِنْهَا: فِيْ ذِكْرِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم]

اِخْتَارَهٗ مِنْ شَجَرَةِ الْاَنْبِيَآءِ، وَ مِشْكَاةِ الضِّيَآءِ، وَ ذُؤَابَةِ الْعَلْيَآءِ، وَ سُرَّةِ

ہر قسم کے حمد خدا ہی کے لیے ہے جو اپنے خلق کے لیے بذریعہ اپنی مخلوق کے واضح ۱؎ اور ان کے دلوں کے لیے اپنی حجت سے ظاہر ہے ۲؎ (اس نے) مخلوق کو بغیر غور وفکر کیے پیدا کیا کیونکہ غور وفکر تو صاحبان ضمیر ہی کی شان سے ہے اور وہ (خدا) فی نفسہ صاحب ضمیر نہیں ہے۔ ۳؎ اس کے علم نے پردہ ہائے غیب کی اندرونی حالت کو شگافتہ کر (کے جان) لیا اور باطنی عقیدوں کی تہوں اور باریکیوں کا احاطہ کر چھوڑا ہے۔ ۴؎

[اسی خطبہ سے حضرت رسول خداؐ کے بیان میں ہے]

(خدا نے) حضرتؐ کو انبیاءؑ کے (مبارک) درخت ۵؎ اور روشنی کے طاق اور شرف و بزرگی کی چوٹی اور

۱؎ چونکہ صانع عالم کے وجود وثبوت کی دلیلیں آفتاب کی طرح ظاہر و باہر اور روشن و تاباں ہیں لہٰذا حضرتؑ نے اس کو اس کی مخلوق کے لیے ظاہر و واضح ہونا ارشاد فرمایا اور یہ کہ اس کی مخلوق کے لیے وجود خدا کی کسی دوسرے دلیل کی ضرورت نہیں ہے بلکہ خود مخلوق کا پایا جانا اور عدم سے وجود میں آنا ہی اس کے لیے واضح دلیل و برہان ہے۔

۲؎ پھر حضرتؑ نے اس جملہ سے اپنے سابق قول کی تاکید فرمائی کہ خداوند عالم اپنی حجت اور نشانیوں سے دلوں کے لیے ظاہر اور روشن ہے۔ یہاں حضرتؑ نے ''وَالظَّاهِرُ لِعُيُوْنِهِمْ'' ''ان کی آنکھوں کے لیے ظاہر ہے'' نہیں فرمایا بلکہ دلوں کے لیے ظاہر فرمایا، جس سے اس طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے کہ خدا کو تو کوئی آنکھ سے دیکھ سکتا نہیں لہٰذا آنکھ کے لیے وہ ظاہر نہیں کہا جا سکتا۔ ہاں دل کو اس کا جلوہ نظر آتا ہے کیونکہ اسی دل میں وجود خدا کی دلیلیں ودیعت کی گئی ہیں لہٰذا اس کے لیے واضح فرمایا۔

۳؎ یعنی انسان جو صاحب ضمیر اور دل و دماغ والا ہے وہ البتہ غور وفکر اور رائے و تدبیر سے اپنے کام کرتا ہے لیکن خدا تو ایسا نہیں، نہ اس کو سوچنے کی ضرورت ہے نہ فکر کی بلکہ اس کے سامنے تو ہر چیز اس طرح کھلی ہوئی ہے جس طرح آئینہ کے سامنے کی چیزیں واضح رہتی ہیں۔

۴؎ یعنی اس کا علم ظاہر و باطن، ماضی و مستقبل سب کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور وہ ہر چیز کی تہہ اور باطن کے نچلے حصہ تک پہنچا ہوا ہے۔

۵؎ انبیاء کے درخت سے مراد اولاد حضرت ابراہیم علیہ السلام ہے کیونکہ اکثر انبیاء اسی نسل سے ہوئے ہیں۔ حضرت علیہ السلام فرماتے ہیں کہ خدا نے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو انتخاب بھی فرمایا تو معمولی لوگوں سے نہیں بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ایسے پیغمبر اولی العزم کی اولاد سے برگزیدہ کیا۔

الْبَطْحَآءِ، وَ مَصَابِيْحِ الظُّلْمَةِ، وَ يَنَابِيْعِ الْحِكْمَةِ.

بطحاء کے وسط[1] اور اندھیری کے چراغوں اور علم وحکمت کے چشموں سے چھانٹ کر نکالا ہے۔

[وَ مِنْهَا]

[اسی سے یہ بھی ہے]

طَبِيْبٌ دَوَّارٌ بِطِبِّهٖ، قَدْ اَحْكَمَ مَرَاهِمَهٗ، وَ اَحْمٰى مَوَاسِمَهٗ، يَضَعُ مِنْ ذٰلِكَ حَيْثُ الْحَاجَةُ اِلَيْهِ، مِنْ قُلُوْبٍ عُمْيٍ، وَ اٰذَانٍ صُمٍّ، وَ اَلْسِنَةٍ بُكْمٍ، مُتَتَبِّعٌ بِدَوَآئِهٖ مَوَاضِعَ الْغَفْلَةِ، وَ مَوَاطِنَ

(حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنی (روحانی) طب کے ساتھ دورہ کرنے والے طبیب تھے[2] آپؐ نے اپنے مرہموں کو قوی اور (آتش حکمت) سے اپنے (علاج کے) اوزار و آلات کو گرم کر رکھا تھا تو جہاں[3] حاجت ہوتی یعنی اندھے دلوں اور بہرے کانوں اور گونگی زبانوں میں اس (طریقہ علاج) کو استعمال فرماتے۔[4] (حضرتؐ) اپنی

---

[1] ''ذُؤَابَةٌ''، اصل میں بالوں کے اس ٹکڑے کو کہتے ہیں جو لٹکتا ہوا چھوڑ دیا جائے جس کو گیسو کہتے ہیں اور اس سے اکثر معزز و اشراف لوگ بھی مراد ہوتے ہیں۔ ''سُرَّةٌ''، معنی ناف اور ''بَطْحَآءُ''، نرم سنگریزوں والی نالی کے مقام کو کہتے ہیں، چونکہ مکہ معظّمہ بھی ایسا ہی تھا تو اسے بھی بطحاء کہتے تھے۔ اور قریش کو قریش البتہ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ مکہ معظّمہ کے پتھریلے مقاموں میں رہتے تھے۔ تو ''سُرَّةِ الْبَطْحَآءِ'' سے مراد اس کا وسطی حصہ ہے اور جو کعب بن لوئی جو بنو ہاشم کے جد اعلیٰ تھے جو عامر بن لوئی پر یہ فخر کرتے تھے کہ وہ لوگ تو مکہ کی پتھریلی زمین میں رہے اور قبیلہ بنو عامر ان پہاڑوں پر جا کر آباد ہو گئے جو مکہ معظّمہ کو گھیرے ہوئے ہیں اور خاص مکہ معظّمہ یا اس کی پتھریلی وادیوں میں رہنا پہاڑوں پر رہنے سے کہیں زیادہ اشرف و اعلیٰ تھا۔

[2] دورہ کرنے والے طبیب اس وجہ سے فرمایا کہ جو طبیب برابر گھومتا اور دورہ کر کے علاج کرتا رہتا ہے اس کا تجربہ بہت وسیع اور زیادہ ہو جاتا ہے یا یہ مراد ہو کہ حضرتؐ روحانی طبیب تھے تو خود ہی ہر بیمار کے یہاں تشریف لے جاتے اور اس کی دوا کرتے کیونکہ خدا کے صالح بندوں کا دستور یہی ہے کہ روحانی و ایمانی بیماروں کے یہاں خود پہنچتے اور دورہ کرتے رہتے اور اس طرح ان کا علاج کرتے رہتے ہیں۔ علامہ ابن ابی الحدید اس موقع پر لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عیسیٰؑ کو لوگوں نے دیکھا کہ ایک فاحشہ بدکار چھنال عورت کے گھر سے نکلے آ رہے ہیں لوگوں نے عرض کی اے سید و آقا آپ ایسا پیغمبر ایسی بدکار عورت کے پاس گیا تھا تو آپ نے ان لوگوں کو جواب دیا کہ بھائی روحانی طبیب خود ہی روحانی مریضوں کے پاس جایا کرتا ہے اسی وجہ سے میں بھی اس عورت کی وعظ و نصیحت کرنے آیا تھا۔

[3] ''مَوَاسِمُ''، معنی داغنے کے آلے جن سے گھوڑے وغیرہ جانوروں کی جلدوں پر داغ لگا دیتے ہیں اور چونکہ وہ آلے گرم کر کے جانور کا بدن داغا جاتا ہے لہٰذا فرمایا کہ حضرتؐ نے اپنے آلوں کو گرم کر رکھا تھا۔

[4] یعنی حضرتؐ اپنے معالجہ روحانی سے ان بیماروں کا علاج کرتے تھے جو اس کے محتاج تھے جو اس کے دل اندھے یعنی بے بصیرت اور کان بہرے یعنی ناشنوا اور زبانیں گونگی یعنی امور حق کے اظہار سے خاموش رہتیں۔ اس کے متعلق علامہ ابن ابی الحدید (بقیہ صفحہ مابعد)

الْحَيْرَةِ، لَمْ يَسْتَضِيْئُوْا بِاَضْوَآءِ الْحِكْمَةِ، وَ لَمْ يَقْدَحُوْا بِزِنَادِ الْعُلُوْمِ الثَّاقِبَةِ، فَهُمْ فِيْ ذٰلِكَ كَالْاَنْعَامِ السَّآئِمَةِ، وَ الصُّخُوْرِ الْقَاسِيَةِ.

قَدِ انْجَابَتِ السَّرَآئِرُ لِاَهْلِ الْبَصَآئِرِ، وَ وَضَحَتْ مَحَجَّةُ الْحَقِّ لِخَابِطِهَا، وَ اَسْفَرَتِ السَّاعَةُ عَنْ وَّجْهِهَا، وَ ظَهَرَتِ الْعَلَامَةُ لِمُتَوَسِّمِهَا. مَا لِيْ اَرَاكُمْ اَشْبَاحًا بِلَآ اَرْوَاحٍ، وَ اَرْوَاحًا بِلَآ اَشْبَاحٍ، وَ نُسَّاكًا بِلَا صَلَاحٍ، وَ

دوا سے غفلت کی جگہوں اور حیرت و پریشانی کے مقامات کو تلاش کرتے رہتے تھے (یعنی ان کو) جو علم و حکمت کی روشنیوں سے نور نہیں حاصل کر سکے تھے اور جنہوں نے روشن علوم کے چقماق سے آگ نہیں نکالی تھی۔ تو وہ لوگ اس میں چرنے والے اونٹوں اور سخت پتھروں ایسے تھے۔

مگر اب صاحبان بصیرت کے لیے (دین و حکمت کے) بھید کھل گئے [1] اور حق کی راہ چلنے والوں کے لیے اس کا راستہ واضح ہو گیا اور قیامت نے اپنے چہرہ سے نقاب اُلٹ دی اور تلاش کرنے والوں کے لیے (ہدایت کا) نشان ظاہر ہو گیا۔ (باوجود اس کے) یہ کیا بات ہے کہ میں دیکھتا ہوں تم سب بے روح کے جسم [2] اور بے جسم کے

(بقیہ صفحہ ماقبل) لکھتے ہیں کہ یہ تقسیم صحیح اور حصر کرنے والی ہے کیونکہ حق کی مخالفت اور گمراہی تین ہی باتوں سے ہوتی ہے۔ یا دل کی جہالت سے یا پند و نصیحت نہ سننے سے یا شہادت توحید و تلاوت آیات سے اپنی زبان کو روکنے کی وجہ سے اور تقسیم کو صحیح طریقہ سے کرنا بھی علم البیان کا ایک بڑا باب ہے۔

[1] ''اِنْجَابَتِ'' معنی ہٹ گیا، کھل گیا، فاش ہو گیا۔

[2] ''اَشْبَاحٌ'' معنی ڈھانچے، تصویریں۔ انوار اللغۃ پارہ ۱۳ صفحہ ۷ میں علامہ اہل سنت مولوی وحید الزمان خان صاحب لکھتے ہیں:

خَلَقَ اللّٰهُ مُحَمَّدًا وَ عِتْرَتَهٗ فَكَانُوْا اَشْبَاحَ نُوْرٍ بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ قُلْتُ وَ مَا الْاَشْبَاحُ قَالَ ظِلُّ النُّوْرِ لَا اَبْدَانٌ نُوْرَانِيَّةٌ بَلْ اَرْوَاحٌ۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کی آل کے نور کی تصویریں اپنے سامنے پیدا کیں۔ میں نے عرض کیا نور کی تصویروں سے کیا مراد ہے؟ فرمایا: نورِ الٰہی کا ایک سایہ یعنی نورانی بدن نہیں بلکہ نورانی روحیں:

بِاَنَّ اٰدَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ رَاٰى عَلَى الْعَرْشِ اَشْبَاحًا يَلْمَعُ نُوْرُهَا. فَسَاَلَ اللّٰهَ تَعَالٰى عَنْهَا فَاَوْحَى اللّٰهُ اِلَيْهِ: اَنَّهَا اَشْبَاحُ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَ اَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْحَسَنِ وَالْحُسَيْنِ وَ فَاطِمَةَ۔

حضرت آدمؑ نے عرش پر کچھ تصویریں دیکھیں ان کا نور چمک رہا تھا اللہ تعالیٰ سے پوچھا یہ تصویریں (مثالیں) کن لوگوں کی ہیں؟ فرمایا: یہ مثالیں ہیں اللہ کے رسول اور امیر المومنین (حضرت علی ابن ابی طالب) اور امام حسن و امام حسین علیہما السلام اور جناب سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی۔

تُجَّارًا بِلَآ اَرْبَاحٍ، وَ اَيْقَاظًا نُّوَّمًا، وَ شُهُوْدًا غُيَّبًا، وَ نَاظِرَةً عَمْيَآءَ، وَ سَامِعَةً صَمَّآءَ، وَ نَاطِقَةً بَكْمَآءَ.

روح [1] اور بے خیر وخوبی کے عبادت گزار اور بے نفع کے تاجر اور (بظاہر) ہوشیار، حاضر، بینا، سننے والے، بولنے والے مگر (درحقیقت) سوتے ہوئے غائب، اندھے، بہرے، گونگے ہو رہے ہو۔

رَايَةُ ضَلَالَةٍ قَدْ قَامَتْ عَلٰى قُطْبِهَا، وَ تَفَرَّقَتْ بِشُعَبِهَا، تَكِيْلُكُمْ بِصَاعِهَا،

البتہ گمراہی کا جھنڈا [2] اپنے مرکز پر کھڑا ہو گیا [3] اور اپنی شاخوں سے (تمام) پھیل گیا ہے۔ وہ تمہیں اپنے

---

[1] ''اَرْوَاحًا بِلَآ اَشْبَاحٍ'' مراد غفلت، بے خبری، کم عقلی۔ اور ممکن ہے ان کے ناقص ہونے کی طرف اشارہ ہو کیونکہ روح تو زیادہ تر جسم ہی کے ذریعہ سے عمل کرتی ہے پھر جب جسم نہیں ہے تو وہ کیا کر سکتی ہے اور بے خیر وخوبی کے عبادت گزار سے حضرتؑ نے ان لوگوں کو نفاق کی اور بے نفع کے تاجر سے ریا کی نسبت دی ہے کہ ان کی ظاہری حالت کچھ ہے اور باطنی کچھ۔ حضرتؑ کا یہ کلام خدا کے اس کلام سے کس قدر ملتا ہوا ہے۔

﴿لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۫ وَ لَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۫ وَ لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ﴾ (پارہ ۹، سورۂ الاعراف، آیہ ۱۷۹)

کہ ان کے دل ہیں لیکن ان سے سمجھتے نہیں اور ان کی آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں الّا ان سے سنتے نہیں۔ یہ لوگ بالکل جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ۔

اس کی وجہ خدا نے پارہ ۱۷ سورۂ حج آیت ۴۶ میں یہ لکھی ہے:

﴿فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَ لٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ﴾

کہ بات یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتی بلکہ دل جو سینوں میں ہیں وہ اندھے ہو جاتے ہیں۔

[2] علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ یہ کلام سابق کلام سے علیحدہ اور جدا ہے کیونکہ جناب سید رضی علیہ الرحمہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے ان کلاموں کو چن لیتے تھے جو فصاحت کی جان ہوتے اور اس کی چوٹی پر پہنچے رہتے اور انہیں کلاموں کو اس کتاب میں جمع کرتے گئے ہیں بہت جگہ قبل اور بعد کا کلام بالکل چھوڑ دیا اور درمیانی حصہ لے لیا ہے۔

پھر علامہ ممدوح لکھتے ہیں کہ حضرتؑ اس ٹکڑے میں ان فتنوں کو ذکر فرما رہے ہیں جو آخر زمانہ میں رونما ہوں گے جیسے سفیانی کا ظاہر ہونا وغیرہ''۔ لیکن اس کی کوئی وجہ نہیں ہے بلکہ واضح مطلب یہ ہے کہ معاویہ کی حالت اس میں بیان فرما رہے ہیں۔

[3] یعنی اس کی حالت درست اور منظم اور اس کی قوت مضبوط و مستحکم ہے۔ جس طرح چکی کے اندر قطب رہنے سے چکی اپنے کام میں درست رہتی ہے اور اپنے پاٹ پر سے ہل ڈول نہیں سکتی اسی طرح ضلالت کا یہ قطب بھی اپنی جگہ جم گیا ہے۔

وَ تَخْبِطُكُمْ بِبَاعِهَا، قَآئِدُهَا خَارِجٌ مِّنَ الْمِلَّةِ، قَآئِمٌ عَلَى الضَّلَّةِ، فَلَا يَبْقٰى يَوْمَئِذٍ مِّنْكُمْ اِلَّا ثُفَالَةٌ كَثُفَالَةِ الْقِدْرِ، اَوْ نُفَاضَةٌ كَنُفَاضَةِ الْعِكْمِ، تَعْرُكُكُمْ عَرْكَ الْاَدِيْمِ، وَ تَدُوْسُكُمْ دَوْسَ الْحَصِيْدِ، وَ تَسْتَخْلِصُ الْمُؤْمِنَ مِنْۢ بَيْنِكُمُ اسْتِخْلَاصَ الطَّيْرِ الْحَبَّةَ الْبَطِيْنَةَ مِنْۢ بَيْنِ هَزِيْلِ الْحَبِّ.

پیمانہ سے ناپتا اور اپنی باہنہ سے ٹھوکتا ہے [1] اس کا افسر ملتِ (اسلام) سے باہر اور گمراہی پر جما ہوا ہے۔ تو اس روز تم سے کوئی چیز نہیں بچے گی سوا تلچھٹ کے جیسی دیگچی کی تلچھٹ ہوتی ہے یا ریشہ کے جیسی گٹھری کا ریشہ ہوتا ہے۔ [2] یہ (فتنہ) سرخ نری کی طرح تم کو چھیل ڈالے گا [3] اور تمہیں اس طرح روندے گا جیسے کھیت کا کاٹا ہوا غلّہ روندا جاتا ہے اور تمہارے درمیان سے مومن کو اس طرح چھانٹ لے گا جیسے طائر بڑے دانہ کو چھوٹے دانوں کے اندر سے چن لیتا ہے۔ [4]

---

[1] یعنی تم لوگوں کو ایک ہی دفعہ ہلاک کرنے کے لیے گرفتار کر لینا ہے جس طرح ناپنے والا ایک ہی دفعہ غلہ کے دانوں کو اپنے پیمانہ میں بھر لیتا ہے اور اپنے باہنہ سے تمہیں ٹھوکتا ہے یعنی تم پر ظلم وستم کرنے میں اس کا ہاتھ بہت لمبا رہتا ہے اور نزدیک دور سب تک اس کا ستم و جور پہنچتا ہے کوئی اس کی آفتوں اور قہروں سے بچنے نہیں پاتا۔

[2] ''ثُفَالَةٌ''، معنی تلچھٹ۔ ''نُفَاضَةٌ''، معنی گڑی ہوئی، جھڑی ہوئی چیز اور ''عِكْمٌ''، معنی گٹھری۔ یعنی اس طرح گری اور جھڑی ہوئی چیز جیسے گٹھریوں اور تھیلیوں سے کوئی چیز گر اور جھڑ جاتی ہے۔

[3] یعنی سرخ نری کی طرح تم کو چھیل ڈالے گی۔

[4] یعنی وہ فتنہ اور تباہی مومن کو خاص کر اپنا نشانہ بنائے گی اور اس بیچارے کو اور زیادہ سختی سے مصائب و مظالم میں مبتلا کرے گی چنانچہ کہتے ہیں:

اَلْمُؤْمِنُ مُلْقٰىٰ وَالْكَافِرُ مَوْنٰىٰ۔

کہ مومن تو ڈال دیا جاتا اور کافر بچا لیا جاتا ہے۔

اور حدیث مرفوع میں ہے کہ دنیا کی آفتیں مومن کی طرف اس آگ سے بھی زیادہ تیزی سے بڑھتی ہیں جو خشک عرفج درخت میں لگتی ہے تو فوراً پھیل جاتی ہے۔ انوار اللغۃ پارہ ۱۸ صفحہ ۸۹ میں ہے ''عَرْفَجٌ''، ایک جنگلی درخت ہے۔ بعضوں نے کہا وہی قفاد ہے جو کانٹے دار مشہور درخت ہے۔

كَاَنَّ لِحْيَتَهٗ ضَرَامُ عَرْفَجٍ۔

ان کی ڈاڑھی ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے عرفج میں آگ لگی ہو، مراد ابوبکر صدیق ہیں۔

اَيْنَ تَذْهَبُ بِكُمُ الْمَذَاهِبُ، وَ تَتِيْهُ بِكُمُ الْغَيَاهِبُ، وَ تَخْدَعُكُمُ الْكَوَاذِبُ؟ وَ مِنْ اَيْنَ تُؤْتَوْنَ وَ ﴿اَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ﴾؟ فَلِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ، وَ لِكُلِّ غَيْبَةٍ اِيَابٌ، فَاسْتَمِعُوْا مِنْ رَّبَّانِيِّكُمْ، وَ اَحْضِرُوْا قُلُوْبَكُمْ، وَ اسْتَيْقِظُوْا اِنْ هَتَفَ بِكُمْ، وَ لْيَصْدُقْ رَآئِدٌ اَهْلَهٗ،

(مختلف) راہیں تمہیں کہاں لیے جاتی اور تاریکیاں تمہیں کدھر بہکاتی اور جھوٹی آرزوئیں تمہیں کس طرح فریب دے رہی ہیں۔ (دیکھو) تم کہاں لائے جا رہے اور (خود) کس طرف بہکے جاتے ہو۔ کیونکہ ہر وقت معین کے لیے (خدا کے یہاں) ایک نوشتہ (تقدیر) اور ہر غائب ہونے کے لیے پلٹنا (ضروری) ہے[1] تو تم اپنے (امام) ربانی کی باتیں سنو[2] اور اپنے دلوں کو ادھر متوجہ کرو اور اگر وہ تمہیں پکارے تو بیدار ہو جاؤ۔ اور چارہ پانی ڈھونڈنے والے کو چاہیے کہ اپنے (سفر کے) ساتھیوں سے سچی بات کہہ دے[3] اور اپنی پراگندگی کو جمع کر لے

---

[1] یعنی جو شے آنکھوں سے غائب ہوئی ضرور پھر پلٹے گی۔ ایک شاعر نے موت کو مستثنیٰ کیا ہے کہ انسان مرنے پر پلٹ نہیں سکتا۔ اس کے متعلق علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ ''یہ عقیدہ زندیقوں کا ہے لیکن حضرت امیر المومنینؑ۔

وَهُوَ ثَانِيْ صَاحِبِ الشَّرِيْعَةِ الَّتِيْ جَاءَتْ بِعَوْدِ الْمَوْتٰى فَاِنَّهٗ لَا يُسْتَثْنٰى۔

کہ حضرتؑ تو اس شریعت کے دوسرے رکن ہیں جو کہتی ہے کہ مُردے دوبارہ پلٹ کر زندہ ہوں گے لہٰذا مرنے والا بھی مستثنیٰ نہیں کیا جا سکتا۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ شریعت اسلام کے پہلے رکن حضرت رسالت مآبؐ اور دوسرے حضرت امیر المومنین علیہ السلام ہی ہیں اور شیعہ بھی یہی کہتے ہیں کہ حضرت رسول خداؐ کے بعد اسلام کے سردار و مولا حضرت علیؑ ہی ہیں۔

[2] یعنی خود امیر المومنینؑ کی چنانچہ جناب حسنؑ نے حضرت امیر المومنینؑ کے وصف میں کہا ہے:

كَانَ وَاللّٰهِ رَبَّانِيَّ هٰذِهِ الْاُمَّةِ وَ ذَا فَضْلِهَا وَ ذَا قَرَابَتِهَا وَ ذَا سَابِقَتِهَا۔

کہ خدا کی قسم حضرتؑ اس امت کے ربانی اور اس کے صاحب فضل و صاحب قرابت اور سب سے پہلے آنحضرتؐ کی نبوت کی تصدیق کرنے والے تھے۔

[3] ''رَآئِدٌ'' اس شخص کو کہتے ہیں جو جماعت سے آگے بڑھ کر دانہ چارہ اور پانی کی تلاش میں جاتا ہے اور یہ ایک مثل ہے کہ وَلْيَصْدُقْ رَائِدٌ اَهْلَهٗ۔ کہ جو شخص اپنی جماعت والوں سے آگے بڑھ کر دانہ چارہ اور پانی کی تلاش میں جائے اسے چاہیے کہ اس جماعت میں واپس آ کر اس سے سچ سچ بیان کر دے کہ کیا کر آیا اور کیا چیز ملی کیا نہیں ملی۔

وَلْيَجْمَعْ شَمْلَهٗ، وَ لْيُحْضِرْ ذِهْنَهٗ، فَلَقَدْ فَلَقَ لَكُمُ الْاَمْرَ فَلْقَ الْخَرَزَةِ، وَ قَرَفَهٗ قَرْفَ الصَّمْغَةِ.

اور اپنے ذہن کو حاضر رکھے۔[1] اور یقیناً اس (امام ربانی) نے امر (حق و باطل) کو تمہارے لیے اس طرح ظاہر کر دیا جیسے مہرہ شگافتہ کر دیا جاتا ہے اور اس کو اس طرح صاف کر دیا ہے جیسے گوند صاف کیا جاتا ہے۔

فَعِنْدَ ذٰلِكَ اَخَذَ الْبَاطِلُ مَاْخِذَهٗ، وَ رَكِبَ الْجَهْلُ مَرَاكِبَهٗ، وَ عَظُمَتِ الطَّاغِيَةُ، وَ قَلَّتِ الدَّاعِيَةُ، وَ صَالَ الدَّهْرُ صِيَالَ السَّبُعِ الْعَقُوْرِ، وَ هَدَرَ فَنِيْقُ الْبَاطِلِ بَعْدَ كُظُوْمٍ، وَ تَوَاخَى النَّاسُ عَلَى الْفُجُوْرِ، وَ تَهَاجَرُوْا عَلَى الدِّيْنِ، وَ تَحَابُّوْا عَلَى الْكَذِبِ، وَ تَبَاغَضُوْا عَلَى الصِّدْقِ.

تو اس وقت باطل اپنی جڑ پکڑ لے گا اور جہالت اپنی سواریوں پر چڑھ جائے گی، سرکشی بڑھ جائے گی اور (حق کی طرف) بلانے والی قوت کم ہو جائے گی[2] اور کاٹنے والے درندے کی طرح زمانہ حملہ کرے گا[3] اور باطل کا نر اونٹ خاموشی کے بعد چیخنے لگے گا[4] اور لوگ فسق و فجور پر بھائی بھائی بن جائیں گے اور دینی امور میں ایک دوسرے کو چھوڑ دیں گے اور جھوٹ پر ایک دوسرے کے دوست اور سچائی پر ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے۔

فَاِذَا كَانَ ذٰلِكَ كَانَ الْوَلَدُ غَيْظًا،

پس جب یہ حالت پہنچے گی تو (کیا عجب) اولاد بھی

---

[1] ''شَمْلٌ''، اپنی پراگندگی جمع کر لے یعنی اپنے ارادوں اور افکار کو اکٹھا کر لے تاکہ اچھی طرح غور و فکر کر سکے۔

[2] یعنی باطل کی قوت مضبوط ہو جائے گی۔ جہالت عام طور پر پھیل جائے گی۔ سرکشی و شیطنت بہت بڑھ جائے گی اور حق کی طرف بلانے والی جماعت یا قوت کمزور اور قلیل ہو کر اس درجہ دب جائے گی کہ اس کا کچھ زور نہیں چلنے پائے گا۔

[3] ''فَنِيْقٌ''، اس عمدہ اونٹ کو کہتے ہیں جس پر عرب لوگ نہ کبھی سواری کرتے ہیں نہ بوجھ لادتے ہیں اس کی شرافت اور عمدگی کی وجہ سے۔ ''هَدْرٌ''، معنی آواز نکالنا، جانور کا اپنے حلق میں آواز کو اُلٹ پھیر کرنا۔

[4] یعنی آپس میں اسی کو طے کر لیں گے کہ وہ فسق و فجور ہی میں بسر کریں گے اور دینی معاملات میں ایک دوسرے کو چھوڑ دیں گے یعنی کوئی کسی کا ساتھ نہیں دے گا اور حکم خدا ﴿تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى﴾ پر عمل نہیں کرے گا بلکہ ﴿وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ﴾ (سورۂ المائدہ، آیہ ۲) کی نوبت آ جائے گی کوئی صاحب یہ شبہ نہ کریں کہ اچھے لوگوں کا طریقہ یہی ہے کہ دینی باتوں میں ایک دوسرے کو چھوڑ دیتے ہیں مثلاً کوئی زنا کرے تو اس وجہ سے اس کے اعزّہ اس کو چھوڑ دیں یا کوئی شراب پیے تو اس سے برادری ترک کر دی جائے کیونکہ حضرتؑ کا یہ مقصود نہیں ہے بلکہ یہ مطلب ہے کہ جو شخص دین کا پابند ہوگا اس کو لوگ چھوڑ دیں گے اور اس کا ساتھ نہیں دیں گے اور دینی کاموں میں ایک دوسرے کی اعانت نہیں کرے گا۔

وَالْمَطَرُ قَيْظًا، وَ تَفِيْضُ اللِّئَامُ فَيْضًا، وَ تَغِيْضُ الْكِرَامُ غَيْضًا، وَ كَانَ اَهْلُ ذٰلِكَ الزَّمَانِ ذِئَابًا، وَسَلَاطِيْنُهٗ سِبَاعًا، وَ اَوْسَاطُهٗ اُكَّالًا، وَ فُقَرَاؤُهٗ اَمْوَاتًا، وَ غَارَ الصِّدْقُ،

(والدین کے لیے) غیظ وغضب [1] اور بارش (کی فصل) گرمی (سے مبدل) ہو جائے [2] اور کمینے برابر بڑھتے جائیں اور شریف لوگ (روز بروز) کم ہوتے جائیں گے اور اس وقت کے لوگ بھیڑیے اور بادشاہ درندے ہو جائیں گے اور اوسط درجہ کے لوگ (بادشاہوں اور عاملوں کے) لقمہ تر اور فقیر مردہ (حال) ہو جائیں گے [3] اور

---

[1] یعنی لڑکوں میں ماں باپ کی نافرمانی اس حد کو پہنچ جائے گی کہ اولاد والدین کے لیے غیظ وغضب ہو جائے گی۔

[2] یعنی برسات کا موسم جو تری اور ٹھنڈک کا زمانہ ہوتا ہے خوب گرمی اور خشکی کی فصل ہو جائے گا گویا زمانہ کے اصول بالکل الٹ جائیں گے۔ لوگوں نے بیان کیا ہے کہ یہ باتیں قیامت کی علامات سے ہیں۔

[3] ''اُكَّالًا''، معنی کھانے کی چیز یعنی اوسط درجہ کے لوگ والیوں اور اصحاب سلاطین کی غذا ہو جائیں گے کہ حکام وقت چوس چوس کر ان کا مال کھاتے رہیں گے، جس طرح شیر چھوٹے جانوروں کو چیر پھاڑ کر اپنی غذا بناتے ہیں۔ اسی وجہ سے تو بادشاہوں کے یہاں کروڑوں روپیہ سالانہ ان کا ذاتی خرچ ہوتا تھا۔

مولوی شبلی صاحب کے رسالہ الندوہ جلد ۳، نمبر ۷، صفحہ ۲۲ میں ہے:

''جب حضرت عمر شام میں حضرت امیر معاویہ کے پاس پہنچے تو امیر معاویہ کے تکلفات کو دیکھ کر فرمایا: اَكْسَرَوِيَّةٌ وَيَا مُعَاوِيَةُ۔ معاویہ کسرا پن کیسا؟ ایک دفعہ جب حضرت معاویہ اپنی اسی شان سے مدینہ پہنچے تو حضرت عمر نے ناپسندیدگی کے لہجہ میں فرمایا: '' جَاءَ كِسْرَى الْعَرَبِ''۔ عرب کا کسرا آیا۔ جب اموی سلطنت قایم ہوئی تو اس پر عظمت سادگی کے بدلے تکلفات آتے گئے۔ اس کی ابتداء امیر معاویہ سے ہوئی۔ وہ بھی اسی شان سے رہنے لگے جس شان وشوکت سے ان کے معاصر سلاطین جو اس وقت دنیا کے اور حصوں پر حکمران تھے رہتے تھے۔ اس کے بعد اور خلفائے بنی امیہ بھی تکلفات آرائش میں روز بروز ترقی کرتے گئے۔ بعض زیادہ تکلف پسند خلفاء اپنے سامنے لعل و یاقوت کے گلدستے چنوا دیتے تھے۔ اندلس کا خلیفہ المعتمد عنبر کی تصویریں اپنی نشست کے سامنے رکھتا تھا۔ اس کے تخت کے دونوں جانب دو اونٹ کھڑے رہتے تھے جس میں سے ایک کا بدن سونے کا تھا جس پر سچے موتیوں کی گل کاری کی گئی تھی اور دوسرا بلور کا تھا جس کی آنکھیں یاقوت کی تھیں۔ دونوں گراں بہا گہنوں سے لدے تھے۔ جاڑوں میں سونے چاندی کی انگیٹھیاں بھی دربار میں سلگائی جاتی تھیں جن میں خوشبودار لکڑیاں جلائی جاتی تھیں''۔

پھر الندوہ جلد ۸، نمبر ۱۰، صفحہ ۳ میں ہے:

''بنو امیہ تمام مفتوحہ شہروں کے لوگوں کو اور ان کے مال و دولت کو شیر مادر سمجھتے تھے۔ بنو امیہ کے عمال زمینداروں پر مال گزاری وغیرہ کے وصول کرنے میں ظلم کرتے تھے اور بنو امیہ کے عمال یہ باتیں اپنی طرف سے نہیں کرتے تھے بلکہ اکثر

(بقیہ صفحہ آئندہ)

وَفَاضَ الْكَذِبُ، وَ اسْتُعْمِلَتِ الْمَوَدَّةُ بِاللِّسَانِ، وَ تَشَاجَرَ النَّاسُ بِالْقُلُوْبِ، وَ صَارَ الْفُسُوْقُ نَسَبًا، وَ الْعَفَافُ عَجَبًا، وَ لُبِسَ الْاِسْلَامُ لُبْسَ الْفَرْوِ مَقْلُوْبًا.

سچائی غائب ہوتی جائے گی اور جھوٹ بڑھتا جائے گا اور زبان سے تو محبت برتی جائے گی مگر دل سے لوگ لڑتے جھگڑتے رہیں گے اور فسق و فجور (مثل) نسب (کے) ہو جائے گا[1] اور عفت عجیب چیز سمجھی جائے گی[2] اور الٹی پوستین کی طرح اسلام بھی الٹ کر پہن (یعنی اختیار کر) لیا جائے گا۔[3]



(بقیہ صفحہ ماقبل) خلفاء کے حکم سے کرتے تھے اور بنو امیہ عیش پرستی اور لہو ولعب اور شراب میں ڈوب گئے تھے اور عمال بنو امیہ مفتوحہ قوموں کے مال چھین لینے کو کچھ برا نہیں سمجھتے تھے۔ قرآن مجید اور حرمین کی توہین، ذمی اور دیگر اصلی باشندوں نے بنی امیہ اور ان کے ملازموں کے ہاتھ سے سخت مصیبتیں جھیلیں، حتی کہ ان لوگوں نے بھی جو مسلمان ہو گئے تھے کیونکہ عرب ان سے غلاموں کا سا برتاؤ کرتے تھے۔ جب ان کے پاس کوئی شخص مال گزاری ادا کرنے کے لیے روپیہ لاتا تھا تو تحصیلدار اس میں سے کچھ روپیہ نکال لیتا تھا اور کہتا تھا کہ روپیہ کا نرخ اور چلن اسی قدر ہے۔ قاضی ابو یوسف نے ہارون الرشید کو عمال خراج کے بارہ میں جو وصیت لکھی تھی اس سے وہ طریقہ معلوم ہو سکتے ہیں جن سے چھوٹے چھوٹے عمال روپیہ جمع کرتے تھے۔ قاضی صاحب نے کتاب الخراج صفحہ ۶۱ و ۶۲ میں لکھا ہے کہ یہ عمال رعایا کو دھوپ میں بٹھاتے تھے اور ان کے گلے میں مٹکے لٹکاتے تھے اور اس طرح زنجیروں میں جکڑتے تھے کہ وہ نماز نہیں پڑھ سکتے تھے''۔

[1] یعنی فاجر و فاسق لوگ اس درجہ شریف اور معزز و محبوب سمجھے جانے لگیں گے کہ سب ان کے دوست اور قدردان ہو جائیں گے اور جس طرح رشتہ و قرابت اور نسبتی تعلقات سے محبت و الفت پیدا ہو جاتی ہے اسی طرح فسق و فجور سے حاصل ہو گی۔

[2] یعنی عفت اور پاکدامنی ایسی نایاب صفت ہو جائے گی کہ جو شخص باعفت پاک دامن رہے گا اس پر لوگ تعجب اور حیرت کرنے لگیں گے کہ اس کو کیا ہو گیا ہے کہیں نامرد تو نہیں ہے۔

[3] یعنی جس طرح استر دار اچکن کو مثلاً اس طرح الٹ دیں کہ اس کا استر تو اوپر ہو جائے اور اوپر کا حصہ نیچے ہو جائے اور اسی طرح اس کو پہن لیں اسی طرح اسلام الٹ کر اختیار کر لیا جائے گا کہ اس کی حرام چیزیں اختیار کی جائیں گی اور حلال چھوڑ دی جائیں گی۔ باطل باتوں کو لوگ خوشی سے قبول کریں گے اور امور حق کی طرف توجہ بھی نہیں کریں گے۔ غرض اس زمانہ میں احکام اسلام سب کے سب بر عکس جائیں گے۔

❁ خطبہ :۱۰۷ ❁

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ

كُلُّ شَيْءٍ خَاشِعٌ لَّهٗ، وَكُلُّ شَيْءٍ قَآئِمٌ بِهٖ: غِنٰى كُلِّ فَقِيْرٍ، وَ عِزُّ كُلِّ ذَلِيْلٍ، وَ قُوَّةُ كُلِّ ضَعِيْفٍ، وَ مَفْزَعُ كُلِّ مَلْهُوْفٍ، مَنْ تَكَلَّمَ سَمِعَ نُطْقَهٗ، وَ مَنْ سَكَتَ عَلِمَ سِرَّهٗ، وَ مَنْ عَاشَ فَعَلَيْهِ رِزْقُهٗ، وَ مَنْ مَّاتَ فَاِلَيْهِ مُنْقَلَبُهٗ. لَمْ تَرَكَ الْعُيُوْنُ فَتُخْبِرَ عَنْكَ، بَلْ كُنْتَ قَبْلَ الْوَاصِفِيْنَ

خطبہ(۱۰۷)

حضرت علیہ السلام کے ایک خطبہ کا کچھ حصّہ۔

ہر چیز (خدا) کے لیے جھکی ہوئی اور ہر شے اسی (کی قدرت) سے قائم ہے وہ ہر فقیر کی تونگری اور ہر ذلیل کی عزت اور ہر کمزور کی قوت (کا سبب) اور ہر بے قرار کی جائے پناہ ہے۔[1] جو شخص (کچھ) بولتا ہے اس کی بات وہ سن لیتا ہے اور جو چپ رہتا ہے اس کا دلی بھید (بھی) جان جاتا ہے۔ اور جو زندہ رہتا ہے اس کی روزی پہنچانا اس (خدا) پر لازم اور جو مر جاتا ہے اس کو بھی اس کی طرف پلٹنا ضروری ہے۔ (اے خدا) آنکھوں نے تجھے دیکھا ہی نہیں تا کہ تیری حالت بیان کریں بلکہ تیری مخلوق سے جو لوگ تیری حالت

---

[1] علامہ ابن ابی الحدید معتزلی لکھتے ہیں کہ حضرتؑ کے اسی جملہ کے مطلب سے علماء نے صانع عالَم کے وجود و ثبوت پر استدلال کیا ہے اور یہ اس وجہ سے کہ انسان کا نفس سختیوں، پریشانیوں اور مصیبتوں میں خواہ مخواہ اپنے خالق اور پروردگار کی طرف لو لگاتا اور اسی سے اس کی ڈھارس بندھتی ہے۔ کیا تم کشتی کے سوار کو نہیں دیکھتے کہ جب طوفان آتا ہے اور وہ ڈوبنے لگتی ہے تو اس وقت اس کے سواروں کو جو کچھ اپنے بچنے کی امید ہوتی ہے صرف خدا سے اور یہ اس سے آس کا لگانا انسان کا کچھ اختیاری فعل نہیں ہے بلکہ نفس اس کے لیے مجبور ہو جاتا ہے جو گویا فطری امر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ خدا کا علم انسانی نفوس میں راسخ ہے اسی کو خدا پارہ ۵ سورہ بنی اسرائیل آیت ۶۷ میں فرماتا ہے:

﴿ وَ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِيَّاهُ ﴾

کہ جب سمندر میں تم پر آفت آتی ہے تو سب مددگار غائب ہو جاتے ہیں مگر وہی تمہیں یاد رہتا ہے۔

پارہ ۶ سورہ یونس آیت ۲۲ میں فرمایا ہے:

﴿هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ ؕ حَتّٰٓى اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ ۚ وَ جَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّ فَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّ جَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّ ظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ لَئِنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ﴾

خدا وہی ہے جو تم لوگوں کو خشکی اور تری میں لیے پھرتا ہے یہاں تک کہ بعض اوقات تم کشتیوں۔۔۔

(خطبہ کا یہ حاشیہ نامکمل ہے۔)

مِنْ خَلْقِكَ.

لَمْ تَخْلُقِ الْخَلْقَ لِوَحْشَةٍ، وَ لَا اسْتَعْمَلْتَهُمْ لِمَنْفَعَةٍ، وَ لَا يَسْبِقُكَ مَنْ طَلَبْتَ، وَ لَا يُفْلِتُكَ مَنْ اَخَذْتَ، وَ لَا يَنْقُصُ سُلْطَانَكَ مَنْ عَصَاكَ، وَ لَا يَزِيْدُ فِيْ مُلْكِكَ مَنْ اَطَاعَكَ، وَ لَايَرُدُّ اَمْرَكَ مَنْ سَخِطَ قَضَآءَكَ، وَ لَايَسْتَغْنِيْ عَنْكَ مَنْ تَوَلّٰى عَنْ اَمْرِكَ، كُلُّ سِرٍّ عِنْدَكَ عَلَانِيَةٌ، وَ كُلُّ غَيْبٍ عِنْدَكَ شَهَادَةٌ.

اَنْتَ الْاَبَدُ فَلَآ اَمَدَ لَكَ، وَ اَنْتَ الْمُنْتَهٰى فَلَا مَحِيْصَ عَنْكَ، وَ اَنْتَ الْمَوْعِدُ فَلَا مَنْجٰى مِنْكَ اِلَّآ اِلَيْكَ، بِيَدِكَ نَاصِيَةُ كُلِّ دَآبَّةٍ، وَ اِلَيْكَ مَصِيْرُ كُلِّ نَسَمَةٍ.

سُبْحَانَكَ مَآ اَعْظَمَ مَا نَرٰى مِنْ خَلْقِكَ! وَ مَآ اَصْغَرَ عِظَمَهٗ فِيْ جَنْبِ قُدْرَتِكَ! وَ مَآ اَهْوَلَ مَا نَرٰى مِنْ مَّلَكُوْتِكَ! وَ مَآ اَحْقَرَ ذٰلِكَ فِيْمَا غَابَ عَنَّا مِنْ سُلْطَانِكَ! وَ مَآ اَسْبَغَ نِعَمَكَ فِي الدُّنْيَا، وَ مَآ اَصْغَرَهَا فِيْ نِعَمِ الْاٰخِرَةِ!.

بیان کرے ان کے پہلے سے تو (موجود) ہے۔

تو نے کسی وحشت کی وجہ سے (اپنی) خلق کو پیدا نہیں کیا ہے اور نہ کسی نفع کے لیے انہیں استعمال کیا اور جسے تو طلب کرے وہ تجھ سے سبقت نہیں کر سکتا اور جس کو تو گرفتار کرے وہ تجھ سے بھاگ نہیں سکتا ہے اور جو تیری نافرمانی کرے وہ تیری جاہ و جلال کو کم نہیں کر سکتا اور جو تیری اطاعت کرے وہ تیری حکومت میں اضافہ نہیں کر سکتا اور جو تیری قضا و قدر سے ناراض ہو وہ تیرا حکم رد نہیں کر سکتا اور جو تیرے حکم سے روگردانی کرے وہ تجھ سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ ہر راز تجھ پر فاش اور ہر غیب کی بات تیرے لیے آشکار ہے۔

تو ہمیشہ ہے لہٰذا تیرے لیے کوئی نہایت نہیں ہے[1] (یہ حاشیہ موجود نہیں ہے) اور تو (ہر چیز کی) حد ہے پس تجھ سے بھاگنے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ اور تو ہی وعدہ گاہِ (قیامت) ہے تو تجھ سے نجات دینے والی کوئی چیز نہیں ہے مگر تیری ہی طرف، تیرے قبضۂ قدرت میں ہر جانور کی پیشانی اور تیری ہی طرف ہر نفس کی بازگشت ہے۔

(اے خدا) تو پاک و پاکیزہ ہے تیری شان کیسی عظیم ہے۔ سبحان اللہ، ہم تیری جس خلق کو دیکھتے ہیں (درحقیقت) کتنی بڑی مگر تیری قدرت کے مقابلہ میں کتنی چھوٹی ہے اور ہم تیری جو حکومت دیکھتے ہیں وہ کیسی ہیبت ناک لیکن تیری سطوت و جلال جو ہم سے پوشیدہ ہے اس (کے مقابلہ) میں کتنی حقیر ہے۔ اور دنیا میں تیری نعمتیں کتنی بھرپور مگر آخرت کی نعمتوں کے سامنے کس قدر ہیچ ہیں۔

[مِنْهَا]

مِنْ مَّلٰٓئِكَةٍ اَسْكَنْتَهُمْ سَمٰوَاتِكَ، وَ رَفَعْتَهُمْ عَنْ اَرْضِكَ، هُمْ اَعْلَمُ خَلْقِكَ بِكَ، وَ اَخْوَفُهُمْ لَكَ، وَ اَقْرَبُهُمْ مِّنْكَ. لَمْ يَسْكُنُوا الْاَصْلَابَ، وَ لَمْ يُضَمَّنُوا الْاَرْحَامَ، وَ لَمْ يُخْلَقُوْا ﴿مِنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ﴾، وَ لَمْ يَتَشَعَّبْهُمْ رَيْبُ الْمَنُوْنِ، وَ اِنَّهُمْ عَلٰى مَكَانِهِمْ مِنْكَ، وَ مَنْزِلَتِهِمْ عِنْدَكَ، وَ اسْتِجْمَاعِ اَهْوَآئِهِمْ فِيْكَ، وَكَثْرَةِ طَاعَتِهِمْ لَكَ، وَ قِلَّةِ غَفْلَتِهِمْ عَنْ اَمْرِكَ، لَوْ عَايَنُوْا كُنْهَ مَا خَفِيَ عَلَيْهِمْ مِنْكَ لَحَقَّرُوْا اَعْمَالَهُمْ، وَ لَزَرَوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ، وَ لَعَرَفُوْا اَنَّهُمْ لَمْ يَعْبُدُوْكَ حَقَّ عِبَادَتِكَ، وَ لَمْ يُطِيْعُوْكَ حَقَّ طَاعَتِكَ.

سُبْحَانَكَ خَالِقًا وَّ مَعْبُوْدًا! بِحُسْنِ بَلَآئِكَ عِنْدَ خَلْقِكَ، خَلَقْتَ دَارًا وَّ جَعَلْتَ فِيْهَا۔۔۔

[اسی خطبہ سے یہ بھی ہے]

ان فرشتوں سے جنہیں تو نے اپنے آسمانوں میں آباد کیا اور اپنی زمین سے بلند کیا وہ تجھے تیری مخلوق سے زیادہ جاننے والے اور تجھ سے زیادہ ڈرنے والے اور تجھ سے زیادہ تقرب حاصل کیے ہوئے ہیں۔ وہ نہ کبھی صلبوں میں رہے اور نہ رحموں میں سپرد کیے گئے اور نہ ذلیل نطفہ سے پیدا کیے گئے اور نہ کبھی حوادث زمانہ نے انہیں متفرق و پراگندہ کیا۔ اور وہ سب (فرشتے) باوجود اس تقرب کے جو تیرے یہاں اور اس مرتبہ کے جو تیرے نزدیک انہیں حاصل ہے اور باوجودیکہ انہوں نے اپنی خواہشیں تیری مرضی میں اکٹھی کر لی ہیں اور وہ بکثرت تیری اطاعت کرتے اور بہت کم تیرے حکم سے غافل ہوتے ہیں (پھر بھی) اگر تیری اس کنہ کو ملاحظہ کر لیں جو ان سے مخفی ہے تو یقیناً وہ اپنے اعمال کو حقیر اور اپنے نفسوں کو معیوب سمجھنے لگیں اور جان لیں کہ تیری عبادت کا جو حق ہے ویسی عبادت نہیں کر سکے اور تیری اطاعت جیسی چاہیے ویسی اطاعت بھی ان سے نہیں ہو سکی۔

تو کس قدر قابل تسبیح خالق اور معبود ہے۔ تو نے اپنی خلق کا بہترین امتحان لے کر ایک گھر (بہشت) پیدا کیا اور اس میں (مختلف قسم کی نعمتیں مثلاً)۔

یہ ترجمہ خطبہ ۱۰۷ سے آگے نہ بڑھ سکا۔
اس بزرگوار نے کیا کیا جتن کیے مگر کلام علیؑ کا ترجمہ مکمل نہ ہو سکا۔
مترجم کے درجات کی بلندی کے لیے سورہ فاتحہ کی تلاوت کر لیجیے۔